عمرہا در کعبہ و بت خانہ می نالد حیات
تا ز بزمِ عشق یک دانائے راز آید بروں

شاہکارِ رسالت

عمر فاروقؓ

جن کے عہدِ خلافت میں اسلام ایک جیتے جاگتے
نظامِ حیات کی شکل میں سامنے آیا

پرویز

شائع کردہ

طلوعِ اسلام ٹرسٹ (رجسٹرڈ)، ۲۵ بی، گلبرگ ۲، لاہور

طلوع اسلام ٹرسٹ کی کتب سے حاصل شدہ
جملہ آمدن قرآنی فکر عام کرنے پر صرف ہوتی ہے۔

رزم ہو یا بزم ہو پاک دل و پاک باز

اذا اردتم ان یطیب المجلس فافیضوا

فی

ذکر عمرؓ

اگر تم چاہتے ہو کہ تمھاری مجلس پاکیزہ ہو جائے تو
عمرؓ کا ذکر کیا کرو!

(خواجہ حسن بصریؒ)

اُس کی محفل میں بیٹھ کر دیکھو
زندگی کتنی خوبصورت ہے

نام کتاب ---------- شاہکار رسالت

مصنف ---------- غلام احمد پرویز

ناشر ---------- طلوع اسلام ٹرسٹ (رجسٹرڈ)

---------- 25-B گلبرگ II لاہور 54660 پاکستان

---------- فون: 4484 576 - 3666 575 فیکس: 5764484

---------- Email: tluislam@brain.net.pk

---------- web: w.toluislam.com, www.ummah.org.uk/xpo/

طابع ---------- آواز اشاعت گھر

مطبع ---------- عالمین پریس

ایڈیشن ---------- پنجم 1999

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نشاناتِ راہ

مضمون	صفحہ
گذرگاہِ خیال	۲۹
پہلا باب	
عشق نبرد پیشہ طلبگارِ مرد تھا	
۱۔ ارشادِ نبویؐ — جو لوگ زمانۂ جاہلیت میں بہتر تھے وہ حالتِ اسلام میں بھی بہتر تھے۔	۱
۲۔ فریضۂ رسالت محض پیغامِ خداوندی پہنچا دینا نہیں تھا ایک اُمت کی تعمیر کرکے اس پیغام کے مطابق معاشرہ متشکل کرنا بھی تھا	۱
۳۔ اس پیغام کی اوّلین مخاطب قوم۔ عرب۔	۲
ان کی خصوصیات، ابوجہل اور امراء القیس کا جذبۂ تمرّد اور احساسِ برتری۔	۳
۴۔ رسول اللہؐ کی دعا کہ ابوجہل اور عمرؓ میں سے کوئی ایک مشرف بہ اسلام ہوجائے۔	۴
۵۔ ابنِ خطاب کے ذاتی اور خاندانی کوائف۔	۶
آپ نبی اکرمؐ سے دس سال چھوٹے تھے۔	۶
باپ سخت گیر تھا۔ مشقت بھی لیتا تھا اور پیٹتا بھی تھا۔	۷
۶۔ معاشرہ میں مقام۔	..
۷۔ آپ سخت مزاج تو تھے، سنگدل نہیں تھے۔	۸
رقّتِ قلبی کا واقعہ۔	..
دوسرا باب	
خلیلِ عشق دیرم را حرم کرد	
۱۔ قریش کی طرف سے اس جدید تحریک (دین) کی مخالفت، مخالفت کی وجہ یہ کہ یہ ان کے معاشرتی اور معاشی نظام کو جڑ بنیاد سے اکھیڑ دیتا ہے۔	۱۰
۲۔ نوحۂ ابوجہل در حریم کعبہ۔	..
۳۔ ابنِ خطاب کی طرف سے مخالفت اور تشدد۔	۱۱
۴۔ اسلام لانے کا واقعہ۔ عام روایات کے مطابق	۱۲
۵۔ یہ روایات صحیح دکھائی نہیں دیتیں۔	۱۳
اس کی وجہ۔	..
۶۔ صحیح سبب — خود حضرت عمرؓ کی زبانی۔	۱۵
۷۔ سردارانِ قریش میں سے ایک ایک کے ہاں جاکر بتایا کہ میں اسلام لے آیا ہوں۔	۱۸
۸۔ اسلام کی دعوت کے لئے جلوت کا مقام آگیا۔	۱۹
۹۔ کہا جاتا ہے کہ حضرت عمرؓ نے ہجرت بھی اسی طرح علانیہ کی تھی۔	۲۰
۱۰۔ عہدِ رسالت مآبؐ میں حضرت عمرؓ کا مقام اور فضیلت	۲۱
خود حضورؐ کی سند و شہادت۔	..
۱۱۔ اس کے باوجود جذبۂ اطاعتِ رسولؐ اپنی انتہا تک۔	۲۲

مضمون	صفحہ
یہ تربیتِ نبویؐ کا نتیجہ تھا۔	۲۳
۱۲۔ بعض غلط روایات۔	..
یعنی ایسی روایات جن میں کہا جاتا ہے کہ قرآنِ کریم کی فلاں فلاں آیات حضرت عمرؓ کے مشورہ، یا خیال، یا رائے کے مطابق نازل ہوئی تھیں۔	
۱۳۔ یہ اس لئے صحیح نہیں کہ اس سے وحی کے بنیادی تصور پر حرف آتا ہے۔ وحیِ خداوندی کسی انسان کے خیال یا رائے کے تابع نہیں ہوتی تھی۔	۲۵
۱۴۔ قرآنی آیات کے سلسلہ میں "شانِ نزول" کا نظریہ غلط ہے۔	۲۵
۱۵۔ واقعہ قرطاس۔ اس کی تفصیل چوتھے باب میں سامنے لائی جائیگی۔	۲۷
۱۶۔ ایک اور روایت۔ رسول اللہؐ کی وفات پر حضرت عمرؓ کا ردِ عمل ـــــ یہ روایت بھی صحیح نہیں۔	۲۸
اصل بات یوں ہوئی ہوگی۔	۲۹

تیسرا باب

خلافت حفظِ ناموسِ الٰہی است

مضمون	صفحہ
۱۔ مذہب اور دین میں فرق۔	۳۲
مذہب خدا اور بندے کے درمیان پرائیویٹ تعلق کا نام ہے جو یکسر انفرادی اور موضوعی جذبہ ہے۔	
دین، معاشرہ یا مملکت کے نظام کا نام جو انفرادی اور اجتماعی پوری زندگی کو محیط ہوتا ہے۔	۳۲
۲۔ دین میں اصلاً اطاعت خدا کی ہوتی ہے جس کی تعمیل کا عملی ذریعہ اس کی کتاب ہے۔	

مضمون	صفحہ
یہ کتاب (قرآنِ مجید) اسلامی مملکت کا غیر متبدل ضابطہ ہوتی ہے جسے سربراہِ مملکت عملاً نافذ کرتا ہے۔	۳۳
۳۔ "خدا اور رسول" کی اطاعت سے مراد، اس نظام کی اطاعت ہوتا ہے	۳۳
۴۔ رسول اللہ کے بعد یہ نظام، حضورؐ کے جانشینوں نے قائم کیا۔ انہیں خلیفۃ الرسول کہا جاتا ہے اور اس منصب کو خلافت	
۵۔ صحابہ کبارؓ کے مومن حقاً ہونے کی شہادتِ خداوندی۔	۳۴
انکے باہمی تعلقات۔ اخوت، یگانگت اور مودت کے۔	..
۶۔ ہماری کتبِ تاریخ اور احادیث میں ان صحابہؓ کے متعلق کیا کہا گیا ہے۔	۳۵
۷۔ خلافت کے متعلق حضرت علیؓ اور حضرت عباسؓ کی گفتگو۔	..
۸۔ اولین خلیفہ (حضرت ابوبکرؓ) کے انتخاب کا واقعہ۔	
سقیفہ بنی ساعدہ میں انصار و مہاجرین کے مابین کیا ہوا؟ طبریؒ کی تاریخ کی تصریحات۔	۳۶
۹۔ یہ سب روایات وضعی اور تاریخ کے بیانات افسانے ہیں صحابہؓ کی سیرت ان سے منزہ اور بلند تھی۔	۴۷
۱۰۔ خلافت کے متعلق دو ایک اصولی باتیں۔	۴۸
انسان خلیفۃ اللہ نہیں۔	..
حضرت ابوبکرؓ کی تصریح کہ میں خلیفۃ اللہ نہیں، خلیفۃ الرسول ہوں	۴۹
۱۱۔ ڈسپلن کی مثال۔ حضرت عمرؓ (حضرت) اسامہؓ بن زید کے لشکر کے ساتھ بطور سپاہی جا رہے تھے خلیفہ (حضرت ابوبکرؓ) نے حضرت اسامہ سے اجازت لیکر انہیں اپنے پاس رکھا۔	۴۹
۱۲۔ حضرت عمرؓ اور حضرت ابوبکرؓ کے باہمی تعلقات، محبت یگانگت، احترام و تکریم کے باہمی تعلقات۔	۵۰

مضمون	صفحہ
حضرت ابوبکرؓ کا ارشاد کہ خلیفہ درحقیقت عمرؓ ہی ہے۔ انہوں	۵۰
نے قبولِ خلافت سے انکار کر دیا تو میں خلیفہ بن گیا۔ حضرت	..
عمرؓ بطور قاضی (مجسٹریٹ)	..
۱۳۔ حضرت عمرؓ کا انتخاب۔	..
۱۴۔ قرآن نے مشاورت کا اصول دیا ہے' اس کا طریق کار	۵۱
(یعنی مشینری) کا تعین خود ہی نہیں کر دیا۔ اسے اُمت کی	
صوابدید پر چھوڑا ہے۔	
قوانین و دستور کے سلسلہ میں قرآن کا انداز یہی ہے	
غیر متبدل اصولوں کی چار دیواری کے اندر ہر زمانے کی اُمت	
کو جزئیات متعین کرنے کی آزادی۔	
۱۵۔ اس اصول کے مطابق اعیانِ مدینہ نے حضرت عمرؓ کا	
انتخاب کیا۔	
۱۶۔ بیعت کا مفہوم۔ اپنا جان اور مال "خدا کے ہاتھ" بیچ دینا۔	۵۲
یہ معاملہ سربراہِ مملکت کی وساطت سے طے پاتا ہے۔	
۱۷۔ انتخابِ حضرت عمرؓ کی توثیق۔	
۱۸۔ خلافتِ حضرت عمرؓ کا آغاز۔ ۲۳ / جمادی الآخر ۱۳ھ ہجری	۵۴
(۲۲ اگست ۶۳۴ء)	
۱۹۔ پہلا خطبۂ خلافت۔	۵۵
حضرت ابوبکر صدیقؓ کا	۵۵
حضرت عمرؓ کے دو خطبے۔ تین دعائیں اور تمنائیں۔	..
قرآن کے فہم اور اس کے مطابق عمل پیرا ہونے کی دعا	۵۶
حقوق و فرائض کی صراحت۔	۵۸

مضمون	صفحہ
۲۰۔ خلیفہ کے بجائے امیر المومنین کا لقب۔	۵۹
امیر کے معنی۔ نشاناتِ راہ متعین کرنے والے۔ راہ نما	..
۲۱۔ خلافت اور ملوکیت میں فرق	۶۰
ملوکیت یہی نہیں کہ باپ کے بعد بیٹا بادشاہ بن جائے ہر وہ نظامِ حکومت	..
جس میں بعض انسان دوسرے انسانوں کے محکوم ہوں' ملوکیت ہے	
۲۲۔ خلافت کا مفہوم حضرت عمرؓ کے ارشادات کی روشنی میں۔	۶۱

چوتھا باب

حسبنا کتاب اللہ

مضمون	صفحہ
۱۔ واقعہ قرطاس سے متعلق روایت صحیح نہیں۔	۶۳
لیکن اگر حضرت عمرؓ نے کسی وقت "حسبنا کتاب اللہ" فرمایا تھا تو یہ	
قرآن کی تعلیم اور رسول اللہ کے اُسوہ کے عین مطابق تھا۔	۶۴
۲۔ قرآن کریم مکمل' غیر متبدل' محفوظ کتاب ہے۔	۶۶
خدا نے خود کہا ہے کہ یہ تمہارے لئے کافی ہے۔	
رسول اللہ نے بھی یہی فرمایا کہ میں تمہارے لئے کتاب اللہ چھوڑ چلا ہوں	
۳۔ صحابہؓ بھی اپنے "اہل قرآن" ہونے پر فخر کرتے تھے۔	۶۶
۴۔ عمل بالقرآن کے لئے حضرت عمرؓ کی تاکید	۶۷
۵۔ عمالِ حکومت کے انتخاب کا اوّلین معیار یہ تھا کہ وہ	
قرآن پر کس قدر عبور رکھتے ہیں۔	
۶۔ قاری سے مراد قرآن کو سمجھنے والا تھا' نہ صرف پڑھنے والا۔	۶۸
۷۔ "واللہ اعلم" مت کہو۔ جو بات نہیں جانتے' سیدھے طور	..
پر کہو کہ میں نہیں جانتا۔	
۸۔ قرآن کی آیت سن کر غصہ اتر جاتا تھا۔	۶۹

مضمون	صفحہ
۹۔ استنباطِ نتائج اور جزئی قوانین کی ترتیب، قرآنی اصولوں کی روشنی میں کرتے تھے۔	
عراق کی مزروعہ اراضی کی تقسیم کا معاملہ۔	۷۰
۱۰۔ مسئلہ تقدیر کا حل ... میں خدا کی تقدیر کی طرف سے خدا ہی کی تقدیر کی طرف جا رہا ہوں۔	۷۱
۱۱۔ خدا، انسانوں کو رزق، انسانوں ہی کے ہاتھوں سے دیتا ہے	۷۲
۱۲۔ متوکل وہ ہے جو زمین میں دانہ ڈالتا ہے اور پھر قانونِ خداوندی پر بھروسہ کرتا ہے۔	
۱۳۔ خدا کی کتاب کو مرکز اور محور بناؤ۔ علماء و مشائخ کو سند و حجت تسلیم نہ کرو۔	۷۳
۱۴۔ قوموں کی موت و حیات کے فیصلے، قرآنی اقدار کی رُو سے ہوتے ہیں۔	۷۴
۱۵۔ آپ کی وصیت۔ کتاب اللہ کو تھامے رہو۔ اس طرح تم گمراہ نہیں ہوگے۔	۷۴
۱۶۔ حضرت ابن عباسؓ کی شہادت کہ آپ فیصلے کتاب اللہ کے مطابق کرتے تھے اور سب کے حصے برابر تقسیم کرتے تھے۔	۷۵
۱۷۔ چھوٹی چھوٹی باتوں میں زیادہ کاوش نہیں کرتے تھے۔ اگر ایک لفظ کے معانی معلوم نہیں ہو سکے تو اس میں تردد اور اضطراب کی کون سی بات ہے؟	
۱۸۔ محض لا الٰہ کہہ دینے سے جنت نہیں مل سکتی۔ جنت عمل سے ملتی ہے۔	۷۵
۱۹۔ دوسرا عظیم واقعہ ـــ قرآن شخصیت پرستی کو مٹانے کے لئے آیا تھا خواہ اس کی شکل کوئی بھی کیوں نہ ہو۔	۷۶
قرآن کریم کی تعلیم اور حضورؐ کی عملی زندگی نے شخصیت پرستی کے تصور تک کو مٹا دیا۔	
۲۰۔ "شجرِ رضوان" کے تلے لوگ آ کر نماز پڑھنے لگ گئے آپ نے اس درخت کو کٹوا دیا۔	۷۷
۲۱۔ جس مسجد میں حضورؐ نے ایک دفعہ نماز پڑھی تھی لوگ دُور دور سے آ کر اس مسجد میں نماز پڑھتے تھے۔ آپ نے اس سے بھی روک دیا۔	۸۱
۲۲۔ ایک قبر کو لوگ دانیال نبی کی قبر کہہ کر اس کی تعظیم کرتے تھے۔ آپؓ نے اس قبر کو چھپا دیا۔	۸۱
۲۳۔ حجرِ اسود کے متعلق کہا کہ وہ صرف ایک پتھر ہے نہ کسی کو نفع پہنچا سکتا ہے نہ نقصان۔	۸۲
شعائر اللہ کی تعظیم کا قرآنی مفہوم۔	۸۳
۲۴۔ جمع و تدوینِ احادیث کے متعلق حضرت عمرؓ (اور صحابہؓ) کا مسلک ـ انہوں نے اسے سختی سے روک دیا تھا۔	۸۷
۲۵۔ جمعِ قرآن کے سلسلہ میں وضعی روایات۔	۹۱
۲۶۔ حضرت عمرؓ اور تفقہ فی القرآن۔	۹۴
۲۷۔ آپ انہی معاملات پر غور و فکر کرتے تھے جو درحقیقت پیش آتے تھے۔ یونہی فرضی مسائل یا "اندیشہ ہائے افلاکی" کے متعلق بحث و تمحیص سے سختی سے روکتے تھے۔	۹۵
۲۸۔ حضرت عمرؓ کے فقہی فیصلے اور ان فیصلوں کے دور رس مستقل نتائج۔ چند مثالیں۔	۹۵

مضمون	صفحہ
i. اہلِ کتاب کی عورتوں سے شادی کی اجازت معطل کر دی۔	
ii. زنا بالجبر میں عورت کو سزا نہیں دی جائے گی۔	۹۶
iii. قاتل مقتول کا وارث نہیں ہو سکتا۔	
iv. عدالت سے معافی کے بعد جرم کا دھبہ مٹ جاتا ہے۔ اور اس کے اثرات و عواقب باقی نہیں رہتے۔	
v. حلالہ کرنیوالے اور کرانیوالے کو سزا دی جائے گی۔	
vi. قانون کا علم نہ ہونے کی صورتمیں مجرم کو سزا نہیں دی جائے گی۔	۹۷
پانچواں باب	
زندگی جہد و استحقاقِ زیست	
۱۔ حرکت و عمل۔ جدوجہد، خود زندگی کا تقاضا ہے۔ اس میں انسان اور حیوان سب شامل ہیں۔	۹۸
۲۔ کائنات میں خیر و شر، تعمیری اور تخریبی قوتوں کا باہمی تصادم ہوتا رہتا ہے اس تصادم کی آخری جولانگاہ 'میدانِ کارزار ہوتا ہے۔	
۳۔ اس آخری ٹکراؤ کو قتال کہا جاتا ہے اور بعض اوقات اس کے لئے جہاد کا لفظ بھی بولا جاتا ہے۔	۹۹
۴۔ مومن کی زندگی جہادِ مسلسل کی زندگی ہے جس کی آخری کڑی قتال ہوتا ہے۔	
۵۔ ہجرت اور جہاد کے متعلق تفصیلی گفتگو۔ یہ کیوں کن حالات میں اور کن شرائط کے ماتحت قتال فی سبیل اللہ بنتا ہے۔	۱۰۰
۶۔ حضرت عمرؓ کی ساری زندگی جہدِ مسلسل کی زندگی تھی۔	
۷۔ خلافتِ فاروقی جہادِ مسلسل کی برق آسا داستان ہے۔	۱۲۵
۸۔ حضرت عمرؓ جنگ کی جزئیات تک خود مرتب کرتے تھے۔	۱۲۵

مضمون	صفحہ
۹۔ آپ خود میدانِ جنگ میں کیوں نہ گئے؟ اس کی وجہ۔	۱۲۶
۱۰۔ جنگ کے سلسلہ میں ہدایات۔	۱۲۷
۱۱۔ سب سے زیادہ زور "نیتوں کی اصلاح" پر دیا جاتا تھا۔ اس کا مفہوم کیا تھا؟ ایک محیّر العقول واقعہ۔	۱۲۹
۱۲۔ جنگ میں کامیابی کا راز سیرت کی پاکیزگی اور اخلاق کی بلندی ہے۔ اس باب میں اپنا موازنہ دشمن کے ساتھ کرتے رہو۔	۱۳۰
۱۳۔ اگر تم یہ جاننا چاہتے ہو کہ خدا کے ہاں تمہارا مقام کیا ہے تو یہ دیکھو کہ مخلوقِ خدا تمہیں کیسا سمجھتی ہے۔	۱۳۰
۱۴۔ تم اپنی رعایا (ماتحتوں) کے لئے ایسے بن جاؤ جیسے اگر تم رعایا (ماتحت) ہو تو اپنے افسر کو دیکھنا چاہو۔	
۱۵۔ جب حاکم بگڑ جاتا ہے تو رعایا بھی بگڑ جاتی ہے۔	
۱۶۔ اسلامی لشکر میں سپاہیوں اور کمانڈروں کے تعلقات	۱۳۱
حضرت ابو عبیدہؓ نے اپنے سپاہیوں کو چھوڑ کر محفوظ مقام پر جانے سے انکار کر دیا۔	
اور ان کھانوں سے بھی ہاتھ کھینچ لیا جو ضیافت میں صرف ان کے لئے تیار کئے گئے تھے تمام اہلِ لشکر کیلئے نہیں۔	۱۳۱
۱۷۔ غیر مسلم رعایا کے ساتھ حسنِ سلوک۔	
حمص کے ذمیوں سے وصول کردہ جزیہ واپس دے دیا۔	۱۳۲
جزیہ کے متعلق مختصر سا اشارہ۔	
۱۸۔ اسلام ان کے حسنِ سیرت کی بدولت پھیلا تھا۔	
۱۹۔ لشکریانِ اسلام کے متعلق مقوقس کے ایلچیوں کا تبصرہ۔	۱۳۳

مضمون	صفحہ
۲۰۔ ایران کے گورنر (ہرمزان) کا تبصرہ۔ جب وہ قید ہو کر آیا تھا۔ پہلے عرب تنہا ہوتے تھے اس لئے ہم ان پر غالب آجاتے تھے۔ اب ان کے ساتھ خدا بھی ہوتا ہے۔ ہم ان دو کا مقابلہ نہیں کرسکتے۔	۱۳۴
۲۱۔ حضرت عمرؓ نے تاکید کردی تھی کہ مسلمان سپاہی غیر مسلموں (اہل ایران) سے خلا ملا پیدا نہ کریں۔	۱۳۵
۲۲۔ میدان جنگ کے حالات معلوم کرنے کا جذبۂ بے اختیار شوق حضرت عمرؓ قادسیہ سے آنے والے سانڈنی سوار قاصد کے ساتھ دوڑتے آئے اور حالات سنتے رہے۔	۱۳۵
۲۳۔ آپ نماز کی حالت میں بھی لشکروں کے متعلق سوچا کرتے تھے ـــ نماز میں ایسے خیالات کا دل میں پیدا ہونا کوئی معیوب بات نہیں۔ نماز میں ایسی کیفیت خود رسول اللہؐ کی بھی ہوتی تھی۔	۱۳۶
۲۴۔ شہادت کا مرتبہ ـــ اپنے بھائی کی شہادت پر غمزدگی کا عالم ـــ اور ایک شاعرہ کے ایک فقرہ سے سکونِ قلب۔	۱۳۹
۲۵۔ مساواتِ اسلامیہ۔ قبائلی افتخار اور حسب و نسب کی نسبتوں کو مٹا دیا۔	۱۴۰
کسی جنگ میں دو سپاہیوں میں باہمی تکرار ہو گئی۔ انہوں نے اپنے اپنے قبیلہ کو مدد کے لئے پکارا۔ اس پر حضرت عمرؓ نے ان کی سخت سرزنش کی۔	۱۴۱
حضرت سعدؓ بن ابی وقاص کو سخت انتباہی مراسلہ	

مضمون	صفحہ
۲۶۔ میدان جنگ میں گئے ہوئے "سپاہیوں کے بچوں کا باپ عمرؓ ہے۔" سپاہیوں کے گھروالوں کے کام کاج خود جا کر کرتے۔ عام حکم دے دیا کہ ایک خاص وقفہ کے بعد ہر سپاہی کو گھر آنے کی رخصت دی جایا کرے۔	۱۴۲
۲۷۔ شکست خوردہ سپاہیوں کی حوصلہ افزائی۔ کس طرح کی حوصلہ افزائی۔ شہادت کے متعلق ایمان کہ اس سے حیاتِ جاوداں حاصل ہوتی ہے اور یہ اطمینان کہ میرے بعد میرے بیوی بچے لاوارث نہیں رہ جائیں گے۔ مومن سپاہیوں کو شیروں کا مقابلہ کرنے کے قابل بنا دیتا تھا۔	۱۴۲
چھٹا باب	
عالم ہے فقط مومنِ جانباز کی میراث	
۱۔ مستشرقین کا اعتراض کہ رسول اللہؐ نے مکہ میں درویشانہ زندگی بسر کی اور مدینہ آکر مملکت قائم کرلی۔	۱۴۴
۲۔ ہمارے ہاں کے جواب دینے والوں کا معذرت خواہانہ انداز۔	۱۴۴
۳۔ عیسائیت میں قانون کا تصور ہی نہیں۔ مملکت کا تصور کیسے ہوسکتا ہے؟	۱۴۵
۴۔ اسلام مذہب نہیں 'دین' ہے اور دین کا قیام اپنی آزاد مملکت کے بغیر ہو نہیں سکتا۔ قرآنی تصریحات۔	۱۴۶
۵۔ مکی زندگی قیام مملکت کے پروگرام کی پہلی کڑی تھی۔ اس زندگی میں مملکت کے متعلق حضورؐ کے ارشادات۔	۱۴۷
۶۔ یہ مملکت کسی دوسرے کی مملکت چھین کر قائم نہیں کی گئی تھی۔ "جوع الارض" اسلام میں جائز نہیں۔	۱۴۹

مضمون	صفحہ
۷۔ "اسلام بزورِ شمشیر پھیلایا گیا" اس اعتراض کا جواب۔	۱۵۰
خود حضرت عمرؓ کا (آزاد کردہ) غلام وثیق، ساری عمر عیسائی رہا۔	
مصر کے قیدیوں کو اجازت کہ چاہے اسلام قبول کر لیں چاہے عیسائی رہیں۔	
۸۔ دوسرا اعتراض ۔ مفتوح علاقہ کے باشندوں کو غلام اور لونڈیاں بنا لیا جاتا تھا ۔ اس کا جواب۔	۱۵۴
۹۔ تیسرا اعتراض ۔ جزیہ اور ذمی ۔ اس کا جواب۔	۱۵۸
مفتوح قوموں کے ساتھ معاہدات کی دو ایک مثالیں۔	۱۶۰
نجران کے عیسائیوں کے ساتھ رسول اللہؐ کا معاہدہ اور اہلِ بیت المقدس (ایلیاء) کے ساتھ حضرت عمرؓ کا معاہدہ۔	
۱۰۔ معاہدات کی پابندی کی محیر العقول مثالیں۔	۱۶۲
اہل الذمہ کے گاؤں کے باہر درختوں کے سائے تلے بیٹھتے تو انکو بھی معاوضہ دے دیتے۔	
انہیں اس کے رسوم و رواج اور شخصی قوانین کی آزادی تھی حتیٰ کہ وہاں کی دفاتری زبان تک بحال رکھی جاتی تھی۔	۱۶۳
۱۱۔ بعد میں کیا ہوا۔ اس کا ذمہ دار اسلام نہیں۔	
۱۲۔ سلسلۂ فتوحات۔	۱۶۴
۱۳۔ ایرانی اور بازنطینی سلطنتیں۔	۱۶۵
ان ممالک کی حالت۔	
۱۴۔ نبی اکرمؐ کے عہدِ ہمایوں میں بازنطینی سلطنت کیساتھ ٹکراؤ۔ جنگ موتہ (۸ھ)	۱۶۶
تبوک کی طرف مہم ۔ بغیر جنگ کے واپسی۔	۱۶۷

مضمون	صفحہ
بازنطینیوں کی روک تھام کے لیے لشکر کی تیاری۔	
حضورؐ کی وفات۔	
۱۵۔ عہدِ صدیقیؓ ۔ مذکورہ بالا لشکر کی (حضرت اسامہ بن زیدؓ کی زیرِ سرکردگی) روانگی۔ سرحدی معاہدات۔	۱۶۸
اندرونِ عرب قبائل کی بغاوت ۔ مانعینِ زکوٰۃ یا مرتدین سے مراد۔ زکوٰۃ کا مفہوم۔	
۱۶۔ سرحدِ عراق پر خطرات۔ ایرانی حکومت کی طرف سے اس علاقہ کے کاشتکاروں اور محنت کشوں پر مظالم۔	
حضرت مثنیٰ بن حارث دربارِ خلافت میں۔	
۱۷۔ ایرانیوں کے خلاف سب سے پہلا معرکہ۔ حیرہ کی فتح اور وہاں کے حاکم، ہرمز کا قتل۔	۱۷۰
۱۸۔ دوسری طرف رومیوں کی یورش کا خطرہ۔	۱۷۱
یرموک کا معرکہ اور نمایاں کامیابی۔	
دمشق کی فتح ۔ ایک طرف سے حضرت خالد بن ولیدؓ بطور فاتح داخل ہوئے اور دوسری طرف، رومی سپہ سالار نے حضرت ابو عبیدہؓ سے صلح کر لی۔ اس صلح کو سارے لشکر پر واجب قرار دیا گیا۔	۱۷۱
حضرت ابوبکرؓ کی وفات	
۱۹۔ عہدِ فاروقیؓ ۔ (جمادی الاخریٰ ۱۳ھ / ۶۳۴ء)	۱۷۲
۲۰۔ حضرت مثنیٰ بارِ دیگر بارگہِ خلافت میں۔	
۲۱۔ سلطنتِ ایران کے حکمران ۔ خسرو پرویز سے لے کر یزدگرد تک جو حضرت عمرؓ کا ہمعصر تھا۔	

مضمون	صفحہ
۲۲۔ ایرانیوں کے ساتھ ٹکراؤ اور اسلامی لشکر کی فتح۔	۱۷۳
۲۳۔ ایرانی سپہ سالار جابان کی گرفتاری۔ اسے ایک مسلمان سپاہی نے (ان جانے) امان دیدی تو یہ امان تمام لشکر پر واجب قرار پا گئی۔	
۲۴۔ معرکہ جسر (پل) میں مسلمانوں کو شکست۔	۱۷۴
حضرت ابو عبیدہؓ ثقفی کی شہادت۔	
۲۵۔ حضرت مثنّٰی کے ساتھ مقابلہ۔ ایرانیوں کی شکستِ فاش مثنّٰی کی وفات	۱۷۵
حضرت سعد بن ابی وقاصؓ بطور سپہ سالار۔	
۲۶۔ یزدگرد کے دربار میں اسلامی لشکر کے سفیر۔	۱۷۶
مٹی کے ٹوکرے کا تحفہ لے کر شاداں وفرحاں لوٹ آئے۔	۱۷۷
۲۷۔ رستم کے دربار میں اسلامی لشکر کا سفیر۔	۱۷۸
۲۸۔ معرکہ قادسیہ۔ رستم مارا گیا۔ حضرت سعدؓ بن ابی وقاص کے لشکر کو عظیم الشان فتح حاصل ہوئی۔	۱۷۹
تاریخِ عالم ایک عظیم موڑ مڑ گئی۔	
۲۹۔ ابو محجن ثقفی گوشۂ زنداں سے میدانِ کارزار میں۔	۱۷۹
۳۰۔ ایرانی لشکر کا تعاقب۔ "بحرِ ظلمات میں دوڑا دیئے گھوڑے ہم نے"۔	
۳۱۔ لیجئے! ایران کا دارالسلطنت مدائن بھی فتح ہو گیا، اور اس کے ساتھ ہی ایران کی مملکت کا خاتمہ ہو گیا۔	۱۸۲
۳۲۔ شاہنشاہِ ایران کا قصرِ ابیض اور اس کا سامان و یراق۔	۱۸۲
اس میں نادر مجسمات بھی تھے۔ مسلمانوں نے انہیں	

مضمون	صفحہ
اسی طرح صحیح و سلامت رہنے دیا۔	
۳۳۔ سپاہیوں میں سے کسی نے اس مالِ غنیمت میں سے ایک سوئی تک کو نہیں چھوا تھا۔	۱۸۳
حضرت عمرؓ کا اس پر اظہارِ تعجب اور حضرت علیؓ کا ارشاد کہ آپ کی سپاہ اس قدر دیانتدار اس لئے ہے کہ آپ خود اس قدر دیانتدار ہیں۔	
۳۴۔ نہاوند کا معرکہ اور مسلمانوں کی کامیابی۔ ایران کے دیگر صوبے بھی یکے بعد دیگرے فتح ہوتے چلے گئے۔	۱۸۴
۳۵۔ یزدگرد کا انجام۔ ایک پن چکی میں پوشیدگی کی حالت میں قتل۔	۱۸۵
۳۶۔ ایران کے گورنر ہرمزان کے ساتھ مقابلہ۔	۱۸۶
ہرمزان گرفتار ہو کر مدینہ پہنچا۔	
فریب دہی سے جان بچانے کا ڈرامہ۔	
یہ واقعہ منطقی طور پر ناقابلِ فہم ہے۔	
۳۷۔ ہرمزان زندہ رہا، مدینہ میں رہا۔ اور آخر الامر اس نے اپنا انتقام لے لیا۔ حضرت عمرؓ کی شہادت اسی کی سازش کا نتیجہ تھا۔	۱۸۸
۳۸۔ یہ قصہ کہ یزدگرد کی تین بیٹیاں قید ہو کر آئیں اور لونڈیاں بنالی گئی تھیں۔ ان میں سے ایک حضرت امام حسینؓ کی زوجہ محترمہ شہر بانو تھیں۔	۱۸۹
یہ قصہ بوجوہ ناقابلِ تسلیم ہے۔	
۳۹۔ معجزات ـــ مخالفین نبی اکرمؐ سے معجزات طلب کرتے	۱۹۰

مضمون	صفحہ
تھے۔ حضورؐ نے قرآن اور اپنی زندگی کو بطور معجزہ پیش کیا۔	
۴۰۔ صحابہ کبارؓ نے بھی نہ کشف و کرامات کا دعویٰ کیا نہ روحانیت اور سلوک کی منازل کا ذکر۔	191
ان کی "روحانیت" ان کی پاکیزہ زندگی اور ان کی کرامات ان کی فتوحات تھیں۔	
۴۱۔ جب مسلمانوں میں تصوف در آیا تو انہیں اپنی کرامات کے لیے سندوں کی تلاش ہوئی۔	194
ایک کرامت حضرت عمرؓ کی طرف بھی منسوب کردی۔	
"یا ساریہ الی الجبل"۔ یہ روایت بھی وضعی ہے۔	
۴۲۔ "عروس نیل" کا افسانہ۔	
۴۳۔ رومیوں کے ساتھ تصادمات کا سلسلہ۔	195
چھوٹی چھوٹی معرکہ آرائیوں اور کامرانیوں کے بعد حمص اور انطاکیہ کے معرکے۔	
۴۴۔ مسلمان افواج کی کامیابی کا راز، ایک عیسائی سیاستدان کی زبانی۔	197
یہ ان کا حسن اخلاق اور پاکیزگی سیرت تھی۔	
۴۵۔ شام کی مکمل فتح، ہرقل کا قسطنطنیہ کی طرف فرار۔	198
۴۶۔ فتح بیت المقدس۔	199
۴۷۔ حضرت عمرؓ کا سفر بیت المقدس۔	199
اس "سکندرانہ جلوس" کے قلندرانہ مناظر!	
بیت المقدس کی زیارت گاہوں کی سیر۔	

مضمون	صفحہ
کلیسا میں نماز ادا کرنے سے انکار کہ ممکن ہے بعد میں مسلمان اسے مسجد بنالیں۔	
۴۸۔ ایک ضمنی گوشہ۔ کعب احبار کی یہودیت کی غمازی۔	۲۰۳
حضرت عمرؓ کی سرزنش۔ نومسلم اقوام کس طرح اپنے سابقہ معتقدات کو ساتھ لے کر آئیں اور انہیں عین اسلام بنادیا	
اسلام کی تاریخ مرتب کرنے کی ضرورت۔	
۴۹۔ قبۃ الصخرہ اور مسجد اقصیٰ کی تعمیر اور تاریخ۔	۲۰۶
۵۰۔ "مسجد اقصیٰ" کا ذکر قرآن کریم میں۔ تفاسیر اس کے متعلق کیا کہتی ہیں۔ شب معراج کا ذکر وضعی روایات	۲۰۶
سورۃ بنی اسرائیل میں حضورؐ کی ہجرت کا بیان ہے۔	
اور "مسجد اقصیٰ" سے مراد مدینہ ہے نہ کہ بیت المقدس کی کوئی مسجد۔	
۵۱۔ فتح بیت المقدس کا جشن۔ حضرت بلالؓ کی اذان۔	۲۰۹
رسول اللہ کی جنت آفریں صحبتوں کی یاد۔ ہر آنکھ اشکبار ہر قلب خونفشاں۔	
۵۲۔ حمص پر عیسائیوں کی یورش اور شکست۔	۲۱۰
۵۳۔ مسلمانوں کا جندی سابور پر حملہ۔ ایک (مسلمان) غلام نے انہیں امان کا وعدہ دے دیا اور اس وعدہ کو سارے مسلمانوں نے تسلیم کرلیا۔	۲۱۱
۵۴۔ فتح مصر۔	۲۱۱
حضرت عمروؓ ابن عاص کی تجویز اور دلائل۔	
۵۵۔ اسلامی سپاہ کے متعلق مقوقس کے تاثرات۔	۲۱۳

مضمون	صفحہ
٥٦۔ مصر کا دارالخلافہ، اسکندریہ، فتح ہو گیا۔	٢١٤
٥٧۔ نویدِ فتح لے کر قاصد مدینے پہنچا۔	٢١٤
وہاں اُس نے امیر المومنین کے ساتھ کھانا کھایا۔ کھانے میں کیا تھا؟	
٥٨۔ حضرت عمرؓ کا ارشاد کہ میں سو کیسے سکتا ہوں؛	٢١٥
٥٩۔ شہر فسطاط کی تعمیر۔ اس کی ضرورت کیوں لاحق ہوئی؟	٢١٥
٦٠۔ حضرت عمرو بن عاصؓ نے اپنے لئے بلند منبر بنوایا تو حضرت عمرؓ نے اسے تڑوا دیا۔	٢١٥
حاکم کو رعایا سے اونچا نہیں بیٹھنا چاہیئے۔	
٦١۔ انہوں نے حضرت عمرؓ کے لئے ایک مکان وہاں بنوایا تو آپ نے لکھا کہ اس مکان کو رفاہِ عامہ کے لئے وقف کر دو۔ حجاز میں رہنے والے کا مصر میں کیسے مکان ہو سکتا ہے؟	٢١٥
٦٢۔ اسکندریہ کی لائبریری جلانے کا افسانہ۔	٢١٦
٦٣۔ ان فتوحات کی انسانیت سازی پر غیروں کا خراجِ تحسین۔	٢١٧
٦٤۔ حضرت خالد بن ولیدؓ کی معزولی کا واقعہ۔	٢١٩
جسے اس قدر اہمیت دی جاتی ہے۔	
تاریخ اس واقعہ کے متعلق کیا کہتی ہے۔	
اس پر قرآن کریم اور سیرت حضرت عمرؓ کی روشنی میں تبصرہ۔	
٦٥۔ ہمیں اس قسم کے محاکمہ میں الجھنے کی ضرورت ہی نہیں۔	٢٢٦
یہ قرآن کا فیصلہ ہے۔	
ساتواں باب	
آئینِ جہانداری	٢٢٨
١۔ عربوں جیسی ناتجربہ کار قوم کے لئے ایسی وسیع و عریض	٢٢٨
مملکت کا نظم و نسق آسان کام نہیں تھا۔	
٢۔ اس مملکت کے نظم و نسق کے بنیادی خط و خال۔ مسجد اس کا مرکز، اور دارالشوریٰ تھی۔	٢٣٠
٣۔ مملکت صوبوں اور کمشنریوں میں منقسم تھی۔ والی صوبوں کے گورنر تھے۔	٢٣٢
٤۔ حج کے اجتماع میں تمام والیانِ مملکت شریک ہوتے تھے۔ اس میں مملکت کے اہم معاملات بھی طے ہوتے تھے اور عوام کی مشکلات کا ازالہ بھی ہوتا تھا۔	//
٥۔ احوالِ مملکت سے باخبر رہنے کے لئے وقائع نویس مقرر کئے۔ شعبۂ محاصل۔	
خلافت کے معنی یہ ہیں کہ یہ بتایا جائے کہ کہاں سے لیا تھا اور کیسے دیا تھا۔	٢٣٢
٧۔ اراضیات کا انتظام۔	//
٨۔ آبپاشی اور آب نوشی کے لئے نہریں کھدوائی گئیں۔	٢٣٣
نہر سویز کی تجویز۔ اسے سیاسی مصالح کی بنا پر عمل میں نہ لایا گیا۔	//
٩۔ نئے نئے شہر بسائے گئے۔	٢٣٤
تین کمروں سے زائد پر مشتمل مکان بنانے کی اجازت نہیں تھی۔	
١٠۔ سڑکوں کی تعمیر۔	٢٣٤
١١۔ مساجد کی تعمیر۔ یہ ملت کی اجتماعی زندگی کے مراکز تھے۔	//
مسجد نبویؐ اور حرم کعبہ کی توسیع۔	
١٢۔ بیت المال، خزانہ کی عمارت بڑی مستحکم بنوائی جاتی تھی۔	//

مضمون	صفحہ
۱۳۔ عسکری نظام۔ ہر مومن سپاہی (مجاہد) تھا۔	۲۳۵
۱۴۔ اس دوران میں اندرونِ ملک بھی کوئی فساد نہیں برپا ہوا تھا۔ کوئی بغاوت نہیں اُبھری حالانکہ حکومت کے پاس کوئی "سٹینڈنگ آرمی" نہیں تھی۔	۲۳۶
۱۵۔ جیوشِ اسلامیہ کے سپاہی، اسلام کے مبلغ بھی تھے۔	//
یہ تبلیغ، ان کی حسنِ سیرت اور بلندیٔ کردار کے ذریعے ہوتی تھی۔	
۱۶۔ قرآنِ کریم کی نشر و اشاعت اور تعلیم و تعلّم کے خصوصی انتظامات۔	//
۱۷۔ سنِ ہجری کا تعین۔	۲۳۷
۱۸۔ امورِ مملکت سے متعلق، سب کام تحریری ہوتا تھا۔	۲۳۸
اس کے لئے سکرٹریٹ قائم کیا گیا۔	
۱۹۔ ایک نہائیت اہم سوال جو دل میں ابھرتا ہے ــ یہ تمام ریکارڈ کہاں چلا گیا۔ اس کا ایک پرزہ تک بھی کہیں نہیں ملتا۔	//
۲۰۔ ہمارے ہاں اوریجنل ریکارڈ کہیں بھی نہیں۔	//
صرف قرآنِ کریم محفوظ و غیر محرف ہے اور بس یہی دین میں سند و حجت ہے اور صدرِ اوّل کی تاریخ کی صحت کا معیار۔	
۲۱۔ نظامِ عدل۔	۲۳۹
عدل کی اہمیت قرآنِ کریم کی رُو سے۔	
۲۲۔ عدل سے مراد کیا ہے؟	۲۴۲
قانون کے مطابق فیصلہ۔	
لیکن اگر قانون ہی مبنی بر عدل نہ ہو تو پھر......	
قانون وہی مبنی بر عدل ہوگا جو وحیِ خداوندی کے مطابق ہو۔	

مضمون	صفحہ
۲۳۔ حضرت عمرؓ قضاۃ (ججوں) کو خود ہدایات بھیجتے رہتے تھے کیونکہ فنِ فقہ پر آپ کی نگاہ بڑی وسیع و عمیق تھی۔	۲۴۳
۲۴۔ ان ہدایات کا ملخص۔	۲۴۴
یہ ہدایات گویا نظامِ عدل کے ستون ہیں۔	
۲۵۔ ثقہ اور قابلِ اعتماد وہ ہے جو باہمی معاملات میں کھرا ثابت ہو، نہ کہ وہ جو نمازیں بہت پڑھتا ہو۔	۲۴۵
۲۶۔ حضرت عمرؓ کے فیصلے۔	۲۴۶
بھوک سے مجبور ہو کر چوری کرنے والے کو سزا نہیں دی جا سکتی۔ سزا اسے دی جائے گی جس نے اسے بھوکا رکھا تھا۔	
(حاطب ابن بلتعہ کے غلاموں کا واقعہ)	
۲۷۔ جبلہ ابن ایہم کا واقعہ ــ سزا سے کوئی نہیں بچ سکتا۔	۲۴۷
اس واقعہ کے ضمن میں دو ایک بصیرت افروز نتائج	//
۲۸۔ خود اپنے بیٹے ــ عبدالرحمٰن ــ کا واقعہ۔	۲۴۹
۲۹۔ ایک دلکشا واقعہ ــ "مجھے اپنا دوست نہ بنائیے۔ میں اس سے جائز مراعات سے بھی محروم ہو جاؤں گا"۔	۲۵۰
۳۰۔ حضرت عمروؓ ابنِ عاصؓ کے بیٹے کا واقعہ۔	۲۵۱
احترامِ آدمیت کا درخشاں اصول ــ لوگوں کو ان کی ماؤں نے آزاد جنا تھا۔ تم نے انہیں غلام کیوں بنا لیا!	
۳۱۔ خود حضرت عمرؓ کے خلاف حضرت شریح کا فیصلہ۔	۲۵۲
۳۲۔ حضرت عمرؓ بہ حیثیت مدعا علیہ حضرت زیدؓ کی عدالت میں۔	//
۳۳۔ حضرت علیؓ بہ حیثیت مدعا علیہ، حضرت عمرؓ کی عدالت میں۔	//

مضمون	صفحہ
مساواتِ انسانیہ کا نہایت لطیف اور عمیق مظاہرہ۔	
آٹھواں باب	
حوادثِ آفاق	
۱۔ طبعی کائنات میں رونما ہونے والے حوادث پر انسان قابو پاسکتا ہے کیونکہ اشیائے فطرت کا علم دیا گیا ہے۔	۲۵۴
لیکن ان پر اسی حد تک قابو پایا جاسکتا ہے جس حد تک انسان نے قوانینِ فطرت کا علم حاصل کر لیا ہے۔	
۲۔ آج سے چودہ سو سال پہلے علمِ انسانی کی حالت۔	۲۵۵
۳۔ عہدِ فاروقیؓ میں عمواس (علاقہ شام) کا طاعون	//
فاروقِ اعظمؓ کا خدا کی ایک تقدیر سے اُسی کی دوسری تقدیر کی طرف چلے جانا اور محفوظ رہنا۔	
حضرت ابوعبیدہؓ کا اپنے سپاہیوں کا ساتھ نہ چھوڑنا اور طاعون کی نذر ہو جانا۔	
۴۔ عرب میں شدید قحط ـــــ اس کی تباہ کاریوں پر غلبہ پانے	۲۵۶
کے لیے حسنِ تدابیر۔	۲۵۷
۵۔ خود حضرت عمرؓ کا قحط زدگان کی صف میں بیٹھنا اور جو کچھ انہیں میسر آئے وہی کچھ خود کھانا۔	۲۵۸
اس سے آپ کی صحت پر سخت مضر اثر پڑا۔	
آپ کا ارشاد کہ جب تک مجھ پر بھی وہی کچھ نہ گزرے جو عوام پر گزرتی ہے، مجھے ان کی تکلیف کا احساس کیسے ہو سکتا ہے۔	//
امیرالمومنین کے پوتوں اور پوتیوں کو بھی وہی کچھ ملے گا جو دوسرے بچوں کو ملتا ہے، خواہ اس کا اثر کچھ ہی کیوں نہ ہو۔	
۶۔ ایک وضعی روایت کہ حضرت عمرؓ نے نمازِ استسقاء میں حضرت عباسؓ کا واسطہ دیکر خدا سے بارش کی دعا مانگی تھی۔	۲۶۰
۷۔ یہ روایت بھی ہمارے ہاں موجود ہے کہ حضورؐ نے فرمایا کہ جس دل میں عباسؓ کی محبت نہیں ہوگی اس دل میں ایمان نہیں آسکتا۔	۲۶۱
یہ سب عباسی دور کی کرشمہ زائیاں ہیں۔	
نواں باب	
سیاسی نظام	
۱۔ اسلام کے سیاسی نظام کا اصل الاصول۔	۲۶۲
حکومت صرف کتابِ خداوندی (قرآن) کی ہوگی۔	
۲۔ قرآنی اصولوں کی چاردیواری کے اندر رہتے ہوئے جزئیات کا تعین اُمت کے باہمی مشورہ سے ہوگا۔	۲۶۳
یہ فیصلے مرکز کی طرف سے قوانین کی شکل میں نافذ ہوں گے۔ انہی کو شریعت کہا جائے گا۔	
۳۔ اسی لئے اپنی آزاد مملکت کے بغیر اسلام پر عمل پیرا ہونا ممکن نہیں۔	۲۶۴
۴۔ جن امور میں کتاب اللہ خاموش ہے ان میں کرید مت کرو۔ وہ خاموش اس لئے ہے کہ ان امور کا تعلق دین سے نہیں۔ دین سب کا سب کتاب اللہ کے اندر آگیا ہے۔	۲۶۷
۵۔ قرآن کریم کے صریح احکام کی شرائط و تضمنات بھی اسلامی حکومت مقرر کرے گی۔	//

مضمون	صفحہ
٦۔ اسلامی نظامِ حکومت کی اطاعت ہی "اطاعت خدا اور رسول" ہے	۲۶۸
٧۔ قرآنی اصول غیر متبدل رہتے ہیں اور حکومت کی متعین کردہ جزئیات بدلی جا سکتی ہیں۔	۲۶۹
٨۔ امامِ اعظمؒ کا مسلک۔	//
٩۔ نیز، امام ابن قیمؒ کا۔	۲۷۰
١٠۔ علامہ اقبالؒ کی تصریحات۔	//
١١۔ عہدِ فاروقیؓ میں قانون سازی کا یہی اصول تھا۔	۲۷۱
١٢۔ نظامِ مشاورت۔	۲۷۲
یہ مغربی نظامِ جمہوریت سے بنیادی طور پر مختلف بلکہ اس کی نقیض ہے۔	
١٣۔ غیر مسلم باشندوں سے مشورہ لیا جاتا تھا۔ انہیں شریکِ حکومت نہیں کیا جاتا تھا۔	۲۷۴
١٤۔ غیر ملکی باشندوں کی آراء سے بھی استفادہ کیا جاتا تھا اس زمانے میں غیر مسلم، بلا روک ٹوک "مکہ" آتے جاتے تھے۔	//
١٥۔ سربراہِ مملکت مجلسِ شوریٰ کی اکثریت کی رائے کا پابند ہوتا تھا یا ویٹو کا اختیار رکھتا تھا۔	//
بڑی بصیرت افروز بحث۔	
١٦۔ "عمرؓ کی رائے وحیِ خداوندی نہیں۔ یہ ایک انسان کی رائے ہے جو غلط بھی ہو سکتی ہے۔ اسے سند اور سنّت قرار نہ دو۔"	۲۷۵
١٧۔ قانون سازی کا طریق۔	۲۷۷
"ہر حکم قرآنِ کریم کے مطابق ہوگا۔"	
١٨۔ مہر کا تعین کرنے کے سلسلہ میں ایک عورت کی طرف سے	۲۷۸
اعتراض کہ ایسا کرنا قرآن کے خلاف ہوگا۔	
اس اعتراض کا جائزہ۔	
١٩۔ تغیرِ حالات کے ماتحت، عہدِ رسالتمآبؐ کے فیصلوں میں تبدیلی ـــ اس کی مثالیں۔	۲۷۸ ۲۷۹
٢٠۔ اوّلیاتِ حضرت عمرؓ ـــ یعنی وہ امور جن کے متعلق آپ نے پہلے پہل فیصلے دیئے۔	۲۸۱
٢١۔ حاصلِ بحث۔	//
٢٢۔ فیصلے کرنے کا حق صرف نظامِ حکومت کو ہے۔ افراد یا کسی جماعت کو نہیں۔	۲۸۲
٢٣۔ اس کے بعد کیا ہوا؟ اور پاکستان میں کیا ہو رہا ہے؟	//
٢٤۔ قانون سازی ہی نہیں ـــ سیرت سازی۔	۲۸۵
٢٥۔ عمال کے انتخاب میں معیار، قرآن کا علم اور حسنِ معاملات تھا۔	//
٢٦۔ ایک نہایت بلند اصول اور دقیق نظریہ۔	۲۸۶
طاقتور خائن اور کمزور دیانتدار، دونوں نقصان رساں ہوتے ہیں۔	
٢٧۔ جس کے دل میں اپنی اولاد کے لئے محبت نہیں وہ رعایا کا شفیق کیسے ہو سکتا ہے۔	۲۸۷
٢٨۔ جو شخص خود کسی عہدہ کا طلب گار ہو اسے اس پر تعینات نہیں کرنا چاہیئے۔	//
٢٩۔ ایک شخص اچھا شاعر ہو سکتا ہے لیکن ضروری نہیں کہ وہ گورنر بھی اچھا ہو۔	//
٣٠۔ ممتاز صحابہؓ کو مدینہ میں رکھتے تھے باہر نہیں جانے دیتے تھے۔	//

مضمون	صفحہ
کہ مبادا لوگ مسلم رعایا میں شخصیت پرستی شروع ہوجائے۔	
۳۱۔ اپنے بیٹے (عبداللہ) کو کوفہ کا گورنر نہیں بنایا حالانکہ وہ اس منصب کے لئے نہایت موزوں تھے۔	۲۸۸
۳۲۔ جس حاکم کی شکایت سنتے، اسے وہاں سے تبدیل کر دیتے اور پھر شکایت کی تحقیق کرتے۔	//
۳۳۔ صرف موزوں شخص کی تعیناتی سے میری ذمہ داری ختم نہیں ہو جاتی۔ مجھے یہ بھی دیکھنا چاہیئے کہ وہ میرے انداز سے کے مطابق کام بھی کرتا ہے یا نہیں۔	//
۳۴۔ اپنے عمالِ حکومت کو ہدایات۔	۲۷۹
امورِ مملکت کی سرانجام دہی کے لئے عالمگیر منشور۔	
[مومن نہ کسی کو دھوکا دیتا ہے نہ کسی سے دھوکا کھاتا ہے]	
قبائلی عصبیت کو ختم کر دو۔ کوئی مظلوم، اپنی مدد کے لئے اپنے قبیلہ کو آواز نہ دے۔ صرف امیر کو آواز دے۔ اب گروہ دو ہی ہوں گے ــــ ظالم اور مظلوم۔	
گورنر، اپنی مجالس میں تکیہ لگا کر نہ بیٹھیں۔	
قرآن جاننے والوں اور دیانتداروں کی عزت افزائی کرو۔	
حکومت میں نرمی ہونی چاہیئے لیکن کمزوری نہیں۔	
سختی ہونی چاہیئے لیکن استبداد نہیں۔	
ایسے بن کر رہو کہ پُرامن قوم سے بے خوف رہیں، اور بدمعاش خوف زدہ۔	
جو شخص شر پیدا کر کے غالب آیا وہ غالب نہیں، مغلوب ہے۔	
جس نے ناجائز طریق سے کامیابی حاصل کی، وہ کامیاب نہیں، ناکام ہے۔	
جو شخص مسلمانوں کا امیر بنے، اس کے لئے ضروری ہے کہ وہ غلام کی طرح مخلص اور امین رہے۔	
موٹا جھوٹا کھاؤ۔ گاڑھا گزی پہنو۔	
اہلِ عجم کی تقلید مت کرو۔	
جس میں تکبر دیکھو سمجھو کہ وہ احساسِ کمتری کا شکار ہے۔	
اپنا محاسبہ کرو قبل اس کے کہ تمہارا محاسبہ کیا جائے۔	
۳۵۔ محاسبہ کس طرح کیا جاتا تھا۔	۲۹۲
عمال کی تعیناتی کے وقت ان کے مقبوضات کی فہرست مرتب کر لی جاتی تھی اور اسے وقتاً فوقتاً چیک کیا جاتا تھا۔	۲۹۳
۳۶۔ ایک حاکم کے خلاف شکایت موصول ہوئی تو ان سے کہا کہ بیت المال کی بکریاں چراؤ تاکہ تمہیں معلوم ہو کہ راعی (گڈریئے) کی ذمہ داریاں کیا ہوتی ہیں۔	//
۳۷۔ حمص کے گورنر کا بالاخانہ جلوا دیا اور اسے حکم دیا کہ بیت المال کے اونٹوں کو پانی پلایا کرو تاکہ دماغ سے تفاخر کی بُو نکل جائے۔	//
۳۸۔ گورنر کی زندگی ــــ نہ ملازم، نہ خادمہ، نہ فالتو کپڑوں کا جوڑا اور کسی گزرے ہوئے گناہ کی یاد سے سکتہ چھا جاتا تھا۔	۲۹۴
۳۹۔ ہر ایک کو سزا پبلک میں دی جاتی تھی۔	۲۹۵
۴۰۔ عمال کو زیادہ محتاط رہنے کی ضرورت ہے کیونکہ ان کی	//

مضمون	صفحہ
حرکات و سکنات عوام کے لئے سند بن جاتی ہے۔	
۴۱۔ امیر المومنین خود اپنے آپ کو بھی محاسبہ کے لئے پیش کر دیتے تھے۔	۲۹۶
یمنی چادروں کا واقعہ۔	
بیت المال کے کوڑے میں نکلا ہوا ایک درہم بھی عمرؓ کے گھرانے کے بچے کے ہاتھ میں نہیں جانا چاہیئے۔	
"عمرؓ خدا سے ڈرو"۔ مجمع میں سے ایک شخص نے بار بار پکارا۔ آپ نے اس کی حوصلہ افزائی کی۔	
اگر خلیفہ بھی کج رو ہو جاتے تو ہم اس کا سر اڑا دیں گے۔	
۴۲۔ امیر المومنین کے اہل و عیال کا محاسبہ۔	۲۹۸
آپ جب کوئی حکم نافذ کرتے تو سب سے پہلے اپنے اہلِ خاندان کو تاکید کرتے کہ اس کی تعمیل کرنا جو ایسا نہیں کرے گا اسے دگنی سزا دی جائے گی۔	
۴۳۔ حضرت عباسؓ کا ارشاد کہ حضرت عمرؓ اس پرندے کی مانند تھے جسے ہر طرف جال ہی جال نظر آ رہے ہوں۔	//
ذمہ داری کے احساس کے دو واقعات	
حضرت علیؓ کا ارشاد کہ حضرت عمرؓ القوی الامین ہیں اور اسی لئے تمام عمال اور سپاہی تک بھی امین ہیں۔	
۴۴۔ خلیفہ خود رعایا کے حالات دریافت کرتا تھا۔ اس کے لئے رات کے وقت گشت بھی کرتا تھا۔	۳۰۰
وہ بچہ جو اس لئے رو رہا تھا کہ اس کی ماں اس کا دودھ چھڑانا چاہتی تھی۔	

مضمون	صفحہ
وہ عورت جس نے بھوکے بچوں کو بہلانے کے لئے ہانڈی میں خالی پانی ڈال کر اسے چولھے پر چڑھا رکھا تھا۔	
زچہ عورت کی خدمت کے لئے اپنی زوجہ محترمہ کو ساتھ لے کر گئے۔	
وہ لڑکی جو دودھ میں پانی نہیں ملانا چاہتی تھی۔	
آپ اسے بہو بنا کر گھر لے آئے۔	
وہ مجاہد جس کا ہاتھ کسی جنگ میں کٹ گیا تھا۔	
دشتِ شام کی بڑھیا نے کہا کہ عمرؓ اگر اپنی رعایا کے حالات سے باخبر نہیں رہ سکتا تو اسے حکومت کرنے کا کوئی حق نہیں۔ حضرت عمرؓ کا ساری مملکت کا دورہ کرنے کا ارادہ۔	
۴۵۔ تاکید کہ حکام کے دروازے عوام کے لئے کھلے رہنے چاہئیں۔	۳۰۴
۴۶۔ حج کے اجتماع میں عام شکایات سنی جاتیں۔	
دسواں باب	
معاشرتی زندگی	
۱۔ انسانی روابط کے تمام گوشے قانون کی زنجیروں میں نہیں جکڑے جا سکتے۔ ان میں سے بیشتر کا تعلق معاشرتی زندگی سے ہوتا ہے۔	۳۰۶
۲۔ معاشرتی زندگی کی اصلاح صحیح تعلیم و تربیت اور اچھا نمونہ پیش کرنے سے ہو سکتی ہے۔	۳۰۸
۳۔ اس باب میں حضرت عمرؓ کے اقدامات۔	//

مضمون	صفحہ
میاں بیوی کے تعلقات سے متعلق ہدایات ونظریات	
(ضمناً) اپنی غلطی کے احساس پر معذرت۔	
درّہ عمرؓ کا نہیں، خدا کا ہے۔ اسے خدا ہی کے لئے اٹھنا	
چاہیئے ۔۔۔ بدوضع اور بدہیئت آدمیوں کی سرزنش	
نبی اکرمؐ کے ارشاداتِ گرامی۔	
۴۔ ایک زاہد مرتاض کو درّہ رسید کیا اور کہا کہ خدا تجھے غارت کرے	۳۱۰
ہمارے دین کا گلا کیوں گھونٹ رہا ہے۔	
۵۔ دنیا میں سب سے بڑی مصیبت کم مال اور کثرتِ عیال ہے۔	//
۶۔ جوانوں کو نصیحت۔	
۷۔ اولاد کی تعلیم و تربیت کیسی ہونی چاہیئے۔	//
۸۔ شعر وادب کی تاکید۔	۳۱۱
ایک ضمنی گوشہ ۔۔۔ قرآن اور شاعری۔	
حضور نبی اکرمؐ کا ذوقِ شعری۔	
اور حضرت عمرؓ کا۔	
۹۔ موسیقی کا ذوق بھی رکھتے تھے اور شعر ترنم سے پڑھا	۳۱۴
کرتے تھے۔	
۱۰۔ مدائن کے قصرِ ابیض کے نادر مجسمات کو محفوظ رکھا۔	۳۱۵
اسلام اور فنونِ لطیفہ۔	
۱۱۔ آپ کے مزاج میں شگفتگی اور شگفتہ ظرافت بھی تھی۔	۳۱۶
آپ کے مزاج کی ایک تبسم خیز مثال	
۱۲۔ اور رقیق القلب بھی ۔۔۔ اس کی مثالیں۔	۳۱۷
بچوں سے پیار اور محبت۔	

مضمون	صفحہ
حیوانات تک سے ہمدردی۔	
۱۳۔ قرآن پڑھتے وقت، ہچکیاں لے لے کر روتے تھے۔	۳۱۸
۱۴۔ تقاضاتِ عدل اور جذباتِ رحم وہمدردی میں تصادم۔	//
اسوۂ نبی اکرمؐ میں ایسے نازک مقام کی درخشندہ مثال۔	
مجرم یہودی کا قتل اور اس کی بچی کی آہ وفریاد۔	
"محمدؐ رسول اللہ کا ہاتھ قتل کا اشارہ کرتا ہے اور محمد ابن	
عبداللہ کی آنکھ روتی ہے"۔	
۱۵۔ تضادِ جذبات میں مسلکِ فاروقی۔	۳۱۹
جو بیوی کاروبارِ مملکت میں مداخلت کرتی تھی آپ نے اسے	
طلاق دے دی حالانکہ وہ بڑی محبوب بیوی تھی۔	
بیویوں کو تحائف قبول کرنے کی ممانعت۔	
اس باب میں شدتِ احتیاط کی مثالیں۔	
۱۶۔ بیٹے نے سرکاری چراگاہ میں اونٹ چرائے تو ان کا منافع	۳۲۲
بیت المال میں جمع کر دیا۔	
۱۷۔ بیٹوں نے بیت المال میں بھیجے جانے والے روپے	//
سے تجارت کر لی تو ان سے منافع وصول کر لیا گیا۔	
۱۸۔ حضرت حفصہؓ امہات الامۃ میں سے تھیں لیکن چونکہ وہ	//
حضرت عمرؓ کی بیٹی بھی تھیں۔ اس لئے مراعات میں انہیں	۳۲۳
سب سے مؤخر کیا جاتا تھا۔	
۱۹۔ وظیفہ میں اپنے بیٹے کو نسبتاً کم حصہ دیا۔	//
۲۰۔ جس سے آپ دوستی کے تعلقات رکھتے، اسے	//
مراعات کم ملتیں۔	

مضمون	صفحہ
۲۱۔ بیت المال سے اپنے اور اپنے اہل خانہ کے لئے کم از کم لیتے تھے۔ بیوی کا دوپٹہ اس قابل نہیں رہا تھا کہ وہ اسے اوڑھ کر دوسروں کے سامنے آ سکیں۔	۳۲۴
۲۲۔ بیت المال سے تھوڑا سا شہد بھی کابینہ کی منظوری سے لیا۔	″
۲۳۔ گوشت کی کمی کے زمانے میں تاکید کہ گوشت ناغے سے خریدا کرو۔	۳۲۵
۲۴۔ حسنِ اخلاق کی تاکید۔ تمہارا جو مقام مخلوق کی نگاہ میں ہے۔ وہی مقام خدا کی نگاہ میں ہے۔	″
۲۵۔ اپنی اصلاح کی طرف ہمیشہ دھیان رکھو۔ تمہارے کسی جانور میں کوئی خرابی پیدا ہو جاتی ہے تو تم اس کی اصلاح کے لئے دوڑ دھوپ کرتے ہو لیکن اپنے نفس کی خرابی کے لئے پریشان نہیں ہوتے۔ تم اپنے آپ کو جانوروں جتنی بھی اہمیت نہیں دیتے۔	″
۲۶۔ میری تعریف مت کرو۔	″
۲۷۔ احترامِ آدمیت۔ کسی کے متعلق رسوا کن الفاظ مت استعمال کرو۔	″
۲۸۔ پاکیزہ باطن کے مدعیوں سے کہتے کہ اس کا اظہار اپنے اعمال و کردار سے کرو۔	۳۲۶
۲۹۔ اکثر وعظ شیطانی ہیجان کا نتیجہ ہوتے ہیں۔	″
۳۰۔ انسان کو چاہیئے کہ اپنے اہل و عیال میں بچے کی طرح رہے لیکن جب ان کی کوئی ضرورت سامنے آئے تو مرد بن جائے۔	″

گیارھواں باب

معاشی نظام

مضمون	صفحہ
۱۔ مثالی حکومت کا معیار، ایک مغربی مفکر کے نزدیک۔	۳۲۷
۲۔ زندگی کے متعلق مغرب کے نظریۂ مادیت اور قرآنی تصورِ حیات میں بنیادی فرق۔	۳۲۸
۳۔ قرآنی نقطۂ نگاہ سے انسان کی طبیعی زندگی اور اس کی ذات، دونوں کی نشوونما نہایت ضروری ہے۔	″
اسلامی مملکت کا فریضہ یہ ہے کہ وہ افرادِ مملکت کی اس قسم کی نشوونما کا انتظام کرے۔	
۴۔ طبیعی زندگی کی ضروریات مہیا کرنے کے لئے سوشلسٹ نظام وضع ہوتے ہیں لیکن ان کے ہاں وہ اساسِ محکم نہیں جس پر اس نظام کی عمارت استوار ہو سکے۔ اس لئے یہ نظام کامیاب نہیں ہو سکا، نہ ہو سکتا ہے۔	۳۳۰
۵۔ یہ اساسِ محکم قرآنی نظریۂ حیات فراہم کرتا ہے۔	″
۶۔ معاشی نظام کی پیچیدگی کی اصل۔	۳۳۱
یہ تصور کہ ایک فرد اپنی اور اپنی اولاد کی ضروریات پوری کرنے کا ذمہ دار خود ہے۔	
اسی سے طبقات کی تفریق وجود میں آتی ہے۔	
۷۔ قرآن اس تصور کو باطل قرار دیتا ہے۔	۳۳۲
اس کے نظام کی رو سے تمام افراد کی ضروریات بہم پہنچانے کی ذمہ داری مملکت کے سر پر ہوتی ہے۔	
۸۔ اس مقصد کے لئے ذرائع پیداوار مملکت کی تحویل میں	۳۳۳

مضمون	صفحہ
رہتے ہیں	
۹۔ اس مملکت کو قائم کرنے والی جماعت کے افراد، خدا سے ایک معاہدہ کرتے ہیں۔ جس کی رُو سے وہ اپنا مال اور جان خدا کے ہاتھ بیچ دیتے ہیں اور خدا اس کے عوض انہیں جنت کی ضمانت دیتا ہے۔ یہ معاہدہ خدا کے نام پر قائم ہونے والی حکومت کے ساتھ ہوتا ہے۔	۳۴۳
۱۰۔ جنتِ ارضی کی خصوصیات ـــ تمام ضروریاتِ زندگی پوری ہونا۔	۳۴۴
۱۱۔ یہ نظام بتدریج عمل میں لایا جا سکتا ہے۔	۳۴۵
۱۲۔ قرآنِ کریم کے معاشی نظام کا تفصیلی بیان اور ان تدریجی مراحل کا ذکر جن سے گزر کر یہ اپنی آخری منزل تک پہنچے گا۔	״
۱۳۔ رسول اللہ نے اس نظام کا آغاز فرمایا۔	
۱۴۔ لیکن حضورؐ کی اپنی زندگی اس نظام کے انتہا کی آئینہ دار تھی۔	
۱۵۔ رسول اللہ کی حیاتِ طیبہ کی چند جھلکیاں۔ آپ نے کس طرح اس نظام کا نمود پیش فرمایا۔ نہایت بصیرت افروز حقائق۔	۳۴۶
۱۶۔ سیرتِ صدیقِ اکبرؓ میں اس نظام کی جھلکیاں۔ امیر المؤمنین کا وظیفہ ایک مزدور کی اجرت کے برابر ہوگا۔ مٹھی بھر آٹا بھی زائد از ضرورت ہے تو وہ بھی نہیں رکھا جائیگا۔	۳۶۰
۱۷۔ عہدِ فاروقیؓ میں معاشی نظام کا نقشہ۔	۳۶۲
خدا بندوں کو رزق انسانوں کے ہاتھوں سے پہنچاتا ہے۔ بنیادی اصول، ایک ضمنی گوشہ، قرآن میں حقوق العباد ہی کا ذکر ہے حقوق اللہ کا نہیں۔ ایک حدیث قدسی۔	
۱۸۔ رزق کی تنگی خدا کا عذاب ہے۔	۳۶۴
۱۹۔ اگر رزق کی کشادگی میں اقدارِ خداوندی کو نظر انداز کر دیا جائے تو وہ بھی موجبِ تباہی بن جاتا ہے۔ حضرت عمرؓ کی دعا۔	״
۲۰۔ فتح جلولا کا مالِ غنیمت دیکھ کر حضرت عمرؓ کی نمناک آنکھیں کہ اس سے یہ امت کہیں بے راہ رو نہ ہو جائے۔	״
۲۱۔ "اگر فرات کے کنارے ایک کتا بھی بھوک سے مرگیا تو عمرؓ سے اس کی بھی باز پرس ہوگی۔"	۳۶۵
۲۲۔ مدینہ کی بھوکی عورتوں کا خیال رکھنا مقدم ہے۔	״
۲۳۔ ہر ضرورت مند کی ضرورت پوری کی جائے۔ ذاتی اطمینان کرتے کہ ایسا ہو رہا ہے۔	۳۶۶
۲۴۔ اللہ کے نزدیک سب سے بہتر کھانا وہ ہے جسے سب مل کر کھائیں۔" (حضرت ابن عمرؓ)	۳۶۷
۲۵۔ "خدایا! اس قوم کا کیا ہوگا جو اپنے آپ کو اپنے ملازموں پر ترجیح دیتی ہے۔	״
۲۶۔ جس بستی میں کوئی شخص بھوک پیاس سے مرجائے تو اہلِ بستی پر اس خون کی دیت لازم آجاتی ہے۔	״
امام ابنِ حزم کا فتویٰ	۳۶۸

مضمون	صفحہ
۲۷۔ رعایا پر حکومت کے واجبات کی ادائیگی اس وقت لازم آتی ہے جب وہ حکومت کے رفاہِ عامہ سے مستفید ہو جائے	۲۶۹
۲۸۔ حکومت کی شکرگزاری کی بھی ضرورت نہیں ۔ اس نے اللہ کا مال اللہ کے بندوں پر خرچ کیا۔ اس کا شکر کس بات پر؟	//
۲۹۔ ایک روایت ۔ امام مہدی مال کی تقسیم مساویانہ کریگا (ضمناً) امام مہدی کے متعلق مروجہ روایات اور عقائد قرآن کریم کی تعلیم کے خلاف ہیں۔	۲۷۰
۳۰۔ بیت المال کی اشیاء کی حفاظت کی ذمہ داری کے بصیرت افروز واقعات۔	۲۷۱
۳۱۔ خلیفہ کی اپنی پوزیشن۔	۲۷۲
(۱) حضرت عمرؓ کا خود مقرر کردہ وظیفہ۔	
(۲) مسلمانوں کا مال، یتیم کے مال کی طرح ہے۔ اگر میں محتاج نہیں ہوتا تو کچھ نہیں لیتا۔ محتاج ہوتا ہوں تو بقدرِ ضرورت لے لیتا ہوں۔	
(۳) حضرت حفصہؓ کا مشورہ کہ وظیفہ میں کچھ اضافہ کر لیجئے۔	
اس کا جواب۔	
(۴) امیر المومنین کا کھانا۔	
میں اس وقت گیہوں کی روٹی کھا سکتا ہوں جب مجھے یقین ہو جائے کہ مملکت میں ہر شخص کو گیہوں کی روٹی مل رہی ہے۔	
ایک وقت میں صرف ایک سالن۔	
"اپنے حصے کی ساری خوشگوار چیزیں یہیں نہ لے لو، کچھ آخرت میں لینے کے لئے بھی رکھ چھوڑو۔"	
(۵) ایسی زندگی کیوں بسر کرتے تھے! اس کی وجہ کہ "اگر مجھ پر وہی کچھ نہ گزرے جو لوگوں پر گزرتی ہے تو مجھے ان کی تکالیف کا احساس کس طرح سے ہو۔"	
۶۔ امیر المومنین کا لباس۔	
پیوند لگے کپڑے۔	
ایک ہی جوڑا جسے دھوکر سکھا لیتے۔	
حج کی تقریب پر امیر المومنین کا درد!	
(۷) مکان وہی تھا جو خلیفہ بننے سے پہلے تھا۔	
سادہ مکانات تعمیر کرنے کی تاکید سب کے لئے تھی۔	
۳۲۔ قیصرِ روم کے قاصد کا مشاہدہ اور تاثرات۔	۲۷۷
ہمارے ہاں بادشاہ نہیں ہوتا امیر ہوتا ہے۔ ہمارا امیر وہ زمین پر سو رہا ہے۔	
"اے عمرؓ! تو لوگوں سے عدل کرتا ہے اس لئے اس طرح بے خوف سوتا ہے۔"	
۳۳۔ "سربراہِ مملکت کی حیثیت ایک خزانچی کی سی ہوتی ہے۔" (ارشادِ نبویؐ)	//
۳۴۔ آمدنی اور اس کی تقسیم	۲۷۸
مال کہاں سے حاصل کیا اور کہاں خرچ کیا۔	//
۳۵۔ مالِ غنیمت کے متعلق قرآنی احکام۔	۲۷۹

مضمون	صفحہ
۳۶۔ دولت کی تقسیم کا مسئلہ، مشکل ترین مسئلہ ہے اس کی آخری شکل مارکس کا یہ نظریہ ہے کہ ہر ایک سے اس کی صلاحیت کے مطابق کام لیا جائے اور اسے اس کی ضرورت کے مطابق دیا جائے۔ خود مارکس اور لینن کا اعتراف کہ یہ اصول ناقابلِ عمل ہے۔	۳۸۰
۳۷۔ یہ اصول رسول اللہ کا تجویز فرمودہ تھا اور حضورؐ نے اس پر عمل بھی کر کے دکھا دیا تھا۔	۳۸۱
۳۸۔ اراضیات کا بندوبست۔	//
(۱) ابتدائی دور ــــ زمین پر کسی کی ملکیت نہیں تھی۔	
(۲) نظامِ سرمایہ داری کی ابتداء ــــ زمین پر ذاتی ملکیت۔	
(۳) رسول اللہ کے انقلابی اقدامات۔	
"زمین اللہ کی اور بندے بھی اللہ کے۔ اس لئے اللہ کی زمین اللہ کے بندوں کے لئے ہونی چاہیئے"۔	
(۴) زمین بٹائی پر نہیں دی جا سکتی۔	
۳۹۔ عراق کی زمینوں کا مسئلہ ــــ تفصیلی بحث۔	۳۸۴
فیصلہ قرآن کریم کی روشنی میں ہوا اور وہ یہ کہ زمین حکومت کی تحویل میں رہے گی۔ افراد میں تقسیم نہیں کی جائے گی۔	
اس واقعہ سے مستنبط ہونے والے نتائج۔	
۴۰۔ اراضیات سب حکومت کی تحویل میں رہیں گی۔	۳۸۷
حکومت انتظامی سہولت کے لئے جن لوگوں کو قطعاتِ اراضی دے، عند الضرورت ان سے واپس بھی لے سکتی ہے۔	
حکومت کاشتکار سے اتنا ہی لے سکتی ہے۔ جتنا اس کی ضرورت سے زاید ہو۔	
۴۱۔ چراگاہیں مفادِ عامہ کے لئے کھلی رہیں گی۔	۳۹۰
ان میں غریبوں کے مویشی چریں گے دولتمندوں کے نہیں	
۴۲۔ پانی کو کوئی شخص روک نہیں سکتا۔	۳۹۱
۴۳۔ اراضیات کے حسنِ انتظام سے مملکت کی آمدنی میں محیّر العقول اضافہ ہو گیا۔	//
ایک علاقہ (بحرین) کا خراج پانچ لاکھ وصول ہوا۔	
یہ صرف حسنِ انتظام کا نتیجہ نہیں تھا۔ اس کے ساتھ دیانت و امانت بھی شامل تھی۔	
حضرت عمرؓ کی دیانت کا مثالی واقعہ۔	
بیت المال کے اونٹوں کا دودھ تک نہیں پیا۔	
سہواً پیا ہوا بھی قے کر کے نکال دیا۔	
۴۴۔ وظائف کا تعین۔	۳۹۲
(۱) صدقہ و خیرات انسانی قلب کے لئے موت ہیں اس لئے حاجتمندوں کی ضروریات ملک کی طرف سے پوری ہونی چاہئیں نہ کہ انفرادی خیرات کے ذریعے۔	
(۲) ہر ایک کا وظیفہ اس کی ضروریات کے مطابق مقرر ہوتا تھا۔	
یہی طریق عہدِ صدیقی میں بھی رائج رہا۔	
(۳) عہدِ فاروقی میں،	

مضمون	صفحہ
۱۔ پہلی عام مردم شماری	۳۹۴
اس پر جرمن مستشرق خان کریمر کا بصیرت افروز تبصرہ۔	
۲۔ آپ نے وظائف کے تعین میں ضرورت کے بجائے ترجیحی سلوک کا اصول اختیار فرمایا۔	۳۹۵
ہمارے نزدیک یہ آپ کی اجتہادی غلطی تھی۔	
۳۔ نسبی تعلق معیارِ ترجیح نہیں ہو سکتا۔	
رسول اللہ کے ارشاداتِ گرامی۔	
جو تاریخی واقعہ ان اصولوں کے خلاف ہے، اسے صحیح تسلیم نہیں کیا جا سکتا۔	
۴۔ وظائف کی مقدار۔	۳۹۷
لاوارث بچوں تک کا وظیفہ۔	
اپنے بیٹے کو حضرت اسامہ بن زیدؓ سے کم وظیفہ۔	
۵۔ وظائف کے علاوہ، خوراک بھی ہر ایک کو بیت المال سے دی جاتی تھی۔	۳۹۸
"لوگوں کو ان کی ضرورت کے مطابق دو۔ مٹھی مٹھی بھر دینے سے لوگوں کے اخلاق درست نہیں رہیں گے"	
۶۔ اس کے بعد لوگوں کو اکتسابِ زر سے روک دیا۔	
۷۔ وظائف کے اس طرح جمع ہونے سے لوگوں کے پاس فاضلہ دولت جمع ہونے لگی۔	
۸۔ اس سے حضرت عمرؓ کو خود اپنی غلطی کا احساس ہو گیا اور انہوں نے اس کے ازالہ کا تہیّہ کر لیا۔	

مضمون	صفحہ
لیکن قبل اس کے کہ ایسا کیا جاتا، آپ کی شہادت ہو گئی۔	
۴۵۔ وظائف کے متعلق حضرت عمرؓ کے فیصلہ کے مضر نتائج حضرت عثمانؓ کے زمانے میں برآمد ہونے شروع ہو گئے۔	۴۰۰
سید قطب اور ڈاکٹر طٰہٰ حسین کی تصریحات۔	
اس سے نظامِ سرمایہ داری کی بنیاد پڑ گئی۔	۴۰۳
۴۶۔ تاریخ کے ان بیانات پر ہمارا تبصرہ۔	۴۰۳
ہم انہیں صحیح تصور نہیں کر سکتے۔	

بارھواں باب (۱۲)

سخنے نگفتہ را چہ قلندرانہ گفتم

مضمون	صفحہ
۱۔ میری زندگی کے دو دور۔	۴۰۶
قرآن کریم کو غور و فکر اور علم و بصیرت کی رو سے سمجھنے کی کوشش۔	
۲۔ اس منزل میں ایک دشوار مرحلہ۔	۴۰۷
دعا کی حقیقت سمجھ میں نہیں آتی تھی۔	
۳۔ اس کے متعلق میری سعی و کاوش۔	
قرآنی آیات کا مفہوم۔	
۴۔ خدا اور بندے کا تعلق۔	
خدا کی ذمہ داریاں کس طرح اس کے بندوں کے ہاتھوں پوری ہوتی ہیں۔	
۵۔ مظلومینِ مکّہ کی امداد، صاحبِ قوت مجاہدین مدینہ	

مضمون	صفحہ
کے ہاتھوں۔	
۶. وَمَا رَمَیْتَ اِذْ رَمَیْتَ کا صحیح مفہوم۔	
۷. حضرت عمرؓ کا ارشادِ گرامی۔	
خدا نے مجھے اس بات کا ذمہ دار ٹھہرایا ہے کہ میں تمہاری دعائیں اس تک نہ پہنچنے دوں۔	۴۱۱
اس عظیم حقیقت کی وضاحت۔	
۸. اب ہماری دعائیں کیوں قبول نہیں ہوتیں۔	
اسلامی مملکت کے بغیر قبول نہیں ہو سکتیں۔	

تیرھواں باب

خوش درخشید ولے شعلۂ مستعجل بود

مضمون	صفحہ
۱. دس سال کی قلیل مدت میں محیر العقول انقلاب۔	۴۱۴
۲. داخلی دنیا میں نفسیاتی تبدیلی۔	۴۱۶
انسائیکلوپیڈیا آف اسلام کے نامہ نگار کا خراجِ تحسین	
۳. ہیکل اور طٰہٰ حسین کا نذرانۂ عقیدت۔	۴۱۷
۴. اس کے بعد تاریخِ انسانیت کا جگر سوز المیہ۔	۴۲۰
۵. ۲۶ ذی الحجہ ۲۳ھ کی صبح، مسجدِ نبویؐ میں، عین بحالتِ نماز، حضرت عمرؓ پر خنجر کا مہلک وار، حیرت یکسر حیرت۔	
۶. حضرت عمرؓ کا پہلا سوال کہ قاتل کون تھا۔	۴۲۱
اظہارِ اطمینان کہ وہ کسی مسلمان اور عرب کے ہاتھوں شہید نہیں ہو رہے۔	
۷. زندگی کے آخری لمحات میں جانشینی سے متعلق جامع اسکیم۔	۴۲۲
اپنے بیٹے کو امیدواروں کے زمرے میں بھی نہ رکھا۔	//
۸. اپنے قرضہ کی ادائیگی کی طرف سے اطمینان۔ بیٹے نے ذمہ لے لیا۔	۴۲۳
۹. قبر کے لئے جگہ ــــ حضرت عائشہؓ سے اجازت حاصل کرلی۔	//
احتیاط کی شدت ــــ کہا کہ ایک دفعہ میرے مرنے کے بعد بھی دریافت کرلینا۔	
۱۰. مؤاخذۂ آخرت کے احساس کی شدت۔	
۱۱. آپ کی عمر۔	
ضمناً رسول اللہؐ کی عمر کے متعلق مختلف روایات۔	
۱۲. رفقاء کی طرف سے خراجِ تحسین۔	۴۲۶
ہماری طرف سے برگِ عقیدت۔	
۱۳. شہادتِ حضرت عمرؓ کے سلسلہ میں سازش کا انکشاف۔	۴۲۸
ہرمزان اس کے پیچھے تھا۔	
حضرت عمرؓ کے بیٹے عبید اللہ نے ہرمزان، جفینہ اور قاتل حضرت عمرؓ (فیروز لولو) کی بیٹی کو قتل کردیا۔	۴۲۹
۱۴. اے کاش! ہرمزان اور فیروز کے مدینہ میں رہنے کے معاملہ میں حضرت عمرؓ زیادہ احتیاط سے کام لیتے!	
۱۵. بعض تاریخی روایات میں ہے کہ بعض لوگوں نے آپ کو اس حادثہ کی وارننگ بھی دے دی تھی۔	

مضمون	صفحہ
۱۶۔ کچھ بھی تھا ۔۔۔ ایران نے اپنی ذلّت آمیز شکست کا انتقام لینے کے لئے پہلا قدم اٹھا لیا۔	
اس کے بعد کے اقدامات کے لئے چودھواں باب دیکھئے۔	
بزمِ انجم	
فاروقِ اعظمؓ کے متفرق اقوالِ درخشندہ۔	۴۳۴ ۔ ۴۳۹
چودھواں باب	
شعلۂ عشق سیاہ پوش ہوا تیرے بعد	
(انتقام)	
۱۔ ہرمزان اور حضرت عمرؓ کا مکالمہ۔	۴۴۰
۲۔ مسلمانوں کی قوّت کا راز ۔۔۔ اتباعِ قرآنی۔	۴۴۱
۳۔ ایرانی سازش ۔۔۔ ان سے قرآن چھڑا دو۔	//
۴۔ عربی اور عجمی اسلام سے مراد۔	
۵۔ ایران اور روما کی فتوحات میں فرق۔	۴۴۲
ایرانی اسلام لے آئے۔	
۶۔ ان کے عوام اسلام لائے تو ان کی تعلیم و تربیت نہ ہو سکی۔	
اور خواص، خاص مقصد لے کر مسلمان ہوئے۔	
ان کا مقصد مسلمانوں اور اسلام سے انتقام لینا تھا۔	
۷۔ نازک مقام ۔۔۔ ہمارا مذہب پرست طبقہ بات سننے تک کے لئے تیار نہیں ہوتا۔	۴۴۴
۸۔ کتبِ روایات و تاریخ کی حقیقت۔	۴۴۴
۹۔ شیعہ حضرات کے ہاں تقیہ جزوِ ایمان ہے۔	۴۴۵
تاریخ پر اس کا اثر۔	
۱۰۔ مذہبی پیشوائیت کے ردِّ عمل کا ایک واقعہ۔	۴۴۶
حضرت عائشہؓ کی عمر بوقتِ نکاح۔	
۱۱۔ روایات اور تاریخ کے متعلق میرا مسلک۔	۴۴۷
۱۲۔ پہلی نزاع ۔۔۔ مسئلۂ خلافت۔	۴۴۸
۱۳۔ خلافت بطورِ حقِ وراثت۔	۴۴۹
۱۴۔ ایرانیوں کے اپنے شہنشاہوں کے متعلق عقیدہ۔	۴۵۰
۱۵۔ عبداللہ ابن سبا۔	//
اس کا سیاسی کردار ۔۔۔ اور مذہبی فتنہ۔	
۱۶۔ امام کے وصیِ رسول اور مامور من اللہ ہونے کا عقیدہ۔	۴۵۱
۱۷۔ خلافت کے متعلق یہ عقائد، کفر و ایمان کا خطِ امتیاز قرار پا گئے۔	۴۵۲
۱۸۔ "تاریخ المورخ" کا تبصرہ۔	//
۱۹۔ حضرت شہربانو کے متعلق شیعہ روایت۔	۴۵۳
اہلِ ایران کے ساتھ رشتہ کا تعلق۔	
۲۰۔ حضرت سلمانؓ فارسی کے متعلق وضعی روایات۔	۴۵۴
۲۱۔ حضرت علیؓ کے بعد، امام حسنؓ کی خلافت سے دست برداری۔ اس طرح خلافت پوری کی پوری بنی	۴۵۶

مضمون	صفحہ
امیہ کے پاس چلی گئی۔	
۲۲۔ امیر معاویہؓ کے حسنینؓ کے ساتھ تعلقات —	۴۵۶
وہ انہیں عطیات دیتے تھے۔	
اور یزید بھی۔	
ان کی باہمی رشتہ داریاں۔	۴۵۷
۲۳۔ بنی اُمیہ اور بنی عباس کی رقابت۔	//
۲۴۔ ایرانیوں نے اس سے فائدہ اٹھایا۔	۴۵۸
۲۵۔ ابومسلم خراسانی — فن پراپیگنڈہ کا ماہر	۴۵۹
(ضمناً۔ بنی امیہ کے خلاف فاطمیین کی محاذ آرائیاں)	
۲۶۔ "سیاہ جھنڈوں والے" (امام مہدی) کا ظہور۔	۴۶۰
۲۷۔ سلطنت بنی عباس کے ہاتھ آ گئی۔	//
۲۸۔ "اہل بیت" کا احتجاج کہ حکومت انہیں ملنی چاہیئے	//
تھی۔ بنی عباس کیسے لے گئے۔	
حقِ خلافت کے متعلق محمد نفس زکیہ اور عباسی خلیفہ	۴۶۱
منصور کے مابین خط و کتابت۔	۴۶۵
۲۹۔ عہد عباسیہ میں برامکہ کا اثر و نفوذ۔	۴۶۶
حکومت عملاً انہی کے ہاتھ میں تھی۔	
۳۰۔ برامکہ نے سارے معاشرے کو عجمی رنگ میں رنگ دیا۔	۴۶۷
۳۱۔ برامکہ کا انجام۔	۴۶۸
۳۲۔ عباسی سلطنت کے خلاف فاطمیین و علویین کی	۴۶۹
محاذ آرائیاں۔	
۳۳۔ مصر میں فاطمی حکومت۔	//

مضمون	صفحہ
۳۴۔ بغداد پر ایرانی تغلب۔ دیلمی حکومت۔	۴۷۱
۳۵۔ بغداد، شیعیت کا مرکز۔	//
عزاداری کی تقاریب کی ابتداء۔	
۳۶۔ ابن العلقمی اور نصیر الدین طوسی کی سازش سے	
ہلاکو خاں کا حملہ۔	
بغداد کی تباہی اور عباسی سلطنت کا خاتمہ۔	
۳۷۔ خود ایرانیوں کا اعتراف کہ ہم نے اپنی شکست کا	۴۷۲
بدلہ لیا تھا۔	
۳۸۔ یہ انتقام سیاسی تھا۔ اب دینی انتقام	
کی طرف آیئے۔	
۳۹۔ اسلام کی اساسات کا اجمالی تعارف۔	۴۷۳
(تجدید یادداشت کے لئے)	
۴۰۔ حضرات ائمہ کا شجرۂ نسب۔	۴۷۵
۴۱۔ شیعوں کا فرقہ کیسانیہ اور اس کے معتقدات۔	//
۴۲۔ فرقۂ زیدیہ۔	۴۷۶
۴۳۔ امامیہ (اثنا عشری) اور اسماعیلیہ کا ابتدائی تعارف۔	۴۷۷
۴۴۔ شیعوں کے بعض غالی فرقے اور ان کے معتقدات۔	//
۴۵۔ اسماعیلیوں کے عقائد۔	//
موجودہ قرآن محرف ہے۔	
اس کا مفہوم بھی باطنی معانی کی رو سے سمجھ میں	
آ سکتا ہے جن کا علم صرف ائمہ کو ہوتا ہے۔	
امامت کے متعلق عجیب و غریب نظریہ اور اعتقادات۔	

مضمون	صفحہ
۴۶۔ آغاخانیوں اور بوہروں کے اعتقادات۔	۴۸۱
۴۷۔ فرقۂ امامیہ یا اثناعشریہ۔	۴۸۲
اصول الکافی' سب سے معتبر حدیث کی کتاب۔	//
۴۸۔ ائمہ کو خدا سے براہِ راست علم حاصل ہونے کا عقیدہ محدث کی اصطلاح۔	//
۴۹۔ خدا سے علم حاصل ہونے کے اعتبار سے نبی اور محدث میں کوئی فرق نہیں ہوتا۔	۴۸۳
۵۰۔ ائمہ کا مقام۔	۴۸۴
۵۱۔ موجودہ قرآن محرف ہے۔	۴۸۹
۵۲۔ قرآن کے باطنی معانی۔	۴۹۱
۵۳۔ قرآن کے علاوہ وحی کے مجموعے ــــ جفر، جامعہ اور مصحفِ فاطمہؓ۔	۴۹۲
۵۴۔ اہلِ بیت کے گھروں میں نزولِ ملائکہ۔	۴۹۳
۵۵۔ سوال یہ ہے کہ یہ اعتقادات حضرات ائمہ کی طرف منسوب ہیں جو سب کے سب عرب تھے پھر ایرانیت کا ان سے کیا تعلق!	۴۹۴
۵۶۔ جامعینِ احادیث سب ایرانی تھے۔	۴۹۵
۵۷۔ الکافی کے متعلق شیعہ علماء کی رائے ــــ اس میں بہت سی روایات ضعیف ہیں۔	
۵۸۔ ضمناً ــــ میرے خلاف "فتنہ انکارِ حدیث" کا اتہام حدیث کے متعلق میرا مسلک۔	۴۹۶
۵۹۔ سُنّیوں کے عقائد و مسلک پر ایرانی اثرات۔	۴۹۷
۶۰۔ جمع قرآن کے متعلق شکوک و شبہات۔	۴۹۷
۶۱۔ ناسخ و منسوخ کا عقیدہ۔	۴۹۹
۶۲۔ وحی متلو اور غیر متلو کا عقیدہ۔	
وحی متلو قرآن کے اندر ہے۔ وحی غیر متلو کتب احادیث میں۔	۵۱۰
اس طرح احادیث کو قرآن کے ہم پایہ قرار دے دیا گیا	۵۰۱
۶۳۔ جامعینِ احادیث سب ایرانی تھے۔	۵۰۳
۶۴۔ ان میں کس قسم کی احادیث ملتی ہیں۔	
آلِ عباس کی محبت اور اہلبیت کی محبت جزوِ ایمان ہے	۵۰۴
۶۵۔ دوسری طرف اس قسم کی حدیثیں بھی کہ رسول اللہؐ کی وفات کے بعد اصحاب مرتد ہوگئے تھے۔ (معاذاللہ)	۵۰۵
۶۶۔ امام ابنِ جریرؒ طبری کی تفسیر جو روایات پر مبنی ہے۔ اُمّ التفاسیر قرار پا گئی۔	۵۰۶
۶۷۔ اور امام طبریؒ کی تاریخ نے اُمّ التواریخ کی حیثیت اختیار کرلی۔	۵۰۷
۶۸۔ اس سے اسلام دین نہ رہا، مذہب بن گیا۔	۵۰۷
۶۹۔ آیۂ استخلاف میں، خلافت سے مفہوم روحانی امامت قرار پا گیا نہ کہ مملکت و حکومت۔	۵۰۸
۷۰۔ مذہب و سیاست میں ثنویت۔	۵۱۰
۷۱۔ قانون سازی کے دروازے بند۔ اُمت پر جمود و تعطل چھا گیا۔	۵۱۱
قرآن بطور سند و حجت کہیں بھی باقی نہ رہا۔	

مضمون	صفحہ
(ضمناً۔ فرقہ اہل قرآن کی غلط نگہی۔)	
۷۲۔ ملوکیت اور مذہبی پیشوائیت کے بعد،	۵۱۲
نظام سرمایہ داری کا احیاء۔	
زکوٰۃ کے متعلق روایت۔	۵۱۳
بے حد و نہایت ذاتی ملکیت۔	
۷۳۔ عقائد میں تبدیلی۔	۵۱۵
۷۴۔ عقیدۂ تقدیر ــــ مجوسیت کا یہ عقیدہ کس طرح مسلمانوں کا جزو ایماں بن گیا۔	//
تقدیر کے متعلق روایات۔	۵۱۶
۷۵۔ سب سے زیادہ تباہ کن سازش۔	
عجمی ترکش کا زہر آلود تیر ــــ اسلام کے تابوت کی آخری میخ۔	
یعنی تصوف! ــــ جو اسلام کی سرزمین میں اجنبی پودا ہے۔	۵۲۰
۷۶۔ سرخیل صوفیا، شیخ اکبر ابن عربی کے معتقدات، یہ اخوان الصفا سے متاثر تھے جو اسماعیلی عقائد کے داعی تھے۔	۵۲۱
۷۷۔ تصوف کے اساسی عقاید اور قرآن کریم۔	۵۲۲
جہاد کے خلاف۔	۵۲۶
۷۸۔ علامہ اقبالؒ اور تصوف ــــ "ایرانی شعبدہ بازوں کی کمند"	۵۲۷
۷۹۔ محدثیت اور کشف والہام کے عقیدہ سے دعوائے نبوت کا دروازہ کھل گیا۔	//
۸۰۔ میرزا غلام احمد قادیانی کے دعوے کی بنیاد انہی نظریات پر تھی۔	//
ان کا سب سے بڑا کارنامہ بھی جہاد کو منسوخ قرار دینا تھا۔	۵۲۹
۸۱۔ ایرانی سازش کا ملخص۔	۵۳۰
۸۲۔ کیا اس کا علاج ممکن ہے۔	۵۳۱
ضرور ممکن ہے بشرطیکہ اسلامی دنیا اس کی طرف عمرؓ کی رُوح کو لے کر آگے بڑھے۔ وہ عمرؓ جس نے رسول اللہ کی حیاتِ ارضی کے آخری لمحات میں کہا تھا کہ ــــ حسبنا کتاب اللہ۔ اور یہی میری عمر بھر کی پکار ہے۔	

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْم

گزرگاہِ خیال

میرے ذمے ایک گراں بار قرض تھا
للہ الحمد...... کہ میں آج اس سے سبکدوش ہو رہا ہوں

میرا سفینۂ حیات، متعدد جوئباروں اور متنوع آبناؤں سے گذر کر اس مقام تک پہنچا ہے۔ میری پیدائش[1] ایک ایسے گھرانے میں ہوئی جو شریعت اور طریقت کا نہایت نظیف و لطیف آمیزہ تھا۔ گھر کے اسی ماحول کی نسبت سے میں اکثر (استعارۃً) کہا کرتا ہوں کہ میری پیدائش پر، اگر میرے ایک کان میں اذان کی ندائے جانفزا پہنچی تھی تو دوسرے میں قوالوں کی آواز میں، امیر خسرو کے "قول قلبانوں" کی نشید فرح افروز۔ (میرے والد مرحوم تو ناخواندہ تھے لیکن) میرے دادا، (مولوی چوہدری رحیم بخشؒ) حنفی مسلک کے ایک جید عالم اور سلسلۂ چشتیہ نظامیہ کے ممتاز بزرگ تھے۔ علاوہ ازیں، وہ ایک ماہر طبیب بھی تھے لیکن انھوں نے ان میں سے کسی خصوصیت کو بھی ذریعۂ معاش نہ بنایا، کہ وہ نوعِ انسان کی طبعی یا روحانی اصلاح یا امداد کا معاوضہ لینا جائز نہیں سمجھتے تھے۔ چونکہ وہ مجھے اپنے علم و سلوک کا وارث بنانا چاہتے تھے، اس لئے انھوں نے شروع ہی سے مجھے اپنے آغوش میں لے لیا اور میری پرورش، تربیت اور تعلیم انہی کے ہاتھوں یا زیرِ نگرانی ہوئی۔ فطرت کی گرم گستری سے ذہن رسا پایا تھا اس لئے علوم شریعت و طریقت کے مبادیات پر تھوڑے سے عرصہ میں عبور حاصل کر لیا۔ دادا جان، سلوک کی منازل بھی ساتھ

---

[1] چونکہ میں یہاں اپنے سوانحِ حیات پیش نہیں کر رہا اس لئے میں اپنے آپ کو انہی واقعات تک محدود رکھنا چاہتا ہوں جن کا تعلق موضوع زیرِ نظر سے ہے۔ ویسے میری پیدائش ۹۔ جولائی ۱۹۰۳ء کو (موجودہ مشرقی پنجاب کے) ضلع گورداسپور کے قصبہ بٹالہ میں ہوئی تھی، جو مختلف خصوصیات کی بنا پر ایک مشہور بستی تھی۔

کے ساتھ طے کرائے جاتے تھے اس لیے مراقبات، مجاہدات، ریاضات (چلّہ کشیاں اور زاویہ نشینیاں) اس عمر میں میرے معمولات بن چکے تھے جس میں بچے ہنوز "گلی ڈنڈا" کھیلا کرتے تھے۔ میرے ہمعصر پتنگیں اڑایا کرتے تھے اور میں "آنسوئے افلاک" کے حقائق و معارف سمجھنے میں محو ہوتا تھا۔ اس ضمن میں ایک بات بالخصوص قابلِ ذکر ہے۔ میں اکثر سوچا کرتا ہوں کہ بعض "اتفاقات" کس طرح ایک فرد کی زندگی کے مستقبل کی تعمیر میں مؤثر کردار ادا کرتے ہیں۔ یہ محض حسنِ اتفاق تھا کہ دادا جان کا تعلق تصوّف کے چشتیہ نظامیہ سلسلہ سے تھا جس میں موسیقی کو جزوِ عبادت سمجھا جاتا ہے۔ اس سے شعر و نغمہ سے متعلق میرے ذوقِ لطیف کی از خود نشوونما ہوتی گئی۔ اگر ان کا تعلق (مثلاً) قادریہ یا نقشبندیہ سلسلہ سے ہوتا تو میرے اس ذوق کا دم گھٹ جاتا اور نہ معلوم پھر یہ تسکین نایافتہ تقاضے کس کس قسم کے نفسیاتی معاذیر کے جھرونکوں سے جھانکتے اور "شرعی تاویلوں" کے روزنوں سے سر نکالتے۔

بٹالہ ایک متشدد قسم کا مذہبی قصبہ تھا۔ آبادی کی اکثریت تو حنفی المسلک سنّیوں پر مشتمل تھی لیکن اہلِ حدیث اور اہلِ تشیع بھی خاصی مؤثر حیثیت رکھتے تھے۔ اس زمانے میں قادیان جانے کے لئے بٹالہ ہی ریلوے اسٹیشن تھا۔ اس لئے وہاں کے زائرین کے لئے یہ قصبہ ناگزیر گذرگاہ تھا۔ علاوہ ازیں، یہ عیسائی مشنریوں کا مرکز اور آریہ سماج کا بھی گڑھ تھا۔ اس زمانے میں بین الفرق مناظروں اور بین المذاہب مباحثوں کا بڑا زور تھا۔ اس لئے، جس طرح دریا کے کنارے بستیوں کے بچے پیدائشی تیراک ہوتے ہیں، بٹالہ کے مذہب پرست طلبا پیدائشی مناظر ہوتے تھے۔ فضا کے ان تقاضوں کی وجہ سے مختلف فرقوں اور مذہبوں کے تقابلی مطالعہ کی ضرورت لاحق ہوئی۔ دادا جان کو ان سب کے لٹریچر پر کافی عبور حاصل تھا (اور تو اور، وہ سنسکرت کے بھی عالم تھے) اس لئے میں ان وادیوں سے بآسانی گزرتا چلا گیا۔ اس کے ساتھ یہ بھی میری انتہائی خوش بختی تھی کہ وہ اس قدر مذہبی شخصیت ہونے کے باوجود، بڑے روشن خیال اور وسیع الظرف واقعہ ہوتے تھے۔ ابتداءً وہ انگریزی نہیں جانتے تھے لیکن جب انھوں نے محسوس کیا کہ اس زمانے میں اس زبان کا جاننا کس قدر ضروری ہے، تو انھوں نے کافی بڑی عمر میں تھوڑے سے عرصہ میں اس میں بھی خاصی استعداد حاصل کر لی۔ مجھے اس کا یہ فائدہ ہوا کہ انھوں نے میری اسکول کی تعلیم کو بھی نظرانداز نہ ہونے دیا۔ انہی مؤثرات و عوامل کا نتیجہ تھا کہ میٹرک تک پہنچتے پہنچتے، میری نگاہ کی مشرقی اور مغربی افقیں کافی وسیع ہو چکی تھیں ـــــ اور ان کے ساتھ ہی "باطنی علوم" کی گہرائیاں بھی کافی عمیق۔

تصوّف کا "ہمہ اوست" انسان کو وسیع المشرب بنا دیتا ہے ـــــ اگرچہ اکثر اوقات کچھ ضرورت سے زیادہ ہی وسیع المشرب ـــــ اس وسیع المشربی کا نتیجہ تھا کہ میں جس جذب و شوق سے میلاد کی محفلوں میں شریک ہوتا

تھا، اسی سوز و گداز کے ساتھ عزاداری کی مجلسوں میں بھی حاضری دیتا تھا[1] اور قوالی تو خیر تھی ہی جزوِ عبادت ـ اس قسم کے اضداد کا مجموعہ تھا میرے بچپن اور ابتدائے شباب کا زمانہ۔

لیکن میں نے ابھی فطرت کی اس نوازشِ خصوصی کا ذکر نہیں کیا جس نے میری زندگی کے دھارے کا رُخ بدل دیا. اس نے ذوقِ سلیم اور ذہنِ رسا کے ساتھ مجھے تنقیدی نگاہ بھی عطا کی تھی. غالب نے کہا تھا کہ

عشق سے طبیعت نے زیست کا مزہ پایا
درد کی دوا پائی، دردِ لا دوا پایا

عشق کے متعلق تو میں کہہ نہیں سکتا، تنقیدی نگاہ کے متعلق اتنا ضرور کہہ سکتا ہوں کہ اس سے دردِ پیدا ہوتا ہے لا دوا، اور پھر یہی دردِ لا دوا، دنیا کے ہر درد کا مداوا بن جاتا ہے. یہی وہ جنسِ گراں مایہ ہے. (کم ازکم میرے حق میں تو یہ ایسی ہی ثابت ہوئی ہے) جس کے متعلق کہا گیا ہے کہ

اے متاعِ درد در بازارِ جاں انداختہ گوھرِ ہر سود در جیبِ زیاں انداختہ

غالب نے یہ بھی کہا تھا کہ

گر عشق نبودے و غمِ عشق نبودے ایں ہمہ سخنِ نغز، کہ گفتے، کہ شنودے

میں بھی اس کی ہمنوائی میں اتنا کہہ سکتا ہوں کہ اگر مجھے یہ تنقیدی نگاہ نہ ملتی، تو میری ساری متاعِ حیات "یوسف بقیمتِ اوّل خریدہ" سے زیادہ کچھ نہ ہوتی. میں نہ کوئی "سخنِ نغز" کہہ سکتا، نہ سن سکتا۔

میں پہلے، اِس کانٹے کی اُس کھٹک کی طرف آتا ہوں، جس کا درد اس زمانے میں لا دوا تھا. میں ایک دن تفسیر دیکھ رہا تھا. سورۂ احزاب کی یہ آیت میرے سامنے تھی.

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَكُوْنُوْا كَالَّذِيْنَ اٰذَوْا مُوْسٰى فَبَرَّاَهُ اللّٰهُ مِمَّا قَالُوْا ...... (۳۳/۶۹)

(اے ایمان والو! تم ان لوگوں کی طرح نہ ہو جانا، جنھوں نے موسیٰؑ کو (طرح طرح کی باتیں کرکے) ستایا لیکن خدا نے ان تمام باتوں سے اس کی بریت کردی.

بات کچھ ایسی دقیق نہ تھی. قرآن مجید کے مختلف مقامات میں تفصیل سے درج ہے کہ بنی اسرائیل کس طرح حضرت موسیٰؑ

---

[1] ویسے بھی صوفی، آدھا شیعہ ہوتا ہے. تفصیل اس اجمال کی کتاب کے آخری باب میں ملے گی۔

کو تنگ کرتے اور بات بات پر بگڑ کر بیٹھ جاتے تھے۔ اس سے حضرت موسیٰؑ کا تو کچھ نہ بگڑا، خود وہ قوم معتوب اور نعماتِ خداوندی سے محروم ہوگئی لیکن اس کی تفسیر میں مجھے یہ لکھا ہوا ملا۔

حضرت ابوہریرہؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہؐ نے فرمایا کہ حضرت موسیٰؑ بڑے حیادار تھے۔ اس طرح جسم کو چھپائے رکھتے تھے کہ اس کا کوئی حصہ دکھائی نہیں دیتا تھا۔ بنی اسرائیل نے انھیں ستانا شروع کیا اور کہا کہ یہ اس قدر جو اپنے بدن کو چھپاتے رکھتے ہیں تو اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کو برص یا اس قسم کی کوئی اور بیماری ہے۔ اللہ نے چاہا کہ (حضرت) موسیٰؑ کو ان کی تہمت سے بری کرے۔ سو موسیٰؑ ایک دن تنہائی میں اپنے کپڑوں کو پتھر پر رکھ کر غسل کرنے لگے۔ جب فارغ ہوئے اور اپنے کپڑے لینے کے لئے اس کی طرف بڑھے، تو پتھر ان کے کپڑوں سمیت بھاگا۔ موسیٰؑ لٹھ لے کر اس کے پیچھے دوڑے، یہ کہتے ہوئے کہ اے پتھر! میرے کپڑے، اے پتھر! میرے کپڑے۔ یہاں تک کہ وہ بنی اسرائیل کے ایک گروہ تک پہنچ گئے۔ انھوں نے انھیں (حضرت موسیٰؑ) کو برہنہ دیکھ لیا اور ان پر واضح ہوگیا کہ وہ ساخت میں سب سے بڑھ کر حسین تھے۔ اس طرح اللہ نے ان کے الزام سے موسیٰؑ کو بری کردیا۔ اس جگہ پہنچ کر پتھر رک گیا۔ موسیٰؑ نے اپنے کپڑے لیکر پہن لئے۔ پھر پتھر کو لٹھ سے مارنے لگے۔ اللہ کی قسم، اس پر ان کی لاٹھی کے نشانات ہیں تین یا پانچ۔ (جامع ترمذی و بخاری)

مجھے جھنجھنی آگئی اور میں گہری سوچ میں ڈوب گیا۔ دل میں طرح طرح کے شکوک ابھرنے لگے لیکن جب یہ خیال آیا کہ یہ تو نبی اکرمؐ کی ارشاد فرمودہ تفسیر ہے، تو کپکپا اٹھا۔ گڑگڑا کر توبہ کی اور شیطان سے پناہ مانگی جو اس قسم کے وساوس پیدا کر رہا تھا لیکن اس کے بعد کیفیت یہ ہوگئی کہ تفسیر کا کوئی سا ورق الٹا، اس پر اسی قسم کی تفسیری روایات دکھائی دیں۔ اس کشمکش میں جو کچھ میرے دل پر گزر رہی تھی، اسے کسی سے بیان نہیں کرسکتا تھا، نہ قرآنِ پاک کی تفسیر چھوڑ سکتا تھا، نہ اس پر اختیار تھا کہ اس سے دل میں اس قسم کے شکوک اور وساوس پیدا نہ ہوں۔ شکوک پیدا ہونے کے ساتھ ہی دل میں یہ خیال ابھرتا کہ رسول اللہؐ کی بیان فرمودہ تفسیر، اور اس کے خلاف شکوک! معاذ اللہ ثم معاذ اللہ۔

ایک دن بخاری شریف دیکھ رہا تھا، تو اس میں اس روایت پر نگاہ ٹھٹک کر رہ گئی۔

رسول اللہؐ نے فرمایا کہ سلیمان بن داؤد (علیہما السلام) نے ایک روز کہا کہ آج شب کو میں سو عورتوں کے پاس

یا ننانوے عورتوں کے پاس جاؤں گا۔ وہ سب عورتیں ایک ایک شاہسوار پیدا کریں گی جو خدا کی راہ میں جہاد کرے گا۔ ان کے ایک ہم نشین نے ان سے کہا کہ "انشاء اللہ" کہو، مگر انھوں نے "انشاء اللہ" نہ کہا۔ پس ان میں سے صرف ایک عورت حاملہ ہوئی اور وہ بھی آدھا بچہ جنی۔ قسم ہے کہ جس کے ہاتھ میں محمدؐ کی جان ہے، اگر وہ "انشاء اللہ" کہہ لیتے تو سب عورتوں کے بچے پیدا ہو جاتے اور وہ سب شہسوار ہو کر اللہ کی راہ میں جہاد کرتے۔ (بخاری۔ کتاب الجہاد)

"اصح الکتب بعد کتاب اللہ" میں یہ حدیثِ رسول!! سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ میں کیا کروں، اور کہاں جاؤں گا ——؟ دل میں کشمکش کی آگ اور تیزی سے بھڑک اٹھی۔ تفاسیر میں وہ کچھ دیکھتا تو کتاب اللہ (قرآن مجید) کے متعلق طرح طرح کے خیالات اُبھرنے شروع ہو جاتے۔ احادیثِ مقدسہ میں یہ کچھ دیکھتا تو جگر شق ہو کر رہ جاتا۔ ان کے بعد کتبِ فقہ سامنے آتیں تو ان میں ایسے ایسے "مسائل" لکھے ملتے جن کا میں، اس زمانے میں تو ایک طرف، اس وقت بھی کسی محفل میں تذکرہ نہیں کر سکتا —— یہ تھی میری اضطراری کیفیت، لیکن مشکل یہ تھی کہ جو کچھ دل پر بیت رہی تھی، اسے زبان تک لا نہیں سکتا تھا۔ اُس ماحول میں ایک انجانا خوف تھا جو دل و دماغ پر بُری طرح چھا رہا تھا۔ چنانچہ اس کے بعد ہوا یہ کہ میں ان کُتبِ مقدسہ کو اٹھاتا اور انھیں چوم کر پھر اسی طرح رکھ دیتا۔

یہ آتشِ خاموش میرے دل میں سلگ رہی تھی کہ تاریخ نے اسے شعلۂ جوالہ میں بدل دیا۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے۔ اور یہ کانٹے وہ ہیں کہ جن کی چبھن کبھی فراموش نہیں کی جا سکتی —— کہ محرم قریب آ رہا تھا۔ سنیّوں کی مسجدوں اور شیعہ حضرات کے امام باڑوں میں محافل و مجالس کا انعقاد شروع ہو گیا تھا۔ جیسا کہ میں نے پہلے کہا ہے، میں ان تقاریب میں بڑے احترام و عقیدت سے شامل ہوا کرتا تھا۔

بخاری شریف میں ایک حدیث ہے کہ حضورؐ نے فرمایا کہ میری اُمت کا پہلا لشکر جو قسطنطنیہ پر حملہ کرے گا، وہ بخشا جا چکا ہے —— مغفورٌ لهم —— حدیث تو یہ پہلے معلوم تھی، تاریخ میں کیا دیکھتا ہوں کہ جس لشکر نے پہلے پہل قسطنطنیہ پر حملہ کیا، اس کا سپہ سالار یزید ابن معاویہ تھا، اور بڑے بڑے جلیل القدر صحابہؓ اور خود امام حسینؓ اس میں سپاہی (مجاہد) کی حیثیت سے شریک تھے۔

یزید، اور اس لشکر کا سپہ سالار، جس کی مغفرت کی بشارت و ضمانت رسول اللہؐ نے دی تھی! یقین مانئے، پاؤں تلے سے زمین نکل گئی —— سر چکرا گیا —— اس وقت اس سے زیادہ اور کیا کہوں کہ میں نہ سنیّوں کی محفل میں شریک ہوا، نہ شیعوں کی مجلسوں میں۔ تنہا خاموش بیٹھا رہتا، اور کبھی کبھی بے ساختہ پکار اٹھتا کہ

ہے دلِ شوریدۂ غالب طلسمِ پیچ و تاب
رحم کر اپنی تمنّا پر کہ کس مشکل میں ہے

لیکن نہ اس "دلِ شوریدہ" پر کسی کو رحم آتا تھا نہ اس تمنّا پر جو اس بھنور میں طلسمِ پیچ و تاب بن رہی تھی! میری وہ جنت چھن رہی تھی جس نے میرے دل و دماغ کو بچپن سے پربہار بنا رکھا تھا۔ میرا وہ سکون برباد ہو رہا تھا جسے میں نے برسوں کی حسین آرزوؤں اور مقدّس دعاؤں سے حاصل کیا تھا اور اس کی جگہ حالت یہ تھی کہ

مرا دردیست اندر دل، اگر گویم زباں سوزد
اگر دم درکشم ترسم کہ مغزِ استخواں سوزد

لے دے کے "ذکر و فکرِ صبحگاہی" (تصوف) کا پیدا کردہ ایک سُرور تھا، سو میری حرماں نصیبی (اور اب سمجھتا ہوں کہ خوش بختی) کہ وہ بھی "نذرِ برہمن" ہو گیا۔ تفصیل اس غارت گریٔ بہارِ چمن" کی دلچسپ بھی ہے اور فکر انگیز بھی۔

دادا جان کے ہاں عام طور پر سرِ شام، شہر کے اچھے اچھے دانشور آتے اور مختلف علمی اور فکری موضوعات پر گفتگو رہتی. لیکن رات ڈھلے ایک اور محفل جمتی جو پُر اسرار سی ہوتی۔ اس میں دور دراز کے سادھو، سنیاسی، یوگی آتے اور موضوع ویدانت اور ہمہ اوست کے رموز و اسرار ہوتے۔ تصوف کا انتہائے کمال، کرامات سمجھا جاتا ہے اور انہی کرامات (اور ان کے تذکروں) سے حضرات اولیاء کرام کی عظمت و عقیدت (بلکہ ہیبت) دلوں میں جاگزیں ہوتی ہے۔ پھر تصوف کو "مغزِ دین" کہا جاتا ہے اور منتہائے اسلام۔ وہ یوگی، سنیاسی آتے تو ان سے لامحالہ صوفیائے کرام کے کشف و کرامات کے تذکرے چھڑتے، لیکن میری حیرت کی انتہا نہ رہتی جب میں دیکھتا کہ بعض یوگی، ان سے بھی کہیں زیادہ حیرت انگیز اور تعجب خیز "کرامات" دکھا دیتے۔ اس سے میرے دل میں یہ خیال ابھرتا کہ اگر ہمارے اولیاء کرام کی کرامات، دین کا عصارہ اور قربِ خداوندی کا نتیجہ ہیں، تو یہ بُت پرست، مشرک، یوگی، ان سے بھی زیادہ حیرت فروش "کرامات" کیسے دکھا دیتے ہیں؟ کتبِ تصوف میں اس کا جواب زیادہ سے زیادہ یہ ملتا کہ اولیاء کرام کی کرامات، کرامات کہلاتی ہیں، اور ان مشرکین کی شعبدہ بازیاں، استدراج، لیکن یہ لفظی تفاوت میرے لئے وجۂ تسکین نہ بن سکتا۔ اس طرح رفتہ رفتہ میرا وہ سکون بھی چھنتا چلا گیا، جسے حاصل کرنے کے لئے میں نے اپنی صحت تک قربان کر دی تھی۔ (اس کے اثرات عمر بھر میرے ساتھ رہے۔ اب بھی اسی طرح موجود ہیں۔ مجھے صحت مند زندگی کبھی نصیب نہیں ہوئی!)

کبھی کبھی جی میں آتا کہ ان شکوک و شبہات کا (جن کی آماجگاہ میرا قلبِ حزیں بن رہا تھا اور جن کی وجہ سے میرا دن کا چین اور راتوں کی نیند مجھ پر حرام ہو رہی تھی) دادا جان سے تذکرہ کروں، لیکن (میں نہیں کہہ سکتا کہ یہ شدّتِ احترام و

عقیدت کا نتیجہ تھا یا ان کے علوِ مرتبت کی عظمت کا احساس) میں اپنے اندر اس کی جرأت نہیں پاتا تھا۔ میں اُسے ڈر بھی نہیں کہہ سکتا، ہیبت بھی نہیں ـــ وہ تو بڑے ہی محبت کرنے والے شفیق تھے ـــ لیکن کچھ تھا جس کی وجہ سے ایسا کہنا تو ایک طرف، میں ان کے دل میں اس کا احساس تک بھی پیدا ہونے نہیں دینا چاہتا تھا کہ میرے دل میں اس قسم کے شکوک ابھر رہے ہیں ـــ اور پھر ابھی میری عمر بھی کیا تھی!

میں اس داستانِ تپش و خلش کو زیادہ طول نہیں دینا چاہتا اور اتنا کہنے پر اکتفا کرتا ہوں کہ میرے قلب و دماغ کی یہ اضطراری کیفیت برسوں تک رہی، تاآنکہ مجھے بصیغۂ ملازمت لاہور آنا پڑا۔ یہ تبدیلی میرے حق میں آیۂ رحمت ثابت ہوئی۔ اس سے میری زندگی کے ایک نئے باب کا آغاز ہوگیا۔ اس فضا میں مجھے زیادہ آزادی سے سوچنے کا موقعہ مل گیا۔ یہ آج سے پچاس سال پہلے کی بات ہے۔

علامہ اقبالؒ سے میرا ذہنی تعارف بہت پہلے ہوچکا تھا۔ وہ یوں کہ جب ان کی مثنوی ـ اسرارِ خودی ـــ شائع ہوئی، تو دادا جان نے مجھے خصوصیت کے ساتھ اسے پڑھایا۔ مجھے اب تک یاد ہے کہ وہ چھوٹی تقطیع کے نفیس کاغذ پر بڑے خوبصورت انداز میں چھپی تھی اور دادا جان کے پاس جو نسخہ تھا، اس پر علامہ اقبالؒ کے دستخط ثبت تھے۔ اس وقت تو مجھے معلوم نہیں تھا کہ جس کتاب پر مصنف کے دستخط ثبت ہوں، اس کا مطلب کیا ہوتا ہے لیکن اب اندازہ ہوتا ہے کہ حضرت علامہ نے وہ نسخہ دادا جان کو تقدیماً ارسال فرمایا تھا اور ان کے باہمی روابط تھے۔ اس کا اندازہ اس سے بھی ہوسکتا ہے کہ جب میں لاہور آنے لگا تو انھوں نے (دادا جان نے) لاہور میں دو "بزرگوں" سے ملنے کے لئے فرمایا تھا۔ ایک امام الدین بخار، جو نواں کوٹ میں رہتے تھے اور کہا جاتا تھا کہ وہ لاہور کے قطب ہیں اور دوسرے علامہ اقبالؒ ـــ بہرحال، بات اس مثنوی کی ہورہی تھی۔ اس کے اُس (پہلے) ایڈیشن، میں حافظؔ کے متعلق وہ اشعار بھی تھے، جن کی بنا پر، ملک بھر کے متصوفین نے علامہ کے خلاف طوفان برپا کردیا تھا۔ اس بحث و نزاع میں علامہ نے "عجمی اسلام" یا اسلام پر عجمی اثرات کا بار بار ذکر کیا تھا ـــ اور یہ بات میرے دماغ کے ساتھ چپک گئی تھی۔ لاہور کی نسبتاً آزاد فضا میں میرے دل میں اس تجسس کا جذبہ بیدار ہوا کہ معلوم کیا جائے کہ حقیقی اسلام اور عجمی اسلام میں کیا فرق ہے اور وہ عجمی اثرات کیا تھے جن سے حضرت علامہ نے اس طرح متنبہ کیا تھا۔ یہاں سے تحقیقات کا ایک نیا باب میرے سامنے کھل گیا۔ یہ تحقیق یکسر آزادانہ تھی کیونکہ "سابقہ اسلام" کی اندھی عقیدت ان شکوک و شبہات نے ختم نہیں تو دھندلی ضرور کردی تھی جن کا ذکر اوپر کیا جاچکا ہے۔ میں نے قریب دس سال کا عرصہ ان سنگلاخ زمینوں اور خار دار جھاڑیوں میں گذارا، اور ان موضوعات سے متعلق جو کتابیں بھی مجھے دستیاب ہوسکیں، انھیں چاٹ ہی نہیں لیا، ہضم کر ڈالا۔ مجھے اس حقیقت کے اعتراف و اعلان

میں کوئی باک یا تامل نہیں کہ اس زمانے میں، سابقہ معتقدات میں سے کسی پر بھی میرا یقین باقی نہیں رہا تھا۔ یوں کہئے کہ میں اس زمانے میں لا کی منزل سے گذر رہا تھا اور اِلّا ہنوز میرے سامنے نہیں آیا تھا۔ ان حالات میں عین ممکن تھا کہ میں اسلام ہی سے برگشتہ ہو جاتا لیکن (میری انتہائی خوش بختی کہ) اس ورطۂ لا میں ایسا جاذبہ موجود رہا جو ان تلاطم خیزیوں میں میری کشتی کا لنگر بن گیا اور وہ جاذبہ تھا حضور نبیٔ اکرمؐ کی ذاتِ اقدس و اعظمؐ کے ساتھ میری بے پناہ عقیدت ہی نہیں محبت۔ میرا ایمان تھا کہ ایسی عظیم ہستی جس نے انسانوں کی داخلی اور خارجی دنیا میں ایسا حیرت انگیز انقلاب برپا کر دیا تھا، نہ تو (معاذ اللہ) فریب خوردہ ہو سکتی ہے نہ فریب کار۔ اس لئے جب آپ نے فرمایا ہے کہ قرآن مجید نہ میری، نہ کسی اور انسان کی فکری تخلیق ہے بلکہ یہ خدا کا کلام ہے تو مجھے اس دعویٰ کو یوں ہی نہیں جھٹک دینا چاہیئے انتظار کرنا چاہیئے تاآنکہ میں قرآن کو خود سمجھنے کے قابل ہو جاؤں۔ بس یہ تھا ایک سہارا (اور کس قدر محکم سہارا) جس نے مجھے ان طوفانوں میں تھامے رکھا اور میرے پاؤں میں لغزش نہ آنے دی۔ حقیقت یہ ہے کہ اس سے کم کشش کی کوئی قوت مجھے اس ورطہ میں سنبھال نہیں سکتی تھی۔ سچ ہے۔

تند و سبک سیر ہے گرچہ زمانے کی رَو   عشق خود اِک سیل ہے، سیل کو لیتا ہے تھام

کس قدر احسانِ عظیم ہے اس ذرۂ ناچیز پر اس آفتابِ عالم تاب کا، جس کی رحمۃ اللعالمینی کے تصدق مجھے منزل ملی، مقام ملا، مدعا ملا۔

کوثر چکد از لبم، باایں تشنہ لبی   خاور دمد از تبسم، باایں تیرہ شبی

اے دوست ادب، کہ در حریمِ دلِ ماست   شاہنشہِ انبیاء، رسولِ عربی

اِنَّ اللّٰهَ وَ مَلٰٓئِكَتَهٗ يُصَلُّوْنَ عَلَى النَّبِيِّ ؕ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا صَلُّوْا عَلَيْهِ وَ سَلِّمُوْا تَسْلِيْمًا ۔ (۳۳/۵۶)

برسوں کی تحقیق و کاوش کے بعد یہ حقیقت میرے سامنے آگئی کہ ہمارا مروّجہ اسلام جن عناصر کا مجموعہ ہے، وہ کہاں کہاں سے مستعار لئے گئے اور کس طرح جزوِ اسلام (بلکہ عینِ اسلام) بن گئے ہیں۔ (ضمناً) میرے تصنیفی پروگرام میں یہ بھی شامل ہے کہ میں ان تحقیقات کی روشنی میں اسلام کی، (مسلمانوں کی نہیں، اسلام کی) تاریخ مرتب کروں، جس میں یہ بتایا جائے کہ حقیقی اسلام کس طرح مروّجہ اسلام میں تبدیل ہو گیا لیکن یہ اسی وقت ممکن ہو گا جب میں قرآنِ مجید کے متعلق اپنے پیشِ نظر پروگرام سے فارغ ہو گیا کہ اُسے ہر دوسرے کام پر تقدّم و تفوّق حاصل ہے۔ سرِدست، اس تاریخ کی ہلکی سی جھلک اس کتاب کے آخری باب میں آپ کے سامنے آئے گی۔

وادیٔ لآ سے گزرنے کے بعد، میں منزلِ اِلّاؔ کی طرف آیا۔ علامہ اقبالؒ نے کہا تھا کہ

گر تو میخواہی مسلمان زیستن   نیست ممکن جز بقرآں زیستن

اس سے یہ بنیادی حقیقت سامنے آئی کہ دین قرآنِ کریم کے اندر ہے، اور قرآنِ کریم سمجھ میں نہیں آسکتا جب تک اسے خالی الذہن ہو کر نہ سمجھا جائے۔ لَا يَمَسُّهٗۤ اِلَّا الْمُطَهَّرُوْنَ (۵۶/۷۹) سے، میرے نزدیک یہی مراد ہے۔ فیضانِ اقبالؒ سے یہ حقیقت بھی میری سمجھ میں آئی کہ قرآنِ کریم کے سمجھنے کا طریق "محاورۂ عرب اور تصریفِ آیات" ہے۔ محاورۂ عرب سے مراد یہ ہے کہ یہ سمجھا جائے کہ زمانۂ نزولِ قرآن میں عربوں کے ہاں (جن کی زبان میں یہ کتابِ عظیم نازل ہوئی تھی) قرآنی الفاظ کا مفہوم کیا لیا جاتا تھا اور تصریفِ آیات سے مفہوم یہ کہ قرآنِ کریم میں ایک موضوع پر مختلف مقامات پر جو کچھ آیا ہے اسے بیک وقت سامنے رکھا جائے۔ اس سے قرآنِ کریم اپنے مطالب آپ واضح کر دیتا ہے۔ (دیکھئے ۶/۱۰۶)

یہ سفر بڑا طویل بھی تھا اور صبر آزما بھی۔ ہمارے ہاں کے اس ہزار سالہ عرصہ میں، مذہب[1] اسلام کے متعلق اتنا کچھ لکھا گیا ہے کہ اسے یکجا کیا جائے تو اہرامِ مصر بھی اس ڈھیر کے سامنے پست نظر آئیں لیکن دیدۂ عبرت اس حرماں نصیبی پر جس قدر آنسو بھی بہائے کم ہے کہ اسے اس آسماں بوس انبار میں قرآنِ خالص کے متعلق جو کچھ ملے گا وہ نہ ہونے کے برابر ہے۔ قرآنی لغات میں بھی لے دے کے امام راغب کا نام لیا جاسکتا ہے۔ وہ بے شک ایک مفید کوشش ہے لیکن وہ ایسی مختصر ہے کہ اس سے قرآنی تصورات سامنے نہیں آسکتے۔ باقی رہی مضامین کے اعتبار سے قرآنی تبویب، سو اس باب میں بھی جو کچھ ہوا ہے وہ چنداں مفید مطلب نہیں۔ وہ محض الفاظ کی اساس پر میکانکی تبویب ہے۔ میں یہ نہیں کہتا کہ قرآنِ خالص کے متعلق کسی نے کوئی مفید کام کیا ہی نہیں۔ کیا ہوگا لیکن قدامت پرست طبقہ نے اسے باقی نہیں رہنے دیا کہ ان کی انتہائی کوشش یہی رہی ہے کہ قرآنِ کریم امت کی نگاہوں سے اوجھل رہے کیونکہ اس کی تعلیم کے بے نقاب اور عام ہو جانے سے، ان کے مفادات پر زد پڑتی تھی۔ اندریں حالات، میں نے جلد محسوس کر لیا کہ اگر مجھے قرآن کے بتائے ہوئے طریقہ سے قرآن سمجھنا ہے تو اس کے لئے سب کچھ مجھے خود ہی کرنا ہوگا

---

[1] واضح رہے کہ میں اس اسلام کو جسے خدائے تعالیٰ نے بوساطتِ نبی اکرمؐ دنیا کو دیا تھا، دین کہہ کر پکارتا ہوں کہ قرآنِ کریم میں اس کے لئے یہی لفظ آیا ہے، اور مروّجہ اسلام کو جو انسانوں کے خود ساختہ تصورات و معتقدات سے مرکب ہے، مذہب کے نام سے تعبیر۔ مذہب کا لفظ تک قرآن میں نہیں آیا۔

جیسا کہ میں نے پہلے کہا ہے، یہ راستہ دور دراز بھی تھا اور دشوار گزار بھی، جسے مجھے بلا رفیق و زمیل، تنہا طے کرنا تھا۔ اگر یہاں بھی عشق، جرأت آفریں اور حوصلہ افزا نہ ہوتا تو میں اس کو ہلکی کی ہمت کبھی نہ کر سکتا۔ بحمد اللہ کہ قریب تیس سال کی مسلسل خارہ شگافی کے بعد، میں ان چٹانوں سے جوئے شیر لانے میں کامیاب ہوگیا۔ چار جلدوں میں میری لغات القرآن اور تیس پاروں میں مفہوم القرآن اس کے ثمرات میں سے ہیں۔ دو درجن کے قریب قرآنی حقائق پر مشتمل مجلدات، اور طلوعِ اسلام کے مضامین اس پر مستزاد ہیں ــــ اور اگر ان میں اس درسِ قرآن کو بھی شامل کر لیا جائے جو گذشتہ بیس سال سے مسلسل دیا جا رہا ہے اور جسے ٹیپ ریکارڈر کے ذریعے محفوظ کر لیا گیا ہے تو ــــ سفینہ چاہیئے اس بحرِ بے کراں کے لئے ــــ واضح رہے کہ اس تمام عرصہ میں، میں ملازمت بھی کرتا رہا (جس سے میں نے ۱۹۵۵ء میں قبل از وقت پنشن لے لی) جب میں اس قطع کردہ منزل پر نگۂ بازگشت ڈالتا ہوں تو یقین مانیئے، میرے تصور میں بھی نہیں آتا کہ یہ سفر میں نے تنہا کیسے طے کر لیا۔ اس کے متعلق اس کے سوا کیا کہہ سکتا ہوں کہ

عشق کی اک جست نے طے کر دیا قصہ تمام　　　اس زمین و آسمان کو بیکراں سمجھا تھا میں

بعید از سپاس گزاری ہوگا اگر میں اس مقام پر استاذی المکرم حافظ محمد اسلم جیراج پوری (علیہ الرحمۃ) کا ذکر نہ کروں، جن کی مشفقانہ حوصلہ افزائی میرے لئے موجبِ ہزار تقویت بنتی رہی۔ میری آنکھوں نے اس مردِ درویش جیسا پاک سیرت، عالمِ متبحر، قرآن کا شیدائی بلکہ فدائی کہیں نہیں دیکھا۔ خدا انھیں اپنے سحابِ کرم کے سایہ میں رکھے ــــ **طُوبیٰ لہٗ وحسنِ مآب**۔

جب اس طرح قرآنِ خالص میرے سامنے آیا تو میرے قلب و دماغ کی دنیا جگمگا اٹھی۔ اللہ تعالیٰ نے اپنی اس کتابِ عظیم کے متعلق کہا ہے۔ کِتَابٌ اَنْزَلْنٰہُ اِلَیْکَ لِتُخْرِجَ النَّاسَ مِنَ الظُّلُمٰتِ اِلَی النُّوْرِ۔ (۱۴/۱)۔ "اے رسولؐ! ہم نے اس کتاب کو تیری طرف اس لئے نازل کیا ہے کہ اس کے ذریعے تو نوعِ انسان کو تاریکیوں سے نکال کر روشنی کی طرف لے آئے۔" اور کسی کا تو اس پر اعتقاداً ایمان ہوگا لیکن میرا اس حقیقتِ کبریٰ پر ایمان علیٰ وجہ البصیرت ہے۔ اسلام کی صداقتوں پر میرا ایمان تقلیدی نہیں ــــ تقلیدی ایمان کو تو میں بہت پیچھے چھوڑ آیا تھا۔ میرا یہ ایمان ذاتی تحقیق، علم و بصیرت اور دلائل و براہین پر مبنی ہے، اور اس جہت سے میں اپنے آپ کو "**نَو مُسلِم**" کہا کرتا ہوں۔ قرآن پر اس طرح ایمان کا نتیجہ ہے کہ میں ان صداقتوں کو پورے حتم و یقین کے ساتھ علم و بصیرت کی روشنی میں، دنیا کے سامنے پیش کر سکتا ہوں ــــ اور ایک مدت سے ایسا کر رہا ہوں۔ ذٰلِکَ فَضْلُ اللّٰہِ یُؤْتِیْہِ مَنْ یَّشَاءُ۔

ان تحقیقی کاوشوں کی رُو سے، تفسیر و روایات اور فقہ و تاریخ کی پیدا کردہ تاریکیاں کس طرح چھٹ گئیں، یہ داستان تو آپ کے سامنے آ گئی۔ تصوف کے دلدل سے میں کس طرح باہر نکلا، یہ قصہ ابھی محتاجِ بیان ہے۔ اس داستان کے بیان کرنے سے پہلے، میں ایک اہم نکتہ آپ کے سامنے لانا ضروری سمجھتا ہوں۔ وہ یہ کہ جن غلط نظریات کا تعلق انسان کے ذہن (INTELLECT) سے ہوتا ہے، فکری طور پر ان کی تصحیح یا اصلاح آسانی سے ہو سکتی ہے، لیکن جن تصورات کا تعلق اس کے جذبات (EMOTIONS) سے ہو، وہ دل کی گہرائیوں میں پیوست ہوتے ہیں اس لیے ان سے چھٹکارا حاصل کرنا بڑا مشکل ہوتا ہے۔ قرآنِ کریم نے جب بنی اسرائیل کے متعلق کہا تھا کہ وَ اُشۡرِبُوۡا فِیۡ قُلُوۡبِہِمُ الۡعِجۡلَ (۲/۹۳) "گوسالہ کی محبت ان کے دل کی گہرائیوں میں اُتر چکی تھی" تو اس سے اسی حقیقت کا اظہار مقصود تھا۔ کبھی کبھی میں سوچتا ہوں کہ علامہ اقبالؒ نے جب کہا تھا کہ

مقامِ شوق میں کھویا گیا یہ فرزانہ مقامِ عقل سے آساں گزر گیا اقبالؒ

تو اس سے شاید وہ اپنی انہی الجھنوں کی طرف اشارہ کر رہے تھے۔ یہ منزل میرے لئے بھی بڑی دشوار گزار اور صبر طلب ہوئی۔

پہلے بتایا جا چکا ہے کہ تصوف کے متعلق میری کھٹک اس وقت شروع ہوئی جب میں نے دیکھا کہ ہندو یوگیوں اور سنیاسیوں سے بھی اُسی قسم کے شعبدات سرزد ہو جاتے ہیں، جس قسم کی "کرامات" کے مدعی ہمارے اہلِ تصوف ہوتے ہیں۔ جن مراقبات و ریاضات کا نتیجہ یہ کرامات ہوتی ہیں، ان کا مجھے ذاتی تجربہ بھی تھا۔ میں اس کاوش اور تجسس میں تھا کہ معلوم کروں کہ مشرک سنیاسیوں اور یوگیوں سے اس قسم کے کارنامے کس طرح سرزد ہو جاتے ہیں۔ میں نئی دہلی میں تھا کہ وہاں بنگلور (جنوبی ہند) کا ایک پنڈت گیتا پر لیکچر دینے کے لئے آیا۔ وہ فلسفہ کا استاذ تھا اور سنسکرت کے علاوہ اسے مغربی علوم پر بھی کافی عبور حاصل تھا۔ اس کے علم اور یوگ کی بڑی دھوم تھی۔ میں اس کے لیکچروں میں بھی جاتا اور علیحدگی میں بھی اس سے باتیں کرتا۔ ان ملاقاتوں کا نتیجہ تھا کہ وہ اپنی قیام گاہ سے اٹھ کر میرے ہاں چلا آیا۔ (میں اس زمانے میں وہاں تنہا رہتا تھا) اس نے مجھ سے قرآن کے حقائق و معارف سمجھنے شروع کئے اور میں اس سے گیتا پڑھنے لگا اور اس کے ساتھ ہی میں نے اس کے زیرِ ہدایت، یوگ کی مشقیں بھی شروع کر دیں۔ تھوڑے ہی عرصہ میں، میں نے دیکھ لیا کہ یوگ کی ان مشقوں اور تصوف کے مراقبوں میں صرف طریق کار کا فرق ہے۔ ماحصل دونوں کا ایک ہی ہے یعنی قوتِ خیال کا ارتکاز (CONCENTRATION OF WILL POWER)

قریب چھ ماہ بعد وہ گیتا اچاریہ، اپنی گیتا، کرشن جی کی مورتی اور ایک ڈکنگ نما ساز میرے پاس چھوڑ کر اور مجھ سے قرآن مجید

کا نسخہ لے کر چلا گیا؛ اور مجھ سے کہہ گیا کہ اس راستے کے مزید منازل طے کرنے کے لئے شملہ کی فلاں سمادھی میں جایا کرو۔ دفاتر کے شملہ جانے پر میں نے اس سمادھی میں جانا شروع کیا اور چند ہی ماہ کی مشقوں کے بعد وہیں پہنچ گیا جہاں مجھے مراقبوں اور مجاہدوں نے پہنچایا تھا۔ اسی زمانے میں مجھے یہ بھی معلوم ہوا کہ جو کچھ مشرق میں ان طریقوں سے حاصل کیا جاتا ہے یورپ میں وہی کچھ عملِ تنویم (ہپناٹزم) کے ذریعے پیدا کر لیا جاتا ہے۔ میں نے اس کی بھی مشق کی اور دیکھا کہ منتہیٰ اس کا بھی وہی ہے[لہ]۔ اس عملی تحقیق کے بعد میں اس نتیجہ پر پہنچ گیا کہ جہاں تک تصوف کے کراماتی گوشے کا تعلق ہے، یہ ایک فن ہے جسے ہر شخص (بلاتمیزِ مذہب و ملت) حاصل کر سکتا ہے، اسی طرح جیسے ورزش اور کسرت سے ہر شخص اپنی جسمانی قوت میں اضافہ کر سکتا ہے۔

یہ رہا تصوف کا فنی پہلو لیکن اس کی اصل و بنیاد اس دعویٰ پر استوار کی جاتی ہے کہ اس سے خدا سے "ہمکلامی" حاصل ہو جاتی ہے۔ قرآنِ کریم سے میں نے اس حقیقت کو بھی سمجھ لیا کہ خدا سے ہمکلامی صرف حضرات انبیاء کرام کو حاصل ہوتی تھی (جسے وحی کہا جاتا ہے) اس کا سلسلہ حضور نبی اکرمؐ کی ذات پر ختم ہو گیا۔ حضورؐ کے بعد خدا سے ہمکلامی کا تصور، ختمِ نبوت کی مہر توڑنے کا نہایت غیر محسوس اور (بظاہر) معصوم سا طریقہ ہے، اور عجمی سازش کا نتیجہ۔ خدا نے اپنی جو باتیں (کلام) انسانوں تک پہنچانی تھیں، وہ قرآن کریم میں محفوظ کر دیں۔ ان میں نہ کسی تبدیلی کی ضرورت ہے نہ اضافہ کی حاجت۔ لہٰذا مزید "ہمکلامی" کا کوئی مقصد ہی نہیں۔ یہی ختمِ نبوت کا مفہوم ہے۔ جہاں تک میں سمجھ سکا ہوں، صوفیا کے "کشف و الہام" ان کے اپنے نفسِ غیر شعوری کی کرشمہ سازیاں ہوتے ہیں، خدا سے ہمکلامی نہیں۔ ختمِ نبوت کے بعد خدا سے ہمکلامی کے عقیدہ نے اسلام کو کس قدر مسخ اور اُمت کو کس طرح تباہ کیا ہے اس کی تفصیل کتاب کے آخری باب میں سامنے آئے گی۔

یہ ہے مختصر الفاظ میں میرے سفرِ حیات کی داستان۔ میں نے اسے بیان کرنا اس لئے ضروری سمجھا ہے کہ اس پس منظر میں اس بات کا سمجھنا آسان ہو جائے گا کہ روایات، تفسیر، فقہ، تاریخ اور تصوف اور دوسری طرف قرآنی حقائق

لہ چونکہ اعجوبہ پسندی گویا "انسانی فطرت" میں داخل ہے اس لئے میرے اس قسم کے بیانات پڑھنے کے بعد اکثر احباب تقاضا کیا کرتے ہیں کہ انہیں ان طریقوں کی تفصیلات بتائی جائیں۔ میں اس کی وضاحت کر دینا چاہتا ہوں کہ جب سے میں نے ان راستوں کو چھوڑا ہے، پھر ان کی طرف مڑ کر بھی نہیں دیکھا۔ اس لئے مجھے اس قسم کی فرمائشوں سے معذور رکھا جائے۔

از گوشۂ بامے کہ پریدیم، پریدیم

سے متعلق جو کچھ میں کہتا ہوں اس کا انحصار سنی سنائی باتوں پر نہیں۔ میں سب کچھ اپنی ذاتی تحقیق اور تجربہ کے بعد کہتا ہوں
قلندر ہرچہ گوید، دیدہ گوید۔

میری عمر بھر کی تحقیق و کاوش کا ماحصل یہ ہے کہ،

(۱) جو دین، نبی اکرمؐ کی وساطت سے، منجانب اللہ ملا تھا، وہ بتمام وکمال، قرآنِ کریم کے اندر محفوظ ہے۔

(۲) دین کے معاملہ میں حق و باطل اور صحیح اور غلط کا معیار قرآنِ کریم ہے۔ روایات ہوں یا تاریخ، شریعت ہو یا طریقت، غرضیکہ جو کچھ بھی اسلام کے نام سے ہمارے ہاں مروّج ہے، ضرورت ہے کہ اسے قرآن کی کسوٹی پر پرکھ لیا جائے۔ جو اس پر پورا اُترے اسے صحیح تسلیم کر لیا جائے، جو اس کے خلاف ہو اسے مسترد کر دیا جائے۔ یہ دعویٰ کہ ہمارے ہاں جو کچھ متوارث چلا آرہا ہے، ہمارے اسلاف نے اسے بہرحال قرآن کی کسوٹی پر پرکھ لیا ہوگا، ہمیں بری الذمہ قرار نہیں دے سکتا۔ قرآن کا مطالبہ یہی ہے کہ تم خود غور و فکر کے بعد، ردّ و قبول کا فیصلہ کرو۔

(۳) اسلام مذہب نہیں، دین ہے جو صرف مسلمانوں کی اپنی آزاد مملکت میں عملی شکل اختیار کر سکتا ہے۔ اس مملکت کا فریضہ، قرآنی احکام و اقدار کو، عملاً نافذ کرنا ہوگا۔

(۴) قرآنی مملکت ـــ محض قوانین کے میکانکی نفاذ سے وجود میں نہیں آجاتی۔ اس کے لئے ایسی جماعت (اُمت) کی ضرورت ہوتی ہے جس کے افراد کی زندگی قرآنی اقدار کے قالب میں ڈھلی ہو۔ حضورؐ نے اپنی فقید المثال تعلیم اور عدیم النظیر تربیت سے ایک جماعت تیار فرمائی اور ان کی رفاقت سے قرآنی مملکت کی بنیاد رکھی۔ حضورؐ کا یہی عمل ہے جو قیامت تک نوعِ انسان کے لئے اسوۂ حسنہ (بہترین نمونہ) قرار پاتا ہے۔

ظاہر ہے کہ اس اسوۂ حسنہ کو سامنے لانے کے لئے حضورؐ کی سیرتِ طیبہ کا مطالعہ ناگزیر ہوگا۔ اس مقصد کے لئے جب میں نے کتبِ روایات و تاریخ کا مطالعہ کیا تو دیکھا کہ وہ اس قسم کے قصے کہانیوں سے بھری پڑی ہیں، جو نہ صرف خلافِ علم و عقل اور خلافِ قرآن ہیں بلکہ ان سے حضورؐ کی سیرت بھی داغدار ہو جاتی ہے۔ دوسری طرف میں نے جب قرآن مجید پر غور کیا تو دیکھا کہ اس میں حضورؐ کی سیرتِ طیبہ کے اصولی گوشے محفوظ ہیں۔ میں نے ان اصولوں کو عنوان قرار دیا اور ان کی روشنی میں کتبِ روایات و آثار کو کھنگالا۔ ان میں جو واقعات قرآن کے مطابق نظر آتے، انہیں قبول کر لیا جو اس کے خلاف دکھائی دیئے انہیں مسترد کر دیا۔ اس طرح حضورؐ کی نکھری، اُجلی، مصفّا، پاکیزہ سیرت مرتب ہو کر سامنے آگئی جو معراجِ انسانیت کے نام سے شائع ہو چکی ہے۔ للہ الحمد کہ میری اس محنت کو بڑی مقبولیت حاصل ہوئی ہے لیکن یہ سن کر آپ حیران ہوں گے کہ ہمارے قدامت پرست طبقہ نے اس کی بھی مخالفت کی۔ ان کی وجوہِ مخالفت میں سے میں اس

موقع پر صرف ایک مثال پر اکتفا کروں گا۔ ہمارے ہاں یہ عقیدہ ایک مسلّمہ کی حیثیت سے مروّج چلا آرہا ہے کہ حضورؐ کے ساتھ نکاح کے وقت حضرت عائشہؓ کی عمر چھ سال کی تھی اور رخصتی کے وقت نو سال کی۔ مخالفین کی طرف سے اس پر جس قدر اور جس نہج سے اعتراضات وارد کئے جاتے ہیں، ان کے بیان کرنے کی ضرورت نہیں۔ قطع نظر ان کے اعتراضات کے، یہ چیز خود قرآنِ کریم کے بھی خلاف ہے کیونکہ قرآن نے بلوغت کو نکاح کی شرط قرار دیا ہے۔ بنابریں، میں اس خیال کو ذہن کے پاس بھی پھٹکنے نہیں دے سکتا تھا کہ یہ واقعہ صحیح ہوگا۔ میں نے جب اس کے متعلق تحقیق سے کام لیا تو یہ حقیقت سامنے آئی کہ شادی کے وقت حضرت عائشہؓ کی عمر انیس سال کے قریب تھی۔ اس پر مجھے جس قدر مسرت حاصل ہوئی ہوگی، اس کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ میں سمجھتا تھا کہ ہمارے مذہبی حلقہ کی طرف سے اس پر صدائے تحسین بلند ہوگی کہ معاندین کے جس اعتراض کا ان سے کوئی معقول جواب بن نہیں پڑتا تھا، تحقیق سے ثابت ہوگیا کہ وہ واقعہ ہی غلط ہے لیکن ان حضرات نے اس کی سخت مخالفت کی۔ دلیل یہ تھی کہ اگر اس تحقیق کو صحیح مان لیا جائے تو اس سے بخاری شریف کی اس روایت کو غلط قرار دینا پڑے گا جس میں حضرت عائشہؓ کی عمر بوقتِ نکاح چھ سال کی بتائی گئی ہے۔

اس سے آپ اندازہ لگا لیجئے کہ ان حضرات کے نزدیک قرآن اور صاحبِ قرآنؐ کی حیثیت کیا ہے اور کتبِ روایات و تاریخ کا مقام کیا ہے اور اسی سے یہ حقیقت بھی سامنے آجائے گی کہ جو شخص کتبِ روایات و تاریخ کی تحقیق و تنقیح کا مشن لے کر اُٹھے، ان کی طرف سے اس کی کس قدر مخالفت ہوگی۔ میرا بھی وہ جرم ہے جس کی بنا پر میرے خلاف، ایک ہزار "علماء کرام" نے کفر کا فتویٰ عائد کیا تھا، اور ہر محراب و منبر سے میرے خلاف مسلسل پراپیگنڈہ جاری ہے، جو یکسر جھوٹے الزامات پر مبنی ہوتا ہے۔

میں نے اوپر کہا ہے کہ حضورؐ نبی اکرمؐ نے اپنی بے مثال تعلیم و تربیت سے قدوسیوں کی ایک جماعت تیار فرمائی اور ان کی رفاقت سے قرآنی مملکت کی بنیاد رکھی۔ آپؐ کی دنیا سے تشریف براری کے بعد، اس مملکت کی سربراہی حضرت صدیقِ اکبرؓ کو تفویض ہوئی لیکن ایک تو ان کا زمانۂ خلافت بہت مختصر تھا (قریب اڑھائی سال) اور دوسرے ملک کے اندر مختلف بدوی قبائل نے جو شورش برپا کی تھی، آپ کا زیادہ وقت اس کے فرو کرنے میں صرف ہوگیا۔ بنابریں، اس نظام کی تکمیل ان کے عہد میں بھی نہ ہوسکی؛ اگرچہ جو فریضہ انھوں نے ادا کیا (یعنی استحکامِ مملکت) وہ بجائے خویش بڑا ارفع اور مستحقِ ہزار تبریک و تحسین ہے۔

عام طور پر کہا جاتا ہے کہ قرآنِ کریم نے انسانی معاشرہ (یا نظامِ مملکت) کے لئے جو اصول بیان کئے ہیں، وہ

تو واقعی بڑے بلند ہیں، لیکن سوال یہ ہے کہ ان پر کبھی عمل ہو بھی سکا ہے اور اگر کبھی ان پر عمل ہؤا بھی تھا، تو وہ سلسلہ آگے کیوں نہ چلا؟ ہمارے ہاں اس کا جواب یہ دیا جاتا ہے کہ ان پر خلافتِ راشدہ کے زمانے میں عمل کیا گیا تھا جب صحیح اسلامی مملکت قائم ہوئی تھی لیکن جب وہ کہتے ہیں کہ اس نظام یا مملکت کی تفصیل بتائیے تو ہماری تاریخ اس کا جو نقشہ پیش کرتی ہے اس کا مثالی ہونا تو ایک طرف، اسے دیکھ کر خود ہماری نگاہیں زمین میں گڑ جاتی ہیں۔ میں نے اپنی تحقیق و تجسس کا ایک معتدبہ حصہ اس کے لئے بھی وقف کیا کہ کسی طرح اس نظام کا صحیح نقشہ سامنے آجائے۔ یہ نقشہ مجھے حضرت عمرؓ کے عہدِ خلافت میں ملا۔ کتبِ تاریخ و روایات میں اس کے متعلق بھی ہر قسم کا رطب و یابس مخلوط ملتا ہے، لیکن میں نے جب اسے اپنے مسلک (یعنی قرآنی معیار) کے مطابق چھانا پھٹکا تو یہ اپنی منزّہ شکل میں سامنے آگیا۔ اسی سے میں اسلام کو بہ حیثیتِ دین (عملی نظامِ حیات) سمجھ سکا۔ اس سے مجھے جس قدر مسرّت و اطمینان حاصل ہؤا ہوگا، اس کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔

یہ نقشہ میرے سامنے تو ایک مدّت ہوئی آچکا تھا، لیکن اسے دوسروں کے سامنے لانے میں ایک خاص اَمر دامن کش تھا۔ یہ نظام حضرت عمرؓ کی سربراہی میں صحابہ کبارؓ کے ہاتھوں متشکّل ہؤا تھا، اور صحابہؓ کے بارے میں مسلمانوں کے دو بنیادی گروہوں ——— شیعہ اور سنّی ——— میں جو اختلاف ہے اس نے "کفر و ایمان" تک کی شدّت اختیار کر رکھی ہے۔ مشکل بالائے مشکل یہ کہ خود سُنّیوں کی کتبِ روایات و تاریخ میں بھی ایسی ایسی باتیں ملتی ہیں، جو ان حضرات (صحابہ کرامؓ) کے شایانِ شان نہیں۔ اس قسم کی روایات اور تاریخی شواہد پر تنقید کا نتیجہ وہی ہو سکتا تھا، جس کا ذکر حضرت عائشہؓ کی عمر بوقتِ نکاح کے سلسلہ میں آچکا ہے۔ پھر جب اس سوال کا دوسرا حصّہ سامنے آتا۔ (یعنی یہ کہ یہ نظام آگے کیوں نہ چلا اور اس کے بعد اسلام پر کیا بیتی) تو اس سلسلہ میں میری تحقیق نے مجھے جن نتائج تک پہنچایا، ان سے مروّجہ اسلام کا کوئی گوشہ بھی ایسا نہیں رہتا جو نظرِ ثانی کا محتاج و متقاضی نہ ہو۔ اس سے یہ کیفیت ایک حقیقت بن کر سامنے آجاتی ہے کہ

تمدّن، تصوّف، شریعت کلام — بُتانِ عجم کے پجاری تمام
حقیقت خرافات میں کھو گئی — یہ اُمّت روایات میں کھو گئی (اقبالؒ)

مذہبی پیشوائیت میں حقائق کے سامنا کرنے کا نہ حوصلہ ہوتا ہے نہ برداشت، اور جب حقائق کی گیرائی اور گہرائی کا یہ عالم ہو تو اس کے ردِّ عمل کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ میں ایک عرصہ تک ان مشکلات پر غور کرتا رہا۔ ایک طرف قرآنِ کریم کا تقاضا تھا کہ ——— دیکھا ہے جو کچھ تو نے، اوروں کو بھی دکھلا دے ——— دوسری طرف یہ موانعات تھے۔

اسی کشمکش میں گزریں میری زندگی کی راتیں

میں ایک عرصہ تک اسی بیم و رجا میں رہا۔ لیکن بالآخر، اب (جبکہ میری عمر ستر برس سے بھی متجاوز ہو گئی ہے، اور نہیں معلوم کہ خدا کے طبیعی قانون کی رُو سے مجھے اس دنیا میں رہنے کی کس قدر مزید مہلت مل سکتی ہے) میں نے مناسب (ہی نہیں ضروری) سمجھا کہ میں ان حقائق کو اربابِ فکر و نظر کے سامنے لے آؤں۔ "ضروری" اس لئے کہ اسلام بہ حیثیتِ دین (نظامِ حیات) سمجھ میں نہیں آسکتا جب تک یہ نہ دیکھا جائے کہ اس کی عملی شکل کیا ہے۔ میں نے اس کتاب میں دین کے مختلف گوشوں کو پہلے قرآنِ کریم کی روشنی میں، نظری حیثیت سے پیش کیا ہے اور پھر اس امر کی وضاحت کی ہے کہ صدرِ اوّل میں اس پر عمل کس طرح ہوا تھا۔

جیسا کہ میں نے اوپر کہا ہے، دین کا یہ نظام، عہدِ رسالتمآبؐ اور شیخین (حضرت صدیقِ اکبرؓ اور فاروقِ اعظمؓ) کے زمانہ میں، اس جماعت کے ہاتھوں متشکل ہوا تھا جس کی تعلیم و تربیت خود رسالتمآبؐ کے مقدس ہاتھوں عمل میں آئی تھی اور جنھیں صحابہؓ کہہ کر پکارا جاتا ہے۔ ان حضرات کی اس خصوصیتِ کبریٰ کی بنا پر، قرآنِ کریم نے اس کا تعارف بڑی شرح و بسط سے کرایا ہے۔ انھیں اس نے اَلَّذِیْنَ مَعَہٗ (۴۸/۲۹) "رسول اللہ کے ساتھی" کی جامع اصطلاح سے تعبیر کیا ہے، اور خود حضورؐ کو ان کا صاحب" (ساتھی) کہہ کر پکارا ہے (۵۳/۲) ایک مقام پر حضورؐ کے شریکِ غار کو صاحبہ کہا ہے۔ (۹/۴۰) حضورؐ کے ان ساتھیوں کو عام طور پر "مومنین" کہا گیا ہے لیکن مزید تعارف کی غرض سے انھیں مہاجرین اور انصار کے گروہوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ ان کے علاوہ اس دور میں اسلام لانے والوں کے ایک اور گروہ کا ذکر بھی قرآن میں آیا ہے جو اعراب (بادیہ نشینوں) پر مشتمل تھا۔ ان کے متعلق کہا ہے کہ انھوں نے مسلمانوں کی حیثیت سے، مملکتِ اسلامی کی اطاعت تو قبول کر لی تھی لیکن "ایمان ان کے دل کی گہرائیوں میں نہیں اُترا تھا۔" (۴۹/۱۴) قرآنِ کریم نے جن "ناپختہ ایمان والوں" کا ذکر کیا ہے۔ ان سے یہی لوگ مراد ہیں۔ ان کے سوا، باقی تمام وہ مومن تھے جن کے راستے پر چلنے کی تاکید خود قرآن نے کی ہے اور کہا ہے کہ جو لوگ اس راستے کو چھوڑ کر کوئی اور راہ اختیار کریں گے ان کا ٹھکانا جہنم ہو گا۔ (۴/۱۱۵) اس سے ان حضرات (صحابہ کرامؓ) کے مقام کا اندازہ لگ سکتا ہے۔

(۲) ان کی اہمیت کے متعلق کہا ہے کہ هُوَ الَّذِیْٓ اَیَّدَکَ بِنَصْرِهٖ وَبِالْمُؤْمِنِیْنَ (۸/۶۲) خدا وہ ہے جس نے، اے رسول! اپنی نصرت اور جماعتِ مومنین کو تمہاری تائید و تقویت کا موجب بنایا۔ آگے چل کر اس کی وضاحت

ان الفاظ سے کردی:

یٰۤاَیُّهَا النَّبِیُّ حَسْبُكَ اللّٰهُ وَ مَنِ اتَّبَعَكَ مِنَ الْمُؤْمِنِیْنَ (۸/۶۴)

اے نبی! (i) خدا اور (ii) یہ جماعت مومنین' جو تیرا اتباع کرتی ہے تیرے لئے کافی ہے۔

آپ نے غور فرمایا کہ صحابہؓ کی جماعت کا مقام اس قدر بلند تھا کہ خدا نے انھیں اپنے ساتھ ہم قوس قرار دے کر' یہ کہا ہے کہ یہ دونوں (خدا اور جماعتِ مومنین) حضورؐ کے مشن کی کامیابی کے لئے کافی ہیں۔

(۳) صحابہؓ کی اس اہمیت کے پیشِ نظر حضورؐ سے کہا گیا کہ "یہ لوگ جو منشائے خداوندی کو پورا کرنے کے لئے صبح و شام' مسلسل و پیہم ــــ خدا کو پکارتے ہیں' انھیں اپنے قریب رکھو' دھتکارو نہیں۔ (۶/۵۲ و ۱۸/۲۸) وَاخْفِضْ جَنَاحَكَ لِلْمُؤْمِنِیْنَ۔ (۱۵/۸۸ و ۲۶/۲۱۵) - ان کی اس طرح پرورش اور حفاظت کرو جس طرح مرغی اپنے بچوں کی پرورش اور نگہداشت کرتی ہے۔

(۴) جیسا کہ بتایا جا چکا ہے' یہ جماعت' مہاجرین اور انصار پر مشتمل تھی۔ ان کے متعلق فرمایا۔

وَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَهَاجَرُوْا وَجٰهَدُوْا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ وَالَّذِیْنَ اٰوَوْا وَّ نَصَرُوْۤا اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُؤْمِنُوْنَ حَقًّا ؕ لَهُمْ مَّغْفِرَةٌ وَّ رِزْقٌ كَرِیْمٌ۔ (۸/۷۴)

وہ لوگ جنہوں نے ہجرت کی اور خدا کی راہ میں جہاد کیا اور وہ لوگ جنہوں نے انہیں پناہ دی اور ان کی مدد کی۔ یہ سب کے سب سچے اور پکے مومن (مومن حقاً) ہیں۔ ان کے لئے مغفرت ہے اور عزت کا رزق۔

اس آیہ جلیلہ میں' اللہ تعالےٰ نے' جملہ مہاجرین اور انصار کو مومنِ حقاً کہہ کر پکارا ہے اور ان کی مغفرت اور رزقِ کریم کی ضمانت دی ہے۔ اس آسمان کے نیچے' کسی کے ایمان اور مغفرت کی اس سے بڑی شہادت اور کون سی ہو سکتی ہے؟

(۵) ان میں کچھ وہ تھے جنھوں نے حضورؐ کی دعوت پر سب سے پہلے لبیک کہا اور کچھ وہ جو اُن میں ذرا بعد شامل ہوئے۔ خدا نے ان سب کے لئے جنّت کی بشارت دی ہے۔ سورۃ توبہ میں ہے۔

وَالسّٰبِقُوْنَ الْاَوَّلُوْنَ مِنَ الْمُهٰجِرِیْنَ وَالْاَنْصَارِ وَالَّذِیْنَ اتَّبَعُوْهُمْ بِاِحْسَانٍ ۙ رَّضِیَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَرَضُوْا عَنْهُ وَاَعَدَّ لَهُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِیْ تَحْتَهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِیْنَ فِیْهَاۤ اَبَدًا ؕ ذٰلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِیْمُ۔ (۹/۱۰۰)

مہاجرین اور انصار میں سے جنھوں نے سبقت کی اور وہ جو حسن کارانہ انداز سے ان میں بعد میں شامل

ہوتے۔ اللہ ان سب سے راضی ہو گیا اور وہ اپنے رب سے راضی ہو گئے۔ خدا نے ان کے لئے
ایسے باغات (جنت) تیار کر رکھے ہیں۔ جن کے نیچے نہریں جاری ہیں۔ ان میں وہ ہمیشہ رہیں گے
اور یہ بہت بڑی کامیابی ہے۔

غور فرمائیے۔ خدا نے تمام صحابہؓ کے لئے، خواہ وہ السابقون الاوّلون کے زمرے میں شریک تھے اور خواہ وہ ان میں بعد میں شامل ہوئے، ابدی جنت کی ضمانت دی ہے اور سب کے لئے " رضی اللہ عنھم و رضوا عنہ " کا درخشندہ سرٹیفکیٹ عطا فرمایا ہے۔ دوسرے مقام پر، ان میں بعد میں شامل ہونے والوں کے متعلق کہا ہے — اُولٰٓئِکَ مِنۡکُمۡ ۔ (۸/۷۵) وہ بھی تم ہی سے ہیں۔ جہاں تک خدا کے وعدے کا تعلق ہے، ان میں اور تم میں کوئی فرق نہیں۔

اس میں شبہ نہیں کہ قرآنی معیار کی رُو سے، مدارج کا تعین اعمال کی رُو سے ہوتا ہے۔ (۴۶/۱۹) لہٰذا السابقون الاوّلون کے مدارج زیادہ بلند ہوں گے، لیکن جہاں تک جنت و مغفرت کے خدائی وعدہ کا تعلق ہے، وہ ان سب کیلئے یکساں ہے۔ چنانچہ سورۃ حدید میں فرمایا؛

لَا یَسۡتَوِیۡ مِنۡکُمۡ مَّنۡ اَنۡفَقَ مِنۡ قَبۡلِ الۡفَتۡحِ وَ قٰتَلَ ؕ اُولٰٓئِکَ اَعۡظَمُ دَرَجَۃً مِّنَ الَّذِیۡنَ اَنۡفَقُوۡا مِنۡۢ بَعۡدُ وَ قٰتَلُوۡا ؕ وَ کُلًّا وَّعَدَ اللّٰہُ الۡحُسۡنٰی ؕ وَ اللّٰہُ بِمَا تَعۡمَلُوۡنَ خَبِیۡرٌ ۞ (۵۷/۱۰)

وہ لوگ جنہوں نے فتح مکہ سے پہلے خدا کی راہ میں مال خرچ کیا اور جنگوں میں شریک ہوئے اور وہ جنہوں نے اس کے بعد ایسا کیا، مدارج کے اعتبار سے یہ دونوں گروہ ایک جیسے نہیں ہو سکتے۔ السابقون الاوّلون کے مدارج بے شک بلند ہیں لیکن خدا کے حسین اور خوشگوار وعدے (یعنی جنت اور مغفرت کے وعدے) ان سب کے لئے ہیں۔ خدا تم سب کے اعمال سے باخبر ہے (اس لئے اس نے یہ ضمانت یونہی نہیں دے دی۔)

(۶) یہ تھی وہ جماعت صحابہؓ، رسول اللہ کے ساتھی، جن کا تذکرہ اللہ تعالےٰ نے سورۃ الفتح میں ان وجد آور الفاظ میں کیا ہے۔ آپ قرآنِ کریم کے ان حسین و جمیل الفاظ پر غور کیجئے اور پھر ان رفقائے محمدؐ کے مقامات و مدارج کا تصور کیجئے۔ فرمایا۔

مُحَمَّدٌ رَّسُوۡلُ اللّٰہِ ؕ وَ الَّذِیۡنَ مَعَہٗۤ اَشِدَّآءُ عَلَی الۡکُفَّارِ رُحَمَآءُ بَیۡنَہُمۡ

تَرٰىهُمْ رُكَّعًا سُجَّدًا يَّبْتَغُوْنَ فَضْلًا مِّنَ اللّٰهِ وَ رِضْوَانًا ؗ سِيْمَاهُمْ
فِيْ وُجُوْهِهِمْ مِّنْ اَثَرِ السُّجُوْدِ ؕ ذٰلِكَ مَثَلُهُمْ فِي التَّوْرٰىةِ ۛۖ وَمَثَلُهُمْ
فِي الْاِنْجِيْلِ ۛ كَزَرْعٍ اَخْرَجَ شَطْـَٔهٗ فَاٰزَرَهٗ فَاسْتَغْلَظَ فَاسْتَوٰى عَلٰى
سُوْقِهٖ يُعْجِبُ الزُّرَّاعَ لِيَغِيْظَ بِهِمُ الْكُفَّارَ ؕ وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا
وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ مِنْهُمْ مَّغْفِرَةً وَّ اَجْرًا عَظِيْمًا۔ (۴۸/۲۹)

میں اس آیۂ جلیلہ کا مفہوم، اپنے مفہوم القرآن سے پیش کرنے کی سعادت حاصل کرنا چاہتا ہوں۔ ملاحظہ فرمائیے۔

محمدؐ اللہ کا رسول اور اس کے رفقاء کار کی جماعت۔ یہ جماعت بھی کیا عجیب و غریب جماعت ہے! ان کی کیفیت یہ ہے کہ یہ حق کے مخالفین کے مقابلہ میں چٹان کی طرح سخت ہیں، لیکن باہم گر بڑے ہی نرم دل اور ہمدرد (۵/۵۴) تو انھیں دیکھتا کہ وہ کس طرح ذمہ داریوں کا بوجھ اٹھانے کے لیے جھک جاتے ہیں، اور قوانینِ خداوندی کے سامنے پیکرِ تسلیم و رضا بن جاتے ہیں (لیکن یہ تارک الدنیا راہبوں کی جماعت نہیں) یہ، قانونِ خداوندی کے مطابق، سامانِ زیست کی تلاش میں مصروفِ تگ و تاز رہتے ہیں اور اس کے ساتھ اس کی بھی کوشش کرتے ہیں کہ ان کا ہر عمل قانونِ خداوندی سے ہم آہنگ اور ان کی سیرت، صفاتِ خداوندی سے یک رنگ ہو جائے۔ اس سے انھیں جو سکونِ قلب اور حقیقی مسرت حاصل ہوتی ہے، اس کے اثرات ان کے چہروں سے نمایاں نظر آتے ہیں۔ ان کی یہ علامات سابقہ کتبِ آسمانی ـــ تورات و انجیل ـــ میں بھی مذکور تھیں۔

انھوں نے نظامِ خداوندی کو جس طرح قائم کیا اور پروان چڑھایا ہے، اس کی مثال یوں سمجھو کہ جب عمدہ بیج سے شگوفہ پھوٹتا ہے تو اس کی پہلی کونپل بڑی نرم و نازک ہوتی ہے۔ پھر جوں جوں اس کی جڑ مضبوط ہوتی جاتی ہے، اس کی نال موٹی ہوتی جاتی ہے۔ حتیٰ کہ وہ اتنی مضبوط ہو جاتی ہے کہ وہ اپنے سہارے آپ محکم اور استوار طریق پر قائم ہو جاتی ہے۔ (اس میں خوشے لگتے ہیں اور خوشوں میں دانے پڑ کر سخت اور مضبوط ہو جاتے ہیں۔ یوں وہ ننھا سا بیج پکی ہوئی فصل میں تبدیل ہو جاتا ہے) جب کاشت کار اپنی محنت کو اس طرح ثمر بار ہوتے دیکھتا ہے تو وجد و مسرت سے جھوم اٹھتا ہے لیکن یہی چیز اس کے مخالفین کے سینے پر سانپ بن کر لوٹنے لگ جاتی ہے۔

اسی طرح اللہ، ہر اس جماعت کو جو اس کے قوانین کی صداقت پر ایمان لا کر، اس کے بتائے ہوئے

پروگرام پر عمل پیرا ہوتی ہے، اس امر کا وعدہ دیتا ہے (یعنی یہ اس کا قانون ہے) کہ ان کی کوششوں کا ننھا سا بیج، تمام خطرات سے محفوظ رہے گا اور ان کی کھیتی پک کر بہترین ثمرات کی حامل ہو جائے گی۔ (۲۴/۵۵)۔ لیکن اس کے لئے اس قسم کی محنت اور استقامت کی ضرورت ہو گی جس قسم کی محنت اور استقامت کا ثبوت کسان دیتا ہے۔ (تخم صالح، قوانین فطرت سے مطابقت مسلسل محنت اور استقلال و استقامت۔ کھیتی کی برومندی کے لئے یہ تمام شرائط لاینفک ہیں)۔

یہ تھے صحابہ رسول اللہ، جنھیں خدا نے مومن حقًا (پکے اور سچے مومن) کہہ کر پکارا۔ جنھیں جنت اور مغفرت کی بشارت ہی نہیں دی بلکہ وعدہ کر کے اس کی ضمانت دے دی (کہ خدا کبھی وعدہ خلافی نہیں کرتا (۳/۸) ان کے متعلق وضاحت کر دی کہ رضی اللہ عنہم و رضوا عنہ۔ یہ شہادت، ضمانت، صراحت، وعدے ان سب کے لئے تھے۔ ان میں کسی کی استثناء نہیں تھی۔ یہ تمام مہاجرین و مجاہدین و انصار کے لئے یکساں تھے۔ اس میں شبہ نہیں کہ (جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا ہے) صحرائی قبائل (اعراب) ایسے تھے جن کی تعلیم و تربیت نہیں ہوئی تھی۔ اس لئے "ایمان ان کے دل کی گہرائیوں میں نہیں اُترا تھا"۔ قرآن کریم میں جن منافقین کا ذکر آتا ہے، ہو سکتا ہے کہ وہ انھی میں سے ہوں۔ لیکن مومنین اور منافقین میں تمیز حضورؐ کی زندگی ہی میں ہو چکی تھی۔ سورۂ آلِ عمران میں ہے۔ مَا کَانَ اللّٰہُ لِیَذَرَ الْمُؤْمِنِیْنَ عَلٰی مَآ اَنْتُمْ عَلَیْہِ حَتّٰی یَمِیْزَ الْخَبِیْثَ مِنَ الطَّیِّبِ ط (۳/۱۷۸)۔ ایسا نہیں ہو سکتا کہ خدا اس معاشرہ کو علیٰ حالہٖ رہنے دے۔ وہ خبیث و طیب میں تمیز کر کے رہے گا۔ اس سے واضح ہے کہ یہ تمیز حضورؐ کی زندگی میں ہو چکی تھی۔ بہرحال، اتنی بات تو حتمی اور یقینی ہے کہ مہاجرین و انصار جن سے خدا نے جنت کا وعدہ کیا تھا، آخری دم تک مومن حقًا رہے تھے کیونکہ جنت کا وعدہ تو خدا انہی سے کر سکتا تھا جو زندگی بھر (اپنے مرنے تک) جنت کے مستحق رہے ہوں۔ جو شخص آج مومن ہو اور کل کو (معاذ اللہ) مرتد ہو جائے اسے خدا جنت کی ضمانت کس طرح دے سکتا ہے؟

لیکن ہماری کتبِ روایات و تاریخ میں انہی صحابہؓ کے متعلق وہ کچھ لکھا ملتا ہے جس سے ان کا مومن حقًا اور مستحق جنت ہونا تو ایک طرف، مسلمان ہونا بھی باقی نہیں رہتا۔ شیعہ حضرات کا (اپنی روایات کی رُو سے) عقیدہ ہے کہ رسول اللہ کی وفات کے بعد، اہلِ بیت کے علاوہ، صرف پانچ مسلمان رہ گئے تھے۔ باقی سب (معاذ اللہ) مرتد ہو گئے تھے۔ آپ کو غالبًا خیال گزرے گا کہ شیعہ حضرات کا مسلک الگ ہے اس لئے ان کے ہاں اس قسم کی روایات کا پایا جانا مستبعد نہیں، لیکن سنّی تو تمام صحابہؓ کے مومن حقًا ہونے پر ایمان رکھتے ہیں لیکن یہ معلوم کر کے آپ کو حیرت ہو گی کہ سنیوں کے

ہاں بھی اس قسم کی روایات موجود ہیں۔ جن کی رُو سے صحابہؓ کا (معاذ اللہ) مرتد ہو جانا ثابت ہے۔ سُنیوں کے ہاں بخاری کو احادیث کی معتبر ترین کتاب سمجھا جاتا ہے۔ اس میں حسب ذیل حدیث موجود ہے۔

رسول اللہ نے فرمایا کہ قیامت کے دن میرے صحابہؓ کی ایک جماعت کو (فرشتے) جہنم کی طرف لئے جا رہے ہوں گے۔ میں پکاروں گا کہ یہ تو میرے صحابی ہیں، یہ میرے صحابی ہیں۔ اللہ فرمائے گا کہ (اے رسولؐ) جب تو ان سے جدا ہوا تو یہ مرتد ہو کر اپنے سابقہ مذہب کی طرف لوٹ گئے تھے۔

(بخاری۔ کتاب الانبیاء)

آپ یقیناً حیران ہوں گے کہ ایک طرف یہ حضرات ہر صحابی کے نام کے ساتھ "رضی اللہ تعالےٰ عنہ" کہتے ہیں اور دوسری طرف، ان روایات کو بھی صحیح مانتے ہیں! لیکن اس میں حیرت کی کوئی بات نہیں۔ اگر آپ کتب احادیث کا بالاستیعاب مطالعہ کریں گے تو آپ کو ان میں، اس سے بھی زیادہ تحیر انگیز روایات ملیں گی ــــ اور ایسی ہی ہیں وہ روایات جن کے انکار سے مجھ پر کفر کا فتویٰ لگایا جاتا ہے!

روایات کے بعد، آپ کتب تاریخ کی طرف آیئے۔ ہم نے دیکھا ہے کہ قرآن کریم میں صحابہؓ کے متعلق کہا گیا ہے رُحَمَآءُ بَیْنَھُمْ۔ (۴۸/۲۹) وہ آپس میں بڑی محبت اور پیار سے رہتے تھے۔ وہ سب آپس میں بھائی بھائی تھے۔ (۴۹/۱۰) سورۂ آلِ عمران میں، جماعتِ صحابہؓ کو مخاطب کر کے کہا گیا ہے۔

تم خدا کی اس نعمت کو یاد کرو کہ تم ایک دوسرے کے دشمن تھے۔ خدا نے تمہارے دلوں میں ایک دوسرے کی الفت ڈال دی جس سے تم ایک دوسرے کے بھائی بھائی بن گئے۔ یہ تم پر خدا کا خاص انعام تھا۔ تم (زمانہ قبل از اسلام میں) جہنم کے گڑھے کے کنارے پہنچ چکے تھے کہ خدا نے تمہیں اس میں گرنے سے بچا لیا۔ (۳/۱۰۲)

دوسرے مقام پر ہے۔

خدا نے ان مومنین کے دلوں میں باہمی اُلفت ڈال دی۔ اے رسول! (یہ باہمی الفت ایسی متاعِ گراں بہا ہے کہ) اگر تو ساری دنیا کی دولت بھی صرف کر ڈالتا تو یہ بات پیدا نہ ہو سکتی۔ یہ بات خدا ہی سے ممکن تھی۔ وہ قوت اور حکمت دونوں کا مالک ہے۔ (۸/۶۳)

یہ خدا کی شہادت تھی۔ اس کے برعکس، ہماری تاریخ ان کے متعلق کیا کہتی ہے، اس کی بابت آپ کو ذرا آگے چل کر (متن کتاب میں) تفصیل سے نظر آئے گا۔ آپ (بالخصوص) تیسرے باب میں دیکھیں گے کہ رسول اللہ کی وفات کے

فوری بعد، جب خلیفہ کے انتخاب کے لئے مہاجرین وانصار کا اجتماع ہوا تو اس میں کیا منظر سامنے آیا؟ آپ دیکھیں گے کہ اس میں (معاذ اللہ) ایک کی ڈاڑھی تھی اور دوسرے کا ہاتھ، ایک کا خنجر تھا اور دوسرے کا سینہ اور طعن و تشنیع اور سب و شتم کا کوئی ٹھکانہ نہ تھا۔ صحابہؓ کے باہمی تعلقات کا یہ نقشہ ہے جو (رسول اللہ کی وفات کے فوری بعد) تاریخ ہمارے سامنے لائی ہے۔

ایک قدم اور آگے بڑھئیے۔ قرآنِ کریم میں کہا گیا ہے کہ "کسی مومن کے لئے یہ جائز نہیں کہ وہ دوسرے مومن کو قتل کر دے۔" (۴/۹۲)

وَمَنْ يَقْتُلْ مُؤْمِنًا مُّتَعَمِّدًا فَجَزَآؤُهٗ جَهَنَّمُ خَالِدًا فِيْهَا وَغَضِبَ اللّٰهُ عَلَيْهِ وَلَعَنَهٗ وَاَعَدَّ لَهٗ عَذَابًا عَظِيْمًا (۴/۹۳)

جو مومن کسی دوسرے مومن کو بالارادہ قتل کر دے تو اس کی سزا جہنم ہے۔ جس میں وہ رہے گا اس پر خدا کا غضب اور اس کی لعنت ہو گی۔ خدا نے اس کے لئے شدید عذاب تیار کر رکھا ہے

آپ نے دیکھا کہ قرآنِ کریم کی رُو سے، ایک مومن کے قتلِ عمد کی سزا کیا ہے لیکن تاریخ ہمیں بتاتی ہے کہ حضرت عثمانؓ کی شہادت کے بعد، جنگِ جمل ہوئی اس میں (بجز معدودے چند) آدھے صحابہؓ ایک طرف تھے اور آدھے دوسری طرف۔ ان میں باہمی جنگ ہوئی جس میں دس ہزار صحابہؓ قتل ہوئے ــــ دس ہزار مومنین کا قتل خود مومنین کے ہاتھوں! (عیاذ باللہ) اس سے اگلی جنگ (صفین) میں تاریخ کے بیان کے مطابق ستر ہزار صحابہؓ ایک دوسرے کے ہاتھوں قتل ہوئے۔ آپ سوچئے کہ (اگر تاریخ کے ان بیانات کو صحیح تسلیم کر لیا جائے تو قرآنِ کریم کے مندرجہ بالا فیصلہ کی رُو سے، ان میں سے کوئی ایک بھی مستحقِ مغفرت رہتا ہے، حالانکہ یہ سب وہ تھے جن کی مغفرت اور جنت کا وعدہ خود قرآنِ کریم میں موجود ہے۔ صاف نظر آتا ہے کہ اس قسم کی روایات اور تاریخی بیانات سب افسانے ہیں جو خاص سازش کے ماتحت وضع کئے گئے۔ اس سازش کی تفصیل کتاب کے آخری باب میں ملے گی۔

اس مقام پر یہ اعتراض کیا جاتا ہے کہ ....

لیکن میں سمجھتا ہوں کہ اس اعتراض کو نظری طور پر سامنے لانے کے بجائے اسے ایک عملی مثال سے واضح کیا جائے تو بہتر ہو گا۔ چند سال اُدھر کی بات ہے، سید ابوالاعلیٰ مودودی صاحب نے "خلافت و ملوکیت" کے نام سے ایک کتاب شائع کی۔ اس میں انھوں نے ان روایات کو بہ ہیئتِ مجموعی یکجا کر دیا۔ جن کی بنا پر، غیر مسلم مصنف صحابہؓ کرام کی سیرت کو مسخ کر کے پیش کیا کرتے ہیں۔ مثال کے طور پر ان میں سے ایک روایت ملاحظہ فرمائیے۔ انھوں نے لکھا

کہ جب یزید کی فوج نے مدینہ پر حملہ کیا تو

وحشی فوجوں نے گھروں میں گھس گھس کر بے دریغ عورتوں کی عصمت دری کی۔ حافظ ابن کثیر کہتے ہیں حتیٰ قیل انہ حملت الف امراءۃ فی تلک الایام من غیر زوج۔ کہا جاتا ہے کہ ان دنوں میں ایک ہزار عورتیں زنا سے حاملہ ہوئیں۔ (خلافت و ملوکیت صـ۱۸۲)

یہ ۶۳ھ کا واقعہ بیان کیا جاتا ہے۔ یعنی رسول اللہ کی وفات کے صرف پچاس سال بعد کا۔ اس وقت ابھی صحابہؓ کی اچھی خاصی تعداد (زندہ) موجود تھی اور باقی امت تابعینؒ پر مشتمل تھی۔ دوسری طرف یزید کی فوج بھی "وحشی تاتاریوں" سے مرتب نہیں ہوئی تھی۔ وہ بھی صحابہؓ اور تابعینؒ کے زمرے میں شامل ہونے والے مسلمانوں پر مشتمل تھی۔ ان حقائق کی روشنی میں آپ مندرجہ بالا روایت کو دیکھئے اور سوچئے کہ اس سے مسلمان کس نتیجہ پر پہنچتا ہے۔ ان "وحشی فوجوں" کو تو چھوڑیئے، سوچئے یہ کہ مدینۃ النبیؐ کے یہ مسلمان اپنی ماؤں، بہنوں، بیٹیوں، بیویوں کے ساتھ (معاذ اللہ) یہ کچھ بے محابا ہوتے دیکھتے رہے اور کسی کی غیرت جوش میں نہ آئی، نہ ہی ان خواتین نے جو خود بھی صحابیہؓ نہیں تو تابعینؒ کے زمرے میں شمار ہوتی تھیں، کسی قسم کی مزاحمت کی۔ اس کیساتھ ہی یہ بھی سوچئے کہ اس سے جو ایک ہزار ناجائز بچے پیدا ہوئے، ان کی نسل آج تک چلتی آرہی ہے، ان کے متعلق کیا کہا جائے گا۔ آپ سوچئے کہ کیا ایسی تاریخ کو قابلِ اعتماد قرار دیا جائے گا۔ جس میں اس قسم کی روایات ہوں؟ اور تاریخ بھی وہ جو، بغیر کسی سابقہ تحریری ریکارڈ کے، محض زبانی روایات کی بنیاد پر، صدرِ اوّل کے اڑھائی تین سو سال بعد، اس زمانے میں مرتب کی گئی ہو جب مسلمانوں میں گروہ بندانہ تعصب عام ہو چکا تھا!

اس کے جواب میں مودودی صاحب نے جو کچھ کہا ہے وہ قابلِ غور ہے۔ انھوں نے مختلف کتبِ تاریخ کے نام گنوانے کے بعد کہا کہ۔

> اب غور فرمائیے۔ یہ ہیں وہ مآخذ جن سے میں نے اپنی بحث میں سارا مواد لیا ہے۔ اگر یہ اس دور کی تاریخ میں قابلِ اعتماد نہیں ہیں تو پھر اعلان کر دیجئے کہ عہدِ رسالتمآب سے لے کر آٹھویں صدی تک کی کوئی اسلامی تاریخ دنیا میں موجود نہیں کیونکہ عہدِ رسالتمآب کے بعد سے کئی صدیوں تک کی پوری اسلامی تاریخ، شیخینؓ کی تاریخ سمیت، انہی ذرائع سے ہم تک پہنچی ہے۔ اگر یہ قابلِ اعتماد نہیں تو ان کی بیان کی ہوئی خلافتِ راشدہ کی تاریخ اور ائمہ اسلام کی سیرتیں اور ان کے کارنامے، سب اکاذیب کے دفتر ہیں جنھیں ہم کسی کے سامنے وثوق کے ساتھ پیش نہیں کر سکتے۔ دنیا کبھی اس

اصول کو نہیں مان سکتی اور دنیا کیا' خود مسلمانوں کی موجودہ نسلیں بھی اس بات کو ہرگز قبول نہ کریں گی کہ ہمارے بزرگوں کی جو خوبیاں یہ تاریخیں بیان کرتی ہیں' وہ تو سب صحیح ہیں' مگر جو کمزوریاں بھی کتابیں پیش کرتی ہیں' وہ سب غلط ہیں۔ (خلافت و ملوکیت ص ۳۱۶)

ہماری کتبِ روایات و تاریخ کس طرح اور کب مرتب ہوئی تھیں' اس کے متعلق تفصیلی ذکر کتاب کے آخری باب میں آئے گا۔ سرِ دست ہم مندرجہ بالا اعتراض کی طرف آتے ہیں۔ تاریخ کے سلسلہ میں ہماری (مسلمانوں کی) کیفیت باقی دنیا کے مقابلہ میں مخصوص اور منفرد ہے۔ قرآن کریم پر ہمارا ایمان ہے جس کے یہ معنی ہیں کہ اس میں جو کچھ کہا گیا ہے اسے ہم حرفاً حرفاً صحیح تسلیم کرتے ہیں۔ اب اگر تاریخ میں کوئی بات ایسی ملے جو قرآن کے کسی بیان کے خلاف ہو' تو اسے ہم کبھی صحیح تسلیم نہیں کر سکتے۔ (مثال کے طور پر) قرآنِ مجید میں ہے کہ حضرت یوسفؑ نے' عزیزِ مصر کی بیوی کے اصرار کے باوجود اپنے دامنِ عصمت کو داغدار نہ ہونے دیا۔ اب اگر کوئی تاریخ' حضرت یوسفؑ کے بے شمار محاسن بیان کرنے کے ساتھ یہ کہے کہ انھوں نے عزیزِ مصر کی بیوی پر ہاتھ ڈالا تھا تو ہم ان محاسن کو تو صحیح تسلیم کر لیں گے لیکن ان کی طرف منسوب کردہ دست درازی کے واقعہ کو کبھی صحیح تسلیم نہیں کریں گے۔ اس پر اگر دنیا یہ کہے کہ تمھاری یہ روش بڑی غیر علمی ہے کہ تم تاریخ کے ایک حصّے کو صحیح تسلیم کرتے ہو اور دوسرے کو غلط' تو ایسے لوگوں سے ہم کہیں گے کہ ایسے معاملات میں تاریخ کے پرکھنے کا ہمارا معیار تم سے مختلف ہے۔ ہم تاریخ کے کسی ایسے بیان کو صحیح تسلیم نہیں کر سکتے جو قرآنی تصریحات سے ٹکراتا ہو۔ اس میں شبہ نہیں کہ ہمارا فریضہ یہ ہوگا کہ ہم علمی تحقیق سے یہ ثابت کریں کہ قرآنی تصریح مبنی بر حقیقت ہے اور تاریخ کا بیان غلط' لیکن جب تک ایسا نہ ہو سکے' ہم قرآنی بیان کو غلط قرار نہیں دیں گے۔ ایک غیر مسلم کی تو یہ پوزیشن ہو سکتی ہے کہ وہ قرآن کے جس بیان کو جی چاہے صحیح تسلیم کرے اور جس سے چاہے انکار کر دے لیکن قرآن پر ایمان رکھنے والوں کا یہ موقف نہیں ہو سکتا۔ انھیں تو قرآن کے ایک ایک حرف کو برحق تسلیم کرنا ہوگا۔ اگر کسی کو' قرآنِ مجید کے کسی بیان پر بھی شبہ ہو جائے تو وہ مسلمان نہیں کہلا سکتا۔

ان تصریحات کی روشنی میں آپ مسئلہ زیرِ نظر پر غور فرمایئے۔

(۱) قرآنِ مجید میں صحابہ کبارؓ (مہاجرین و انصار) کے متعلق بہ صراحت کہا گیا ہے کہ وہ مومن حقاً (پکّے اور سچے) مومن تھے۔

(۲) قرآنِ مجید میں مومنین کی صفات اور خصوصیّات بہ صراحت بیان کی گئی ہیں۔

(۳) اس سے واضح ہے کہ صحابہ کبارؓ ان صفات و خصوصیّات کے پیکر تھے جو مومنین کے متعلق قرآن میں آئی ہیں۔

(۴) اگر تاریخ میں صحابہؓ کی ایسی خصوصیات کا ذکر آتا ہے جنھیں قرآن مومنین کی صفات بتاتا ہے، تو ہم تاریخ کی ان شہادات کو صحیح تسلیم کریں گے، لیکن اگر اس میں صحابہؓ کی طرف کوئی ایسی بات منسوب کی گئی ہے جو ایک مومن کے شایانِ شان نہیں، تو ہم تاریخ کے اس بیان کو بلا تامل مسترد کر دیں گے۔ یہ اس لئے کہ ایسی صورت میں سوال 'تاریخ کے دو بیانات کا نہیں ہوگا' اس میں ایک طرف خدا کا نازل کردہ قرآن ہوگا اور دوسری طرف' انسانوں کی مرتب کردہ تاریخ۔ ہم قرآن پر ایمان لانے کے مکلف ہیں، کسی طبریؔ یا ابن اثیر پر ایمان لانے کے نہیں۔ اگر قرآن کے مقابلہ میں طبریؔ اور ابنِ اثیرؔ (وغیرہم) کی ہزار تاریخیں بھی غلط ثابت ہوتی ہیں تو ہوا کریں لیکن ہم ان مورخین کی خاطر' قرآنِ مجید کے ایک لفظ کو بھی غلط تسلیم کرنے کے لئے تیار نہیں ہوں گے۔

ہمیں تسلیم ہے کہ قرآن کریم نے ان حضرات (صحابہؓ) کو "معصوم" قرار نہیں دیا۔ ان سے سہو و خطا اور اجتہادی غلطیوں کا امکان تھا۔ اس باب میں خود قرآنِ کریم نے وضاحت کر دی ہے کہ مومنین کا شعارِ زندگی یہ ہے کہ یَجۡتَنِبُوۡنَ كَبٰٓئِرَ الۡاِثۡمِ وَالۡفَوَاحِشَ اِلَّا اللَّمَمَ (۵۳/۳۲) وہ کبائر الاثم اور فواحش سے مجتنب رہتے ہیں۔ البتہ ان سے لَمَم سرزد ہونے کا امکان ہوتا ہے۔ لَمَم کے معنی ہیں' یونہی کبھی کبھار' بلا ارادہ کسی ناپسندیدہ بات کا سرزد ہو جانا۔ اس کو سہو و خطا کہا جاتا ہے۔ اس باب میں بھی ان کی کیفیت یہ ہوتی ہے کہ

اِنَّ الَّذِيۡنَ اتَّقَوۡا اِذَا مَسَّهُمۡ طٰٓئِفٌ مِّنَ الشَّيۡطٰنِ تَذَكَّرُوۡا فَاِذَا هُمۡ مُّبۡصِرُوۡنَ۔

(۷/۲۰۱)

متقیوں کی کیفیت یہ ہوتی ہے کہ اگر کبھی کوئی شیطانی خیال یونہی گھومتے گھامتے انھیں چھو جائے تو وہ ہدایتِ خداوندی کو سامنے لے آتے ہیں اور اس سے ان میں فوراً بصیرت پیدا ہو جاتی ہے۔

بنابریں' ان حضرات (صحابہ کرامؓ) کے سلسلہ میں' لَمَم کی حد تک تو کسی تاریخی بیان کو صحیح تسلیم کیا جا سکتا ہے' لیکن ان کی طرف منسوب کردہ کسی ایسے بیان کو صحیح تسلیم نہیں کیا جا سکتا جو مومن کے شایانِ شان نہ ہو۔

ہمیں یہ بھی تسلیم ہے کہ اصحابِ رسول اللہ کے فہم و ادراک کی صلاحیتوں میں فرق تھا اور اس اعتبار سے انھوں نے تعلیم و تربیتِ نبویؐ سے جو کچھ اخذ کیا' اس میں تفاوتِ مراتب ضروری تھا لیکن ان میں سے کسی سے کوئی ایسی بات سرزد نہیں ہو سکتی تھی جو مومنِ حقا کی خصوصیات کے خلاف ہو۔ اس باب میں وہ سب یکساں تھے۔ فلہذا یکساں احترام کے مستحق۔ رضی اللہ عنہم و رضوا عنہ ان سب کے لئے تھا۔ اس مقصد کے لئے ہمیں اس کی بھی ضرورت نہیں کہ ہم فہرستیں مرتب کرنے بیٹھ جائیں کہ مہاجرین و انصار کے زمرے میں کس کس کا شمار ہو سکتا ہے۔ ہمارے اس

ذریعہ بھی کون سا ہے جس سے ہم اس قسم کی فہرستیں مرتب کر سکیں۔ ذریعہ ہمارے پاس تاریخ ہی ہے۔ لہذا تاریخ نے جس کے متعلق بھی ایسا کہہ دیا ہے، ہم اسے اس زمرہ میں شامل سمجھ لیں گے اور اس کا احترام کریں گے۔ اس لئے کہ اگر تاریخ نے کسی اور کو بھی اس فہرست میں شامل کر دیا ہے تو اس کا احترام کرنا خدا کے ہاں جرم نہیں قرار پائیگا لیکن اگر اس فہرست میں شامل حضرات میں سے کسی کے متعلق ہم نے سوءِ ظن سے کام لیا تو اس کی بابت ہم سے ضرور مواخذہ ہوگا۔ بنابریں صحابہ کبارؓ میں سے کسی کے متعلق بھی بدظنی سے کام نہیں لیا جا سکتا۔ وہ سب واجب الاحترام ہیں۔ باقی رہے ان کے بعد کے مسلمان سو ان کے مومن حقا تسلیم کرنے کے متعلق قرآن کریم ہمیں مکلف نہیں ٹھہراتا۔ ان کے اعمال کس قسم کے تھے اس سے ہمیں کچھ واسطہ نہیں۔ ان کے متعلق ہمارا موقف از روئے قرآن یہ ہے کہ

تِلْكَ أُمَّةٌ قَدْ خَلَتْ ۔ لَهَا مَا كَسَبَتْ وَ لَكُمْ مَّا كَسَبْتُمْ ۔ وَلَا تُسْئَلُوْنَ عَمَّا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ (۲/۱۴۱)

یہ لوگ اپنے اپنے وقت میں دنیا سے چلے گئے۔ ان کے اعمال ان کے لئے، تمہارے اعمال تمہارے لئے۔ تم سے یہ پوچھا ہی نہیں جائے گا کہ انھوں نے کس قسم کے کام کئے تھے۔

یہ ہے میرا موقف تاریخ کے سلسلہ میں۔ جہاں تک میں نے غور کیا ہے، اسلام پر جس قدر اعتراضات وارد ہوتے ہیں، اور اس کی جس قدر گھناؤنی تصویر سامنے لائی جاتی ہے، اس کی ذمہ داری ہماری کتبِ روایات و تاریخ پر عائد ہوتی ہے بنابریں، اس امر کی اشد ضرورت ہے کہ قرآنِ کریم کو معیار قرار دے کر عہدِ رسالتمآبؐ اور دورِ صحابہؓ کی تاریخ از سرِ نو مرتب کی جائے۔ یہ اسلام کی سب سے بڑی خدمت ہوگی۔ میرا بہرحال یہی مسلک اور مشن ہے۔ (جیسا کہ میں نے پہلے لکھا ہے) میں نے، اسی معیار کے مطابق، پہلے حضور نبی اکرمؐ کی سیرتِ طیبہ کو مرتب کیا۔ اس کے بعد میں نے عہدِ صحابہؓ کی تاریخ کا مطالعہ اسی نقطۂ نظر سے کیا تو دیکھا کہ وہ بھی رطب و یابس سے پٹی پڑی ہے۔ میں نے اسے بھی، قرآنی معیار کے مطابق پرکھا اور کھنگالا۔ اس سلسلہ میں، میں اتنا عرض کر دینا ضروری سمجھتا ہوں کہ جو کچھ میں نے کیا ہے، اسے مغربی مؤرخین کے معیار کی رُو سے ہسٹوریکل ریسرچ (تاریخی تحقیق) قرار نہیں دیا جا سکتا۔ حقیقت یہ ہے کہ ہمارے ہاں، تاریخی تحقیق کی گنجائش ہی نہیں اور جو اس کا دعویٰ کرتا ہے وہ یا تو غلط فہمی میں مبتلا ہے یا غلط بیانی سے کام لیتا ہے۔ ہمارا سارا تاریخی سرمایہ متقدمین کی چند کتابیں ہیں، جو صدرِ اوّل کے صدیوں بعد، بغیر کسی سابقہ تحریری ریکارڈ کے، محض بربنائے روایات، مرتب ہوئی تھیں۔ ہمارے ہاں کے "محققین" اس سے زیادہ کچھ کر ہی نہیں سکتے کہ وہ ان کتابوں میں سے، اپنے اپنے نقطۂ نگاہ کے مطابق، واقعات منتخب اور مقتبس کر کے، ایک نئی تالیف مرتب کر دیں۔ میں نے بھی یہی کیا ہے لیکن اس فرق کے ساتھ کہ میرا معیارِ انتخاب واقعہ، میرا ذاتی نقطۂ نگاہ نہیں بلکہ غلط اور صحیح کا قرآنی معیار ہے۔ میری پیشکش اسی اعتبار سے منفرد

ہے، اور (میرے نزدیک) اس لئے اہم کہ یہ میرے مدّت العمر کے مطالعہ اور فکر کی ماحصل اور میری زندگی کا نقطۂ پرکارِ تمنا ہے۔

عام قاعدہ کے مطابق، چاہیئے تھا کہ کتاب میں مندرج ایک ایک واقعہ کا حوالہ دیا جاتا، لیکن میں نے جب ایسا کرنا چاہا تو دیکھا کہ ساری کتاب حوالوں سے بھر جائے گی اسے میرے ذوقِ سلیم نے گوارا نہ کیا۔ چنانچہ میں نے ان واقعات کا جو ہمارے ہاں عام طور مسلّم ہیں، حوالہ نہیں دیا، صرف ان واقعات کے حوالوں تک اکتفا کیا ہے جو شاذ ہیں یا متنازہ فیہ۔ ویسے میرے ریکارڈ میں ایک ایک واقعہ کا حوالہ موجود ہے اور "فہرست مصادر الکتاب" میں، ان میں سے نسبتاً زیادہ مشہور کتابوں کے نام درج کر دیئے گئے ہیں جن سے میں نے، بالواسطہ یا بلاواسطہ، استفادہ کیا ہے۔

(جیساکہ میں نے پہلے بھی عرض کیا ہے)، اسلامی نظام کے سلسلہ میں دوسرا سوال یہ سامنے آتا ہے کہ یہ نظام آگے کیوں نہ چلا، اور اسلام اپنی حقیقی صورت کھوکر، مروجہ مذہب میں کس طرح تبدیل ہوگیا (جیساکہ میں نے پہلے عرض کیا ہے) عمر بھر کے تنقیدی اور تحقیقاتی مطالعہ کی رُو سے، یہ حقیقت میرے سامنے بے نقاب ہوگئی ہے کہ یہ کیسے ہوگیا اور اسی بنا پر میرا ارادہ ہے کہ (اگر مجھے مہلت اور توفیق حاصل رہی تو) میں اس سرگزشت کو تفصیل سے بیان کروں گا لیکن اس کے لیئے معلوم نہیں مجھے کب فرصت مل سکے، اس لئے میں نے مناسب سمجھا ہے کہ اس کتاب کے آخری باب میں، اس عبرت انگیز داستان کو مختصراً بیان کر دیا جاتے۔ مجھے اس کا احساس ہے کہ اس سرگزشت کے مختلف گوشوں سے ہمارے مختلف فرقے اختلاف کریں گے کیونکہ ان میں، ان کے نظریات ہدفِ تنقید نظر آئیں گے۔ اس سلسلہ میں، میں اتنا عرض کر دینا ضروری سمجھتا ہوں کہ

(۱) میرا تعلق کسی فرقے سے نہیں، اس لئے میں نے جو کچھ لکھا ہے، اس سے نہ کسی فرقہ کی جانبداری مقصود ہے نہ کسی کی مخالفت۔

(۲) میرے نزدیک دین میں سند اور حجّت، خدا کی کتاب (قرآن مجید) ہے۔ جو کچھ اسلام کی طرف منسوب کیا جاتا ہے میں اسے قرآنی معیار پر پرکھتا ہوں۔ جسے اپنی بصیرت کے مطابق، قرآن کے مطابق پاتا ہوں اسے صحیح قرار دیتا ہوں جو اس کے خلاف نظر آئے، اسے غلط سمجھتا ہوں۔ مجھے کسی کی دلآزاری مقصود نہیں لیکن اگر کوئی اس بات سے ناراض ہوتا ہے کہ اس کے کسی ایسے عقیدہ یا نظریہ کو، جسے میں قرآن کے خلاف پاتا ہوں، غلط کیوں ٹھہرایا جاتا ہے، تو اس کے لیئے میں معذور ہوں ــــ قرآن کی رُو سے کتمانِ حقیقت جرمِ عظیم ہے اور منافقت، انتہائی دنائت۔

(۳) ہر فرقہ اپنے نظریات و معتقدات کو اپنے بزرگوں کی طرف منسوب کرتا ہے۔ ان میں سے جس نظریہ یا عقیدہ کو میں، قرآن کے خلاف پاتا ہوں، اس کے متعلق، بنا بر احتیاط و احترام، یہ سمجھتا اور کہتا ہوں کہ ان بزرگوں کی طرف اس کی نسبت صحیح نہیں۔ وہ کوئی ایسا نظریہ یا عقیدہ پیش نہیں کر سکتے تھے، جو قرآن کے خلاف ہو لیکن اگر ان کے متبعین اس پر اصرار کریں کہ ان کی طرف اس کی نسبت صحیح ہے، انھوں نے ایسا ہی کہا یا کیا تھا، تو میں کہہ دیا کرتا ہوں کہ ایسا کہنا آپ کو مبارک۔ میں ان کے متعلق سوءِ ظن سے کام نہیں لینا چاہتا، میں ان کا احترام کرتا ہوں۔

(۴) اور آخری بات یہ کہ (جیسا کہ میں اپنی ہر تصنیف میں اس کا اعتراف اور اعلان کیا کرتا ہوں) میں نہ اپنی بصیرت کو سہو و خطا سے منزہ سمجھتا ہوں، نہ اپنے فہمِ قرآن کو حرفِ آخر۔ میں قرآنِ مجید کا ایک ادنیٰ طالب العلم ہوں۔ اس سے زیادہ، نہ میرا کوئی دعوے ہے نہ مقام۔ وَاللّٰہُ عَلٰی مَا نَقُوْلُ شَھِیْد۔

آپ، بابِ اوّل میں دیکھیں گے کہ حضور نبی اکرمؐ نے دُعا مانگی تھی کہ ابوجہل اور عمرؓ میں سے کوئی ایک مشرف بہ اسلام ہو جاتے۔ یہ دعا (حضرت) عمرؓ کے حق میں پوری ہو گئی اور وہ آغوشِ رسالتؐ میں آگئے۔ حضورؐ کی اس دعا سے واضح ہو جاتا ہے کہ آپؐ کی نگہِ جوہر شناس نے (حضرت) عمرؓ کی مضمر صلاحیتوں کو کس طرح بے نقاب دیکھ لیا تھا۔

نبی اکرمؐ، معلّم، مربّی اور مزکّی تھے یعنی آپؐ کا فریضہ یہ تھا کہ آپؐ اپنی عدیم النظیر تعلیم و تربیت سے اپنے دست پروردگان کی صلاحیتوں کو ایسی جلا بخشیں جس سے وہ شرفِ انسانیت کے پیکر بن جائیں۔ ابوجہل، دستِ نبویؐ کی صورتگری کی سعادت سے محروم رہا، تو اس کی صلاحیتیں راکھ کا ڈھیر ہو کر رہ گئیں۔ وہ ناکامی کی زندگی جیا اور نامرادی کی موت مر گیا۔ (حضرت) عمرؓ کو یہ سعادت نصیب ہو گئی تو ان کی صلاحیتیں نشو و نما پا کر ایسے متوازن قالب میں ڈھل گئیں، جس سے وہ نابغۂ روزگار بن گئے۔ تاریخ نے جو معلومات بہم پہنچائی ہیں۔ ان سے واضح ہوتا ہے کہ جملہ دست پروردگانِ رسالتؐ میں، انہیں اس سعادت کا سب سے زیادہ حصّہ نصیب ہوا تھا۔ اس نہج سے دیکھئے تو حضرت عمرؓ کے کمالات، حضورؐ کی نگہِ انتخاب اور سیرت سازی کے رہینِ کرم تھے۔ اسی اعتبار سے میری نگہِ بصیرت نے انہیں **شاہکارِ رسالتؐ** کے لقب سے پکارا ہے ـــــ رسول اللہؐ شاہکارِ خالقِ فطرت، اور فاروقِ اعظمؓ شاہکارِ رسالتؐ۔

پھر، جس طرح نبی اکرمؐ کے خاتم الانبیا اور مکمل دینِ خداوندی ہونے سے، دیگر انبیاء کرامؑ کی قدر و منزلت میں کوئی فرق نہیں آجاتا، اسی طرح فاروقِ اعظمؓ کے شاہکارِ رسالتؐ قرار پانے سے دیگر دست پروردگانِ رسالتؐ کے علوِ مرتبت میں کوئی کمی واقعہ نہیں ہو جاتی۔ مقامِ صحابیت پر فائز ہونے کی جہت سے سب یکساں احترام و تکریم کے مستحق

رہتے ہیں۔ " رَضِیَ اللّٰہُ عَنْھُمْ وَرَضُوْا عَنْہُ " کا اعزازِ خداوندی سب کے لئے ایک جیسا ہے۔

میں نے اسلام کو بہ حیثیتِ دین (نظامِ حیات) سیرتِ فاروقیؓ سے سمجھا تھا، اس لئے اس سیرت کو اُجلی اور نکھری صورت میں دنیا کے سامنے پیش کرنا اپنے ذمہ قرض محسوس کرتا تھا۔ لِلّٰہِ الحمد کہ میں آج اس قرض سے سبکدوش ہو رہا ہوں۔

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا اِنَّکَ اَنْتَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ ط

نومبر ۱۹۷۳ء

پرویز

۲۵/بی، گلبرگ ۲۔ لاہور

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

پہلا باب

عشق نبرد پیشہ طلبگارِ مرد تھا

رسول اللہؐ نے فرمایا۔

خِیَارُھُمْ فِی الْجَاھِلِیَّۃِ خِیَارُھُمْ فِی الْاِسْلَامِ (مسلم۔ باب خیار الناس)

جو لوگ زمانۂ جاہلیت میں بہتر تھے، وہ حالتِ اسلام میں بھی بہتر ہیں۔

آج سے چودہ سو سال پہلے، جب نفسیات کے علمی مطالعہ کا ہنوز تصور تک بھی دنیا کے سامنے نہیں آیا تھا، انسانی مضمرات کی اس گہرائی تک پہنچنا نگۂ محمدیؐ ہی کے لئے ممکن تھا۔

خدا کی طرف سے سلسلۂ رشد و ہدایت کا مقصد، انسانوں تک صحیح تعلیم پہنچا دینا ہی نہیں تھا۔ اس کی غایت یہ تھی کہ انسانی زندگی کے، انفرادی اور اجتماعی، ہر گوشے میں خوشگوار انقلاب پیدا کر کے، کاروانِ انسانیت کو صحیح راستے پر گامزن کر دیا جائے، تاکہ اس طرح، زندگی، رفتہ رفتہ، اپنی منزلِ مقصود تک پہنچ جائے۔ یہی وہ مقصد تھا جس کے لئے پیغامِ خداوندی کو حروف و نقوش کی شکل میں دینے پر ہی اکتفا نہیں کیا جاتا تھا، بلکہ اسے خود انسانوں میں سے

فریضۂ رسالت

ایک فرد کے ذریعے، عام کیا جاتا...... اس منتخب فرد کا (جسے رسولؐ کہا جاتا تھا) یہ فریضہ تھا کہ وہ، اس پیغام کو عام کرنے کے بعد، ایسی قوم تیار کرے جو اس پیغام کا عملی پیکر بنے، اور اس نظام کو متشکل اور متمکّن کر کے دکھا دے جو اس پیغام کی غایت تھا۔ اس سے ظاہر ہے کہ رسولؐ کا

فریضۂ زندگی کس قدر اہم اور اس کی ذمہ داری کیسی گراں بار ہوتی تھی۔ قرآنِ کریم نے رسولؐ کے اس عظیم فریضہ کو چند مختصر الفاظ میں یوں بیان کیا ہے کہ یَتْلُوْا عَلَیْھِمْ اٰیٰتِکَ وَیُعَلِّمُھُمُ الْکِتٰبَ وَالْحِکْمَۃَ وَیُزَکِّیْھِمْ (۶۲/۲؛ ۲/۱۲۹) وہ ان کے سامنے قوانینِ خداوندی پیش کرتا ہے۔ انھیں ان کی غرض وغایت کی تعلیم دیتا ہے اور پھر مسلسل و پیہم تربیت سے ان کے جوہرِ انسانیت کی نشوونما کرتا ہے۔ اس کے ساتھ ہی وہ اس قسم تعلیم و تربیت یافتہ انسانوں کے دلوں کو یک نگہی اور یک مقصدی کے رشتے میں منسلک، اور انھیں باہمدگر پیوست کرکے ایک ایسی امت کی تشکیل کرتا ہے جو اس پیغامِ خداوندی کو عملی نظام کی شکل میں دنیا کے سامنے پیش کرتی ہے۔

قرآنِ کریم خدا کا آخری پیغام تھا جس کے اندر وہ تمام قوانین واصولِ حیات، جامع اور غیر متبدل شکل میں محفوظ کر دیئے گئے تھے جن کے مطابق عالمگیر انسانیت کو آخرالامر ایک حیات پرور اور انسانیت ساز نظام کے تابع زندگی بسر کرنی تھی۔ ظاہر ہے کہ اس قسم رفیع و منیع پروگرام کی ابتداء ایک ایسی قوم کے ہاتھوں ہو سکتی تھی جو اس بارِ امانت کے اٹھانے کی کماحقہٗ اہل ہو۔ تاریخِ انسانیت کا یہ ایک اہم سوال ہے کہ اس عالمگیر انقلاب کی تخم ریزی کے لئے سرزمین عرب کو کیوں منتخب کیا گیا؟ عربوں میں وہ کون سی خصوصیات تھیں جن کی بنا پر انھیں اس قابل سمجھا گیا کہ وہ اس ابدیت بداماں انقلاب کے لئے اولین خمیر کا کام دیں۔

عربوں کی خصوصیت

زمانہ قبل از اسلام کے عربی معاشرہ میں (جسے ایامِ جاہلیت سے تعبیر کیا جاتا ہے) جو ذمائم اور عیوب وبائی امراض کی طرح عام ہو رہے تھے، ان کے تذکرے سے کتبِ تاریخ کے صفحات بھرے پڑے ہیں لیکن اُن کی اُن خصوصیات کو، جن کی بنا پر انھیں اس جلیل القدر مقصد کے لئے منتخب کیا گیا تھا، نمایاں اور جامع طور پر بہت کم سامنے لایا جاتا ہے، حالانکہ تاریخ کا یہ گوشہ بڑی اہمیت کا حامل ہے۔ میں نے ان خصوصیات کو اپنی کتاب، **معراجِ انسانیت** میں، جو حضور نبی اکرمؐ کی حیاتِ طیبہ کے تذکارِ جلیلہ پر مشتمل ہے، بڑی شرح وبسط سے بیان کیا ہے۔ اس مقام پر انھیں، موضوعِ زیرِ نظر کی نسبت سے، مجملاً پیش کیا جاتا ہے۔ (میں نے اس میں لکھا ہے کہ) کسی قوم کے اجتماعی عیوب وذمائم کو اصولی طور پر دو شقوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ ایک وہ جو غلامی اور محکومی کے پیدا کردہ ہوتے ہیں اور دوسرے وہ جو نشۂ قوت کی بدمستی اور جذبۂ تغلب کی بدلگامی کی تخلیق ہوتے ہیں۔ پہلی شق میں دنایت، کمینگی، بےحمیتی، بےغیرتی، دوں ہمتی، پست فطرتی، تنگ نظری، کور ذوقی، بدعہدی، غداری، منافقت، دروغ بافی، بہانہ سازی، فریبکاری، مکاری، عیاری، تلون مزاجی، بددیانتی، عدمِ اعتماد، سہل انگاری، تن آسانی، گدیہ گری جیسی رذیل عادات شامل ہیں۔ دوسری طرف نشۂ قوت وسطوت کی بدمستی سے، استیلاء، تغلب، استحصال، استبداد، تمرد ونخوت، تظلم جیسی انسانیت سوز خصلتیں

بیدار ہوتی ہیں جن سے انسان، انا الموجود لاغیری کے اہرمانہ نشۂ اقتدار سے مغلوب ہو کر اپنے سوا کسی کو جینے کا حق دینے کے لئے تیار نہیں ہوتا۔

خطۂ حجاز نہ کسی کا محکوم تھا اور نہ ہی اس میں ہوسِ ملک گیری اور جوع الارض پیدا ہوئی تھی۔ اس سرزمین کو یہ خصوصیت حاصل تھی کہ جب سے زندگی کی نمود ہوئی، اس پر کسی غیر نے حکومت نہیں کی۔ غیر تو ایک طرف، اُن کی اپنی بھی کوئی منظم حکومت نہیں تھی۔ اس لئے ان کے دل و دماغ ان ابلیسانہ روباہ بازیوں سے پاک اور صاف تھے جو میکیاولی سیاست کا لازمی نتیجہ ہوتی ہیں۔ دوسری طرف، وہاں تمدنی زندگی کے وہ جراثیم بھی نہیں پہنچ پاتے تھے جو ایران و روما کی جذامی تہذیب کی پیداوار تھے وہ سیدھے سادے لوگ تھے جو صاف اور شفاف صحرائی ماحول میں زندگی بسر کرتے چلے آ رہے تھے اسی ماحول کا نتیجہ تھا کہ ان کے سینوں میں صحراؤں کی سی وسعت، ان کی نگاہوں میں چشموں کی سی پاکیزگی اور سیرچشمی، ان کے ارادوں میں رِفعت و تخیل کی سی بلندی اور ان کے عزم میں کوہساروں کی سی پختگی پیدا ہو چکی تھی۔ مہمان نوازی، ایفائے عہد، احسان شناسی، شجاعت، بسالت، مروّت ان کی فطرت بن گئی تھی۔ ممکن ہے یہ کہہ دیا جائے کہ جس قوم میں اس قسم کے جوہر پہلے سے موجود ہوں، اسے ایک مثالی اُمّت بنا دینا چنداں مشکل نہ تھا لیکن اس مشکل کا اندازہ اس وقت لگ سکے گا جب ہم یہ دیکھیں کہ ان پسندیدہ خصائل کے ساتھ، ان میں ناپسندیدہ خصائص کس قسم کے تھے اور ان کی شدت اور تصلّب کا کیا عالم تھا! احساسِ برتری اور جذبۂ انتقام جوئی ان کے رگ و پے میں اس طرح سرایت کر چکا تھا کہ دنیا کی بڑی سے بڑی طاقت بھی انہیں اس سے باز نہیں رکھ سکتی تھی۔ چھوٹی چھوٹی سی باتوں پر ایسی لڑائیاں چھڑ جاتی تھیں جن کا سلسلہ سو سو سال تک جاری رہتا اور ہر مرنے والا اپنی اولاد کو وصیت کر جاتا کہ جب تک تم فریقِ مخالف سے انتقام نہ لے لو، اس آگ کو فرو نہ ہونے دینا۔ ان کے نسبی افتخار کا یہ عالم تھا کہ ایک قبیلہ، اپنے سے فروتر قبیلہ کے ساتھ رشتۂ یگانگت استوار کرنا تو ایک طرف، ان کے مقابلہ میں میدانِ کارزار میں اترنا بھی باعثِ ننگ سمجھتا تھا۔ ان کے جذبۂ تفوق و منافرت کی یہ کیفیت تھی کہ جب بدر کے میدان میں ایک مجاہدؓ ابوجہل کا سر کاٹنے لگا تو اس نے کہا کہ دیکھنا میری گردن کو ذرا نیچے، کندھوں کے برابر سے کاٹنا۔ اس نے پوچھا کہ یہ کیوں؟ تو اس نے کہا کہ جب لڑائی کے بعد مقتولین کے سروں کا نیزوں پر جلوس نکلے گا، تو میرا سر باقیوں کے سروں سے جب بھر اونچا ہوگا اور دُور سے نظر آتے گا کہ فلاں سردار کا سر ہے! مذہب کی دنیا کو تذلّل و تعبد کا انتہائی گوشہ سمجھا جاتا ہے۔ بات ہے بھی ٹھیک جس معبود کو پرستش کے لئے منتخب کر لیا جاتا ہے اس کے سامنے سر اٹھا کر چلنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ جسے خدا تسلیم کر لیا جائے اس کے حضور سرکشی کیسی؟ لیکن عربوں کا احساسِ برتری اور جذبۂ تغلّبِ نفس اس گوشہ میں بھی عجیب

غریب تھا۔ ایک دفعہ امراء القیس کے باپ کو کسی نے قتل کر دیا تو وہ 'حسبِ دستور' اپنے سب سے بڑے دیوتا کی بارگاہ میں پہنچا کہ اس سے باپ کا انتقام لینے کی اجازت حاصل کرے۔ اجازت طلبی کے لئے تیر پھینکا تو اس کا جواب نفی میں تھا۔ دوسری مرتبہ تیر پھینکا تو پھر بھی وہ نفی میں نکلا۔ تیسری (اور آخری) مرتبہ تیر پھینکا، تو جواب پھر بھی نفی میں تھا۔ امراء القیس بپھر گیا۔ تیروں کا ترکش زور سے بت (یعنی اپنے خدا) کے منہ پر مارا اور کہا کہ اگر تیرے باپ کو کسی نے قتل کر دیا ہوتا تو پھر میں دیکھتا تو کس طرح انتقام لینے سے باز رہتا ہے! تو اجازت نہیں دیتا، تو نہ دے، میں تو انتقام لے کر رہوں گا۔۔۔۔ یہ کہا اور انتقام جوئی کے لئے نکل کھڑا ہوا۔

یہ تھی وہ قوم جسے اس قسم کی اُمّت کے قالب میں ڈھالنا مقصود تھا۔ جس میں عرب کا سب سے بڑا سردار حبش کے ایک غلام (بلالؓ) کو سیّدنا بلالؓ (ہمارے سردار بلالؓ) کہہ کر پکارے، اور جس میں قوانینِ خداوندی کے سامنے اس طرح سرِ تسلیم خم کر دیا جائے کہ ان کی تعمیل میں، دل کی گہرائیوں میں بھی کسی قسم کی گرانی پیدا نہ ہو۔۔۔۔ لَا یَجِدُوْا فِیْۤ اَنْفُسِهِمْ حَرَجًا مِّمَّا قَضَیْتَ وَ یُسَلِّمُوْا تَسْلِیْمًا۔ (۴/۶۵) کسی تالاب میں محصور پانی کو تو آپ جس طرح جی چاہے استعمال میں لا سکتے ہیں، لیکن ایک کف بردہان، بپھرے ہوئے سیلاب کو ساحلوں میں محبوس کرنا، تاکہ وہ باعثِ تباہیِ باغ و راغ بننے کے بجائے وجہِ شادابیِ کشت و چمن بن جائے، کچھ آسان کام نہیں ہوتا۔

یہ تھے وہ عرب جنھیں عالمگیر انقلاب کی تخم ریزی کے لئے منتخب کیا گیا تھا۔ پھر جس طرح یہ قوم، اپنی ہمعصر اقوام میں منفرد خصوصیات کی حامل تھی، اسی طرح، خود اس قوم میں بھی بعض قبائل دیگر قبائل کے مقابلہ میں افضل و اعلیٰ تھے۔ ان میں قریش کا قبیلہ سب سے بلند تھا، اور قریش میں بنو ہاشم کی شاخ، سب سے زیادہ سرفراز (اسی شاخِ بلند کے گلِ سرسبد مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰہِ تھے)

اور یہ بھی ظاہر ہے کہ ہر قبیلہ میں بھی بعض افراد، دوسرے افراد کے مقابلہ میں بلند و برتر تھے۔ قریشِ مکہ میں، اس زمانے میں دو افراد، باقیوں کے مقابلہ میں زیادہ سرکردہ نظر آتے تھے۔ اُنہی پر نبی اکرمؐ کی نگہِ انتخاب آکر رُکی تھی اور اُنہی کے لئے آپؐ نے بدرگاہِ ربّ العزت ان الفاظ میں اپنی شدّتِ آرزو کا اظہار فرمایا تھا کہ:

رسول اللہؐ کی دُعا | یا الٰہ العالمین! اسلام کو ابوجہل یا عمر ابن الخطاب کے ذریعے تقویت بخش۔ ان دونوں میں سے تجھے جو بھی محبوب ہو، اسے مشرف بہ اسلام فرما۔

ابوجہل، عمر ابن الخطاب کا ماموں تھا، اور ان دونوں (ماموں، بھانجا) کا اس معاشرہ میں کیا مقام تھا، اس کا اندازہ حضورؐ کی اس دعا سے لگ سکتا ہے۔ یہ شاخِ بنو ہاشم سے منسلک نہیں تھے بلکہ قریش کے ایک اور قبیلہ عدّی سے متعلق تھے۔ عربوں کے عام معمول کے مطابق، ان دونوں شاخوں میں بھی باہمی چشمک رہتی تھی۔ رسولؐ اللہ کی مندرجہ بالا دعا ایک اور عمیق نفسیاتی حقیقت کی دلالت کرتی ہے۔ ہم اوپر بیان کر چکے ہیں کہ رسولؐ کا فریضہ یہ بھی تھا کہ وہ افرادِ اُمت کی انسانی صلاحیتوں (یعنی انسانی ذات) کی نشو و نما کرے۔ دنیا میں اکثر لوگ ایسے ہوتے ہیں جن کی انسانی صلاحیتیں بیدار نہیں ہوتیں لیکن بعض ایسے بھی ہوتے ہیں جن کی یہ صلاحیتیں بیدار تو ہوتی ہیں لیکن ان کا رُخ متعیّن نہیں ہوتا جس کی وجہ سے وہ تعمیری نتائج مرتب کرنے کی بجائے تخریبی نتائج پیدا کرنے کا موجب بنتی ہیں۔ اوّل الذکر افراد کے سلسلہ میں رسولؐ کا فریضہ یہ ہوتا ہے کہ وہ مناسب تعلیم و تربیّت سے، پہلے ان کی انسانی صلاحیتوں کو بیدار کرے اور اس کے بعد ان کا رُخ صحیح سمت کی طرف متعیّن کرے۔ لیکن ثانی الذکر افراد کے ضمن میں اُسے، ان کی بیدار شدہ (لیکن سرکش) صلاحیتوں کو مستقل اقدارِ خداوندی کے قالب میں ڈھالنا ہوتا ہے۔ خود حضورؐ کے ارشاد فرمودہ استعارہ کے مطابق یوں کہیئے کہ "ان کے ابلیس کو مسلمان کرنا" مقصود ہوتا ہے۔ حضورؐ نے جن دو افراد (ابوجہل اور عمرؓ) کے لئے دُعا مانگی تھی، ان کی صلاحیتیں، بیدار اور اس کے ساتھ ہی نہایت بیباک، سرکش اور رعناں تاب تھیں لیکن تھیں وہ ایسی توانائیوں کی حامل کہ اگر "ان کا ابلیس مسلمان ہو جاتا" تو وہ فلاح و فروغِ انسانیّت کے لئے بڑی تقویت کا موجب بنتیں۔ ان دونوں میں، ابوجہل کا ابلیس، پندارِ نفس کے اس مقام تک پہنچ چکا تھا جہاں سے واپس آنا وہ اپنے لئے موت کا پیغام سمجھتا تھا۔ وہ دعوتِ محمدیہ کو کس نگاہ سے دیکھتا تھا اس کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ جب اس سے اس کی بابت سوال کیا گیا تو اس نے کہا کہ

> ہم میں اور عبد مناف (یعنی نبی اکرمؐ کے خاندان) میں شرف و عظمت کا جھگڑا تھا۔ انھوں نے... .... کھانا کھلایا تو ہم نے بھی کھلایا۔ انھوں نے ذمّہ داریاں سنبھالیں تو ہم نے بھی سنبھالیں انھوں نے بخششیں کیں تو ہم نے بھی کیں۔ غرضیکہ ہم ایک دوسرے کے دوش بدوش چلتے رہے لیکن جب ہم نے شہ سواری میں ان پر سبقت حاصل کی تو انھوں نے دعویٰ کر دیا کہ ہم میں نبی مبعوث ہوا ہے جس پر آسمان سے وحی نازل ہوتی ہے۔ اب ہم اس کا جواب کیسے دے سکتے ہیں۔ خدا کی قسم ہم اس پر کبھی ایمان نہیں لائیں گے۔ ہرگز اس کی اطاعت نہیں کریں گے۔

لیکن خاندانی عصبیّت اور جذبۂ منافست نے، ابن خطاب کی فکری صلاحیّت کو مفلوج نہیں کر دیا تھا۔ ان کے ذوقِ تحقیق

تفحص کا یہ عالم تھا کہ جب ہجرت کے بعد آپ مدینہ گئے تو وہاں یہودیوں کے ہاں تورات کا درس ہوتا تھا۔ آپ اس درس میں شریک ہوتے تھے لیکن تورات عبرانی زبان میں تھی۔ اس کے لئے آپ نے عبرانی سیکھی اور اس میں اس حد تک مشق بہم پہنچائی کہ آپ براہِ راست تورات کا مطالعہ کرنے لگ گئے۔ یہی تھا وہ جذبۂ تحقیق و تجسس جس کی بنا پر وہ اسلام کی دعوت کا غائر نگاہ سے مطالعہ کر رہے تھے اور اسی کا نتیجہ تھا کہ ابوجہل جہالت کی زندگی جیا اور جہالت ہی کی موت مرگیا لیکن عمر ابن الخطاب ـــــ فاروق اعظمؓ بن کر آسمانِ انسانیت پر مہر عالمتاب کی طرح ایسے چمکا کہ اس کی ضوفشانیاں ابدالآباد تک وجہ تابندگی عالم بن گئیں۔

ہست ایں میکدہ و دعوتِ عام است ایں جا
قسمتِ بادہ باندازہ جام است ایں جا

ذاتی اور خاندانی کوائف

اہلِ عرب عموماً عدنان کی اولاد ہیں اور عدنان کا سلسلہ حضرت اسمٰعیلؑ تک پہنچتا ہے۔ عدنان کے نیچے گیارہویں پشت میں فہر بن مالک، ایک ذی اقتدار شخصیت گذری ہے۔ انہی کی اولاد ہے جو قریش کے لقب سے مشہور ہے۔ قریش کی نسل میں دس اشخاص نے بڑا نام پیدا کیا اور انہی کی طرف نسبت سے قریش کے دس جداگانہ قبیلے وجود میں آتے۔ ان میں سے ایک قبیلہ ہاشم تھا جس سے رسول اللہ متعلق تھے اور ایک قبیلہ عدیؔ، جس کی اولاد سے (حضرت) عمرؓ تھے۔ حضرت عمرؓ کا سلسلۂ نسب، رسول اللہ سے آٹھویں پشت میں جا کر مل جاتا ہے۔ ان کے والد کا نام خطاب تھا اسی لئے انھیں عمر ابن الخطاب کہا جاتا ہے۔ چونکہ سنین کے معاملہ میں ہماری صدرِ اوّل کی تاریخ بڑی ناقص ہے اس لئے آپ کی سنِ پیدائش کے متعلق مختلف روایات ہیں۔ عام طور پر یہ کہا جاتا ہے کہ آپ کی پیدائش، نبی اکرمؐ کی بعثت سے تیس سال پہلے ہوئی تھی، اور چونکہ (عام روایات کے مطابق) بعثت کے وقت حضورؐ چالیس سال کے تھے، اس لئے (اس اعتبار سے) آپ، نبی اکرمؐ سے عمر میں دس سال چھوٹے تھے۔ ہم نے یہ تصریح محض تاریخی نقطۂ نگاہ سے ضروری سمجھی ہے، ورنہ اسلام کے نقطۂ نظر سے تو آپ کی "پیدائش" بعثت نبویؐ کے چھٹے سال ہوئی جب حضورؐ کے دمِ مسیحائی نے آپ کو حیاتِ تازہ سے سرفراز فرمایا۔ (تفصیل اس اجمال کی آگے چل کر سامنے آئے گی) باپ بڑا سخت گیر تھا۔ ایک دفعہ (زمانۂ خلافت میں) آپ مکہ سے باہر وادی ضجنان سے گزر رہے تھے کہ اچانک کھڑے

ہو گئے۔ آبدیدہ ہو کر فرمایا۔
اللہ اکبر! ایک وہ زمانہ تھا کہ میں نمدہ کا کرتہ پہنے' اس وادی میں اونٹ چرایا کرتا تھا۔ تھک کر بیٹھ جاتا تو باپ کے ہاتھوں مار کھاتا اور آج یہ دن ہے کہ خدا کے سوا میرے اوپر کوئی حاکم نہیں
سوچئے کہ اس قسم کا تفاوتِ مقام عمرؓ کے سوا اور کون بیان کر سکتا تھا! زندگی کی راہوں میں اسی قسم کے باریک فرق کرنے کی جہت سے تو آپ فاروق کہلاتے۔

معاشرہ میں مقام

جبلِ عرفات کے قریب ایک مقام تھا عکاظ جہاں سال بہ سال اس مقصد کے لئے میلہ لگتا تھا کہ عرب کے تمام اہلِ ہنر و فن وہاں جمع ہو کر اپنے اپنے کمالات کے جوہر دکھائیں۔ اس میلہ میں وہی صاحبِ ہنر شریک ہوتے تھے جو اپنے فن میں کامل دستگاہ رکھتے تھے۔ اس زمانے میں کُشتی لڑنا بہت بڑا فن سمجھا جاتا تھا۔ عمر ابن الخطاب' عکاظ کے دنگل میں کشتی لڑا کرتے تھے اور اس کا شہرہ دُور دُور تک پھیلا ہوا تھا۔ شہسواری میں بھی انھیں بڑی مہارت حاصل تھی۔ شعر کا مذاق نہایت شستہ تھا' اس لئے جب وہ کُشتی کے اکھاڑے سے نکل کر محفلِ شعر و سخن کی طرف آتے' تو وہاں بھی باعثِ رونقِ مجلس بن جاتے۔ حسب و نسب پر فخر کرنا عربوں کی بنیادی خصوصیت تھا' اس لئے علم الانساب ان کے ہاں بڑی قدر و منزلت سے دیکھا جاتا تھا۔ (حضرت) عمرؓ نے یہ فن اپنے باپ سے سیکھا اور اس میں ایسا مقام حاصل کیا کہ جب کوئی شخص قریش کے سامنے نسبی تفاخر کے لئے آتا تو اس کے مقابلہ کے لئے عمر ابن الخطاب کو منتخب کیا جاتا۔ وہ قریش کے سفیر بھی تھے' اس لئے جب کسی سے ان کی (قریش کی) جنگ ہوتی' تو اس سلسلہ میں وہ آپ ہی کو اپنا نمائندہ بنا کر بھیجتے۔ عربوں میں لکھنا پڑھنا بہت کم آدمی جانتے تھے۔ چنانچہ بعثتِ نبویؐ کے وقت مکہ میں صرف سترہ آدمی نوشت و خواند سے واقف تھے' اور ان میں ایک عمرؓ بھی تھے۔

تجارت کی غرض سے آپ' اکثر دُور دراز علاقوں (عراق' شام' یمن) جایا کرتے تھے لیکن انداز یہ تھا کہ ضرورت کے مطابق کاروبار کر کے' باقی وقت' وہاں کے اعیانِ سلطنت اور اربابِ حکمت و دانش سے ملتے اور اس طرح اپنے علم و فکر میں اضافہ کرتے۔ زندگی خوشحالی کی بسر کرتے تھے بلکہ بعض روایات سے تو ایسا مترشح ہوتا ہے کہ ان کا شمار قریش کے متمول ترین لوگوں میں ہوتا تھا۔

اسلامی تحریک کی مخالفت

اسلام نے جو تحریک اٹھائی تھی، وہ اسے، عربوں کے قدیم تمدن و معاشرت، اور ان کے متوارث تصورات و نظریاتِ حیات کے لئے عظیم خطرہ سمجھتے تھے اس لئے اس کی مخالفت کرتے تھے، اور چونکہ انتہائی مخلص اور انتہا پسند تھے اس لئے اس مخالفت میں بھی سب سے آگے تھے اور مسلمانوں پر سختیاں کرنے میں بڑی شدت برتتے تھے۔

(حضرت) عمرؓ کے متعلق عام تصور یہی ہے کہ وہ بڑے سخت گیر، تندخو، درشت مزاج تھے۔ ہنٹر (درہ عمری) ہر وقت ان کے ہاتھ میں رہتا تھا اور وہ اس سے لوگوں کو پیٹتے تھے لیکن ان کے متعلق یہ تصور صحیح نہیں۔ اسلام کے بعد تربیتِ نبویؐ نے ان میں کیا قلبِ ماہیت پیدا کر دی تھی۔ اس کا ذکر تو بعد میں آئے گا۔ زمانۂ جاہلیت میں بھی وہ (سخت مزاج تو تھے لیکن) سنگدل نہیں تھے۔ ان کی کیفیت وہ تھی، جس کا نقشہ اقبالؒ نے ان الفاظ میں کھینچا ہے کہ:-

تنے پیدا کن از مشتِ غبارے تنے محکم تراز سنگیں حصارے
درونِ اُو دلِ درد آشنائے چو جوئے درکنارِ کوہسارے

جیسا کہ کہا جا چکا ہے، وہ (دیگر زعمائے مکہ کی طرح) مسلمانوں پر بڑی سختیاں کرتے تھے۔ ان سختیوں سے تنگ آکر، مسلمان (مردوں اور عورتوں) نے حبشہ کی طرف ہجرت کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ انہی میں کی ایک خاتون اُمِّ عبداللہ بنت ختمہ کا بیان ہے کہ جب ہم ہجرت کے لئے سامانِ سفر باندھ رہے تھے تو عمرؓ آئے اور میرے پاس کھڑے ہو گئے۔ کہنے لگے ــــ "اُمِّ عبداللہ! کیا تم واقعی جا رہی ہو۔" ــــ میں نے کہا ــــ "ہاں! قسم بخدا! ہم کہیں اور چلے جائیں گے۔ خدا کی زمین بڑی وسیع ہے۔ تم نے تو ہمیں تنگ کر مارا ہے، خدا ہمیں کشائش عطا کر دے گا۔ ہم جا رہے ہیں" ــــ اس پر عمرؓ نے ایک عجیب حسرت بھری نگاہ سے میری طرف دیکھا اور کہا ــــ "اچھا! خدا تمہارا ساتھ دے" ــــ اُمِّ عبداللہ کہتی ہیں کہ میں نے عمرؓ کو ساری زندگی اس قدر رقیق القلب نہیں دیکھا تھا۔ جب عامر بن ربیعہ گھر آئے تو میں نے ان سے کہا کہ مجھے توقع ہے کہ عمرؓ اسلام لے آئیں گے۔

اور اُمِّ عبداللہ کا قیاس صحیح نکلا۔ عمرؓ کی رقّتِ قلب اسے کشاں کشاں اس آستانہ پر لے گئی جہاں عرقِ انفعال کا ہر قطرہ موتیوں سے تولا جاتا ہے۔ وہ وہاں پہنچا۔ انتہائی دلگدازی اور جاں سوزی کے عالم میں ہاتھ

پھیلاتے اور صدا دی کہ

ساقیا! بر جگرم شعلۂ نمناک انداز
دگر آشوبِ قیامت بکفِ خاک انداز

دُوسرا باب

خلیلِ عشق دیرم را حرم کرد

جیسا کہ پہلے بیان ہو چکا ہے' امرائے قریش' اس جدید تحریک (اسلام) کی شدت سے مخالفت کرتے تھے۔ اس مخالفت کی وجہ یہ تھی کہ یہ (جدید) تصورِ حیات اور نظامِ زندگی' ان کے قدیمی معتقدات اور نظامِ معاشرہ کو جڑ بنیاد سے اکھیڑ کر رکھ دیتا تھا۔ اقبالؒ نے اس حقیقت کو" نوحۂ روحِ ابوجہل در حرمِ کعبہ" کے عنوان سے' جاوید نامہ میں بڑے دلکش انداز میں بیان کیا ہے۔ انھوں نے کہا ہے کہ اس جدید نظامِ حیات (دینِ محمدیؐ) کی روز افزوں ترقی سے گھبرا کر' ابوجہل کعبہ میں گیا۔ غلافِ کعبہ کو تھاما' اور اپنے معبودان — لات و منات و ہبل — کو بنہایت عجز و الحاح سے پکار کر' ان کے حضور یوں نوحہ کناں ہُوا کہ

سینۂ ما از محمدؐ داغ داغ　　　از دمِ اُو کعبہ را گُل شُد چراغ
از ہلاکِ قیصر و کسریٰ سرود　　　نوجواناں را ز دستِ ما ربود
تا بساطِ دینِ آباء در نورد　　　با خداوندانِ ما کرد آنچہ کرد

اس کے بعد کہا کہ یہ دین جس قسم کا انقلاب لانا چاہتا ہے' وہ ہمارے لئے تباہ کن ہے۔

مذہبِ او قاطعِ ملک و نسب　　　از قریش و منکر از فضلِ عرب
در نگاہِ او یکے بالا و پست　　　با غلامِ خویش بر یک خواں نشست
قدرِ احرارِ عرب نشناختہ　　　با کلفتانِ حبش در ساختہ
احمراں با اسوداں آمیختند　　　آبروئے دودمانے ریختند

یہ وہ انقلاب ہے جسے یہ نیا دین ہماری معاشرتی زندگی میں لانا چاہتا ہے اور جو تبدیلی یہ معاشی زندگی میں لانے کا مدعی ہے، وہ اس سے بھی کہیں زیادہ خطرناک ہے۔ وہ طبقاتی امتیاز مٹانا چاہتا ہے اور تمام انسانوں میں اس قسم کی مساوات پیدا کرنا چاہتا ہے جس سے امیر اور غریب کا فرق ہی مٹ جائے۔ یہ خالص مزدکیت (پارس کی کمیونزم) ہے جسے اس (محمدؐ) نے سلمانؓ فارسی سے سیکھ لیا ہے۔

این مساوات این مواخات اعجمی است خوب می دانم کہ سلماں مزدکی است

ابن عبداللہ فریبش خوردہ است رستخیزے بر عرب آوردہ است

اس نوحہ کے ساتھ اس نے اپنے معبودوں سے درخواست کی کہ:۔

اے ہبل! اے بندہ را پوزش پذیر خانۂ خود را ز بے کیشاں بگیر

اے منات، اے لات، ازیں منزل مرو گر ز منزل می روی، از دل مرو

یہ بھی ان کی وجہ مخاصمت۔ اس کے لئے وہ مسلمانوں پر بڑا تشدد برتتے، جاں سوز سختیاں کرتے، جگرگداز اذیتیں پہنچاتے، لیکن ان بادہ مستانِ توحید پر اس کا کچھ اثر نہ ہوتا۔ وہ دیکھتے کہ ان کی کیفیت یہ ہے کہ:۔

بڑھتا ہے اور "ذوقِ گنہ" یاں سزا کے بعد

ان سختیوں سے، ان میں سے کوئی بھی اپنی روش سے باز نہیں آتا، اور یہ تحریک آگے ہی آگے بڑھے چلی جا رہی ہے۔

ابنِ خطاب کی طرف سے مخالفت

ان متشدد مخالفین میں ابن الخطاب پیش پیش تھا۔ وہ اپنے معاشرہ میں ایک امتیازی حیثیت کا مالک تھا۔ طبعاً انتہا پسند۔ پھر جوانی کا زمانہ ــــ اس پر طرہ یہ کہ، (بقول ان کے) یہ "ارتداد" خود ان کے اپنے گھر میں بھی گھس آیا۔ ان کی ایک کنیز (لبینہؓ) مسلمان ہو گئی اور بہن (فاطمہؓ) اور بہنوئی سعیدؓ بن زید، جو ان کے چچازاد بھائی بھی ہوتے تھے، اسلام لے آئے۔ اس سے ان کا جذبۂ مخاصمت و تشدد اور بھی بڑھ گیا لیکن یہ عجیب ماجرا ہے کہ جس مقام پر یہ جذبۂ مخاصمت اپنی انتہا تک پہنچتا ہے اسی مقام سے خود ان کی اپنی زندگی ایک نیا رُخ اختیار کر لیتی ہے۔ روایات میں ان کے مشرف بہ اسلام ہونے کا واقعہ ان کی بہن اور بہنوئی کی نسبت سے سامنے لایا جاتا ہے۔ کہا یہ جاتا ہے کہ قریش نے تنگ آکر بالآخر یہ فیصلہ کیا کہ اس "فتنہ" کو فرو کرنے کا ایک ہی طریقہ ہے اور وہ یہ کہ خود محمدؐ کو (معاذ اللہ) قتل کر دیا جائے۔ اس کا ذمہ عمرؓ نے لیا۔ وہ اسی ارادے سے گھر سے نکل کر جا رہے تھے کہ راستے میں انھیں ایک مسلمان نعیمؓ ابن عبداللہ ملے۔ انھوں نے پوچھا کہ عمر! اس دوپہر کی سخت گرمی میں کدھر جا رہے ہو؟ انھوں نے کہا کہ (معاذ اللہ)

اس بے دین کی طرف جس نے قریش میں پھوٹ ڈال دی ہے، انھیں بیوقوف بناتا ہے ان کے معبودوں کو گالیاں دیتا ہے۔ میں اسے ختم کر دینا چاہتا ہوں۔

اس پر نعیمؓ نے کہا۔ "عمرؓ! تم ٹھیک راستے پر نہیں چل رہے۔ اگر تم نے محمدؐ کو قتل کر دیا تو سوچو کہ کیا بنو عبدِ مناف تمھیں زندہ چھوڑیں گے۔" باتیں کرتے کرتے دونوں میں جھگڑا بڑھ گیا تو ابنِ خطاب نے کہا کہ میں سمجھتا ہوں کہ تو بھی بے دین ہو گیا ہے۔ اگر مجھے اس کا علم ہوتا تو میں تجھی سے ابتدا کرتا۔

نعیمؓ نے دیکھا کہ عمرؓ اس طرح باز آنے کا نہیں تو اس سے کہا کہ ابتدا کرنی ہے تو مجھ سے کیوں کرتے ہو، خود اپنے گھر سے کیوں نہیں کرتے۔ تمھیں معلوم ہے کہ تمھارا بہنوئی اور بہن دونوں مسلمان ہو چکے ہیں۔

عمرؓ نے یہ سُنا تو وہ آگ بگولہ ہو گئے اور فوراً اپنی بہن کے گھر کی طرف ہو لئے۔ بعض روایات میں ہے کہ

اسلام لانے کا واقعہ

انھیں راستے میں نعیمؓ ابن عبداللہؓ نہیں بلکہ سعدؓ بن ابی وقاص ملے تھے بہرحال بہن کے گھر کے دروازہ پر پہنچ کر عمرؓ نے دستک دی تو اندر بہن اور بہنوئی، قرآنِ کریم کی سورۃ طٰہٰ کی تلاوت کر رہے تھے۔ دستک کی آواز پر پوچھا کون؟ تو جواب ملا۔ ابن الخطاب۔ یہ سُنکر ان دونوں کے اوسان خطا ہو گئے۔ بہنوئی نے جلدی سے دروازہ کھولا تو بہن قرآن کے اوراق اپنے پہلو کے نیچے چُھپا کر بیٹھ گئیں۔ عمرؓ نے پوچھا کہ اندر سے گنگنانے کی کیا آواز آ رہی تھی۔ تم دونوں کیا پڑھ رہے تھے۔ انھوں نے جواب میں تامل برتا، تو یہ کڑک کر بولے کہ مجھے معلوم ہو گیا ہے کہ تم دونوں بے دین ہو گئے ہو! یہ کہا اور سعیدؓ پر جھپٹ پڑے۔ دونوں ایک دوسرے سے گتھم گتھا ہو گئے۔ چونکہ عمرؓ ان سے زیادہ طاقت ور تھے، اس لئے بہنوئی کو زمین پر دے مارا اور ان کے سینے پر سوار ہو گئے۔ بہن مدافعت کے لئے آگے بڑھیں تو بھائی نے اس کے چہرے پر اس زور سے تھپڑ مارا کہ وہ لہولہان ہو گئی۔ وہ غصے سے بولیں کہ اے دشمنِ خدا! تو مجھے اس لئے مارتا ہے کہ میں کہتی ہوں خدا ایک ہے۔ اس کا کوئی شریک نہیں۔ اگر یہی بات ہے تو سن لو کہ

اَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِيْكَ لَهٗ وَ اَشْهَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ ۔ ہم اسلام لا چکے ہیں۔ فَاقْضِ مَآ اَنْتَ قَاضٍ ۔ جو تیرا جی چاہے کر لے۔ (۲۰/۷۲)

بہن کا خون آلودہ چہرہ ۔ اور یہ جواب! عمرؓ گہری سوچ میں ڈوب گیا۔ غصہ فرو ہو گیا۔ رقّتِ قلب عود کر آئی۔ بہنوئی کو زمین پر سے اٹھایا۔ بہن سے کہا کہ مجھے وہ صحیفہ دکھاؤ جسے تم پڑھ رہی تھیں۔ بہن نے کہا ہرگز

نہیں۔ بھائی نے کہا۔ عزیزہ! تیری بات میرے دل میں اُتر چکی ہے۔ مجھے صحیفہ دو کہ میں اسے خود پڑھوں۔ میں وعدہ کرتا ہوں کہ اسے ضائع نہیں کروں گا۔ تمھیں واپس دے دوں گا۔ بہن نے کہا کہ "تم ناپاک ہو اور اس صحیفہ کو صرف پاک لوگ چھو سکتے ہیں۔ پہلے غسل کرو تو پھر صحیفہ دوں گی"۔ غور کیجئے کہ ایسی سادہ سی تدبیر میں نگاہ کا زاویہ اور دل کا ارادہ بدلنے کے لئے کتنے نفسیاتی مؤثرات پوشیدہ تھے!

عمرؓ نے صحیفہ ہاتھ میں لیا۔ اس میں سورۃ طٰہٰ اور دیگر سورتوں کی آیات درج تھیں۔ کھولا تو سامنے سورۃ حدید تھی سَبَّحَ لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَهُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ۔ (۵۷/۱) عمرؓ پڑھتے جاتے تھے اور ان کے دل کی حالت بدلتی جاتی تھی۔ تلاوت ختم کی تو عمرؓ کی دنیا بدل چکی تھی۔

عشق کی اک جست نے طے کر دیا قصہ تمام
اس زمین و آسماں کو بے کراں سمجھا تھا میں

کہا کہ جو ذات ایسی باتیں کہے اس کے ساتھ واقعی کسی اور کو شریک نہیں کرنا چاہیئے۔ مجھے بتاؤ کہ محمدؐ کہاں ہیں؟ چونکہ اب عمرؓ کا انداز کچھ اور ہو چکا تھا، اس لئے انھیں بتا دیا گیا کہ آپؐ مع صحابہؓ صفا کے دامن میں قیام پذیر ہیں۔ آپ نے تلوار حمائل کی اور سیدھے حضورؐ کی قیام گاہ پر پہنچ گئے۔ اندر سے دروازہ بند تھا۔ صحابہؓ نے ابن خطاب کی آواز سنی تو گھبرا گئے۔ حضرت حمزہؓ نے کہا کہ ڈرنے کی کوئی بات نہیں۔ اگر عمرؓ نیک ارادے سے آیا ہے تو بسم اللہ اور اگر ایسا نہیں، تو ہم سے بچ کر نہیں جا سکے گا۔ حضورؐ نے یہ باتیں سنیں تو فرمایا کہ اُسے اندر آنے دو۔ آپؐ عمرؓ کو ساتھ لے کر الگ کمرے میں تشریف لے گئے اور پوچھا کہ عمر! کس ارادے سے آئے ہو۔ (حضرت) عمرؓ نے کہا کہ

یہ گواہی دینے کے لئے کہ اللہ کے سوا کوئی الٰہ نہیں اور آپؐ اس کے سچے رسولؐ ہیں۔

یہ سُن کر حضورؐ نے باآوازِ بلند کہا۔ اللّٰہ اکبر! جس سے صحابہؓ کو معلوم ہو گیا کہ عمرؓ ایمان لے آتے ہیں۔

حضرت عمرؓ کے اسلام لانے کا یہ واقعہ باختلافِ جزئیات، کم و بیش تمام روایات میں مذکور ہے۔ لیکن

یہ بات صحیح نظر نہیں آتی

ہمارے نزدیک یہ روایات صحیح نہیں۔ یہ تو ممکن ہے کہ حضرت عمرؓ نے اپنے بہنوئی اور بہن کے ساتھ بھی تشدد برتا ہو لیکن یہ بات کچھ جچتی نہیں کہ محض یہ ہنگامی واقعہ ان میں ایسی عظیم تبدیلی کا موجب بن گیا ہو کہ وہ گئے ہوں رسول اللہؐ کو (معاذ اللہ) قتل کرنے کے لئے، اور اس واقعہ کے بعد ارادہ اسلام لانے کا کر لیا ہو۔ ہم نے جو کہا ہے کہ ہمارے نزدیک یہ روایات صحیح نظر نہیں آتیں تو اس کی کچھ اور وجوہات بھی ہیں۔ (مثلاً)

(۱) یہ بات عمر جیسی شخصیت کے مزاج سے مطابقت نہیں رکھتی کہ اس نے ایک ایسے اہم معاملہ کے متعلق، جس نے اس کی سابقہ زندگی کے تمام قلبی، ذہنی اور معاشرتی رشتوں کو منقطع کر کے، اسے ایک اور ہی راستے پر ڈال دینا ہو، کبھی غور و فکر نہ کیا ہو، اور محض ایک ہنگامی واقعہ سے متاثر ہو کر، جذباتی طور پر ایسا انقلابی فیصلہ کر لیا ہو۔ عمر جیسی شخصیت ایسے معاملہ کا فیصلہ اس طرح نہیں کر سکتی تھی۔

(۲) (حضرت) عمرؓ لکھے پڑھے تھے ــــ مکہ کے سترہ لکھے پڑھے لوگوں میں سے ایک۔ وہ تجارت کے لئے دیگر ممالک میں جاتے، تو کاروبار سے فرصت کا وقت نکال کر، وہاں کے زعماءِ سیاست اور مشاہیرِ فکر و تدبر سے ملاقاتیں کرتے اور اس طرح اپنے علم میں اضافہ کرتے رہتے۔ (ہم دیکھ چکے ہیں کہ) ان کے ذوقِ تجسس کا یہ عالم تھا کہ انہوں نے تورات کو براہِ راست سمجھنے کے لئے عبرانی زبان سیکھی اور اس پر عبور حاصل کر لیا۔ ہم آئندہ چل کر دیکھیں گے کہ وہ کس طرح ایک ایک معاملہ پر مہینوں غور و فکر کے بعد کسی نتیجہ اور فیصلہ پر پہنچتے، فکر و تدبر ان کی طبیعت کا خاصہ تھا۔

(۳) یہ باور نہیں کیا جا سکتا کہ اس قسم کی طبیعت اور مزاج و روش کا انسان، ایک ایسی دعوت کے مالہٗ و ماعلیہ پر غور و فکر نہ کرتا ہو گا جو اس کی ذات ہی نہیں بلکہ اس کے ملک اور قوم، اس کے مذہب اور معاشرہ میں بنیادی انقلاب برپا کرنے کے لئے ظہور میں آئی تھی اور جو ان کی مخالفت کے علی الرغم دن بدن پھیلتی جا رہی تھی۔ وہ اس قسم کی دعوت اور تحریک سے فکری طور پر کبھی غیر متعلق نہیں رہ سکتے تھے۔ یہ دعوت چھ برس سے جاری تھی اور اس وقت تک اس میں چالیس پینتالیس افراد شریک ہو چکے تھے۔ جن میں مکہ کی بڑی بڑی نامور ہستیاں شامل تھیں۔ ہو نہیں سکتا کہ ابن خطاب نے کبھی ان معاملات کو اپنی گہری توجہ کا مستحق نہ قرار دیا ہو، اور اس دعوت کے داعی کی تعلیم نے اس دعوت کے قبول کرنے والوں کی زندگی میں جو محیرّ العقول انقلاب پیدا کر دیا تھا، وہ اسے درخورِ اعتنا نہ سمجھتے ہوں۔

(۴) نہ ہی یہ ممکن ہے کہ مکہ میں رہتے ہوئے (حضرت) عمرؓ نے کبھی قرآنی آیات نہ سنی ہوں۔ رسول اللہؐ کی یہ دعوت کوئی باطنی تحریک یا گپت ودیا نہیں تھی۔ آپؐ نے تو اس دعوت کا آغاز بھی پہاڑ کی چوٹی سے، تمام اہلِ مکہ کو بآوازِ بلند پکار کر کیا تھا اور اس کے بعد پھر اس پیغام کو دوسروں تک مسلسل پہنچاتے چلے جاتے تھے۔ کیا یہ باور کیا جا سکتا ہے کہ یہ آواز اور تو سب تک پہنچی ہو لیکن اگر نہ پہنچی ہو تو ابن خطاب کے کانوں تک نہ پہنچی ہو!

(۵) ان شواہد سے ظاہر ہے کہ (حضرت) عمرؓ اس دعوت سے اچھی طرح باخبر تھے۔ قرآن کی آواز ان تک

پہنچ چکی تھی اور وہ کامل چھ برس سے اس پر غور و فکر کرتے چلے آرہے تھے۔ ایک مفکر کی صورت میں یہ تو ممکن ہے کہ وہ ایک معاملہ پر عرصہ سے غور و فکر کرنے کے باوجود ہنوز کسی حتمی نتیجہ پر نہ پہنچا ہو' اور پھر یکایک کوئی ایسا واقعہ رُونما ہو جائے جس سے اس کی نگاہوں میں ایسی چمک پیدا ہو جائے کہ اس معاملہ کی حقیقت ابھر کر اس کے سامنے آجائے' اور وہ اس کے متعلق یقینی فیصلہ تک پہنچ جائے۔ لیکن ظاہر ہے کہ اس کا یہ فیصلہ کسی ہنگامی جذبہ کا نتیجہ نہیں ہوتا۔ یہ دراصل مجموعی تاثر (ACCUMULATIVE EFFECT) ہوتا ہے اس کے برسوں کے غور و فکر کا۔ اور کوئی ہنگامی واقعہ' بس ایک فتیلہ کا کام دیتا ہے جس سے اس کی فکر کا آتش گیر مادہ بھڑک اُٹھتا ہے۔ ایک مفکر جو فیصلے بحران (CRISIS) میں کرتا ہے وہ (بظاہر) ہنگامی ہوتے ہیں لیکن درحقیقت ہوتے ہیں اس کی مدت العمر کی سوچ کا نتیجہ۔ وہ بحران اس فیصلہ کا فوری سبب (IMMEDIATE CAUSE) بن جاتا ہے۔ یا یوں کہئے کہ اس کی فکر کا نقطۂ آخریں (CLIMAX)

(حضرت) عمرؓ کے ایمان لانے کا انقلابی فیصلہ بھی اسی قبیل کا تھا۔ اب رہا یہ کہ اس کا فوری سبب کیا تھا' اس سوال کے جواب کے لئے' ہم مندرجہ بالا روایات کے بجائے اس روایت کو کیوں نہ صحیح مانیں' جسے (حضرت) عمرؓ نے خود بیان کیا ہے اور جو ان شواہد سے مطابقت بھی رکھتی ہے جن کا ہم نے اوپر ذکر کیا ہے۔ سنیئے کہ اپنے اسلام لانے کے واقعہ کے متعلق خود (حضرت) عمرؓ کیا کہتے ہیں۔

خود حضرت عمرؓ کا بیان

ان کا بیان ہے کہ:۔

جاہلیت میں' میں شراب کا رسیا تھا۔ ہر شب' ہم' یارانِ قدح خوار کی ایک رنگین محفل جما کرتی تھی۔ ایک رات میں گیا تو وہاں کسی کو موجود نہ پایا۔ میں کئی ایک اور مقامات میں پہنچا لیکن اتفاق کہ شراب مجھے وہاں بھی نہ ملی۔ اب میں نے سوچا کہ یوں گھر لوٹنے کے بجائے' کعبہ کا طواف ہی کرتا جاؤں حریم کعبہ میں سناٹا تھا۔ دیکھا کہ ایک شخص تنہا محوِ عبادت ہے اور اونچی آواز سے کچھ پڑھ رہا ہے۔ غور کرنے پر معلوم ہوا کہ وہ محمد رسول اللہ ہیں۔ میں نے دل میں کہا کہ موقعہ اچھا ہے' دیکھوں کہ یہ شخص تنہائی میں کیا کرتا اور کیا کہتا ہے۔ دبے پاؤں آگے بڑھا۔ محتاط تھا کہ وہ مجھے دیکھ نہ لیں' اس لئے میں غلافِ کعبہ میں چھپ گیا اور سرکتا سرکتا ایسی جگہ پہنچ گیا جہاں مجھ میں اور ان میں غلافِ کعبہ کے سوا کچھ اور حائل نہ تھا۔ آپ نہایت جذب و کیف کے عالم میں کھڑے' قرآن مجید کی یہ آیات پڑھ رہے تھے کہ فَلَآ اُقْسِمُ بِمَا تُبْصِرُوْنَ ۙ وَمَا لَا تُبْصِرُوْنَ ۙ ان الفاظ میں

کچھ ایسا بلا کا اثر تھا کہ میں نے کہا کہ قریش جو کہتے ہیں کہ یہ شخص نہایت بلند پایہ شاعر ہے تو وہ ٹھیک ہی کہتے ہیں، کہ اتنے میں آپؐ نے اگلی آیت پڑھی کہ اِنَّهٗ لَقَوْلُ رَسُوْلٍ كَرِيْمٍ وَّمَا هُوَ بِقَوْلِ شَاعِرٍ ۭ قَلِيْلًا مَّا تُؤْمِنُوْنَ۔ میں نے کہا کہ یہ تو اپنے شاعر ہونے سے بھی انکار کرتا ہے۔ تو پھر، جیسا کہ قریش کہتے ہیں یہ کاہن ہوگا، کہ اتنے میں میرے کان میں یہ الفاظ پڑے کہ وَلَا بِقَوْلِ كَاهِنٍ ۭ قَلِيْلًا مَّا تَذَكَّرُوْنَ۔ قرآن کے اسلوب نے مجھے حیرت میں ڈال دیا۔ میں نے کہا کہ اگر یہ نہ کسی شاعر کا کلام ہے، نہ کاہن کا، تو پھر یہ ہے کیا؟ میرے دل کی اس بات کا جواب مجھے ان الفاظ میں ملا۔ تَنْزِيْلٌ مِّنْ رَّبِّ الْعٰلَمِيْنَ (۴۳-۳۸/۶۹)۔ آپ یہ پڑھتے جارہے تھے اور مجھ پر ایک عجیب وغریب کیفیت طاری ہوتی جا رہی تھی۔

بھیگی ہوئی رات، تاروں کی چھاؤں، حریم کعبہ اور اس میں کامل سکوت۔ اس سکون افزا ماحول میں، خود صاحبِ قرآن کی زبانِ اقدس سے قرآن کی آیات کی نشیدِ رُوح پرور! کشش ومحویت کے ان تمام عناصر کے حسین امتزاج نے وہ کیفیت پیدا کی جو ابنِ خطاب کے فکری ارتقاء کے نقطۂ عروج اور نفسیاتی تغیر کے سدرۃ المنتہیٰ تک پہنچنے کا موجب بن گئی۔ یہ وہ مقام تھا جس کے متعلق اقبالؒ نے کہا ہے کہ ؎

افلاک سے آتا ہے نالوں کا جواب آخر — کرتے ہیں خطاب آخر اٹھتے ہیں حجاب آخر
خلوت کی گھڑی گزری جلوت کی گھڑی آئی — چھٹنے کو ہے بجلی سے آغوشِ سحاب آخر

اس مقام پر عمرؓ کی شدتِ شوق وہ فتیلہ بن گئی جس نے شکوک وشبہات کے خس وخاشاک کو جلا کر راکھ کا ڈھیر بنا دیا، اور ان کے نیچے، لاشعور میں پہلو بدلنے والے قیاسات کو یقینِ محکم کی شکل میں، شعور کی سطح پر لے آنے کا موجب بن گیا۔ (عمرؓ کا بیان ہے)

رسول اللہؐ قرآن پڑھتے جارہے تھے اور میں بے اختیار روتا جارہا تھا۔ یہاں تک کہ آپؐ نے نماز ختم کرلی اور گھر جانے کے ارادہ سے روانہ ہوتے۔ میں بھی دبے پاؤں آپؐ کے پیچھے ہولیا۔ گھر کے نزدیک پہنچے تو میں قریب ہوگیا۔ آپؐ نے آہٹ پاکر مڑکر دیکھا، تو مجھے پہچان لیا اور ڈانٹ کر کہا۔

ابنِ خطاب! تم ایسے وقت میں یہاں کیسے؟

آپؐ کے سامنے اس وقت ابنِ خطاب نہیں تھا۔ تین دن پہلے آپؐ نے جو دعا مانگی تھی، اس کی قبولیت، محسوس ہیکرمیں،

سامنے تھی۔ ابنِ خطاب نے کہا کہ

یہ گواہی دینے کے لئے کہ آپؐ خدا کے سچے رسولؐ ہیں۔

اس پر حضورؐ نے خدا کا شکر ادا کیا اور میرے سینے پر ہاتھ رکھ کر میرے لئے ثبات واستقامت کی دعا مانگی۔[۱]

عمرؓ اسلام لے آیا اور اس کی اس حیاتِ نو پر:

نعرہ زد عشق کہ خونیں جگرے پیدا شُد حسن لرزید کہ صاحب نظرے پیدا شُد

آرزو بے خبر از خویش بآغوشِ حیات چشم وا کرد وجہانِ دگرے پیدا شُد

زندگی گفت کہ در خاک تپیدم ہمہ عمر

تا ازیں گنبدِ دیرینہ درے پیدا شُد

یہ ہے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے قبولِ اسلام کا وہ واقعہ جسے انھوں نے خود بیان فرمایا — وہ واقعہ جس سے مقناطیس اور فولاد کا غیر مرئی اور غیر محسوس رشتہ نگاہوں کے سامنے آجاتا اور اس حقیقت کو بے نقاب کردیتا ہے کہ مقناطیس کی طرف کھنچ کر جانے کے لئے فولاد بننا ضروری ہے۔ یا یوں کہیئے کہ مقناطیس، فولاد کو اپنے آغوش میں لیتا ہے، مٹی کے ڈھیلے کو نہیں۔ وہ پکار کر کہتا ہے کہ

بجلی ہوں نظر کوہ و بیاباں پہ ہے میری میرے لئے شایاں خس وخاشاک نہیں ہے

یہ معنی ہیں اس حقیقتِ کبریٰ کے جسے لسانِ محمدیؐ نے ان الفاظ میں بیان فرمایا تھا کہ

خیارھم فی الجاھلیۃ

خیارھم فی الاسلام

بردار تواں گفت بہ منبر نتواں گفت

(جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا ہے) یہ واقعہ بعثتِ نبویؐ کے بعد چھٹے سال کا ہے۔ اس وقت تک چالیس پینتالیس

---

[۱] ابن اسحاق و مسند امام احمد بن حنبل۔ بحوالہ ہیکل۔

کے قریب افراد اسلام لا چکے تھے لیکن ان میں بیشتر کمزور اور ناتواں تھے اس لئے امرائے قریش ان پر بڑی سختیاں کرتے تھے۔ حضرت عمرؓ کی معاشرہ میں بڑی ممتاز حیثیت تھی۔ اس لئے عام حالات میں یہ ممکن نہیں تھا کہ ان پر کوئی ہاتھ اٹھاتا لیکن یہ نوعمر تھے۔ ان کا بیان ہے کہ

میری خواہش یہ تھی کہ جو تکلیف عام مسلمانوں کو پہنچتی ہے، وہ مجھے بھی پہنچنی چاہیئے تاکہ میں محسوس کرسکوں کہ غریبوں اور کمزوروں پر بیتتی کیا ہے۔

[اور عمرؓ کی یہی وہ خصوصیت تھی، جس کی وجہ سے وہ تاریخِ انسانیت کے اس بلند مقام پر کھڑے نظر آتے ہیں۔ تفصیل اس اجمال کی آگے چل کر ملے گی۔ سرِدست، عمرؓ کے قبولِ اسلام کے بعد، ان کی مندرجہ بالا خواہش کی طرف آیئے۔]

اس مقصد کے لئے آپ نے ارادہ کیا کہ "قریش کے بڑے بڑے سرداروں کے پاس جا کر انھیں اپنے اسلام لانے کے واقعہ سے مطلع کروں اور پھر دیکھوں کہ وہ میرے ساتھ کیا کرتے ہیں؟ اس مقصد کے لئے آپ سب سے پہلے، اپنے ماموں، ابوجہل کے پاس گئے جو زعمائے قریش میں بلند پوزیشن کا حامل تھا۔ آپ نے دروازہ کھٹکھٹایا۔ وہ باہر نکلا تو آپ نے کہا کہ میں تمہیں یہ بتانے کے لئے آیا ہوں کہ میں نے اپنا آبائی مذہب چھوڑ دیا ہے۔ یہ سن کر اس نے حیرت سے پوچھا، کیا واقعی؟ آپ نے کہا، جی ہاں! واقعی۔ اس نے کہا کہ باز آجاؤ۔ آپ نے کہا کہ ہرگز نہیں۔ یہ سنکر وہ گھر کے اندر گھس گیا اور دروازہ بند کرلیا۔

حضرت عمرؓ کہتے ہیں کہ اس پر میں نے اپنے جی میں کہا کہ یہ تو کچھ بھی نہ ہوا۔ اس کے بعد، پھر ایک اور قریشی سردار کے پاس گئے تو اس نے بھی ایسا ہی کیا۔ عمرؓ مایوس سے ہوگئے۔

جب حضرت عمرؓ ایمان لاتے ہیں تو ان کے بیٹے، حضرت عبداللہ (ابن عمرؓ) سنِ تمیز کو پہنچ چکے تھے۔ ان کی زبانی روایت ہے کہ جب میرے والد سردارانِ قریش کی طرف سے اس طرح مایوس ہوگئے تو آپ نے کسی سے پوچھا کہ مکہ میں سب سے بڑا ڈھنڈورچی کون ہے۔ انھیں بتایا گیا کہ اس قسم کا آدمی جمیل بن معمر الجمحی ہے۔ جو بات اس تک پہنچ جائے، سمجھ لو سارے مکہ میں پھیل گئی۔ یہ سن کر میرے والد جمیل کے پاس گئے اور اس سے اپنے اسلام لانے کا ذکر کیا۔ اس نے سُنا تو ایک لفظ کہے بغیر سیدھا کعبہ کی طرف چل دیا۔ حضرت عمرؓ بھی اس کے پیچھے پیچھے ہولئے۔ حریم کعبہ میں اس وقت بہت سے سردارانِ قریش بیٹھے آپس میں باتیں کررہے تھے۔ جمیل نے بالفاظ بلند عمرؓ کے اسلام لانے کا اعلان کردیا۔ اس پر لوگ مجنونانہ حضرت عمرؓ پر ٹوٹ پڑے اور مارپٹائی

شروع ہو گئی۔ جب حضرت عمرؓ کے ماموں نے یہ دیکھا تو اس نے کھڑے ہو کر اعلان کیا کہ میں نے اپنے بھانجے کو پناہ دے دی ہے۔ اب جو ہمت کر سکتا ہے آگے بڑھے۔ اس پر سب پیچھے ہٹ گئے۔

ایک روایت یہ بھی ہے کہ یہ پناہ حضرت عمرؓ کو (حضرت) عمرابن العاص کے والد عاص بن وائل سہمی نے دی تھی ۔۔ لیکن یہ پناہ کسی نے بھی دی ہو، عمرؓ اس قسم کی پناہ گاہوں کے پیچھے رہنے کے لئے پیدا نہیں ہوئے تھے۔ ان کا بیان ہے کہ

> اس پناہ دہی کے بعد میں دیکھتا کہ عام مسلمانوں کو پیٹا جا رہا ہے اور میں ہر طرح سے محفوظ و مصئون ہوں، تو میں نے اپنے دل میں کہا کہ ابنِ خطاب! تمھیں یہ کب زیب دیتا ہے کہ مسلمان بیچارے اذیتیں اٹھائیں اور تم اطمینان سے بیٹھے رہو۔ چنانچہ میں اٹھا، سیدھا کعبہ پہنچا، جہاں میرا ماموں اور دیگر سردارانِ قریش بیٹھے تھے۔ وہاں جا کر میں نے اپنے ماموں سے علانیہ کہا کہ آپ کی پناہ آپ کو مبارک ہو! میں اسے واپس کرتا ہوں ۔۔ وہ بہتیرا کہتے رہے کہ ایسا نہ کرو، تکلیف اٹھاؤ گے لیکن میں تو تہیہ کر کے گھر سے نکلا تھا۔ میں نے کہا کہ میں جو فیصلہ کر چکا ہوں وہ اٹل ہے اس کے بعد لوگ مجھے مارتے اور میں لوگوں کو مارتا۔ حتےٰ کہ اسلام کو اللہ تعالےٰ نے غلبہ عطا فرما دیا۔

يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ حَسْبُكَ اللَّهُ وَمَنِ اتَّبَعَكَ مِنَ الْمُؤْمِنِينَ ۔ (۸/۶۴)

"اے نبی! خدا اور مومنین جو تیرے متبع ہیں تیرے لئے کافی ہیں"۔

نبی اکرمؐ اس وقت تک اپنی اس دعوت کے ساتھ کھلے بندوں قریش کے مقابلہ میں نہیں آتے تھے۔ عمرؓ کے اسلام لانے کے بعد حالات بدل گئے تو صحابہؓ کے مشورہ سے، جن میں حضرت عمرؓ پیش پیش تھے، یہ طے پایا کہ اب اس پرچم کو لے کر باہر نکلنا چاہیئے۔ چنانچہ حضورؐ، صحابہؓ کی دو صفوں کے جلو میں باہر تشریف لائے ۔۔ ایک صف میں حضرت حمزہؓ تھے اور دوسری میں حضرت عمرؓ۔ اس طرح مسلمان کعبہ میں داخل ہو گئے اور قریش دیکھتے کے دیکھتے رہ گئے۔ یعنی اس طرح مسلمانوں کو وہ حقوق حاصل ہو گئے جو ویسے تو ہر عرب کو حاصل تھے لیکن جن سے قریش نے انھیں اس جرم کی پاداش میں محروم کر رکھا تھا کہ وہ اللہ کو الٰہِ واحد کیوں مانتے

ہیں۔ حضرت عبداللہ ابنِ مسعودؓ کا بیان ہے کہ

عمرؓ کا اسلام ہماری کامیابی تھی۔ ان کی ہجرت ہماری نصرت اور ان کی خلافت ہمارے لئے باعثِ رحمت۔ جب تک عمرؓ اسلام نہیں لاتے تھے، ہم کعبہ میں نماز نہیں پڑھ سکتے تھے۔ جب وہ اسلام لاتے تو قریش سے لڑ بھڑ کر ان سے ہمارے اس حق کو تسلیم کرا لیا کہ ہم بھی کعبہ میں نماز پڑھ سکتے ہیں۔

حضرت صہیبؓ کا بیان ہے کہ

جب عمرؓ مسلمان ہوتے تو اسلام کھل کر سامنے آگیا اور اس کی دعوت اعلانیہ دی جانے لگی۔ ہم کعبہ کے گرد حلقے بنا کر بیٹھتے اور بیت اللہ کا طواف کرتے۔ زیادتی کرنے والے سے بدلہ لیتے اور بدزبانی کرنے والے کو دندان شکن جواب دیتے۔

اور اسی پر حضورؐ نے حضرت عمرؓ کو فاروق کے ممتاز لقب سے سرفراز فرمایا۔ یعنی وہ جس کی وجہ سے کفر اور اسلام، حق اور باطل کا فرق نکھر کر سامنے آگیا، چنانچہ آپؐ نے فرمایا کہ۔

اللہ تعالےٰ نے عمرؓ کی زبان اور ان کے دل کو حق سے سرفراز فرمایا اور وہ فاروق ہیں۔ جن کے ذریعے حق اور باطل میں تفریق کی گئی۔

ہجرت

مسلمانوں نے، مکہ سے مدینہ کی طرف ہجرت، چپکے چپکے کی تھی لیکن حضرت عمرؓ نے ہجرت بھی اسی طرح دھڑلے سے کی، جس طرح اپنے اسلام لانے کے واقعہ کو اس قدر جرأت اور بےباکی کے ساتھ عام کیا تھا۔ حضرت علیؓ کی روایت ہے کہ

میں نہیں جانتا کہ عمرؓ بن خطاب کے سوا کسی نے علانیہ مکہ سے ہجرت کی ہو۔ چنانچہ جب وہ ہجرت کے ارادے سے نکلے تو تلوار گلے میں لٹکائی، کمان کندھے پر رکھی، تیر مٹھی میں لئے، نیزہ کمر سے باندھا اور کعبہ کی طرف چل پڑے۔ کعبہ اس وقت قریش سے بھرا پڑا تھا۔ پہلے انھوں نے نہایت اطمینان سے کعبہ کے سات طواف کئے۔ پھر نماز پڑھی۔ اس کے بعد قریش کے ایک ایک گروہ کے پاس یہ کہتے ہوتے گئے کہ تمھیں روسیاہی نصیب ہو۔ اللہ تمھارے جیسوں کو مغلوب اور ذلیل کرتا

ہے. جو کوئی اپنی ماں کو ماتم گُسار، اپنے بچوں کو یتیم اور اپنی بیوی کو بیوہ بنانا چاہتا ہے وہ میرے
پیچھے آئے اور مجھ سے دو دو ہاتھ کر لے.

اگرچہ بعض روایات میں ہے کہ انھوں نے بھی، دیگر مسلمانوں کی طرح، خاموشی سے ہجرت کی تھی اور آپ کے ساتھ بیس سوار اور بھی تھے۔

(۵)

حضورؐ نبی اکرمؐ کی رفاقت میں حضرت عمرؓ نے کیا کیا کارنامے سرانجام دیئے' ان کی تفصیل کا حقیقی مقام، نبی اکرمؐ کی سیرت طیبہ ہے کیونکہ یہ کارنامے، بلاواسطہ خود حضورؐ سے متعلق تھے۔ صحابہ کرامؓ کی حیثیت حضورؐ کے رفقاء کی تھی۔ قرآنِ کریم نے ان حضرات (رضی اللہ عنہم) کا تعارف اسی حیثیت سے کرایا ہے. جب کہا ہے کہ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ وَ الَّذِيْنَ مَعَهٗۤ اَشِدَّآءُ عَلَى الْكُفَّارِ...... الخ (۴۸/۲۹) محمدؐ رسول اللہ اور حضورؐ کے رفقاء، جن کی کیفیت یہ تھی کہ.......... یعنی عہد رسالتمآبؐ میں بنیادی اور عمودی حیثیت نبی اکرمؐ کی تھی ـــــ اور ایسا ہونا بھی چاہیئے تھا اور صحابہؓ کی حیثیت حضورؐ کے رفقاء کی تھی۔ اس لئے اس دور ہمایوں میں جو معرکے سرزد ہوتے اور اسلام کو جس طرح فروغ حاصل ہوا' اس سلسلہ میں اوّلاً اور اساساً ذکر حضورؐ ہی کا آنا چاہیئے اور صحابہ کرامؓ کا تذکرہ تبعاً اور ثانیاً ـــــ لہٰذا' اس دور میں حضرت عمرؓ نے کیا کیا کارنامے سرانجام دیئے، ان کے تذکرہ کا یہ مقام نہیں۔ اس مقام پر اتنا اشارہ کافی ہوگا کہ حضورؐ کے زمانہ میں جو لڑائیاں لڑی گئیں، غیر قوموں سے جو معاہدات ہوئے' مملکت کے سلسلہ میں جو انتظامات کئے گئے' اسلام کی اشاعت کے لئے جو تدابیر اختیار کی گئیں، ان میں کوئی ایک واقعہ بھی ایسا نہیں جو حضرت عمرؓ کی شرکت کے بغیر طے پایا ہو۔ اسی بنا پر حضورؐ نے فرمایا تھا کہ "وزیرای من اهل الارض ابوبکر و عمر"[1] اہل زمین میں سے ابوبکرؓ و عمرؓ میرے وزیر ہیں. شاہ ولی اللہؒ نے (ازالۃ الخفاء) میں لکھا ہے کہ رسول اللہؐ نے فرمایا کہ "قسم اس ذات کی' جس کے قبضۂ قدرت میں میری جان ہے! اے عمرؓ! جب تمھیں شیطان کسی راستے پر چلتا دیکھ لیتا ہے تو اس راستے کو چھوڑ کر دوسرا راستہ اختیار کر لیتا ہے۔

اور آخر میں ہم' فاروقِ اعظمؓ کے حق میں، حضور نبی اکرمؐ کی وہ سند و شہادت پیش کرتے ہیں کہ جس سے بڑی انسانی سند و شہادت اس آسمان کے نیچے کوئی نہیں ہو سکتی اور وہ سند یہ ہے کہ

---

[1] اسد الغابہ فی معرفۃ الصحابہ (ابن اثیر)

ایک دفعہ حضرت عمرؓ نے حضورؐ سے عمرہ کی اجازت چاہی اور آپؐ نے اجازت دیتے ہوئے فرمایا۔

یا اخیؔ! مجھے اپنی دُعا میں یاد رکھنا۔

حضرت عمرؓ جب کبھی اس کا ذکر کرتے تو فرماتے کہ

مجھے رسولؐ اللہ کا ارشاد ـــــ یا اخیؔ! ان تمام اشیاء سے زیادہ محبوب ہے جن پر سورج طلوع ہوتا ہے۔ (بحوالہ ہیکل)

اور، اس سے زیادہ متاعِ گراں بہا، اس کائنات میں اور ہو بھی کونسی سکتی ہے؟

ہم اَوجِ طالعِ لعل و گہر کو دیکھتے ہیں۔

جذبۂ اطاعت

لیکن اس اوجِ مرتبت، اور حضورؐ کی نگاہوں میں اس قدر موانست و یگانگت کے باوجود حضرت عمرؓ کا جذبۂ اطاعتِ رسولؐ، اپنی انتہا تک پہنچا ہوا تھا ـــــ اور یہی ایک سچے مومن کا شعار اور معیارِ ایمان ہے۔ (۴/۶۵) اس باب میں وہ اس قدر محتاط رہتے تھے کہ ایک دفعہ حضورؐ نے انہیں ایک قبیلہ (تُربہ) کے خلاف جنگ کے لئے بھیجا۔ راستے میں ایک اور دشمن نظر آیا جس پر آپ بڑی آسانی سے کامیابی حاصل کرسکتے تھے لیکن آپ نے اس سے کوئی تعرض نہ کیا۔ جب اہلِ لشکر نے آپ سے اس کی وجہ دریافت کی تو آپ نے فرمایا کہ حضورؐ نے مجھے صرف تُربہ کے خلاف جنگ کا حکم دیا تھا۔ میں کسی اور دشمن کے خلاف ہاتھ کس طرح اٹھا سکتا ہوں؟

فرقِ مراتبت کا لحاظ

اور فرقِ مراتبت کا آپؓ اس قدر لحاظ رکھتے تھے کہ حضرت عبداللہ بن زمعہ روایت کرتے ہیں کہ جب مرض الموت میں رسولؐ اللہ کے درد میں شدت ہوئی، تو میں وہاں موجود تھا۔ (حضرت) بلالؓ نے حضورؐ کو صلوٰۃ کے لئے آواز دی تو آپؐ نے فرمایا کہ اس وقت کسی اور سے کہہ دو کہ امامت کرا دے۔ میں باہر نکلا تو حضرت عمرؓ وہاں موجود تھے۔ میں نے ان سے کہا کہ آپ امامت کرا دیجئے۔ چنانچہ وہ کھڑے ہوگئے اور تکبیر کہی۔ رسولؐ اللہ نے آواز سنی تو فرمایا کہ کیا ابوبکرؓ موجود نہیں ہیں۔

حضرت عبداللہ ابن زمعہؓ بیان کرتے ہیں کہ اس پر حضرت عمرؓ نے مجھ سے کہا کہ:۔

ابن زمعہؓ! تجھ پر افسوس ہے کہ تو نے میرے ساتھ یہ کیا کیا؟ خدا کی قسم، جب تو نے مجھے امامت کے لئے کہا تو میں نے یہی سمجھا کہ یہ رسولؐ اللہ کا فرمان ہے۔ اگر میرا یہ گمان نہ ہوتا تو میں کبھی امامت نہ کراتا۔ میں نے کہا کہ رسولؐ اللہ نے ایسا حکم تو نہیں دیا تھا لیکن جب میں نے حضرت ابوبکرؓ کو موجود

نہ پایا اور آپ کو دیکھا تو آپ سے ایسا کہہ دیا کیونکہ میرے نزدیک حضرت ابوبکرؓ کی عدم موجودگی میں اس منصب کے لئے آپ سے زیادہ مستحق اور کوئی نہیں تھا۔

یہ تھا اطاعتِ رسولؐ کا جذبہ اور فرقِ مراتبت کا لحاظ حضرت عمرؓ کے دل میں! یہ درحقیقت اس تربیتِ نبویؐ کا نتیجہ تھا جس نے ابن الخطاب کو فاروقِ اعظمؓ بنادیا تھا۔ ایک مغربی مفکر نے کہا ہے کہ تربیتِ ذات کے معنی یہ ہیں کہ اس فرد کے اندر جو کچھ سخت ہے وہ اسے نرمادے' اور جو کچھ نرم ہے اسے سخت کردے۔ تربیتِ نبویؐ کا یہی کمال تھا۔ اسی کو قرآنِ کریم نے يُزَكِّيهِمْ (۶۲/۲) کی جامع اصطلاح سے تعبیر کیا ہے اور عمرؓ ابن الخطاب اس کی جلتی پھرتی مثالی تصویر تھے۔

بعض غلط روایات

آگے بڑھنے سے پہلے ہم بعض ایسی روایات کی وضاحت ضروری سمجھتے ہیں جنہیں ہمارے ہاں حضرت عمرؓ کے علوِ مرتبت کے ثبوت میں بہت بڑی شہادت کے طور پر پیش کیا جاتا ہے لیکن جو ہمارے نزدیک صحیح نہیں ہیں۔ کہا یہ جاتا ہے کہ قرآنِ کریم کی بہت سی آیات حضرت عمرؓ کے خیال' مشورہ یا رائے کے مطابق نازل ہوئیں۔ ہماری کتبِ روایات و تفسیر میں ان آیات کی تفصیل دی گئی ہے۔ انہیں ہم تفسیر ابن کثیر سے نمونتہً پیش کرتے ہیں۔ واضح رہے کہ یہ تفسیر ہمارے ہاں بڑی معتبر سمجھی جاتی ہے۔

(۱) خمر (شراب) کے امتناعی احکام کے سلسلہ میں' اس تفسیر میں لکھا ہے:

> حضرت عمرؓ ابن الخطاب نے تحریم شراب کے نازل ہونے پر فرمایا۔ خدایا! ہمارے سامنے اور کھول کر بیان فرما۔ پس سورۃ بقرہ کی آیت فِيهِمَا إِثْمٌ كَبِيرٌ۔ (۲/۲۱۹) نازل ہوئی۔ حضرت فاروقؓ کو بلوایا گیا اور ان کے سامنے اس کی تلاوت کی گئی۔ پھر بھی آپ نے فرمایا۔ اے اللہ! تو ہمیں اور واضح الفاظ میں بتا۔ پس سورۃ نساء کی آیت وَأَنْتُمْ سُكَارَىٰ (۴/۴۳) نازل ہوگئی..... حضرت عمرؓ کو بلوایا گیا اور یہ آیت بھی انہیں سنوائی گئی لیکن پھر بھی آپ نے یہی فرمایا کہ اے اللہ! اس بارے میں صفائی سے بیان فرما۔ پس سورۃ مائدہ کی آیت اتری۔ فَهَلْ أَنْتُمْ مُنْتَهُونَ۔ (۵/۹۰-۹۲) سنا تو فرمانے لگے۔ انتهينا انتهينا۔ ہم رک گئے۔ ہم رک گئے۔ (ابن کثیر۔ سورۃ مائدہ)

(۲) جنگِ بدر مسلمانوں اور مخالفینِ اسلام (قریش) کے درمیان پہلی لڑائی تھی۔ اس وقت تک جنگ کے قیدیوں کے متعلق احکام نازل نہیں ہوئے تھے۔ اس سلسلہ میں تفسیر ابنِ کثیر میں کہا گیا ہے۔

مسند امام احمد میں ہے کہ بدر کے قیدیوں کے بارے میں رسول اللہ نے صحابہؓ سے مشورہ لیا۔ حضرت عمرؓ نے عرض کیا کہ ان کی گردنیں اڑا دی جائیں۔ آپؐ نے ان سے اپنا منہ پھیر لیا۔ آپؐ نے دوبارہ پوچھا تو حضرت عمرؓ نے اپنا وہی جواب دہرایا۔ آپؐ نے پھر اپنا منہ پھیر لیا۔ اب کی دفعہ حضرت ابوبکر صدیقؓ کھڑے ہوتے اور عرض کیا کہ ہماری رائے میں آپؐ ان کی خطا سے درگزر فرمایئے اور انھیں فدیہ لے کر آزاد کر دیجئے۔ اب آپؐ کے چہرے سے غم کے آثار جاتے رہے اور عفوِ عام کر دیا اور فدیہ لے کر سب کو آزاد کر دیا۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے سورۃ انفال کی آیت (۸/۶۷) نازل کی۔

(تفسیر سورۃ انفال)

سورۃ انفال کی اس آیت میں کہا گیا ہے کہ

نبی کے لئے یہ شایانِ شان ہی نہیں کہ اس کے قبضے میں قیدی ہوں تاآنکہ وہ جنگ میں پوری پوری کامیابی نہ حاصل کرلے۔ تم دنیا کا مال چاہتے ہو اور اللہ تمہارے لئے آخرت چاہتا ہے اور اللہ غالب حکمت والا ہے۔ اگر اللہ کی طرف سے پہلے حکم نہ ہو چکا ہوتا تو تم نے جو کچھ لیا ہے اس پر تمہیں سخت عذاب دیا جاتا۔

بعض روایات میں ہے کہ اس آیت کے نازل ہونے پر رسول اللہ اور حضرت ابوبکرؓ کو سخت صدمہ ہوا اور وہ عتاب خداوندی کی اس وعید پر رونے لگ گئے۔ (اس مقام پر ہم، اس آیت کے صحیح مفہوم کو سامنے نہیں لا رہے۔ موضوع زیرِ نظر کے اعتبار سے، اتنا کہنے پر ہی اکتفا کرتے ہیں کہ ان روایات کی رُو سے یہ آیت بھی حضرت عمرؓ کی رائے کے مطابق نازل ہوئی تھی۔)

(۳) عبداللہ بن اُبی بن سلول، مدینہ کا رئیس المنافقین تھا۔ جب اس کا انتقال ہوا تو اس کے بیٹے کی درخواست پر حضورؐ اس کے جنازے کی نماز پڑھانے کے لئے تیار ہو گئے۔ اس پر"

حضرت عمرؓ نے آپؐ کا دامن تھام لیا اور عرض کیا کہ کیا آپؐ اس منافق کے جنازے کی نماز پڑھائیں گے حالانکہ اللہ تعالیٰ نے آپؐ کو اس سے منع فرمایا ہے...... لیکن اس کے باوجود آپؐ نے اس کی نمازِ جنازہ پڑھائی۔ اس پر سورۃ توبہ کی یہ آیت وَلَا تُصَلِّ عَلٰٓى اَحَدٍ مِّنْهُمْ (۹/۸۴)

نازل ہوئی۔ (تفسیر مذکور۔ سورۃ توبہ)

(۴) آیاتِ حجاب کے سلسلہ میں لکھا ہے۔

بخاری شریف میں حضرت عمرؓ سے مروی ہے کہ تین باتیں میں نے کہیں جن کے مطابق رب العالمین سے احکام نازل ہوئے۔ (۱) میں نے کہا۔ یا رسول اللہ! اگر آپ مقامِ ابراہیم علیہ السلام کو مصلیٰ بنائیں، تو بہتر ہو۔ اس پر خدا تعالیٰ کا یہ حکم نازل ہوا۔ وَاتَّخِذُوْا مِنْ مَّقَامِ اِبْرٰهِيْمَ مُصَلًّى۔ (۲) پھر میں نے کہا کہ یا رسول اللہ! مجھے یہ اچھا معلوم نہیں ہوتا کہ آپ کے گھر میں ہر کہ ومہ آتے جاتے۔ آپ اپنی بیویوں کو پردے کا حکم دیں تو اچھا ہو۔ بس اللہ تعالیٰ کی طرف سے پردے کا حکم نازل ہوا۔ (۵۹۔ ۵۳/ ۳۳)۔ (۳) جب حضورؐ کی ازواجِ مطہرات غیرت کی وجہ سے کچھ کہنے سننے لگیں تو میں نے کہا، کسی غرور میں نہ رہنا، اگر حضورؐ تمہیں چھوڑ دیں، تو اللہ تعالیٰ تم سے بہتر بیویاں آپ کو دلوائے گا۔ چنانچہ اس پر یہ آیت (۳۳/۵۱) نازل ہوئی۔ (تفسیر مذکور۔ سورۃ احزاب)

اس قسم کی روایات پیش کرنے کے بعد بڑے فخر سے کہا جاتا ہے کہ حضرت عمرؓ کی بصیرت و فراست کو دیکھئے کہ خود اللہ تعالیٰ آپ کے خیال اور رائے کے مطابق احکام نازل کیا کرتا تھا! ایسا کہنے والے (بزعمِ خویش) حضرت عمرؓ کی عظمتِ شان تو ثابت کر دیتے ہیں لیکن اتنا نہیں سوچتے کہ اس سے اللہ تعالیٰ اور اس کی کتاب کے متعلق کس قسم کا تصور پیدا ہوتا ہے!!

شانِ نزول کا عقیدہ

یہ جو ہم نے کہا ہے کہ اس سے اللہ تعالیٰ اور اس کی کتاب کے متعلق کس قسم کا تصور پیدا ہوتا ہے، تو یہ چیز صرف انہی آیات تک محدود نہیں جن کی نسبت حضرت عمرؓ کی طرف کی جاتی ہے اس کا اطلاق ان تمام روایات پر ہوتا ہے جنہیں "شانِ نزول" کی روایات کہا جاتا ہے۔ "شانِ نزول" کے سلسلہ میں کہا یہ جاتا ہے کہ رسول اللہ کے سامنے فلاں تنازعہ پیش ہوا۔ اس کے متعلق اختلافِ رائے ہوا۔ کسی نے کچھ کہا کسی نے کچھ۔ اس پر خدا کی طرف سے فلاں آیت نازل ہوئی۔ اس تنازعہ، قصہ یا واقعہ کو متعلقہ آیت کی "شانِ نزول" کہا جاتا ہے، جیسا کہ حضرت عمرؓ سے متعلق آیات کے ضمن میں آپ دیکھ چکے ہیں۔ یہ "شانِ نزول" کا عقیدہ ہے جس سے خدا اور اس کی کتاب کے متعلق وہ تصور پیدا ہوتا ہے۔ جس کی طرف ہم نے اوپر اشارہ کیا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے انسانوں کی راہ نمائی کے لئے سلسلۂ رشد و ہدایت جاری فرمایا۔ خدا علیم ہے، حکیم ہے۔ وہ جانتا

ہے کہ انسانی زندگی کے تقاضوں کے حل کے لئے کس قسم کے اصول و ضوابط کی ضرورت ہے۔ وہ ان اصول و ضوابط کو مختلف زمانوں میں، مختلف انبیائے کرامؑ کی وساطت سے نازل کرتا رہا تا آنکہ اس کی مشیّت کے پروگرام کے مطابق وہ زمانہ آگیا جب ایک ایسے ضابطہ اصول و قوانین کا دیا جانا مناسب سمجھا گیا جو انسانی زندگی کے تمام تقاضوں کو ہمیشہ کے لئے پورا کر سکے۔ خدا کے اس آخری، عالمگیر، مکمل، غیر متبدّل، محفوظ ضابطۂ حیات کا نام قرآنِ کریم ہے۔ اس سے ظاہر ہے کہ جو کچھ قرآن کریم میں دیا گیا ہے وہ خدا کے ازلی اور ابدی علم پر مبنی ہے۔ یہ تمام اصول و ضوابط، شروع ہی سے اس کے علم میں تھے اور اس کی مشیّت کے پروگرام کے مطابق انہیں انسانوں تک پہنچایا جانا تھا۔ یہ ایک طے شدہ امر تھا۔ اسی طرح طے شدہ، جس طرح قوانینِ فطرت شروع سے ہی علمِ خداوندی میں موجود تھے بالبتہ ان کا ظہور تخلیقِ کائنات کے ساتھ ہوا۔

یہ ہے خدا اور اس کی کتاب کے متعلق، صحیح (قرآنی) تصوّر۔ اس کے برعکس اگر "شانِ نزول" کے نظریہ کو صحیح مانا جائے تو اس کی رُو سے صورت یہ سامنے آتی ہے کہ

(۱) فلاں واقعہ سرزد ہوا جس کے متعلق فیصلہ نہ ہو پایا کہ کیا کرنا چاہیئے۔ یا جو فیصلہ ہوا اسے خدا نے پسند نہ کیا اس پر اس نے فلاں حکم یا قانون نازل کر دیا۔ بالفاظِ دیگر، اگر وہ واقعہ رونما نہ ہوتا تو وہ حکم یا قانون نازل ہی نہ ہوتا۔ یہ محض ایک اتفاقی امر تھا کہ وہ واقعہ ظہور میں آگیا تو یہ حکم نازل ہو گیا۔

(۲) رسول اللہؐ نے تریسٹھ سال کی عمر پائی۔ اگر حضورؐ کچھ اور عرصہ تک زندہ رہتے تو ہو سکتا تھا کہ اس قسم کے اور واقعات بھی رونما ہو جاتے، جن کی وجہ سے قرآن میں کچھ اور احکام دے دیئے جاتے۔

(۳) اب بھی یہ ممکن ہے کہ ایسے واقعات ظہور میں آتے رہیں جو اگر رسول اللہؐ کی زندگی میں رونما ہوتے تو ان کے متعلق بھی خدا کی طرف سے احکام و ضوابط مل جاتے۔ حضورؐ دنیا سے تشریف لے گئے، اور نبوّت (یعنی خدا کی طرف سے نزولِ وحی) حضورؐ کے ساتھ ختم ہو گئی۔ اس لئے اب اس قسم کے واقعات کے متعلق خدا کی طرف سے راہ نمائی مل ہی نہیں سکتی۔

یہ، اور اسی قسم کے دیگر سوالات (اور اعتراضات) ہیں جو "شانِ نزول" کے نظریہ کی وجہ سے پیدا ہوتے ہیں اور جن کا کوئی اطمینان بخش جواب نہیں دیا جا سکتا۔ ظاہر ہے کہ یہ نظریہ، قرآنِ کریم کے متعلق شکوک و شبہات پیدا کرنے کے لئے، مخالفین کی طرف سے وضع کیا گیا اور اسے اس قسم کی وضعی روایات کے ذریعے عام کیا گیا ورنہ قرآنِ کریم (جو سر تا سر علمِ الٰہی پر مبنی ہے) زمان و مکان کی حدود سے ماوراء اور واقعات و حوادث کی احتیاج سے مستغنی

ہے۔ وہ ان ابدی اصول و قوانین کا مکمل مجموعہ ہے جو علم خداوندی میں ازل سے موجود تھے اور جنہیں اپنے وقت پر انسانوں تک پہنچایا جانا مقصود تھا۔ اس میں شبہ نہیں کہ قرآن کریم میں بہت سے واقعات کا ذکر آتا ہے لیکن جو احکام ان واقعات کے ضمن میں سامنے آتے ہیں، ان کی صورت یہ نہیں کہ وہ واقعہ ظہور میں آگیا تو وہ حکم نازل ہو گیا۔ اگر وہ ظہور میں نہ آتا تو وہ حکم بھی نازل نہ ہوتا۔

ان تصریحات کی روشنی میں آپ نے دیکھ لیا ہو گا کہ وہ روایات جن کے مطابق یہ کہا جاتا ہے کہ فلاں فلاں احکام حضرت عمرؓ کی رائے اور خیال کے مطابق نازل ہوئے، ناقابلِ اعتبار اور وضعی ہیں۔ حضرت عمرؓ کی فراست و بصیرت کے اور بے شمار واقعات ہمارے سامنے آئیں گے جو ان کی بلندیٔ فکر و نظر کی شہادت پیش کریں گے۔ وحی کو ان کی فراست و بصیرت کے تابع قرار دینے سے ان کا مرتبہ تو بڑھتا نہیں لیکن وحی کی عظمت مجروح اور ابدیت ختم ہو جاتی ہے۔ اس قسم کے مروّجہ اعتقادات و تصورات قرآنی روشنی میں نظرِ ثانی کے متقاضی ہیں۔

——— (٭) ———

واقعۂ قرطاس

کتبِ روایات و تاریخ میں حضرت عمرؓ کی طرف ایک اور واقعہ بھی منسوب ہے، جسے واقعۂ قرطاس کہا جاتا ہے۔ مجملاً یہ واقعہ یوں بیان کیا جاتا ہے کہ نبی اکرمؐ نے اپنی وفات سے تین دن پہلے مرض کی حالت میں فرمایا کہ قلم دوات لاؤ تاکہ میں تمہارے لئے ایسی بات لکھ دوں جس سے تم آئندہ گمراہ نہ ہو گے۔ اس پر حضرت عمرؓ نے لوگوں کو مخاطب کر کے کہا کہ حضورؐ کو اس وقت درد کی شدت ہے اور "حَسْبُنَا کِتَابُ اللّٰہ"؛ ہمارے لئے قرآن کافی ہے۔ اس لئے قلم دوات وغیرہ لانے کی ضرورت نہیں۔

اس واقعہ کو بڑی شہرت اور اہمیت حاصل ہے اور اس سے مختلف قسم کے نتائج اخذ کئے جاتے ہیں۔ ہم نے زیرِ نظر تصنیف میں "حسبنا کتاب اللہ" کے عنوان سے ایک الگ باب باندھا ہے۔ اس واقعہ کی تفصیل اور اس عظیم اعلان کی حقیقت اور اہمیت اس مقام پر سامنے لائی جائے گی یعنی چوتھے باب میں۔ وَاللّٰہُ الْمُسْتَعَان۔

——— (٭) ———

رسول اللہ کی وفات پر

ایک روایت یہ بھی ہے کہ:۔

جب حضرت عمرؓ کو رسول اللہ کی وفات کا علم ہوا تو آپ تلوار لے کر مسجد میں کھڑے ہو گئے اور لوگوں سے کہنا شروع کیا کہ جو شخص کہے گا کہ رسول اللہ فوت ہو گئے ہیں، میں اس تلوار سے اس کی گردن اڑا دوں گا۔ آپ ہرگز فوت نہیں ہوئے بلکہ اپنے ربّ کے حضور تشریف لے گئے ہیں۔ اسی طرح جیسے حضرت موسیٰ تشریف لے گئے تھے اور چالیس رات غیر حاضر رہنے کے بعد واپس اپنی قوم میں آ گئے تھے۔ رسول اللہ بھی یقیناً واپس آئیں گے اور منافقین کے ہاتھ پاؤں کاٹیں گے۔

اس کے بعد روایت کہتی ہے کہ

اس وقت حضرت ابو بکرؓ تشریف لاتے اور منبر پر چڑھ کر فرمایا کہ ایھا الناس! من کان یعبد محمداً فان محمداً قد مات۔ ومن کان یعبد اللّٰہ فان اللّٰہ حیّ لا یموت۔ (اے لوگو! جس شخص نے محمدؐ کی عبودیت اختیار کر رکھی تھی اسے معلوم ہونا چاہیئے کہ محمدؐ وفات ہو چکے ہیں لیکن جو شخص خدا کی عبودیت اختیار کئے ہوئے ہے تو خدا یقیناً زندہ ہے اور اس پر کبھی موت وارد نہیں ہوگی۔

اس کے بعد آپ نے قرآن مجید کی یہ آیت تلاوت فرمائی۔

وَمَا مُحَمَّدٌ اِلَّا رَسُوْلٌ ۚ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ ۭ اَفَا۟ئِنْ مَّاتَ اَوْ قُتِلَ انْقَلَبْتُمْ عَلٰٓى اَعْقَابِكُمْ ۭ...... (۳/۱۴۳)

محمدؐ بجز نیست کہ اللہ کے رسولؐ ہیں۔ ان سے پہلے بھی بہت سے رسول (آئے اور دنیا سے) چلے گئے۔ اس لئے اگر (کل کو) یہ بھی وفات پا جائیں یا قتل کر دیئے جائیں تو کیا تم (یہ سمجھ کر کہ دین کا نظام ان کی ذات تک محدود تھا) اپنی سابقہ روش کی طرف لوٹ جاؤ گے؟

اس کے بعد روایت میں ہے کہ:۔

جب حضرت عمرؓ کے کانوں میں یہ آواز پڑی تو ان کے ذہن پر پڑا ہوا پردہ آہستہ آہستہ ہٹنے لگا، اور بالآخر انھیں یقین ہو گیا کہ واقعی رسول اللہ فوت ہو چکے ہیں۔ اس یقین کا ان پر اتنا شدید اثر ہوا کہ

ان کی ٹانگیں لڑکھڑا گئیں اور وہ بے ہوش ہو کر زمین پر گر پڑے۔

ہم سمجھتے ہیں کہ اس روایت کی تردید کے لئے ہمیں کسی لمبی چوڑی بحث میں پڑنے کی ضرورت نہیں۔ آپ حضرت عمرؓ کی شخصیت کو سامنے لاتیے۔ وہ خود بخود بتا دے گی کہ یہ واقعہ اس سے مطابقت نہیں رکھتا۔ آپ سوچئے کہ جس شخص کا قرآن پر اس قدر عبور ہو (جیسا کہ آگے چل کر ہم تفصیل سے دیکھیں گے) کیا وہ اس بات کو بھی نہیں سمجھ سکا تھا کہ دوسرے انسانوں کی طرح محمدؐ ابن عبداللہ کی بھی ایک طبیعی زندگی تھی اور طبیعی زندگی، خدا کے طبیعی قوانین کے مطابق، ایک دن ختم ہو جاتی ہے۔ قرآنِ کریم نے حضورؐ کی حیاتِ طبیعی کے متعلق بڑی شرح وبسط سے صراحت کر دی تھی اور واضح الفاظ میں بتا دیا تھا کہ آپؐ نے بھی ایک دن دنیا سے تشریف لے جانا ہے۔ (۳۹/۳۰) کیا قرآن کی اس صراحت (اور حضرت عمرؓ کی اس قدر دقیق فراست کے بعد بھی) یہ باور کیا جا سکتا ہے کہ ان کا عقیدہ یہ ہو کہ رسول اللہؐ فوت نہیں ہو سکتے۔ یہ عقیدہ کہ آپؐ دنیا سے روپوش ہو جانے کے بعد، پھر واپس تشریف لائیں گے اور منافقین کی گردیں اڑائیں گے، عیسائیت اور مجوسیت کا "رجعت" کا عقیدہ ہے جس کی قرآن شدومد سے تردید کرتا ہے۔ حضرت عمرؓ کا اس قسم کا عقیدہ کس طرح ہو سکتا تھا!

ہم سمجھتے ہیں کہ حضورؐ کی وفات پر حضرت عمرؓ نے یہ مناسب خیال کیا ہو گا کہ آپؐ کی وفات کی خبر جلدی سے عام نہ ہونے پاتے اور اس کی خاص وجہ تھی۔ حضورؐ، ایک عظیم مملکت کے سربراہ بھی تھے، اور (باہر تو ایک طرف خود عرب کے اندر ایسے عناصر موجود تھے جو اس مملکت کے خلاف سر اٹھانے کے مواقع کی تلاش میں تھے۔ (رسول اللہؐ نے ابھی اسی صبح ایک جری لشکر حضرت اسامہؓ بن زید کی زیر سرکردگی، روم کے خلاف روانہ فرمایا تھا) حضرت عمرؓ کی سیاسی ژرف نگہی نے اس حقیقت کو بھانپ لیا تھا کہ ان حالات میں، سربراہِ مملکت کی وفات کی خبر اس وقت تک عام نہیں ہونی چاہیئے جب تک اس کے جانشین کا تقرر نہ ہو جائے۔ یعنی مملکت کو کسی وقت بھی بغیر سربراہ کے نہیں رہنا چاہیئے ـــــ یہ تھی وہ مصلحت جس کی رُو سے انہوں نے یہ اعلان فرمایا ہو گا کہ حضورؐ کی وفات کی خبر کو سرِ دست عام نہ کیا جائے۔ آپ نے اس پر غور فرمایا ہو گا کہ حضرت ابوبکرؓ نے جو اعلان کیا تھا وہ یہی تھا کہ حضورؐ کی وفات سے یہ نظام ختم نہیں ہو جائے گا۔ یہ مملکت باقی رہے گی۔ یہ نظام آگے چلے گا اور خلیفۃ الرسول اس خلا کو پُر کر دے گا، جو حضورؐ کی وفات سے واقع ہو گیا ہے۔

اور نظامِ مملکت کا یہی وہ بنیادی تقاضا تھا جس کی رُو سے اصحابہ کرامؓ نے سربراہِ مملکت کی جانشینی کا معاملہ، حضورؐ کی تجہیز و تکفین سے بھی پہلے طے کر لیا ـــــ انھیں ایسا ہی کرنا چاہیئے تھا۔ وہ دستِ رسالتؐ کے تربیت یافتہ، سیاستِ

مملکت کے اس بنیادی تقاضا سے بے خبر نہیں تھے۔

ہم سمجھتے ہیں کہ زیرِ نظر روایت کا اتنا حصہ صحیح ہو سکتا ہے کہ حضرت عمرؓ نے لوگوں کو منع کر دیا تھا کہ رسول اللہؐ کی وفات کی خبر کو بہ عجلت عام نہ کریں۔ اس سے زیادہ جو کچھ کہا گیا ہے 'وہ زیبِ داستان کے لئے افسانہ طرازوں کا اضافہ ہے' اور ہمارے خیال میں اس زمانے میں وضع کیا گیا ہوگا جب مسلمانوں میں (ایرانی اثرات کی وجہ سے) "رجعت" کا عقیدہ در آیا تھا۔

(تفصیل اس اجمال کی آخری باب میں ملے گی)

(۵)

آئیے، حضرت ابو بکر صدیقؓ کے اس اعلامیہ کے بعد جس کا ذکر اوپر آ چکا ہے، ہم آگے بڑھیں اور دیکھیں کہ اس پر عمل کس طرح سے ہوا۔

تیسرا باب

خلافت حفظِ ناموسِ الٰہی است

اس آیۂ جلیلہ کو پھر سامنے لایئے جس میں کہا گیا ہے کہ

وَمَا مُحَمَّدٌ اِلَّا رَسُوْلٌ ۚ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ ۭ اَفَا۟ئِنْ مَّاتَ اَوْ قُتِلَ انْقَلَبْتُمْ عَلٰٓى اَعْقَابِكُمْ ۭ وَمَنْ يَّنْقَلِبْ عَلٰي عَقِبَيْهِ فَلَنْ يَّضُرَّ اللّٰهَ شَـيْـــًٔـا ۭ وَسَيَجْزِي اللّٰهُ الشّٰكِرِيْنَ ۝ (٣/١٤٤)

محمدؐ بیش ازیں نیست کہ خدا کا ایک پیغامبر ہے۔ اس سے پہلے بھی اسی طرح بہت سے پیغامبر آئے اور اپنا فریضہ ادا کر کے چلے گئے۔ لہٰذا اگر یہ پیغام رساں (محمدؐ) بھی کل کو وفات پا جائے یا قتل کر دیا جائے تو کیا تم سمجھو گے کہ اس کی وفات سے یہ سارا نظام ختم ہو گیا اور اس کے بعد تم اپنی قدیم روش کی طرف پلٹ جاؤ گے؟ یاد رکھو! جو ایسا کرے گا وہ خدا کا کچھ نہیں بگاڑے گا' خود اپنا ہی نقصان کرے گا لیکن جو اسی روش پر قائم رہے گا تو اسے اس کی کوششوں کا بھرپور صلہ ملے گا۔

اس سے واضح ہے کہ جو نظام رسول اللہؐ نے قائم فرمایا تھا' وہ آپؐ کی ذات اور حیات تک محدود نہیں تھا۔ اُسے حضورؐ کے بعد بھی اسی طرح جاری و ساری رہنا تھا۔ نبوت تو آپؐ کی ذات پر ختم ہو گئی تھی لیکن نبوت کی رُو سے قائم کردہ نظام کا سلسلہ بدستور آگے چلنا تھا۔ اس نظام کو جاری رکھنے کے لئے حضورؐ کی جانشینی کو خلافت کہا جاتا ہے اور جن کے ہاتھوں اسے جاری رہنا تھا' انہیں رسول اللہؐ کے خلفاء (جانشین یعنی ———

یہیں سے دین اور مذہب کا فرق سمجھ میں آجاتا ہے۔ مذہب، خدا اور بندے کے درمیان پرائیویٹ تعلق کا نام ہوتا ہے۔

دین اور مذہب کا فرق

جس کا وجود، فردِ متعلقہ کے ذہن سے باہر کہیں نہیں ہوتا۔ یہ تعلق، پوجا پاٹ، بھگتی یا پرستش کی چند رسومات یا گیان دھیان، مراقبوں، ریاضتوں کی رو سے قائم کرلیا جاتا ہے۔ یعنی یہ کہہ کر اپنے دل کو مطمئن کرلیا جاتا ہے کہ وہ تعلق پیدا ہوگیا ہے۔ اس سے ظاہر ہے کہ یہ ایک خالصۃً انفرادی اور داخلی یا موضوعی (SUBJECTIVE) جذبہ کا نام ہے۔ جس کے لئے کسی نظام کی ضرورت نہیں ہوتی۔ اس کے برعکس، دین اس نظام کا نام ہے جو قوانینِ خداوندی کی بنیادوں پر قائم کیا جاتا ہے اور اس کا دائرہ انسانی زندگی کے ہر شعبے اور کاروبارِ حیات کے ہر گوشے کو محیط ہوتا ہے۔ اسی کو عصرِ حاضر کی اصطلاح میں 'نظامِ مملکت' کہا جاتا ہے۔ اسلام، دین ہے، مذہب نہیں۔ "مذہب" کا تو لفظ تک قرآن میں نہیں آیا ۔ خدا کے رسول، ہمیشہ دین لے کر آتے تھے لیکن ان کے بعد، ان کے نام لیوا، اس دین کو مذہب میں تبدیل کردیتے تھے اور مذہبی پیشوائیت (PRIESTHOOD) اس کی اجارہ داری سنبھال لیتی تھی۔ یہی کچھ ہوتا چلا آرہا تھا کہ خدا کا آخری رسول (محمدؐ) دینِ خداوندی لے کر آیا۔ اس دین (نظامِ مملکت) کے اصول و قوانین عالمگیر تھے، کیونکہ اسے تمام نوعِ انسان کے لئے ضابطۂ حیات قرار دیا گیا تھا۔ (۲۷/۸۱) مکمل اور غیر متبدل تھا۔ (۶/۱۱۶) اور اسے قرآنِ کریم کی دفتین میں محفوظ کردیا گیا تھا (۱۵/۹)۔ اس نظام کا بنیادی نکتہ یہ تھا کہ کسی انسان کو حق حاصل نہیں کہ وہ کسی دوسرے انسان پر حکومت کرے (۳/۷۹) حکومت کا حق صرف خدا کو حاصل ہے۔ (اِنِ الۡحُکۡمُ اِلَّا لِلّٰہِ۔ ۱۲/۴۰) لیکن خدا تو ایک ایسی بسیط حقیقت ہے جس کا محسوس شکل میں سامنے آکر حکومت کرنا تو درکنار، وہ "برتر از قیاس و خیال و گمان و وہم" ہے۔ اس لئے سوال یہ پیدا ہوا کہ خدا کی حکومت سے مراد کیا ہے؟ اس کا جواب اس نے خود ہی دے دیا کہ خدا کی حکومت سے مراد ہے اس کی کتاب (قرآنِ مجید) کے قوانین و احکام کی اطاعت۔ یہی مومن و کافر میں خطِ امتیاز ہے۔ چنانچہ اس نے واضح الفاظ میں کہہ دیا کہ

وَ مَنۡ لَّمۡ یَحۡکُمۡ بِمَاۤ اَنۡزَلَ اللّٰہُ فَاُولٰٓئِکَ ہُمُ الۡکٰفِرُوۡنَ۔ (۵/۴۴)

جو خدا کی کتاب کے مطابق حکومت قائم نہیں کرتے، انہی کو کافر کہا جاتا ہے۔

لیکن اس سے پھر یہ سوال پیدا ہوا کہ کتاب تو ایک ضابطہ کا نام ہے۔ اس کی اطاعت کسی زندہ محسوس اتھارٹی کے

نظامِ مملکت

ذریعے ہی کی جاسکتی ہے۔ وہ اتھارٹی کون سی ہوگی۔ اس کے جواب میں کہا کہ وہ اتھارٹی سب سے پہلے یہ رسول ہوگا جو اس نظام کو قائم کرے گا۔ اسی لئے اس رسول سے کہا گیا کہ

فَاحْكُمْ بَيْنَهُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ ۔ (۵/۴۸)

تو ان میں کتاب اللہ کے مطابق حکومت قائم کر۔

اور اس کے ساتھ ہی یہ بھی کہا گیا کہ وَ شَاوِرْهُمْ فِي الْاَمْرِ....... (۳/۱۵۸) امورِ مملکت میں اپنے رفقاءؓ کے ساتھ مشورہ کیا کرو اور اس کے بعد اپنے فیصلہ کو قانونِ حکومت کی حیثیت سے نافذ کیا کرو۔ اس طرح نافذ کردہ فیصلوں کی اطاعت، امتِ مسلمہ پر لازم ہوگی۔ قرآنِ کریم میں جہاں جہاں "اللہ اور رسول" کی اطاعت کا حکم دیا گیا ہے، اس سے مراد انہی فیصلوں کی اطاعت ہے۔ یعنی ان فیصلوں کی اطاعت، جو قوانینِ خداوندی کے مطابق سربراہِ مملکت، اپنے رفقاء کے مشورہ سے نافذ کرے۔ اس سے واضح ہے کہ (جیسا کہ پہلے کہا جا چکا ہے) یہ نظام رسول اللہ کی ذات اور حضورؐ کی زندگی تک محدود نہیں تھا۔ اسے اسی طرح آگے چلنا تھا، اس فرق کے ساتھ رسول اللہ کی زندگی میں اس مملکت کی سربراہی، خود رسول اللہ کے پاس تھی۔ آپؐ کی وفات کے بعد، اسے آپؐ کے جانشین (خلیفۃ الرسول) کی طرف منتقل ہو جانا تھا۔ اب "اللہ اور رسولؐ" کی اطاعت سے مراد، خلیفۃ الرسول کے فیصلوں کی اطاعت تھی اور اسی طرح اس سلسلہ کو آگے بڑھتے چلے جانا تھا۔

اس حقیقت کو پھر دہرا لینا چاہیئے کہ نہ یہ فیصلے، سربراہِ مملکت کے اپنے ذاتی فیصلے تھے۔ یہ فیصلے سربراہِ مملکت کی حیثیت سے، مندرجہ بالا اصول و ضوابط کے مطابق طے اور نافذ کردہ فیصلے تھے، اور نہ ہی یہ مملکت کسی کی ذاتی ملکیت تھی کہ وہ اپنے بعد جسے چاہے اس کا وارث اور مالک بنا دے۔ یہ مملکت پوری کی پوری امت کی ملکیت تھی کیونکہ یہ ان کے ایمان اور اعمالِ صالحہ کے نتیجہ میں حاصل ہوئی تھی۔ (۲۴/۵۵) اور اس تمکّن (اقتدار) میں وہ سب شریک تھے۔ (۲۲/۴۱)[1]

خلیفۃ الرّسول کا انتخاب

ان تصریحات سے واضح ہے کہ رسول اللہ کی وفات کے بعد، رفقائے رسول اللہ (صحابہ کبار) کا سب سے مقدم فریضہ یہ تھا کہ وہ جانشینِ رسول اللہ کا انتخاب کریں کیونکہ مملکت کا ایک لمحہ کے لئے بھی سربراہ کے بغیر رہنا خطرہ سے خالی نہیں ہوتا۔ (اس کی طرف ہم سابقہ باب میں اشارہ کر چکے ہیں) آیئے، ہم دیکھیں کہ اس نہایت اہم فریضہ کی ادائیگی کے لئے صحابہؓ نے کیا کیا لیکن

---

[1] اس مقام پر ان اہم نکات کا اختصاراً ذکر کیا گیا ہے۔ تفصیلاً نہیں، میں نے اپنی کتاب "معراجِ انسانیت" کے باب "نظامِ مملکت" میں بیان کیا ہے، اسے ایک نظر دیکھ لیا جائے۔

قبل اس کے کہ ہم اس کی تفصیل سامنے لائیں، ایک اور حقیقت کا سمجھ لینا بھی ضروری ہے۔ ہم اس کتاب کے "مقدمہ" میں بتا چکے ہیں کہ ہماری موجودہ تاریخ قطعاً قابلِ اعتماد نہیں۔ ضرورت ہے کہ عہدِ رسالتمآبؐ اور عصرِ صحابہؓ کی تاریخ، قرآنِ کریم کو معیار قرار دے کر، از سرِ نو مدون کیا جائے۔ اس مقام پر ہم نے اس کی مثالیں نہیں دی تھیں کہ ہماری تاریخ میں، اس دور کے متعلق کیا کچھ کہا گیا ہے جو اس امر کی آپ شہادت ہے کہ وہ وضعی ہے۔ آپ غور فرمائیے کہ رسول اللہؐ کی وفات کے بعد، مدینہ میں، اکابرِ صحابہؓ کا طبقہ مہاجرین اور انصار پر مشتمل تھا جن کے متعلق خود خدا کی یہ شہادت موجود ہے کہ وہ سچے اور پکے مومن تھے۔ سورۃ انفال میں ہے۔ وَالَّذِينَ آمَنُوا وَهَاجَرُوا وَجَاهَدُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ وَالَّذِينَ آوَوا وَّنَصَرُوا أُولَٰئِكَ هُمُ الْمُؤْمِنُونَ حَقًّا ۚ لَّهُم مَّغْفِرَةٌ وَرِزْقٌ كَرِيمٌ ۝ (۸/۷۴)۔ "جو لوگ ایمان لائے اور ہجرت کی اور اللہ کی راہ میں جہاد کیا، اور جن لوگوں نے انہیں پناہ دی، یہ سب مومنِ حقہ، پکے اور سچے مومن ہیں۔ ان کے لئے خدا کی طرف سے مغفرت ہے اور رزقِ کریم کی نوازش۔" اللہ ان سے راضی ہے اور یہ اپنے اللہ سے راضی۔ خدا نے ان کے لئے جنت کے وہ باغات تیار کر رکھے ہیں، جن کے نیچے نہریں جاری ہیں اور جن میں یہ ہمیشہ رہیں گے۔ یہ عظیم کامرانی اور کامیابی ہے۔ (۹/۱۰۰) ان خدائی شہادات سے واضح ہے کہ ان حضرات سے کوئی ایسی بات سرزد نہیں ہو سکتی تھی جو ایک پکے اور سچے مومن کے شایانِ شان نہ ہو۔ ان کے باہمی تعلقات کے متعلق فرمایا کہ مُحَمَّدٌ رَّسُولُ اللَّهِ ۚ وَالَّذِينَ مَعَهُ أَشِدَّاءُ عَلَى الْكُفَّارِ رُحَمَاءُ بَيْنَهُمْ ۔ (۴۸/۲۹) محمدؐ، اللہ کے رسول اور ان کے رفقاء کا یہ عالم ہے کہ وہ باہمدگر ریشم کی طرح ہیں اور مخالفین کے مقابلہ میں چٹان کی طرح سخت۔ دوسرے مقام پر اس کی وضاحت یہ کہہ کر کر دی کہ وَأَلَّفَ بَيْنَ قُلُوبِهِمْ ۔ (۸/۶۳) خدا نے ان کے دلوں میں ایک دوسرے کی الفت ڈال دی اور یہ ایسی عظیم متاعِ گراں بہا ہے کہ (اے رسولؐ!) اگر تو ساری دنیا کی دولت بھی خرچ کر ڈالتا تو اسے کہیں سے خرید نہ سکتا۔ یہ خدا کا انعام ہے جسے اس نے خاص طور پر ارزانی فرمایا ہے جس سے یہ آپس میں بھائی بھائی بن گئے۔ (۳/۱۰۲)۔

ہماری تاریخ

یہ ہیں صحابہ کبارؓ کے ایمان اور سیرت و کردار کی وہ شہادات، جو خود قرآنِ کریم میں موجود ہیں۔ اب آپ دیکھئے کہ ایسی بلند سیرت کے حاملین کے متعلق ہماری تاریخ میں کیا کہا گیا ہے۔ حدیث کی وہ کتاب جسے اصح الکتب بعد کتاب اللہ کہا جاتا ہے۔ یعنی بخاری کے باب "وفات النبی" میں حضرت عبداللہ ابن عباسؓ کی روایت سے حسبِ ذیل واقعہ بیان کیا گیا ہے:۔

اس بیماری میں جس میں آپؐ نے وفات فرمائی علی ابن ابی طالب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

کے پاس سے باہر آئے تو لوگوں نے ان سے پوچھا۔ ابو الحسن! رسول اللہ صلعم نے کس حالت میں صبح فرمائی۔ حضرت علیؓ نے جواب دیا کہ الحمد للہ اچھی حالت میں صبح فرمائی ہے تو عباسؓ بن عبد المطلب ان کا ہاتھ پکڑ کر ایک طرف کو لے گئے اور ان سے کہنے لگے۔ خدا کی قسم تین دن کے بعد تم لاٹھی کے غلام ہو گے۔ بخدا میرا یہ خیال ہے کہ رسول اللہ صلعم کا اپنی اس بیماری میں انتقال ہو جائے گا میں خوب پہچانتا ہوں کہ عبد المطلب کی اولاد کے چہرے مرتے وقت کیسے ہوتے ہیں۔ چلو رسول اللہ صلعم کے پاس چلیں اور آپؐ سے دریافت کر لیں کہ آپؐ کے بعد حکومت کن لوگوں میں ہو گی۔ اگر ہم میں ہوئی تو ہمیں معلوم ہو جائے گا اور اگر ہمارے سوا دوسروں میں ہوئی تو بھی ہمیں معلوم ہو جائے گا اور آپؐ اپنے جانشین کو ہمارے حق میں وصیت فرما دیں گے۔ (اس[1] پر حضرت علیؓ نے فرمایا کہ کیا اس امر کی طمع ہمارے سوا کسی دوسرے کو بھی ہو سکتی ہے؟ عباسؓ نے فرمایا کہ میرا خیال ہے کہ خدا کی قسم ایسا ضرور ہو گا) اس پر علیؓ نے کہا کہ خدا کی قسم اس بارہ میں اگر ہم نے رسول اللہ صلعم سے پوچھ لیا اور آپؐ نے انکار کر دیا تو آپؐ کے بعد لوگ پھر ہمیں حکومت کبھی بھی نہیں دیں گے۔ خدا کی قسم میں اس بات کو رسول اللہ صلعم سے ہرگز نہیں پوچھوں گا۔

(صحیح بخاری، باب وفات النبیؐ)

اس روایت سے ظاہر ہے کہ ابھی حضورؐ کا انتقال بھی نہیں ہوا تھا کہ حضورؐ کے چچا حضرت عباسؓ اور چچا زاد بھائی اور داماد حضرت علیؓ کے دل میں خلافت کا خیال پیدا ہو گیا تھا۔ حضرت علیؓ مطمئن تھے کہ خلافت کسی اور کے پاس نہیں جائے گی۔ لیکن حضرت عباسؓ کا اندازہ کچھ اور تھا۔ اس لئے وہ اس بارے میں نبی اکرمؐ سے (خلافتِ حضرت علیؓ کے متعلق) توثیق کرا لینا چاہتے تھے۔ اس پر حضرت علیؓ نے جو جواب دیا ہے' وہ قابلِ غور ہے۔ یعنی اگر ہم نے رسولؐ اللہ سے دریافت کر لیا اور آپؐ نے انکار کر دیا تو پھر ہمارے لئے کوئی گنجائش (CHANCE) نہیں رہے گی۔ آپ غور فرمائیے کہ اگر اس حدیث کو صحیح مان لیا جائے تو رسولؐ اللہ کے قریب ترین صحابہ (حضرت عباسؓ اور حضرت علیؓ) کے متعلق کیا تصور قائم ہوتا ہے؟ یہ تصور کہ وہ (معاذ اللہ) اسلام کے ابتدائی اور بنیادی اصول کو بھی نہیں سمجھ سکے تھے کہ خلافت بطورِ وراثت یا استحقاق نہیں ملتی، یہ معاملہ اُمت کے باہمی مشورہ سے طے ہوتا ہے۔ پھر، جو جواب حضرت علیؓ کی طرف منسوب

---

[1] بین القوسین عبارت بخاری میں نہیں مگر علامہ عینی نے مراسیل شعبی سے اس اضافہ کو نقل کیا ہے۔

کیا گیا ہے اس سے ان کی سیرت و کردار پر جو زد پڑتی ہے وہ بھی کسی تشریح کی محتاج نہیں۔

اب آگے بڑھئے۔ نبی اکرمؐ اس دنیا سے تشریف لے گئے۔ چونکہ خلافت (سربراہِ مملکت کی جانشینی) کا معاملہ اُمت کے باہمی مشورہ سے طے ہونا تھا اس لئے حضورؐ نے اس کے متعلق کوئی وصیت نہیں فرمائی تاکہ اُمت کی آزادیٔ رائے پر کسی قسم کی پابندی عائد نہ ہو جائے۔ چونکہ یہ معاملہ بہت اہم تھا۔ مرکزِ ملت کے بغیر دین کا

سقیفہ بنی ساعدہ کا اجتماع

تصوّر ہی نہیں کیا جا سکتا۔ اس لئے اُمت نے تجہیز و تکفین سے بھی پہلے اسے طے کر لینا ضروری سمجھا۔ تاریخ ہمیں بتاتی ہے کہ سقیفہ بنی ساعدہ میں انصار کا اجتماع ہوا جس میں حضرت سعد بن عبادہؓ کو خلافت کا امیدوار قرار دیا گیا۔ ایک روایت کے مطابق وہاں یہ تجویز بھی سامنے لائی گئی کہ ایک امیر انصار میں سے ہو اور ایک مہاجرین میں سے۔ اس وقت مہاجرین (حضرت ابوبکرؓ، حضرت عمرؓ اور دیگر صحابہؓ) بھی وہاں پہنچ گئے۔ اس اجتماع کی جو روداد تاریخ میں بیان ہوئی ہے وہ قابلِ غور ہے۔ کہا گیا ہے کہ (انصار میں سے) حضرت حباب بن منذرؓ نے حسبِ ذیل تقریر فرمائی۔

حضرت حبابؓ کی تقریر

"اے انصار! امارت اپنے ہاتھوں ہی میں رکھو کیونکہ لوگ تمہارے مطیع رہیں۔ کسی شخص میں یہ جرأت نہ ہوگی کہ وہ تمہارے خلاف آواز اٹھا سکے یا تمہاری رائے کے خلاف کوئی کام کر سکے۔ تم اہلِ عزت و ثروت ہو۔ تم تعداد اور تجربے کی بنا پر دوسروں سے بڑھ چڑھ کر ہو۔ تم بہادر اور دلیر ہو۔ لوگوں کی نگاہیں تمہاری طرف لگی ہوئی ہیں۔ ایسی حالت میں تم ایک دوسرے کی مخالفت کر کے اپنا معاملہ خراب نہ کرو۔ یہ لوگ تمہاری بات ماننے پر مجبور ہیں۔ زیادہ سے زیادہ رعایت جو ہم انہیں دے سکتے ہیں وہ یہ ہے کہ ایک امیر ہم میں سے ہو اور ایک ان میں سے۔" (حسنین ہیکل کی کتاب "ابوبکر صدیق اکبرؓ" ص۱)

آپ نے غور فرمایا؟ ہماری تاریخ کا یہ بیان ان انصار (رضی اللہ تعالےٰ عنہم) کے متعلق ہے جن کے مہاجرین کے ساتھ فدایانہ تعلقات اور بے لوث ایثار کی شہادت خود اللہ تعالےٰ نے دی ہے۔ (تاریخ کے بیان کے مطابق) اُن کی طرف سے ان جذبات کا اظہار اس وقت ہو رہا ہے جب نبی اکرمؐ کی نعش مبارک بھی ہنوز آنکھوں سے اوجھل نہیں ہوئی۔

یہ تو رہا انصار کے متعلق۔ اب مہاجرین کی بات سنئے۔ (تاریخ بتاتی ہے کہ) اس کے جواب میں حضرت عمرؓ نے حسبِ ذیل تقریر فرمائی۔

حضرت عمرؓ کی تقریر ایک میان میں دو تلواریں جمع نہیں ہو سکتیں۔ اللہ کی قسم! عرب تمہیں امیر بنانے پر ہرگز رضامند نہ ہوں گے۔ جب کہ رسول اللہ تم میں سے نہ تھے۔ ہاں اگر امارت ان لوگوں کے ہاتھوں میں آئے جن میں رسول اللہ مبعوث ہوئے تھے تو انہیں کوئی اعتراض نہ ہوگا۔ اگر عربوں کے کسی طبقے نے ہماری امارت اور خلافت سے انکار کیا تو اس کے خلاف ہمارے ہاتھ میں دلائلِ ظاہرہ اور براہینِ قاطعہ ہوں گے۔ رسول اللہ کی جانشینی اور امارت کے بارے میں کون شخص ہم سے جھگڑا کر سکتا ہے جب ہم آپ کے جانثار اور اہلِ عشیرہ ہیں اس معاملہ میں ہم سے جھگڑا کرنے والا وہی شخص ہو سکتا ہے جو باطل کا پیروکار، گناہوں سے آلودہ اور ہلاکت کے گڑھے میں گرنے کے لئے تیار ہو۔ (ابوبکر صدیقؓ، از ہیکل ص۱۰۸)

اس کے جواب میں حضرت حبابؓ نے انصار سے کہا۔

اے انصار! تم ہمت سے کام لو اور عمرؓ اور اس کے ساتھیوں کی بات نہ سنو۔ اگر تم نے اس وقت کمزوری دکھائی تو یہ سلطنت میں سے تمہارا حصہ غصب کرلیں گے۔ اگر یہ تمہاری مخالفت کریں تو انہیں یہاں سے جلاوطن کردو اور سلطنت پر خود قابض ہو جاؤ کیونکہ اللہ کی قسم! تمہی اس کے سب سے زیادہ حقدار ہو۔ تمہاری ہی تلواروں کی بدولت اسلام کو شان و شوکت نصیب ہوئی ہے۔ اس لئے اس کی قدر و منزلت کا موجب تمہی ہو۔ تمہی اسلام کو پناہ دینے والے اور اس کی پشت پناہ ہو اور اگر تم چاہو تو اسے اس کی شان و شوکت سے محروم بھی کر سکتے ہو۔

(ایضاً۔ ص۱۰۹-۱۰۸)

اندازِ گفتگو حضرت عمرؓ نے یہ فقرہ سُنا تو کہا۔

اگر تم نے اس قسم کی کوشش کی تو اللہ تمہیں ہلاک کر ڈالے گا۔ (ایضاً ص۱۰۹)

اس کے جواب میں حضرت حبابؓ نے کہا۔

ہمیں نہیں، اللہ تمہیں ہلاک کرے گا۔ (ایضاً ص۱۰۹)

یہ ہے ہماری تاریخ کے مطابق ان صحابہؓ کے باہمی تعلقات کا نقشہ جن کے متعلق اللہ تعالیٰ یہ سارٹیفکیٹ دیتا ہے کہ اَشِدَّآءُ عَلَى الْكُفَّارِ رُحَمَآءُ بَيْنَهُمْ۔ وہ کفار کے مقابلہ میں بڑے سخت اور آپس میں بڑے ہمدرد تھے۔ وہ جن کے متعلق خدا کا ارشاد ہے کہ وَاَلَّفَ بَيْنَ قُلُوْبِهِمْ۔ (۸/۶۳) ان کے دلوں میں خدا

نے باہمی محبت اور الفت ڈال دی۔ وہ محبت اور الفت جو دنیا بھر کی دولت دے کر بھی خریدی نہیں جا سکتی تھی۔ (۸/۶۳)
ان صحابہؓ کے باہمی تعلقات اور اخلاق کے متعلق ہماری تاریخ یہ نقشہ پیش کرتی ہے۔

حضرت عمرؓ کی جو تقریر (تاریخ کے بیان کے مطابق) اوپر درج کی گئی ہے اس میں انہوں نے اپنے (یعنی مہاجرین کے) حقِ خلافت کے متعلق یہ دلیل دی ہے کہ

> رسول اللہؐ کی جانشینی اور امارت کے بارے میں ہم سے کون جھگڑ سکتا ہے جب ہم آپ کے جاں نثار اور اہلِ عشیرہ (اہلِ خاندان) ہیں۔

یہ دلیل قابلِ غور ہے۔ اس سے پیشتر ہم دیکھ چکے ہیں کہ تاریخ ہمیں حضرت عباسؓ اور حضرت علیؓ کے متعلق یہ باور کرانا چاہتی ہے کہ ان کے نزدیک خلافت حضورؐ کے قرابت داروں کو ورثہ میں ملنی چاہیئے تھی۔ اب حضرت عمرؓ کے متعلق یہ بتایا جاتا ہے کہ انہوں نے بھی استحقاقِ خلافت کے لئے یہی دلیل دی کہ ہم رسولؐ کے اہلِ خاندان ہیں۔ غور کیجئے کہ اس سے ہماری تاریخ ہمیں کہاں لے جانا چاہتی ہے؟

لیکن تاریخ یہیں تک نہیں رہتی۔ وہ ایک قدم آگے بڑھتی ہے اور بتاتی ہے کہ جب معاملہ زیادہ نزاکت اختیار کر گیا تو حضرت ابوبکرؓ اٹھے اور آپ نے فرمایا کہ اس باب میں انصار کا دعوٰے یکسر بے بنیاد ہے۔ رسول اللہؐ نے فیصلہ کر دیا

الائمۃ من القریش

ہوا ہے کہ الائمۃ من القریش خلافت قریش میں رہے گی۔ اس پر انصار خاموش ہو گئے اور حضرت ابوبکرؓ خلیفہ منتخب کر لئے گئے۔

یہ حدیث متفقہ طور پر صحیح مانی جاتی ہے لیکن آپ ذرا اس کی گہرائی میں جایئے اور سوچئے کہ یہ کبھی رسول اللہؐ کا ارشاد ہو سکتا ہے؟ قرآنِ کریم نسل اور خون کے امتیازات مٹا کر مساواتِ انسانیہ اور تکریمِ آدمیت کی تعلیم دیتا رہا۔ حضورؐ کی ساری زندگی اس بلند و برتر تعلیم کا عملی نمونہ رہی۔ کیا آپ اس امر کا تصور بھی کر سکتے ہیں کہ اس تعلیم کا حامل رسولؐ یہ فیصلہ کرے گا کہ حکومت میرے قبیلہ کے اندر رہے گی۔ یہ ایک روایت قرآن کی بنیادی تعلیم اور نبی اکرمؐ کے اسوۂ حسنہ کو مجروح کر دینے کے لئے کافی ہے لیکن ہماری تاریخ اس روایت کو رسول اللہؐ کی طرف منسوب کرتی ہے اور یہ کہتی ہے کہ حضرت ابوبکرؓ نے انصار اور مہاجرین کے بھرے مجمع میں اسے حقِ خلافت کے لئے بطورِ دلیل پیش کیا اور اسے سب نے تسلیم کر لیا۔ یعنی ہماری تاریخ ایک ہی واقعہ سے، خدا کے رسولؐ اور رسولؐ کے صحابہؓ کبار کے متعلق نسل پرستی کا ایسا تصور پیدا کر جاتی ہے جسے مٹانے کے لئے قرآن آیا تھا۔

———— (۰) ————

رسول اللہؐ کی وفات کے فوری بعد، صحابہ کبارؓ (انصار و مہاجرین) کا جو پہلا اجتماع ہوا، اس میں (ہماری تاریخ کے مطابق) ان حضرات کے باہمی تعلقات، اندازِ گفتگو اور اسلوبِ دلائل کا نقشہ ہمارے سامنے آگیا۔ اب اس سے آگے بڑھتے ہمارے ہاں سب سے پہلی، مبسوط اور مستند تاریخ امام ابن جریر طبری کی سمجھی جاتی ہے۔ (جن کا انتقال چوتھی صدی ہجری میں ہوا) اور سب سے پہلی مبسوط تفسیر بھی انہی کی ہے[1] اس اجتماعِ صحابہؓ کے متعلق طبری کی تاریخ میں لکھا ہے۔

دست و گریباں

سابقہ روایت کے سلسلہ سے عبداللہ بن عبدالرحمٰن سے مروی ہے کہ اب ہر طرف سے لوگ آ آ کر ابوبکرؓ کی بیعت کرنے لگے۔ قریب تھا کہ وہ سعدؓ[2] کو روند ڈالتے، اس پر سعدؓ کے کسی آدمی نے کہا کہ سعدؓ کو بچاؤ۔ ان کو نہ روندو عمرؓ نے کہا۔ اللہ اسے ہلاک کرے۔ اس کو قتل کردو اور خود ان کے سرہانے آکر کھڑے ہوگئے اور کہا کہ میں چاہتا ہوں کہ تم کو روند کر ہلاک کردوں۔ سعدؓ نے عمرؓ کی داڑھی پکڑلی۔ عمرؓ نے کہا۔ چھوڑدو۔ اگر اس کا ایک بال بھی بیکا ہوا تو تمہارے منہ میں ایک دانت نہ رہے گا۔ ابوبکرؓ نے کہا۔ عمرؓ! خاموش رہو۔ اس موقع پر نرمی برتنا زیادہ سودمند ہے۔ عمرؓ نے سعدؓ کا پیچھا چھوڑدیا۔ سعدؓ نے کہا۔ اگر مجھ میں اٹھنے کی بھی طاقت ہوتی تو میں تمام مدینے کی گلی کوچوں کو اپنے حامیوں سے بھر دیتا کہ تمہارے اور تمہارے ساتھیوں کے ہوش و حواس جاتے رہتے اور بخدا اس وقت میں تم کو ایسی قوم کے حوالے کردیتا جو میری بات نہ مانتے بلکہ میں ان کا اتباع کرتا۔ اچھا اب مجھے یہاں سے اٹھالے چلو۔ ان کے آدمیوں نے ان کو اٹھاکر ان کے گھر میں پہنچادیا۔ چند روز ان سے تعارض نہیں کیا گیا۔ اس کے بعد ان سے کہلا بھیجا کہ چونکہ تمام لوگوں نے اور خود تمہاری قوم نے بھی بیعت کرلی ہے، تم بھی آکر بیعت کرلو۔ سعدؓ نے کہا۔ یہ نہیں ہوسکتا تاوقتیکہ میں تمہارے مقابلہ میں اپنا ترکش خالی نہ کردوں، اپنے نیزے کو تمہارے خون سے رنگین نہ کرلوں اور اپنی تلوار سے جس پر میرا بس چلے وار نہ کرلوں اور اپنے خاندان اور قوم کے ان افراد کے ساتھ جو میرا ساتھ دیں تم سے لڑنہ لوں، ہرگز بیعت نہ کروں گا۔ خدا کی قسم! اگر انسانوں کے ساتھ جن بھی تمہارے ساتھ ہوجائیں، تب بھی جب تک کہ میں اپنے معاملے کو اپنے ربّ کے

---

[1] امام طبری اور ان کی تاریخ اور تفسیر کے متعلق تفصیلی گفتگو اس کتاب کے آخری باب میں کی جائے گی۔

[2] انصار کی طرف سے امیدوارِ خلافت۔

سامنے پیش نہ کر لوں، بیعت نہیں کروں گا۔

(تاریخ طبری، جلد اوّل، حصہ چہارم، اُردو ترجمہ، شائع کردہ:۔ جامع عثمانیہ[1])

معاذ اللہ اس سے ایک صفحہ آگے ہے۔

ضحاک بن خلیفہ سے مروی ہے کہ امارت کے انتخاب کے موقع پر حباب بن المنذر نے کھڑے ہو کر تلوار نکال لی اور کہا کہ میں ابھی اس کا تصفیہ کر دیتا ہوں۔ میں شیر ہوں اور شیر کی کھوہ میں ہوں اور شیر کا بیٹا ہوں۔ عمرؓ نے اس پر حملہ کیا اس کے ہاتھ پر وار کیا۔ تلوار گر پڑی۔ عمرؓ نے اُسے اٹھا لیا اور پھر سعدؓ پر جھپٹے اور لوگ بھی سعدؓ پر جھپٹے۔ اب سب نے باری باری آکر بیعت کی۔ سعدؓ نے بھی بیعت کی۔ اس وقت عہدِ جاہلیت کا سا منظر پیش آیا اور تُو تُو مَیں مَیں ہونے لگی۔ ابوبکرؓ اس سے دُور رہے۔ جس وقت سعدؓ پر لوگ چڑھ گئے، کسی نے کہا کہ تم لوگوں نے سعدؓ کو مار ڈالا۔ عمرؓ نے کہا، اللہ اسے ہلاک کر دے، یہ منافق ہے۔ عمرؓ کی تلوار کے سامنے ایک پتھر آ گیا اور ان کی ضرب سے وہ قطع ہو گیا۔

کلیجے پر ہاتھ رکھئے اور اس فقرہ کو پھر پڑھیئے:۔

اس وقت عہدِ جاہلیت کا سا منظر پیش آیا اور تُو تُو مَیں مَیں ہونے لگی۔

بہر حال، حضرت ابوبکرؓ خلیفہ منتخب ہو گئے۔ اس کے بعد دوسرے امیدوار، حضرت سعدؓ کا طرزِ عمل کیا رہا؟ سنیئے۔

اس کے بعد سعدؓ نہ ابوبکرؓ کی امامت میں نماز پڑھتے اور نہ ان کے پیچھے جماعت میں شریک ہوتے تھے۔ حج میں بھی مناسکِ حج ان کے ساتھ ادا نہیں کرتے تھے۔ ابوبکرؓ کے انتقال تک ان کی یہی روش رہی۔

(طبری صفحہ ۱)

ڈاڑھیاں نوچنا ہم اوپر دیکھ چکے ہیں کہ سقیفہ کے تنازعہ میں، حضرت سعدؓ نے حضرت عمرؓ کی ڈاڑھی پکڑ لی تھی تاریخ ہمیں بتاتی ہے کہ ایک دوسرے کی ڈاڑھیاں نوچنا (معاذ اللہ) ان حضرات کا معمول سا ہو گیا تھا۔ چنانچہ اس میں لکھا ہے کہ جب حضرت اسامہؓ کی امارتِ عساکر کے مسئلہ میں حضرت عمرؓ اور حضرت

---

[1] ہم احادیث اور تاریخ کے اقتباسات کا ترجمہ بھی اپنی طرف سے نہیں کرنا چاہتے بلکہ شائع شدہ ترجموں کو پیش کرتے ہیں تاکہ ان میں کسی اشتباہ کا احتمال نہ ہو۔

ابوبکرؓ میں اختلافِ رائے ہوا تو

ابوبکرؓ جو بیٹھے ہوئے تھے، غصے سے اچھل پڑے اور بڑھ کر انھوں نے عمرؓ کی داڑھی پکڑ لی اور کہا اے ابن الخطاب! اللہ تیری ماں کا برا کرے کہ تم مرجاتے۔ بھلا جس شخص کو رسولؐ اللہ نے اس پر فائز کیا ہے، تم مجھ سے کہتے ہو کہ میں اسے علیحدہ کردوں۔ (ایضاً ص۱۲)

یہ جملہ معترضہ تھا۔ اب پھر انتخاب خلیفہ اوّل کی تاریخی داستان کی طرف آیئے۔ اس تمام واقعہ میں حضرت علیؓ کا ابھی تک کہیں ذکر نہیں آیا۔ آپ یقیناً یہ معلوم کرنے کے لئے مشوّش ہوں گے کہ جن بزرگوار (یعنی حضرت علیؓ) کے دل میں

حضرت علیؓ کا ردِّ عمل

سب سے پہلے خلافت کا خیال پیدا ہوا تھا، حضرت ابوبکرؓ کے انتخاب پر ان کی طرف سے کیا ردِّ عمل ہوا۔ تاریخ اس کے متعلق تفصیل سے بتاتی ہے۔ غور سے سنیئے:۔

مہاجرین اور انصار کے چند افراد حضرت ابوبکرؓ کی بیعت میں شامل نہ تھے بلکہ ان کا میلان حضرت علیؓ ابن ابی طالب کی طرف تھا۔ ان میں سے مشہور لوگ یہ تھے، عباسؓ بن عبدالمطلب، فضل بن عباسؓ، زبیرؓ بن عوام بن العاص، خالد بن سعیدؓ، مقدادؓ بن عمرو، سلمانؓ فارسی، ابوذرؓ غفاری، عمار بن یاسرؓ، براءؓ بن عازب، ابی بن کعبؓ ــــ ابوبکرؓ نے عمرؓ، ابوعبیدہ بن جراحؓ، مغیرہؓ بن شعبہ سے ان لوگوں کے بارے میں مشورہ کیا تو انہوں نے جواب دیا کہ آپ عباسؓ بن عبدالمطلب سے ملئے اور خلافت میں ان کا حصہ بھی رکھ دیجئے جو ان کی اولاد کی طرف منتقل ہوجائے۔ اس طرح ان کے اور ان کے بھتیجے علیؓ ابن ابی طالب کے درمیان اختلاف واقعہ ہوجائے گا اور یہ بات آپ کو علیؓ کے مقابلہ میں فائدہ مند ثابت ہوگی۔

اس مشورہ کے مطابق ابوبکرؓ عباسؓ سے ملے تو دونوں کے درمیان طویل گفتگو ہوئی۔ حضرت ابوبکرؓ نے کہا۔ "آپ رسولؐ اللہ کے چچا ہیں۔ ہم چاہتے ہیں کہ خلافت میں آپ کا حصہ بھی موجود ہو، جو آپ کے بعد آپ کی اولاد میں منتقل ہوتا رہے۔" لیکن عباسؓ نے یہ پیشکش ردّ کردی کہ اگر خلافت ہمارا حق ہے تو ہم ادھوری خلافت لینے پر رضامند نہیں ہوسکتے۔ (ابوبکر۔ از ہیکل ص۱۱۹)

اس کے بعد لکھا ہے۔

ایک اور روایت میں جس کا یعقوبی اور بعض دیگر مؤرخین نے بھی ذکر کیا ہے، مذکور ہے کہ مہاجرین اور انصار کی ایک جماعت حضرت علیؓ کی بیعت کرنے کے ارادے سے حضرت فاطمۃؓ الزہرا بنت رسولؐ اللہ کے گھر

میں جمع ہوئی۔ ان میں خالد بن سعیدؓ بھی تھے۔ خالدؓ نے حضرت علیؓ سے کہا۔
"اللہ کی قسم! رسول اللہ کی جانشینی کے لئے آپ سے بہتر اور کوئی آدمی نہیں، اس لئے آپ ہماری بیعت قبول کر لیجئے۔

جب حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ کو اس اجتماع کی خبر ملی تو وہ چند لوگوں کو لے کر حضرت فاطمہؓ کے گھر پہنچے اور اس پر حملہ کر دیا۔ حضرت علیؓ تلوار ہاتھ میں لے کر گھر سے باہر نکلے۔ سب سے پہلے ان کی مڈبھیڑ حضرت عمرؓ سے ہوئی۔ حضرت عمرؓ نے ان کی تلوار توڑ ڈالی اور وہ دوسرے لوگوں کے ہمراہ گھر میں داخل ہو گئے۔ اس پر حضرت فاطمہؓ گھر سے باہر آئیں اور کہا۔
"یا تو تم میرے گھر سے نکل جاؤ ورنہ اللہ کی قسم، میں اپنے سر کے بال نوچ لوں گی اور تمہارے خلاف اللہ سے مدد طلب کروں گی۔"
حضرت فاطمہؓ کی زبان سے یہ الفاظ سن کر سب لوگ گھر سے باہر نکل گئے۔
کچھ روز تک تو مذکورہ بالا اصحاب بیعت سے انکار کرتے رہے لیکن آہستہ آہستہ یکے بعد دیگرے سب نے بیعت کر لی، سوا حضرت علیؓ کے جنھوں نے چھ سات مہینے تک بیعت نہ کی مگر حضرت فاطمہؓ کی وفات کے بعد انہوں نے بھی بیعت کر لی۔

ایک روایت میں ہے کہ حضرت علیؓ نے چالیس روز بعد بیعت کر لی تھی۔ ایک اور روایت میں یہ بھی مذکور ہے کہ حضرت عمرؓ نے ارادہ کر لیا تھا کہ اگر بنو ہاشم حضرت فاطمہؓ کے گھر میں خفیہ مجالس منعقد کرنے سے باز نہ آئے تو وہ ایندھن جمع کر کے گھر کو آگ لگا دیں گے۔　(ایضاً صفحہ ۱۲)

اس وقت تک جو کچھ سامنے آیا ہے اس میں یہ نہیں بتایا گیا کہ حضرت علیؓ نے اپنے مؤقف کی تائید میں دلیل کیا پیش کی تھی۔ اب وہ دلیل سنئے:۔

حضرت علیؓ کی دلیل

حضرت علیؓ اور دیگر بنی ہاشم کے بیعت نہ کرنے سے متعلق مشہور ترین روایت وہ ہے جو ابن قتیبہ نے اپنی کتاب "الامامۃ والسیاسۃ" میں درج کی ہے۔ وہ یہ کہ حضرت ابوبکرؓ کی بیعت کے بعد حضرت عمرؓ چند لوگوں کو ساتھ لے کر بنی ہاشم کے پاس گئے جو اس وقت حضرت علیؓ کے گھر جمع تھے تاکہ ان سے بھی بیعت کا مطالبہ کریں لیکن سب لوگوں نے حضرت عمرؓ کا مطالبہ ماننے سے انکار کر دیا۔ زبیرؓ بن عوام تو تلوار ہاتھ میں لے کر حضرت عمرؓ

کے مقابلہ کے لئے باہر نکل آئے۔ یہ دیکھ کر حضرت عمرؓ نے اپنے ساتھیوں سے کہا۔
"زبیر کو پکڑ لو"

لوگوں نے زبیرؓ کو پکڑ کر تلوار ان کے ہاتھ سے چھین لی۔ اس پر مجبوراً زبیرؓ نے جا کر حضرت ابوبکرؓ کی بیعت کر لی۔ حضرت علیؓ سے بھی بیعت کرنے کا مطالبہ کیا گیا لیکن انھوں نے انکار کر دیا اور کہا۔ میں تمھاری بیعت نہیں کروں گا کیونکہ میں تم سے زیادہ خلافت کا حقدار ہوں اور تمہیں میری بیعت کرنی چاہیئے تھی۔ تم نے یہ کہہ کر انصار کی بیعت کرنے سے انکار کر دیا تھا کہ ہم رسولؐ اللہ کے قریبی عزیز ہیں اور آپ کے قریبی عزیز ہی خلافت کے حقدار ہیں۔ اس اصول کے مطابق تمہیں چاہیئے تھا کہ خلافت ہمارے حوالے کرتے مگر تم نے اہلِ بیعت سے چھین کر خلافت غصب کر لی۔ کیا تم نے انصار کے سامنے یہ دلیل پیش نہ کی تھی کہ ہم خلافت کے زیادہ حقدار ہیں کیونکہ رسولؐ اللہ ہم میں سے تھے۔ اس لئے تم ہماری اطاعت قبول کرو اور خلافت ہمارے حوالے کر دو؟ وہی دلیل جو تم نے انصار کے مقابلے میں پیش کی تھی۔ اب میں تمھارے مقابلے میں پیش کرتا ہوں۔ ہم تم سے زیادہ رسولؐ اللہ کے قریبی عزیز ہیں۔ اس لئے خلافت ہمارا حق ہے۔ اگر تم میں ذرہ برابر ایمان ہے تو ہم سے انصاف کر کے خلافت ہمارے حوالے کر دو لیکن اگر تمہیں ظالم بننا پسند ہے تو جو تمہارا جی چاہے کرو، تمہیں اختیار ہے۔ (ایضاً ص ۱۲۲)

آپ نے غور فرمایا کہ تاریخ نے جو دلیل حضرت عمرؓ اور حضرت ابوبکرؓ کی طرف منسوب کی تھی (کہ خلافت قریش میں رہے گی اور ہم رسولؐ اللہ کے اہل خاندان ہیں) اسے تاریخ نے کس سادگی سے حضرت علیؓ کی طرف لوٹایا ہے۔ بہرحال حضرت علیؓ کے اس جواب پر حضرت عمرؓ نے کہا۔

میں اس وقت تک آپ کو نہ چھوڑوں گا جب تک آپ بیعت نہ کریں گے۔ (ایضاً ص ۱۲۲)

سرگرمیاں

اس کے بعد۔ حضرت علیؓ اس وقت تیزی میں آ گئے اور کہنے لگے۔ "عمرؓ تم شوق سے دودھ دوہو جس میں تمہارا بھی حصہ ہے۔ آج تم اس لئے خلافتِ ابوبکرؓ کی حمایت کر رہے ہو کہ کل کو خلافت تمھارے پاس لوٹ آئے گی لیکن میں کبھی ان کی بیعت نہ کروں گا۔

حضرت ابوبکرؓ کو ڈر پیدا ہوا کہ کہیں بات بڑھ نہ جائے اور درشت کلامی تک نوبت نہ آ جائے۔ انہوں نے کہا۔ "علیؓ! اگر تم بیعت نہیں کرتے تو میں بھی تمہیں مجبور نہیں کرتا۔"

اس پر ابو عبیدہؓ بن جراح حضرت علیؓ کی طرف متوجہ ہوئے اور نہایت نرمی سے کہا۔ "بھتیجے! تم ابھی کم عمر ہو اور یہ لوگ بزرگ ہیں۔ نہ تمہیں ان جیسا تجربہ حاصل ہے اور نہ تم ان کی طرح جہاں دیدہ ہو۔ اگر قوم میں کوئی شخص رسولؐ اللہ کی جانشینی کے فرائض صحیح طور پر بجا لا سکتا اور خلافت کا بوجھ کماحقہٗ اٹھا سکتا ہے تو وہ صرف ابوبکرؓ ہیں اس لئے تم ان کی خلافت قبول کر لو۔ اگر تم نے لمبی عمر پائی تو یقیناً اپنے علم و فضل، دینی رتبے، فہم و ذکا، سابقیتِ اسلام، حسب و نسب اور رسولؐ اللہ کی دامادی کا شرف حاصل ہونے کے باعث تمہیں خلافت کے مستحق ٹھہرو گے۔"

یہ سنکر حضرت علیؓ کے جوش کی انتہا نہ رہی اور وہ غصے سے بولے۔ "اللہ اللہ اے گروہِ مہاجرین! تم رسولؐ اللہ کی حکومت کو آپ کے گھر سے نکال کر اپنے گھروں میں داخل نہ کرو۔ آپ کے اہلِ بیت کو ان کے صحیح مقام پر سرفراز کرو اور ان کا حق انہیں دو۔ اے مہاجرین! اللہ کی قسم! ہمیں خلافت اور حکومت کے مستحق ہیں کیونکہ ہم اہلِ بیت ہیں۔ ہم اس وقت تک اس کے حقدار ہیں جب تک ہم میں اللہ کی کتاب کا قاری، دین کا فقیہہ، رسولؐ اللہ کی سنّت کا عالم، رعایا کی ضرورت سے واقف، ان کی تکالیف کو دُور کرنے والا اور ان سے مساوات کا سلوک کرنے والا قائم ہے اور اللہ جانتا ہے کہ ہم میں ان صفات کا حامل موجود ہے۔ اس لئے اپنی خواہشات کی پیروی کر کے اللہ کے راستے سے گمراہی اختیار نہ کرو اور حق کے راستے سے دور نہ چلے جاؤ۔" راویوں کے بیان کے مطابق بشیر بن سعدؓ بھی اس موقع پر موجود تھے۔ جب انہوں نے حضرت علیؓ کی باتیں سنیں تو کہا۔ "اے علیؓ! اگر یہ باتیں جو اس وقت تم نے کی ہیں، انصار کا گروہ ابوبکرؓ کی بیعت سے پہلے سن لیتا تو وہ لوگ تمہارے سوا کسی کی بیعت نہ کرتے۔"

اس گفتگو کے بعد حضرت علیؓ طیش میں بھرے ہوئے گھر چلے گئے۔ جب رات ہوئی تو وہ حضرت فاطمہؓ کو لے کر باہر آئے اور انہیں ایک خچر پر بٹھا کر انصار کے پاس لے گئے۔ حضرت فاطمہؓ گھر گھر جاتیں اور ان سے حضرت علیؓ کی مدد کرنے کی درخواست کرتیں لیکن ہر جگہ سے انہیں یہی جواب ملتا۔

"اے بنتِ رسولؐ اللہ! ہم ابوبکرؓ کی بیعت کر چکے ہیں۔ اگر آپ کے خاوند بیعت سے قبل ہمارے پاس آتے تو ہم ضرور ان کی بیعت کر لیتے۔"

یہ سنکر حضرت علیؓ غصہ میں آکر جواب دیتے۔ "کیا میں رسولؐ اللہ کی نعش کو بلا تجہیز و تکفین چھوڑ دیتا

اور باہر نکل کر آپ کی جانشینی کے متعلق لڑتا جھگڑتا پھرتا؟

حضرت فاطمہؓ بھی کہتیں۔ "ابوالحسن (علیؓ) نے وہی کیا جو ان کے مناسب تھا۔ باقی ان لوگوں نے جو کچھ کیا اللہ ان سے ضرور اس کا حساب لے گا اور باز پرس کرے گا۔" (ایضاً صفحہ ۲۵۔۱۲۲)

ہیکل نے ان واقعات کو مختلف حوالوں سے نقل کیا ہے۔ اس باب میں بخاری میں حسبِ ذیل روایت آئی ہے۔

بخاری کی حدیث

"حضرت فاطمہؓ نبی صلعم کے بعد چھ ماہ تک زندہ رہیں۔ جب ان کا انتقال ہوا تو ان کے شوہر علیؓ نے رات کو ان کو دفن کر دیا اور ان کے انتقال کی اطلاع ابوبکرؓ کو نہیں دی بلکہ خود ہی نماز پڑھ لی اور جب تک حضرت فاطمہؓ زندہ رہیں لوگوں کی نگاہوں میں حضرت علیؓ کا ایک خاص وقار رہا لیکن جب حضرت فاطمہؓ کا انتقال ہو گیا تو حضرت علیؓ نے محسوس کیا کہ لوگوں کے چہرے اب بدل گئے ہیں تو اب انہوں نے حضرت ابوبکرؓ سے صلح کر لینے اور بیعت کر لینے کی خواہش کی۔ ان چھ ماہ تک انہوں نے بیعت[1] نہیں کی تھی۔ چنانچہ انھوں نے ابوبکرؓ کے پاس پیغام بھیجا کہ آپ ہمارے پاس تشریف لائیے مگر آپ کے ساتھ کوئی دوسرا شخص نہ آئے۔ حضرت علیؓ کو یہ بات گوارا نہیں تھی کہ وہ حضرت عمرؓ کو ساتھ لائیں۔ اس پر حضرت عمرؓ نے کہا۔ نہیں، خدا کی قسم آپ ان کے ہاں تنہا نہیں جا سکیں گے، اس پر حضرت صدیقؓ نے کہا، تم کیا سمجھتے ہو، وہ میرا کیا کر لیں گے۔ خدا کی قسم! میں ان کے پاس ضرور جاؤں گا۔ چنانچہ صدیق اکبرؓ تشریف لے گئے[2] تو حضرت علیؓ نے خطبہ پڑھا اور فرمایا۔ "ہم آپ کی فضیلت کو اور جو کچھ خدا نے آپ کو عطا کیا ہے، اسے پہچانتے ہیں اور کسی بھلائی پر جو حق تعالیٰ نے آپ کو عطا فرمائی، ہم حسد نہیں کرتے لیکن تم نے امرِ خلافت میں ہمارے خلاف استبداد سے کام لیا ہے ہم سمجھتے تھے کہ رسول اللہ صلعم سے ہماری قرابت کی وجہ سے اس میں ہمارا حصہ[3] ہے

---

[1] بعینہ اسی سند کے ساتھ ابن جریر طبری نے بھی اس روایت کو نقل کیا ہے۔ انہوں نے اس کے ساتھ اتنا اضافہ کیا ہے۔ "معمر کہتے ہیں کہ کسی نے ابن شہاب زہری سے پوچھا کہ کیا حضرت علیؓ نے چھ ماہ تک ابوبکرؓ کی بیعت نہیں کی تو زہری نے جواب دیا کہ نہیں۔ نہ حضرت علیؓ نے بیعت کی اور نہ بنو ہاشم میں سے کسی اور نے بیعت کی۔ حتیٰ کہ چھ ماہ بعد حضرت علیؓ نے بیعت کر لی تو بنو ہاشم نے بھی بیعت کر لی۔"

[2] ابن جریر طبری کی روایت کے مطابق حضرت علیؓ نے اس موقع پر تمام بنو ہاشم کو اپنے ہاں جمع کر لیا تھا۔ (ایضاً)

[3] ابن جریر طبری نے یہاں یہ الفاظ نقل کئے ہیں۔ ولکنا کنا نریٰ ان لنا فی ھٰذا الامر حقا فاستبددتم به علینا۔ یعنی ہم یہ سمجھتے تھے کہ امرِ خلافت ہمارا حق ہے اور تم نے ہم پر استبداد کر کے ہمارا حق ہم سے چھین لیا ہے۔ (ایضاً)

ظہر کی نماز پڑھنے کے بعد ابوبکر صدیقؓ منبر پر چڑھے اور خطبہ دیا، اور بیعت سے علیؓ کے تخلف کی صورت کو بیان کیا اور جو عذر انہوں نے بیان کیا تھا اسے پیش کیا پھر مغفرت کی دعا مانگی اور (اس کے بعد) حضرت علیؓ نے خطبہ پڑھا اور حضرت ابوبکرؓ کے حق عظمت کو بیان کیا اور کہا کہ اب تک انہوں نے جو کچھ کیا ہے وہ ابوبکرؓ سے کسی حسد کی بنا پر نہیں کیا اور نہ اس فضیلت سے انکار کی بنا پر جو خدا نے انہیں دی ہے بلکہ ہم سمجھتے تھے کہ امر خلافت میں ہمارا حصہ ہے اور ابوبکرؓ نے ہمارے خلاف استبداد سے کام لیا ہے لہٰذا ہم اپنے دلوں میں ناراض تھے۔ (صحیح بخاری، کتاب المغازی)

بخاری کی اس روایت میں چند باتیں بڑی غور طلب ہیں۔ مثلاً

(۱) حضرت علیؓ حضرت ابوبکرؓ سے اس قدر ناراض تھے کہ انہوں نے انہیں حضرت فاطمہؓ کی وفات کی اطلاع تک نہیں دی اور چپکے ہی چپکے انہیں رات کو دفن کر دیا۔

(۲) جب تک حضرت فاطمہؓ زندہ رہیں، حضرت علیؓ نے حضرت ابوبکرؓ کی بیعت نہ کی لیکن ان کی وفات کے فوری بعد انہوں نے محسوس کیا کہ لوگوں کی نظروں میں ان کا پہلا وقار باقی نہیں رہا، اس لئے انہوں نے یہی مناسب سمجھا کہ حضرت ابوبکرؓ کی بیعت کر لی جائے۔

(۳) حضرت علیؓ نے اپنے حق خلافت کے لئے یہ دلیل دی کہ وہ رسول اللہؐ کے قرابت دار ہیں۔

آپ غور کیجئے کہ تاریخ کے اس بیان کو اگر صحیح تسلیم کر لیا جائے تو اس سے حضرت علیؓ کے متعلق کیا تصور قائم ہوتا ہے؟

تاریخ کے اس بیان کے مطابق حضرت علیؓ نے یہ بھی کہا کہ جن لوگوں نے انہیں خلافت سے محروم رکھا ہے انہوں نے غصب اور استبداد سے کام لیا ہے۔ یہی وہ "جرم" ہے جس کی بنا پر شیعہ حضرات کا عقیدہ ہے کہ نبی اکرمؐ کی وفات کے بعد، بجز چند اصحاب (جنہوں نے حضرت ابوبکرؓ کی بیعت نہیں کی تھی) باقی سب (معاذ اللہ) مرتد ہو گئے تھے۔ اس کے متعلق سنی حضرات یہ کہہ دیتے ہیں کہ یہ عقیدہ تعصب پر مبنی ہے لیکن اس کا کیا جواب کہ خود ان کی (حدیث کی) معتبر ترین کتاب، بخاری میں حسب ذیل روایت موجود ہے۔

صحابہؓ کا ارتداد؟

حضرت ابن عباسؓ آنحضرتؐ سے روایت کرتے ہیں کہ آپؐ نے فرمایا کہ تم لوگ برہنہ پا، برہنہ بدن، بغیر ختنہ کے حشر کئے جاؤ گے۔ آپؐ نے یہ آیت پڑھی۔ كَمَا بَدَأْنَا أَوَّلَ خَلْقٍ نُّعِيدُهُ وَعْدًا

عَلَيْنَا اِنَّا كُنَّا فَاعِلِيْنَ (۲۱/۱۰۴)۔ اور قیامت کے دن سب سے پہلے جسے کپڑے پہنائے جائیں گے وہ ابراہیم ہیں۔ اس دن میرے چند صحابہؓ بائیں جانب (یعنی جہنم کی طرف) لئے جا رہے ہوں گے۔ میں کہوں گا یہ تو میرے صحابہؓ ہیں۔ پھر اللہ فرمائے گا یہ لوگ اپنے پچھلے دین پر لوٹ گئے تھے[1] جب سے آپ ان کے پاس سے جدا ہوئے۔ پس میں کہوں گا جیسا کہ نیک بندے (یعنی عیسیٰؑ) نے کہا تھا۔ وَكُنْتُ عَلَيْهِمْ شَهِيْدًا مَّا دُمْتُ فِيْهِمْ فَلَمَّا تَوَفَّيْتَنِيْ كُنْتَ اَنْتَ الرَّقِيْبَ عَلَيْهِمْ (۵/۱۱۷)

(بخاری، کتاب الانبیاء ترجمہ شائع کردہ نور محمد تاجر کتب، کراچی۔ جلد دوم صفحہ ۱۴۹)

سوچئے کہ بخاری کی اس حدیث کی رو سے بات کہاں سے کہاں پہنچ جاتی ہے؟ یہ وہ صحابہؓ ہیں جن کے متعلق قرآن شہادت دیتا ہے کہ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُؤْمِنُوْنَ حَقًّا۔ (۸/۷۴) "یہی لوگ ہیں جو حقیقی مومن ہیں۔" اگر ان مومنین کے ایمان کی بھی یہ کیفیت تھی کہ اُدھر رسول اللہ نے آنکھیں بند کیں اور اِدھر یہ (معاذ اللہ) ایمان سے پھر گئے، تو بہ دیگراں چہ رسد؟ اور اگر کوئی معترض یہ کہہ دے (اور کہنے والے کہتے ہی ہیں) کہ "درخت اپنے پھل سے پہچانا جاتا ہے۔" تو سوچئے کہ (ان روایات کی رو سے) خود نبی اکرمؐ کے متعلق (معاذ اللہ) کیا تصور سامنے آتا ہے؟

ہمارے نزدیک نہ یہ احادیث ہی رسول اللہ کی ہیں اور نہ ہی تاریخ کے یہ واقعات صحیح ہیں۔ یہ سب افترا ہے اور اس دور کا وضع کردہ جب خلافت، ملوکیت سے بدل چکی تھی۔ (امام بخاری کی وفات ۲۵۶ھ میں ہوئی تھی اور امام ابن جریر طبری کی ۳۱۱ھ میں۔ یہ عباسیوں کی حکومت کا زمانہ تھا) ہمارے پاس ان داستانوں کے وضعی ہونے کی دلیل یہ ہے کہ ان سے اولوالعزم صحابہ کرامؓ کا اس قسم کا کردار سامنے آتا ہے جو ان کے متعلق قرآنی شہادات کے یکسر خلاف ہے اور یہ حقیقت ہے کہ جب بھی تاریخ یا کتبِ روایات میں کوئی ایسی بات سامنے آئے گی جو قرآن کریم کے خلاف ہو، تو ہم قرآنی شہادت کو تسلیم کریں گے اور تاریخ کے بیان کو باطل قرار دیں گے کہ ہم قرآن پر ایمان لانے کے مکلف ہیں، نہ کہ تاریخ پر[1]۔ ہمارے نزدیک حضرت ابوبکر صدیقؓ کا انتخاب نہایت محبت اور آشتی کی فضا میں، قرآنی اصولوں کی روشنی میں عمل میں آیا تھا۔ یہ تمام حضرات، دست پروردگانِ رسالتؐ تھے۔ اس لئے دین کی علم اور حقیقت سے اچھی طرح واقف اور ان کی سیرت بھی اتنی بلند تھی کہ ان سے، ہمارے زمانے کی انتخابی مہمات جیسے خلافِ شرفِ انسانیت مظاہر ناممکن تھے

---

[1] تاریخ اور روایات کی صحیح پوزیشن کے متعلق اس کتاب کے مقدمہ میں بھی بحث ہو چکی ہے اور اس کے آخری باب میں بھی تفصیل گفتگو کی جائے گی۔

قرآنِ کریم نے بتایا ہے کہ وَ اَمْرُهُمْ شُوْرٰی بَیْنَهُمْ (۴۲/۳۸) ان کے معاملات باہمی مشورے سے طے پاتے تھے۔ وہ اس حقیقت سے بھی واقف تھے کہ قرآنِ کریم کی رُو سے، مملکت کسی فرد کی ذاتی ملکیت نہیں، جو اس کے وارثوں کی طرف ...... ترکہ کے طور پر منتقل ہو جاتے یا کسی خاص قبیلہ میں محصور ہو کر رہ جاتے۔ مملکت، پوری کی پوری امت کے ایمان و عمل کے نتیجہ میں حاصل ہوئی تھی اور انہوں نے اس کے سربراہ کا انتخاب قرآنِ کریم کے اس ابدی اصول کے مطابق کرنا تھا کہ اِنَّ اَکْرَمَکُمْ عِنْدَ اللّٰهِ اَتْقٰکُمْ۔ (۴۹/۱۳) تم میں سب سے زیادہ واجب التکریم وہ ہے جو سب سے زیادہ احکامِ خداوندی کا پابند ہے۔ وہ جمع ہوتے تھے صرف یہ طے کرنے کے لئے کہ ان میں سے اتقیٰ کون ہے۔ انہوں نے حضرت ابوبکرؓ کو اتقیٰ پایا اور انہیں سربراہی کے لئے منتخب کر لیا۔ اس واقعہ کا تعلق تو حضرت ابوبکرؓ کے انتخاب سے ہے لیکن ہم نے اسے حضرت عمر فاروقؓ کے سوانحِ حیات کے سلسلہ میں اس لئے درج کرنا ضروری سمجھا ہے کہ (جیسا کہ آپ نے دیکھا) اس میں حضرت عمرؓ کے کردار کو نمایاں طور پر پیش کیا گیا ہے۔ ہم پر لازم تھا کہ ہم بتاتے کہ ان کی جو اس قسم کی تصویر کھینچی گئی ہے، اس کی حیثیت ایک افسانے سے زیادہ کچھ نہیں۔

اب ہمیں، حضرت صدیقِ اکبرؓ کے دورِ خلافت سے آگے بڑھ کر، خلافتِ فاروقی سے آغازِ سخن کرنا چاہیئے، لیکن اس مقام پر دو ایک اصولی باتیں ایسی سامنے آتی ہیں جن کا تعلق "نفسِ خلافت" سے ہے اور وہ اپنی اہمیت کے اعتبار سے ایسی نہیں جن سے صرفِ نظر کیا جا سکے۔

خلیفۃ اللہ نہیں

ہمارے ہاں ایک عام عقیدہ یہ ہے کہ خدا نے انسان کو اپنا خلیفہ بنایا ہے اور اس کی سند کے طور پر پیش کی جاتی ہے قرآن کریم کی وہ آیت جس میں آدمؑ (یعنی نوعِ انسان کے نمائندہ) کے متعلق کہا گیا ہے کہ اِنِّیْ جَاعِلٌ فِی الْاَرْضِ خَلِیْفَةً (۲/۳۰) ہم یہ دیکھ چکے ہیں کہ **خلیفہ** کے معنی جانشین کے ہیں اور یہ ظاہر ہے کہ جانشینی کا سوال کسی کے بعد پیدا ہوتا ہے۔ کسی کی موجودگی میں، کوئی اس کا جانشین نہیں ہو سکتا اور خدا چونکہ ہمیشہ اور ہر جگہ موجود ہے، اس لئے اس کا کوئی جانشین نہیں ہو سکتا۔ اس آیت میں صرف اتنا کہا گیا ہے کہ تخلیقِ انسانی سے پہلے جو صاحبِ اقتدار مخلوق دنیا میں موجود تھی اور جو اُس وقت پنہاں یا نابید ہو چکی تھی، نوعِ انسان (بنی آدم) کو اس کا جانشین بنایا گیا۔ سورۃ حجر میں ہے۔ وَالْجَآنَّ خَلَقْنٰهُ مِنْ قَبْلُ (۱۵/۲۷) اس میں مِنْ قَبْلُ (اس سے پہلے) کے الفاظ اس پر شاہد ہیں۔ (تخلیقِ آدم ایک جداگانہ مبحث ہے جسے میں نے اپنی کتاب ــــ ابلیس و آدم ــــ میں بڑی

شرح و بسط سے لکھا ہے)۔ اس مقام پر صرف اتنا بتانا مقصود ہے کہ یہ عقیدہ کہ خدا نے انسان کو اپنا خلیفہ بنایا ہے، قرآنِ کریم کی رُو سے صحیح نہیں۔ دیکھئے اس حقیقت کو حضرت ابوبکرؓ نے کس عمدگی سے واضح کر دیا۔ بیعتِ خلافت کے بعد ایک شخص نے آپ کو "یا خلیفۃ اللہ" کہہ کر پکارا۔ آپ نے فوراً اسے ٹوکا اور فرمایا کہ "میں خلیفۃ اللہ نہیں بلکہ خلیفۃ الرسول" ہوں۔ عام مؤرخین، آپ کے اس فقرہ کو، آپ کی منکسر المزاجی پر محمول کر کے آگے بڑھ گئے ہیں لیکن یہ نکتہ بڑا غور طلب ہے۔ آپ نے اس سے حکومت کے اس تصوّر کی وضاحت کر دی ہے جسے قرآن نے پیش کیا ہے۔ قرآنِ کریم کی رُو سے اسلامی حکومت، تھیاکریسی (THEOCRACY) نہیں جس میں مذہبی پیشوا، خدا کے قائم مقام بن کر لوگوں سے اپنی اطاعت لیتے ہیں۔ حضرت صدیق اکبرؓ نے اپنے انتخابِ خلافت کے بعد سب سے پہلے فقرہ میں اپنے آپ کو اپنے پیشرو سربراہِ مملکت کا جانشین بتا کر حکومت کے عمومی تصوّر کا اعلان کر دیا اور اس طرح خدا کی جانشینی کے عقیدہ کی جڑ کاٹ کر رکھ دی۔

یہ تھی دستِ پروردگانِ رسالت کی بصیرتِ قرآنی!

ڈسپلن

(۲) رسول اللہ نے اپنی حیاتِ ارضی کے آخری ایام میں، رومیوں کی مدافعت کے لئے ایک لشکر مرتب فرمایا تھا جس کی سپہ سالاری، حضرت زید بن حارثؓ (جو حضورؐ کے آزاد کردہ غلام تھے) کے بیس سالہ بیٹے اسامہؓ کو تفویض فرمائی تھی۔ حضورؐ کی وفات کے بعد حضرت ابوبکرؓ نے حضورؐ کے طے فرمودہ پروگرام کو علیٰ حالہٖ برقرار رکھا اور لشکر کو حضرت اسامہؓ بن زید کی قیادت میں روانہ کر دیا۔ دیگر صحابہؓ کی طرح حضرت عمرؓ بھی اس لشکر میں شامل تھے۔ حضرت صدیق اکبرؓ چاہتے تھے کہ حضرت عمرؓ پیچھے رہ جائیں تاکہ آپ ان سے مشورے لے سکیں۔ حضرت ابوبکرؓ خلیفہ تھے اور نہایت آسانی سے حکم دے سکتے تھے کہ حضرت عمرؓ پیچھے رہ جائیں لیکن جب آپ نے لشکر کی قیادت حضرت اسامہؓ کو سونپ دی تو پھر ان کے معاملات میں دخل اندازی مناسب نہیں سمجھی۔ آپ نے حضرت اسامہؓ سے درخواست کی اور کہا کہ "اگر تم چاہو تو میری مدد کے لئے عمرؓ کو چھوڑتے جاؤ۔" حضرت اسامہؓ نے بڑی خوشی سے اس کی اجازت دے دی۔ اس سے جہاں اس ڈسپلن کی ایک جھلک سامنے آجاتی ہے جس کے قالب میں صحابہؓ نے اپنے آپ کو ڈھال لیا تھا، وہاں یہ حقیقت بھی بے نقاب ہو جاتی ہے کہ حضرت ابوبکرؓ کی نگاہوں میں حضرت عمرؓ کی اہمیت کس قدر تھی۔

ایک دوسرے کا احترام

حضرت ابوبکرؓ کی نگاہوں میں حضرت عمرؓ کا مقام کیا تھا، اس کا اندازہ اس ایک واقعہ سے لگائیے کہ حضرت ابوبکرؓ نے حضرت طلحہؓ کو ایک قطعۂ

زمین عطا کیا اور کہا کہ اس دستاویز پر منجملہ دیگر صحابہؓ، حضرت عمرؓ سے بھی گواہی ڈلوالاؤ۔ جب حضرت عمرؓ نے اس دستاویز کو دیکھا تو حضرت طلحہؓ سے کہا کہ یہ جاگیر بہت بڑی ہے۔ میں اس پر مہر نہیں لگاؤں گا۔ حضرت طلحہؓ برافروختہ ہو ہو کر حضرت ابوبکرؓ کے پاس آتے اور کہا کہ

خدا کی قسم! مجھے معلوم نہیں کہ خلیفہ آپ ہیں یا عمرؓ!

آپ نے جواب میں فرمایا کہ "خلیفہ تو عمرؓ ہی ہیں لیکن انہوں نے قبولِ خلافت سے انکار کر دیا تھا' اس لئے یہ بار میرے کندھوں پر رکھا گیا۔"

دوسری طرف' حضرت عمرؓ کے دل میں حضرت ابوبکرؓ کا احترام کس قدر تھا' اس کا اندازہ اس سے لگایئے کہ حضرت عمرؓ کے خلیفہ منتخب ہو جانے کے بعد' کچھ لوگوں نے آپ سے کہا کہ "واللہ! ہم نے آپ سے زیادہ عادل' فیصل' حق گو' اور منافقین پر سخت اور کسی کو نہیں پایا۔ آپ رسول اللہؐ کے بعد سب سے بہتر انسان ہیں۔ اس پر حضرت عوف بن مالکؓ نے کہا کہ

تم لوگ غلط کہتے ہو۔ میں نے رسول اللہؐ کے بعد عمرؓ سے بہتر ابوبکرؓ کو پایا۔

یہ سنکر حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ

عوف نے سچ کہا ہے اور تم لوگوں نے غلط۔ ابوبکرؓ بوئے مشک سے بھی زیادہ پاکیزہ تھے۔ رہا میں' تو میں اپنے گھر کے اونٹ سے بھی زیادہ بے راہ رو ہوں۔

اس قسم تھے باہمی قلبی تعلقات ان حضرات کے جن کے متعلق قرآنِ کریم نے کہا تھا کہ "رُحَمَآءُ بَیْنَھُمْ ــــ وہ باہمد گر بریشم سے زیادہ نرم اور محبت خو ہیں۔

حضرت ابوبکرؓ کے زمانہ میں آپ (حضرت عمرؓ) مدینہ کے قاضی (مجسٹریٹ) بھی رہے لیکن کچھ عرصہ کے بعد اس منصب ہی کو ختم کر دینا پڑا کیونکہ آپ کی عدالت میں کوئی مقدمہ ہی پیش نہ ہوا۔ اُس دور میں "مقدمہ بازی" کی نوبت ہی نہیں آئی تھی۔

آیئے اب حضرت عمرؓ کی خلافت کی طرف قدم بڑھائیں۔

(۰)

حضرت عمرؓ کا انتخاب

حضرت ابوبکرؓ کے دورانِ خلافت' حضرت عمرؓ ان کے مشیرؓ اور شریک کار رہے۔ جب حضرت ابوبکرؓ مرض الموت میں مبتلا ہوتے تو انھوں نے محسوس

کیا کہ انہیں اپنی جانشینی کا مسئلہ اپنے سامنے طے کر دینا چاہیئے۔ ہم سمجھتے ہیں کہ ان کا یہ احساس بڑی عاقبت اندیشی اور حسنِ تدبر پر مبنی تھا۔ موجودہ زمانہ میں جہاں حکومتوں کا مدار آئین (کانسٹی ٹیوشن) پر ہو اور قوم آئین کی خوگر، جانشینی کا مسئلہ چنداں دشواری پیدا نہیں کرتا لیکن اس زمانے میں، جب مملکت کا کوئی باضابطہ آئین نہیں ہوتا تھا، یہ زیادہ مناسب تھا کہ ایک سربراہ اپنی جانشینی کا مسئلہ خود اپنی موجودگی میں طے کر دے تاکہ بعد میں کسی قسم کا خلفشار نمودار نہ ہو۔ اس مصلحت کے پیشِ نظر، حضرت ابوبکرؓ کا یہ خیال، ان کی فراست و بصیرت کی درخشاں شہادت ہے۔

جیسا کہ ہم پہلے دیکھ چکے ہیں، قرآنِ کریم نے کہا تھا کہ امورِ مملکت، اُمت کے باہمی مشورے سے طے ہوں گے (۴۲/۳۸) لیکن قرآن نے مشاورت کا حکم اصولی طور پر دیا ہے۔ مشاورت کے طریقِ کار (مشینری) کا تعین خود نہیں کیا۔ اس نے اسے اُمت کی صوابدید پر چھوڑ دیا ہے کہ وہ اپنے زمانے کے تقاضوں کے مطابق، مشاورت کی مشینری کا تعین خود کرے۔ جس ضابطۂ حیات کو تمام نوعِ انسان کے لئے، ابدی طور پر، غیر متبدل رہنا ہو، اس کا انداز یہی ہونا چاہیئے۔ اس کے اصول ہمیشہ کے لئے غیر متبدل رہیں گے، لیکن ان اصولوں کی روشنی میں جزئیات خود متعین کی جائیں گی۔ یہ جزئیات وقت کے تقاضوں کے لحاظ سے بدلتی رہیں گی لیکن اصول اپنی جگہ اٹل رہیں گے۔ ثبات و تغیر کا یہی وہ حسین امتزاج ہے جس سے اسلام ایک ابدی نظامِ حیات بن سکتا ہے۔ جہاں تک مشاورت کے اصولی حکم کے بروئے کار لانے کے لئے طریقِ کار کا تعلق ہے اس کی ضرورت حضرت ابوبکرؓ کے انتخابِ خلافت کے وقت پیش آئی۔ جو کچھ تاریخ سے مترشح ہوتا ہے، وہ یہی ہے کہ اس مقصد کے لئے مدینہ کے اکابرِ صحابہؓ (اعیانِ مملکت) کے اجتماع نے یہ فیصلہ کر دیا۔ (تفصیل اس کی ذرا آگے چل کر آتی ہے۔) اس زمانے میں، جبکہ سامانِ رسل و رسائل اور ذرائع مواصلات آج کی طرح اس قدر عام نہیں تھے، یہ مشکل ہی نہیں، ناممکن تھا کہ ایسے ہنگامی واقعہ کی صورت میں (اتنے تھوڑے نوٹس پر) تمام اُمت کے نمائندگان کو یکجا اکٹھا کیا جا سکتا۔ اعیانِ مدینہ نے باہمی مشاورت سے خلیفہ کو منتخب کیا۔ اس کے بعد اطراف و اکنافِ مملکت سے اُمت کے نمائندے (مختلف قبائل کے سربراہ) آئے اور انہوں نے بیعت کر لی۔

بیعت کا مفہوم

دین کے نظام میں بیعت کی اصطلاح بڑی بنیادی، فلہٰذا اس قابل ہے کہ اسے اچھی طرح سمجھ لیا جائے۔ قرآنِ کریم کی رُو سے، جب کوئی شخص اُمتِ مسلمہ (کی سوسائٹی) کا رکن بننا چاہے (یعنی عام اصطلاح میں مسلمان ہونا چاہے)، تو اسے اپنی کامل رضامندی

سے ایک معاہدہ پر دستخط کرنے ہوتے ہیں جس کی رُو سے (اِنَّ اللّٰہَ اشْتَرٰی مِنَ الْمُؤْمِنِیْنَ اَنْفُسَھُمْ وَ اَمْوَالَھُمْ بِاَنَّ لَھُمُ الْجَنَّۃَ - (۹/۱۱۱) وہ شخص" اپنی جان اور مال خدا کے ہاتھ بیچ دیتا ہے اور اس کے عوض خدا اسے جنت کی زندگی کی ضمانت دیتا ہے"۔ (اس دنیا کی زندگی میں بھی اور موت کے بعد بھی)

یہاں سوال پھر وہی پیدا ہوتا ہے کہ خدا تو ایک ان دیکھی غیر محسوس حقیقت ہے۔ اس کے ساتھ بیع و شریٰ (خرید و فروخت) کا یہ معاملہ طے کس طرح پاتا ہے؟ اور اس کا جواب بھی وہی ہے جو پہلے دیا جا چکا ہے کہ یہ معاملہ طے پاتا ہے اس سربراہِ مملکت کے توسط سے جو احکامِ خداوندی کے مطابق حکومت قائم کرتا ہے ـــ اصولاً یوں سمجھ لیجئے کہ انسانوں کے معاملہ میں جس قدر ذمہ داریاں خدا نے اپنے اوپر لی ہیں (اور جن کا ذکر قرآنِ کریم میں آیا ہے) وہ اسلامی مملکت کے ہاتھوں پوری ہوتی ہیں۔ جو مملکت، خدا کی یہ ذمہ داریاں پوری کرتی ہے، اسی کو حق حاصل ہوتا ہے کہ وہ لوگوں سے احکامِ خداوندی کی اطاعت کرائے ـــ اس اصول کے مطابق، خدا سے بیع و شریٰ (یعنی حقوق اور ذمہ داریوں) کا یہ معاملہ سربراہِ مملکت کی وساطت سے طے پاتا ہے۔ اس کی شہادت خود قرآنِ کریم میں موجود ہے۔ جب صلح حدیبیہ سے پہلے، جماعتِ مومنین پر سخت نازک وقت آیا جس میں نظر آتا تھا کہ اہلِ مکہ کے ساتھ شدید مقابلہ ہوگا اور اس میں انہیں بے دریغ جانیں قربان کرنی پڑیں گی، تو حضورؐ نے، بیع و شریٰ کے معاملہ کی تجدید یا یاددہانی کے طور پر، جماعتِ مومنین سے "بیعت" لی۔ (بیعت کے معنی ہی خود فروشی یعنی اپنے آپ کو بیچ ڈالنا ہیں) اس مقصد کے لئے صحابہؓ آتے اور (اس زمانے کے قاعدے کے مطابق) اس معاہدہ کے لئے اپنا ہاتھ حضورؐ کی طرف بڑھاتے اور حضورؐ ان کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھ کر، معاہدہ کی توثیق فرماتے تھے۔ اس "بیعت" کو قرآنِ کریم نے ان الفاظ میں بیان کیا ہے کہ اِنَّ الَّذِیْنَ یُبَایِعُوْنَکَ - یہ لوگ جو (اے رسولؐ!) تیرے ہاتھ پر بیعت کرتے ہیں اِنَّمَا یُبَایِعُوْنَ اللّٰہَ - یہ درحقیقت خدا کے ساتھ اپنی بیع کا معاملہ طے کرتے ہیں۔ یَدُ اللّٰہِ فَوْقَ اَیْدِیْھِمْ (۴۸/۱۰) ان کے ہاتھ پر بظاہر، محسوس طور پر، تو تیرا ہاتھ ہوتا ہے لیکن درحقیقت یہ خدا کا ہاتھ ہے، تو ان سے یہ معاہدہ خدا کے (BEHALF) پر کرتا ہے[1]

---

[1] یہ تھا قرآنِ کریم کی رُو سے "بیعت" کا مفہوم لیکن جب دینؔ مذہب میں تبدیل ہوگیا تو اس بیعت کا مفہوم رہ گیا کسی پیر کا مرید بن جانا اور اس کے لئے "حضرت صاحب کی بیعت کرلینا" رسم ہے۔

الفاظ و معانی میں تفاوت نہیں لیکن ملّا کی اذاں اور مجاہد کی اذاں اور
پرواز ہے دونوں کی اسی ایک فضا میں کرگس کا جہاں اور ہے شاہیں کا جہاں اور (اقبالؒ)

یہ تھی وہ بیعت جو مختلف قبائل (نمائندگانِ ملّتِ اسلامیہ) خلیفہ کے ہاتھ پر کرتے تھے۔ اس طریق سے اس انتخاب کی توثیق، تمام ملّت کی طرف سے ہو جاتی تھی۔ حضرت ابوبکرؓ کے انتخاب کے وقت، مشاورت کے قرآنی حکم کی تعمیل کے لئے یہ طریقِ کار اختیار کیا گیا۔ حضرت ابوبکرؓ نے اپنے جانشین کے انتخاب کے سلسلہ میں، اس طریقِ کار میں ذرا سی تبدیلی کر لی۔ آپ نے لوگوں کو بلایا (اور ظاہر ہے کہ یہ لوگ اہلِ مدینہ ہی کے اعیان وارکان تھے) اور ان سے کہا۔

لوگو! جو کچھ میری حالت ہے وہ تمہارے سامنے ہے۔ میں خیال کرتا ہوں کہ اب میں زیادہ عرصہ تک زندہ نہیں رہ سکتا۔ اس لئے اللہ نے تمہیں میری بیعت سے آزاد کر دیا ہے اور تمہیں اختیار دے دیا ہے کہ تم اپنے لئے ایک سربراہ کا انتخاب کر لو۔ اگر تم میری زندگی میں ایسا کر لوگے تو میرے بعد اختلافات سے بچ جاؤ گے۔

لوگوں نے باہمی مشورہ کیا لیکن کسی نتیجہ پر نہ پہنچ سکے، تو آپ کی خدمت میں حاضر ہو کر کہا کہ ہم انتخاب کا اختیار آپ کو دیتے ہیں۔ آپ ہی اُمّت کے لئے ایک سربراہ منتخب فرما دیجئے۔ آپ نے فرمایا کہ اس مقصد کے لئے مجھے کچھ مہلت دو تاکہ میں اکابرینِ اُمّت سے مشورہ کر لوں۔

آپ نے پہلے حضرت عبدالرحمٰن بن عوفؓ کو بلایا اور ان سے کہا کہ مجھے بتاؤ کہ عمر ابن الخطاب کے متعلق تمہاری کیا رائے ہے۔ انہوں نے کہا کہ اس بارے میں آپ مجھ سے بہتر طور پر جانتے ہیں۔ میں اتنا ہی کہہ سکتا ہوں کہ آپ ان کے متعلق جو رائے رکھتے ہیں، میرے نزدیک وہ اس سے بھی بہتر ہیں۔ اس کے بعد آپ نے حضرت عثمانؓ سے مشورہ کیا، تو انہوں نے بھی اسی رائے کا اظہار کیا۔ پھر آپ نے مہاجرین اور انصار میں سے مختلف منتخب و ممتاز شخصیتوں سے مشورہ کیا، تو ان سب نے یہی رائے دی۔ بعض لوگوں نے اتنا اعتراض کیا کہ حضرت عمرؓ سخت مزاج ہیں۔ خلافت پا کر وہ اور زیادہ سخت ہو جائیں گے۔ اس پر آپ نے کہا کہ نہیں! میرا اندازہ یہ ہے کہ خلافت کی ذمہ داریاں ان کی سختی کو نرمی میں بدل دیں گی۔ میں سمجھتا ہوں کہ اگر عمرؓ میرے جانشین ہو جائیں تو میں خدا سے کہہ سکوں گا کہ میں تیرے بندوں پر تیرے بہترین بندے کو ذمہ دار بنا آیا ہوں۔ اس پر لوگ مطمئن ہو گئے اور آپ نے حسبِ ذیل دستاویز قلمبند کرا دی۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ۝

یہ ہے وہ وصیت جو ابوبکرؓ بن قحافہ نے دنیا سے جاتے ہوئے اور آخرت میں داخل ہوتے وقت

کھاتی۔ یہ وہ وقت ہوتا ہے جب کافر بھی ایمان لے آتا ہے اور فاجر بھی (صداقت کا) یقین کر لیتا ہے جھوٹا بھی سچ کا اعتراف کر لیتا ہے۔ میں نے اپنے بعد تمہارے لئے (عمرؓ ابن خطاب کو) سربراہ مقرر کیا ہے۔ لہٰذا، تم لوگ ان کی سنو اور اطاعت کرو۔ میں نے خدا، رسول اور دین کے سلسلہ میں اپنی اور آپ لوگوں کی بہتری میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا۔ اگر وہ عدل کریں گے تو میرا خیال درست ثابت ہوگا۔ اگر وہ بدل جاتے ہیں (تو اس کے لئے میں مکلف نہیں ہوں گا کیونکہ) ہر شخص اپنے کئے کا پھل پائے گا۔ میں نے (اپنی دانست میں) بھلائی کا کام کیا ہے۔ مجھے غیب کا علم نہیں۔ والسلام علیکم ورحمتہ اللہ۔

اس دستاویز پر آپ نے مہر لگائی۔ اسے لفافہ میں بند کیا اور جھروکے میں سے جھانک کر، نیچے منتظر لوگوں سے کہا کہ "لوگو! میں نے اس دستاویز میں اپنا فیصلہ لکھ دیا ہے۔ تم اس پر رضامند ہو" سب نے بیک زبان کہا کہ ہم رضامند ہیں (کیونکہ ہم ہی نے تو آپ کو اس کا اختیار دیا تھا) لیکن حضرت علیؓ نے کہا کہ

ہم صرف اسی صورت میں راضی ہو سکتے ہیں کہ اس میں عمرؓ کا نام ہو۔ (بحوالہ طنطاوی)

آپ نے فرمایا کہ ہاں! اس میں عمرؓ ہی کا نام ہے۔ اس پر سب لوگوں نے حضرت عمرؓ کی بیعت کر لی۔ ازاں بعد، حضرت ابوبکرؓ نے دعا کے لئے ہاتھ اٹھائے اور بدرگاہِ رب العزت عرض کیا کہ

بارِ الٰہا! میں نے ان لوگوں کی بھلائی کا ارادہ کیا ہے میں نے جو کچھ کیا ہے وہ تجھے معلوم ہے اپنی سمجھ بوجھ کے مطابق، میں نے ایسے شخص کو خلیفہ منتخب کیا ہے جو ان میں سب سے بہتر ہے۔ صاحبِ قوت بھی ہے اور طالبِ رشد و ہدایت بھی۔ تو اسے میرا صحیح جانشین ثابت کر دے۔ یہ تیرے بندے ہیں اور ان کے معاملات تیرے ہاتھ میں ہیں۔ تو ان کے امیر کو صلاح اور فلاح کی توفیق عطا فرما اور ان خلفائے راشدین میں سے بنا جو نبیٔ رحمتؐ کی عطا کردہ راہ نمائی کا اتباع کریں۔

اس کے بعد، حضرت ابوبکر صدیقؓ وفات پا گئے اور خلافتِ فاروقی کا آغاز ہو گیا۔ یہ ۲۲ جمادی الآخر ۱۳ھ (مطابق ۲۲۔ اگست ۶۳۴ء) کی بات ہے۔

پہلا خطبہ خلافت

خلافت کی ذمہ داریاں سنبھالنے کے بعد، ان خلفائے عظام کا پہلا خطبہ خاص اہمیت کا حامل ہوتا تھا۔ وہ اس میں اپنی ذمہ داریوں، افرادِ معاشرہ کے حقوق و فرائض اور مملکت کے مقاصد و منتہیٰ کا بڑی وضاحت سے اعلان کر دیتے تھے۔ آج کی اصطلاح میں یوں سمجھئے کہ وہ ان کا منشور ہوتا تھا۔ اس نہج سے ہم مناسب سمجھتے ہیں کہ حضرت ابوبکرؓ کے خطبہ خلافت کو بھی درج کر دیا جائے۔ انہوں نے اللہ کی حمد کے بعد فرمایا تھا۔

حضرت ابوبکرؓ

اے لوگو! میں تمہارا سربراہ بنایا گیا ہوں لیکن میں تم سے بہتر نہیں ہوں۔ اگر میں صحیح (نیک) کام کروں تو اس میں میری مدد کرو۔ اگر غلط قدم اٹھاؤں تو مجھے ٹوکو۔ صدق امانت ہے اور کذب خیانت۔ تم میں سے کمزور ترین شخص میرے نزدیک قوی تر ہے جب تک میں اسے اس کا حق نہ دلا دوں، اور تم میں سے قوی تر آدمی میرے نزدیک کمزور تر ہے جب تک میں اس سے وہ حق نہ لے لوں جو اس کے ذمے ہے۔ جو قوم خدا کی راہ میں جہاد ترک کر دیتی ہے اس پر اللہ ذلت اور خواری مسلط کر دیتا ہے اور اگر کسی قوم میں بے حیائی پھیل جاتی ہے تو اللہ اس پر مصائب اور تباہی کا عذاب عام کر دیتا ہے۔ تم میری اطاعت کرو، جب تک میں اللہ اور اس کے رسولؐ کی اطاعت کروں لیکن اگر مجھ سے کوئی ایسا کام سرزد ہو جس سے اللہ اور اس کے رسولؐ کی نافرمانی کا پہلو نکلتا ہو تو تم پر میری اطاعت واجب نہیں۔

تاریخی روایات میں حضرت عمرؓ کے خلافت کے یوم اوّل کے دو خطبے مذکور ہیں۔ ایک مختصر ہے اور دوسرا مفصّل۔ معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے مختصر خطبہ، صبح کی نماز کے وقت ارشاد فرمایا تھا اور مفصّل خطبہ ظہر کی نماز کے وقت جب اجتماع زیادہ تھا۔ یہ خطباب، بادنیٰ لفظی اختلاف، کتبِ تاریخ میں مذکور ہیں۔ مختصر خطبہ میں آپ نے، حمد و ثنا کے بعد، حضرت ابوبکر صدیقؓ کے فضائل و مناقب کا ذکر کرنے کے بعد فرمایا۔

حضرت عمرؓ کا خطبہ لوگو! میں تمہیں میں سے ایک انسان ہوں۔ اگر مجھے خلیفۂ رسول اللہ

کی حکم عدولی گوارا ہو سکتی تو میں ہرگز یہ ذمہ داری قبول نہ کرتا۔[1]

آپ نے یہ الفاظ ایسے خلوص اور انکسار کے ساتھ کہے کہ سامعین کے دل کی گہرائیوں میں اتر گئے۔ چنانچہ انہوں نے محسوس کیا کہ حضرت ابوبکر صدیقؓ نے جو کہا تھا کہ خلافت کی ذمہ داریاں (حضرت) عمرؓ کی سختی کو نرمی سے بدل دیں گی، وہ درست تھا۔

اس کے بعد حضرت عمرؓ نے کہا کہ لوگو! میں خدا سے تین دعائیں مانگتا ہوں۔ تم آمین[2] کہو۔ انہوں نے آسمان کی طرف نگاہ اٹھائی اور نہایت عجز و الحاح سے کہا۔

بارالٰہا! میں سخت ہوں، مجھے حق کی موافقت، اپنی رضا طلبی اور احساسِ آخرت کیلئے نرم کر دے

یہ کہہ کر آپ خاموش ہو گئے۔ سامعین نے آمین کہا، تو آپ نے دوسری دعا مانگی کہ

یا اللہ! میں کمزور ہوں۔ مجھے قوی بنا دے تاکہ میں دین کے دشمنوں، منافقوں اور فحش کاروں کا مقابلہ کر سکوں لیکن ایسا قوی نہیں کہ میں ان کے حق میں ظالم بن جاؤں اور ان پر دست درازی کرنے لگ جاؤں۔

آپ پھر خاموش ہو گئے۔ مجمع پر سناٹا چھا رہا تھا۔ لوگوں نے آمین کہا، تو آپ نے بدرگاہِ ربّ العزت عرض کیا کہ

یا اللہ! میں بخیل ہوں۔ مجھے امورِ خیر کے لئے سخی بنا دے لیکن اس سخاوت میں ریاکاری کا شائبہ نہ ہو۔

مجمع پر سکوت چھا رہا تھا۔ تھوڑے سے توقف کے بعد آپ نے فرمایا۔

ایھا الناس! اللہ نے میرے دو رفقاء کے بعد، مجھے تم میں باقی رکھا ہے تاکہ وہ میرے ذریعے تمہاری اور تمہارے ذریعے میری آزمائش کرے۔ تمہارا جو معاملہ میرے سامنے آئے گا میں اسے کسی دوسرے پر نہیں چھوڑوں گا بلکہ خود سرانجام دوں گا۔ البتہ جو معاملہ ایسا ہو گا جس میں مجھے دوسروں کی معاونت کی ضرورت ہو گی تو اس کے لئے میں حتیّ الامکان ایسے لوگوں کو متعین کروں گا جن کی صداقت اور امانت میں شبہ نہ ہو۔ اگر وہ لوگ صحیح راستے پر چلیں گے تو میں ان کے ساتھ نیک سلوک کروں گا۔ اگر غلط روش اختیار کریں گے تو انہیں عبرتناک سزا دوں گا۔

---

[1] شاہ ولیؒ اللہ نے لکھا ہے کہ حضرت عمرؓ نے یہ بھی فرمایا تھا کہ اگر میں دیکھتا کہ کوئی اور صاحب اس بار کو مجھ سے بہتر طور پر اٹھا سکنے کے قابل ہیں تو میں اسے قبول نہ کرتا۔ (ازالۃ الخفاء)

[2] آمین عبرانی زبان کا لفظ ہے جس کے معنی ہیں — ہاں! یقیناً ایسا ہو گا — اس میں یقین کا تصور غالب ہوتا ہے۔ اسی سے لفظ ایمان ہے جس کے بنیادی معنی اس یقین کے ہیں جس سے قلب کو امن (اطمینان) حاصل ہو۔

اس کے بعد آپ نے سامعین سے کہا کہ

قرآن پڑھا کرو۔ اسی سے تمہاری قدر و منزلت ہوگی اور اسی پر عمل کرو تاکہ تم حاملِ قرآن ہو جاؤ۔ اپنے نفوس کا وزن کرو اس سے پیشتر کہ تمہارا وزن کیا جاتے۔ قیامت کے دن کے لئے اپنے آپ کو تیار کرو جب تم خدا کے سامنے پیش کئے جاؤ گے اور تمہاری کوئی بات پوشیدہ نہیں رہے گی۔

اس کے بعد، پھر اپنے لئے ایک اور دعا مانگی جس میں کہا کہ

بارالہا! مجھے تفکر و تدبرِ قرآنی عطا فرما تاکہ میں جو کچھ قرآن سے پڑھوں اسے اچھی طرح سمجھ سکوں اور اس کے نوادرات پر غور کرسکوں۔

یا اللہ! تو مجھے توفیق عطا فرما کہ میں جب تک زندہ رہوں تیری کتاب پر عمل پیرا رہوں۔ اِنَّکَ عَلٰی کُلِّ شَیْیءٍ قَدِیْرٌ۔

یہ مختصر خطبہ تھا۔ دوسرے قدرے مفصل خطبہ میں آپ نے حمد و ثنا کے بعد برسرِ منبر فرمایا۔

مفصّل خطبہ

مجھے معلوم ہوا ہے کہ لوگ میری سختی سے خائف اور میری درشتی سے لرزاں ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ عمرؓ اس وقت بھی ہم پر سختی کرتا تھا جب ہم رسولؐ اللہ کے سایۂ عاطفت میں تھے اور اس وقت بھی جب ہمارے اور اس کے درمیان حضرت صدیقِ اکبرؓ حائل تھے لیکن اب کیا ہو گا جب ہم میں نہ رسولؐ اللہ موجود ہیں نہ ابوبکر صدیقؓ اور معاملات تمام کے تمام اس کے ہاتھ میں ہیں۔

جو شخص بھی یہ کہتا ہے وہ ٹھیک کہتا ہے لیکن ایسا کہتے وقت وہ بھول جاتا ہے کہ مجھے رسولؐ اللہ کی مصاحبت کا شرف حاصل تھا اور میں ان کا فرماں پذیر تھا۔ وہ سراپا نرمی اور رحمت تھے جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے خود فرمایا ہے کہ وہ مومنین کے لئے رافت اور رحمت کا سرچشمہ ہیں۔ بارگاہِ رسالتؐ میں میری حیثیت ایک شمشیرِ برہنہ کی سی تھی۔ جب حضورؐ چاہتے اس شمشیر کو اذنِ کار عطا کر دیتے اور جب چاہتے اسے نیام میں رکھ لیتے۔ میں حضورؐ کی خدمت میں اسی طرح رہا تا آنکہ اللہ تعالےٰ نے آپؐ کو یاد فرمالیا۔ حضورؐ آخر وقت تک مجھ سے خوش رہے۔ اس پر میں اللہ کا لاکھ لاکھ شکر ادا کرتا ہوں، اور اس سعادتِ عظمٰے پر مجھے فخر و ناز ہے۔

اس کے بعد اُمت کی زمامِ کار حضرت ابوبکرؓ صدیق کے سپرد کردی گئی جن کے تحمل اور نرمی سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ میں ان کا بھی خادم اور مددگار تھا اور اپنی سختی کو ان کی نرمی میں سمو دیتا تھا۔ میں حسبِ سابق ایک برہنہ تلوار تھا جسے وہ جس وقت چاہتے بروئے کار لاتے، اور جب چاہتے زیرِ نیام کر لیتے۔ میں اسی طرح ان کے ساتھ رہا یہاں تک کہ خدا نے انہیں ہم سے جدا کر دیا۔ وہ بھی آخر دم تک مجھ سے خوش رہے۔ اس پر میں اللہ کا لاکھ لاکھ شکر ادا کرتا ہوں اور یہ سعادت میرے لئے وجہِ مسرت ہے۔

اور اب کہ، اے لوگو! تمہارے معاملات کی ذمہ داری میرے کندھوں پر رکھ دی گئی ہے، تمہیں معلوم ہونا چاہیئے کہ میری وہ سختی نرمی میں بدل گئی ہے لیکن ان لوگوں کے لئے بدستور قائم ہے جو ظلم اور زیادتی سے کام لیں۔ رہے وہ لوگ جو امن و سلامتی سے رہتے اور جرأتِ ایمانی رکھتے ہیں، تو ان کے لئے میں سب سے زیادہ نرم ہوں۔ اگر کوئی شخص کسی کے ساتھ ظلم اور زیادتی کرے گا تو میں اسے اس وقت تک نہیں چھوڑوں گا جب تک اس کا ایک رخسار زمین پر ٹکا کر دوسرے رخسار پر اپنا پاؤں رکھ دوں تا آنکہ وہ حق کے سامنے سپرانداز ہو جائے لیکن اس تمام سختی کے باوجود، میں اہلِ حق کے لئے خود اپنے رخسار زمین پر رکھ دوں گا۔

لوگو! مجھ پر تمہارے کچھ حقوق ہیں جو میں تمہارے سامنے بیان کرتا ہوں۔ تم اپنے یہ حقوق مجھ سے حاصل کرو۔ تم پر میرا صرف یہ حق ہے کہ تمہارے خراج اور مالِ غنیمت میں سے جو اللہ تمہیں عطا کرے (یعنی مملکت کی آمدنی میں سے) اپنے کفاف کے لئے لوں، لیکن اسے ناحق نہ لوں۔

تمہارا مجھ پر یہ حق ہے کہ جب تم میں سے کوئی میرے پاس آئے تو مجھ سے اپنا حق لے کر جائے۔

تمہارا مجھ پر یہ حق بھی ہے کہ میں تمہارے عطیات اور وظائف میں اضافہ کروں اور تمہاری سرحدوں کو مستحکم کروں۔

اور یہ حق بھی کہ تمہیں ہلاکت میں نہ ڈالوں۔ تمہیں بلاضرورت گھر واپس آنے سے نہ روکے رکھوں اور جب تم کسی جنگ پر جاؤ تو ایک باپ کی طرح تمہارے اہل و عیال کی نگہداشت کروں۔

اللہ کے بندو! اللہ سے ڈرو! میرا ہاتھ بٹاؤ۔ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر میں میری مدد کرو۔ تمہاری جو خدمات اللہ نے میرے سپرد کی ہیں ان کے متعلق مجھے نصیحت کرتے رہو۔ میں تم سے یہ کچھ کہہ رہا

ہوں اور اپنے اور تمہارے لئے اللہ سے مغفرت طلب کر رہا ہوں۔ میں یوم الحساب کا منتظر ہوں۔
جب مجھے یہ بتانا ہوگا کہ میں نے تم سے کیا لیا اور اسے کیسے خرچ کیا۔

یہ کہہ کر آپ منبر سے اُترے اور نماز پڑھائی۔

یہ تھے وہ پہلے خطبات جن سے خلافتِ فاروقی کا آغاز ہوا۔ آپ کا معمول یہ تھا کہ ہر اہم موقعہ پر امت سے خطاب کرتے تھے۔ آگے چل کر آپ کے یہ خطبات ہمارے سامنے آئیں گے۔ ان سے یہ اندازہ کیا جاسکے گا کہ اللہ تعالیٰ نے اسلام کے اس بطلِ جلیل کو معاملات کے سمجھنے، سلجھانے اور لوگوں کے سامنے انہیں پیش کرنے کی کس قدر وسیع، بلند اور عمیق صلاحیت عطا فرمائی تھی۔ یوں تو خطابت اور بلاغت، عربوں کی سب سے بڑی خصوصیت تھی لیکن عربی ادب کے ماہرین اس حقیقت پر شاہد ہیں کہ حضرت عمرؓ کے خطبات، فنِ خطابت اور فصاحت و بلاغت میں بھی اپنی مثال آپ ہیں۔

امیر المومنین کا لقب

جیسا کہ ہم دیکھ چکے ہیں، جب حضرت ابوبکرؓ کو کسی نے "خلیفۃ اللہ" کہہ کر پکارا تو آپ نے اسے ٹوکا اور کہا کہ میں خلیفۃ اللہ نہیں (خلیفۃ اللہ کوئی نہیں ہوسکتا) میں خلیفۃ الرسولؐ ہوں۔ چنانچہ آپ خلیفۃ الرسولؐ کہلاتے رہے۔ جب حضرت عمرؓ خلیفہ منتخب ہوتے تو لوگوں نے آپ کو "خلیفہ خلیفہ رسول اللہ" کہنا شروع کیا۔ اس پر یہ حقیقت سامنے آئی کہ اگر یہی انداز جاری رہا تو بعد میں آنے والے خلفاء کا لقب بہت لمبا ہو جائے گا۔ اس لئے کوئی ایسا لقب اختیار کرنا چاہیئے جو سب کے لئے موزوں قرار پائے۔ تاریخ کے ایک بیان میں ہے کہ عراق کے گورنر نے ایک دفعہ عبید بن ربیعہ عامری اور عدی بن حاتم طائی کو آپ کی خدمت میں بھیجا۔ مسجد میں ان کی ملاقات حضرت عمرو بن عاصؓ سے ہوئی تو انہوں نے ان سے کہا کہ امیر المومنین کو ہماری آمد کی اطلاع کر دیجئے۔ انہوں نے یہ سن کر کہا کہ کیسا اچھا لقب ہے جس سے تم نے خلیفہ کو پکارا ہے ہم سب مومن اور وہ ہمارے امیر — جب حضرت عمرؓ تک یہ بات پہنچی تو انہوں نے بھی اسے پسند کیا اور اس کے بعد خلفاء کے لئے یہی لقب اختیار کر لیا گیا۔

امیر کے معنی

واضح رہے کہ آج تو ہمارے ہاں امیر کے معنی کچھ اور لئے جاتے ہیں لیکن عربوں کے ہاں بنیادی طور پر اس

کے معنی کچھ اور تھے۔ عربوں کے قافلے صحراؤں میں سفر کرتے تھے جہاں نہ پختہ شاہراہیں ہوتی تھیں نہ سنگِ میل۔ وہ لوگ، چھوٹے چھوٹے پتھروں سے راستوں میں نشان لگا دیتے تھے۔ انہیں اَلْاَمَرَةُ وَ الْتَامُوْرُ کہا جاتا تھا، بنابریں، امر کے بنیادی معنی علامت، نشان یا راہ نمائی کے تھے...... یہیں سے اس کے معنی مشورہ کرنے کے آتے ہیں۔ اَلْاِئْتِمَارُ کے معنی ہیں مشورہ کرنا۔ ان بنیادی معانی کے پیشِ نظر، امیرالمومنین کے معنی "مومنین کا حاکم" نہیں، بلکہ ان کے لئے نشاناتِ راہ متعین کرنے والا، ان کی راہ نمائی کرنے والا ہوں گے، یا ان سے مشورہ کرنے والا۔ آپ نے دیکھا کہ خود اس لقب (امیرالمومنین) سے بھی خلافت اور ملوکیت یا حاکمیت کا فرق کس طرح نمایاں طور پر سامنے آجاتا ہے؟ اور یہی وجہ تھی کہ حضرت عمرؓ نے اسے پسند اور اختیار فرمایا۔

خلافت اور ملوکیّت میں فرق

ملوکیت یہی نہیں کہ باپ کے بعد اس کا بیٹا تخت نشین ہو جائے۔ قرآنِ کریم کی رُو سے، کسی انسان کا کسی دوسرے انسان کو اپنا محکوم بنا لینا، ملوکیت ہے۔ خواہ اس کی شکل کوئی سی ہو — قدیم زمانے کی بادشاہت عصرِ حاضر کی ڈکٹیٹرشپ، اور مغربی جمہوریّت جس میں انسانوں کا ایک گروہ (اکثریتی پارٹی) دوسرے انسانوں سے اپنا حکم منواتی ہے، سب ملوکیت میں شامل ہیں۔ قرآنِ کریم کا واضح فیصلہ ہے کہ

مَاكَانَ لِبَشَرٍ اَنْ يُّؤْتِيَهُ اللّٰهُ الْكِتٰبَ وَ الْحُكْمَ وَ النُّبُوَّةَ ثُمَّ يَقُوْلَ لِلنَّاسِ كُوْنُوْا عِبَادًا لِّيْ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَلٰكِنْ كُوْنُوْا رَبّٰنِيّٖنَ بِمَا كُنْتُمْ تُعَلِّمُوْنَ الْكِتٰبَ وَ بِمَا كُنْتُمْ تَدْرُسُوْنَ ۙ (٣/٧٩)

کسی انسان کو اس کا حق حاصل نہیں، خواہ اللہ اسے ضابطۂ قوانین، حکومت کے اختیارات یا نبوّت بھی کیوں نہ دے دے، کہ وہ لوگوں سے کہے کہ تم خدا کے نہیں بلکہ میرے محکوم بن جاؤ۔ اسے یہی کہنا چاہیے کہ تم اس کتابِ خداوندی کے ذریعے جسے تم پڑھتے پڑھاتے، اور اس کے معانی پر غور و فکر کرتے رہتے ہو، ربّانی بن جاؤ۔

جیسا کہ پہلے بتایا جا چکا ہے، حقِ حکومت صرف خدا کو حاصل ہے جس کی تعمیل کا عملی ذریعہ اس کی کتاب کی اطاعت ہے۔ وہ (خدا) اپنے حقِ حکومت میں کسی کو شریک نہیں کرتا۔ لَا يُشْرِكُ فِيْ حُكْمِهٖٓ اَحَدًا۔ (١٨/٢٦) لہٰذا، خلافت، احکام و قوانینِ خداوندی کی اطاعت کرنا اور کرانا ہے، اور ملوکیّت دوسروں سے اپنے احکام منوانا۔ قرآن نے نصبِ خلافت

کا حکم دیتا اور ملوکیّت کو حرام ٹھہراتا ہے۔ اقبالؒ کے الفاظ میں :۔

خلافت بر مقامِ ما گواہی است — حرام است آنچہ بر ما پادشاہی است

ملوکیّت ہمہ مکر است و نیرنگ — خلافت حفظِ ناموسِ الٰہی است

انسان اپنے لئے جو نظام بھی خود وضع کرے گا وہ ملوکیت ہی کی کوئی نہ کوئی شکل ہوگی۔ اسے حقیقی آزادی اسی وقت نصیب ہوگی جب وہ انسانوں کی ہر قسم کی محکومی سے نکل کر صرف احکامِ خداوندی کی اطاعت اختیار کرے۔ اقبالؒ ہی کے الفاظ میں :۔

ہنوز اندر جہاں آدم غلام است — نظامش خام و کارش ناتمام است

غلامِ فقرِ آں گیتی پناہم — کہ در دینش ملوکیت حرام است

خلافت قائم کرنے والا، سب سے پہلے خود احکام و قوانینِ خداوندی کی اطاعت اختیار کرتا ہے۔ وہ اعلان کرتا ہے کہ اَنَا اَوَّلُ الْمُسْلِمِیْنَ (۶/۱۶۴) "سب سے پہلے میں اس کے احکام کے سامنے سرِ تسلیم خم کرتا ہوں"۔ اور پھر دوسروں سے اسی کے احکام کی اطاعت کراتا ہے۔ اسی کا نام الاسلام ہے۔ یہی نظام رسول اللہؐ نے قائم کیا۔ اسی کا اتباع حضرت صدیق اکبرؓ نے کیا، اور اسی روش پر حضرت فاروقِ اعظمؓ گامزن رہے، اور ہر موقعہ پر خلافت اور ملوکیت کے فرق کو نمایاں کر کے دکھاتے اور سمجھاتے رہے۔ زیرِ نظر کتاب میں جو کچھ آپ کے سامنے آئے گا، اجمالاً وہ ملوکیّت اور خلافت کے اسی بنیادی فرق کی تشریح ہوگی جس کی جھلک مختلف پہلوؤں سے وجہ فروغِ دیدہ و دل ہوگی۔ مثلاً فتح قادسیہ کے بعد حضرت عمرؓ نے اپنے خطبہ میں فرمایا :۔

> واللہ! میں کوئی بادشاہ نہیں ہوں کہ تمہیں اپنا غلام بنالوں۔ میں تو خود خدا کا غلام ہوں۔ اس نے میرے سپرد ایک امانت کر دی ہے۔ اگر میں اسے اس طرح استعمال کروں کہ تمہارا ہر طرح سے خیال رکھوں اور تمہیں گھر بیٹھے سیراب کردوں تو میں سعادت مند ہوں اور اگر میں اس امانت کو اٹھا کر اپنے گھر لے جاؤں تو میں سخت بدبخت ہوں گا کہ چند دن عارضی طور پر خوش ہولوں اور پھر ابدی غم و الم میرے حصے میں ہوں۔ میں جانتا ہوں کہ اس خیانت کے جرم سے مجھے کبھی معافی نہیں مل سکے گی اور نہ میں واپس بھیجا جاؤں گا کہ تمہیں آکر راضی کرلوں۔

خدا کی محکومی سے حاصل کیا ہوتا ہے، اسے حضرت عمرؓ نے ایک مختصر سے فقرہ میں ایسی جامعیت سے واضح کر دیا ہے کہ آپ جس قدر اس کی گہرائی میں جائیں وہ حقیقت عمیق سے عمیق تر ہوتی چلی جاتی ہے۔ ایک دن آپ اپنے رفقاء کے ساتھ

مصروفِ سفر تھے۔ ایک وادی سے گزرے تو بلا کچھ کہے اونٹ سے اُترے اور زمین پر سجدہ ریز ہو گئے۔ اٹھے تو آنکھیں اشکبار تھیں۔ ساتھیوں کے دریافت کرنے پر کہا کہ یہ وہ وادی ہے جس میں میں اونٹ چرایا کرتا تھا۔ باپ سخت گیر تھا۔ مجھ سے مشقت بھی لیتا تھا اور پیٹتا بھی تھا۔ وہ منظر سامنے آیا تو دل سے یہ آواز اُبھری کہ،

> عمرؓ! تو کس قدر خوش نصیب ہے۔ ایک دن وہ تھا اور ایک دن یہ ہے کہ آج تیرے اور میرے خدا کے درمیان کوئی قوت حائل نہیں۔ اس پر میرا سرِ نیاز بدرگاہِ ربّ العزت بیتابانہ تشکر کے لئے جھک گیا۔

یہ ہے نظامِ خلافت کا نتیجہ کہ "انسان اور اس کے خدا کے درمیان کوئی قوت حائل نہیں ہوتی"۔ یعنی انسان احکامِ خداوندی کے سوا کسی کا محکوم نہیں ہوتا۔ یہی تھا وہ جذبۂ تشکر جس کے متعلق حضرت انسؓ نے بیان کیا تھا کہ "میں عمرؓ کے ساتھ تھا کہ وہ ایک احاطہ میں داخل ہو گئے اور دیوار کے پیچھے سے میں نے انہیں یہ کہتے ہوئے سنا۔ خطابؓ کا بیٹا عمرؓ اور امیر المومنین! سبحان اللہ! خطاب کے چھوکرے، خدا سے ڈرو، ورنہ وہ تجھے ضرور اس کی سزا دے گا۔"

انھوں نے خلافت و ملوکیت کا یہ فرق محض اپنی تقاریر و خطبات کے ذریعے نہیں سمجھایا بلکہ اپنے اعمال و افعال اور سیرت و کردار سے اسے اس طرح نمایاں کر دیا کہ دوسرے بھی اسے اچھی طرح سمجھ گئے تھے۔ ایک دن آپ نے حضرت سلمان فارسیؓ سے پوچھا کہ میں بادشاہ ہوں یا خلیفہ؟ انہوں نے جواب میں کہا کہ "اگر آپ نے مسلمانوں سے ایک درہم، یا اس سے کم و بیش، وصول کیا اور اسے صحیح مقام پر صرف نہ کیا تو آپ بادشاہ ہیں، خلیفہ نہیں"۔ اس جواب پر حضرت عمرؓ کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ ایک اور روایت ہے کہ آپ نے کہا کہ "میں کہہ نہیں سکتا کہ میں بادشاہ ہوں یا خلیفہ۔ اگر بادشاہ ہوں تو اس سے بُری بات اور کیا ہو سکتی ہے؟" مجمع میں سے فوراً ایک شخص برجستہ بولا کہ "خلافت اور شہنشاہیت میں فرق ہے۔ خلیفہ عوام کے جملہ حقوق کا محافظ ہوتا ہے۔ وہ ہر انسان کا حق، حقدار کو دیتا ہے۔ وہ نہ ناجائز طور پر کسی سے کچھ لیتا ہے، نہ ناجائز خرچ کرتا ہے۔ الحمد للہ کہ آپ خلیفہ ہیں، بادشاہ نہیں۔ بادشاہ زبردستی کرتا ہے۔ ایک سے چھین کر دوسرے کو دیتا ہے"۔ عام مسلمانوں کے ذہن میں خلافت اور بادشاہت کا فرق اس قدر واضح تھا کہ جب روم کا سفیر مدینہ پہنچا اور اس نے دریافت کیا کہ تمہارا بادشاہ کہاں ہے، تو اسے یہ جواب ملا کہ " ما لنا ملك ـ بل لنا امير"۔ ہمارا کوئی بادشاہ نہیں۔ البتہ ہمارا امیر ہے...... یعنی ہمارے لئے صحیح راستے کی نشاندہی کر کے، خود بھی اس پر چلنے اور ہمیں بھی اس پر چلانے والا۔

آیئے، اب دیکھیں کہ اس انسانیت ساز اصول کو محسوس پیکروں میں کس طرح ڈھالا گیا تھا۔ اسی کا نام

سیرتِ فاروقیؓ ہے۔

حکمرانے بود و سامانے نداشت
دستِ اُو جُز تیغ و قرآنے نداشت
ایں دو قوّتِ حافظِ یک دیگر است
کائناتِ زندگی را محور اند!

(اقبالؒ)

چوتھا باب

حسبنا کتاب اللہ

دستِ او جز تیغ و قرآنے نداشت

تاریخ میں واقعۂ قرطاس کو بڑی اہمیت دی جاتی ہے، کہا یہ جاتا ہے کہ نبیٔ اکرمؐ نے اپنی وفات سے تین روز پہلے، جب آپؐ کو درد کی شدت تھی، فرمایا کہ قلم اور دوات لاؤ، میں تمہارے لئے ایسی چیز لکھ دوں گا جس کے بعد تم گمراہ نہیں ہو گے۔ اس پر حضرت عمرؓ نے لوگوں کو مخاطب کر کے کہا کہ آنحضرت کو درد کی شدت ہے اور ـــ حَسْبُنَا کِتَابُ اللّٰہِ ۱ ـــ ہمارے لئے خدا کی کتاب کافی ہے۔ حاضرین میں سے بعض نے یہ بھی کہا کہ حضورؐ اس وقت، بیماری کی شدت کی وجہ سے (معاذ اللہ) بہکی بہکی باتیں کر رہے ہیں۔

یہ ہے واقعہ قرطاس جو چودہ سو سال سے بحث و نزاع کا موضوع بنے چلا آ رہا ہے جس کی بنیاد فرقہ وارانہ اختلاف ہے۔ چونکہ ہم اس کتاب کو گروہ بندانہ تفریق و اختلاف سے بالا رکھنا چاہتے ہیں، اس لئے ہم اس نزاع میں اُلجھنا نہیں چاہتے۔ یہ روایت، بخاری میں موجود ہے لیکن علامہ شبلیؒ نے اس پر جو تنقید کی ہے۔ اس سے اس کی صحت ہی مشکوک ہو جاتی ہے۔ انہوں نے کہا ہے کہ اس (مبیّنہ) واقعہ کے وقت کثرت سے صحابہؓ موجود تھے لیکن اس کے متعلق، بجز حضرت عبداللہ بن عباسؓ کے، کسی سے ایک لفظ بھی منقول نہیں۔ حضرت عبداللہ ابن عباسؓ کی عمر اس وقت ۱۳۔ ۱۴ سال کی تھی اور تعجب یہ کہ وہ خود اس وقت وہاں موجود بھی نہیں تھے لیکن ہمارے نزدیک اس واقعہ کے

مشکوک ہونے کے لئے ایک اور دلیل سب سے قوی ہے اور وہ یہ کہ یہ واقعہ جمعرات کا بتایا جاتا ہے اور رسول اللہ اس کے بعد چار دن تک زندہ رہے (حضورؐ کی وفات سوموار کو ہوئی تھی) اور اس دوران میں آپؐ کی حالت بھی نسبتاً بہتر ہو گئی تھی۔ اگر آپؐ نے کچھ تحریر کرانا ہوتا تو اس کے لئے چار دن کی مدت موجود تھی لیکن اس سلسلہ میں کہیں ایک لفظ بھی مذکور نہیں کہ حضورؐ نے کچھ لکھا یا ہو یا اس واقعہ کی یاددہانی ہی کرائی ہو۔ اس کے برعکس، ان دنوں میں آپؐ نے اور بہت سی ہدایات ارشاد فرمائیں۔

لیکن قطع نظر اس واقعہ کے، حضرت عمرؓ نے اگر کسی سلسلہ میں بھی یہ الفاظ (حسبنا کتاب اللہ) کہے ہوں تو یہ مستبعد نہیں۔ یہ حقیقت (کہ ہمارے لئے خدا کی کتاب کافی ہے) خود قرآن کریم کے دعویٰ کے عین مطابق ہے۔ رسول اللہ کی بھی یہی تعلیم تھی اور حضرت عمرؓ کا عہد خلافت اس کی زندہ شہادت ہے۔

قرآن کی کفایت

دین کو قرآن کے اندر مکمل کر دیا گیا ہے۔ وَتَمَّتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ صِدْقًا وَّعَدْلًا ۚ لَا مُبَدِّلَ لِكَلِمٰتِهٖ ۚ (۶/۱۱۶) "تیرے رب کی باتیں صدق و عدل کے ساتھ مکمل ہو گئیں۔ کوئی ان میں تبدیلی نہیں کر سکتا۔" جو کچھ دین کے متعلق کہنا مقصود تھا، اسے اس کتاب میں کہہ دیا گیا۔۔۔ اس میں کسی قسم کی کمی نہیں رہ گئی۔ مَا فَرَّطْنَا فِي الْكِتٰبِ مِنْ شَيْءٍ ۔ (۶/۳۸) "ہم نے الکتاب[1] میں کسی بات میں نہیں چھوڑا۔" یہ کتاب ہر بات کو نہایت وضاحت سے بیان کرتی ہے۔ وَنَزَّلْنَا عَلَيْكَ الْكِتٰبَ تِبْيَانًا لِّكُلِّ شَيْءٍ ۔ (۱۶/۸۹) "اور ہم نے، اے رسول! تیری طرف یہ کتاب نازل کی ہے جو ہر شے کو نہایت وضاحت سے بیان کر دیتی ہے۔" جماعت مومنین سے بصراحت کہا گیا تھا کہ اِتَّبِعُوْا مَآ اُنْزِلَ اِلَيْكُمْ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَلَا تَتَّبِعُوْا مِنْ دُوْنِهٖٓ اَوْلِيَآءَ (۷/۳) "جو کچھ خدا نے تمہاری طرف نازل کیا ہے، اس کا اتباع کرو۔ اس کے سوا کسی بڑے کا اتباع مت کرو۔" خود رسول اللہ سے بھی یہی ارشاد ہوا جب کہا کہ وَاتَّبِعْ مَا يُوْحٰٓى اِلَيْكَ ۔ (۱۰/۱۰۹) "جو کچھ تیری طرف وحی کیا جاتا ہے اس کا اتباع کرو۔" خود بھی اسی کا اتباع کرو اور دوسروں کے معاملات کے فیصلے بھی اسی کے مطابق کرو۔ فَاحْكُمْ بَيْنَهُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ ۔ (۵/۴۸) "جو کچھ خدا نے نازل کیا ہے اس کے مطابق لوگوں کے معاملات کے فیصلے کیا کرو۔"

---

[1] الکتاب میں صحیفۂ فطرت بھی شامل ہے اور انسانوں کے لئے ضابطہ قوانین (قرآن مجید) بھی۔

یہ تھی قرآن کی پوزیشن جس کے پیشِ نظر کہا گیا تھا کہ:-

اَوَلَمْ یَکْفِهِمْ اَنَّآ اَنْزَلْنَا عَلَیْکَ الْکِتٰبَ یُتْلٰی عَلَیْهِمْ ..... (۲۹/۵۱)

کیا ان لوگوں کے لئے یہ کافی نہیں کہ ہم نے تیری طرف یہ کتاب نازل کر دی ہے، جسے ان کے سامنے پیش کیا جاتا ہے۔

حضرت عمرؓ نے اگر "حسبنا کتاب اللہ" فرمایا تھا، تو وہ قرآن کریم کے اسی استفہام ــــ اَوَلَمْ یَکْفِهِمْ ــــ کا مثبت جواب تھا۔ یعنی خدا نے یہ کہا تھا کہ کیا ان کے لئے یہ کتاب کافی نہیں، تو (جیسا کہ ہر مسلمان کو کہنا چاہیئے) حضرت عمرؓ نے اس کا جواب اثبات میں دیتے ہوئے کہا تھا کہ حسبنا کتاب اللہ۔ ہاں! ہم اس کا اقرار و اعلان کرتے ہیں کہ ہمارے لئے خدا کی کتاب کافی ہے۔

اور یہی وہ اعلان تھا جسے نبی اکرمؐ نے، حجۃ الوداع کے خطبہ میں، قریب ایک لاکھ بیس ہزار کے مجمع کے سامنے ان الفاظ میں فرمایا تھا کہ

قد ترکت فیکم ما تضلوا بعدہ ان اعتصمتم بہ ـ کتاب اللہ۔

(بخاری۔ باب حجۃ الوداع)

میں تم میں ایک ایسی چیز چھوڑ چلا ہوں کہ اگر تم نے اسے تھامے رکھا، تو تم کبھی گمراہ نہیں ہو گے وہ ہے کتاب اللہ۔

لہٰذا، حضرت عمرؓ کا یہ اعلان کہ حسبنا کتاب اللہ ــــ اسی فرمانِ نبویؐ کی صدائے بازگشت تھا۔ یہی اتباعِ رسالت کا تقاضا تھا ــــ اور اسی نشیدِ حیات آور کے دوبارہ سننے کی تڑپ تھی جو علامہ اقبالؒ کے لبوں پر ان الفاظ میں آگئی تھی کہ "ضرورت ہے کہ عالمِ اسلامی، قانون سازی کے سلسلہ میں عمرؓ کی روح کو ساتھ لیکر بڑھے ــــ وہ عمرؓ جو اسلام میں پہلا تنقیدی اور آزاد ذہن تھا اور جس نے نبی اکرمؐ کی حیاتِ ارضی کے آخری لمحات میں یہ کہنے کی اخلاقی جرأت کا ثبوت دیا تھا کہ حسبنا کتاب اللہ[1]"۔ حقیقت یہ ہے کہ اسلام کے صدرِ اوّل میں، اُمّت (جماعتِ مومنین) کا مسلک ہی تمسک بالقرآن تھا، حتیٰ کہ وہ میدانِ جنگ میں، جامِ شہادت نوش کرتے ہوئے بھی اسی کا اعادہ کرتے تھے۔ جنگِ یمامہ (عہدِ صدیقیؓ) میں حضرت ابوحذیفہؓ پکار پکار کر کہتے تھے کہ

---

[1] خطباتِ تشکیلِ جدید۔ (انگریزی آکسفورڈ ایڈیشن، صفحہ ۱۵۴)

اے اہلِ قرآن! اپنے اعمال سے قرآن کی عزت افزائی کا موجب بنو۔

اور جب وہ شہید ہو گئے اور علم، ان کے (غلام) حضرت سالمؓ نے اٹھایا تو فرمایا کہ

اگر میں آج ثابت قدم نہ رہوں تو میں بدترین حاملِ قرآن ہوں گا۔ ("ابوبکر" از ہیکل)

اور اسی پکار کے ساتھ وہ بھی داخلِ فردوسِ بریں ہو گئے۔ ان حضرات کی محیّرالعقول کامیابیوں کا راز انہی نعروں میں تھا۔

حضرت عمرؓ کا مسلک

ہم دیکھ چکے ہیں کہ حضرت عمرؓ نے اپنے پہلے خطبہ خلافت میں اپنے لئے یہ دعا مانگی تھی کہ

یا اللہ! مجھے تفکّر و تدبّرِ قرآنی عطا فرما تاکہ میں جو کچھ قرآن سے پڑھوں اسے اچھی طرح سمجھ سکوں اور اس کے نوادرات پر غور کر سکوں۔

اور سامعین سے کہا تھا کہ

قرآن پڑھا کرو۔ اسی سے تمہاری قدر و منزلت ہوگی اور اسی پر عمل کرو تاکہ تم حاملِ قرآن ہو جاؤ۔

یہی ان کی مملکت کا منشور تھا۔ "وہ ہمیشہ آیاتِ قرآنی کی حکمت و غایت دریافت کرنے کی کوشش میں سرگرداں رہتے تھے[1]۔" اور لوگوں کو تاکید کیا کرتے تھے کہ وہ قرآن پڑھا کریں اور اس کے معانی پر غور و فکر کیا کریں[2]۔ آپ احکامِ قرآنی کی تعیین میں کس قدر احتیاط برتتے تھے، اس کا اندازہ اس ایک واقعہ سے لگایئے کہ ایک دفعہ ایک بدو نے آپ سے کہا کہ میں نے حالتِ احرام میں ایک ہرن مار ڈالا ہے۔ اب میں کیا کروں۔ حضرت عبدالرحمٰنؓ بن عوف پاس بیٹھے تھے۔ آپ نے ان سے کہا کہ کہئے! آپ کی اس باب میں کیا رائے ہے۔ انہوں نے کہا کہ یہ ایک بکری فدیہ میں دے دے۔ آپ نے کہا کہ ٹھیک ہے۔ میری بھی یہی رائے تھی۔ چنانچہ آپ نے بدو کو یہ فیصلہ سنا دیا۔ اس نے فیصلہ سن کر کہا کہ میں سمجھ نہیں سکا کہ امیرالمومنین کو اتنا سا مسئلہ بھی نہیں آتا تھا کہ اس نے دوسرے شخص سے فتویٰ طلب کیا۔ آپ نے کہا کہ بات یہ نہیں۔ بات یہ ہے کہ قرآنِ کریم میں ہے کہ اس امر کا فیصلہ ذَوَا عَدْلٍ مِّنْكُمْ۔ (۵/۹۵) کریں۔ یعنی دو صاحب عدل۔ سو میرے لئے ضروری تھا کہ میں، ایک اور صاحبِ عدل کو بھی اپنے ساتھ شامل کرتا۔ سو میں عمرؓ ابن خطاب ہوں اور یہ عبدالرحمٰنؓ بن عوف ہیں۔

وہ امورِ مملکت میں اپنے مشیروں سے مشورہ لیتے تو ان سے واضح الفاظ میں کہہ دیتے کہ "میں یہ نہیں چاہتا کہ

---

[1] القضاء فی الاسلام۔ [2] (الاغانی)

آپ میری بات مانیں۔ آپ لوگوں کے پاس کتاب اللہ ہے جو حق کو صاف صاف بیان کرتی ہے۔ آپ اس کے مطابق مشورہ دیں"۔ آپ کے عہد میں عمّالِ حکومت کے انتخاب کا اوّلین معیار یہ تھا کہ وہ کس حد تک قرآن جانتے ہیں۔ جب مکّہ کے گورنر نافع بن عمر بن عبدالحارث نے عبدالرحمٰن بن ابزیؓ کو وادی کا حاکم مقرر کیا تو آپ نے اس (گورنر) سے پوچھا کہ اس انتخاب کی بنیاد کیا ہے۔ اس پر گورنر نے کہا کہ وہ شخص "قرآن کا قاری اور فرائضِ دین کا عالم ہے"۔ تو آپ خوش ہوئے۔ واضح رہے کہ اس زمانے میں قاری سے مراد قرآن کو محض صحیح تلفظ کے ساتھ پڑھنے والا نہیں تھا۔ اس سے مراد قرآن میں تفقہ کرنے والا تھا۔ چنانچہ آپ نے ایک مرتبہ اپنے گورنروں سے خطاب کرتے ہوئے کہا تھا کہ "میں دیکھ رہا ہوں کہ وہ زمانہ قریب آرہا ہے جب قرآن کے قاری تو بہت ہوں گے لیکن فقیہہ بہت کم ہوں گے"۔ ایک اور موقعہ پر فرمایا کہ "لوگو! قرآن پڑھو۔ قرآن دانی کی بنا پر تم میں امتیاز کیا جائے گا۔ قرآن پر عمل کرو اور اس طرح اہلِ قرآن کہلاؤ"۔ لیکن اس کے ساتھ ہی وہ انہیں اس کی تنبیہہ بھی کرتے رہتے تھے کہ قرآن خوانی سے مقصد حصولِ اجرِ خداوندی ہونا چاہیئے چنانچہ ایک خطبہ میں آپ نے فرمایا۔

> ایک وقت تھا جب میں سمجھا کرتا تھا کہ جو شخص بھی قرآن پڑھتا ہے وہ اللہ، اور جو کچھ اللہ کے پاس ہے اس کا طالب بن کر قرآن پڑھتا ہے لیکن اب میں دیکھتا ہوں کہ بعض لوگ اس لئے بھی قرآن پڑھتے ہیں کہ اس طرح مخلوقِ خدا سے کچھ حاصل کر لیں۔ سنو! قرآن پڑھو تو صرف اجرِ خداوندی کے متلاشی بنو اور اپنے ہر عمل کا مقصود اسی اجر کو ٹھہراؤ۔

سب تمہارے لئے، تم اللہ کے لئے

صرف "اللہ کے ہاں سے اجر" (للہ) سے کیا مراد ہے' اسے آپ نے دو جملوں میں اس حسن و جامعیّت سے واضح کر دیا کہ اس سے نگہ بصیرت میں چمک پیدا ہو جاتی ہے۔ آپ نے قرآنِ کریم کی آیت — سَخَّرَ لَكُمْ مَّا فِي السَّمٰوٰتِ وَ مَا فِي الْاَرْضِ...... (زمین و آسمان میں جو کچھ ہے خدا نے اسے تمہارے لئے مسخّر کر رکھا ہے) کی تفسیر بیان کرتے ہوئے کہا کہ "یاد رکھو! خدا نے ساری مخلوق کو تمہارے لئے پیدا کیا ہے اور تمہیں اپنے لئے"۔ "اپنے لئے" سے مراد ہے خدا کے پروگرام کی تکمیل کے لئے۔ اس سے مومن کی زندگی کا مطلوب و مقصود اور مآل و منتہیٰ نکھر کر سامنے آجاتا ہے اور یہی مطلب ہے خدا کے ہاں سے اجر پانے کا۔

وَاللّٰهُ اَعْلَمُ مت کہو

حضرت عمرؓ کی مجلس میں اکثر قرآنی آیات کے حقائق و غوامض کے متعلق بحثیں ہوتی رہتی تھیں۔ انہی مجالس میں سے ایک کا ذکر ہے کہ ایک آیت زیرِ غور آئی تو لوگوں

نے واللہ اعلم کہہ دیا۔ (یعنی خدا بہتر جانتا ہے) آپ کو اس جواب پر سخت غصہ آیا اور کہا کہ اگر تمہیں کسی بات کا علم نہیں تو صاف صاف کہو کہ میں نہیں جانتا۔ واللہ اعلم کہنے کا کیا مطلب؟ اس کے بعد آپ نے دیکھا کہ حضرت عبداللہ بن عباسؓ کچھ کہنا چاہتے ہیں لیکن معمر صحابہؓ کی موجودگی میں اپنی کم عمری کی وجہ سے کچھ متامل سے ہیں۔ آپ نے ان کی حوصلہ افزائی فرمائی اور کہا کہ علم کے معاملہ میں عمر کا کوئی لحاظ نہیں ہو سکتا۔ جو کچھ کہنا چاہتے ہو بلا جھجک کہو۔ اسی بنا پر بخاری میں ہے کہ "حضرت عمرؓ کے اہل مجلس و مشاورت ارباب علم و بصیرت تھے، خواہ بوڑھے ہوں اور خواہ جوان"۔

قرآن سن کر غصہ اتر جاتا

قرآن کے ساتھ آپ کی شیفتگی کا یہ عالم تھا کہ حضرت عبداللہ بن عمرؓ فرماتے ہیں کہ کبھی ایسا نہیں ہوا کہ آپ کو غصہ آیا ہو اور سامنے سے کسی نے قرآن کی آیت پڑھ دی ہو تو آپ کا غصہ فرو نہ ہو گیا ہو۔ ایک مرتبہ حضرت بلالؓ نے حضرت اسلمؓ سے آپ کا (حضرت عمرؓ کا) حال پوچھا۔ انہوں نے کہا کہ اس میں شبہ نہیں کہ آپ تمام انسانوں سے بہتر ہیں لیکن جب آپ کو غصہ آجاتا ہے، تو غضب ہو جاتا ہے۔ حضرت بلالؓ نے کہا کہ اس وقت تم کوئی آیت کیوں نہیں پڑھ دیا کرتے کہ سارا غصہ اتر جائے۔

وہ چلتے پھرتے لوگوں سے کچھ نہ کچھ نصیحت کرتے رہتے اور اس کے ساتھ قرآن کی آیت پڑھتے (مثلاً) ایک دفعہ فرمایا کہ تین باتوں کا اللہ خود ضامن ہے۔ ان کے بارے میں کبھی وعدہ خلافی نہیں ہو سکتی۔

إِنَّ اللَّهَ لَا يُضِيعُ أَجْرَ الْمُحْسِنِينَ ۔ (۹/۱۲۰)

اللہ محسنین کے اجر کو ضائع نہیں کرتا۔

أَنَّ اللَّهَ لَا يَهْدِي كَيْدَ الْخَائِنِينَ (۱۲/۵۲)

خدا مکاروں کی مکاری کے لئے کشاد کی راہ نہیں نکالتا۔

إِنَّ اللَّهَ لَا يُصْلِحُ عَمَلَ الْمُفْسِدِينَ ۔ (۱۰/۸۱)

اللہ فساد انگیزوں کے پروگرام کو کبھی نہیں سنوارتا۔

قرآن سے استنباطِ نتائج

آپ کو قرآن فہمی کا کس قدر بہرۂ وافر عطا ہوا تھا، اور قرآنی اصولوں سے استنباطِ نتائج و ترتیبِ جزئیات میں آپ کس ژرف نگہی سے کام لیتے تھے، اس کی مثالیں آگے چل کر جہاں آپ کا قائم کردہ سیاسی اور معاشی نظام سامنے آئے گا، قدم قدم پر ملیں گی۔ اس وقت ہم، اس نکتہ کی وضاحت کے دو ایک مثالوں پر اکتفا کریں گے۔

(۱) جب عراق فتح ہوا تو اس کی مزروعہ اراضی کے وسیع رقبات مسلمانوں کے ہاتھ میں آئے۔ اس سے

پہلے ایسا اتفاق کہیں نہیں ہوا تھا۔ اس وقت تک کے عام دستور کے مطابق، مجاہدین نے مطالبہ کیا کہ ان قطعاتِ اراضی کو، دیگر مالِ غنیمت کی طرح، ان (مجاہدین) میں تقسیم کر دیا جائے۔ حضرت عمرؓ کی نگہ دوررس قرآن کی اس حقیقت تک پہنچ چکی تھی کہ ذرائع پیداوار تمام نوعِ انسان کے لئے یکساں طور پر کھلے رہنے چاہئیں۔ اس لئے ان زمینوں کو مملکت کی تحویل میں رہنا چاہیئے۔ انفرادی ملکیّت میں نہیں دے دینا چاہیئے۔ چنانچہ آپ نے اس مطالبہ کی مخالفت کی۔ مجلسِ شوریٰ میں بھی دو گروہ پیدا ہو گئے — ایک ان اراضیات کی تقسیم کے حق میں تھا، دوسرا حضرت عمرؓ سے متفق۔ معاملہ کی اہمیّت کے پیشِ نظر اس پر بڑی تفصیلی بحث ہوتی رہی اور یہ سلسلہ کئی دنوں تک چلا۔ حضرت عمرؓ نے فیصلہ تک پہنچنے کے لئے مہلت طلب کی تاکہ اس پر اچھی طرح سے غور و فکر کر لیا جائے۔ کچھ دنوں کے غور و تدبّر کے بعد، آپ نے پھر مجلس کا اجلاس منعقد کیا اور اپنے رفقاء سے کہا کہ میں نے اس معاملہ کے ہر پہلو پر انتہائی غور و فکر کیا اور اللہ کا شکر ہے کہ مجھے بالآخر قرآنِ مجید سے راہنمائی مل گئی۔ سورۂ حشر میں جہاں مالِ فے کی تقسیم کے متعلق تفصیلی ہدایات دی گئی ہیں وہاں ان گروہوں کا ذکر کرنے کے بعد جو اس وقت ہم میں موجود ہیں، یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس میں ان لوگوں کا بھی حصّہ ہے۔ وَالَّذِيْنَ جَآءُوْ مِنْۢ بَعْدِهِمْ۔ (۵۹/۱۰) جو ان کے بعد آئیں۔ اب ظاہر ہے کہ اگر ان اراضیات کو افراد کی ذاتی ملکیّت میں دے دیا جائے تو ان میں آنے والی اُمّت کا حصّہ نہیں رہ سکتا۔ یہ اسی صورت میں ممکن ہے کہ یہ مملکت کی تحویل میں رہیں اور ان کی پیداوار سے مملکت، موجودہ افرادِ معاشرہ کے رزق کا انتظام کرے اور یہ سلسلہ اسی طرح آگے بھی بڑھتا جائے۔ آپ کے الفاظ یہ تھے کہ وَالَّذِيْنَ جَآءُوْ مِنْۢ بَعْدِهِمْ سے مراد اولادِ آدم ہے خواہ وہ کالے ہوں یا گورے۔ یہاں اللہ نے بعد میں آنے والوں کو بھی مالِ غنیمت میں قیامت تک کے لئے شریک کر دیا ہے اور اس کی عملی شکل یہی ہو سکتی ہے کہ ان اراضیات کو افراد کی ذاتی ملکیّت میں نہ دیا جائے۔" صحابہؓ اس دلیل سے مطمئن ہی نہیں، بہت خوش ہوئے اور اراضیات افراد میں تقسیم نہ کی گئیں۔

یہ تھا قرآنی اصولوں کی روشنی میں حضرت عمرؓ کے تفقہ اور اجتہاد کا انداز! (تفصیل اس واقعہ کی معاشی نظام سے متعلق عنوان میں ملے گی)

مسئلۂ تقدیر

(۲) تقدیر کا مسئلہ اس قدر پیچیدہ اور پریشان کن ہے (یا ایسا بنا دیا گیا ہے) کہ حکمائے یونان کے زمانہ سے لے کر اب تک یہ دنیائے مذاہب اور جہانِ فلسفہ میں باعثِ ہزار ردِ دسری بنا رہا ہے (اور بنا ہوا ہے) اور کیفیّت اب تک یہ ہے کہ — ڈور کو سلجھا رہے ہیں اور سرا

ملتا نہیں ـــــ میں نے اس مشکل ترین مسئلہ کو (اپنی بصیرت کے مطابق) قرآن کریم کی روشنی میں، اپنی تصنیف۔ کتاب التقدیر۔ میں حل کرنے کی کوشش کی ہے اور ارباب فکر و نظر نے میری اس کوشش کو سراہا ہے۔ یہاں نہ اس کی فرصت ہے، نہ موقعہ کہ میں اس مسئلہ کی تفصیلات میں جاؤں۔ میں یہاں مختصر الفاظ میں اتنا کہنے پر اکتفا کروں گا کہ (قرآن کریم کی رُو سے) اللہ تعالٰے نے کچھ غیر متبدل قوانین متعین فرماتے ہیں جن کے مطابق انسانی اعمال کے نتائج مرتب ہوتے ہیں اور انسان کو اس کا اختیار دیا گیا ہے کہ وہ ان قوانین کے مطابق راستہ اختیار کرے یا ان سے انحراف برتے۔ اگر وہ ان کے مطابق روش اختیار کرے گا تو اس کا نتیجہ خوشگوار اور تعمیری ہوگا۔ اگر ان کی خلاف ورزی کرے گا تو اس کا نتیجہ تباہی ہوگا۔ بالفاظِ دیگر، انسان کے سامنے دو ممکنات (POSSIBILITIES) ہوتی ہیں۔ اور اسے اس کا اختیار دیا گیا ہے کہ وہ ان میں سے جسے چاہے اختیار کرلے۔ ان ممکنات کو تقدیراتِ الٰہی کہا جاتا ہے۔ یہ تقدیرات اٹل ہیں لیکن ان میں سے کسی ایک کو منتخب کرنے کی حد تک انسان صاحبِ اختیار ہے اور اپنے اس اختیار و انتخاب کی بنا پر اپنے فیصلوں اور اعمال کا ذمہ دار۔

آپ غور فرمایئے کہ آج سے چودہ سو سال پہلے حضرت عمرؓ نے تقدیر کے اس قرآنی مفہوم کو کس عمدگی سے سمجھا اور کس حسن و خوبی سے اپنے رفقاء کو سمجھایا تھا۔ ہؤا یوں کہ ایک دفعہ آپ شام کے سفر کے لئے مدینہ سے روانہ ہوئے۔ جب راستے میں تبوک کے قریب پہنچے تو ادھر سے اطلاع موصول ہوئی کہ شام اور اس کے گرد و نواح کے علاقہ میں طاعون، وبا کی صورت میں پھوٹ پڑی ہے اور لوگ ہزاروں کی تعداد میں روزانہ لقمۂ اجل بن رہے ہیں۔ آپ وہیں رُک گئے اور سوال پیدا ہؤا کہ آپ کو آگے جانا چاہیئے یا نہ۔ رفقاء میں اختلاف پیدا ہوگیا۔ ایک گروہ نے کہا کہ آپ شام کی طرف ایک مقدس اور بلند و بالا مقصد کے لئے راہ پیما ہیں۔ وبا کو آپ کے راستے میں حائل نہیں ہونا چاہیئے۔ موت تو قضاء الٰہی سے آتی ہے۔ دوسرے گروہ کا خیال تھا کہ آپ کو صحابہؓ کی اتنی بڑی جماعت کے ساتھ اس طرح موت کے مُنہ میں نہیں جانا چاہیئے۔ آپ نے معاملہ پر ٹھنڈے دل سے غور کیا اور علی الصباح اعلان کردیا کہ میں واپس جارہا ہوں۔ تم بھی واپس چلو۔

حضرت ابوعبیدہؓ کو اس فیصلہ کا علم ہؤا تو آپ نے حضرت عمرؓ سے کہا کہ "عمر! کیا تقدیرِ الٰہی سے فرار اختیار کرتے ہو؟" اب وہ جواب سامنے آتا ہے جس کے لئے ہم نے یہ واقعہ بیان کیا ہے۔ آپ نے فرمایا کہ "ابوعبیدہ! کاش کوئی اور یہ بات کہتا۔ میں تقدیرِ الٰہی سے تقدیرِ الٰہی کی طرف فرار کررہا ہوں"۔

اس جواب کے چار الفاظ تقدیر جیسے مشکل ترین مسئلہ کو جس ایجاز اور حسن و خوبی سے حل کرکے رکھ دیتے ہیں،

اس کی داد اہلِ فکر و نظر ہی دے سکتے ہیں۔ اقبالؒ نے اسی بصیرتِ فاروقیؓ سے کسبِ ضیاء کرتے ہوئے جاوید نامہ میں کہا ہے کہ

گر ز یک تقدیر خوں گردد جگر خواہ از حق حکمِ تقدیرِ دگر
تو اگر تقدیرِ نو خواہی رواست زانکہ تقدیراتِ حق لاانتہاست

حضرت عمرؓ نے اپنے اس جامع اور مانع فقرہ ہی پر اکتفا نہیں کیا بلکہ اس کی وضاحت کے لئے کہا کہ "ابو عبیدہ! ذرا غور کرو کہ اگر تمہارے پاس کچھ اونٹ ہوتے اور تم انہیں ایسی وادی میں لے جاتے جس کا ایک حصہ سرسبز و شاداب اور دوسرا حصہ بنجر ہوتا۔ تم اگر اپنے اونٹوں کو بنجر علاقہ میں چھوڑتے تو کیا یہ تقدیرِ الٰہی کے مطابق نہ ہوتا؟ اور اگر انہیں سرسبز و شاداب رقبہ کی طرف لے جاتے، تو کیا یہ بھی تقدیرِ الٰہی کے مطابق نہ ہوتا؟" کس قدر بلیغ ہے یہ انداز بات سمجھانے کا! تقدیر جیسے پیچیدہ ترین مسئلہ کا قرآن کریم کی روشنی میں اس آسانی سے سمجھ لینا اور پھر اسے اس انداز سے سمجھانا، دستِ پروردگانِ رسالتؐ ہی کا حصہ ہو سکتا تھا!

رزق خدا کے ہاتھ میں ہے کا مفہوم

(۲) ہمارے ہاں عام عقیدہ ہے کہ رزق کو اللہ تعالیٰ نے اپنے ہاتھ میں رکھا ہے۔ وہ جسے چاہے اور جتنا چاہے عطا کر دے۔ انسان کی سعی و کاوش سے کچھ نہیں ہوتا۔ یہ بھی درحقیقت تقدیر ہی کے غیر قرآنی تصور کا پیدا کردہ عقیدہ ہے۔ قرآن کریم نے اس عقیدہ کی واضح الفاظ میں تردید کر دی جب کہا کہ وَإِذَا قِيلَ لَهُمْ أَنفِقُوا مِمَّا رَزَقَكُمُ اللَّهُ قَالَ الَّذِينَ كَفَرُوا لِلَّذِينَ آمَنُوا۔ جب ان لوگوں سے جو ابدی صداقتوں کے قائل نہیں، کہا جاتا ہے کہ جو کچھ خدا نے سامانِ زیست عطا کر رکھا ہے، اسے دوسروں کی ضروریات کے لئے کھلا رکھو، تو وہ جواب میں کہتے ہیں کہ أَنُطْعِمُ مَن لَّوْ يَشَاءُ اللَّهُ أَطْعَمَهُ۔ تم کیا کہتے ہو؟ اگر خدا کو منظور ہوتا کہ یہ لوگ بھوکے نہ رہیں، تو وہ انہیں خود روٹی کھلا دیتا۔ یہ جو بھوکے ہیں تو اس سے ظاہر ہے کہ خدا انہیں روٹی دینا چاہتا ہی نہیں۔ اس لئے تم، ہم سے ایسی بات کس طرح کہتے ہو جو منشاءِ مشیّتِ خداوندی کے خلاف ہے! اس کے جواب میں قرآن نے صرف اتنا کہا کہ ان سے کہہ دو کہ إِنْ أَنتُمْ إِلَّا فِي ضَلَالٍ مُّبِينٍ۔ (۳۶/۴۷) تم کھلی ہوئی گمراہی کی باتیں کر رہے ہو۔ بات بالکل واضح ہے یعنی اس جہانِ اسباب و ذرائع میں، خدا کسی کو براہِ راست روٹی نہیں دیتا۔ اس نے سامانِ رزق پیدا کر دیا ہے لیکن اس کی تقسیم انسانوں کے اختیار پر رکھ دی ہے۔ اس طرح وہ محتاجوں کے رزق کا بندوبست دوسرے انسانوں کے ہاتھوں

کرتا ہے۔ اس انتظام خداوندی کی آخری اور مکمل شکل اسلامی مملکت کی صورت میں سامنے آتی ہے جو ان تمام ذمہ داریوں کو پورا کرنے کا فریضہ ادا کرتی ہے جن کا وعدہ خدا نے انسانوں سے کر رکھا ہے۔ چنانچہ اس سلسلہ میں حضرت عمرؓ کا یہ قول نہایت عمدگی سے منشائے خداوندی کی وضاحت کرتا ہے۔ آپ نے فرمایا۔

> اے لوگو! تم میں سے کوئی شخص رزق کی طلب و جستجو سے فارغ ہو کر نہ بیٹھ جائے اور یہ کہتا رہے کہ اے اللہ! مجھے رزق دے۔ یاد رکھو! آسمان سے کوئی من نہیں برستا۔ اللہ ایک انسان کو دوسرے انسان کے ہاتھوں رزق پہنچاتا ہے۔

اسی سلسلہ میں ایک دفعہ آپ نے کہا کہ :-

> متوکل وہ ہے جو زمین میں دانہ ڈالتا ہے اور پھر خدا (کے قانون) پر بھروسہ کرتا ہے۔

علماء و مشائخ کا اتباع نہ کرو

آپ جانتے تھے کہ جب تک مسلمانوں کی فکر و نظر کا محور اور اعمال و افعال کا مرکز، قرآن مجید رہے گا، یہ صحیح راستے سے نہیں بھٹکیں گے۔ اگر انہوں نے اسے چھوڑ کر، انسانی خیالات و نظریات کو اپنے لئے وجۂ کشش قرار دے لیا تو پھر انہیں تباہی سے کوئی نہیں بچا سکے گا۔ اس لئے وہ اس باب میں بہت محتاط رہتے تھے۔ ایک دفعہ ایک شخص آپ کے پاس آیا اور کہنے لگا کہ امیر المومنین! جب ہم نے مدائن فتح کیا تو میرے ہاتھ ایک کتاب لگی جس میں بڑی اچھی باتیں لکھی ہیں۔ آپ نے فرمایا کہ "کیا قرآن سے بھی زیادہ اچھی؟ اس پر اس نے کہا کہ نہیں! تو آپ نے فرمایا کہ :-

> یاد رکھو! تم سے پہلی اُمتیں اس وجہ سے برباد ہوئیں کہ وہ اپنے احبار و رہبان (علماء و مشائخ) کی کتابوں پر ٹوٹ پڑیں اور خدا کی کتابوں کو چھوڑ دیا۔ نتیجہ اس کا یہ کہ خدا کی کتابیں مٹ گئیں اور اس طرح دین ان کے ہاں سے ضائع ہو گیا۔ تم ایسا نہ کرنا۔

اس سے یہ نہ سمجھ لیا جائے کہ آپ انسانی علوم حاصل کرنے کی مخالفت کرتے تھے۔ قطعاً نہیں۔ انسانی علوم کی تحصیل کے سلسلہ میں تو آپ کا یہ عالم تھا کہ (جیسا کہ ہم پہلے دیکھ چکے ہیں) آپ جہاں جاتے، وہاں کے علماء و حکماء سے التزاماً ملتے۔ مدینہ میں آپ یہودیوں کی مجالس میں شرکت کرتے۔ حتیٰ کہ آپ نے ان کی کتابوں کو براہ راست سمجھنے کے لئے عبرانی زبان بھی سیکھ لی تھی۔ آپ نے جو کچھ اس شخص سے کہا تھا۔ اس کی بنیاد ایک بلیغ حکمت پر

بھی۔ انسانی خیالات و نظریات کا علم حاصل کرنا اس شخص کے لئے مفید ہو سکتا ہے جو ان کا مطالعہ تنقیدی نگاہ سے کر سکنے کے قابل ہو جسے اس قدر صلاحیت حاصل نہ ہو، وہ غلط اور صحیح اور حق و باطل میں تمیز نہیں کر سکے گا۔ اس لئے ہو سکتا ہے کہ دوسروں کے باطل خیالات کی رَو میں بہہ جائے۔ عوام کے لئے یہی راہ صواب ہوتی ہے کہ وہ اپنی انفرادی اور اجتماعی زندگی کے مرکز کے ساتھ متمسک رہیں۔ یہی حضرت عمرؓ نے اس شخص سے کہا تھا۔ مسلمانوں کے فکر و عمل کا مرکز کتاب اللہ ہے اور اعتصام بکتاب اللہ ہی سے وہ اس منزل تک پہنچ سکتے ہیں جو ان کی زندگی کا منتہٰی و مقصود ہے۔

قوموں کی موت و حیات کے فیصلے

مسلمان ہی نہیں، ان پر تو یہ حقیقتِ کبریٰ بھی روزِ روشن کی طرح واضح ہو گئی تھی کہ اب عدالتِ خداوندی کے میز پر ایک ہی کتاب ہے جس کے مطابق قوموں کے عروج و زوال اور اُمتوں کی موت و حیات کے فیصلے ہوتے ہیں اور وہ ہے القرآن العظیم۔ چنانچہ آپ کا یہ ارشاد، ہمارے ہاں کلاسک کی طرح مشہور و منقوش ہے کہ

اِنَّ اللّٰہ یرفع بالقرآن اقواما و یضع بالقرآن اقواما (ازالۃ الخفاء)

خدا، اس قرآن میں عطا کردہ اصولوں کے مطابق بعض قوموں کو بلندیاں عطا کر دیتا ہے اور بعض کو پستیوں میں گرا دیتا ہے۔

وصیّت

قرآنِ کریم کی اہمیّت و عظمت آپ کے رگ و پے میں اس شدّت سے سرایت کئے ہوئی تھی کہ جب آپ کو وہ زخم لگا ہے جس سے آپ کی شہادت واقعہ ہو گئی تو کیفیّت یہ تھی کہ آپ کی انتڑیاں کٹ کر باہر آ چکی تھیں۔ جسم سے خون کے فوارے چھوٹ رہے تھے۔ درد کی شدّت انتہا تک پہنچ چکی تھی۔ نقاہت بڑھتی جا رہی تھی۔ اس حالت میں صحابہؓ آپ کے گرد جمع ہوئے اور آپ سے کہا کہ آپ اپنی وصیت فرما دیجئے تو آپ نے ان سے کہا کہ

میں تمہیں وصیت کرتا ہوں کہ کتاب اللہ کو تھامے رہنا کیونکہ جب تک تم اسے تھامے رہو گے، گمراہ نہیں ہو گے۔

اسی حالت میں ایک شخص آپ کی عیادت کے لئے آیا۔ اس نے دیکھا کہ آپ آخرت کے خیال سے مضطرب و بیقرار ہیں اور بار بار اس کا احساس کرتے ہیں کہ جو ذمہ داریاں خدا نے مجھے سونپی تھیں، معلوم نہیں میں ان سے عہدہ برآ ہو سکا ہوں یا نہیں۔ اس نے کہا کہ آپ اس باب میں متردد نہ ہوں جہنّم کی آگ آپ کے جسم کو مس تک نہ کر سکے گی۔

آپ نے اس کی طرف دیکھا۔ آپ کی آنکھوں میں آنسو چھلک رہے تھے اور کہا کہ نہ بھائی! تمہارا علم اس معاملہ میں بہت قلیل ہے۔ میرے بس میں ہوتا تو میں زمین کے سارے خزانے اس مؤاخذہ کے خوف پر نچھاور کر دیتا۔ آپ نے یہ آخری الفاظ کہے تو حضرت ابنِ عباسؓ نے، جو پاس بیٹھے تھے، کہا کہ یہ شخص ٹھیک کہتا ہے۔ اس لئے کہ آپ ہمیشہ کتاب اللہ کے مطابق فیصلے کرتے تھے اور سب کے حصے برابر برابر تقسیم کرتے تھے۔ یہ سن کر آپ کی نگاہوں میں چمک پیدا ہوگئی۔ سنبھل کر بیٹھ گئے اور کہا کہ ابن عباسؓ! کیا تم میرے لئے خدا کے ہاں اس کی شہادت دو گے؟ وہ خاموش ہوگئے تو آپ نے ان کے شانے پر ہاتھ مارا اور دوبارہ کہا کہ کہو! ابن عباس! تم اس کی شہادت دو گے کہ میں کتاب اللہ کے مطابق فیصلے کیا کرتا تھا اور سب کے حصے برابر تقسیم کیا کرتا تھا۔ حضرت ابن عباسؓ نے کہا کہ ہاں! میں اس کی گواہی دوں گا۔ اس پر آپ کو اطمینان ہوا۔

وفات کے بعد گواہی

اور آپ کی وفات کے بعد صحابہؓ نے (حضرت عبداللہ ابن مسعودؓ کے الفاظ میں) اس کی عام گواہی دی کہ

عمرؓ ــــــ کتاب الٰہی کے سب سے بڑے عالم تھے اور دین کے سب سے بڑے فقیہہ۔

کتاب اللہ کے اتنے جید عالم تھے لیکن چونکہ ایک عملی (PRACTICAL) انسان تھے۔ اس لئے چھوٹی چھوٹی باتوں کی زیادہ کاوش نہیں کیا کرتے تھے۔ سورۂ عبس میں زمینی پیداوار کی مختلف چیزوں کے تذکرہ کے سلسلہ میں فَاكِهَةً وَّ اَبًّا۔ (۸۰/۳۱) کے الفاظ بھی آتے ہیں۔ شہری لوگ باقی چیزوں کے متعلق تو جانتے تھے لیکن اَبًّا ایک قسم کی گھاس تھی جسے دہقان پہچانتے تھے۔ حضرت عمرؓ اس لفظ کے معانی معلوم کرنے کے لئے کاوش کرتے رہے۔ جب معلوم نہ ہو سکا تو اپنا ہاتھ اپنے سر پر رکھا اور خفیف سے تبسم کے ساتھ فرمایا کہ

اے عمر کی ماں کے بیٹے! یہ تکلفات کس لئے! کیا ہوا اگر تجھے اَبًّا کے معنی معلوم نہیں! اور بعد میں معلوم کر لئے۔

فقط لَآ اِلٰہَ کہنے سے جنت نہیں مل سکتی

کتاب اللہ کا یہ علم محض نظری نہیں تھا بلکہ اس پر غور و فکر سے مقصود یہ تھا کہ قرآنی اصول و ہدایات کو عملی زندگی پر کس طرح منطبق کیا جاتے ــــــ اور یہی، ہمارے نزدیک، حضرت عمرؓ کا سب سے بڑا درخشندہ و پائندہ کارنامہ ہے۔ بنگاہِ تعمق دیکھنے سے یہ حقیقت ابھر کر سامنے آجاتی ہے گی کہ ان کے ایک ایک فیصلہ اور ایک ایک اقدام کی بنیاد کس طرح قرآنِ مجید کے کسی نہ کسی اصول و قانون پر ہوتی تھی اور اس باب میں وہ کس جرأت و بیباکی

سے کام لیتے تھے، تفصیلات ان امور کی تو بعد میں سامنے آتی رہیں گی، اس وقت دو واقعات ایسے ہیں جو بے ساختہ میرے عمقِ قلب سے اُبھر کر نوکِ قلم پر آ گئے ہیں۔ ان میں ایک واقعہ ایسا ہے جس کے وقوعہ ہونے میں تو مجھے شبہ ہے لیکن اس میں جو بات حضرت عمرؓ کی طرف منسوب کی گئی ہے، وہ بالکل صحیح ہے۔ بیان یہ کیا جاتا ہے کہ ایک دفعہ نبی اکرمؐ کسی طرف تنہا تشریف لے گئے۔ جب آپؐ کی واپسی میں دیر ہو گئی تو صحابہؓ کو تشویش لاحق ہوئی اور وہ آپؐ کی تلاش کے لئے اِدھر اُدھر نکلے۔ حضرت ابوہریرہؓ نے آپؐ کو ایک باغ کے اندر پا لیا۔ حضورؐ نے انہیں اپنے نعلین (جوتے) عنایت فرمائے اور کہا کہ انہیں لے جاؤ اور جو شخص بھی باہر ملے اسے میری طرف سے خوش خبری دے دو کہ جس شخص نے بھی کلمۂ شہادت پڑھ لیا وہ جنت میں چلا جائے گا۔ وہ باہر آئے تو سب سے پہلے ان کی ملاقات حضرت عمرؓ سے ہوئی۔ جب انہوں نے آپ کو حضورؐ کی دی ہوئی خوشخبری سنائی تو آپ (حضرت عمرؓ) نے حضرت ابوہریرہؓ کے سینے پر ہاتھ مارا اور کہا کہ ابوہریرہؓ! اسی وقت رسول اللہؐ کی طرف واپس چلو۔ جب یہ دونوں حضورؐ کی خدمت میں پہنچے تو آپؐ نے حضرت عمرؓ سے پوچھا کہ تم نے ایسا کیوں کیا اور ابوہریرہؓ کو اس خوش خبری کے عام کر دینے سے کیوں روکا۔ حضرت عمرؓ نے کہا کہ

حضورؐ! ایسا نہ کیجئے۔ مجھے ڈر ہے کہ لوگ ہاتھ پاؤں توڑ کر بیٹھ جائیں گے۔

انہیں عمل کرنے دیجئے۔

اس پر حضورؐ نے فرمایا کہ اچھا! انہیں عمل کرنے دو۔

جیسا کہ میں نے پہلے کہا ہے، مجھے یہ واقعہ یکسر وضعی نظر آتا ہے۔ نہ حضورؐ ایسا فرما سکتے تھے، نہ حضرت عمرؓ کی طرف سے بارگاہِ رسالتؐ میں ایسی گستاخی ہو سکتی تھی لیکن جو بات اس میں کہی گئی ہے وہ قرآنی تعلیم کے عین مطابق ہے۔ قرآن کریم میں متعدد مقامات میں اس حقیقت کو واضح کیا گیا ہے کہ کوئی شخص محض یہ کہہ دینے سے کہ میں ایمان لے آیا، جنت میں داخل نہیں ہو سکتا۔ سورۃ عنکبوت کا آغاز ان الفاظ سے ہوتا ہے ــــ اَحَسِبَ النَّاسُ اَنْ یُّتْرَکُوْٓا اَنْ یَّقُوْلُوْٓا اٰمَنَّا وَھُمْ لَا یُفْتَنُوْنَ۔ (۲۹/۲) کیا لوگ یہ خیال کئے بیٹھے ہیں کہ محض اتنا کہہ دینے سے کہ ہم ایمان لے آتے ہیں، انہیں چھوڑ دیا جائے گا اور انہیں حق و باطل کے تصادمات کی بھٹیوں میں سے گذرنے کی ضرورت ہی نہیں پیش آئے گی؟ (اس سلسلہ میں ان آیات کو سامنے لے آنا بھی مفید رہے گا۔ ۲/۲۱۴، ۳/۱۴۱، ۶/۱۵۹، ۹/۱۶، ۱۰/۳۳) ہو سکتا ہے کہ حضرت عمرؓ نے یہ الفاظ کسی اور موقعہ پر کہے ہوں۔ ان کا قلب و دماغ قرآنی تعلیمات کا چھلکتا ہوا ساغر تھا اور اس باب میں وہ جو کچھ کہتے تھے

دو ٹوک کہتے تھے۔ کوئی لگی لپٹی نہیں رکھتے تھے۔

شجرِ رضوان کو کٹوا دیا

اور دوسرا واقعہ ایسا ہے جس کے صحیح ہونے میں مجھے کوئی شبہ نظر نہیں آتا لیکن ہے ایسا نازک کہ میں جب بھی اس کا تصور کرتا ہوں تھر تھرا اٹھتا ہوں۔ انسانی زندگی میں وہ لمحات مشکل ترین ہوتے ہیں، جب اس کے جذبات کا تقاضا کچھ اور ہو، اور دین کا مطالبہ کچھ اور، اور میں سمجھتا ہوں کہ حضرت عمرؓ کی زندگی میں اس سے زیادہ نازک اور دشوار گزار مقام شاید ہی کوئی اور آیا ہو۔ اس دشوار ترین مرحلہ پر حضرت عمرؓ نے جس ہمت اور حوصلہ سے، اپنے جذبات کو قربان کر کے، دین کے تقاضے کو ترجیح دی، اس کے احساس سے میری نظروں میں عظمتِ فاروقیؓ، تا بہ ثریا پہنچ جاتی، اور اس کے احترام میں میری نگہ نیاز بے ساختہ جھک جاتی ہے لیکن اس واقعہ کی اہمیت کا صحیح اندازہ کرنے کے لئے قرآنِ کریم کی اصولی تعلیم کا سمجھ لینا ضروری ہے۔

شخصیت پرستی

تاریخ انسانیت اس حقیقت پر شاہد ہے کہ قوموں کی کشتی شخصیت پرستی کی چٹان سے ٹکرا کر پاش پاش ہو جاتی ہے، خواہ یہ شخصیت پرستی دنیاوی حکمرانوں کو ظل اللہ علی الارض (زمین پر خدا کا سایہ) قرار دینے کی شکل میں ہو، اور خواہ "روحانی پیشواؤں" کو فوق البشر حیثیت دینے کی صورت میں۔ شخصیت پرستی کی یہ دوسری شکل، پہلی کے مقابلہ میں کہیں زیادہ شدید، محکم اور عمیق ہوتی ہے۔ حکمرانوں کی محکومیت کی زنجیریں انسان کے جسم کو مقید کر سکتی ہیں لیکن "روحانی پیشوائیت" کی محکومیت کا تصور انسان کے قلب و دماغ پر مستولی ہوتا ہے۔ اگر کسی "حضرت صاحب" کی شان کے خلاف کوئی خیال تک ان کے کسی عقیدت مند کے دل میں گذر جائے تو وہ ڈرتا ہے، کانپتا ہے، لرزتا ہے کہ نہ معلوم اس سے مجھ پر کیا قیامت ٹوٹ پڑے گی۔ اس لئے وہ ان کے حضور دست بستہ حاضر ہو کر روتا ہے، گڑگڑاتا ہے، معافی مانگتا ہے، پاؤں پکڑتا ہے کہ یا حضرت! مجھے بخش دیجئے ورنہ میں تباہ ہو جاؤں گا۔ سوچئے، کہ شرفِ انسانیت کی تذلیل کی اس سے بڑھ کر کوئی اور صورت بھی ہو سکتی ہے؟ لیکن شخصیت پرستی یہ سب کچھ کراتی ہے۔

قرآنِ کریم جو عظیم انقلاب دلوں کی بستیوں میں لایا اس کی رُو سے اس نے شخصیت پرستی کی جڑ کاٹ کر رکھ دی ہے۔ اس نے، سب سے پہلے یہ کہہ کر کہ حقِ حکومت خدا کے سوا کسی کو حاصل نہیں، انسانی حکمرانی کے تصور تک کو مٹا دیا۔ پھر یہ کہہ کر خدا کی یہ حکومت، اس کی کتاب کی اطاعت کے ذریعے روبہ عمل آئے گی، یہ اعلان کر دیا کہ اطاعت

قانون کی ہوگی، کسی انسان کی نہیں ہوگی۔ آپ سورۂ آلِ عمران کی اس آیۂ جلیلہ کو ایک بار پھر سامنے لائیے جسے اس سے پہلے بھی درج کیا جا چکا ہے، اور دیکھئے کہ اس منشورِ خداوندی نے کس طرح، ہر قسم کی شخصیت پرستی کا خاتمہ کر کے رکھ دیا۔ اس نے کہا کہ

مَا كَانَ لِبَشَرٍ أَنْ يُؤْتِيَهُ اللّٰهُ الْكِتٰبَ وَ الْحُكْمَ وَ النُّبُوَّةَ ثُمَّ يَقُوْلَ لِلنَّاسِ كُوْنُوْا عِبَادًا لِّيْ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَ لٰكِنْ كُوْنُوْا رَبَّانِيِّيْنَ بِمَا كُنْتُمْ تُعَلِّمُوْنَ الْكِتَابَ وَ بِمَا كُنْتُمْ تَدْرُسُوْنَ ۝ (۳/۷۸)

کسی انسان کو اس کا حق حاصل نہیں، خواہ اسے ضابطۂ قوانین، حکومت کے اختیارات اور نبوّت تک بھی کیوں نہ مل جائے کہ وہ لوگوں سے کہے کہ تم خدا کے نہیں بلکہ میرے محکوم بن جاؤ۔ اسے یہی کہنا چاہیئے کہ تم اس کتاب کی اطاعت سے جسے تم پڑھتے پڑھاتے ہو اور اس کی حکمت پر غور و خوض کرتے ہو، ربّانی بن جاؤ۔

جماعتِ مومنین کے نزدیک، خدا کے بعد، سب سے زیادہ واجب الاحترام، حضورؐ نبی اکرمؐ کی ذاتِ اقدس تھی۔ اگر وہ (سابقہ امتوں کی روش کے اتباع میں) کسی کو فوق البشر تصوّر کرتے تو سرِ فہرست حضورؐ ہی کی ذاتِ گرامی آتی۔ قرآنِ کریم نے، اسی احساس کے پیشِ نظر خود حضورؐ کی زبانِ مبارک سے بار بار کہلوا دیا کہ اِنَّمَآ اَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ يُوْحٰٓى اِلَيَّ .... (۱۸/۱۱۰) میں اس کے سوا کچھ نہیں کہ تمہارے ہی جیسا ایک انسان ہوں، اس فرق کے ساتھ کہ مجھے خدا سے وحی ملتی ہے۔ جب میں اس وحی کو تم تک پہنچا دیتا ہوں، تو پھر انسان ہونے کی حیثیت سے تم میں اور مجھ میں کوئی فرق نہیں رہتا۔ مخالفین کی اعجوبہ پسند ذہنیت کو یہ بات حیرانگیز نظر آتی کہ ایک شخص نبوّت کا دعویٰ کرتا ہے اور کہتا ہے کہ وہ ہمارے ہی جیسا انسان ہے۔ وہ تعجب سے کہتے کہ مَالِ هٰذَا الرَّسُوْلِ يَأْكُلُ الطَّعَامَ وَ يَمْشِيْ فِي الْاَسْوَاقِ..... (۲۵/۷) یہ کس قسم کا رسول ہے کہ عام انسانوں کی طرح کھاتا پیتا اور بازاروں میں چلتا پھرتا ہے! انہیں جواب دیا جاتا کہ یہی رسول ایسا نہیں۔ اس سے پہلے بھی جتنے رسول آئے، سب اسی طرح کے انسان تھے۔ کھاتے پیتے اور بازاروں میں چلتے پھرتے تھے (۲۵/۲۰)۔ لیکن یہ بعد میں ان کے نام لیوا تھے جنہوں نے انہیں مقامِ الوہیّت تک پہنچا دیا اور انہیں عجیب و غریب سی مخلوق بنا کر اپنے جذبۂ استعجاب پسندی کی تسکین کر لی لیکن اس سے نہ وہ رسول، رسول رہا، نہ اس کا پہنچایا ہوا دین، دین ـــــ رسول، فوق البشر ہستی بن گیا اور اس کا پہنچایا ہوا دین، مذہب میں تبدیل

ہوگیا۔

شخصیت پرستی کی سب سے بڑی خرابی یہ ہے کہ اس میں، انسانی زندگی کے تمام سہارے اس شخص کی ذات سے وابستہ ہوجاتے ہیں۔ اس کی موت سے یہ سب سہارے ٹوٹ جاتے ہیں اور انسان اپنے آپ کو بے آسرا محسوس کرنے لگ جاتا ہے۔ اپنی بے کسی اور "بے آسرگی" کا یہی احساس تھا جس سے مجبور ہوکر انسان نے اپنے آپ کو یہ دے لیا کہ ایسی ہستیاں کبھی مرتی نہیں ــــ وہ یا تو زندہ آسمان پر چلی جاتی ہیں، اور اگر ہمارے سامنے مر بھی جاتی ہیں تو وہ درحقیقت مرتی نہیں، زندہ ہوتی ہیں اور ہماری ہر دعا کو سنتی، اور مرادیں بہم پہنچاتی ہیں۔ یہ "آنے والے کا انتظار" اور قبر پرستی کا شعار، اسی خودفریبی کے مظاہر ہیں۔ قرآنِ کریم نے اس خودفریبی کے پردوں کو بھی چاک کر دیا۔ اس نے کہا کہ وَمَا مُحَمَّدٌ اِلَّا رَسُوْلٌ ...... شَيْئًا۔ (۳/۱۴۴) "محمدؐ اس سے زیادہ کچھ نہیں کہ خدا کا رسول ہے۔ اس سے پہلے، اسی قسم کے کئی رسول آئے اور اپنی اپنی عمر پوری کرنے کے بعد دنیا سے چلے گئے۔ سو اگر کل کو یہ بھی طبیعی وفات پا جائے یا قتل کر دیا جائے تو کیا تم یہ سمجھ کر کہ یہ نظام تو اسی شخصیت کے سہارے پر قائم تھا، وہ شخصیت نہ رہی تو وہ نظام بھی ختم ہوا۔ پھر اپنی قدیم روش کی طرف پلٹ جاؤ گے؟ جو تم میں سے ایسا کرے گا، وہ اپنا ہی نقصان کرے گا، خدا کا کچھ نہیں بگاڑے گا"۔ اس نے یہ کلیہ بیان کر دیا کہ وَمَا جَعَلْنَا لِبَشَرٍ مِّنْ قَبْلِكَ الْخُلْدَ ط اَفَائِنْ مِّتَّ فَهُمُ الْخَالِدُوْنَ۔ (۲۱/۳۴) "ہم نے (اے رسولؐ) تم سے پہلے بھی کسی انسان کو اس دنیا میں حیاتِ دوام (ہمیشہ کی زندگی) عطا نہیں کی۔ سو تم اگر وفات پا جاؤ گے تو کیا یہ تمہارے مخالف ہمیشہ زندہ رہیں گے؟ ہمیشہ زندہ کوئی بھی نہیں رہ سکتا۔

جیسا کہ کہا جا چکا ہے، دین میں اطاعت احکامِ خداوندی کی ہوتی ہے اور اس اطاعت میں خود رسول بھی دوسروں کے ساتھ برابر کا شریک ہوتا ہے۔ حتیٰ کہ وہ اس حقیقت کا بھی اعتراف و اعلان کرتا ہے کہ

اِنِّيْٓ اَخَافُ اِنْ عَصَيْتُ رَبِّيْ عَذَابَ يَوْمٍ عَظِيْمٍ۔ (۶/۱۵)

اگر میں بھی احکامِ خداوندی کی خلاف ورزی کروں تو اس کی پاداشش سے میں نہیں بچ سکتا۔ مجھے بھی اس کا خوف رہتا ہے۔

رسول اللہ کی وفات کے بعد، دین کا نظام آگے چلا جس میں قانونِ خداوندی کی اطاعت، حضورؐ کے جانشینوں کی وساطت سے ہوتی تھی۔ شخصیت پرستی کا تصور نہ حضورؐ کی زندگی میں پیدا ہوا تھا، نہ اس کے بعد۔ حضورؐ نے خود احکام و قوانینِ خداوندی کی اطاعت کی اور اس سے ایسی پاکیزہ سیرت اور بلند کردار کا ثبوت دیا جسے خدا نے دوسرے انسانوں

کے لئے ماڈل قرار دیا۔ (لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِيْ رَسُوْلِ اللّٰهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ۔ (۳۳/۲۱) حضورؐ کے جانشینوں (خلفائے راشدینؓ) نے بھی اپنے سامنے یہی اسوہ حسنہ رکھا اور شخصیت پرستی کے شائبہ تک کو شریک تصورات نہ ہونے دیا۔

اس تمہید کے بعد اس واقعہ کی طرف آیئے جسے ہم نے حضرت عمرؓ کی زندگی کا نازک ترین مقام قرار دیا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ نبی اکرمؐ نے صلح حدیبیہ کے وقت، ایک درخت کے نیچے، صحابہؓ سے بیعت لی تھی۔ (اس کا ذکر پہلے آچکا ہے) حضرت عمرؓ نے اپنے زمانہ خلافت میں دیکھا کہ لوگ آتے ہیں اور اس درخت کے نیچے نماز ادا کرتے ہیں۔

عمومی نقطۂ نگاہ سے دیکھئے تو بات معمولی سی تھی۔ لوگ نہ اس درخت کی پرستش کرتے تھے' نہ اس سے مرادیں مانگتے تھے۔ صرف اس کے نیچے جا کر نماز پڑھتے تھے لیکن عمرؓ کی نگہ حقیقت شناس اور دوررس اس بظاہر معصوم سے عمل کے نیچے مہیب خدشات دیکھتی تھی ـــ حضرت عمرؓ کی نگاہیں اس درخت پر تھیں اور آنکھوں کے سامنے وہ حسین وجمیل منظر، سینما کے فلم کی طرح وجہ فروغِ دیدہ ہو رہا تھا، جب اسلام پر سخت نازک وقت آیا تھا اور نظر آتا تھا کہ مخالفین مکہ سے اب فیصلہ کن تصادم ہوگا۔ حضورؐ کی دعوت پر صحابہؓ کبار پروانہ وار آ رہے تھے اور اس تصادم میں اپنی جانیں قربان کر دینے کے عہد کی تجدید کر رہے تھے۔ حضورؐ توثیق عہد کے لئے' اپنا دستِ مبارک صحابہؓ کے ہاتھ پر رکھتے تھے اور اُدھر سے یہ ندا ئے جاں باعثِ فردوسِ گوش ہو رہی تھی کہ تمہارے ہاتھوں پر بظاہر رسولؐ کا ہاتھ ہے لیکن اُسے تم خدا کا ہاتھ سمجھو کہ تمہارا یہ عہد خدا ہی کے ساتھ ہو رہا ہے جو تمہیں اس جاں فروشی کے عوض جنت کی بشارت دیتا ہے۔

کیسا فردوس بداماں تھا یہ منظر اور کس قدر جنت بآغوش تھی اس کی یاد ـــ اور یہ درخت اس یاد کا مظہر تھا۔

طبیعی آثار و مظاہر سے وابستگی محسوسات کے خوگر انسان کی گویا طبیعت میں داخل ہے۔ اگر یہ وابستگی، دین کے کسی تقاضے سے نہ ٹکرائے تو اس میں چنداں مضائقہ نہیں ہوتا۔ قرآنی حقائق، رسول اللہؐ کا اسوہ حسنہ اور امم سابقہ کی تاریخ حضرت عمرؓ کے سامنے تھی۔ آپ جانتے تھے کہ اس قسم کے خطرات کی ابتدا، معصوم سے انداز سے ہوا کرتی ہے لیکن آگے چل کر یہ مہیب تباہی کا موجب بن جاتی ہے۔ لہٰذا، فتنے کے امکان کو ابتدا ہی سے کچل دینے کا اصول اس کا مقتضی تھا کہ اس روش کو یہیں ختم کر دیا جائے لیکن اس کے حتمی طور پر ختم کرنے کا طریقہ تو ایک

ہی تھا اور وہ یہ کہ اس درخت کو جڑ سے کاٹ دیا جائے۔ غور کیجئے کہ حضرت عمرؓ کے لئے یہ فیصلہ کس قدر ہمت طلب اور جذبات آزما تھا لیکن عمرؓ، فاروقِ اعظم کس طرح بنتا۔ اگر دین کا تقاضا اس کے جذبات پر غالب نہ آجاتا۔ دین کا تقاضا جذبات پر غالب آیا اور آپ نے حکم دے دیا کہ اس درخت کو کاٹ دیا جائے۔ درخت کاٹ دیا گیا تو آپ نے لوگوں سے کہا کہ انما هلك من كان قبلكم بهذا يتبعون اثار انبياءهم فاتخذوها كنائس وبيعا۔ تم سے پہلے لوگ اس وجہ سے ہلاک ہو گئے کہ انہوں نے انبیاء کے آثار کا اتباع شروع کر دیا اور اس کے بعد نوبت یہاں تک پہنچ گئی کہ انہیں عبادت گاہیں بنا لیا[1] — کیسی دور رس تھی نگاہ اس حقیقت شناس کی! آپ نے اس امکانی خطرہ کے پیشِ نظر اس درخت کو تو کٹوا دیا، لیکن آپ کو کیا خبر تھی کہ بعد میں یہ اُمّت، "اس درخت کے بیجوں" کو جھولیاں بھر بھر کرلے جائے گی۔ اور انہیں ساری دنیا میں اس طرح بکھیر دے گی کہ ایک ایک بیج سے سو سو پرستش گاہیں نمود میں آجائیں گی، جہاں اس توحید کی مدعی قوم کے سر، اینٹوں اور پتھروں کے سامنے جھکیں گے! بہرحال، عمرؓ فاروق ان بعد میں آنے والوں کے اعمال کے ذمہ دار نہیں۔ انہوں نے آثارِ شرک کی ایسی جڑ کاٹی تھی کہ اس پر خدا اور اس کے فرشتے آپ پر تبریک و تہنیت کے پھول برساتے ہوں گے اور انبیاء سابقہ جنت میں حضورؐ کو ہزار ہزار مبارک باد دیتے ہوں گے کہ آپؐ کی تعلیم و تربیت نے کیسے کیسے جوہر گراں مایہ پیدا کئے ہیں۔ اِنَّ اللّٰهَ وَ مَلٰٓئِكَتَهٗ يُصَلُّوْنَ عَلَى النَّبِيِّ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا صَلُّوْا عَلَيْهِ وَ سَلِّمُوْا تَسْلِيْمًا۔ (۳۳/۵۶)

اسی طرح آپ ایک دفعہ حج کے لئے روانہ ہوئے تو راستے میں دیکھا کہ ایک مسجد ہے جس کی طرف لوگ دوڑ دوڑ کر جا رہے ہیں۔ آپ نے لوگوں سے پوچھا کہ یہ کیا ہے؟ انہوں نے کہا کہ رسول اللہؐ نے ایک دفعہ اس مسجد میں نماز پڑھی تھی۔ لوگ تبرکاً اس میں جا کر نماز پڑھتے ہیں۔ آپ نے یہ سنا تو لوگوں کو ڈانٹا اور کہا کہ جس شخص کو اس مسجد کے قریب نماز کا وقت آجائے، وہ تو اس میں جا کر نماز پڑھ لے لیکن بہ تکلّف اور بہ تعمد اس میں کوئی نماز نہ پڑھے۔

آپ نے ایک دفعہ سنا کہ ایک قبر ہے جسے لوگ حضرت دانیالؑ کی قبر سمجھ کر اس کی طرف رجوع کرتے ہیں۔ آپ نے

---

[1] علامہ طنطاوی نے یہ الفاظ نقل کئے ہیں۔ اراکم ایها الناس رجعتم الی العزّٰی۔ (ص۲۲۴)

حکم دے دیا کہ اس قبر کو چھپا دیا جائے۔

حجرِ اسود ہمارے ہاں، حجرِ اسود (دیوارِ کعبہ میں نصب، سیاہ پتھر کے ٹکڑے) کا چومنا، مناسکِ حج میں قرار دیا جاتا ہے اور اس پر عمل بھی کیا جاتا ہے۔ قرآن کریم میں نہ حجرِ اسود کا ذکر ہے، نہ اس کے چومنے یا چھونے کو مناسکِ حج میں شامل کیا گیا ہے۔ یہ چیز عربوں میں، زمانہ قبل از اسلام سے چلی آرہی تھی۔ ہم بہ تیقّن تو نہیں کہہ سکتے لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ دیوارِ کعبہ میں دوسرے رنگ کا ایک پتھر اس مقصد کے لئے لگایا گیا ہوگا کہ اس سے، طواف (کعبہ کے گرد چکروں) کے شمار میں آسانی رہے یعنی بآسانی معلوم ہو جائے کہ یہاں سے ہم نے چکر شروع کیا تھا اور یہیں آکر ایک چکر ختم ہو گیا۔ یا شاید اس کی علّت یہ ہو کہ سامی اقوام میں پختگیٔ عہد کا طریقہ یہ تھا کہ عہد کرنے والا، دوسرے فریق کے ہاتھ پر ہاتھ مارتا تھا۔ (یہ طریق بالعموم ساری دنیا میں پایا جاتا ہے) دورِ ابراہیمی میں جب حج کی ابتداء ہوئی تو اس کا بنیادی مقصد خدا سے یہ عہد کرنا تھا کہ ہم تیرے سوا کسی کی معبودیت (محکومیت) اختیار نہیں کریں گے۔ اس عہد کی توثیق کے لئے خدا کے ہاتھ پر ہاتھ مارنا تو ممکن نہیں تھا، اس لئے ہو سکتا ہے کہ اس کے لئے بطورِ علامت (SYMBOLLICALY) یہ طے کیا گیا ہو کہ بیت اللہ (خدا کے گھر) میں نصب شدہ پتھر پر ہاتھ مارنے سے سمجھا یہ جائے گا کہ تم خدا سے توثیقِ عہد کر رہے ہو۔ جس طرح "خدا کے گھر" کے گرد گھومنے سے مقصد یہ بتانا تھا کہ ہم خدا کے لئے اپنا سب کچھ نثار کرنے کے لئے تیار ہیں، کیونکہ کسی کے گرد گھومنے سے مقصد اس پر نثار ہو جانا ہوتا ہے۔

اس خطرہ کے پیشِ نظر کہ لوگ کہیں حجرِ اسود کی پرستش ہی نہ شروع کر دیں حضرت عمرؓ نے اس کی طرف اشارہ کر کے علانیہ کہا تھا کہ "میں جانتا ہوں کہ تو ایک پتھر ہے۔ نہ کسی کو نفع پہنچا سکتا ہے نہ نقصان"۔ یہ تھا توحید کے معاملہ میں حضرت عمرؓ کی احتیاط کا عالم!

بعض روایات میں ہے کہ آپ نے کہا تھا کہ "میں جانتا ہوں کہ تو ایک پتھر ہے۔ نہ نفع دے سکتا ہے نہ نقصان۔ واللہ اگر میں رسول اللہ کو بوسہ دیتے نہ دیکھتا تو میں تجھے کبھی بوسہ نہ دیتا"۔ ہمارے خیال میں اس روایت کا آخری حصہ وضعی ہے اور بعد کا اضافہ۔ رسول اللہ اس پتھر کو چومتے نہیں ہوں گے۔ نہ ہی حضرت عمرؓ نے ایسا کہا ہوگا۔ اس لئے کہ کسی پتھر کو چومنے سے اس کی تقدیس (مقدس ہونے) کا تصوّر ابھرتا ہے اور یہ چیز توحید کی اس تعلیم کے منافی ہے۔ جسے قرآنِ کریم نے پیش کیا ہے۔

قرآنِ کریم نے بعض چیزوں کو "شعائر اللہ" قرار دے کر ان کے احترام کا حکم دیا ہے۔ یہ نکتہ سمجھنے کے قابل ہے

شعائر (مادہ ش۔ع۔ر، جس سے لفظ شعور بنتا ہے) کے معنی ہیں وہ محسوس علامات (SYMBOL) جن سے کوئی مستور حقیقت سمجھ میں آسکے۔ وہ (CODE WORDS) جو جنگ میں علامات کے طور پر استعمال کئے جاتے تھے، شعائر کہلاتے تھے۔ نیز ایسی علامات جن سے اپنے قافلے کی پہچان ہو سکے۔ اسی طرح جن جانوروں کو وہ حج میں اپنے ساتھ لے جاتے تھے ان پر نشانات لگانے کو اشعار کہتے تھے۔ قرآنِ کریم نے، مناسکِ حج کے سلسلہ میں بعض چیزوں (صفا و مروہ کی پہاڑیوں، اور حج میں ساتھ لئے جانے والے اونٹوں) کو شعائر اللہ کہہ کر پکارا ہے۔ (۲/۱۵۸، ۲۲/۳۶) اور کہا ہے کہ ان کا احترام کرو۔

شعائر اللہ کے احترام سے مفہوم کیا ہے اسے ایک مثال کی رُو سے سمجھئے۔ ہر مملکت کا ایک جھنڈا ہوتا ہے۔ جھنڈے کی ذاتی حیثیت تو اتنی ہی ہوتی ہے کہ وہ مشتمل ہوتا ہے ایک لمبی سی لکڑی اور کپڑے کے ٹکڑے پر، لیکن وہ علامت بن جاتا ہے اس سلطنت کی (اسی لئے اسے عَلَم کہا جاتا ہے) اس جھنڈے کی سرفرازی اس سلطنت کی سرفرازی کی علامت ہوتی ہے اور اس کا سرنگوں ہو جانا اس سلطنت کی نکبت کی نشانی۔ اس جھنڈے کا احترام، اس مملکت کے افراد پر لازم قرار دیا جاتا ہے۔ یہ احترام اس جھنڈے کا نہیں ہوتا، اس مملکت کا ہوتا ہے۔ جو شخص اس جھنڈے کا احترام نہیں کرتا اس کے متعلق سمجھ لیا جاتا ہے کہ اس کے دل میں اس مملکت کا احترام نہیں اور یہ چیز اس مملکت کے خلاف بغاوت کے مرادف قرار پاتی ہے فلہذا، سنگین جرم۔ شعائر اللہ سے یہی مفہوم ہے یعنی وہ چیزیں جنہیں حکومتِ خداوندی کی محسوس علامات قرار دیا جائے۔ سورۃ المائدہ میں ہے۔ یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تُحِلُّوْا شَعَآئِرَ اللّٰهِ وَ لَا الشَّهْرَ الْحَرَامَ وَ لَا الْهَدْیَ وَ لَا الْقَلَآئِدَ وَ لَاۤ آٰمِّیْنَ الْبَیْتَ الْحَرَامَ ...... (۵/۲) اے جماعتِ مومنین! تم شعائر اللہ کی بے حرمتی نہ کرو۔ نہ ہی ان مہینوں کی جن میں جنگ کرنے کی ممانعت کی گئی ہے۔ نہ ہی ان تحائف اور نشان زدہ جانوروں کی جو اس اجتماعِ عظیم میں بھیجے جاتے ہیں اور نہ ہی اس اجتماع میں شرکت کے لئے جانے والوں کی۔" یہاں "بے حرمتی نہ کرنے" کا مطلب واضح ہے۔ یعنی ان چیزوں کے متعلق جو پابندیاں عاید کی گئی ہیں، انہیں ملحوظ رکھا جائے۔ انہیں کسی قسم کا نقصان نہ پہنچایا جائے۔ دوسرے مقام پر اس "احترام" کی وضاحت ان الفاظ سے کر دی کہ وَ مَنْ یُّعَظِّمْ شَعَآئِرَ اللّٰهِ فَاِنَّهَا مِنْ تَقْوَى الْقُلُوْبِ۔ (۲۲/۳۲) شعائر اللہ کی تعظیم دراصل اس امر کا اظہار ہے کہ تمہارے دل میں قوانینِ خداوندی کی نگہداشت کی اہمیت کا احساس ہے۔ یعنی ان محسوس علامات کا احترام، مقصود بالذات نہیں۔ یہ اس امر کی دلیل ہے کہ تمہارے دل میں قوانین و احکامِ خداوندی کا احترام ہے اور یہ ان کے احترام کا محسوس

مظاہرہ ہے۔

یہ ہے شعائر اللہ کے احترام کا مطلب۔ ظاہر ہے کہ اس سے وہ شعائر (محسوس علامات) فی ذاتہ مقدس نہیں بن جاتیں جس کا کسی مملکت کا جھنڈا (خواہ وہ مملکتِ خداوندی ہی کا جھنڈا کیوں نہ ہو) مقدس نہیں ہو جاتا۔ اگر کوئی شخص اس جھنڈے کو چومنے لگ جائے تو یہ اس (جھنڈے) کا احترام نہیں ہوگا، پرستش ہو جائے گی۔ بُت پرستی کی ابتداء بھی تو اسی طرح ہوئی تھی۔ بتوں کے متعلق ان کے پرستار بھی کہتے ہیں کہ یہ درحقیقت ہمارے غیر مرئی معبودوں کی محسوس و مرئی علامات ہیں لیکن جب ان علامات کو فی ذاتہ مقدس تصور کر لیا گیا تو وہ خود معبود بن گئیں۔ قرآنِ کریم چونکہ شرک کی تمام راہوں کو بند کر دینا چاہتا ہے، اس لئے وہ کسی علامت کو مقدس نہیں بننے دیتا۔ وہ علاماتِ حکومتِ خداوندی کے احترام کا حکم دیتا ہے، انہیں مقدس بنا لینے کا نہیں۔ اور تو اور، اس نے کعبہ کو بھی "مسجد الحرام" کہہ کر پکارا ہے۔۔۔ یعنی واجب الاحترام مرکزِ اطاعت خداوندی۔ کسی چیز کے واجب الاحترام ہونے اور ان معنوں میں مقدس ہونے میں جن کی طرف اوپر اشارہ کیا گیا ہے، کیا فرق ہے اسے قرآنِ کریم نے نہایت عمدگی سے واضح کر دیا ہے۔ صفا اور مروہ کی پہاڑیوں کو، قرآنِ کریم نے، شعائر اللہ میں سے قرار دیا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ زمانۂ قبل از اسلام میں عرب انہیں مقدس تصور کرتے تھے۔ اس لئے ان میں چلنا پھرنا گناہ سمجھتے تھے۔ قرآنِ کریم نے یہ اعلان کیا کہ صفا اور مروہ شعائر اللہ میں سے تو ہیں[1]،

---

[1] صفا اور مروہ کے شعائر اللہ قرار دیئے جانے کی وجہ کیا ہے، اسے قرآنِ کریم نے بیان نہیں کیا لیکن یہ جو ہمارے ہاں روایت ہے کہ حضرت ابراہیمؑ اپنی بیوی اور شیر خوار بچے کو، ایک مشکیزہ پانی دے کر لق و دق صحرا میں، بے یار و مددگار، تنہا چھوڑ گئے تھے اور حضرت ہاجرہ پیاس سے بیتاب بچے کے لئے پانی کی تلاش میں ان پہاڑیوں پر دوڑ دوڑ کر چڑھتی اترتی تھیں، تورات کے بیان پر مبنی ہے اور بالبداہت نظر آتا ہے کہ وضعی ہے۔ خدا کے ایک عظیم پیغمبر (حضرت ابراہیمؑ) سے یہ بعید ہے کہ وہ اپنی بیوی اور شیر خوار بچے کو اس حالت میں تنہا چھوڑ کر چلے جائیں۔ (ایسا تو عام انسان بھی نہیں کرتے۔ تفصیل اس کی میں نے اپنی کتاب "جوئے نور" تذکرہ حضرت ابراہیمؑ میں دی ہے۔)

ہم سمجھتے ہیں کہ قرآنِ کریم نے جو زمانۂ جاہلیت کی اس توہم پرستی کو ختم کیا جس کی رُو سے وہ اس وادی میں چلنا پھرنا گناہ سمجھتے تھے اور کہا کہ ان میں گھومنا پھرنا ہرج کی بات نہیں، تو اسی اجازت نے سعی بین الصفا والمروہ کی موجودہ شکل اختیار کر لی ہوگی بہرحال، یہ ہمارا قیاس ہے۔ قرآنِ کریم میں اس "سعی" کا بھی ذکر نہیں۔

لیکن فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِ اَنْ يَطَّوَّفَ بِهِمَا۔ (۲/۱۵۸) ان میں گھومنا پھرنا گناہ کا موجب نہیں۔ یعنی شعائر اللہ کا احترام تو کیا جائے گا انہیں مقدس نہیں تصور کر لیا جائے گا۔ اس سے احترام اور تقدیس کا فرق واضح ہو جاتا ہے۔

اسی طرح (جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا ہے) قرآنِ کریم نے ان اونٹوں کو بھی شعائر اللہ میں سے قرار دیا ہے جنہیں عازمینِ حج اپنے ساتھ لاتے تھے لیکن اس کے ساتھ ہی اس کی بھی وضاحت کر دی کہ ان جانوروں کو مقدس نہ سمجھ لیا جاتے۔ سفر میں ان سے عام جانوروں کی طرح کام لیا جاتے اور پھر، مکہ میں قیام کے دوران، انہیں ذبح کر کے ان کا گوشت خود بھی کھایا جاتے اور دوسرے ضرورت مندوں کو بھی کھلایا جاتے۔ (۳۶، ۳۳، ۳۲، ۲۸/۲۲)

یہ ہیں وہ وجوہات جن کی بنا پر ہم سمجھتے ہیں کہ نبی اکرمؐ حجرِ اسود کو چومتے نہیں ہوں گے۔ اوّل تو (جیسا کہ پہلے کہا گیا ہے) قرآنِ کریم نے حجرِ اسود کو شعائر اللہ میں شمار نہیں کیا۔ (قرآنِ کریم میں اس کا ذکر تک نہیں آیا۔) لیکن اگر اسے مملکتِ اسلامیہ نے منجملہ شعائر قرار دیا تھا تو اس کا فقط احترام مقصود تھا، اسے پرستش کی شے بنانا مقصود نہیں تھا۔

اور اسی بنا پر ہم نے کہا ہے کہ اس روایت کا یہ حصہ (جس کی رو سے کہا جاتا ہے کہ حضرت عمرؓ نے فرمایا تھا کہ اگر میں رسول اللہ کو بوسہ دیتے نہ دیکھتا تو میں تجھے کبھی بوسہ نہ دیتا) صحیح نہیں ہو سکتا۔ قرآنِ کریم نے توحید کا ایسا بلند اور منزہ تصور دیا ہے کہ اگر وہ پیش نظر ہے تو پھر اسلام میں اس قسم کی چیزیں بار ہی نہیں پا سکتیں اور اگر توحید کا یہ تصور (معاذاللہ) رسول اللہ اور صحابہ کبارؓ کے بھی پیشِ نظر نہیں تھا، تو پھر اور کس کے پیشِ نظر ہوگا۔

احادیثِ نبویؐ اور عمر فاروقؓ

آثار سے آگے بڑھیئے تو احادیث رسول اللہ کے معاملہ میں بھی آج اکثر لوگوں کو حضرت عمرؓ کا مسلک عجیب سا نظر آئے گا لیکن جن کی نگاہیں دین (اسلامی نظام) کی کنہ و حقیقت پر ہیں، وہ سمجھ جائیں گے کہ جو کچھ انہوں نے اس باب میں کیا وہ تقاضائے دین کے عین مطابق تھا۔

جیسا کہ ہم مجملاً دیکھ چکے ہیں (اور جسے تفصیلاً آگے چل کر "اسلامی نظام" کے عنوان میں بیان کیا جائے گا۔)

(۱) اسلام میں اطاعت، خدا کی کتاب (قرآن مجید) کی ہے۔

(۲) چونکہ اس کتاب کو تمام نوعِ انسان کے لئے اور ہمیشہ کے لئے ضابطہ ہدایت بننا تھا اس لئے اس میں (چند تفصیلی احکام کے سوا) صرف اصول دیئے گئے ہیں، اور اسے اسلامی مملکت پر چھوڑ دیا گیا ہے کہ وہ ان اصولوں

کی جزئیات، اپنے اپنے زمانے کے تقاضوں کے مطابق، خود متعیّن کرے۔ قرآن کے اصول ہمیشہ غیر متبدّل رہیں گے لیکن ان کی جزئیات، زمانے کے تقاضوں کے ساتھ ساتھ بدلتی رہیں گی۔ ثبات و تغیّر کے اس حسین امتزاج سے دین کا نظام ہمیشہ کے لئے رواں دواں رہے گا۔

(۳) قرآنی اصولوں کی روشنی میں جزئیات، سب سے پہلے اس اسلامی مملکت نے مرتب کیں، جسے نبیِ اکرمؐ نے قائم فرمایا تھا۔ حضورؐ کو جو خدا کا حکم تھا کہ معاملات کے طے کرنے میں، جماعتِ مومنین سے مشورہ کیا کرو تو اس کا تعلق انہی جزئیات کی تعیین سے تھا۔

(۴) اس مملکت کے نافذ کردہ فیصلوں کی اطاعت کا نام "اطاعتِ خدا ور سولؐ" (اَطِیْعُوا اللّٰہَ وَ اَطِیْعُوا الرَّسُوْلَ) تھا۔ یعنی اس نظامِ خداوندی کے فیصلے جسے رسولؐ اللہ نے قائم فرمایا۔

(۵) رسولؐ اللہ کی وفات کے بعد، یہی نظام آگے چلا۔ اس وقت "اَطِیْعُوا اللّٰہَ وَ اَطِیْعُوا الرَّسُوْلَ" کا عملی مفہوم تھا خلافتِ راشدہ (اسلامی مملکت) کے فیصلوں کی اطاعت۔

(۶) جو فیصلے رسولؐ اللہ کے زمانے میں صادر ہوئے تھے چونکہ انہیں ابدی طور پر غیر متبدّل رہنا مقصود نہیں تھا اس لئے حضورؐ نے ان فیصلوں (یعنی اپنی احادیث) کا کوئی مجموعہ مرتب فرما کر امّت کو نہیں دیا۔ اُمّت کو صرف قرآن دیا اور مکمّل اور محفوظ شکل میں دیا ——— اسی شکل میں جس میں وہ آج ہمارے پاس ہے۔ نہ صرف یہ کہ آپ نے ایسا مجموعہ خود مرتب فرما کر نہیں دیا بلکہ حکم دے دیا کہ

لا تکتبوا عنّی غیر القرآن۔ ومن کتب عنّی غیر القرآن فلیمحہ۔ (مسلم)

مجھ سے قرآن کے سوا کوئی چیز نہ لکھو۔ جس نے قرآن کے سوا اور چیز لکھی ہو اسے مٹا دے۔

(۷) اسی بنا پر، ان احادیث کا کوئی مجموعہ، نہ حضرت صدیقِ اکبرؓ نے مرتب فرمایا نہ حضرت فاروقِ اعظمؓ نے، نہ ہی، ان کے بعد دیگر خلفائے عظام یا صحابہؓ کرام نے۔ (یہ مجموعے صدیوں بعد جا کر مرتب ہوئے جب اسلامی نظام باقی نہیں رہا تھا۔) انہوں نے نہ صرف یہ کہ ایسے مجموعے خود مرتب نہ کئے بلکہ (ارشادِ رسولؐ کے مطابق) اس کے لئے امتناعی حکم جاری کر دیا کیونکہ انہیں خدشہ تھا کہ اگر ایسے مجموعے مرتب ہو گئے تو لوگوں کی عقیدت انہیں، ان کی طرف مائل کر دے گی، اور دین کی یہ اصل کہ اطاعت، قرآنی اصولوں کی روشنی میں موجودہ اسلامی حکومت کے فیصلوں کی، کی جائے گی، نگاہوں سے اوجھل ہو جائے گی اور اُمّت میں انتشار پیدا ہو جائے گا۔ اس سلسلہ میں عام صحابہ کبارؓ اور خلفائے عظام کا

مسلک کیا تھا؟ اسے ہم ذرا تفصیل سے بیان کرتے ہیں[۱]۔ مسند امام احمد میں ہے کہ صحابہؓ نے فرمایا :-

احادیث کے متعلق صحابہؓ کا مسلک

ہم لوگ جو کچھ رسول اللہ سے سنا کرتے تھے اسے لکھ لیا کرتے تھے۔ تب ایک دن رسول اللہ ہم لوگوں کے سامنے برآمد ہوئے اور فرمایا یہ کیا ہے جسے تم لوگ لکھ لیا کرتے ہو۔ ہم نے عرض کیا کہ حضورؐ سے جو کچھ ہم سنتے ہیں (اس کو لکھ لیا کرتے ہیں) تب آپؐ نے فرمایا کہ کیا اللہ کی کتاب کے ساتھ دوسری کتاب ؟ (یعنی ایسا نہیں کرنا چاہیئے) پھر فرمایا (ستھری کرو۔ خالص رکھو) اللہ کی کتاب کو ادہر قسم کے اشتباہ سے اسے پاک رکھو۔ (صحابیؓ کہتے ہیں کہ) تب ہم نے جو کچھ لکھا تھا اس کو ایک میدان میں اکٹھا کیا پھر اس کو ہم نے جلا دیا۔

(تدوین حدیث ص۲۴۹، از مولانا مناظر احسن گیلانی مرحوم)

امام ذہبی نے حضرت ابو بکر صدیقؓ کے متعلق حسب ذیل روایت بھی لکھی ہے۔

حضرت ابو بکر صدیقؓ نے رسول اللہ کی وفات کے بعد لوگوں کو جمع کیا اور فرمایا کہ تم لوگ رسول اللہ سے ایسی حدیثیں روایت کرتے ہو جن میں باہم اختلاف کرتے ہو اور تمہارے بعد کے لوگ اختلاف میں زیادہ سخت ہو جائیں گے۔ پس چاہیئے کہ رسول اللہ کی طرف منسوب کر کے کوئی بات بیان نہ کرو۔ پھر تم سے اگر کوئی کچھ پوچھے تو کہہ دیا کرو کہ ہمارے اور تمہارے درمیان اللہ کی کتاب ہے۔ پس چاہیے کہ اس کتاب نے جن چیزوں کو حلال کیا ہے ان کو حلال قرار دو اور جن باتوں کو حرام ٹھہرایا ان کو حرام ٹھہراؤ۔ (تذکرہ الحفاظ ذہبی۔ بحوالہ تدوین حدیث ص۲۲۱)

امام ذہبی نے یہ بھی لکھا ہے کہ

حضرت عائشہؓ نے فرمایا کہ میرے والد (حضرت ابو بکرؓ) نے رسول اللہ کی احادیث کو جمع کیا اور ان کی تعداد پانچ سو تھی۔ پھر ایک شب میں دیکھا گیا کہ وہ (یعنی حضرت صدیق اکبرؓ) بہت زیادہ کروٹیں بدل رہے تھے۔ میں نے عرض کیا آپ یہ کروٹیں کسی جسمانی تکلیف کی وجہ سے بدل رہے ہیں یا

---

[۱] ان تفاصیل کو ادارہ طلوع اسلام کی طرف سے شائع کردہ کتاب ۔ مقامِ حدیث ۔ سے لیا گیا ہے۔ جو حدیث کا صحیح مقام متعین کرنے کے لئے جامع تالیف ہے۔

کوئی خبر آپ تک پہنچی ہے (جسے سن کر آپ بے چین ہو رہے ہیں۔) آپ نے اس کا کوئی جواب نہ دیا۔
جب صبح ہوئی تو آپ نے فرمایا۔ بیٹی! ان حدیثوں کو لاؤ جو تمہارے پاس ہیں۔ پھر آگ منگائی اور اس
نسخہ کو جلا دیا۔ (تدوین حدیث صفحہ ۲۸۵)

جہاں تک حضرت عمرؓ کا تعلق ہے، علامہ ابن عبدالبر نے اپنی مشہور کتاب جامع بیان العلم میں اس روایت کو نقل کیا ہے۔

عمرؓ بن خطاب نے چاہا کہ سنن یعنی حدیثوں کو لکھوا لیا جاتے۔ تب انہوں نے رسول اللہ کے صحابیوں سے فتویٰ طلب کیا تو لوگوں نے یہی کہا کہ حدیثیں لکھوالی جائیں۔

لیکن لوگوں کے اس مشورہ سے حضرت عمرؓ کا قلب مطمئن نہ ہوا۔ چنانچہ

کامل ایک ماہ تک حضرت عمرؓ اس معاملہ میں استخارہ کرتے رہے۔ پھر ایک دن جب صبح ہوئی اور اس وقت حق تعالیٰ نے فیصلہ میں یکسوئی کی کیفیت ان کے قلب میں عطا کردی تھی۔ حضرت عمرؓ نے لوگوں سے کہا کہ میں نے حدیثوں کو قلمبند کرانے کا ارادہ کیا تھا۔ پھر مجھے ان قوموں کا خیال آیا، جو تم سے پہلے گزری ہیں کہ انہوں نے کتابیں لکھیں اور ان پر ٹوٹ پڑیں اور اللہ کی کتاب چھوڑ بیٹھیں اور قسم ہے اللہ کی میں اللہ کی کتاب کو کسی دوسری چیز کے ساتھ مخلوط کرنا نہیں چاہتا۔

(تدوین حدیث، صفحہ ۳۹۴)

اور یہ اس لئے تھا کہ جیسا کہ (پہلے لکھا جا چکا ہے) خود نبی اکرمؐ نے فرمایا تھا کہ مجھ سے قرآن کے سوا کچھ نہ لکھو جس نے قرآن کے سوا کوئی میری بات لکھی ہے تو چاہیئے کہ اسے مٹا دے۔ (صحیح مسلم)

یہی نہیں کہ حضرت عمرؓ نے فیصلہ کر دیا کہ احادیث کو جمع اور مدوّن نہیں کرنا چاہیئے بلکہ وہ ایک قدم آگے بڑھے۔

چنانچہ طبقات میں ہے کہ

حضرت عمرؓ کے زمانے میں حدیثوں کی کثرت ہوگئی تو آپ نے لوگوں کو قسمیں دے دے کر حکم دیا کہ ان حدیثوں کو ان کے پاس پیش کریں۔ حسب الحکم لوگوں نے اپنے مجموعے حضرت عمرؓ کے پاس پیش کر دیتے۔ تب آپ نے انہیں جلانے کا حکم دیا۔

(طبقات، جلد ۵، صفحہ ۱۴۱)۔ (تدوین حدیث صفحہ ۳۹۹)

یعنی حدیثوں کے نذرِ آتش کرنے کا یہ تیسرا واقعہ ہے۔ پہلی دفعہ صحابہؓ نے نبی اکرمؐ کے ارشاد کے مطابق حضورؐ کے سامنے انہیں جلایا۔ پھر حضرت ابوبکرؓ نے اپنے مجموعے کے ساتھ یہی کچھ کیا اور تیسری دفعہ حضرت عمرؓ نے لوگوں کو قسمیں دے دے

کر، ان کے مجموعوں کو اپنے سامنے نذرِ آتش کر دیا۔
یہ کچھ دارالخلافہ میں ہوا۔ اس کے بعد کیا ہوا، اس کے متعلق حافظ ابن عبدالبر نے جامع بیان العلم میں یہ روایت نقل کی ہے۔

> عمرؓ ابن خطاب نے پہلے تو یہ چاہا کہ حدیثوں کو قلمبند کر لیا جائے مگر پھر ان پر واضح ہوا کہ قلمبند کرانا ان کا مناسب نہ ہو گا۔ تب الامصار (یعنی چھاؤنیوں اور دیگر اضلاعی شہروں) میں یہ لکھ کر بھیجا کہ جس کے پاس حدیثوں کے سلسلہ کی کوئی چیز ہو، چاہیئے کہ اسے محو کر دے یعنی ضائع کر دے۔
> (جامع بیان العلم، جلد ۱، ص ۶۵)، (تدوین حدیث ص ۳۹۴)

مولانا مناظر احسن گیلانی (مرحوم) نے اپنی کتاب میں ایک خاص باب باندھا ہے۔ جس کا عنوان ہے۔ "قرآنِ اول میں حکومت کی طرف سے حفاظت و اشاعتِ حدیث کا اہتمام نہ ہونا کوئی امرِ اتفاقی نہیں بلکہ مبنی بر مصلحت ہے"۔ انہوں نے اس سے پہلے امام ابنِ حزم کا یہ قول نقل کیا ہے کہ

> جس وقت حضرت عمرؓ کی وفات ہوئی تو مصر سے لے کر عراق تک، اور عراق سے شام تک، شام سے یمن تک قرآن کے نسخے جو پھیلے ہوئے تھے، ان کی تعداد اگر ایک لاکھ سے زیادہ نہ تھی، تو کم بھی نہ تھی۔ (تدوین حدیث ص ۲۸۶)

اس کے بعد انہوں نے تفصیل کے ساتھ لکھا ہے کہ جب قرآنِ کریم کی اشاعت میں اس قدر اہتمام کیا گیا تو اگر حکومت چاہتی تو احادیث کی اشاعت میں کون سا امر مانع ہو سکتا تھا۔ انہوں نے کہا ہے کہ حکومت نے دیدہ دانستہ ایسا نہیں کیا تھا۔

یہ ہے کیفیت صحابہ کبارؓ کے زمانے میں احادیث مرتب کرنے کی۔ یعنی

(۱) رسول اللہ نے حکم دیا کہ مجھ سے قرآن کے سوا کچھ نہ لکھو۔
(۲) صحابہؓ نے جو احادیث اپنے طور پر لکھی تھیں انہیں، انہوں نے، حضورؐ کے فرمان کے مطابق جلا دیا۔
(۳) حضرت ابوبکر صدیقؓ نے اپنے مدوّن کردہ مجموعہ احادیث کو جلا دیا اور لوگوں کو حکم دیا کہ وہ احادیث بیان نہ کریں۔
(۴) حضرت عمرؓ نے ایک ماہ تک غور و خوض کے بعد فیصلہ کیا کہ احادیث جمع اور مدّون نہیں کرنی چاہئیں۔
(۵) حضرت عمرؓ نے لوگوں کو قسمیں دے دے کر ان سے احادیث کے مجموعے منگوائے اور انہیں جلا دیا۔

(۶) اور باقی شہروں میں حکم بھیج دیا کہ اگر کسی کے پاس احادیث لکھی ہوتی ہوں تو وہ انہیں ضائع کر دے۔

۱۵

(۷) یہ کچھ اتفاقاً نہیں کیا گیا، بلکہ مولانا مناظر احسن گیلانی (مرحوم) کے الفاظ میں "ایسا دیدہ دانستہ کیا گیا۔"

مزید شدت حضرت عمرؓ نے اس باب میں اور بھی شدت سے کام لیا۔ آپ لوگوں کو حدیثوں کی اشاعت سے سختی سے روکتے تھے۔ قرظہ بن کعبؓ راوی ہیں کہ جب حضرت عمرؓ نے ہم لوگوں کو عراق بھیجا تو ہمیں تاکید کر دی کہ یاد رکھو کہ تم ایسے مقام پر جاتے ہو جہاں کے لوگوں کی آوازیں قرآن پڑھنے میں شہد کی مکھیوں کی طرح گونجتی رہتی ہیں۔ تم ان کو احادیث میں الجھا کر قرآن سے غافل نہ کر دینا۔

حضرت ابوہریرہؓ سے پوچھا گیا کہ کیا آپ اسی طرح حضرت عمرؓ کے زمانے میں بھی حدیثیں بیان کرتے تھے؟ انہوں نے کہا کہ اگر میں حضرت عمرؓ کے زمانے میں اسی طرح حدیثیں بیان کرتا تو وہ مجھے دُرّے سے پیٹتے۔

یہ بھی روایت میں ہے کہ حضرت عمرؓ نے حضرت عبداللہ بن مسعودؓ، ابودرداءؓ اور ابومسعودؓ انصاری کو کثرتِ روایت کے جرم میں قید کر دیا تھا (ان تمام روایات کے لئے دیکھئے تذکرۃ الحفاظ) ممکن ہے ان روایات کی صحت کو محلِ نظر قرار دے دیا جاتے، حالانکہ ہمارے نزدیک ان کے صحیح ہونے کی دلیل یہ ہے کہ یہ منشائے قرآنی اور عمل رسول اللہ کے عین مطابق ہیں۔ بایں ہمہ، ہم اس بحث میں نہیں الجھنا چاہتے، نہ ہی آپ کو پریشان ہونے کی ضرورت ہے، اس لئے کہ اگر ہمیں یہ داخلی شہادات نہ بھی ملتیں، تو بھی ایک حقیقت ایسی ہے جس سے کسی کو مجالِ انکار نہیں اور وہ یہ کہ خلافتِ راشدہ کے اختتام پر بھی کوئی ایسا مجموعہ احادیث نہیں ملتا جو ان حضرات نے خود مرتب فرمایا ہو یا ان کی زیرِ نگرانی مدوّن کیا گیا ہو۔

ان تصریحات سے ظاہر ہے کہ اگر یہ حضرات (رضی اللہ عنہم) احادیث کو دین کا جزو سمجھتے تو جس طرح انہوں نے قرآنِ کریم کی عام نشر و اشاعت کا اہتمام فرما دیا تھا، خلافت کی زیرِ نگرانی احادیث کا بھی کوئی مجموعہ مرتب کر کے ضرور شائع کر دیتے۔ لہٰذا رسول اللہ کے بعد خلافتِ راشدہ میں بھی جمع و تدوینِ حدیث کے متعلق کوئی اقدام نہیں کیا گیا۔[۱]

---

[۱] اس مقام پر صرف یہیں تک لکھا جا رہا ہے۔ بعد میں احادیث کے مجموعے کس طرح مرتب ہوتے اس کے متعلق آخری باب میں تفصیل سے بتایا جائے گا۔

یہ تھا حضرت عمرؓ کا مسلک، قرآن اور حدیث کے بارے میں۔ جیسا کہ ہم آئندہ صفحات میں دیکھیں گے، ان کا عہدِ خلافت، اسی مسلک کی محسوس تفسیر ہے۔ یعنی حکومت کے فیصلوں کا مرکز، قرآنِ کریم، اور جو فیصلے سابقہ ادوار (عہدِ نبی اکرمؐ اور خلافتِ صدیقیؓ کے دوران) صادر ہوئے تھے، ان کی حیثیت نظائر (PRECEDENT) کی، جو صرف تائید کا کام دیتے تھے، ناقابلِ تغیر نہیں تھے۔ حضرت عمرؓ کی قرآنِ کریم سے اس درجہ والہانہ وابستگی (اعتصام و تمسک) اسی بنا پر تھی کہ وہ مرکز و محور تھا مسلمانوں کی انفرادی اور اجتماعی زندگی کا۔

جمع القرآن

قرآنِ کریم کے سلسلہ میں حضرت عمرؓ کی طرف بعض ایسی روایات منسوب کی جاتی ہیں، جو بالبداہت وضعی نظر آتی ہیں، لیکن چونکہ انہیں ہمارے ہاں (بدقسمتی سے) صحیح مانا جاتا ہے اس لئے ہم مناسب سمجھتے ہیں کہ ان کا بھی ذکر کر دیا جائے۔

پہلے تمہیداً یہ سمجھ لیجئے کہ دین کا تمام تر مدار یقین پر ہے۔ یقین اس امر کا کہ جس بات کو ہم دین کہتے ہیں وہ بلاشک و شبہ خدا کی طرف سے ہے۔ اگر اس بنیاد میں ذرا سا بھی تزلزل واقعہ ہو جائے تو دین کی ساری عمارت نیچے آگرتی ہے۔

قرآنِ کریم واضح الفاظ میں بتاتا ہے کہ اصولی طور پر دین، حضرت نوحؑ سے لے کر نبی اکرمؐ تک ہر رسول کو یکساں طور پر خدا کی طرف سے ملتا رہا لیکن اس کے باوجود وہ انبیاءؑ سابقہ کی تمام اُمتوں (یہود۔ نصاریٰ وغیرہ) سے مطالبہ کرتا ہے کہ وہ قرآن پر ایمان لائیں۔ اس کی وجہ (منجملہ دیگر وجوہات) وہ یہ بتاتا ہے کہ ان لوگوں کے پاس وہ کتابیں اپنی اصلی شکل میں موجود نہیں جو ان کے انبیاء کو خدا کی طرف سے ملی تھیں۔ ان میں تحریف و الحاق ہو چکا ہے۔

لہٰذا، اب اس آسمان کے نیچے، خدا کا دین، اپنی حقیقی اور غیر محرّف شکل میں صرف قرآنِ کریم کے اندر ہے۔ (قرآنِ کریم کا یہ دعویٰ کس طرح حرفاً حرفاً حقیقت پر مبنی ہے، اُسے میں نے اپنی کتاب "مذاہبِ عالم کی آسمانی کتابیں" میں بدلائل و شواہد واضح کر دیا ہے) چونکہ نبی اکرمؐ خدا کے آخری نبیؐ تھے اس لئے اللہ تعالیٰ نے اعلان کر دیا کہ اس نے نوعِ انسان کی ہدایت کے لئے جو کچھ دینا تھا، اسے مکمل شکل میں قرآن میں دے دیا ہے۔ یہ مکمل بھی ہے اور غیر متبدل بھی۔ (۶/۱۱۶) اس کے ساتھ ہی خدا نے یہ بھی کہہ دیا کہ اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَ اِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ (۱۵/۹) "ہم نے اس قرآن کو نازل کیا ہے اور ہم ہی اس کی حفاظت کے ذمہ دار ہیں"۔ حفاظتِ قرآنِ کریم کی یہی اہمیت اور ذمہ داری تھی جس کے پیشِ نظر، کتابتِ وحی کے لئے بارگاہِ رسالتؐ میں ایک چھوڑ چھبیس

چھبیس کاتب موجود رہتے تھے۔ اس طرح کتابت کردہ قرآن کی "ماسٹر کاپی" (جسے مصحفِ استوانہ یا الامام کہا جاتا تھا) مسجدِ نبویؐ میں رکھی رہتی تھی، جس سے دیگر صحابہؓ اپنے اپنے نسخے نقل کرتے تھے۔ اس طرح قرآنِ کریم کے متعدد نسخے، رسول اللہ کی حیاتِ طیبہ میں مکمّل اور مرتّب شکل میں اُمّت کے پاس موجود تھے۔ ان کے علاوہ ہزارہا کی تعداد میں حفّاظ تھے، جنہوں نے قرآن کو اپنے سینوں میں محفوظ کر رکھا تھا۔ رسول اللہ کے علاوہ، بڑے بڑے جیّد صحابہؓ سب حافظِ قرآن تھے۔ قرآنِ کریم کو اس اہتمام کے ساتھ محفوظ کیا گیا تھا۔

لیکن ہماری کتبِ احادیث میں ایسی روایات ملتی ہیں جن میں کہا گیا ہے کہ قرآنِ کریم، رسول اللہ کی زندگی میں جمع اور مرتّب ہی نہیں ہوا تھا۔ وہ یونہی اِدھر اُدھر بکھرا پڑا تھا۔ اسے بعد میں مرتّب کیا گیا۔ ان روایات میں، سب سے پہلی روایت خود حضرت عمرؓ کی طرف منسوب کی گئی، ملاحظہ فرمائیے۔

امام ابوداؤد اپنی سند کے ساتھ حضرت زید بن ثابتؓ سے یہ روایت نقل کرتے ہیں کہ جس سال اہلِ یمامہ کے ساتھ جنگ ہوئی، (حضرت) ابوبکرؓ نے مجھے (یعنی حضرت زید بن ثابتؓ کو) بلایا۔ وہاں حضرت عمرؓ بھی موجود تھے۔ حضرت ابوبکرؓ نے فرمایا کہ (حضرت) عمرؓ نے مجھ سے کہا ہے کہ قرآن کے حفّاظ بڑی تعداد میں شہید ہو چکے ہیں۔ مجھے ڈر ہے کہ یہ سلسلہ اگر اسی طرح جاری رہا تو کہیں قرآن ضائع نہ ہو جائے۔ میری رائے یہ ہے کہ قرآن کو جمع کر لو۔ میں نے عمرؓ سے کہا کہ جو کام رسول اللہ نے نہیں کیا وہ ہم کیسے کر سکتے ہیں لیکن (حضرت) عمرؓ اس پر برابر زور دیتے رہے تاآنکہ خدا نے میرا بھی شرحِ صدر کر دیا اور میں عمرؓ سے متفق ہو گیا۔

(حضرت زیدؓ نے کہا کہ) ابوبکرؓ نے مجھ سے کہا کہ تم نوجوان اور عقلمند آدمی ہو اور رسول اللہ کی وحی بھی لکھتے رہے ہو۔ لہٰذا تم اس کام کا ذمّہ لے لو۔ (حضرت) زیدؓ نے بعد از بسیار تردّد و تامّل اس کام کا بیڑہ اٹھا لیا اور قرآن کو جمع کرنے لگ گئے۔ اس کے لئے انہوں نے، کاغذوں کے ٹکڑوں، کھجور کے پتّوں، پتّھر کے ٹکڑوں اور لوگوں کے سینوں (حافظوں) سے اس کی تلاش شروع کر دی۔ (انہوں نے کہا کہ) اس طرح میں نے اسے مرتّب کر لیا لیکن ایک آیت جسے میں حضورؐ کو پڑھتے سنا کرتا تھا کہیں سے نہ مل سکی۔ میں نے اپنی تلاش جاری رکھی تاآنکہ وہ خزیمہ بن ثابتؓ کے پاس ملی اور اسے بھی میں نے قرآن میں درج کر دیا۔

آپ نے غور فرمایا کہ اس ایک روایت نے قرآن مجید کی محفوظیت کے متعلق اس یقین کے کس طرح پرخچے اڑا اڑا دیئے ہیں جس پر دین کی عمارت استوار ہے! لیکن ابھی بات ختم نہیں ہوئی۔ ایک اور روایت میں ہے کہ حضرت زیدؓ کے جمع کردہ قرآن میں آیۂ رجم نہیں تھی (یعنی جس آیت میں کہا گیا ہے کہ زانی کو سنگسار کرنا چاہیئے۔) حضرت عمرؓ اس آیت کو لے کر حضرت زیدؓ کے پاس پہنچے تو انہوں نے کہا کہ ہم نے اصول یہ طے کر رکھا ہے کہ جو شخص کوئی آیت لے کر آتے، اسے اس وقت درج قرآن کیا جائے جب وہ اپنے دعوے کی تائید میں ایک گواہ بھی لاتے۔ حضرت عمرؓ کوئی گواہ نہ لا سکے اس لئے یہ آیت قرآن میں درج نہ کی گئی۔ لیکن حضرت عمرؓ کو اس پر اصرار تھا کہ یہ قرآن کی آیت ہے۔ ہم رسول اللہ کے زمانے میں اس کی تلاوت کیا کرتے تھے۔ اس لئے انہوں نے اس کی تلاش جاری رکھی۔ وہ اس سلسلہ میں حضرت عائشہؓ کے پاس پہنچے تو انہوں نے فرمایا کہ

قرآن کی دو آیتیں کھجور کے پتوں پر لکھی ہوئی میرے صحیفہ میں موجود تھیں۔ ایک آیۂ رجم اور دوسری آیۂ رضاعت (جس میں کہا گیا تھا کہ دس گھونٹ دودھ پینے سے رضاعت کی حرمت ہو جاتی ہے) جب رسول اللہ نے وفات پائی تو اس حادثے میں مشغول ہو گئے۔ میری بکری آئی اور اس صحیفہ کو کھا گئی۔ (اس لئے اب یہ آیتیں تمہیں کہاں سے مل سکیں گی۔) (ابن ماجہ)

اس طرح یہ دو آیتیں قرآن میں درج نہ ہو سکیں لیکن حضرت عمرؓ نے کہا کہ اگر یہ قرآن میں درج نہیں ہو سکیں، تو کوئی بات نہیں۔ ہم ان پر عمل اسی طرح کرتے رہیں گے۔ ایک روایت میں ہے کہ حضرت عمرؓ سے (غالباً ان کے دورِ خلافت میں) کہا گیا کہ جب آپ کو اس قدر یقین ہے کہ آیۂ رجم قرآن کی آیت ہے تو آپ اسے داخلِ قرآن کیوں نہیں کر دیتے۔ اس پر آپ نے فرمایا[۱]

اگر مجھے یہ خوف نہ ہوتا کہ لوگ کہیں گے کہ عمرؓ نے قرآن میں اضافہ کر دیا تو میں اس آیت کو ضرور داخلِ قرآن کر دیتا۔

آیت قرآن میں داخل تو نہ ہوئی لیکن عمل اس کے مطابق ہوتا رہا۔

ضمناً رجم (یعنی زنا کی سزا سنگسار کرنے) کے حکم کی تائید میں بخاری میں حسبِ ذیل روایت درج ہے۔

(حضرت) عمر ابن میمونؓ کہتے ہیں کہ میں نے زمانہ جاہلیت میں ایک بندر کو دیکھا کہ بہت سے بندر اس کے پاس جمع ہو گئے تھے۔ اس نے زنا کیا تھا۔ ان سب نے اُسے سنگسار کر دیا۔ میں نے بھی انکے ساتھ اسے سنگسار کیا۔ (بخاری، پارہ پندرہ، باب قیامت)

---

[۱] ان امور کی تفصیل کے لئے ادارہ طلوعِ اسلام کی طرف سے شائع کردہ کتاب "مقامِ حدیث" ملاحظہ فرمایئے۔

بہر حال، ہم کہہ یہ رہے تھے کہ اس قسم کی وضعی روایات جن سے قرآنِ کریم کی محفوظیت کے متعلق شکوک در شکوک ابھرتے چلے آئیں، (منجملہ دیگر صحابہؓ) حضرت عمرؓ کی طرف بھی منسوب کی گئی ہیں۔ یہ قرآن (اسلام) کے خلاف بڑی گہری سازش تھی۔ اس کے متعلق وضاحت سے آخری باب میں لکھا جائے گا۔

فقہ عمرؓ

ہم دیکھ چکے ہیں کہ حضرت عمرؓ خدا سے تدبّر فی القرآن کی دعائیں مانگتے رہے۔ وہ ساری عمر خدا کی اس کتابِ عظیم میں خود بھی غور و فکر کرتے رہے اور دیگر صحابہؓ کو بھی اس کی تاکید اور تلقین کرتے رہے۔ وہ تاکید کیا کرتے تھے کہ قرآن کے محض قاری (پڑھنے والے) نہ بنو۔ اس کے فقیہہ بھی بنو۔

اسلامی مملکت کے سربراہ کیلئے تفقہ فی القرآن کی ضرورت

قرآن کریم میں تفقہ یوں تو ہر مسلمان کے لئے ضروری ہے کہ خود قرآنِ کریم نے بار بار اس کا حکم دیا ہے لیکن جس شخص نے اسلامی مملکت کے امور کی سرانجام دہی کی ذمہ داریاں سنبھالنی ہوں، اس کے لئے تفقہ فی القرآن لاینفک ہو جاتا ہے، اس لئے کہ (جیسا کہ پہلے کہا جا چکا ہے) قرآن کریم میں، (چند جزئی احکام کے سوا) کلی قوانین اور اصولات دیئے گئے ہیں، اور یہ چیز اسلامی مملکت پر چھوڑی گئی ہے کہ وہ، ان اصول و قوانینِ کلی کی روشنی میں، اپنے اپنے حالات کے مطابق، جزئی یا فرعی قوانین خود مرتب کرے۔ ظاہر ہے کہ یہ کام تفقہ فی القرآن کے بغیر ناممکن ہے۔ چونکہ حضرت عمرؓ کے زمانے میں مملکت بڑی وسیع ہو گئی تھی، اور نت نئے حالات اور تقاضے سامنے آتے تھے، اس لئے، ان تقاضوں کے حل کے لئے قرآنِ کریم سے استنباطِ احکام، ایک مستقل فریضہ قرار پا گیا تھا۔ (اس اجمال کی تفصیل، آگے چل کر اس باب میں دی جاتے گی۔ جس کا عنوان "سیاسی نظام" ہے۔ بلکہ یوں کہیے کہ اس باب کے بھی اس ذیلی گوشے میں جس کا تعلق اسلامی مملکت میں قانون سازی کے اصول سے ہے) اس وقت ہم صرف اتنا بتانا چاہتے ہیں کہ جب تفقہ فی القرآن حضرت عمرؓ کا عام زندگی میں بھی معمول تھا، تو خلافت کی ذمہ داریاں سنبھالنے کے بعد، اس میں کس قدر اضافہ ہو گیا ہوگا۔ "ازالۃ الخفاء عن خلافۃ الخلفاء" خلافتِ راشدہ کے احوال و کوائف کے متعلق شاہ ولی اللہ دہلویؒ کی ایک مبسوط تصنیف ہے اور اس میں عہدِ فاروقیؓ کی

سرگذشت قریب ڈیڑھ سو صفحات پر پھیلی ہوئی ہے۔ اس میں ایک مستقل عنوان ہے ـــ رسالہ در مذہب فاروق اعظمؓ ـــ اس میں انہوں نے ان فقہی مسائل سے بحث کی ہے جنہیں حضرت عمرؓ نے قرآنِ کریم سے مستنبط فرمایا تھا۔ علامہ شبلیؒ نے لکھا ہے کہ فقہ کے جس قدر مسائل حضرت عمرؓ سے منقول ہیں ان کی تعداد یوں تو ہزاروں تک پہنچتی ہے لیکن ان میں جن مسائل کو تقدّم حاصل ہے' ان کی تعداد بھی ایک ہزار سے کم نہیں' اور شاہ ولی اللہؒ نے انہی مسائل کی تفصیل اپنے رسالہ میں دی ہے۔ ظاہر ہے کہ ہمارے لئے یہ مشکل ہے کہ ہم ان تمام مسائل کی تفصیل اپنی کتاب میں دے سکیں۔ اس لئے ہم ان کی چند ایک مثالوں پر اکتفا کریں گے۔

صرف عملی مسائل کے متعلق

مذکورہ بالا تعداد کے سلسلہ میں ایک بات اور بھی ذہن میں رکھنی چاہیے۔ ہمارے ہاں فقہ کی کتابوں میں دیکھئے۔ باب در باب' ایسے مسائل کے متعلق بحث و تمحیص کے لئے وقف ہوں گے جو درحقیقت کسی کو پیش نہیں آئے لیکن فرض کر لیا جاتا ہے کہ اگر ایسا ہو تو پھر کیا فتویٰ دیا جائے۔ ان " لو فرضنا " کی بیکار بحثوں اور ان کی تائید و تردید میں لاطائل دلیلوں نے جہاں ہماری کتبِ فقہ کو خواہ مخواہ " زنبیلِ عمر" بنا دیا ہے۔ وہاں اسے اس قدر الجھا دیا ہے کہ اس بھول بھلیاں سے نکلنا کسی کے بس میں نہیں رہتا۔ حضرت عمرؓ عملی انسان تھے اس لئے وہ کبھی ایسے مسائل کے متعلق گفتگو نہیں کیا کرتے تھے جو عملاً درپیش نہ ہوں۔ ایک دفعہ ایک شخص نے ایک ایسے مسئلہ کا جواب معلوم کرنا چاہا جو اسے دراصل پیش نہ تھا' تو آپ نے اس سے کہا کہ " ضرورت پیش آنے سے پیشتر' فرضی طور پر ذہن میں سوال قائم نہیں کرنا چاہیئے اور نہ ہی اس کے جواب کی تلاش میں مارے مارے پھرنا چاہیئے۔" ایسا کرنے والے کو آپ نے سختی سے ڈانٹا اور ملعون قرار دیا اور اس کا برسرِ منبر اعلان کیا۔ لہٰذا' فقہ عمریؓ انہی مسائل پر مشتمل ہے جو اس زمانے میں درحقیقت پیش آتے تھے۔

فقہ عُمریؓ کی مثالیں

(۱) قرآنِ کریم نے مسلمانوں کو' اہلِ کتاب کی عورتوں سے شادی کر لینے کی اجازت دی ہے (۵/۵) چنانچہ مسلمان ان سے نکاح کرتے تھے۔ حضرت عمرؓ نے دیکھا کہ ان (اہلِ کتاب کی) عورتوں کے' مسلمانوں کے گھروں میں آجانے سے' فتنے کا دروازہ کھل رہا ہے تو آپ نے اس کی ممانعت کر دی۔ حتیٰ کہ حضرت حذیفہؓ (گورنر مدائن) نے جس یہودی عورت سے شادی کر لی تھی' آپ نے لکھا کہ اسے طلاق دے دی جائے۔

اس سے ایک نہایت اہم قانونی مسئلہ مستنبط ہوا (اور وہ یہ کہ جن امور (کا قرآن نے حکم نہیں دیا بلکہ ان) کی محض اجازت دی ہے' اسلامی مملکت کو اختیار حاصل ہے کہ اگر وہ دیکھے کہ اس سے کوئی خرابی پیدا ہوتی ہے تو اس اجازت کو

معطل قرار دے دے۔ (وہ اسے منسوخ نہیں کر سکتی' مصالحِ اُمت کے پیشِ نظر اس اجازت کو وقتی طور پر روک سکتی ہے۔)

(۲) قرآنِ کریم میں زانی مرد اور زانی عورت کے لئے سزا مقرر کر دی گئی ہے (۲۴/۲) لیکن اس میں زنا بالجبر کے سلسلہ میں بالتصریح کچھ نہیں کہا گیا۔ حضرت عمرؓ کے زمانہ میں ایک ایسا مقدمہ سامنے آیا جس میں عورت سے بالجبر زنا کیا گیا تھا۔ آپ نے اسے سزا نہیں دی۔

اس سے بھی یہ اہم قانونی نکتہ مستنبط ہوُا کہ مجبور مستوجب سزا نہیں ہوتا' اور یہ منشائے قرآنی کے عین مطابق ہے جس میں کہا گیا ہے کہ جرم وہی قابل مواخذہ ہے جس کے ساتھ دل کا ارادہ شامل ہو۔ (۳۳/۵) اور اسی بنا پر اس نے قتل عمد اور قتل بالخطا میں فرق کر دیا ہے۔ (۹۳-۴/۹۲)

(۳) قرآنِ کریم نے ترکہ کی تقسیم کے سلسلہ میں وارثوں پر کوئی شرط نہیں لگائی لیکن حضرت عمرؓ نے یہ فیصلہ کیا کہ "قاتل' مقتول کا وارث نہیں ہو سکتا۔" آپ نے دیکھا کہ اس فیصلے سے کتنے بڑے فتنے کا دروازہ بند کر دیا گیا جس کی رو سے ہمارے ہاں جائیدادوں کی خاطر آئے دن قتل ہوتے رہتے ہیں۔ حضرت عمرؓ کے اس فیصلہ سے یہ جزئیہ بھی مستنبط ہو گیا کہ اسلامی حکومت' قرآنِ کریم کے کسی مطلق حکم کو (یعنی جس میں کوئی شرط نہ عائد کی گئی ہو) مقید کر سکتی ہے۔ یعنی اس پر عند الضرورت شرائط عائد کر سکتی ہے۔

(۴) ہمارے ہاں عام طور پر یہ سمجھا جاتا ہے کہ زانی مرد صرف زانیہ (عورت) سے' اور زانیہ عورت' صرف زانی مرد سے نکاح کر سکتے ہیں۔ اس کی سند میں قرآنِ کریم کی آیت (۲۴/۳) پیش کی جاتی ہے۔ ہمارے نزدیک' اس آیۂ قرآنیہ کا مطلب یہ نہیں لیکن حضرت عمرؓ نے اس سلسلہ میں جو فیصلہ دیا اس سے ایک اور قانونی نکتہ واضح ہوتا ہے۔ ایک شخص نے اپنی لڑکی کا عقد ایک آدمی سے کر دیا لیکن اس عورت نے اپنے شوہر سے کہا کہ مجھے ڈر ہے کہ میری وجہ سے تمہاری خفت نہ ہو کیونکہ مجھ سے ایک مرتبہ زنا کا ارتکاب ہو چکا ہے۔ یہ معاملہ حضرت عمرؓ کے سامنے پیش ہوا تو آپ نے فرمایا کہ کیا اس عورت نے توبہ کی ہے؟ جواب ملا کہ اس نے توبہ کر لی ہے۔ آپ نے فرمایا کہ تب اس سے نکاح جائز ہے۔

نکتہ یہ مستنبط ہوا کہ توبہ کے بعد (جسے عدالت تسلیم کر لے اور اس طرح سزا معاف کر دے) اس جرم کا دھبّہ مجرم سے مٹ جاتا ہے اور اس کے عواقب باقی نہیں رہتے۔

(۵) ہمارے ہاں یہ' وجہ تذلیلِ انسانیت اور یکسر خلافِ قرآن رسم عام ہے (اور اسے بدقسمتی سے مشروع سمجھا جاتا

ہے) کہ خاوند کھڑے کھڑے بیوی سے طلاق طلاق، طلاق کہہ دیتا ہے۔ اس سے بیوی پر ایسی طلاق پڑ جاتی ہے جس کے بعد یہ دونوں آپس میں نکاح نہیں کر سکتے۔ یہ نکاح اسی صورت میں ہو سکتا ہے کہ یہ عورت کسی دوسرے مرد سے نکاح کرے اور وہ اسے، شب بسری کے بعد، طلاق دے دے۔ اس شرم وحیا سے عاری رسم کو حلالہ کہا جاتا ہے۔ حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ اگر میرے پاس حلالہ کرنے والا، اور جس کے لئے حلالہ کیا جانا مقصود ہو، لایا گیا تو میں دونوں کو رجم (سنگسار) کی سزا دوں گا۔ حتیٰ کہ آپ نے ایک واقعہ میں، اس عورت کو بھی سزا دی جو اس فعلِ شنیع میں واسطہ (دلالہ) بن رہی تھی۔

اس سے یہ اصول مستنبط ہوا کہ جن امور کو قرآنِ کریم نے بالتصریح جرم قرار نہیں دیا، اسلامی مملکت انہیں، روحِ قرآنی کی روشنی میں، جرم بھی قرار دے سکتی ہے اور ان کی سزا بھی مقرر کر سکتی ہے۔

(۶) مروّجہ قوانین کی رو سے، قانون کی عدم واقفیت، ارتکابِ جرم کا عذر نہیں قرار پا سکتی۔ یعنی کوئی شخص یہ کہہ کر سزا سے نہیں بچ سکتا کہ مجھے اس بات کا علم نہیں تھا کہ ایسا کرنا قانوناً ممنوع ہے۔ قانون کا یہ مسلّمہ آج ساری دنیا میں رائج ہے لیکن حضرت عمرؓ نے اس کے خلاف فیصلہ صادر فرمایا۔ ایک مقدمہ میں یہ ثابت ہو گیا کہ مجرم کو واقعی علم نہیں تھا کہ ایسا کرنا ممنوع ہے۔ حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ اس دفعہ اسے معاف کیا جائے لیکن اس کے بعد اگر یہ اس جرم کا اعادہ کرے، تو پھر مستوجبِ سزا قرار پائے گا۔ فلہٰذا، آپ نے ایسا انتظام کیا کہ قانون کا علم عام ہو جائے۔

حضرت عمرؓ کا یہ فیصلہ بھی منشائے قرآنی کے عین مطابق ہے۔ سورۂ انعام میں ہے کہ مجرمین سے پوچھا جائے گا کہ کیا تمہارے پاس ہمارے پیغام بر آتے تھے جنہوں نے تمہیں بتا دیا تھا کہ تمہاری غلط روش کا نتیجہ کیا ہو گا؟ اور جب وہ اس کا اقرار کریں گے کہ انہیں ایسا بتا دیا گیا تھا تو پھر انہیں سزا ملے گی۔ (۶/۱۳۱) حضرت عمرؓ کا استنباط اس آیۂ جلیلہ سے تھا۔

ہم انہی مثالوں پر اکتفا کرتے ہیں۔ ان سے واضح ہو گیا ہو گا کہ حضرت عمرؓ کس طرح قرآنِ کریم پر غور و تدبّر کرتے تھے، اور اس کی کلّیات سے استنباطِ جزئیات کرنے کے لئے ان کا انداز اور مسلک کیا تھا۔ ان امور کی تفاصیل آئندہ (متعلقہ) عنوانات میں آپ کے سامنے آئیں گے۔ وبیدہ التوفیق۔

پانچواں باب

زندگی جہد ست استحقاق نیست

رسول اللہ سے دریافت کیا گیا کہ مومن کی زندگی کیا ہے؟
فرمایا کہ جب جہاد ہو رہا ہو تو اُس میں شریک ہو اور
جب نہ ہو رہا ہو تو اُس کی تیاری میں مصروف ہو!

سابقہ باب کے سرعنوان ہم نے لکھا تھا — دست او جز تیغ و قرآنے نہ داشت — قرآن کی بات اس باب میں کی گئی تھی۔ اب تیغ کی باری آتی ہے۔

جہاد کے معنی ہیں اپنے مقصد کے حصول کے لئے جدّوجہدِ مسلسل، سعیٔ پیہم، عملِ متواتر، تگ و تازِ لامنتہا۔ یہاں سوال یہ سامنے آتا ہے کہ یہ جدّوجہد، یہ تگ و تاز، یہ سعی و کاوش، یہ حرکت و عمل، بالآخر کس مقصد کے لئے؟ مقصد کی وضاحت تو بعد میں کی جائے گی، علمائے علم الحیات اور نفسیات کی تحقیق یہ ہے کہ یہ خود زندگی کا تقاضا ہے، بلکہ خود زندگی ہے۔ زندگی نام ہی سعیٔ مسلسل اور حرکتِ پیہم کا ہے۔ اقبالؒ کے الفاظ میں، — زندگی جہد است و استحقاق نیست — حرکت علامت ہے حیات کی — ہستم اگر می روم، می نروم نیستم۔

اس حد تک حرکت و حرارت اور سعی و عمل، ہر ذی حیات کا فطری شعار ہے جس میں انسان بھی شامل ہے۔ اس کا مقصد جذبۂ تحفّظِ خویش (SELF - PRESERVATION) ہے۔ زندگی جہاں بھی ہے وہ اپنا تحفظ چاہتی ہے، اور اس کی سعی و کاوش اسی مقصد کے لئے ہے لیکن انسانی سطح پر پہنچ کر، اس سعی و عمل کا مقصد، طبیعی زندگی کی حفاظت کے علاوہ، ایک اور بھی ہوتا ہے۔ اس کا سمجھ لینا ضروری ہے کیونکہ اگر یہ مقصد سامنے نہ ہو تو پھر انسان اور حیوان میں کوئی فرق نہیں رہتا۔

انسانی سطح زندگی کائنات میں خیر و شر، حق و باطل، تعمیری و تخریبی قوتیں ہر وقت مصروفِ جدوجہد رہتی ہیں لیکن ان کی یہ جدوجہد ایک دوسرے کے ساتھ ٹکرانے کے لئے ہوتی ہے۔ قرآنِ کریم کے الفاظ میں بَلْ نَقْذِفُ بِالْحَقِّ عَلَى الْبَاطِلِ...... (۲۱/۱۸) "حق اور باطل ایک دوسرے کے ساتھ ٹکراتے رہتے ہیں۔" حق کا تقاضا یہ ہوتا ہے کہ انسانی دنیا میں مستقل اقدارِ خداوندی کا غلبہ رہے تاکہ انسانیت ارتقائی منازل طے کرتی آگے بڑھتی اور بلند ہوتی چلی جائے۔ چونکہ ان اقدار کا غلبہ و تسلط، استحصال پسند گروہوں کی مفاد پرستیوں کے خلاف جاتا ہے، اس لئے وہ اس سعی و کاوش کی مزاحمت کرتے ہیں اور اس طرح ان دونوں جماعتوں میں مسلسل تصادم ہوتا رہتا ہے۔ اس تصادم کی آخری جولانگاہ میدانِ کارزار ہوتا ہے۔ جہاں یہ قوتیں، جان کی بازی لگا کر، ایک دوسرے کے بالمقابل صف آراء ہو جاتی ہیں۔ جہاد کی اس

جہاد اور قتال آخری منزل کو قتال (جنگ) کہا جاتا ہے۔ اس سے ظاہر ہے کہ جہاد صرف قتال کو نہیں کہتے۔ زندگی کی ہر جدوجہد کو جہاد کہا جاتا ہے اور قتال بھی جہاد میں شامل ہے۔ اس لحاظ سے بعض اوقات، لفظ جہاد کو قتال کے معنوں میں بھی استعمال کیا جاتا ہے۔ چنانچہ حضور نبی اکرمؐ کا جو ارشادِ گرامی، زیبِ عنوان ہے، اس میں جہاد کا لفظ قتال کے معنوں ہی میں استعمال کیا گیا ہے۔

قرآنِ کریم کی رو سے ہر مومن، مجاہد ہوتا ہے۔ ظاہر ہے کہ اس سے مراد میدانِ جنگ میں لڑنے والا سپاہی ہی نہیں۔ اس کا مطلب، زندگی کے ہر گوشے میں حق کی خاطر مصروفِ جدوجہد اور سرگرمِ عمل رہنے والا، حرکت اور حرارت کا زندہ و پائندہ پیکر، مردِ خدا ہے۔ قرآنِ کریم نے مجاہدین کے مقابلہ میں قاعدین کا لفظ لا کر، اس کا مفہوم واضح کر دیا ہے۔ سورۂ نساء میں ہے، لَا يَسْتَوِي الْقَاعِدُونَ مِنَ الْمُؤْمِنِينَ غَيْرُ أُولِي الضَّرَرِ وَالْمُجَاهِدُونَ فِي سَبِيلِ اللَّهِ بِأَمْوَالِهِمْ وَأَنْفُسِهِمْ۔ مومنوں میں سے قاعدین (بجز اس کے کہ وہ کسی وجہ سے معذور ہوں) مجاہدین کے برابر نہیں ہو سکتے۔ قاعدہ کے معنی ہوتے ہیں، بیٹھا رہنے والا، یا کسی کام میں سستی اور تاخیر کرنے والا۔ قرآنِ کریم کی رو سے، بیٹھے رہنے والے یا سست خرام لوگ کبھی ان لوگوں کے برابر نہیں ہو سکتے جو اللہ کی راہ میں مصروفِ جدوجہد اور مشغولِ حرکت و عمل رہیں۔ فَضَّلَ اللَّهُ الْمُجَاهِدِينَ بِأَمْوَالِهِمْ وَأَنْفُسِهِمْ عَلَى الْقَاعِدِينَ دَرَجَةً...... وَفَضَّلَ اللَّهُ الْمُجَاهِدِينَ عَلَى الْقَاعِدِينَ أَجْرًا عَظِيمًا۔ (۴/۹۵) خدا نے، مجاہدین کو قاعدین کے مقابلہ میں بلند درجہ اور اجرِ عظیم عطا کیا ہے۔ دیکھئے، یہاں مجاہدین فانہی کو نہیں کہا جو اپنی جانوں کے ساتھ جہاد فی سبیل اللہ کرتے ہیں، ان

نے ان لوگوں کو بھی مجاہدین کہا ہے جو اپنے مال و دولت کے ساتھ جہاد فی سبیل اللہ میں مصروف رہتے ہیں یعنی وہ لوگ جو زندگی کے ہر گوشے میں، اس مقصد کے حصول کے لئے جو خدا نے مقرر کیا ہے، ہر آن مصروف سعی و کاوش رہتے ہیں اور جب مخالفین کے ساتھ ٹکراؤ کا آخری مرحلہ سامنے آتا ہے تو شمشیر بدست اور کفن بدوش میدانِ جنگ میں باہر نکل آتے ہیں اور یہ جہاد کا بلند ترین مقام اور افضل ترین درجہ ہے۔

ہجرت سے مقصود

زندگی کی اس جدوجہد کا پہلا مرحلہ وہ ہے جس میں انسان کو، حصولِ مقصد کی خاطر، بہت کچھ چھوڑنا پڑتا ہے ــــ آرام و آسائش کو چھوڑنا پڑتا ہے۔ خور و نوش کو بھی چھوڑنا پڑتا ہے۔ گھربار کو چھوڑنا پڑتا ہے۔ اہل و عیال اور خویش و اقارب کو چھوڑنا پڑتا ہے۔ بڑی بڑی دلکش اور جاذبیت کی چیزوں کو چھوڑنا پڑتا ہے۔ حتیٰ کہ اگر دیکھا جائے کہ اپنے مشن کی کامیابی کے لئے، اپنے وطن کے مقابلہ میں کوئی دوسری جگہ زیادہ سازگار ہے تو وطن کو بھی تیاگ دینا پڑتا ہے۔ حق کی خاطر، زندگی کی ان آسائشوں اور دامن کشیوں کو چھوڑ دینا، قرآن کی اصطلاح میں ہجرت کہلاتا ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ جس طرح میدانِ جنگ میں قتال بھی جہاد کہلاتا ہے، اسی طرح ہجرت کا لفظ بھی عام طور پر ترکِ وطن کے لئے بولا جاتا ہے لیکن جس طرح جہاد کو میدانِ جنگ تک محدود کر دینا صحیح نہیں، اسی طرح ہجرت کو محض ترکِ وطن قرار دے دینا بھی اس کے وسیع مفہوم کو مقیّد کر دینا ہے۔ ہجرت: ہر اس شے سے کنارہ کشی کے مرادف ہے جو حصولِ مقصد کی راہ میں رکاوٹ پیدا کرے اور اس کی آخری شکل ترکِ وطن ہے۔ سمجھنے کے لئے یوں کہئے کہ ہجرت، دین کے عظیم پروگرام کا حصّہ لاؔ ہے اور جہاد اس کا مرحلہ اِلاّ۔ مردِ مومن (جسے خدا کا سپاہی کہنا چاہیئے) مہاجر بھی ہوتا ہے اور مجاہد بھی۔ دیکھئے قرآن کریم نے اس حصّہ لاؔ (یعنی ہجرت) کی وضاحت کس انداز سے کی ہے جب کہا ہے کہ قُلْ "اے رسولؐ! ان لوگوں سے کہہ دو کہ اگر تمہارے ماں باپ اور اولاد، تمہارے خویش و اقارب اور بیویاں، تمہارے اہل خاندان اور مال و دولت، تمہارا کاروبار جس کے مندا پڑ جانے سے تم اس قدر خائف ہوتے ہو اور تمہارے محلات، جنہیں تم اس قدر پسند کرتے ہو۔" اَحَبَّ اِلَیْکُمْ مِّنَ اللّٰہِ وَ رَسُوْلِہٖ وَ جِهَادٍ فِیْ سَبِیْلِہٖ ان میں سے کوئی شے بھی تمہارے نزدیک خدا اور رسولؐ اور اس کے راستے میں جہاد سے زیادہ محبوب ہو گئی، تو فَتَرَبَّصُوْا۔ انتظار کرو۔ حَتّٰی یَاْتِیَ اللّٰہُ بِاَمْرِہٖ ۔ تا آنکہ تمہارے متعلق خدا کا فیصلہ تمہارے سامنے آجائے۔ وَ اللّٰہُ لَا یَهْدِی الْقَوْمَ الْفٰسِقِیْنَ ۔ (۹/۲۴) مقصدِ خداوندی کے حصول کے راستے میں اگر ان میں سے کوئی شے بھی تمہارے دامن گیر ہو گئی تو اسے فسق کہا جائے گا اور قومِ فاسقین پر کشاد کی راہیں کبھی

نہیں کھلتیں۔ آپ نے غور فرمایا کہ ہجرت کا مرحلہ، کس طرح جہاد کے لئے شرطِ اوّلین (PRE - REQUSITE) (QUALIFICATION) ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ دونوں حصے ایک دوسرے کے لئے لازم و ملزوم ہیں۔ جس شخص کا دامن، راستے کی خاردار جھاڑیوں میں اُلجھ کر رہ جائے، وہ منزلِ مقصود تک کیسے پہنچ سکتا ہے؟ اقبالؒ کے الفاظ میں ؎

ہجرت آئینِ حیاتِ مسلم است
این ز اسبابِ ثباتِ مسلم است

ثباتِ زندگی، جدوجہد کا فطری نتیجہ ہے اور اس جدوجہد کا مرحلۂ اوّلین، ہر اس شے سے قطع تعلق کر لینا ہے جو اس کے راستے میں حائل ہوتی ہو۔ یہ وجہ ہے کہ قرآن نے مہاجرین اور مجاہدین

مہاجران اور مجاہدین

کو ایک ہی سکّہ کے دو رُخ اور ایک ہی حقیقت کے دو گوشے قرار دیا ہے سورۂ توبہ میں ہے۔ اَلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَهَاجَرُوْا وَجَاهَدُوْا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ اَعْظَمُ دَرَجَةً عِنْدَ اللّٰهِ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْفَآئِزُوْنَ۔ (۹/۲۰) جن لوگوں نے قوانینِ خداوندی کی صداقت کا اقرار کیا، پھر اس کی راہ میں جس چیز کو چھوڑنے کی ضرورت پڑی، اسے بلا تکلّف و بلا تامّل چھوڑ دیا اور حصولِ مقصد کے لئے اپنے مال اور جان سے مصروفِ جدوجہد رہے، خدا کے ہاں ان کے درجات بہت بلند ہیں اور یہی لوگ ہیں جنہیں کامیاب و کامران کہا جاتے گا۔ نہیں! ایک قدم اور آگے بڑھیئے۔ اور جو بات سورۂ انفال میں کہی گئی ہے اسے بڑے غور سے سنیئے۔ کہا ہے۔ وَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَهَاجَرُوْا وَجَاهَدُوْا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ وَالَّذِیْنَ اٰوَوْا وَّنَصَرُوْٓا اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُؤْمِنُوْنَ حَقًّا۔ لَهُمْ مَّغْفِرَةٌ وَّ رِزْقٌ كَرِیْمٌ۔ (۸/۷۴)۔ جو لوگ ایمان لاتے اور انہوں نے ہجرت کی اور جہاد کیا اور جن لوگوں نے انہیں ٹھکانا دیا اور ان کی ہر طرح سے مدد کی، یہ سب پکے اور سچے مومن ہیں۔ ان کے لئے مغفرت اور رزقِ کریم کا فیصلہ ہو چکا ہے۔ اس سے ذرا پہلے اس کی بھی وضاحت کر دی کہ وَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَلَمْ یُهَاجِرُوْا مَا لَكُمْ مِّنْ وَّلَایَتِهِمْ مِّنْ شَیْءٍ حَتّٰی یُهَاجِرُوْا۔ (۸/۷۲) جو لوگ ایمان تو لے آتے لیکن انہوں نے (بلا عذر) ہجرت نہیں کی تو ان کی حفاظت کا ذمّہ تمہارے اوپر عائد نہیں ہوتا تاوقتیکہ وہ ہجرت نہ کریں۔ یہ اس لئے کہ، جیسا کہ پہلے کہا گیا ہے، ہجرت جہاد کی منزلِ اوّل ہے۔ جو اس منزلِ اوّل میں پورا نہیں اُترتا، وہ منزلِ دوم میں کیا کرے گا!

ان تصریحات سے واضح ہے کہ مومن کی زندگی ہجرت اور جہاد سے ترتیب پاتی ہے۔ یعنی اس کی زندگی

کا جو مقصد خدا نے مقرر کر دیا ہے (یعنی دنیا میں قرآن کے نظامِ حق و صداقت کو قائم کرنا اور غالب رکھنا) اس کے راستے میں جو شے حائل ہوتی ہو، اسے بلا تامل چھوڑ دینا، اور اس (مقصد) کے حصول کے لئے مثبت طور پر ہر قسم کی جدوجہد کرنا، حتیٰ کہ اگر اس کے لئے جان بھی دینی پڑے تو اسے بھی بلا تذبذب و بلا توقف حاضر کر دینا۔

اس مقصد کی خاطر جان دینے کو خدا نے بلند ترین عمل اور منتہائے جہاد قرار دیا ہے اور یہ حقیقت بالکل واضح ہے۔ انسان (بلکہ حیوانات) کے متعلق جس قدر تحقیقات عمل میں آئی ہیں، ان کا ایک نتیجہ ایسا ہے جسے

جان دے دینا

متفق علیہ اور ہر اعتبار سے یقینی قرار دیا جاتا ہے۔ وہ نتیجہ یہ ہے کہ تحفّظِ خویش (PRESERVATION OF SELF) زندگی کا اوّلین، بنیادی اور اٹل تقاضا ہے، یعنی (جیسا کہ پہلے کہا جا چکا ہے) زندگی جہاں بھی ہے وہ ہر حال میں، اور ہر قیمت پر، اپنے آپ کو محفوظ رکھنا چاہتی ہے۔ زندگی کے اوّلیں جرثومہ سے لے کر حیوانات تک، ان کا انفرادی اور اجتماعی مقصد تحفّظِ خویش (اور اس کے بعد افزائشِ نسل) سے زیادہ کچھ نہیں، بلکہ یوں کہئے کہ افزائشِ نسل بھی درحقیقت تحفّظِ خویش ہی کا ایک ذریعہ ہے یعنی یہ انواع اپنے افراد کے طبیعی خاتمے کے بعد، اپنا تحفّظ اور بقا، اپنی نسل کے تسلسل سے قائم رکھنا چاہتی ہیں۔ ان کے سامنے اس سے بلند مقصد اور کوئی نہیں۔ انسان کی طبیعی زندگی بھی حیوانی زندگی ہی ہے اور اس کے تقاضے بھی وہی جو دیگر حیوانات کی زندگی کے تقاضے ہیں۔ ان میں، جیسا کہ ابھی ابھی کہا گیا ہے، تحفّظِ خویش کا تقاضا اساسی اور بنیادی حیثیت رکھتا ہے لیکن انسانی زندگی، حیوانی زندگی سے ایک حیثیت سے متمیز ہے، اور وہ یہ کہ انسان کے سامنے طبیعی تقاضوں کے علاوہ، اور ان سے بلند ایک اور تقاضا بھی ہے اور وہ تقاضا ہے نظامِ حق و صداقت کو بلند اور غالب رکھنا۔ جن علائق کو ہم نے اس راستے میں رکاوٹیں کہا ہے، وہ درحقیقت وہ مقامات ہیں جہاں زندگی کے کسی طبیعی تقاضے اور انسانیت کے اس بلند مقصد میں ٹکراؤ واقعہ ہوتا ہو۔ اس مقصد کے حصول کی خاطر، ان طبیعی تقاضوں کو چھوڑتے چلے جانا، ہجرت ہے لیکن اس تصادم میں آخری مقام وہ آجاتا ہے جس میں خود زندگی اور اس بلند مقصد میں تصادم واقعہ ہو جاتا ہے، یعنی اس مقصد کے حصول کے لئے جان دے دینے کی ضرورت پڑ جاتی ہے۔ چونکہ تحفّظِ خویش، زندگی کا بنیادی تقاضا ہے، اس لئے، یہ مقام بڑی سخت آزمائش کا ہوتا ہے اور جو یہاں پورا اترے وہ طبیعی (اور حیوانی) زندگی کی سطح سے بلند ہو کر، زندگی کی اگلی ارتقائی منزل میں پہنچنے کے قابل قرار پا جاتا ہے۔ قرآنِ کریم نے اسے دعویٰ ایمان کے پرکھنے کا معیار قرار دیا ہے۔ اس نے اسلامی

نظام کے مخالفین سے کہا کہ فَتَمَنَّوُا الْمَوْتَ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ۔ (۲/۹۴) اگر تم سچے ہو تو موت کی تمنا کرو۔ سوال یہ ہے کہ وہ ایمان' وہ دعویٰ کیا ہے جس کی صداقت کے پرکھنے کا معیار موت کی تمنا قرار دیا گیا ہے۔ قرآن کریم کہتا ہے کہ ایک

ایمان سے کیا مراد ہے

نظریۂ زندگی یہ ہے کہ انسانی زندگی بھی دیگر حیوانات کی طرح بس طبیعی زندگی ہے۔ انسان بھی حیوانات کی طرح کھاتا پیتا' سوتا جاگتا' افزائشِ نسل کرتا اور اس کے بعد مر جاتا ہے اور موت کے ساتھ اس کا خاتمہ ہو جاتا ہے۔ اس نظریۂ حیات کو وہ کفر کہہ کر پکارتا ہے۔ وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا يَتَمَتَّعُوْنَ وَيَاْكُلُوْنَ كَمَا تَاْكُلُ الْاَنْعَامُ (۴۷/۱۲) کفر کا شیوہ اختیار کرنے والوں کا انداز یہ ہے کہ وہ حیوانات کی طرح کھاتے پیتے اور دیگر متاعِ دنیا سے فائدہ اٹھاتے ہیں (اور اس کے بعد مر جاتے ہیں) ان کے برعکس' مومن کی کیفیت یہ ہے کہ وَ بِالْاٰخِرَةِ هُمْ يُوْقِنُوْنَ۔ (۲/۴) وہ اس حقیقت پر ایمان رکھتے ہیں کہ موت سے زندگی کا خاتمہ نہیں ہو جاتا۔ زندگی ایک جوئے رواں کی طرح آگے بھی چلتی ہے اور خدا کی وحی وہ ضابطۂ حیات عطا کرتی ہے جس کے مطابق زندگی بسر کرنے سے انسان' زندگی کی اگلی ارتقائی منزل طے کرنے کے قابل ہو جاتا ہے۔

اب ظاہر ہے کہ جس شخص کے نزدیک' زندگی بس اسی دنیا کی زندگی ہو' اس کے لئے تحفظِ خویش بنیادی اور آخری مقصدِ حیات ہوگا۔ وہ کبھی مرنا نہیں چاہے گا۔ وہ موت سے بچنے کی ہر ممکن کوشش کرے گا اور یہ جاننے کے باوجود کہ اَيْنَ مَا تَكُوْنُوْا يُدْرِكْكُّمُ الْمَوْتُ۔ (۴/۷۸) تم کہیں بھی ہو' موت تمہیں ضرور پکڑ لے گی۔ موت سے کسی حالت میں بھی مفر نہیں' اس نے آکر رہنا ہے۔ یہ سب کچھ جاننے کے باوجود' موت سے بھاگے بھاگے پھرے گا' اور اس کے سامنے آنے کے احساس سے ہر وقت ترساں و لرزاں رہے گا۔ اس کے برعکس' ایمان بالآخرت کا حامل' موت کو ایک نئی منزل میں داخل ہونے کا دروازہ سمجھے گا اور تبسّم برلب اس کا استقبال کرے گا۔ اس کے یہ معنی نہیں کہ وہ اپنے آپ کو خواہ مخواہ خطرے میں ڈال کر موت کے منہ میں چلا جائے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ اگر ایسا وقت آجائے کہ اسے حق و صداقت کے تحفظ اور اعلائے کلمۃ اللہ (خدا کے متعین کردہ نظریۂ حیات) کے غلبہ و کامرانی کے لئے جان تک بھی دینی پڑے' تو وہ جان بچانے کی خاطر بھاگ نہیں جائے گا۔ وہ مردانہ وار موت کا سامنا کرے گا اور ہنسی خوشی جان دے دے گا۔ یوں موت کی تمنا اس کے دعوائے ایمان کی صداقت کی شہادت قرار پا جائے گی۔

شہادت

اس طرح جان دینے والوں کو جو عام اصطلاح میں 'شہید' کہا جاتا ہے، تو وہ اسی لئے کہ ان کی موت، ان کے دعوائے ایمان کی شہادت (گواہی) دیتی ہے۔ کشمکشِ حیات میں موت کے ڈر سے، راہِ فرار اختیار کرنے والوں کو قرآن مردے کہہ کر پکارتا ہے۔ ایسے مُردے جو اپنی لاشیں اپنے کندھوں پر اٹھائے اٹھائے پھرتے ہیں۔ سورۃ بقرہ میں ہے۔ اَلَمْ تَرَ اِلَی الَّذِیْنَ خَرَجُوْا مِنْ دِیَارِھِمْ وَ ھُمْ اُلُوْفٌ حَذَرَ الْمَوْتِ۔ تم نے ان کی حالت پر بھی غور کیا جو اگرچہ ہزاروں کی تعداد میں تھے لیکن جب دشمن کے ساتھ مقابلہ کا وقت آیا تو اپنا گھر بار چھوڑ کر، موت کے ڈر سے بھاگ اٹھے۔ وہ بھاگ اٹھے تو فَقَالَ لَھُمُ اللّٰہُ مُوْتُوْا۔ (۲/۲۴۳) خدا کے قانونِ مکافات نے انہیں پیچھے سے آواز دی کہ تم موت کے ڈر سے بھاگ نکلے ہو، اور یوں اپنے آپ کو زندہ خیال کرتے ہو۔ یہ تمہاری خام خیالی اور خوش فہمی ہے۔ تم سانس ضرور لیتے ہو لیکن موت تو تم پر طاری ہو چکی ہے۔ تمہارا شمار زندوں میں نہیں ہو سکتا۔ تم مردہ ہو۔ ان کے برعکس، جو لوگ حق و باطل کی کشمکش میں اعلائے حق کی خاطر جان دے دیں، ان کے متعلق کہا کہ اگرچہ طبیعی نقطۂ نگاہ سے وہ مر چکے ہیں، بَلْ اَحْیَآءٌ (۲/۱۵۴) لیکن وہ درحقیقت زندہ ہیں۔ انہیں تم مردہ مت سمجھو، مردہ مت کہو۔ (۳/۱۶۸) قرآن کی دعوت، انسان کو موت کے خوف سے نجات دلا کر حیاتِ ابدی عطا کرنے کی دعوت ہے۔ اسی لئے اس نے کہا کہ یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اسْتَجِیْبُوْا لِلّٰہِ وَ لِلرَّسُوْلِ اِذَا دَعَاکُمْ لِمَا یُحْیِیْکُمْ۔ (۸/۲۴) تم خدا اور رسول کی اس دعوت پر لبیک کہو جو تمہیں حیاتِ ابدی عطا کرنے کی ضمانت دیتی ہے۔ قرآنِ کریم نے اس زندگی کو قابلِ رشک، حیاتِ خوش آئند اسی لئے کہا ہے کہ اس میں موت کا خوف دامن گیر نہیں ہوگا۔ بالفاظِ دیگر، اس قسم کی موت مرنے والا، خود نہیں مرتا بلکہ موت کو مار دیتا ہے اور فاتح و منصور، رقصاں و فرحاں، یہ پکارتا ہوا آگے بڑھ جاتا ہے کہ اَفَمَا نَحْنُ بِمَیِّتِیْنَ۔ اِلَّا مَوْتَتَنَا الْاُوْلٰی (۳۷/۵۸-۵۹) ہم نے اس طرح مر کر، موت کو مار دیا ہے۔ اب ہم کبھی نہیں مر سکتے۔ اسی کو جنت کی زندگی کہتے ہیں، جس تک پہنچنے کا راستہ، باطل

جنت کا راستہ

کی قوتوں کے ساتھ تصادمات و تزاحمات سے پٹا پڑا ہے۔ اسی لئے کہا کہ:

کیا تم خیال کرتے ہو کہ تم جنت میں یونہی داخل ہو جاؤ گے حالانکہ تم ہنوز ان جانگداز اور صبر آزما مراحل میں سے نہیں گزرے جن میں سے ان لوگوں کو گزرنا پڑا تھا جو تم سے پہلے ان راستوں پر چلے تھے۔ ان کی کیفیت یہ تھی کہ سختیاں اور مصیبتیں انہیں ہر طرف سے گھیر لیتیں۔ شدائد و مشکلات سے ان کا دل دہل جاتا۔ یہاں تک کہ وہ اور ان کا رسول پکار

اُٹھتے کہ بارِ الٰہا! ہماری کوششوں کے بار آور ہونے کا وقت کب آئے گا۔ ایسے ہمت شکن

اور جرأت آزما تصادمات کے بعد کہیں جاکر ان کی کوششیں کامیاب ہوئیں۔ (۲/۲۱۴)

تمہیں بھی، جنت میں داخل ہونے کے لئے، انہی مراحل میں سے گزرنا ہوگا۔

دوسری جگہ ہے۔ اَمْ حَسِبْتُمْ اَنْ تَدْخُلُوا الْجَنَّةَ وَ لَمَّا يَعْلَمِ اللّٰهُ الَّذِيْنَ جَاهَدُوْا مِنْكُمْ وَ يَعْلَمَ الصّٰبِرِيْنَ۔ (۳/۱۴۱) کیا تم یہ خیال کئے بیٹھے ہو کہ تم جنت میں داخل ہو جاؤ گے حالانکہ ابھی تک یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ تم میں سے مجاہد کون ہے اور کون کس حد تک مشکلات اور مصائب میں ثابت قدم رہتا ہے۔

آگے بڑھنے سے پہلے، یہاں ایک نکتہ کی وضاحت ضروری ہے۔ قرآنِ کریم کی ان (اور اسی قسم کی دوسری) آیات کا، یہ مطلب نہیں کہ جو شخص جنگ کی صعوبات و مشکلات سے دوچار نہیں ہوتا وہ جنت میں جا ہی نہیں سکتا۔ ایسا ہو سکتا ہے کہ ایک شخص (حتیٰ کہ ایک قوم) کی زندگی میں جنگ کا موقعہ ہی نہ آئے۔ خود نبی اکرمؐ اور صحابہؓ کی زندگی میں مکہ کے تیرہ سال ایسے گذرے جس میں جنگ کا موقعہ نہیں آیا۔ اس کے یہ معنی نہیں کہ جو مومنین اس زمانے میں وفات پا گئے وہ جنت کے مستحق قرار نہیں پا سکتے۔ ایسا سمجھنا صحیح نہیں۔ ان ارشاداتِ خداوندی کا مطلب یہ ہے کہ مومن کی زندگی مسلسل جہاد کی زندگی ہے جس میں ہر قسم کے خطرات کا ہر وقت امکان ہے اس لئے اسے ان خطرات کے مقابلہ کے لئے ہر وقت تیار رہنا چاہیئے۔ اگر ان حالات میں کسی وقت خطرہ سچ مچ سامنے آجائے تو اس کا مقابلہ کرے، خواہ اس مقابلہ میں جان تک بھی کیوں نہ دینی پڑے اور اگر ایسا وقت نہ آئے تو اس میں اس کا قصور نہیں۔ وہ تو اس کے لئے ہر وقت آمادہ اور تیار تھا۔ یہی وجہ ہے جو قرآنِ کریم نے دوسرے مقام پر کہہ دیا ہے کہ وَلَئِنْ قُتِلْتُمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَوْ مُتُّمْ لَمَغْفِرَةٌ مِّنَ اللّٰهِ۔ (۳/۱۵۷) اگر تم اللہ کی راہ میں قتل کر دیئے جاؤ یا تمہیں ویسے ہی موت آجائے، تو ہر دو صورتوں میں تم اللہ کی مغفرت کے حقدار ہو جاؤ گے۔

ہم کہہ یہ رہے تھے کہ قرآنِ کریم کی رُو سے، جنت کی طرف جانے والا راستہ، خطرات اور مشکلات سے بٹا پڑا ہے اور انہی کے مقابلہ سے انسانی ذات کی وہ صلاحیتیں ابھرتی ہیں جو اسے حیاتِ ابدی کا مستحق بنا دیتی ہیں۔ اقبالؒ کے الفاظ میں۔

حیاتِ جاوداں اندر ستیز است

مجاہدین کے اعمالِ صالحہ

اور یہی وجہ ہے کہ اس راستہ پر چلنے والے، مردانِ جفاکش و ثبات طلب کے ہر قدم کو عملِ صالح کہہ کر پکارا گیا ہے۔ سورۂ توبہ میں ہے کہ

(خدا کے یہ سپاہی) بھوک اور پیاس کی جس مصیبت کو جھیلتے ہیں، جس تکان، اور مشقت کو وہ برداشت کرتے ہیں، ان کا ہر قدم جو اس مقام پر پڑتا ہے جو دشمن کے لئے غیظ و غضب کا موجب ہوتا ہے، حتیٰ کہ ہر نقصان جو انہیں مخالفین کی طرف سے پہنچتا ہے اور ہر گزند جو وہ اٹھاتے ہیں، ان میں سے ایک ایک چیز ان کے لئے عملِ صالح بنتی چلی جاتی ہے۔ یہ اس لئے کہ خدا کا قانونِ مکافات کسی کا حسن کارانہ عمل ضائع نہیں کرتا۔ اسی طرح، یہ لوگ اس مقصد کے لئے جو کچھ بھی خرچ کرتے ہیں — خواہ تھوڑا ہو یا بہت — یا جو منزل بھی وہ قطع کرتے ہیں، وہ سب ان کے اعمالنامہ میں لکھ لئے جاتے ہیں تاکہ خدا ان کے حسنِ عمل کا انہیں بہترین بدلہ دے۔ (۹/۱۲۰۔۲۱)

اس لئے کہ کسی بلند مقصد کے حصول کے لئے جو ذرائع اختیار کئے جائیں (بشرطیکہ وہ ذرائع ضابطۂ خداوندی کے مطابق ہوں) وہ خود اس مقصد کا جزو بنتے چلے جاتے ہیں، اور ان ذرائع کو اختیار کرنے والے، ان مفادات کے برابر کے حقدار جو اس مقصد کے حصول سے مرتب ہوں۔ خواہ وہ باقی افرادِ کارواں کے ساتھ منزلِ مقصود تک پہنچ جائیں یا راستے ہی میں وفات پا جائیں۔ سورۂ نساء میں ہے۔

جو اپنا گھر بار، سب کچھ چھوڑ چھاڑ، خدا کی راہ میں نکل کھڑا ہو، اسے منزل پر پہنچنے کے بعد سامانِ حفاظت اور زندگی کی خوشگواریاں بافراط میسر آ جائیں گی لیکن اگر وہ منزل تک نہ بھی پہنچ سکے اور اسے راستے ہی میں موت آ جائے تو بھی اس کا اجر خدا کے ذمہ واجب ہو جائے گا۔ (۴/۱۰۰)

یعنی مومن کی زندگی یہ ہے کہ وہ خدا کے متعین فرمودہ مقصد کے حصول کے لئے، اٹھ کھڑا ہوا اور دنیاوی مفاد و متاع کی جس قدر جاذبیتیں، اور لذائذ و حظائظ کی جس قدر دلکشیاں اس کی دامن کش اور عناں گیر ہوں، انہیں جھٹک کر الگ کر دے۔ راستے میں جس قدر مشکلات و خطرات سامنے آئیں، ان کا ڈٹ کر مردانہ وار مقابلہ کرتے ہوئے آگے ہی آگے بڑھتا چلا جائے۔ اس میں موت آ جائے تو بھی اس کی خوش نصیبی، اور منزلِ مقصود تک زندہ پہنچ جائے تو بھی بیدار بختی۔ قرآن کے الفاظ میں:۔

اس راستے میں کہیں جنگ و قتال اور دیگر خطرات کا اندیشہ ہوگا، کہیں سامانِ خور و نوش کی کمی ہو

گی۔ کہیں مال کا نقصان ہوگا کہیں جان کا اتلاف کہیں فصلیں اجڑیں گی اور باغات تباہ ہوں گے۔ یہ تمام خطرات اور نقصانات سامنے آئیں گے لیکن کامرانیوں اور فائز المرامیوں کی خوشخبریاں ان کے لئے ہوں گی جو اس جدوجہد میں ثابت قدم رہیں گے اور مصائب و مشکلات کے ہجوم میں ان کی نگاہ اس نقطہ سے ذرا بھی اِدھر اُدھر نہیں ہٹے گی۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَ اِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ۔ ہمارا مقصد خدا کے پروگرام کو پورا کرنا ہے۔ ہم نے اپنے آپ کو اس مقصد کے لئے وقف کر رکھا ہے۔ مشکلات آتی ہیں تو آئیں۔ ہم ان سے ڈر کر منہ نہیں موڑیں گے۔ ہمارا ہر قدم اسی نصب العین کی طرف اٹھے گا۔ وہی ہمارا مقصود و منتہیٰ ہے اور ہم ہر حال میں اسی کی طرف رجوع کریں گے۔ (۲/۱۵۶)

یہ ہیں وہ اربابِ عزم و ہمم' اور پیکرانِ ثبات و استقامت جن کے متعلق کہا کہ عَلَیْهِمْ صَلَوٰتٌ مِّنْ رَّبِّهِمْ وَ رَحْمَةٌ ۔ وَ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُهْتَدُوْنَ۔ (۲/۱۵۷) ان کے نشو و نما دینے والے کی طرف سے ان پر تحسین و آفریں کے ڈونگرے برسائے جاتے ہیں اور ان پر نوازشاتِ خداوندی کی بارشیں ہوتی ہیں۔ یہی وہ لوگ ہیں جن کا منزلِ مقصود تک پہنچ جانا یقینی ہے۔ اس سے ذرا آگے چل کر کہا کہ "نیکی یہ نہیں کہ تم مشرق کی طرف منہ کرتے ہو یا مغرب کی طرف۔ نیکی یہ ہے کہ تم (علاوہ دیگر امور) مخالفین کے ساتھ مقابلہ کے وقت مشکلات و مصائب میں کس حد تک ثابت قدم رہتے ہو! (۲/۱۷۷) چھوٹی موٹی مصائب اور مشکلات تو ایک طرف' ان کے عزم و یقین اور ثبات و استقامت کا عالم یہ ہوتا ہے کہ (اِذْ) قَالَ لَهُمُ النَّاسُ اِنَّ النَّاسَ قَدْ جَمَعُوْا لَكُمْ فَاخْشَوْهُمْ — جب ان سے لوگ کہتے ہیں کہ تمہارے دشمنوں نے تمہارے خلاف ایک لشکرِ جرار جمع کر لیا ہے اس لئے تمہیں ان سے ڈرنا چاہیئے۔ فَزَادَهُمْ اِيْمَانًا تو اس سے ان کا ایمان اور بھی بڑھ جاتا ہے۔ وَ قَالُوْا حَسْبُنَا اللّٰهُ وَ نِعْمَ الْوَكِيْلُ (۳/۱۷۲) اور وہ دل کے پورے اطمینان سے کہتے ہیں کہ دشمن کا لشکر بہت بڑا ہے تو ہوا کرے، قانونِ خداوندی کی نصرت اور تائید ہمارے شاملِ حال ہے اور یہ وہ قوت ہے جس کے بعد کسی اور قوت کی حاجت نہیں رہتی اور جس پر پورا پورا بھروسہ کیا جا سکتا ہے۔ فَانْقَلَبُوْا بِنِعْمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ وَ فَضْلٍ لَّمْ يَمْسَسْهُمْ سُوْٓءٌ ۔ وَّ اتَّبَعُوْا رِضْوَانَ اللّٰهِ ۔ وَ اللّٰهُ ذُوْ فَضْلٍ عَظِيْمٍ (۳/۱۷۳) یہ' اس عزم و یقین کے ساتھ میدانِ کارزار میں آگے بڑھتے ہیں اور کسی قسم کا نقصان اٹھائے بغیر' نعمائے خداوندی کی جھولیاں بھر بھر کر واپس آتے ہیں — حقیقت یہ ہے کہ قانونِ خداوندی اپنے نتائج کے اعتبار سے بڑا پُرثمر اور بار آور واقع ہوا ہے۔

——— (۵) ———

یہ مؤمنین حقا ـــ پکے اور سچے مومنین کی خصوصیات ہیں۔ ان کے برعکس، قرآن کریم نے ایک اور طبقہ کا بھی ذکر کیا ہے جن کی حالت یہ ہے کہ معاملہ اگر رسمی نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ تک رہے تو وہ چھاتی پر ہاتھ رکھ کر اپنے آپ کو مسلمان کہیں گے لیکن اگر کہیں جنگ کی بات

منافقین کی حالت

آجائے تو ان پر کپکپی چھا جائے گی۔ یہی وہ طبقہ ہے جس کا ذکر کرتے ہوئے سورۂ نساء میں کہا کہ اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ قِيْلَ لَهُمْ كُفُّوْٓا اَيْدِيَكُمْ وَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ۔ تم نے ان لوگوں کی حالت پر بھی غور کیا کہ جب تک دین کا نظام اپنے ابتدائی مراحل سے گزرتا رہا جس میں تمہیں ہاتھ اٹھانے سے روکا گیا تھا اور تمہاری جماعت اقامتِ الصلوٰۃ اور ایتائے زکوٰۃ کے ابتدائی تربیتی منازل سے گذر رہی تھی، تو وہ بہت خوش تھے۔ فَلَمَّا كُتِبَ عَلَيْهِمُ الْقِتَالُ اِذَا فَرِيْقٌ مِّنْهُمْ يَخْشَوْنَ النَّاسَ كَخَشْيَةِ اللّٰهِ اَوْ اَشَدَّ خَشْيَةً۔ لیکن جب دین کا اگلا پروگرام سامنے آیا جہاں مخالفین سے ٹکراؤ ناگزیر ہو گیا اور انہیں جنگ کرنے کا حکم دیا گیا تو ان میں سے ایک گروہ انسانوں سے اس طرح ڈرنے لگ گیا جیسے خدا کے قانونِ مکافات سے ڈرنا چاہیئے بلکہ اس سے بھی زیادہ شدت کے ساتھ وَقَالُوْا رَبَّنَا لِمَ كَتَبْتَ عَلَيْنَا الْقِتَالَ۔ اور کہنے لگا کہ اے ہمارے پروردگار! تو نے ہم پر جہاد کیوں فرض قرار دے دیا لَوْلَآ اَخَّرْتَنَآ اِلٰٓى اَجَلٍ قَرِيْبٍ۔ کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ تو ہمیں کچھ عرصہ کے لئے مہلت دے دے تاکہ ہم متاعِ حیات سے اور نفع اندوز ہو جائیں۔ قُلْ مَتَاعُ الدُّنْيَا قَلِيْلٌ وَالْاٰخِرَةُ خَيْرٌ لِّمَنِ اتَّقٰى وَلَا تُظْلَمُوْنَ فَتِيْلًا۔ (۴/۷۷) اے رسولؐ! ان سے کہہ دو کہ تم دنیاوی زندگی کا کتنا ہی ساز و سامان کیوں نہ اکٹھا کر لو، وہ اُخروی زندگی کی خوشگواریوں کے مقابلہ میں بہرحال قلیل بھی ہوگا اور کہتر بھی۔ تم قوانین خداوندی کی نگہداشت کرو تاکہ ان نعماء سے فیضیاب ہو سکو۔ تمہاری کوششوں کے نتائج میں ذرا بھی کمی نہیں کی جائے گی۔ دوسری جگہ ہے کہ

> جماعتِ مومنین کی بے تابی تمنا کا یہ عالم ہے کہ وہ اس انتظار میں رہتے ہیں کہ کب جہاد کا حکم ملے۔ ان کے برعکس، یہ منافقین ہیں کہ جب کوئی ایسی آیت نازل ہو جس میں متعین طور پر جنگ کا ذکر کیا گیا ہو تو اے رسولؐ! وہ تیری طرف یوں دیکھنے لگ جاتے ہیں گویا انہیں ابھی غش آ جائے گا ـــ یہ کیسے شوریدہ بخت اور بدنصیب لوگ ہیں۔ (۴۷/۲۰)

یہی وہ منافقین کا گروہ تھا جن کی اس قلبی کیفیت کے پیشِ نظر کہا گیا تھا کہ كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِتَالُ وَهُوَ

قتال فرض قرار دیا گیا

کُرْهٌ لَّكُمْ ۔ تم پر قتال (جنگ) فرض قرار دیا گیا ہے خواہ تمہیں یہ ناگوار ہی کیوں نہ گزرے۔ وحیٔ خداوندی کے پیشِ نظر تمہاری یا کسی اور کی خوشگواری یا ناگواری نہیں ہوتی۔ وہ ابدی حقائق بیان کرتی ہے خواہ وہ کسی کو ناگوار گذریں یا خوشگوار محسوس ہوں۔ انسان اپنے اپنے مفادِ عاجلہ کی رُو سے کسی بات کے خوش آیند یا ناگوارِ خاطر ہونے کا فیصلہ کرتا ہے اور وحی کے سامنے مطلق صداقتیں (ABSOLUTE TRUTHS) ہوتی ہیں۔ اس لئے وَعَسٰٓى اَنْ تَكْرَهُوْا شَيْئًا وَّهُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ وَعَسٰٓى اَنْ تُحِبُّوْا شَيْئًا وَّهُوَ شَرٌّ لَّكُمْ ۔ ایسا ہو سکتا ہے کہ تم ایک بات کو ناپسند کرو اور وہ درحقیقت تمہارے لئے نفع رساں ہو، یا ایک چیز تمہیں بہت مرغوب ہو اور وہ درحقیقت تمہارے لئے نقصان رساں ہو۔ تم خیر اور شر یا نفع اور نقصان کا معیار، اپنی پسند یا ناپسند کو قرار نہ دو۔ اس کے لئے مستقل اقدارِ خداوندی کو معیار قرار دو۔ اس لئے کہ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ وَاَنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ۔ (۲/۲۱۶) تمہارا علم محدود بھی ہوتا ہے اور ذاتی جذبات و میلانات سے متاثر بھی۔ اس کے برعکس علمِ خداوندی محیطِ کلّی ہوتا ہے اور ہر قسم کے اثرات سے مبرّا اور بالا۔ تم صرف اپنے نفع، نقصان تک سوچ سکتے ہو اور وحیٔ خداوندی کے سامنے پوری کائنات اور جملہ نوعِ انسان کا نفع نقصان ہوتا ہے۔

عقلِ خود بیں غافل از بہبودِ غیر — سودِ خود بیند نہ بیند سودِ غیر

وحیٔ حق بینندۂ سودِ ہمہ — در نگاہش سُود و بہبودِ ہمہ (جاوید نامہ)

انسان کو وحی کی راہنمائی کی ضرورت ہی اس لئے تھی (اور ہے) کہ انسانی فکر، ذاتی میلانات اور اپنے ماحول کے عواطف سے غیر متاثرہ رہ کر، معروضی طور پر (OBJECTIVELY) کچھ سوچ ہی نہیں سکتی اور وحیٔ خداوندی ان تمام میلانات اور رجحانات سے غیر متاثر ہوتی ہے اور اس کے پیشِ نظر کائنات اور عالمِ انسانی کا کلّی مفاد ہوتا ہے۔ یہ وجہ تھی جو ان لوگوں سے، جن کے قلوب مفادِ خویش کے میلانات سے متاثر تھے، کہا گیا کہ تم پر جہاد (قتال) فرض قرار دیا گیا، خواہ تمہیں یہ ناگوار ہی کیوں نہ گذرے۔

ضمناً، یہ طبقہ جس پر جہاد (قتال) سے متعلق احکام ناگوار گزرتے تھے، عہدِ رسالتمآبؐ تک ہی محدود نہیں تھا، مسلمانوں میں ایسے لوگ ہر دَور میں رہے ہیں جنہیں یہ امر سخت شاق گزرتا تھا کہ قرآن میں جہاد بالسیف کی آیات کیوں ہیں۔ ان کا اس پر تو اختیار نہیں تھا کہ وہ ان آیات کو قرآن سے نکال دیتے لیکن وہ ان کی ایسی ایسی تاویلات کرتے تھے (اور کرتے ہیں) جن سے جہاد محض وعظ و نصیحت یا نفس کُشی بن کر رہ جاتے۔

جنگ کے مقاصد

اب ہمارے سامنے یہ سوال آتا ہے کہ وہ مقاصد کیا ہیں جن کے لئے، اور وہ کیا حالات ہیں جن میں، جنگ کو فرض قرار دیا گیا ہے۔

ہم یہ دیکھ چکے ہیں کہ دین کے نظام کے ابتدائی مراحل میں "ہاتھ روک رکھنے" کی ہدایت تھی. یہ رسول اللہ کی مکی زندگی تھی۔ اس کے بعد حضورؐ اپنی جماعت کے ساتھ مکہ چھوڑ کر، دُور، مدینہ میں جاکر آباد ہو گئے۔ اب اہلِ مکہ کو ان سے کوئی سروکار نہیں ہونا چاہیئے تھا لیکن انہوں نے وہاں بھی پیچھا نہیں چھوڑا اور ایک لشکرِ جرار لے کر، مدینہ پر چڑھ دوڑے۔ یہ تھا وہ مقام جہاں مسلمانوں کو جنگ کی اجازت دی گئی۔ سورۃ حج میں ہے۔

> جن لوگوں پر مخالفین اس طرح جنگ کے لئے چڑھ دوڑے ہیں، اب انہیں بھی جنگ کرنے کی اجازت دی جاتی ہے اس لئے کہ ان پر بڑے ہی ظلم ہوتے ہیں، اور خدا اس پر قادر ہے کہ ان مظلومین کی مدد کرے۔ یہ وہ لوگ ہیں جنہیں ان کے گھروں سے ناحق نکال دیا گیا۔ ان کا جُرم اتنا ہی تھا کہ وہ کہتے تھے کہ ہمارا رب اللہ ہے۔۔۔۔ (۲۲/۳۹-۴۰)

یعنی جب سوال زندگی اور موت کا ہو تو پھر تحفظِ خویش کی خاطر جنگ کے لئے میدان میں آجانا ضروری ہوجاتا ہے. حیاتِ بے شرف کے مقابلہ میں مرگِ باشرف ہزار درجہ بہتر ہوتی ہے۔

جہاد زندگی کا ثبوت ہے

جنگِ بدر کے ضمن میں قرآنِ کریم ایک ایسی عظیم حقیقت کو سامنے لایا ہے کہ جوں جوں نگہ بصیرت اس پر غور کرتی ہے، انسان وجد میں آجاتا ہے۔ پہلے اس پس منظر کو سامنے لائیے. خدا پر ایمان رکھنے والوں کی یہ مٹھی بھر جماعت، تیرہ برس تک سردارانِ قریش کے مظالم برداشت کرنے کے بعد، پناہ گزینوں کی حیثیت سے، خالی ہاتھ مدینہ میں آئی۔ مدینہ کے انصار بھی کسی خاص قوت و شوکت اور جاہ و حشمت کے مالک نہیں تھے. وہ انہیں صرف پناہ دے سکنے کے قابل تھے. ان حالات میں، یہ مہاجرین ابھی یہاں آکر بیٹھنے بھی نہ پائے تھے کہ قریش، ایک ہزار پر مشتمل لشکرِ جرار کے ساتھ ان پر حملہ کرنے کے لئے نکل کھڑے ہوئے. ظاہر ہے کہ بے سروسامان جماعت مومنین (جن کی کل تعداد ۔ مہاجرین اور انصار ملا کر ۔ صرف تین سو کے قریب تھی) اس لشکر کا مقابلہ کرنے کی قوت اپنے اندر نہیں پاتے تھے. فطری طور پر وہ چاہتے تھے کہ کسی طرح جنگ ٹل جائے. اتفاق سے، قریش کا ایک قافلہ مدینہ کے قریب سے گزر رہا تھا. ان (مومنین) میں سے بعض کا مشورہ یہ تھا کہ قریش کے لشکر کے یہاں تک پہنچنے سے پہلے، ہمیں ان کے قافلہ پر حملہ کردینا چاہیئے۔ اس طرح اس امر کا امکان ہے کہ قریش مصالحت پر

آمادہ ہو جائیں اور ہم جنگ سے بچ جائیں۔

نظر بظاہر یہ تدبیر مفید طلب تھی لیکن دیکھئے کہ اس مقام پر خدا نے کیا کہا۔ اس نے کہا کہ ہم جانتے ہیں کہ تم اپنی عافیت اسی میں سمجھتے ہیں کہ قریش سے ٹکراؤ کی نوبت نہ آئے، لیکن اس طرح ڈر ڈر کر، سہمے ہوئے زندگی بسر کرنا، زندگی نہیں۔ یہ صرف نفس شماری ہے، حیاتِ بے شرف ہے۔ زندہ رہنے کا حق اسی کا حاصل ہے جو خطرات کا مقابلہ کرنے کے بعد، یہ ثابت کر دے کہ اس میں زندہ رہنے کی صلاحیت ہے اور اگر اس میں اس کی صلاحیت نہیں تو پھر مردانہ وار جان دے دے۔ لہٰذا، ہمارا فیصلہ یہ ہے کہ تم قریش کا مقابلہ کرنے کے لئے میدانِ جنگ میں نکلو۔ لِيَهْلِكَ مَنْ هَلَكَ عَنْ بَيِّنَةٍ وَيَحْيَىٰ مَنْ حَيَّ عَنْ بَيِّنَةٍ ط (۸/۴۲)۔ تاکہ جسے زندہ رہنا ہے وہ زندہ رہنے کا ثبوت بہم پہنچا کر زندہ رہے، اور جس میں زندہ رہنے کی صلاحیت نہیں وہ بھی اس امر کا ثبوت بہم پہنچا کر موت کے آغوش میں چلا جائے۔ خطرات سے ڈر کر، چھپے چھپے پھرنا، اور یوں اپنے آپ کو فریب دے لینا کہ ہم زندہ ہیں، زندگی نہیں۔

میارا بزم بر ساحل کہ آں جا — نوائے زندگانی نرم خیز است
بدریا غلط و با موجش درآویز — حیاتِ جاوداں اندر ستیز است

جہاد (یا قتال) اس امر کا ثبوت بہم پہنچانے کا ذریعہ ہے کہ ہم میں زندہ رہنے کی صلاحیت موجود ہے۔

یہ دو قوموں کی جنگ نہیں تھی

جنگِ بدر کے سلسلہ میں ایک اور نکتہ بھی غور طلب ہے اور وہ یہ کہ کیا یہ لڑائی محض دو قوموں کی باہمی جنگ تھی یا اس کی تہہ میں کچھ اور بھی تھا؟ اس سوال کا جواب ہمیں اسی آیت میں مل جاتا ہے جو کہا گیا ہے کہ إِلَّا أَنْ يَقُولُوا رَبُّنَا اللَّهُ (۲۲/۴۰) یعنی یہ دو قوموں کی جنگ نہیں تھی۔ یہ دو نظریوں کی جنگ تھی۔ ان دونوں کے درمیان مابہ النزاع مسئلہ یہ تھا کہ یہ لوگ "خدا کو اپنا نشوونما دینے والا" مانتے تھے اور فریقِ مخالف انہیں اس کی اجازت نہیں دینا چاہتا تھا۔ یہی وجہ مخالفت مکہ میں تھی اور یہی بنائے نزاع مدینہ آنے کے بعد بھی رہی اور اسی بنا پر انہوں نے ان کے خلاف لشکر کشی کی تھی۔ اس بنا پر یہ جنگ، عام قومی جنگ نہ رہی، دین کی جنگ ہو گئی۔

یہی وہ لطیف نکتہ ہے جس کی وضاحت دوسرے مقام پر اس طرح کر دی گئی کہ:

وَأَعِدُّوا لَهُمْ مَا اسْتَطَعْتُمْ مِنْ قُوَّةٍ وَمِنْ رِبَاطِ الْخَيْلِ تُرْهِبُونَ بِهِ عَدُوَّ اللَّهِ وَعَدُوَّكُمْ ..... (۸/۶۰)

تم ان مخالفین کی مدافعت کے لئے امکان بھر سامانِ حفاظت تیار رکھو۔ اپنی سرحدوں کو ایسا مضبوط رکھو کہ اس سے ان لوگوں کے دل پر جو تمہارے بھی دشمن ہیں اور اللہ کے بھی دشمن، خوف طاری رہے اور وہ حملہ کرنے کی جرأت نہ کر سکیں۔

یہاں دیکھئے، عَدُوَّ اللّٰهِ اور عَدُوَّكُمْ کی تخصیص و تمیز سے کس طرح بات واضح کر دی۔ عَدُوَّكُمْ

دین کے دشمن

(تمہارے دشمن) قومی سطح پر ہیں اور عَدُوَّ اللّٰهِ سے مراد ان کی وہ عداوت ہے جو دین کی بنا پر ہے۔ قومی سطح پر باہمی عداوتیں تو دنیا کی مختلف اقوام میں اکثر رہتی ہیں لیکن جنگ، جہاد فی سبیل اللہ کی حیثیت اس وقت اختیار کرتی ہے جب اس عداوت کی بنا دین ہو، یعنی قومِ مخالف، اس نظام کو مٹانے کے لئے یورش کرے جسے یہ قوم بہ حیثیتِ دینِ خداوندی قائم کرنا اور مستحکم رکھنا چاہتی ہو۔ ان کی طرف سے مخالفت کی ایک شکل یہ بھی ہے کہ وہ دینِ خداوندی کے خلاف طعن و تشنیع پر اُتر آئیں۔ انہیں، اس سے باز رہنے کے لئے سمجھانا چاہیئے۔ انہیں بتانا چاہیئے کہ ہمارے دین کی تعلیم یہ ہے کہ ہم تمہارے معبودوں کے خلاف بھی سوءِ ادبی اور گستاخی کے الفاظ زبان پر نہ لائیں، حالانکہ ہم انہیں باطل معبود سمجھتے ہیں۔ (۶/۱۰۹) ہمیں حکم دیا گیا ہے کہ تمام مذاہب کے بانیوں کی تعظیم کریں کیونکہ ہو سکتا ہے کہ وہ خدا کے فرستادہ انبیاء ہوں۔ اگر وہ انبیاء تھے تو ہم ان کی نبوّت پر ایمان لانے کے لئے مکلّف[1] ہیں۔ لہٰذا تم، کم از کم، ہمارے دین کے خلاف طعن و تشنیع سے تو باز رہو لیکن اگر ان میں اتنی سی شرافت اور انسانیت بھی باقی نہ رہی ہو تو پھر انہیں تلوار کے زور سے اس سے روکا جائے گا۔ سورۂ توبہ میں ہے۔ وَاِنْ نَّكَثُوْٓا اَيْمَانَهُمْ مِّنْۢ بَعْدِ عَهْدِهِمْ وَطَعَنُوْا فِيْ دِيْنِكُمْ فَقَاتِلُوْٓا اَئِمَّةَ الْكُفْرِ (۹/۱۲) اگر یہ لوگ، اس قسم کا عہد و پیمان کر لینے کے بعد اس سے پھر جائیں، اور تمہارے دین میں طعن و تشنیع سے باز نہ آئیں تو پھر تم کفار کے ان سرغنوں کے خلاف جنگ کرو۔

اُس سرزمین کی حفاظت

یہاں تک ان جنگوں کا ذکر ہے جو اپنے دین کی مدافعت کے لئے لڑنی پڑیں۔ واضح رہے کہ چونکہ قرآن کی رُو سے، دین صرف اپنی آزاد مملکت میں زندہ حقیقت بن سکتا ہے، اس لئے اس مملکت کی حفاظت کے لئے جنگ جس میں دین کا نظام متمکن ہو یا

---

[1] اس سے مراد حضور نبی اکرمؐ سے پہلے کے انبیاء ہیں کیونکہ سلسلۂ نبوّت حضورؐ پر ختم ہو گیا۔

جسے اس مقصد کے لئے حاصل کیا گیا ہو، قتال فی سبیل اللہ کہلاتے گا۔ مدینہ کی پہلی جنگ (جنگِ بدر) اس زمانے میں لڑی گئی تھی جب ہنوز اسلامی مملکت عملی شکل میں وجود میں نہیں آئی تھی۔ بایں ہمہ اس سرزمین کی حفاظت اس لئے ضروری تھی کہ اس میں اس مملکت کے وجود میں آنے کا امکان تھا۔ اگر وہ سرزمین نہ رہتی تو اسلامی مملکت کا وجود شرمندۂ تعبیر نہ ہو سکتا۔ یہ ہے قتال فی سبیل اللہ کی پہلی شکل۔

(۲) اس کی دوسری شکل، سورۂ حج کی اس آیت کے اگلے حصے میں سامنے لائی گئی ہے۔ جس کا پہلا حصہ

مذہب کی آزادی

اوپر مذکور ہے۔ اس میں کہا گیا ہے کہ وَلَوْلَا دَفْعُ اللّٰهِ النَّاسَ بَعْضَهُمْ بِبَعْضٍ لَّهُدِّمَتْ صَوَامِعُ وَبِيَعٌ وَّصَلَوٰتٌ وَّمَسَاجِدُ يُذْكَرُ فِيْهَا اسْمُ اللّٰهِ كَثِيْرًا - (۲۲/۴۰) اور اگر اللہ ایسا نہ کرتا کہ ایک جماعت کی دست درازیوں کی روک تھام، دوسری جماعت کے ہاتھوں ہو جاتے تو یہودیوں کی عبادت گاہوں، عیسائیوں کے گرجوں، راہبوں کی خانقاہوں اور مسلمانوں کی مسجدوں (جن میں خدا کا ذکر اکثر ہوتا رہتا ہے) میں سے کوئی بھی باقی نہ رہتی۔ سب منہدم ہو جاتیں ــــ اس آیۂ جلیلہ میں، جہاں تک مسجدوں کی حفاظت کا تعلق ہے، وہ اس زمرہ میں آجاتی ہیں جس کا ذکر اوپر آچکا ہے یعنی دین کے نظام کی حفاظت کے لئے مخالفین کے حملوں کی روک تھام لیکن اس میں تو مسلمانوں پر تمام اہلِ مذاہب کی پرستش گاہوں کی حفاظت کا فریضہ عائد کیا گیا ہے۔ "پرستش گاہوں کی حفاظت" سے مراد ہے مذہبی آزادی۔ اس حکمِ خداوندی سے مراد یہ ہے کہ دنیا میں مذہبی آزادی کا برقرار رکھنا مسلمانوں کا دینی فریضہ ہے، اور اس فریضہ کی ادائیگی کے لئے اگر انہیں جنگ بھی کرنی پڑے تو جنگ کرنی ہوگی۔

لَآ اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ

اس سے ایک عظیم حقیقت سامنے آتی ہے اور وہ یہ کہ جس قوم کا فریضہ یہ ہو کہ وہ جان دے کر بھی دوسرے اہلِ مذاہب کی مذہبی آزادی کو برقرار رکھے گیا اس کے لئے کسی صورت میں بھی جائز ہوگا کہ وہ کسی شخص کو بزورِ شمشیر مسلمان بنائے۔ یا جو بدقسمت مسلمان کوئی دوسرا مذہب اختیار کرنا چاہے، اسے اس سے بزورِ شمشیر روکے۔ یہ تصور قطعاً غلط اور اسلام کے اساسی اصولوں کے خلاف ہے۔ لَآ اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ (۲/۲۵۶) - اس کا بنیادی اصول ہے اور فَمَنْ شَآءَ فَلْيُؤْمِنْ وَّمَنْ شَآءَ فَلْيَكْفُرْ - (۱۸/۲۹) "جس کا جی چاہے ایمان لے آئے، جس کا جی چاہے کفر اختیار کرلے" ــــ اس کا عالمگیر منشور۔ جب اس نے کہا تھا کہ وَقٰتِلُوْهُمْ حَتّٰى لَا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ وَّ

یَکُوْنَ الدِّیْنُ لِلّٰہِ۔ (۲/۱۹۳) تو اس سے بھی یہی مراد تھی۔ یعنی اگر کوئی قوم کسی دوسرے کی مذہبی آزادی سلب کرنا چاہے، تو تم اس مستبد قوم کے خلاف جنگ کرو، اور اس جنگ کو اس وقت تک جاری رکھو جب تک ایسے حالات پیدا نہ ہو جائیں کہ مذہب صرف خدا کی خاطر اختیار کیا جائے۔ اس میں کسی قسم کے خارجی اثر یا دباؤ کا کوئی دخل نہ رہے۔ "وَ یَکُوْنَ الدِّیْنُ لِلّٰہِ" عالمگیر مذہبی آزادی کا ایسا ابدی منشور ہے جس کی مثال کہیں اور نہیں مل سکتی۔

اس شکل میں بھی جنگ مدافعانہ ہی رہتی ہے لیکن اس میں صرف اپنی اور اپنے دین کی مدافعت نہیں بلکہ دنیا بھر کے اہلِ مذاہب کی مذہبی آزادی کی مدافعت مقصود ہے۔

یہ جہاد فی سبیل اللہ کی دوسری شکل ہے۔ اب آگے بڑھیئے۔

انسانی حقوق کا تحفظ

(۳) مذہبی آزادی ہی نہیں بلکہ اس میں غلامی کی اور بھی بہت سی شکلیں شامل ہیں جن کا تعلق انسانی حقوق سے ہے۔ سورۃ البلد میں ہے کہ ہم نے انسان کو دونوں راستے دکھا دیئے۔ ایک راستہ سہل انگاریوں، مفاد پرستیوں اور عیش سامانیوں کا ہے۔ "کنارِ آب رکنا باد گل گشت و مصلیٰ" کا راستہ۔ دوسرا راستہ اَلْعَقَبَۃُ کا ہے۔ یعنی پہاڑ کی گھاٹی پر چڑھنے کے مرادف۔ پہاڑ کی گھاٹی پر چڑھنے کا راستہ بڑا دشوار گزار ہوتا ہے۔ اس پر قدم قدم پر سانس پھولتی ہے لیکن ہر قدم، انسان کو پہلے سے زیادہ بلندی کی طرف لے جاتا ہے۔ یہ راستہ کیا ہے؟

(۱) فَکُّ رَقَبَۃٍ (۹۰/۱۳) جو گردنیں کسی دوسرے کی محکومی میں جکڑی ہوئی ہوں، انہیں اس سے آزاد کرانا۔

(۲) اَوْ اِطْعَامٌ فِیْ یَوْمٍ ذِیْ مَسْغَبَۃٍ (۹۰/۱۴) جس زمانے میں افلاس و غربت عام ہو جائے اس میں دوسروں کے کھانے پینے کا انتظام کرنا۔ کن لوگوں کے کھانے پینے کا؟

(۳) یَتِیْمًا ذَا مَقْرَبَۃٍ (۹۰/۱۵) ان کا جو بھرپور معاشرہ میں بھی اپنے آپ کو تنہا محسوس کریں۔ اور

(۴) اَوْ مِسْکِیْنًا ذَا مَتْرَبَۃٍ (۹۰/۱۶) یا ان محنت کشوں کا جو دن بھر خاک آلود رہنے کے باوجود اس قابل نہ ہو سکیں کہ ان کی زندگی کی گاڑی آگے چلے۔

یہ ہے الدّین ــــ وہ گھاٹی جس پر چڑھنا بڑا دشوار ہے۔ ان میں سے شقِ اوّل فَکُّ رَقَبَۃٍ ہے۔ زمانۂ نزولِ قرآن میں غلامی کی ایک ہی شکل تھی جسے عرفِ عام میں (SLAVERY) کہا جاتا ہے۔ قرآنِ کریم نے ان غلاموں

کو چھوڑنے کے لئے مختلف طریق تجویز کئے اور آئندہ کے لئے غلامی کا خاتمہ کر دیا۔ دنیا آج بڑے فخر سے کہتی ہے کہ اس نے غلامی کو مٹا دیا ہے لیکن اِس زمانے میں، جسے دورِ تہذیب کہا جاتا ہے، غلامی کی ایسی ایسی شکلیں وضع کی گئی ہیں جن کا تصوّر بھی اُس (دورِ جہالت) میں نہیں کیا جا سکتا تھا۔ ان شکلوں کی تفصیل تو طول طویل ہے۔ لیکن ان سب میں قدرِ مشترک یہ ہے کہ جن حقوق کو قرآن نے بنیادی حقوقِ انسانیت قرار دیا ہے، انہیں سلب کر لیا جاتا ہے اور اکثر اوقات سلب بھی اس انداز سے کیا جاتا ہے کہ جسے مصلوب کیا جاتا ہے، اسے اس کا احساس تک نہیں ہونے پاتا یا نہیں ہونے دیا جاتا۔ ان سلب کردہ حقوق کا بحال کرانا بھی فَكُّ رَقَبَةٍ میں آ جائے گا۔ ہمارے زمانے میں (U.N.O) نے بنیادی حقوق انسانیت کا منشور شائع اور اختیار کر رکھا ہے لیکن اس کی رُو سے، کمزور انسانوں اور قوموں کے حقوق کا جس انداز سے تحفظ ہوتا ہے، وہ ظاہر ہے۔ یہ فریضہ جماعت مومنین ہی ادا کر سکتی ہے۔ ان حقوق کی شدید ترین پامالی کو قرآن، ظُلم سے تعبیر کرتا ہے اور مظلوموں کی امداد

مظلوموں کی امداد کیلئے جنگ

کے لئے (عندالضرورت) جنگ کے لئے اٹھنا، جماعت مومنین کا فریضہ قرار دیتا ہے (مثلاً) جب مدینہ میں مسلمانوں کی مملکت قائم ہو گئی تو وہ قریشِ مکہ کے دستِ تظلم سے محفوظ ہو گئے لیکن مکہ میں ایسے مسلمان رہ گئے جنہیں وہ جور و استبداد کا تختۂ مشق بناتے تھے۔ قرآنِ کریم نے مسلمانانِ مدینہ کو مخاطب کر کے کہا کہ

> تمہیں کیا ہو گیا ہے کہ تم قتال فی سبیل اللہ کے لئے اٹھتے نہیں۔ حالانکہ حالت یہ ہے کہ (مکہ کے) کمزور و ناتواں، بے کس و بے بس مسلمان — مرد، عورتیں، بچے چلا چلا کر کہہ رہے ہیں کہ اے ہمارے نشوونما دینے والے! تو ہمیں اس بستی سے نکالنے کی کوئی صورت پیدا کر دے جس کے رہنے والے اس قدر ظالم اور سفاک ہیں تو اپنی طرف سے ہمارا کوئی حامی و مددگار بھیج جو ہمیں ان کے جور و ستم سے نجات دلائے۔ (۴/۷۵)

چنانچہ مدینہ کے مسلمان اٹھے اور انہوں نے مکہ فتح کر کے، ان مظلوموں کو ان کے مظالم سے نجات دلائی۔ قرآنِ کریم نے اس واقعہ کے بیان کرنے سے اس ابدی اصول کی وضاحت کر دی کہ اسلامی مملکت کا فریضہ یہ بھی ہے کہ دنیا میں کسی قوم اور کسی ملک کے مظلوموں کی فریاد ان تک پہنچے، وہ ان کی مدد کے لئے اٹھیں۔ حضور نبیٔ اکرمؐ نے ایران کے کسریٰ اور روم کے قیصر کو جو دعوت نامے ارسال فرمائے تھے، ان میں یہی کہا گیا تھا کہ تمہاری مملکت میں کسانوں پر جو مظالم ہو رہے ہیں، اگر تم نے ان کا تدارک نہ کیا تو اس کی سزا تمہیں بھگتنی پڑے گی۔ اس قسم کی جنگیں، اس لحاظ سے مدافعانہ

کہلائیں گی کہ یہ ان مظلوموں کی مدافعت کے لئے لڑی جائیں گی۔

(۵) اسی قسم کی مدافعانہ ایک اور جنگ بھی ہے جسے قتال فی سبیل اللہ کہا گیا ہے۔ سورۃ بقرہ میں (حضرت) طالوت اور جالوت کے معرکہ کے تذکرہ کے بعد فرمایا۔ وَلَوْ لَا دَفْعُ اللّٰهِ النَّاسَ بَعْضَهُمْ بِبَعْضٍ لَّفَسَدَتِ الْاَرْضُ وَ لٰكِنَّ اللّٰهَ ذُوْ فَضْلٍ عَلَى الْعٰلَمِيْنَ۔ (۲/۲۵۱)

فساد روکنے کے لئے جنگ

اگر خدا ایسا انتظام نہ کرے کہ ایک سرکش اور امن شکن گروہ کی جارحیت کی روک تھام، دوسرے گروہ کے ہاتھوں کرائی جاتے، تو زمین میں ہر طرف فساد ہی فساد برپا ہو جائے لیکن چونکہ خدا اہلِ دنیا پر اپنا فضل رکھنا چاہتا ہے، اس لئے فساد برپا کرنے والوں کی دراز دستیوں کی روک تھام دوسرے لوگوں کے ہاتھوں سے ہوتی رہنی چاہیئے۔ اور ظاہر ہے کہ خدا کا یہ پروگرام اوّلاً اور تاسیساً جماعتِ مومنین کے ہاتھوں پورا ہو گا کہ انہی کو اس نے حزب اللہ (اللہ کی پارٹی) کہہ کر پکارا ہے اور کہا ہے کہ قَاتِلُوْهُمْ يُعَذِّبْهُمُ اللّٰهُ بِاَيْدِيْكُمْ وَ يُخْزِهِمْ (۹/۱۴) تم ان کے خلاف جنگ کے لئے اٹھو۔ اس لئے کہ خدا چاہتا ہے کہ ان مستکبرین کو ان کی سرکشی کی سزا تمہارے ہاتھوں سے دلائے اور ان کی گردن جھکائے تاکہ وہ پھر فساد کے لئے نہ اُٹھ سکیں۔

فساد سے مفہوم

فساد ایک بڑی جامع اصطلاح ہے جو قرآنِ کریم میں بے شمار مقامات پر آتی ہے اور اس نے مفسدین کا شمار اکابر مجرمین میں کیا ہے۔ ارتقائے انسانیت کے لئے بنیادی شرط یہ ہے کہ معاشرہ میں امن و امان رہے۔ لوگوں کی جان، مال، عزت، آبرو، عصمت ہر طرح سے محفوظ ہو اور اس طرح انہیں اطمینان اور سکون میسّر ہو۔ جس معاشرہ سے یہ سکون اٹھ ہو جائے اس کے متعلق کہا جائے گا کہ اس میں فساد برپا ہے۔ ہمارے نزدیک یہ' فساد کا مختصر ترین مفہوم ہے۔ قرآنِ کریم نے فسادؔ کو صلاحؔ کی ضد بتایا ہے اور صلاحؔ کے معنی ہیں ایسے حالات۔ جن میں انسانی صلاحیتیں بیدار ہوں اور اس طرح اس میں زندگی کے ارتقائی منازل طے کرنے کی اہلیت پیدا ہو جائے۔ نیز جن میں معاشرہ کا حسن و توازن قائم رہے اور ناہمواریاں دور ہو جائیں۔ جس چیز کو جس حال میں ہونا چاہیئے، اس کا ٹھیک اسی حال میں ہونا اور ہر کام کا وقت کے تقاضے اور قوانینِ خداوندی کے مطابق سرانجام پاتے جانا۔ جب معاشرہ کی حالت ایسی نہ رہے تو اسے فساد سے تعبیر کیا جائے گا۔ اس میں قانون و ضوابط کا احترام اُٹھ جائے گا اور فوضویت (انارکی) عام ہو جائے گی۔ ایسی حالت کو رُو بہ اصلاح لانے کے لئے (عند الضرورت) جنگ کو بھی قتال فی سبیل اللہ کہا جائے گا۔ خواہ وہ کہیں پیدا

ہو۔ اس لئے کہ قرآن کریم نے اُمّتِ مسلمہ کو شہداء علی الناس کہہ کر پکارا ہے۔ یعنی تمام نوعِ انسان کے امور کی نگران اور نگران کا فریضہ ہے کہ وہ دیکھے کہ کہیں فساد برپا نہ ہو جائے۔

یہ ہیں وہ مقاصد جن کے لئے قرآن کریم نے جنگ کی نہ صرف اجازت دی ہے بلکہ اسے مسلمانوں پر فرض قرار دیا ہے۔ ان مقاصد کی خاطر جنگ، قتال فی سبیل اللہ ہے اور اگر مقصد کچھ اور ہے تو وہ قتال فی سبیل اللہ نہیں قتال فی سبیل الطاغوت ہے اور یہ کفر اور اسلام میں ما بہ الامتیاز ہے۔ سورۃ نساء میں ہے۔ اَلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا یُقَاتِلُوْنَ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ ۔ وَ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا یُقَاتِلُوْنَ فِیْ سَبِیْلِ الطَّاغُوْتِ (۴/۷۶) مومنین اللہ کی راہ میں جنگ کرتے ہیں اور کفار طاغوت کی راہ میں۔ یہی قتال فی سبیل اللہ جہاد کی حدِ آخریں اور مومن کی زندگی کا منتہیٰ و مقصود ہے۔

جنگ کی شرائط

یہ تو ہیں وہ مقاصد جن کے لئے جنگ لڑی جائے گی۔ ان کے ساتھ ہی کچھ شرائط بھی ہیں جنہیں ملحوظ رکھا جائے گا۔ مختصر الفاظ میں وہ شرائط یہ ہیں:-

(۱) پہلی شرط یہ ہے کہ ــــــ وَ قَاتِلُوْا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ الَّذِیْنَ یُقَاتِلُوْنَکُمْ وَ لَا تَعْتَدُوْا ۔ (۲/۱۹۰) جو تمہارے خلاف جنگ پر اتر آئیں، ان سے جنگ کرو لیکن حدود سے تجاوز مت کرو۔ لَا تَعْتَدُوْا کے ایک معنی تو یہی ہیں کہ اس باب میں جو حدود خدا نے مقرر کی ہیں، ان سے آگے نہ بڑھو اور اس کے دوسرے معنی یہ بھی ہو سکتے ہیں کہ جنگ کو وہیں تک محدود رکھو، اور ایسے حالات نہ پیدا ہونے دو کہ وہ متعدی امراض کی طرح پھیل کر عالمگیر بن جائے، یہ آگ ایسی بھڑکے کہ ہر ایک کو اپنی لپیٹ میں لے لے۔ ایسی صورت نہ پیدا ہونے دو۔

(۲) دوسری شرط یہ ہے کہ جہاں تک دشمن کی قوت توڑنے کا تعلق ہے وہیں تک اسے نقصان پہنچاؤ۔ خواہ مخواہ ہلاکتِ حرث و نسل نہ کرو۔ (۲/۲۰۵) نہ کھیتیاں تباہ و برباد کرو، نہ عام آبادی کو ہلاک کرو۔ ایسا کرنا فساد میں شامل ہو جائے گا اور وَاللّٰہُ لَا یُحِبُّ الْفَسَادَ ۔ (۲/۲۰۵) خدا فساد کو پسند نہیں کرتا۔

(۳) مفتوحہ علاقہ کو برباد مت کرو، نہ ہی وہاں کے معززین کو ذلیل کرو۔ یہ اندازِ ملوکیت ہے جس کی نظامِ خداوندی میں گنجائش نہیں۔ (۲۷/۳۴)

(۴) بین الاقوامی معاہدات کی رو سے یہ اصول طے کر لو کہ جنگ کہیں، اور کسی کے خلاف بھی کیوں نہ ہو، اسے

مسلسل جاری نہیں رہنا چاہیئے۔ سال میں کچھ مہینے ایسے مقرر ہو جانے چاہئیں جن میں جنگ اصولاً بند کر دی جائے۔ اس متارکہ سے فریقین کے جذباتِ مخاصمت کی شدت میں کمی واقعہ ہو جائے گی اور اس بات کا امکان پیدا ہو جائے گا کہ دشمن، نامعقولیت کو چھوڑ کر، صلح کی معقول شکل اختیار کر لے۔ اسی طرح بعض مقامات بھی ایسے ہونے چاہئیں، جہاں پہنچ جانے پر، ہر شخص اپنے آپ کو محفوظ اور مامون پائے۔ (۲/۲۱۷)

(۵) جب دشمن صلح کی طرف جھکے تو اس کی "سفید جھنڈی" کا احترام کیا جائے۔ یہ ممکن ہے کہ ایسا کرنے میں وہ تمہیں دھوکہ دیتا ہو لیکن یہ بھی تو ممکن ہے کہ وہ مخلصانہ طور پر صلح چاہتا ہو۔ اس لئے تمہارا ردِ عمل یہ نہیں ہونا چاہیئے کہ وہ دھوکا دیتا ہے بلکہ یہ ہونا چاہیئے کہ وہ صلح کا آرزومند ہے۔ (۸/۶۱) خُذُوْا حِذْرَكُمْ (۴/۷۱) اپنی حفاظت کا پورا پورا سامان رکھو اور پھر اس سے صلح کی بات کرو۔

(۶) صلح کرنے میں بھی دشمن کے ساتھ عدل کرو۔ لَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ عَلٰٓى اَلَّا تَعْدِلُوْا۔ اِعْدِلُوْا۔ هُوَ اَقْرَبُ لِلتَّقْوٰى۔ (۵/۸) کسی قوم کی دشمنی تمہیں اس پر آمادہ نہ کر دے کہ تم اس کے ساتھ عدل نہ کرو۔ ہمیشہ عدل کرو۔ ہر ایک کے ساتھ عدل کرو۔ اس لئے کہ تم نے تقویٰ کی زندگی بسر کرنی ہے اور تقویٰ کا تقاضا یہی ہے۔

(۷) دشمن کے قیدیوں کے ساتھ حسنِ سلوک سے پیش آؤ۔ معاہدہ صلح کے بعد، انہیں یا تو اپنے قیدیوں کے تبادلہ میں رہا کر دو، یا فدیہ لے کر۔ لیکن اگر دیکھو کہ ان میں سے کسی صورت کا امکان نہیں تو انہیں بطور احسان چھوڑ دو۔ اس کا اثر بڑا گہرا ہو گا۔ (۴۷/۴) قیدی تو ایک طرف، اس نے یہاں تک کہا ہے کہ اگر دشمن کا کوئی فرد تمہارے پاس پناہ کے لئے آئے تو اسے پناہ دو۔ اسے قرآن کی تعلیم سے آگاہ کرو اور اس کے بعد اگر وہ اپنے ہاں واپس جانا چاہے تو اسے اپنی حفاظت میں اس کے مامن تک پہنچاؤ۔ (۹/۶)

(۸) دشمن (یا ویسے بھی دیگر اقوام کے ساتھ) جو معاہدات کرو، ان کا احترام کرو۔ (۵/۱) وَ اِمَّا تَخَافَنَّ مِنْ قَوْمٍ خِيَانَةً فَانْۢبِذْ اِلَيْهِمْ عَلٰى سَوَآءٍ۔ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْخَآئِنِيْنَ۔ (۸/۵۸) اگر تمہیں اس کا خدشہ ہو کہ قوم مخالف، معاہدہ کی آڑ میں تم سے خیانت کرنے کا ارادہ رکھتی ہے، تو تم معاہدہ کی اوٹ میں اس کے خلاف خیانت مت کرو۔ تم اس معاہدہ کو ان کی طرف لوٹا دو۔ انہیں بتا دو کہ وہ معاہدہ باقی نہیں رکھا جا سکتا اور اس طرح دونوں ایک سطح پر اتر کر، جو مناسب سمجھو کرو۔

(۹) اور آخری بات یہ کہ تم سرکش گروہوں کے خلاف جنگ کر کے، ان کی قوت کو توڑو، تو اس لئے کہ اس

طرح مختلف قوموں میں قوّتوں کا توازن پیدا ہو جاتے اور کسی کو دوسرے کے خلاف دست درازی کی جرأت نہ ہو اور یوں دنیا سے جنگ کا خاتمہ ہو جائے۔ قرآنِ کریم کے نہایت جامع الفاظ میں، تم دشمن کی قوّت توڑنے کے لئے جنگ کرو۔ تا آنکہ خود جنگ اپنے ہتھیار رکھ دے۔ (۴/۴۷) یہ ہے جماعتِ مومنین، اُمّتِ مسلمہ کی جنگ کا مقصود و منتہیٰ۔ دنیا سے جنگ کا خاتمہ۔

جنگ کی ہدایات

ان شرائط کے ساتھ قرآنِ کریم نے جنگ کے سلسلہ میں کچھ اصولی ہدایات بھی دی ہیں، جن کا مختصر سا تذکرہ اس مقام پر ضروری معلوم ہوتا ہے۔ (مثلاً) اس نے کہا ہے کہ

(۱) جیسا کہ شروع میں بہ تفصیل بتایا جا چکا ہے، قرآنِ کریم کی رُو سے، ہر مومن مجاہد ہے اور اُمّتِ مسلمہ پوری کی پوری حزب اللہ (خدا کا لشکر)۔ لہٰذا ہر مسلمان کے لئے عسکری تربیّت اسلامی زندگی کا اساسی جزو ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ دورِ حاضرہ میں، جنگ اس قدر فنّی ہو چکی ہے کہ اس کے لئے فنونِ حرب کے ماہروں کی ضرورت لاینفک ہے۔ اس مقصد کے لئے بیشک، ایک ہمہ وقتی جماعت الگ ہونی چاہیئے لیکن ہر مومن کے لئے سپاہی ہونا ضروری ہے۔ قرآن کا تصوّر اور ہدایت یہی ہے — ہر مومن خدا کا سپاہی۔

(۲) فوج کی کمان کرنے والوں کے انتخاب کا معیار، دولت یا خاندانی وجاہت نہیں ہونا چاہیئے۔ اس کا معیار جوہرِ ذاتی ہونا چاہیئے یعنی — زَادَهٗ بَسْطَةً فِي الْعِلْمِ وَالْجِسْمِ۔ (۲/۲۴۷) یعنی فنونِ حرب سے پوری پوری واقفیّت، اور جسمانی صحت و توانائی۔ واضح رہے کہ پاکباز زندگی (تقویٰ) ہر مومن کی بنیادی خصوصیت ہے۔ اس لئے ان افسروں کے انتخاب میں اس کا خاص خیال رکھا جائے گا کہ اِنَّ اَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ اَتْقٰكُمْ۔ (۴۹/۱۳) معیارِ خداوندی کے مطابق، تم میں سب سے زیادہ واجب التکریم وہ ہے جو سب سے زیادہ قوانینِ خداوندی کی نگہداشت کرتا ہے۔ قرآنِ کریم نے یہاں تک کہہ دیا کہ وَلَا تُطِعْ مَنْ اَغْفَلْنَا قَلْبَهٗ عَنْ ذِكْرِنَا وَاتَّبَعَ هَوٰىهُ وَكَانَ اَمْرُهٗ فُرُطًا۔ (۱۸/۲۸) جس شخص کی حالت یہ ہو جائے کہ وہ قوانینِ خداوندی کو فراموش کر دے اور اپنی خواہشاتِ نفس ہی کے پیچھے دوڑتا رہے اور اس دوڑ میں تمام حدود پھاندتا چلا جائے، اس کی اطاعت کا جُوا اپنی گردن سے اتار پھینکو۔ وہ اس قابل ہی نہیں رہتا کہ اس کی اطاعت کی جائے۔ لہٰذا، اگر کسی افسر کی سیرت و کردار ملوّث ہو جائے، وہ پاک بین و پاک باز نہ رہے تو اسے کمان سے

برطرف کر دینا چاہیے کیونکہ ایسے افسر کے رفقاء کی نظروں میں اس کا وقار اور اس کے ماتحتوں کے دل میں اس کا احترام کبھی باقی نہیں رہ سکتا اور جس کا احترام نہ رہے اس کے احکام کی اطاعت، میکانکی طور پر تو ہو سکتی ہے، دل کی رضامندی سے نہیں ہو سکتی۔ قرآن نے تو صاحب کمان کا مقام یہ بتایا ہے کہ اس کے حکم اور فیصلوں کے خلاف دل کی گہرائیوں میں بھی گھبیدگی اور گرانی محسوس نہ ہو۔ (۴/۶۵)

(۳) اگر سپاہیوں کے لئے یہ حکم ہے کہ وہ اپنے صاحب کمان کے حکم کی تعمیل دل کی کامل رضامندی سے کریں، تو صاحب کمان کے لئے بھی ضروری ہے کہ وہ اپنے ماتحتوں کے لئے سپر بنا رہے اور ان کی اس طرح حفاظت اور نگہداشت کرے جس طرح مرغی اپنے چوزوں کی حفاظت اور نگہداشت کرتی ہے۔ (۲۶/۲۱۵)

(۴) صاحب کمان کو اپنے سپاہیوں کے ساتھ رہنا چاہیے۔ جنگی ضروریات کے لئے ایسا کرنا اور بات ہے ورنہ عام حالات میں چھپ کر پیچھے نہیں بیٹھے رہنا چاہیے۔ حضور نبی اکرمؐ کے متعلق قرآن کریم نے بتایا ہے ـــــ واضح رہے کہ عساکر مومنین کے لئے حضورؐ کی پوزیشن، آج کی اصطلاح میں، کمانڈر انچیف کی بھی تھی کہ تُبَوِّئُ الْمُؤْمِنِيْنَ مَقَاعِدَ لِلْقِتَالِ۔ (۳/۱۲۰) میدان جنگ میں آپ اپنے سپاہیوں کی پوزیشن متعین کیا کرتے تھے۔

(۵) ڈسپلن فوج کی رگِ حیات ہے۔ اس کی مثال دیتے ہوئے قرآن کریم نے بتایا ہے کہ جب (حضرت) طالوت اپنی فوج کو لے کر جالوت کے مقابلہ کے لئے چلے تو سپاہی پیاسے تھے اور راستے میں ایک ندی آتی تھی آپ نے حکم دیا کہ کوئی شخص ندی سے پانی نہ پیئے۔ یونہی حلق تر کرنے کیلئے ایک گھونٹ کی اجازت ہے۔ بات بظاہر چھوٹی سی تھی لیکن اس کی اہمیت اس قدر تھی کہ آپ نے کہا کہ فَمَنْ شَرِبَ مِنْهُ فَلَيْسَ مِنِّيْ۔ (۲/۲۴۹) جو پانی پی لے گا وہ میرا نہیں ہوگا۔ اس کے باوجود بہت سے سپاہیوں نے پانی پی لیا اور قرآن کہتا ہے کہ یہی وہ لوگ تھے کہ جب لشکرِ جالوت سامنے آیا تو انہوں نے کہہ دیا کہ ـــــ لَا طَاقَةَ لَنَا الْيَوْمَ بِجَالُوْتَ وَجُنُوْدِهٖ۔ (۲/۲۴۹) ـــــ ہم میں، جالوت اور اس کے لشکر کے مقابلہ کی تاب نہیں۔ ڈسپلن درحقیقت اس بات کا ٹسٹ ہوتا ہے کہ فوج میں خطرات کے مقابلہ کی صلاحیت کہاں تک پیدا ہو چکی ہے۔

(۶) اور ڈسپلن کے ساتھ استقامت، جسے قرآن صبر کی عظیم اصطلاح سے تعبیر کرتا ہے اور بار بار اس حقیقت کا اعلان کرتا ہے کہ ـــــ اِنَّ اللّٰهَ مَعَ الصّٰبِرِيْنَ۔ (۲/۲۴۹) خدا کی تائید و نصرت انہی کے ساتھ ہوتی ہے جو ثبات و استقامت کے ساتھ خطرات کا مقابلہ کرتے ہیں۔ یہ اگر تعداد میں کم بھی ہوں تو بھی دشمن پر غالب آسکتے ہیں۔

(۷) میدانِ جنگ میں فتح بھی ہوتی ہے اور کبھی کبھی شکست بھی۔ شکست سے دل برداشتہ اور افسردہ خاطر نہیں ہونا چاہیئے۔ اس وقت، اس حقیقت کو پیشِ نظر رکھنا چاہیئے کہ اِنۡ یَّمۡسَسۡکُمۡ قَرۡحٌ فَقَدۡ مَسَّ الۡقَوۡمَ قَرۡحٌ مِّثۡلُهٗ ؕ وَتِلۡكَ الۡاَيَّامُ نُدَاوِلُهَا بَيۡنَ النَّاسِ۔ (۳/۱۳۹) اگر تم نے آج دشمن کے ہاتھوں زخم کھائے ہیں تو کل تم نے بھی تو اسے کاری ضربیں لگائی تھیں۔ حالات کی یہ گردش دولابی جاری ہے۔ اس تغیر سے ہمت نہیں ہارنی چاہیئے۔ ایسے وقت میں سوچنا یہ چاہیئے کہ اس شکست کے اسباب کیا تھے۔ اگر تم اس پر غور کرو گے تو یہ حقیقت تمہارے سامنے آجائے گی کہ یہ تمہاری ہی کسی غلطی کا نتیجہ تھی۔ هُوَ مِنۡ عِنۡدِ اَنۡفُسِكُمۡ۔ (۳/۱۶۴) (۴/۷۹) جیوشِ اسلامیہ کو جنگِ اُحد میں جو عارضی شکست ہوئی تھی، اس کی وجہ بتاتے ہوئے قرآن کریم نے کہا،۔

> تم قانونِ خداوندی کے اتباع میں دشمن کو تہ تیغ کر رہے تھے۔ تمہیں غلبہ حاصل ہو رہا تھا اور اس طرح خدا کا وہ وعدہ پورا ہو رہا تھا جو اس نے تم سے کر رکھا تھا لیکن عین اس وقت تمہارے پاؤں میں لغزش پیدا ہو گئی۔ معاملہ پیشِ نظر میں تم نے باہمی تنازعہ شروع کر دیا۔ تم میں اختلاف پیدا ہو گیا اور تمہارے کمانڈر نے جو حکم دے رکھا تھا تم نے اس کی خلاف ورزی کی، حالانکہ فتح و کامرانی جو تمہارا محبوب مقصد تھا، تمہاری آنکھوں کے سامنے تھی ــــ تمہیں معلوم ہے ایسا کیوں ہوا تھا؟ اس لئے کہ تم میں سے کچھ لوگ پیشِ پا افتادہ مفاد پر ٹوٹ پڑے اور کچھ ایسے رہ گئے جن کی نگاہیں مستقبل کے مفاد پر تھیں۔ یوں تمہارا رُخ دشمن کی طرف سے ہٹ کر، دوسری سمت کو پھر گیا۔ (تمہیں شکست ہوگئی اور اس شکست سے تمہیں معلوم ہو گیا کہ تم میں کیا خامی تھی۔ (۳/۱۵۱)

اس واقعہ سے ایک اور عظیم حقیقت ہمارے سامنے آتی ہے جسے ہم ذرا آگے چل کر بیان کریں گے۔ بہرحال یہاں قرآنِ کریم نے بتایا ہے کہ اپنی شکست سے ہمت نہیں ہار دینی چاہیئے بلکہ ان اسباب پر غور کرنا چاہیئے جن کی وجہ سے وہ شکست ہوئی اور پھر ان کا تدارک یا ازالہ کرنا چاہیئے۔

میدانِ جنگ میں بھی غور و تدبّر

جنگ کے متعلق ذہن میں یہی آتا ہے کہ اس میں صرف جذبات کی شدّت کام آتی ہے۔ غور و فکر کا اس سے کچھ واسطہ نہیں۔ قرآن کہتا ہے کہ یہ غلط ہے۔ میدانِ جنگ میں بھی اگر غور و فکر اور تدبّر و تعقّل سے کام نہ لیا جائے تو اس کا نتیجہ شکست ہوتی ہے۔ جنگِ بدر میں قریش کو جو شکستِ فاش ہوئی تو قرآن نے اس کی بنیادی وجہ

بتاتے ہوئے کہا کہ یہ اس لئے ہوا کہ بِاَنَّھُمْ قَوْمٌ لَّا یَفْقَهُوْنَ (۸/۶۵) انہوں نے فکر و تدبر سے کام نہ لیا بلکہ اپنے جذبات کی رو میں اندھا دھند بہے چلے گئے۔ اس میں شبہ نہیں کہ انسانی زندگی میں جذبات کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔ جذبات ہی عمل کے محرک ہوتے ہیں لیکن جذبات کو ہمیشہ عقل و فکر کے تابع رکھنا چاہیئے — حتیٰ کہ میدانِ جنگ میں بھی — اور عقل کو وحیٔ خداوندی کے تابع — یہی اسلام ہے۔

(۸) اور اگلی ہدایت یہ ہے میدانِ جنگ میں پیٹھ دکھا کر بھاگنا نہیں چاہیئے۔ ایسا کرنا کس قدر سنگین جرم اور ناقابلِ معافی حرکت ہے، اس کا اندازہ اس سے لگایئے کہ میدانِ بدر میں، خود رسول اللہ کے زیرِ لوا، صحابہ کبارؓ کی جماعت، صف بستہ کھڑی ہے۔ یہ وہ سپاہی ہیں جو اپنا سب کچھ قربان کر کے، سربکف باطل کے مقابلہ کے لئے میدانِ کارزار میں آگئے ہیں۔ یہ وہ جماعت ہے جس کے متعلق ابھی ابھی حضور نبی اکرمؐ نے بدرگاہِ ربّ العزت بصد الحاح وزاری عرض کیا ہے کہ بار الہا! اگر آج اس جماعت کو شکست ہوگئی تو دنیا میں قیامت تک تیرا نام لینے والا کوئی نہیں رہے گا۔ سرفروشوں کی یہ جماعت میدانِ جنگ میں کھڑی ہے کہ کمانڈر کا حکم ملے تو وہ شیروں کی طرح دشمن پر جھپٹ پڑیں۔ عین اس وقت یہ آیت نازل ہوتی ہے کہ یاد رکھو۔

> اے جماعتِ مومنین! (یہ ٹھیک ہے کہ ہمارے قانون کی تائید و نصرت تمہارے ساتھ ہے اور تمہیں فتح و کامرانی کی نویدِ جانفزا بھی سنائی گئی ہے۔ بایں ہمہ، اسے بگوشِ ہوش سن لو کہ) جب تمہارا مقابلہ دشمن کی فوج سے ہو تو انہیں پیٹھ مت دکھانا۔ یاد رکھو جو ایسے وقت میں پیٹھ دکھائے گا، وہ خدا کے عذاب کا مورد بن جائے گا اور سیدھا تباہی و بربادی کے جہنم میں جا گرے گا اور وہ بہت برا ٹھکانا ہے۔ ہاں مگر جو جنگ کی تدبیر کے پیشِ نظر اپنا پینترا بدل لے، یا اپنی پارٹی کی طرف پلٹنا چاہے اور اس طرح اپنے مقام سے ہٹ کر ادھر ادھر ہو جائے تو اس کا مضائقہ نہیں۔
>
> (۸/۱۵ - ۱۶)

سرفروشوں کی جو جماعت اس وقت رزمگاہ میں تھی اس نے تو دشمن کو کیا پیٹھ دکھانی تھی، یہ دراصل ایک اصولی ہدایت تھی کہ فتح و کامرانی انہی کا حصہ ہوتی ہے جو دشمن کا ڈٹ کر مقابلہ کریں اور اس کی سختی سے ڈر کر بھاگ نہ اٹھیں — حَتّٰی یُثْخِنَ فِی الْاَرْضِ (۸/۶۷) تاآنکہ دشمن کی قوت ٹوٹ جائے اور وہ مغلوب ہو جائے۔ اس کے ساتھ ہی یہ بھی کہہ دیا کہ اس کے میدان سے بھاگ جانے پر یہ قیاس نہ کرو کہ وہ شکست کھا گیا ہے۔ یہ اس کی جنگی چال ہو سکتی ہے۔ اس لئے اس کا تعاقب کرو اور پیچھے سے اس پر بھرپور وار کرو۔ وَلَا تَهِنُوْا فِی ابْتِغَآءِ

اُلْقَوْمِ۔ (۴/۱۰۴) اس کے تعاقب میں سُستی اور کمزوری نہ دکھاؤ۔ اس طرح اس کی کمر یوں ٹوٹے گی کہ وہ دوبارہ سرکشی کی ہمت نہیں کرے گا۔

اسلامی نظام کی جھلک

یہ ہدایات ہیں تو جنگ سے متعلق لیکن اگر بغور دیکھا جائے تو اس سے خود اسلامی نظام کی ایک جھلک سامنے آجاتی ہے۔ دشمن کے خلاف جنگ کی جائے اور کب کی جائے، اس کا فیصلہ سربراہِ مملکت اپنے اہل الرائے اعیان کے مشورہ سے کرے گا۔ وَشَاوِرْهُمْ فِي الْأَمْرِ ۚ فَإِذَا عَزَمْتَ فَتَوَكَّلْ عَلَى اللَّهِ (۳/۱۵۸)۔ تم امورِ مملکت میں ان سے مشورہ کرو اور اس مشاورت کے بعد جب تو کسی فیصلہ پر پہنچ جائے تو پھر پورے عزم اور ہمّت کے ساتھ اس پر عمل پیرا ہو جاؤ اور قانونِ خداوندی کی محکمیّت پر کامل بھروسہ رکھو۔ (یہ خود رسول اللہؐ سے ارشاد ہے) ایسا فیصلہ ہو جانے کے بعد جنگ سے متعلقہ افسر اس کے مطابق پلان مرتّب کریں۔ وَ أَمْرُهُمْ شُورَىٰ بَيْنَهُمْ۔ (۴۲/۳۸) (یہ اُمّت سے کہا گیا ہے) اس پلان کو افسرانِ زیریں تک پہنچا دیا جائے تاکہ وہ، وقت اور حالات کے تقاضے کے مطابق اس کی جزئیات خود مرتب کریں۔ ان جزئیات کے مطابق وہ احکامِ جنگ نافذ کریں۔ ان احکام کی اطاعت سپاہیوں پر بے چون وچرا لازم ہوگی۔ سوچئے کہ اگر سپاہی "آزادیٔ رائے اور حریّتِ فکر" کو اپنا حق سمجھیں اور میدانِ جنگ میں ہر سپاہی وہ کچھ کرے جو اس کا اپنا فیصلہ ہو تو میدانِ جنگ کا نقشہ اور اس قوم کا حشر کیا ہو جاتے؟ انفرادی آزادیٔ فکر ہی نہیں، اگر سپاہیوں کو "حقِ جمہوریّت" دے دیا جائے اور میدانِ جنگ میں، افسرانِ بالا کی ہدایات کے مطابق قدم اٹھانے کے بجائے، وہ کچھ کریں جو ان میں سے اکیاون کا فیصلہ ہو تو بھی نتیجہ ظاہر ہے! آزادیٔ رائے اور حریّتِ فکر کا ایک دائرہ ہے اور اسے وہیں تک محدود رہنا چاہیئے۔ اس کے بعد پابندیٔ ہدایات ضروری ہو جاتی ہے۔ آزادی اور پابندی کے اسی امتزاج کا نام اسلامی نظام ہے۔ قرآنِ کریم نے جو اسلامی جیوش و عساکر کے متعلق کہا ہے کہ۔ إِنَّ اللَّهَ يُحِبُّ الَّذِينَ يُقَاتِلُونَ فِي سَبِيلِهِ صَفًّا كَأَنَّهُم بُنْيَانٌ مَّرْصُوصٌ۔ (۶۱/۴) کس قدر محبوب ہیں یہ لوگ خدا کی نگاہ میں جو اس کے راستے میں یوں صف بستہ لڑتے ہیں گویا ایک سیسہ پلائی ہوئی دیوار ہیں، تو سپہ سالار سے لے کر سپاہی تک، سب اس دیوار کی اینٹیں ہوتی ہیں جن میں کوئی خلا نہیں ہوتا۔ وہ سب باہمدگر مربوط ہوتی ہیں۔ ("سیسہ پلائی ہوئی" سے یہی مراد ہے) یہی وہ رابطہ ہے جس کے متعلق کہا گیا ہے کہ

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اصْبِرُوا وَصَابِرُوا وَرَابِطُوا وَاتَّقُوا اللَّهَ لَعَلَّكُمْ

تُفۡلِحُـــــوۡنَ (۳/۱۹۹)

اے جماعتِ مومنین! مصافِ زندگی میں اس طرح گامزن رہو کہ تم میں سے ہر ایک خود بھی ثابت قدم ہو اور اپنے ساتھیوں کی ثابت قدمی کا موجب بھی۔ تم اس انداز سے بانہوں میں بانہیں ڈالے نہایت محکم ربطِ باہمی سے، قوانینِ خداوندی کی نگہداشت کرتے ہوئے آگے بڑھتے جاؤ۔ فتح و کامرانی تمہارے قدم چوم لے گی۔

مومن کی زندگی میں تیغ کا مقام

یہ ہے قرآنِ کریم کی رُو سے مومن کی زندگی میں "تیغ" کا مقام، وہ تیغ جس کے متعلق اس نے کہا ہے کہ

لَقَدۡ اَرۡسَلۡنَا رُسُلَنَا بِالۡبَیِّنٰتِ وَ اَنۡزَلۡنَا مَعَہُمُ الۡکِتٰبَ وَ الۡمِیۡزَانَ لِیَقُوۡمَ النَّاسُ بِالۡقِسۡطِ ۚ وَ اَنۡزَلۡنَا الۡحَدِیۡدَ فِیۡہِ بَاۡسٌ شَدِیۡدٌ وَّ مَنَافِعُ لِلنَّاسِ وَ لِیَعۡلَمَ اللّٰہُ مَنۡ یَّنۡصُرُہٗ وَ رُسُلَہٗ بِالۡغَیۡبِ ؕ اِنَّ اللّٰہَ قَوِیٌّ عَزِیۡزٌ ﴿۵۷/۲۵﴾

ہم نے دنیا کی ہر قوم کی طرف اپنے پیغامبروں کو بھیجا۔ ہر رسول اپنے ساتھ ایک ضابطۂ قوانین لاتا تھا اور اسے دلائل و براہین کی رُو سے پیش کرتا تھا تاکہ لوگ عقل و بصیرت سے کام لے کر ایسا معاشرہ قائم کریں جس میں ہر شخص کے ساتھ عدل و انصاف ہو لیکن مستبد قوتیں ایسا نہیں ہونے دیتی تھیں۔ ان کی روک تھام کے لئے ہم نے (ضابطۂ قوانین کے ساتھ) شمشیرِ خارہ شگاف بھی "نازل کی" جس میں بڑی صلابت ہوتی ہے۔ چونکہ یہ شمشیر، مظلوموں اور کمزوروں کی حفاظت کے لئے اٹھائی جاتی ہے، اس لئے یہ نوعِ انسان کے لئے بڑی منفعت بخش ہوتی ہے۔ اس سے یہ بھی واضح ہوجاتا ہے کہ وہ کون لوگ ہیں جو نظامِ خداوندی کی ایسے وقت میں مدد کرتے ہیں جب ہنوز اس کے نتائج و اثمار محسوس شکل میں سامنے نہیں آتے ہوتے۔ اس طرح خدائے قوی و غالب کا پروگرام انسانی دنیا میں غلبہ حاصل کرلیتا ہے۔

یہی ہے وہ شمشیر جس کے متعلق اقبالؒ نے کہا ہے کہ

سوچا بھی ہے اے مردِ مسلماں کبھی تو نے　　کیا چیز ہے فولاد کی شمشیرِ جگردار

اس بیت کا یہ مصرعِ اوّل ہے کہ جس میں پوشیدہ چلے آتے ہیں توحید کے اسرار
ہے فکر مجھے مصرعِ ثانی کی زیادہ
اللہ کرے تجھ کو عطا فقر کی تلوار

عہدِ فاروقی، "فولاد اور فقر کی تلوار" کے حیات بخش "شعر" کا تابندہ مظہر تھا جس کا "وزن" سیرتِ فاروقی کی میزان سے قائم تھا۔

حضرت عمرؓ کا جہادِ مسلسل

حضرت عمرؓ کی ساری زندگی جہادِ مسلسل کی درخشندہ داستان تھی۔ ان کے زمانۂ قبل از اسلام کی زندگی میں ان کے ذہنی اور فکری جہاد کا ثبوت ہمیں اس سے ملتا ہے کہ وہ تجارت کی غرض سے دور دراز ممالک میں جاتے تھے تو اپنا فارغ وقت وہاں کے اربابِ فکر و نظر اور اعیانِ علم و بصیرت کی ملاقاتوں میں گزارتے تھے۔ جو شخص آباؤ اجداد کے مسلک پر مطمئن ہو کر بیٹھ جائے، اس کا ذہن جامد، اور اس کی فکر مردہ ہو جاتی ہے۔ وہ نہ اپنے نظریات و معتقدات کو، محکِ علمی پر پرکھنے کی ضرورت محسوس کرتا ہے، نہ تحقیق و تجسس کی احتیاج۔ اس کے برعکس، زندہ ذہن، موروثی نظریات و مسالک کو پرکھتا ہے اور اگر ان میں کوئی سقم پاتا ہے تو تلاشِ صداقت میں سرگرداں رہتا ہے۔ تجسسِ حقیقت کی یہی کاوش تھی جس کے متعلق حضورِ نبی اکرمؐ کے متعلق کہا گیا کہ وَ وَجَدَكَ ضَآلًّا فَهَدٰى (۹۳/۷) "اے رسولؐ! ہم نے تجھے تلاشِ صداقت میں سرگرداں پایا تو زندگی کے صحیح راستے کی طرف تمہاری راہ نمائی کر دی"۔ تلاشِ حقیقت کی یہی سرگردانی تھی جو عمرؓ ابن خطاب کو بھی کبھی مختلف اربابِ فکر و نظر کی محفلوں کی طرف کشاں کشاں لئے جاتی تھی، اور کبھی راتوں کی تنہائیوں میں جانبِ حرم رواں دواں، کہ وہاں خاموشی سے اس نئے داعیٔ انقلاب کے پیغام کا مطالعہ کیا جا سکے۔ جب تک ابن خطابؓ نے حقیقت کو نہیں پا لیا وہ اس دعوتِ انقلاب کا شدید ترین مخالف رہا کیونکہ وہ بزعمِ خویش اسے اپنی قوم کے لئے مضرت رساں سمجھتا تھا۔ اس کی یہ مخالفت بھی اس کے "جہاد" (جدوجہدِ مسلسل) کی آئینہ دار تھی۔ اگرچہ اس وقت اس کا رُخ غلط سمت کی طرف تھا اور جب (رسول اللہ کی وساطت سے، انسانوں تک پہنچی ہوئی) حقیقت اپنی نقاب الٹ کر سامنے آگئی تو اس کی مدافعت و حفاظت کے لئے برہنہ شمشیر باہر آنا بھی، اسی جذبۂ جہاد کا مظہر تھا۔ ہجرت اسی جہد للحق کا حصہ لاتا تھا اور اس کے بعد حضورِ نبی اکرمؐ کے زیرِ لوا، ہر میدانِ سعی و عمل میں بھرپور شرکت، اس کا گوشۂ الا حضرت صدیق اکبرؓ کی رفاقت میں، ہر معرکہ میں شرکت بھی اسی قلبِ متحرک کی تڑپ اور خلش کی مظہر تھی، اور اس کے بعد جب خلافت کی ذمّہ داریاں خود سنبھالیں، تو ساری زندگی اور اس کے بعد شہادت، بھی اسی جہادِ مسلسل کی برق آسا داستان،

اور یہی وہ کوندا تھا جس کی لپک آپ کے رفقاء (دیگر صحابہؓ) کی سیرتوں میں بھی تڑپتی نظر آتی ہے۔ أُولَٰئِكَ عَلَيْهِمْ صَلَوَاتٌ مِّن رَّبِّهِمْ وَرَحْمَةٌ ۖ وَأُولَٰئِكَ هُمُ الْمُهْتَدُونَ۔ (۲/۱۵۷)

(۵)

صدرِ اوّل میں سربراہِ مملکت ہی فوجوں کا کمانڈر۔ان۔چیف ہوتا تھا۔ چنانچہ قرآنِ کریم میں ہے کہ نبئِ اکرمؐ

فوجوں کا کمانڈر

خود عساکرِ اسلامیہ کی صف بندی فرمایا کرتے تھے۔ (۳/۱۲۰) یہی کیفیت حضرت عمرؓ کی تھی۔ وہ نہ صرف یہ کہ فوجوں کی روانگی کے وقت جنگ کے متعلق پوری پوری ہدایات دیتے تھے بلکہ جنگ کے حالات سے پورے طور پر باخبر رہتے تھے، اور مدینہ میں بیٹھے، محاذِ جنگ کے پلان مرتب کر کے بھیجتے رہتے تھے۔ اپنے زمانۂ خلافت میں آپ بہ نفسِ نفیس کسی معرکہ میں شریک نہیں ہوئے۔ اس کی وجہ کیا تھی، اس کا اندازہ اس سے لگ سکتا ہے کہ آپ نے ۱۴ھ میں ارادہ کیا کہ عراق جا کر ایک لشکر کی کمان خود سنبھال لیں۔ آپ نے حضرت علیؓ کو اپنا جانشین مقرر کیا اور خود رختِ سفر باندھ لیا۔ ابھی مدینہ کے باہر پہلے پڑاؤ تک پہنچے تھے (جو وہاں سے قریب تین میل پر واقعہ تھا) کہ صحابہؓ نے اس معاملہ پر مزید غور و فکر کیا اور ان کے نمائندہ حضرت عبدالرحمٰنؓ بن عوف نے آپ سے کہا کہ

> امیر المومنین! آپ خود تشریف نہ لے جایئے۔ ایک لشکر بھیج دیجئے اور اس کی کمان کی خدمت میرے سپرد کر دیجئے۔ اگر لشکر شکست کھا گیا تو یہ کوئی ایسی بات نہیں ہوگی لیکن اگر آپ شکست کھا گئے اور وہ بھی سب سے پہلے لشکر میں، تو اس کا اثر تمام مضرت رساں ہوگا اور اگر آپ شہید ہو گئے تو مجھے ڈر ہے کہ خدا کا نام لینے والا کوئی بھی نہیں رہے گا۔

یہ سن کر آپ نے فرمایا کہ ___ "ہاں! میں بھی آپ جیسا ایک انسان ہوں اور آپ کے مشوروں کا محتاج۔ اگر آپ یہی مناسب سمجھتے ہیں تو میں رک جاتا ہوں"۔ چنانچہ آپ واپس مدینہ تشریف لے آئے۔

سپہ سالاروں کا انتخاب

آپ سپہ سالاروں کا انتخاب بڑی دوُر نگہی اور ژرف بینی سے کرتے تھے۔ ان کی عسکری صلاحیتوں کے علاوہ، ان کے جوہرِ ذاتی، پاکیزگیٔ سیرت اور بلندیٔ کردار کو بڑی اہمیت دیتے تھے۔ ان کے انتخاب پر انہیں ضروری ہدایات دیتے اور جب کسی لشکر کو کسی مہم پر روانہ کرتے تو جملہ اہلِ لشکر کو خاص نصیحتیں فرماتے۔ اصولاً ان سے کہا کرتے تھے کہ

> یاد رکھو! ہماری جنگ ظلم، تغلّب، استعمار یا استحصال کے لئے نہیں۔ یہ نہایت عادلانہ اور رحیمانہ

جنگ ہے جس کے خاص قواعد و ضوابط اور اصول و اقدار ہیں۔ ان کی خاص طور پر پابندی کرنا۔
عام ہدایات میں اس کی بھی تاکید کی جاتی تھی کہ غیر متحارب آبادی کو (یعنی جو لوگ جنگ میں شریک نہ ہوں) انہیں قتل نہ کیا جائے۔ عورتوں اور بچوں پر کسی صورت میں ہاتھ نہ اٹھایا جائے۔ درختوں کو نہ کاٹا جائے۔ فصلوں کو تلف نہ کیا جائے۔ مقتولینِ جنگ کا مُثلہ نہ کیا جائے۔ (عربوں کے ہاں رواج تھا کہ وہ بڑے بڑے سرداروں کی لاشوں کے مختلف اعضاء ناک، کان وغیرہ کاٹ ڈالتے تھے۔ اسے مُثلہ کہتے تھے) اور دشمن سے کبھی بدعہدی نہ کی جائے۔

ہدایات آپ نے جب حضرت خالد بن ولیدؓ کی جگہ حضرت ابو عبیدہؓ کو سپہ سالار مقرر کیا، تو انہیں لکھا۔
میں تمہیں خوفِ خدا کی نصیحت کرتا ہوں جو ہمیشہ باقی رہے گا اور اس کے سوا ہر چیز فنا ہو جائے گی۔ اسی نے ہمیں تاریکیوں سے نکال کر زندگی کی روشن راہوں پر چلایا۔ تمہیں ایک نہایت ذمہ دار منصب پر تعینات کیا جاتا ہے۔ مسلمانوں کے حقوق کا خیال رکھنا، مالِ غنیمت کے لالچ میں مجاہدین کو ہلاکت میں مبتلا نہ کرنا اور نہ کسی ایسی جگہ ٹھہرنا جہاں پہلے سے جاسوس بھیج کر وہاں کے جملہ احوال و کوائف سے واقفیت اور وہاں کے راستوں کی معلومات حاصل نہ کر لی ہوں۔ لشکر بھیجنا تو بھاری تعداد میں بھیجنا۔ دنیاوی جاذبیتوں کی طرف سے آنکھیں بند کر لینا اور ان سے اپنے دل کو پاک رکھنا۔ خبردار! دنیاوی کشش تمہیں ہلاک نہ کر دے جیسا کہ وہ پہلوں کو ہلاک کر چکی ہے۔

جب حضرت سعدؓ کو جنگِ عراق کا سپہ سالار مقرر کیا تو فرمایا۔
اے سعد! اے سعد بن وہیب!! دیکھنا کہیں اس بات سے دھوکہ نہ کھا جانا کہ تم رسول اللہ کے ماموں اور آپ کے صحابی کہلاتے ہو۔ اللہ کے ہاں نسب کوئی شے نہیں۔ بس اطاعتِ خداوندی کام آتی ہے۔ انسان سب برابر ہیں۔ وہ سب کا پروردگار ہے۔ البتہ اطاعتِ خداوندی اور سلامت روی کی وجہ سے ایک کو دوسرے پر فضیلت حاصل ہوتی ہے۔ یاد رکھو! اللہ تعالیٰ برائی کو برائی کے ذریعے نہیں مٹاتا۔ وہ برائی کو بھلائی سے مٹاتا ہے۔ رسول اللہ کے اُسوۂ حسنہ پر نگاہ رکھو۔ اگر تم نے اس سے رُوگردانی کی تو تمہارے سب اعمال بیکار ہو جائیں گے اور تم بھی ان میں سے ہو جاؤ گے جو تباہ ہو گئے۔

پہلے بتایا جا چکا ہے کہ اپنے زمانۂ خلافت میں حضرت عمرؓ کسی میدانِ کارزار میں بذاتِ خویش شریک نہیں ہوتے۔

لیکن وہ مدینہ میں بیٹھے اس طرح ہدایات جاری کیا کرتے تھے گویا میدان جنگ ان کے سامنے ہے۔ میدان جنگ ہی نہیں بلکہ وہ سارا ملک، اس کے نشیب و فراز، وہاں کے احوال و کوائف، سب ان کے نظروں کے سامنے ہیں۔ مثلاً حضرت سعد ابن ابی وقاصؓ، سپہ سالار کی حیثیت سے ایران جاتے ہیں تو حضرت عمرؓ انہیں ایک تفصیلی خط لکھتے ہیں۔ اس میں تحریر فرماتے ہیں۔

> اب تم مجاہدین کی معیت میں ایران کی طرف بڑھو اور قوانین خداوندی کی محکمیت پر پورا پورا بھروسہ رکھو اور تمام امور میں اُسی کی اعانت طلب کرو۔ تمہیں معلوم ہونا چاہیئے کہ تم ایک ایسی قوم پر حملہ کر رہے ہو جس کی طاقت بہت زیادہ ہے۔ تعداد بھی بڑی کثیر ہے۔ ساز و سامان کی افراط ہے۔ ان کا ملک بڑا محفوظ ہے، زمین اگرچہ وہاں کی نرم ہے (سنگلاخ نہیں) لیکن دریاؤں، سیلابوں اور جنگلوں سے اس طرح پٹی پڑی ہے کہ وہاں کے راستے بڑے دشوار گزار ہیں۔ ان امور کو پیش نظر رکھو ایک بات اور بھی یاد رکھو، اور وہ یہ کہ ان پر جب بھی حملہ کرو، پوری شدت کے ساتھ بھرپور حملہ کرو۔ ان کی کثرت تعداد سے نہ گھبرانا لیکن ان کے دھوکہ میں نہ آنا۔ یہ بڑی مکار قوم ہے۔ ان کی طبائع تمہاری طبائع سے بالکل مختلف ہیں۔ وہ مکار بہت زیادہ ہیں لیکن جدوجہد میں تمہارا مقابلہ نہیں کر سکتی۔ تم قادسیہ تک پہنچ جاؤ تو یوں سمجھو جیسے تم ایران کے دروازے میں داخل ہو گئے۔ یہ علاقہ بڑا سرسبز و شاداب ہے۔ اس سے درے دریا ہیں اور دریاؤں پر پل ہیں۔ تم اپنی چھاؤنی اس کی سرحد پر بنانا لیکن اس قدر مضبوط چھاؤنی بنانا کہ تمہیں وہاں سے ہٹنا نہ پڑے۔

آپ دیکھتے ہیں کہ آپ مدینے میں بیٹھے ہوئے ایران کے متعلق کس قدر تفصیلی ہدایات دے رہے ہیں اور ایسی جزئی ہدایات اس زمانے میں دے رہے ہیں جب سامان رسل و رسائل کا اس قدر فقدان اور مواصلات کی اس قدر کمی تھی۔ اس زمانے میں، دشمن کے ملک سے اتنی دور بیٹھے، وہاں کی جزئیات تک سے اس قدر باخبر ہونا، ہر ایک کے بس کی بات نہ تھی۔ اس کے لئے بڑی دوربینی، جزرسی، کاوش اور کاہش کی ضرورت اور ہر وقت عقابی نظروں سے حالات کا مشاہدہ اور مطالعہ کرنے کی صلاحیت اور عادت لاینفک تھی۔

حضرت عمرو بن عاصؓ مصر کی افواج کے سپہ سالار تھے۔ جب مصر کی فتح میں تاخیر ہو گئی تو آپ نے انہیں ایک انتہائی چٹھی لکھی جس میں کہا کہ:-

> مجھے تعجب ہے کہ تم اس وقت تک مصر کیوں نہ فتح کر سکے حالانکہ تمہیں لڑتے ہوتے دو برس ہو گئے

میں تو یہی سمجھ سکا ہوں کہ غالباً تم لوگ بھی دنیاوی جاذبیتوں سے اسی طرح محبت کرنے لگ گئے ہو جس طرح تمہارا دشمن کرتا ہے۔ اس صورت میں تم کبھی ان پر غالب نہیں آسکو گے۔ یاد رکھو! خدا کسی قوم کو فتح عطا نہیں کرتا جب تک اس کی نیتیں درست نہ ہوں۔

"نیتوں کی درستی" سے کیا مفہوم تھا' اسے ایک واقعہ سے سمجھئے۔ ایک جنگ میں، دشمن کا ایک سردار اس بے جگری اور جرأت و بسالت سے لڑتا تھا کہ اسے مغلوب کرنا مشکل نظر آتا تھا۔

سپاہیوں کا کردار

مجاہدین کے سپہ سالار نے اعلان کیا کہ جو شخص اس سردار کا سر کاٹ کر لے آئے گا' اسے ہزار دینار انعام دیا جائے گا۔ صبح ہوئی تو لوگوں نے دیکھا کہ اس سردار کا سر سپہ سالار کے خیمے کے باہر پڑا ہے اور کسی کو پتہ نہیں کہ یہ کارنامہ کس نے سرانجام دیا ہے۔ لوگوں سے دریافت کرنے پر بھی کچھ معلوم نہ ہو سکا تو سپہ سالار نے اعلان کیا کہ جس مرد جری نے یہ کارنامہ سرانجام دیا ہے میں اسے خدا کی قسم دیتا ہوں کہ وہ میرے سامنے آئے۔

یہ سنکر ایک غیر معروف سا سپاہی سامنے کھڑا ہو گیا۔ سپہ سالار نے پوچھا کہ یہ تمہارا کارنامہ ہے' اس نے کہا۔ ہاں! تو سپہ سالار نے کہا کہ یہ لو تمہارا انعام۔

اس نے انعام لینے سے انکار کر دیا اور کہا کہ میں نے یہ خدمت خدا کے لئے سرانجام دی ہے' انعام کی خاطر نہیں۔ سپہ سالار بہت خوش ہوا۔ اس سے پوچھا کہ تمہارا نام کیا ہے؟ وہ بولا — آپ میرا نام پوچھ کر کیا کریں گے۔ کیا آپ چاہتے ہیں کہ لوگوں میں اس کا شہرہ کرو۔ تم اس طرح میرا اجر بھی ضائع کر دو گے اور میرے نفس کو بھی خراب کر دو گے۔ مجھے جانے دیجئے۔

یہ تھا مطلب نیتوں کی اصلاح کا اور اسی پر سب سے زیادہ زور دیا جاتا تھا۔ حضرت سعد بن ابی وقاص کو ایک خط میں لکھا۔

کامیابی کا راز

میں تمہیں اور تمہارے لشکریوں کو حکم دیتا ہوں کہ وہ ہر حال میں اللہ سے ڈرتے رہیں کیونکہ دشمن کے مقابلہ کے لئے سب سے زیادہ مؤثر ہتھیار اور سب سے زیادہ کامیاب تدبیر، خوف خدا ہے — خوف خدا کے معنی ہیں' احکام خداوندی کی خلاف ورزی سے بچنا۔ میں تم سب کو حکم دیتا ہوں کہ تم اپنے دشمن کی نسبت' اخلاقی خرابیوں سے زیادہ بچو کیونکہ اہل لشکر کی اپنی اخلاقی خرابیاں ان کے حق میں دشمنوں کے حملوں سے بھی زیادہ خطرناک ہوتی ہیں۔ مسلمانوں کی فتح صرف

اس لئے ہوتی ہے کہ دشمن کے اخلاق ان سے زیادہ پست ہوتے ہیں۔ اگر یہ بات نہ ہو تو مسلمان کبھی ان کا مقابلہ نہ کر سکیں۔ اس لئے کہ نہ ہماری فوج، تعداد میں ان کی فوج کے برابر ہے نہ ساز و سامان میں۔ لہٰذا، اگر گناہگاری یعنی بداخلاقی اور بدکرداری میں ہم اور وہ ایک سطح پر ہوئے تو پھر وہ کون سی چیز ہوگی جس کے بل بوتے پر ہم ان پر غالب آسکیں گے۔ اگر ہم حسنِ سیرت میں ان سے آگے ہوں گے تو ہم ان پر فتح حاصل کر سکیں گے۔ تمہیں معلوم ہونا چاہیئے کہ تمہارے اوپر کراماً کاتبین مقرر ہیں، جو تمہاری ہر بات کو جانتے ہیں۔ ان سے شرماؤ (اور اس طرح ظاہر و باطن ہر بداخلاقی اور معصیت سے بچو) یہ کبھی خیال نہ کرو کہ ہم بُرے ہی سہی لیکن دشمن ہم سے زیادہ بُرا ہے۔ اس لئے خدا یہ کبھی نہیں کرے گا کہ خواہ ہم برائی ہی کیوں نہ کرتے رہیں، وہ ہم پر مسلط ہو جائے۔ تاریخ میں دیکھو کتنی قومیں ایسی تھیں کہ ان سے زیادہ بُری قومیں ان پر مسلط ہو گئیں۔ بابل کا بخت نصر بنی اسرائیل پر کسطرح مسلط ہو گیا حالانکہ بنی اسرائیل بہر حال خدا کو مانتے تھے اور اہل بابل کافر و مشرک تھے۔ (لہٰذا، اپنا اور دشمن کا مقابلہ برائیوں کے پیمانے سے نہیں، اچھائیوں کے پیمانے سے کرو۔ اسی میں کامیابی کا راز ہے)

حسنِ کردار اور پاکیزگیٔ اخلاق کا معیار یہ ہے کہ لوگوں کے ساتھ تمہارے معاملات کیسے ہیں۔ اس سلسلہ میں انہوں نے حضرت سعد ابنِ ابی وقاصؓ کے نام خط میں ایک فقرہ ایسا لکھا جس میں فلسفۂ اخلاق کی ساری تفصیل سمٹ کر آگئی ہے۔ آپ نے لکھا:-

اگر تم یہ جاننا چاہتے ہو کہ اللہ کے ہاں تمہارا مقام کیا ہے تو یہ دیکھو کہ اللہ کی مخلوق تمہیں کیسا سمجھتی ہے۔ اچھی طرح جان لو کہ اللہ کے ہاں تمہارا مرتبہ وہی ہے جو مخلوق کے ہاں ہے۔

اسی طرح سپہ سالار اور لشکری، حاکم اور رعایا، امیر اور عوام کے باہمی تعلقات کے سلسلہ میں، حضرت عمرو بن عاصؓ کے نام ایک مکتوب گرامی میں ایک فقرہ ایسا لکھا جو اپنی جامعیت اور صداقت کے اعتبار سے یوں کہیئے گویا ابد بکنار ہے۔ آپ نے لکھا کہ

تم اپنی رعایا (ماتحتوں) کے لئے ایسے بن جاؤ جیسے اگر تم رعایا (ماتحت) ہو تو اپنے امیر کو دیکھنا چاہو۔

انہی کے نام ایک اور خط میں لکھا:-

یاد رکھو! جب حاکم بگڑ جاتا ہے تو رعایا بھی بگڑ جاتی ہے۔ سب سے بدبخت وہ انسان ہے جس کی وجہ سے اس کی رعایا بدبخت ہو جائے۔

انہی نصائح کا اثر تھا کہ سپہ سالاروں نے، اہلِ لشکر کے ساتھ ــــ من تو شدم تو من شدی ــــ (دو قالب و

سپہ سالاروں کا برتاؤ سپاہیوں کیساتھ

ایک جان کا) سا رشتہ استوار کر رکھا تھا حضرت ابو عبیدہؓ عواس میں تھے کہ وہاں طاعون کا مرض وبائی شکل میں پھوٹ پڑا۔ حضرت عمرؓ کو خطرہ لاحق ہوا کہ "امین الامت" (یہ حضرت ابو عبیدہؓ کا لقب تھا) کہیں اس کی گرفت میں نہ آجائیں۔ چنانچہ آپ نے انہیں لکھا کہ:۔

مجھے ایک ضروری کام کے سلسلہ میں آپ سے بالمشافہ گفتگو کرنی ہے۔ تاکید ہے کہ اس خط کے دیکھتے ہی میرے پاس پہنچ جاؤ۔

حضرت ابو عبیدہؓ خط پڑھتے ہی حضرت عمرؓ کے مقصد کو بھانپ گئے۔ انہوں نے جواب میں لکھا کہ:۔

میں سمجھ گیا کہ آپ کو میری کیا ضرورت ہے۔ اس وقت میرے ساتھ مسلمانوں کا پورا لشکر ہے۔ میں نہیں چاہتا کہ انہیں اس بلا میں چھوڑ کر خود محفوظ ہو جاؤں۔ لہٰذا میں درخواست کرتا ہوں کہ آپ مجھے اس ارشاد کی تعمیل سے معذور قرار دیں اور اپنے لشکر میں رہنے دیں۔

خط پڑھ کر حضرت عمرؓ کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ لوگوں نے پوچھا کہ کیا (حضرت) ابو عبیدہؓ وفات پا گئے؟ آپ نے رُندھی ہوئی آواز میں کہا کہ وفات پا تو نہیں گئے ــــ پا جائیں گے۔

اور دوسری اطلاع یہ موصول ہوئی کہ امین الامت، وفات پا گئے۔

اور یہی حضرت ابو عبیدہؓ تھے کہ جب عراق کے سرداروں کے ساتھ صلح کی گئی، تو انہوں نے آپ کو کھانے پر مدعو کیا۔ دسترخوان پر انواع و اقسام کے ایرانی کھانے چنے ہوئے تھے۔ آپ نے انہیں دیکھا تو دریافت کیا کہ کیا تمام اہلِ لشکر کو اسی قسم کے کھانے دیئے گئے ہیں یا یہ میرے ہی لئے مخصوص ہیں۔ جب معلوم ہوا کہ وہ صرف آپ کے لئے ہیں تو آپ نے اپنا بڑھایا ہوا ہاتھ یہ کہہ کر دسترخوان سے کھینچ لیا کہ جب تک تمام اہلِ لشکر کو یہی کھانے نہیں دیئے جائیں گے، میں انہیں ہاتھ نہیں لگاؤں گا۔

اور جب تک تمام اہلِ لشکر کے لئے انہی جیسے کھانوں کا اہتمام نہیں ہوا، آپ نے ان کی دعوت قبول نہیں کی۔

سقاطیہ کی جنگ میں مسلمانوں کے ہاتھوں بہت سا مالِ غنیمت آیا۔ ان میں وہ کھجوریں بھی تھیں جو ایران کے بادشاہوں کے لئے مخصوص تھیں۔ یہ کھجوریں بھی تمام اہلِ لشکر میں اسی طرح تقسیم کی گئیں جس طرح سپہ سالار کو ملیں۔

جب انہیں معلوم ہوا کہ ایران کے شاہنشاہ ان کھجوروں کو اپنے تک محدود رکھتے تھے اور ان کاشتکاروں کو بھی نہیں دیتے تھے جن کی محنت کے پسینے سے ان درختوں کی آبیاری ہوتی تھی تو انہوں نے ان غریب کاشتکاروں کو بھی ان میں برابر کا شریک کر لیا۔

حمص کا واقعہ

مفتوحہ علاقہ کی غیر مسلم رعایا کے ساتھ بھی لشکرِ اسلام کا یہی سلوک تھا جس سے وہ انہیں خود اپنوں پر بھی ترجیح دیتے تھے۔ جب مسلمانوں نے حمص کو فتح کر لیا تو وہاں کی عیسائی رعایا سے جزیہ وصول کیا۔ (جزیہ اور ذمیوں کے متعلق تفصیلی بحث کسی دوسری جگہ ملے گی۔ اس وقت اتنا واضح کر دینا کافی ہوگا کہ مسلمان جس علاقہ کو فتح کرتے، وہاں کے باشندوں کو اجازت ہوتی کہ وہ چاہے تو اسلام قبول کر کے خود فاتح قوم کا جزو بن جائیں اور چاہے اپنے مذہب پر قائم رہیں۔ اس دوسری صورت میں مسلمان ان غیر مسلم مفتوحین کی جان، مال، عزت، آبرو، مذہب، معابد کی حفاظت کا ذمہ لیتے۔ اسی نسبت سے انہیں ذمی یا اہل الذمہ کہا جاتا۔ یعنی وہ جن کی ہر قسم کی حفاظت کا ذمہ مسلمانوں نے لے لیا ہو۔ اس حفاظتِ کلی کے عوض، وہ لوگ ایک نہایت معمولی سا ٹیکس ادا کرتے جسے جزیہ کہا جاتا۔ یہ ٹیکس درحقیقت ایک علامت (TOKEN) ہوتی تھی اس بات کی کہ ان لوگوں نے مملکتِ اسلامیہ کی حفاظت قبول کر لی ہے۔ اس مقصد کے لئے مسلمانوں نے حمص کے عیسائیوں سے جزیہ وصول کیا۔ کچھ عرصہ کے بعد انہوں نے (مسلمانوں نے) دیکھا کہ رومیوں کا لشکر حمص کی طرف بڑھ رہا ہے اور یہ، جنگی تدبیر کے پیشِ نظر، حمص کو خالی کر دینا چاہتے ہیں۔ انہوں نے وہاں کے پادریوں اور سرداروں کو بلایا اور کہا کہ چونکہ ہم یہاں سے جا رہے ہیں اور تمہاری حفاظت نہیں کر سکتے، اس لئے (اس حفاظت کے لئے) تم سے جو جزیہ کی رقم وصول کی تھی، ہمیں اب کوئی حق حاصل نہیں کہ اس رقم کو اپنے پاس رکھ لیں، اس لئے ہم تمہیں وہ رقم واپس دیتے ہیں۔

حمص کے یہ باشندے بھی عیسائی تھے اور رومی جو یہاں سے چلے گئے تھے لیکن اب دوبارہ واپس آ رہے تھے وہ بھی عیسائی۔ لیکن اہلِ حمص کا یہ عالم تھا کہ وہ روتے تھے اور مسلمانوں کے لشکر سے درخواستیں کرتے تھے کہ آپ یہاں سے نہ جائیے۔

تو نخلِ خوش ثمرے کیستی، کہ سرو و سمن

ہمہ ز خویش بریدند و با تو پیوستند

مسلمان سپاہیوں کا یہی کردار تھا جو اس سرعت کے ساتھ اسلام کے پھیلنے کا ذریعہ بن گیا تھا۔ حقیقت یہ

ہے کہ آپ زمینیں تو تلوار سے فتح کر سکتے ہیں، انسانی قلوب تلوار سے فتح نہیں کیے جا سکتے۔ وہ صرف حسنِ سیرت اور پاکیزگیٔ کردار ہی سے فتح کیے جا سکتے ہیں اور قرنِ اوّل کے مسلمانوں نے، غیر اقوام کے قلوب کو اس طرح فتح کیا تھا۔ امام ابن تیمیہؒ کا یہ قول کس قدر مبنی برحقیقت ہے کہ:۔

> قرونِ اولیٰ کے مسلمانوں نے اسلام کو دوسری قوموں کی طرف منتقل نہیں کیا تھا بلکہ ان قوموں کو اسلام کی طرف منتقل کیا تھا۔

یعنی ان (مسلمانوں) کے حسنِ سیرت و کردار سے متأثر ہو کر یہ قومیں کشاں کشاں اسلام کی طرف چلی آتی تھیں اور

مقوقس کا تأثر

اس کے مظاہر ہمیں، ان سپاہیوں کے نقوشِ پا میں، قدم قدم پر ملتے ہیں۔ جب مقوقس نے اپنے ایلچی، حضرت عمرو بن العاصؓ کے پاس بھیجے، جو مصر میں جوشِ اسلامیہ کے سپہ سالار تھے، تو وہ دو دن تک وہاں رُکے رہے۔ مقوقس کو اندیشہ لاحق ہوا کہ عربوں نے کہیں ان ایلچیوں کو قتل نہ کر دیا ہو۔ جب وہ واپس آئے تو معلوم ہوا کہ حضرت عمرو ابن عاصؓ نے انہیں اس مقصد کے لیے روک لیا تھا کہ وہ مسلمان فوجیوں کا بنظرِ خویش مشاہدہ اور بنگاہِ غائر مطالعہ کر سکیں۔ ان ایلچیوں کے رئیس نے مقوقس سے کہا کہ:۔

> ہم نے ایک ایسی قوم کو دیکھا ہے جس کا ہر فرد، زندگی سے زیادہ موت، اور غرور و نخوت سے زیادہ خاکساری پر جان دیتا ہے۔ ان میں ایک بھی ایسا نہیں جو دنیا سے کوئی بھی غرض یا دلچسپی رکھتا ہو۔ وہ زمین پر بیٹھتے ہیں۔ گھٹنوں پر رکھ کر کھاتے ہیں۔ ان کا امیر گویا انہی میں کا ایک فرد ہے۔ ان میں شریف اور کمینے، آقا اور غلام کا کوئی فرق نہیں۔ ان میں کامل مساوات ہے اور اس کا عملی مظاہرہ نماز کے وقت ہوتا ہے جب سب ایک طرح وضو کرتے اور ساتھ مل کر نہایت خضوع و خشوع سے اپنے رب کے حضور جُھک جاتے ہیں۔

مسلمانوں کے لشکریوں کے یہ اوصاف سن کر مقوقس سوچ میں پڑ گیا۔ اس کے بعد اس نے سر اٹھا کر اپنے ساتھیوں سے کہا کہ ــــ "قسم اس ذات کی جس کی قسم کھائی جا سکتی ہے، یہ لوگ چاہیں تو پہاڑوں کو بھی اپنی جگہ سے ہلا سکتے ہیں۔ ان سے کوئی نہیں لڑ سکتا۔ اگر ہم آج ان سے صلح نہ کر سکے جب انہیں نیل نے گھیر رکھا ہے تو کل جب وہ اس خطرہ سے نکل گئے تو انہیں ہم کسی طرح بھی صلح پر آمادہ نہیں کر سکیں گے۔"

اور تستر (ایران کے گورنر)، ہرمزان نے اس تمام تفصیل کو سمیٹ کر ایک فقرہ میں سمو دیا تھا۔ جب وہ (فتح ایران

کے بعد) گرفتار ہو کر مدینہ آیا ہے۔ (ہیکل نے اس کی آمد کا نقشہ ان الفاظ میں کھینچا ہے) وہ مدینہ کے قریب پہنچا تو اس

ہرمزان کا تبصرہ

نے دیبا کی زرکار پوشاک زیب تن کی، موتیوں اور جواہرات سے مرصّع تاج سر پر رکھا، خالص سونے کا عصائے شاہی جس میں موتی اور یاقوت جڑے ہوتے تھے، ہاتھ میں لئے "مسلمانوں کے بادشاہ" حضرت عمرؓ کی ملاقات کے لئے چلا۔ اس نے خیال کیا کہ حضرت عمرؓ پہرے داروں کی حفاظت میں، رونق افروز ایوانِ شاہی ہوں گے اور ایوان کے دروازے پر حاجب و دربان متعین ہوں گے۔ حضرت انس بن مالکؓ اور احنف بن قیسؓ نے (جو ہرمزان کو ساتھ لاتے تھے) دریافت کیا تو معلوم ہوا کہ حضرت عمرؓ مسجد میں ہیں۔ ہرمزان مسجد میں پہنچا تو دیکھا کہ وہاں کچھ لوگ بیٹھے چپکے چپکے باتیں کر رہے ہیں اور ایک طرف ایک شخص جُبّہ سرہانے رکھے، سو رہا ہے۔ ہرمزان نے اپنے ساتھیوں سے پوچھا کہ "شاہنشاہ عمرؓ کہاں ہیں؟" انہوں نے اس سونے والے شخص کی طرف اشارہ کر کے بتایا کہ وہ ہیں، تو وہ ورطۂ حیرت میں ڈوب گیا۔ وہ اسے باور کرنے کے لئے تیار ہی نہ تھا کہ عرب و عجم کا شاہنشاہ اور یوں فرشِ خاک پر محو استراحت ہو۔ جب اسے یقین دلایا گیا کہ (حضرت) عمرؓ یہی ہیں تو اس نے بے ساختہ کہا کہ "اس شخص کو پیغمبر ہونا چاہیئے اور اگر یہ پیغمبر نہیں تو اس کا عمل ضرور پیغمبروں کا سا ہے۔"

نیند سے بیدار ہونے پر حضرت عمرؓ نے ہرمزان کو دیکھا تو آپ نے اس سے پہلا سوال یہ کیا کہ ہرمزان! یہ بتاؤ کہ اس سے پہلے تم (ایرانی) ہم لوگوں کو کبھی خاطر میں نہیں لایا کرتے تھے اور نفرت و حقارت کی نظروں سے دیکھا کرتے تھے۔ اب کیا ہوا جو تم نے ہم لوگوں کے ہاتھوں اس قدر ذلت آمیز شکست کھائی۔ اس نے جواب دیا ــــ اور یہی وہ اس کا جواب ہے جس تک پہنچنے کے لئے ہم نے یہ ابتدائی گفتگو کی ہے ــــ اس نے کہا کہ "عمرؓ! بات یہ ہے کہ ایامِ جاہلیت میں، ہم اور تم اکیلے اکیلے ایک دوسرے سے نپٹتے تھے اس لئے ہم ہمیشہ تم پر غالب آتے تھے لیکن اب صورت یہ ہے کہ مقابلہ کے وقت، ہم اکیلے ہوتے ہیں، اور تمہارے ساتھ تمہارا خدا ہوتا ہے۔ ہمارے لئے ممکن ہی نہیں کہ تم دونوں کا مقابلہ کر سکیں۔"

ایک ایران ہی نہیں جب تک "خدا ان کے ساتھ رہا" دنیا کا کوئی ملک بھی مسلمانوں کا مقابلہ نہیں کر سکا۔ اور خدا کے ساتھ ہونے کے معنی یہ تھے کہ یہ لوگ (رضی اللہ عنہم و رضوا عنہ) خدا کے متعیّن کردہ نصب العین کی خاطر، باطل کی قوتوں کے ساتھ ٹکراتے تھے اور اس ٹکراؤ میں خدا کے مقرر کردہ قوانین و اقدار کا دامن کبھی ہاتھ سے نہیں چھوڑتے تھے۔ حضرت عمرؓ کی دور رس نگاہوں نے اس خدشہ کو بھانپ لیا تھا کہ قرآنی تعلیم و تربیت نے ان مجاہدین

کی سیرت کو جس قالب میں ڈھال دیا تھا، اگر ان کا اختلاط غیر اسلامی تصورات اور عجمی تہذیب و تمدن کے ساتھ ہو گیا، تو ان میں یہ جوہر باقی نہیں رہیں گے۔ اس لئے انھوں نے ہدایات نافذ کر دی تھیں کہ مسلمان سپاہی، ایرانی شہروں میں نہ بسیں، بلکہ ان کی بستیاں الگ بسائی جائیں جو ان کے لئے چھاؤنیوں کا بھی کام دیں۔ آپ نے کوفہ اور بصرہ کی بنیاد اسی مقصد کے لئے ڈالی تھی۔ جب تک یہ کیفیت باقی رہی، مسلمانوں کی مجاہدانہ روح بدستور تازہ اور شاداب رہی۔ جب ان کا اہلِ عجم کے ساتھ خلاملا شروع ہوا، ان کی زندگی کی حرارت بھی افسردہ ہونی شروع ہو گئی اور آہستہ آہستہ یہ سراپا برق و رعدِ اُمت، راکھ کا ڈھیر بن کر رہ گئی۔ (لیکن یہ داستان الگ ہے جس کی تفصیل آخری باب میں ملے گی۔)

ان حضرات کے دل میں جذبۂ جہاد کس شدت سے موجزن تھا اور انہیں اس کی اہمیت کا کس قدر شدید

جذبۂ بے اختیارِ شوق

اور عمیق احساس تھا، اس کا اندازہ دو ایک واقعات سے لگائیے۔ فتح ایران کے سلسلہ میں، معرکۂ قادسیہ نے اس قدر اہمیت حاصل کر لی تھی کہ ہر شخص اس کے متعلق تازہ ترین خبریں حاصل کرنے کے لئے بے حد مضطرب و مشوش رہتا تھا۔ خود حضرت عمرؓ کی بے قراری کا یہ عالم تھا کہ آپ ہر صبح، اس راستے پر جدھر سے قادسیہ کے پیغامبر آیا کرتے تھے، میلوں باہر نکل جاتے تاکہ کوئی قاصد مل جائے اور وہ اس سے حالات معلوم کر سکیں۔ اس طرح وہ ہر صبح باہر نکل جاتے اور دوپہر کو واپس تشریف لاتے۔ ایک دن وہ اسی طرح اس راستے پر جا رہے تھے کہ ایک سانڈنی سوار آتا دکھائی دیا۔ پوچھنے پر معلوم ہوا کہ وہ قادسیہ سے آ رہا ہے۔ آپ نے اس سے، یہ بتاتے بغیر کہ آپ کون ہیں، کہا کہ وہاں کی کوئی خبر ہو تو سناؤ۔ اس نے وہاں کے حالات سنانے شروع کئے تو حضرت عمرؓ نے اس کے ساتھ ساتھ دوڑنا شروع کر دیا۔ وہ وہاں کی فتح کی خوشخبریاں سنا رہا تھا، اور حضرت عمرؓ فرطِ مسرت سے رقصاں و جنباں، اس کے ساتھ بھاگتے چلے جا رہے تھے، بھاگتے چلے جا رہے تھے اور زبانِ حال سے کہتے جا رہے تھے کہ

کہے جا پیام قاصد، یونہی جانِ ناتواں سے
کہ ہوا بدل چلی ہے تری جنبشِ زباں سے

کہ اتنے میں وہ مدینہ کے قریب آ گئے اور لوگوں نے حضرت عمرؓ کو امیر المومنین کہہ کر سلام کہنا شروع کیا۔ جب اس طرح اس سوار کو معلوم ہوا کہ اس کے ساتھ کون دوڑے چلا آیا ہے تو اس نے انتہائی استعجاب کے عالم میں کہا کہ یا امیر المومنین! یہ آپ نے کیا کیا؟ آپ نے مجھ سے اپنا تعارف کیوں نہ کرا دیا! آپ نے نہایت سادگی سے کہا کہ اگر میں اپنا تعارف

کرا دیتا تو جس بے تکلفی سے تم نے باتیں کی ہیں، ویسے نہ کر سکتے۔ اس پر اس نے حضرت سعد بن ابی وقاصؓ کا وہ خط آپ کی خدمت میں پیش کیا جس میں نوید ظفر مرقوم تھی۔

جہاد کے ساتھ آپ کی قلبی وابستگی اور والہانہ شیفتگی کا یہی ثبوت نہیں کہ آپ مجاہدین کے حالات معلوم کرنے کے لئے مدینہ سے اتنی دور تک باہر چلے جاتے تھے۔ ان کے جذب و انہماک کی کیفیت اس سے بھی بڑھ کر تھی بعض

نماز میں بھی یہی خیال مرکزِ توجہ رہتا تھا

روایات میں آیا ہے کہ آپ بعض اوقات نماز میں بھی مجاہدین کی صف بندی کے متعلق سوچا کرتے تھے۔ اگر یہ روایات صحیح ہیں تو اس کے معنی یہ ہیں کہ اس بات کا ذکر، کہ آپ نماز میں بھی مجاہدین کی بابت سوچتے رہتے تھے، حضرت عمرؓ نے خود ہی دوسروں سے کیا ہوگا کیونکہ جب تک سوچنے والا خود ہی کسی دوسرے سے ذکر نہ کرے، کسی شخص کو معلوم نہیں ہو سکتا کہ فلاں شخص کیا سوچتا ہے اور اگر اس کا ذکر حضرت عمرؓ نے خود کیا تھا تو ہمارے نزدیک اس میں بھی ان کی بلندیٔ کردار کی جھلک موجود ہے۔ ہمارے ہاں یہ خیال عام ہے کہ "اللہ والوں" کی کیفیت یہ ہوتی ہے کہ بحالتِ نماز، دنیا تو ایک طرف، انہیں خود اپنے آپ کی بھی کچھ خبر نہیں رہتی۔ اس وقت وہ کسی اور دنیا میں پہنچے ہوتے ہوتے ہیں۔ نماز میں جذب و محویت بجا اور درست، لیکن اس کے یہ معنی نہیں کہ اس وقت انسان کو دنیا یا خود اپنی ذات کا بھی احساس نہیں رہتا۔ نماز میں ہم خدا سے دعائیں مانگتے ہیں۔ اس کے حضور اپنی آرزوئیں پیش کرتے ہیں اور ظاہر ہے کہ ان دعاؤں میں دنیا یا اپنی ذات سے قطعِ تعلق نہیں ہوجاتا۔ ہم، انفرادی یا اجتماعی طور پر خود اپنے لئے کچھ مانگتے ہیں، اس لئے اس میں خود فراموشی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا اور جو کچھ ہم مانگتے ہیں۔ اس میں دنیا بھی ہوتی ہے اور آخرت بھی۔ جب ہم کہتے ہیں — رَبَّنَآ اٰتِنَا فِی الدُّنْيَا حَسَنَةً وَّ فِی الْاٰخِرَةِ حَسَنَةً۔ (۲/۲۰۱)

"اے ہمارے نشوونما دینے والے! ہمیں دنیا میں بھی خوشگواریاں عطا فرما اور آخرت میں بھی خوشگواریاں"۔

تو اس میں نَا (ہم) کا احساس ہمارے سامنے ہوتا ہے اور دنیا اور اس کی خوشگواریوں کا احساس بھی۔ یہ احساسات مٹ جائیں تو "رَبَّنَآ اٰتِنَا فِی الدُّنْيَا حَسَنَةً" کا کچھ مفہوم نہیں رہتا۔ اسی طرح جب ہم کہتے ہیں کہ اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ (۱/۶-۵) تو اس میں "ہم" کا احساس سب سے پہلے موجود ہوتا ہے۔ اس کے بعد ان اقوام کا تصور نگاہوں کے سامنے جن پر انعاماتِ خداوندی کے سحابِ کرم کی بارشیں ہوئیں اور اس کے ساتھ ان انعامات کی تفصیل بھی۔ آپ سوچئے کہ ان دعاؤں میں اپنی ذات کی فراموشی اور دنیاوی معاملات سے قطعِ تعلق کا سوال پیدا نہیں ہوتا۔

اس سے ایک قدم اور بھی آگے بڑھیئے۔ حضورؐ نبیٔ اکرمؐ سے زیادہ نماز میں محویت کی کیفیت اور کس پر طاری ہو سکتی تھی۔ بایں ہمہ، حضورؐ کے متعلق، کتبِ احادیث میں ہمیں اس قسم کی روایات ملتی ہیں۔ مثلاً بخاری کتاب الصلوٰۃ میں ہے:۔

رسول اللہ بحالتِ نماز

(۱) حضرت عائشہؓ سے روایت ہے کہ نبیٔ اکرمؐ نے ایک ایسی خمیصہ میں نماز پڑھی جس میں نقش تھے تو آپؐ کی نظر ان نقوش پر پڑی۔ جب آپؐ فارغ ہوئے تو فرمایا کہ میری اس خمیصہ کو ابوجہم کے پاس لے جاؤ اور مجھے ابوجہم کی انبجانیہ لادو کیونکہ اس خمیصہ نے ابھی مجھے میری نماز سے غافل کر دیا۔

(انبجانیہ ایک قسم کی چادر کو کہتے ہیں۔)

(۲) انسؓ کہتے ہیں کہ حضرت عائشہؓ کے پاس ایک پردہ تھا کہ اسے انہوں نے اپنے گھر کے ایک گوشے میں ڈالا تھا، تو نبی اکرمؐ نے فرمایا کہ ہمارے پاس سے یہ اپنا پردہ ہٹادو، اس لئے کہ اس کی تصویریں برابر میرے سامنے آرہی ہیں۔

ایک اور روایت میں ہے کہ حضورؐ نے فرمایا کہ

(۳) میں نماز میں کھڑا ہوتا ہوں تو چاہتا ہوں کہ میں اس میں طول دوں لیکن بچے کے رونے کی آواز سن کر میں اپنی نماز میں اختصار کر دیتا ہوں، اس بات کو برا سمجھ کر کہ میں اس کی ماں کی تکلیف کا باعث ہو جاؤں گا۔

بحالتِ نماز دل میں خیالات گزرنے کے سلسلہ میں۔

(۴) حضرت عقبہؓ بن حارث کہتے ہیں کہ میں نے ایک مرتبہ رسول اللہ کے ساتھ عصر کی نماز پڑھی۔ جب آپؐ نے سلام پھیرا تو بہت جلد کھڑے ہو گئے اور اپنی بعض بی بیوں کے پاس تشریف لے گئے اور تھوڑی دیر کے بعد باہر آئے اور آپؐ نے لوگوں کے چہروں میں اپنے جلد تشریف لے جانے کے سبب سے تعجب کے آثار دیکھے تو فرمایا کہ مجھے نماز میں ایک (سونے کا) ٹکڑا جو ہمارے ہاں تھا یاد آگیا تو میں نے برا سمجھا کہ وہ شام کو یا شب بھر ہمارے ہاں رہے۔ لہٰذا میں نے اسکے تقسیم کرنے کا حکم دے دیا۔[1]

---

[1] اس حدیث پر ذرا وہ لوگ غور فرمائیں جو بڑے دھڑلے سے کہتے ہیں کہ "اسلام میں بے حد و نہایت" دولت جمع کرنے کی اجازت ہے۔ تفصیل ان امور کی متعلقہ باب (معاشی نظام) میں ملے گی۔

(۵) حضرت ابو قتادہؓ فرماتے ہیں کہ میں نے نبی اکرمؐ کو اس حال میں دیکھا کہ آپ نماز پڑھ رہے ہیں اور ابو عاصؓ کی بیٹی امامہ (یعنی حضورؐ کی نواسی) آپؐ کے کاندھے پر ہے۔ آپؐ رکوع میں جاتے تو بچی کو نیچے اتار دیتے اور سجدے سے فارغ ہو کر اسے پھر مونڈھے پر بٹھا لیتے۔ (صحیحین)

(۶) حضرت عائشہؓ کا بیان ہے کہ آپ گھر میں نماز پڑھتے تو دروازہ بند کر لیتے۔ میں باہر سے آتی تو آپؐ دروازہ کھول دیتے اور پھر بدستور نماز میں مشغول ہو جاتے۔ (احمد و داؤد، بحوالہ مشکوٰۃ)

(۷) حضرت بلالؓ کا بیان ہے کہ حضورؐ نماز میں مشغول ہوتے، ہم لوگ سلام کرتے تو آپؐ ہاتھ کے اشارے سے سلام کا جواب دے دیتے۔ (ترمذی۔ بحوالہ مشکوٰۃ)

ان روایات سے بھی واضح ہے کہ بحالتِ نماز اس قسم جذب و انہماک کا تصور، جس میں انسان دنیا و مافیہا سے بے خبر ہو جاتے، حضورؐ کے زمانے میں بھی نہیں تھا۔

اصل یہ ہے کہ اس قسم کے تصورات کہ "اللہ والے" بحالتِ نماز دنیا و مافیہا حتیٰ کہ خود اپنی ذات تک سے بے خبر ہوتے ہیں اور وہ خالصتہً خدا سے لَو لگاتے ہوتے ہیں' اس دَور میں پیدا ہوئے جب مسلکِ خانقاہیت (روحانیت یا تصوف) مسلمانوں میں در آیا[1]۔ اس مسلک کی بنیاد اس نظریہ پر ہے کہ روحانیت اور مادیت ایک دوسرے کی ضد ہیں۔ دنیا اور اس کی جاذبیتیں مادہ کی مظاہر ہیں اس لئے اس قابل کہ ان سے دور بھاگا جائے، ان سے نفرت کی جائے۔ جس قدر کوئی شخص دنیاوی آلائشوں سے قطع تعلق کرے گا اتنا ہی "روحانیت" میں آگے بڑھتا جائے گا اور نماز کا تعلّق چونکہ خالصتہً "عالمِ روحانیت" سے ہے اس لئے اس میں دنیاوی خیالات قطعاً دل میں نہیں آنے چاہئیں۔ یہ وجہ ہے جو "اللہ والوں" کی خصوصیت یہ بتائی جاتی ہے کہ نماز کی محویت میں وہ دنیا و مافیہا سے قطعاً بے خبر ہو جاتے ہیں اور اس قسم کے خیالات ان کے دل و دماغ کے قریب تک آنے نہیں پاتے ان (عام) اعتقادات و تصورات کے پیشِ نظر کوئی شخص جو "اللہ والا" ہونے کا مدعی ہو وہ کسی سے کبھی یہ نہیں کہے گا کہ وہ نماز کی حالت میں دنیاوی معاملات کے متعلق سوچتا ہے۔ لہٰذا، اگر حضرت عمرؓ نے ایسا کہا، اور آپ کے رفقاء نے اسے قابلِ قدر جذبہ سمجھا (جبھی تو اسے حضرت عمرؓ کے محاسن کے طور پر روایت کیا) تو اس سے واضح ہے کہ اس دَور میں "اللہ والے ہونے" کا معیار وہ نہیں تھا جو بعد میں پیدا ہوا۔ وہ حضرات دین کی حقیقت سے باخبر تھے۔ ان کے نزدیک دین نام تھا باطل قوتوں پر غلبہ پا کر، حق کی اقدار کے مطابق نظام قائم کرنا اور ایسا کرنے والے ہی ان کے

---

[1] اس کے متعلق گفتگو آخری باب میں کی جائے گی۔

نزدیک "اللہ والے" تھے۔ بنابریں، اگر حضرت عمرؓ بحالتِ نماز میدانِ جہاد کے متعلق سوچا کرتے تھے، تو اس سے ظاہر ہے کہ باطل کو مغلوب اور حق کو غالب کرنے کا خیال کس شدت سے ان کے دل و دماغ پر مستولی رہتا تھا اور یہی سچے "اللہ والوں" کی نشانی ہے۔

جہاد، اور اس میں مقتولین فی سبیل اللہ کی عظمت کا تصور ان حضرات کے دلوں میں کس قسم کا انقلاب پیدا

بھائی کا مرثیہ

کر دیتا تھا، اس کا اندازہ ایک ایسے واقعہ سے لگایئے جس کا تعلق بھی حضرت عمرؓ کے جذبات سے تھا۔ حضرت عمرؓ کے ایک بھائی زیدؓ شہید ہو گئے تھے۔ ان سے انہیں (حضرت عمرؓ کو) بڑی محبت تھی۔ اس لئے ان کی جدائی ان پر بڑی شاق گذری۔ وہ اکثر بھائی کی یاد میں غم آلود اور افسردہ خاطر رہتے تھے۔

ایک شخص مالک بن نویرہ، ان میں سے تھا جنہوں نے عہدِ صدیقیؓ میں مملکت کے خلاف بغاوت کی تھی۔ وہ گرفتار ہوا اور حضرت خالد بن ولیدؓ نے (جو باغیوں کے خلاف مہم کے کمانڈر تھے) اسے قتل کر دیا۔ (تفصیل اس کی حضرت خالدؓ سے متعلق باب میں آئے گی) مالک کا ایک بھائی تھا ــــ متمم بن نویرہ۔ وہ شاعر تھا۔ اس نے اپنے بھائی کے قتل پر ایسے جگر پاش اور جانگداز مرثیے کہے جس سے دلوں کی دنیا دہل گئی۔ عرب میں اس کے مرثیوں کا عام چرچا تھا۔ ایک دن وہ اتفاق سے حضرت عمرؓ کے سامنے آگیا تو آپ نے اس سے کہا کہ مجھے بھی اپنا کوئی مرثیہ سناؤ کیونکہ تمہارا اور میرا غم ایک ہی جیسا ہے۔ اس نے مرثیہ سنایا تو آپ نے کہا کہ ہاں! اسے کہتے ہیں نوحہ۔ اللہ ابن خطاب کو اپنی قسمت کے سامنے میں جگہ دے۔ اگر میں شاعر ہوتا تو اس کے غم میں اسی قسم کے مرثیے کہتا۔

متمم بولا: امیر المومنینؓ! یہ آپ نے کیا کہا۔ اگر میرے بھائی کو وہ موت نصیب ہو جاتی جو آپ کے بھائی کے حصے میں آئی ہے (یعنی شہادت) تو میں اس کے غم میں ایک آنسو بھی نہ بہاتا۔

آپ نے کہا۔ نویرہ! اس قسم کی تعزیت اس سے پہلے مجھ سے کسی نے نہیں کی۔ اس سے مجھے سکونِ قلب حاصل ہو گیا۔

یہ تھا ان لوگوں کے نزدیک شہادت کا مرتبہ۔۔۔!

اس میں شبہ نہیں کہ ان حضرات کے دلوں میں شوقِ شہادت میں جان دے دینے کا جذبہ بیش بیش تھا اور یہی وہ

جذبہ تھا جس سے سرشار ہو کر ان مجاہدین نے وہ کچھ کر کے دکھایا جسے دوبارہ دیکھنے کے لئے آسمان کی آنکھ آج تک ترستی ہے لیکن اس سلسلہ میں، ذمہ دارارباب بست و کشاد نے جو فضا پیدا کر دی تھی اس میں اس کا بھی بڑا دخل تھا۔ (مثلاً) نسبی افتخار عربوں کی گھٹی میں پڑا تھا۔ اپنے اپنے قبیلہ کی طرف نسبت، ان کے لئے دنیا جہان کی عزت و عظمت سے زیادہ وسیع تھی۔ اس کا نتیجہ یہ تھا کہ جن قبائل کو گھٹیا تصور کیا جاتا تھا ان کے افراد، اپنے آپ کو معاشرہ میں ایسا ہی سمجھتے تھے جیسے ہندوؤں کے ہاں شودر اور جب خود عربوں کے بعض اپنے قبائل کے افراد کا یہ عالم تھا، تو ان کے معاشرہ میں بیچارے غلاموں کی جو ذہنی اور نفسیاتی کیفیت ہو سکتی تھی وہ ظاہر ہے، خواہ وہ غلام آزاد کردہ ہی کیوں نہ ہو۔

مساوات کا ماحول

لیکن اسلام نے یہ ذہنیت ہی بدل ڈالی۔ اس نے حسب و نسب کے تمام امتیازات مٹا کر اِنَّ اَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ اَتْقٰكُمْ۔ (۴۹/۱۳) کو معیارِ فضیلت و تکریم قرار دے دیا۔ اسی سے ایسی مساواتِ انسانیہ کی جنت وجود میں آگئی جس میں ـــــ نہ کوئی بندہ رہا اور نہ کوئی بندہ نواز ـــــ آپ ذرا اس واقعہ پر غور کیجئے کہ نبی اکرمؐ نے اپنی حیاتِ ارضی کے آخری سانس میں، رومیوں کے خلاف جس لشکرِ عظیم کو تیار کیا اس کی سپہ سالاری کے لئے (عام الفاظ میں) ایک غلام (حضرت زیدؓ) کے بیٹے (حضرت اسامہؓ) کو منتخب فرمایا۔ یعنی ایک غلام ابن غلام سپہ سالار اور اس کی ماتحتی میں عرب کے بلند ترین قبائل کے نامور سردار، سپاہی۔

جہاں تک قبائلی اور خاندانی نسبتوں کے تصور کو مٹانے کا تعلق تھا، حضرت عمرؓ اس باب میں اس قدر محتاط تھے کہ ایک دفعہ آپ تک یہ اطلاع پہنچی کہ فوج میں دو سپاہیوں میں کوئی جھگڑا ہو گیا تو ان میں سے ایک نے اپنے قبیلہ کا نام لے کر انہیں اپنی مدد کے لئے پکارا۔ اس پر آپ سخت برافروختہ ہوئے۔ اس لئے کہ اس سے، نہ صرف یہ کہ سینوں میں کمتری اور برتری کے جذبات بیدار ہو جاتے ہیں بلکہ رنگ اور خون کے امتیاز سے اخوتِ اسلامیہ کی جڑ کٹ جاتی ہے جس پر امت کی تشکیل کا مدار ہے۔ اسلام میں نسبت صرف ایک ہی باقی رہ جاتی ہے اور وہ ہے دین کی نسبت ایمان کی نسبت (دورِ حاضر کی اصطلاح میں آئیڈیالوجی کی نسبت)۔ اگر مسلمان کہلانے کے بعد بھی رنگ، نسل، خون، وطن کے امتیازات باقی رہ جاتے ہیں، تو سمجھ لیجئے کہ اسلام کا یہ دعوے صرف زبان اور الفاظ تک محدود ہے۔ (قرآن کے الفاظ میں) "ایمان دل کی گہرائیوں میں نہیں اترا۔" (۴۹/۱۴) یہ وجہ تھی کہ اس خبر کے ملنے پر حضرت عمرؓ اس قدر برافروختہ ہوئے کیونکہ یہ اسلام لانے کے بعد پھر جاہلیت (حالتِ کفر) کی طرف پلٹ جانے کی غماز تھی چنانچہ

آپ نے فوراً مدار النظام، حضرت سعد بن ابی وقاصؓ کو ایک تفصیلی مراسلہ بھیجا۔ اس میں مرکزی واقعہ تو مدد کے لئے" قبیلے کو پکارنا" تھا لیکن ضمناً مزید ایسی ہدایات بھی آگئی تھیں جن کا ذکر کئے بغیر آگے بڑھ جانے کو جی نہیں چاہتا۔ اس میں آپ نے لکھا:-

> جب بھی کبھی دو ایسے معاملات سامنے آئیں جن میں ایک "اللہ کے لئے" ہو اور دوسرا دنیا (کے طبیعی مفاد) کے لئے، تو دنیا سے متعلق حصہ پر اللہ سے متعلق حصہ کو ترجیح دو (یعنی دنیاوی مفاد کو ہمیشہ مستقل اقدارِ خداوندی کے تابع رکھو) اگر کبھی قبائلی تنازعہ ابھرے اور کوئی شخص "یاآلِ فلاں" کہہ کر آواز دے تو سمجھ لو کہ یہ شیطان کی آواز ہے۔ ایسا کہنے والوں کی تلوار سے خبر لو، تاآنکہ وہ اللہ اور اپنے امام کی طرف رجوع کرلیں۔ مجھے یہ اطلاع پہنچی ہے کہ قبیلہ ضبّہ کے بعض افراد نے "یاآلِ ضبّہ" کہہ کر پکارا ہے۔ (اگر یہ سچ ہے تو) میرا مراسلہ پہنچتے ہی انہیں سخت سزا دو تاکہ وہ آئندہ کبھی ایسی حرکت نہ کریں۔
>
> جہاں تک تمہاری ذات کا تعلق ہے تم سب کے لئے اپنے دروازے یکساں طور پر کھلے رکھو۔ ان کے کام خود سرانجام دو۔ مریضوں کی عیادت کرو۔ ان کے جنازوں میں شرکت کرو کیونکہ تم انہی میں کے ایک فرد ہو، اس فرق کے ساتھ کہ اللہ نے تم پر بہت بڑی ذمہ داری ڈال دی ہے۔ مجھے معلوم ہوا ہے کہ تم اور تمہارے گھر والے ایسا کپڑا پہنتے، ایسا کھانا کھاتے اور ایسی سواریاں رکھتے ہیں جو عام مسلمانوں کو میسر نہیں۔ خدا کے بندے! بچ، کہیں تیرا حال اس جانور کا سا نہ ہو جائے جس کا گزر ایک شاداب وادی پر ہوا تو سوائے پرخوری اور فربہی کے اس کے سامنے کوئی مقصد ہی نہ رہا، حالانکہ وہی پرخوری اور فربہی اس کی ہلاکت کا موجب تھی۔ اچھی طرح یاد رکھو کہ حاکم کو خدا کے سامنے پیش ہونا ہے۔ جب حاکم بگڑتا ہے تو رعایا بھی بگڑ جاتی ہے۔ سب سے بدبخت وہ انسان ہے جس کی وجہ سے اس کی رعیت بدبخت ہو جائے۔

یہ تھا حضرت عمرؓ کی احتیاط کا عالم، اور اس قسم کی تھیں ان کی ہدایات جو وہ ذمہ دار اربابِ مملکت، اور سپہ سالارانِ جیوش و عساکر کو بھیجتے رہتے تھے۔

(۰۰۰)

میدانِ جنگ میں آپ اس قسم کی ہدایات بھیجتے رہتے۔ جہاں تک، مجاہدین کے بال بچوں کا تعلق تھا، حضرت

عمرؓ نے اعلان کر رکھا تھا کہ سپاہیوں کی عدم موجودگی میں "اُن کے بچوں کا باپ عمرؓ ہے۔" چنانچہ آپ خود ان سپاہیوں کے گھروں پر جا کر دریافت فرماتے کہ ان کے بال بچوں کو کسی قسم کی تکلیف تو نہیں۔ جن گھروں میں مرد نہ ہوتے "ان کا سودا سلف خود خرید کر لا دیتے۔ ان کے مویشیوں کو چارہ ڈالتے۔ ان کا دودھ تک دوہ دیتے۔ خط آتے تو خود جا کر انہیں پڑھ کر سُناتے اور وہیں زمین پر بیٹھ کر، ان کے اہل خانہ کی طرف سے جوابی خطوط لکھتے۔ خطرہ کے وقت راتوں کو ان کے گھروں کا پہرہ دیتے۔ چپکے سے ان کے حالات معلوم کرتے، اور انہیں جس قسم کی مدد کی ضرورت ہوتی، بہم پہنچاتے۔ (تفصیل ان امور کی آگے چل کر سامنے آئے گی)ایک رات پاسبانی کے دوران سُنا کہ ایک عورت اپنے گھر کے اندر، کچھ اشعار گنگنا رہی ہے جن میں ہجر کی راتوں کا ذکر تھا۔ دریافت کرنے پر معلوم ہؤا کہ اس کا شوہر میدانِ جہاد میں گیا ہؤا ہے اور ایک عرصہ ہؤا، لوٹا نہیں۔ آپ نے عام حکم جاری کر دیا کہ سپاہیوں کو اس انداز سے رخصت دی جائے کہ وہ ایک معقول وقفہ کے بعد گھروں سے ہو آیا کریں۔

==(٥)(٥)==

شکستِ خوردہ فوج کی حوصلہ افزائی

مجاہدین کو عام طور پر ہر میدان میں فتح و کامرانی نصیب ہوتی تھی، لیکن جنگ، پھر جنگ ہے۔ اس میں فتح کے ساتھ شکست کے امکانات بھی ہوتے ہیں۔ خود حضور نبئ اکرمؐ کے عہدِ ہمایوں میں بھی جیوشِ اسلامیہ کو شکستیں ہوئیں، اگرچہ وہ شکستیں عارضی تھیں اور ان کے دوبارہ سنبھل جانے پر مبدّل بہ فتح و ظفر ہو گئیں۔ اسی طرح عہدِ فاروقی میں بھی بعض محاذوں پر عساکرِ اسلامیہ کو شکستیں ہوئیں۔ ان میں (ایران پر حملہ کے سلسلہ میں) جسر کی شکست بڑی ہمت شکن تھی۔ جب یہ شکست خوردہ سپاہی مدینہ آئے تو یہ خود مارے شرم کے سر اٹھا کر نہیں چلتے تھے اور ان کے اعزہ و اقارب انہیں سخت ملامت کرتے تھے۔ حضرت عمرؓ کو معلوم ہؤا تو آپ نے ان ملامت کرنے والوں کو سختی سے ڈانٹا اور ان سپاہیوں کی ایسی ہمت افزائی کی کہ وہ تازہ دم ہو کر، ہر مقابلہ کے لئے تیار ہو گئے۔ حضرت عمرؓ کا اس قسم کا حقیقت پسندانہ رویّہ اور مجاہدین کے ساتھ شفقت و رأفت کا سلوک تھا جس نے ان کے سینوں میں سکون و اطمینان کی جنتیں آباد کر دی تھیں ـــــ اور یہی تھا وہ سکون و اطمینان جس کی وجہ سے ان میں کا ایک ایک، دس دس کا مقابلہ کیا کرتا تھا ـــــ!

جب سپاہی کی اس طرح حوصلہ افزائی ہوتی رہے، شہادت کے متعلق اس کا ایمان ہو کہ اس سے وہ

سیدھا جنّت میں چلا جائے گا اور اس بات کا اسے کامل یقین ہو کہ اس کے بعد، اس کے بال بچے، لاوارث نہیں رہ جائیں گے بلکہ ان کی نگہ پرداخت اس سے بھی بہتر ہو گی جیسی اس کی زندگی میں ہو سکتی تھی، تو اس سپاہی کی بے جگری کا مقابلہ دنیا کی کون سی طاقت کر سکتی ہے؟

اور یہی تھی ان کی وہ بے جگری جس سے دیکھتے ہی دیکھتے آدھی دنیا ان کے زیرِ نگیں آ گئی تھی۔ آیئے ہم دیکھیں کہ یہ کیسے ہوا تھا۔

چھٹا باب

علم ہے فقط مومنِ جانباز کی میراث

ہر کہ خنجر بہرِ غیر اللہ کشید
تیغِ اُو در سینۂ اُو آرمید

یورپ کے مستشرقین اعتراض کیا کرتے ہیں کہ جب تک رسول اللہؐ مکہ میں رہے، چونکہ وہاں آپ کے پاس قوت نہیں تھی، اس لئے آپؐ نے ایک مذہبی پیشوا کی حیثیت سے زندگی گزاری اور اس کے بعد، جب مدینہ میں قوت حاصل ہوگئی تو آپؐ نے حکومت قائم کرلی اور خود اس مملکت کے فرمانروا بن گئے۔ ہمارے ہاں سے جن لوگوں نے اس اعتراض کا جواب دینے کی کوشش کی، انہوں نے بڑی معذورانہ (APPOLOGETIC) روش اختیار کی جس سے مترشح ہوتا تھا کہ ان کا خیال بھی یہ ہے کہ اگر رسول اللہؐ ایسا نہ کرتے (یعنی مملکت قائم نہ کرتے بلکہ مذہبی پیشوا کی زندگی بسر کرتے رہتے) تو زیادہ اچھا ہوتا لیکن چونکہ آپؐ نے مملکت قائم کرلی اس لئے ہمیں اس کے جواز میں کچھ نہ کچھ کہنا ہی چاہیئے۔

جہاں تک معترضین کا تعلق ہے ان میں سے جنہوں نے نیک نیتی سے اعتراض کیا ہے اس کی وجہ ان کی حقیقت سے بے خبری اور دین سے لاعلمی ہے اور یہی کیفیت ان کی ہے جنہوں نے اس کے جواب میں معذرانہ انداز اختیار کیا ہے۔ ان دونوں گروہوں نے اسلام کو ایک مذہب سمجھا ہے، دین نہیں سمجھا۔ دین اور مذہب

عیسائیت کی تعلیم

میں کیا فرق ہے، اس کے متعلق تیسرے باب (خلافت) میں وضاحت سے لکھا جا چکا ہے۔ عیسائیوں کے سامنے دین کا تصور آہی نہیں سکتا۔ وہ صرف مذہب کو

سمجھ سکتے ہیں اناجیل میں، حضرت عیسیٰؑ کی زندگی کا جو نقشہ پیش کیا گیا ہے، وہ ایک گلیم پوش درویش اور بے نوا فقیر کی سی زندگی ہے۔ یہودیوں نے انہیں پکڑ کر صلیب پر چڑھا دیا جہاں انہوں نے (معاذ اللہ) کس پرسی کے عالم میں جان دے دی۔ "کس مپرسی" اس لئے کہ ان کے کل بارہ شاگرد تھے جن میں سے ایک نے غداری کی اور چند سکوں کے عوض انہیں گرفتار کرا دیا، اور باقی گیارہ کے گیارہ انہیں تنہا چھوڑ کر بھاگ گئے۔ یہ ہے (عیسائیت کی رُو سے) زندگی حضرت عیسیٰؑ کی۔ باقی رہی وہ تعلیم جو اناجیل میں پیش کی گئی ہے، سو اس کی حیثیت وعظ کی سی ہے، بطورِ ضابطۂ حیات ان میں کچھ نہیں۔ ان میں صرف ایک قانون ملتا ہے، اور وہ یہ کہ بیوی کو، بجز ارتکابِ زنا، کسی حالت میں طلاق نہیں دی جا سکتی۔ یہی نہیں کہ ان میں دنیاوی امور کے متعلق کوئی ضابطہ یا قانون نہیں ملتا، ترکِ علائق اور ترکِ دنیا، ان کی تعلیم کا مابہ الامتیاز ہے۔ ان کے ولیوں (SAINTS) نے جس انداز سے خانقاہیت کی زندگی بسر کی، تاریخ کا ہر طالبعلم اس سے واقف ہے۔ ان حالات میں، کسی عیسائی کے حیطۂ تصور میں بھی نہیں آسکتا کہ کسی مذہب کے بانی کو مملکت (STATE) سے کوئی واسطہ ہو سکتا ہے۔ جب روما کے شاہنشاہ قسطنطین نے عیسائیت اختیار کی تو ایک عیسائی مملکت وجود میں آئی لیکن وہ مملکت عیسائیوں کی تھی، عیسائیت کی نہیں تھی۔ چرچ (کلیسا) نے اپنا اقتدار بڑھایا تو مملکت میں تھیاکریسی قائم ہو گئی۔ لوتھر نے قوم کو کلیسا کے استبداد سے نجات دلائی، تو مملکت سیکولر ہو گئی جس میں مذہب اور سیاست ایک دوسرے سے الگ ہو گئے۔ لہٰذا سیکولر اسٹیٹ کے تصور کے حاملین کے ذہن میں بھی نہیں آسکتا کہ مملکت کا قیام مذہب کا تقاضا ہو سکتا ہے۔ یہ ہے وہ ذہنی پس منظر جس کی رُو سے یورپ کے (نیک نیت) مستشرق بھی یہ اعتراض کر دیتے ہیں کہ رسول اللہ کی زندگی کا حقیقی اور بنیادی مقصد تو مذہب کی نشر و اشاعت تھا۔ مملکت کا قیام، بعد کا خیال تھا جو مدنی زندگی کی بعض اتفاقی وجوہات کی بنا پر پیدا ہو گیا۔ اسے رسول اللہ کے حقیقی مشن سے کوئی واسطہ نہیں تھا بلکہ یہ چیز اس مشن کی نقیض تھی۔

مسلمانوں کا تصوّرِ مملکت

بد قسمتی سے خود مسلمانوں میں بھی صدیوں سے، اسلام کا تصور ایک مذہب کا سا چلا آ رہا ہے، اور مملکت کا تصور سیکولر، جو اسلام کو مذہب تصور کرنے کا فطری نتیجہ ہے۔ ان کے تصورِ مملکت کی رُو سے، پرسنل (شخصی) اور پبلک (ملکی) قوانین الگ الگ ہیں۔ شخصی قوانین علماء کی تحویل میں رہتے ہیں۔ اس اعتبار سے، مسلمانوں کی اجتماعی زندگی کا یہ گوشہ تھیاکریسی کا حامل ہوتا ہے اور امورِ مملکت حکومت کی تحویل میں، جن میں مذہب دخل نہیں دے سکتا۔ اس نہج سے مملکت ان کے ہاں بھی سیکولر قرار پا جاتی ہے۔ یہ وجہ ہے جو ہمارے ہاں کے جواب دینے والے معتدلانہ روش

اختیار کرتے ہیں۔ اگر اسلام بہ حیثیتِ دین کسی کے سامنے ہو، تو پھر نہ تو حضورؐ کے خلاف (نیک نیتی ہی سے سہی) یہ اعتراض وارد ہو سکتا ہے کہ آپؐ نے مدنی زندگی میں مملکت کیوں قائم فرمائی، اور نہ اس اعتراض کے جواب میں ہمیں کسی قسم کی جھجک محسوس کرنے کی ضرورت لاحق ہو سکتی ہے۔ دینؔ نام ہے اس نظامِ زندگی کا جس میں احکام

دین اور سیاست

خداوندی، بہ حیثیتِ قوانین نافذ ہوں اور ظاہر ہے کہ ایسا اسی صورت میں، اور اسی وقت، ممکن ہے جب دینؔ کے مدعیوں کی اپنی آزاد مملکت ہو۔ مذہب پر ہر مملکت میں عمل کیا جا سکتا ہے لیکن اسلام پر صرف اسی صورت میں عمل پیرا ہوا جا سکتا ہے جب اپنی آزاد مملکت ہو اور اس میں حکمرانی احکام و اقتدارِ خداوندی کی ہو۔ قرآنِ کریم نے واضح الفاظ میں کہہ دیا ہے کہ اَلَّذِيْنَ اِنْ مَّكَّنّٰهُمْ فِي الْاَرْضِ اَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتَوُا الزَّكٰوةَ وَاَمَرُوْا بِالْمَعْرُوْفِ وَنَهَوْا عَنِ الْمُنْكَرِ وَلِلّٰهِ عَاقِبَةُ الْاُمُوْرِ۔ (۲۲/۴۱) یہ جو ایک نئی اُمت وجود کوشش ہو رہی ہے، انہیں جب ملک میں تمکّن حاصل ہوگا، تو یہ اقامتِ صلوٰۃ اور ایتائے زکوٰۃ کا فریضہ سرانجام دیں گے، امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کریں گے۔ یعنی جن امور کو خدا نے پسندیدہ قرار دیا ہے، انہیں حکماً نافذ کریں گے اور جنہیں اس نے ناپسندیدہ کہا ہے انہیں قانوناً ممنوع قرار دیں گے۔ غرضیکہ ان کے تمام امور آخرالامر خدا کی طرف لوٹیں گے۔ یعنی ان کا ہر فیصلہ قوانینِ خداوندی کی رُو سے ہوگا۔" آپ دیکھئے۔ اس آیۂ جلیلہ میں اقامتِ صلوٰۃ اور ایتائے زکوٰۃ، امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے لئے "تمکّن فی الارض" کو شرط قرار دیا گیا ہے اور تمکّن فی الارض کے معنی ہیں اپنی آزاد، خود مختار مملکت۔ اسی کو "استخلاف فی الارض" کہا جاتا ہے، اور قرآنِ کریم نے واضح الفاظ میں بتا دیا ہے کہ، استخلاف فی الارض، ایمان اور اعمالِ صالحہ کا لازمی اور فطری نتیجہ ہوتا ہے۔ سورۂ نور میں ہے:۔

وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْاَرْضِ كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ ۠ وَلَيُمَكِّنَنَّ لَهُمْ دِيْنَهُمُ الَّذِي ارْتَضٰى لَهُمْ وَلَيُبَدِّلَنَّهُمْ مِّنْ بَعْدِ خَوْفِهِمْ اَمْنًا ۭ يَعْبُدُوْنَنِيْ لَا يُشْرِكُوْنَ بِيْ شَيْـــًٔا ۭ وَمَنْ كَفَرَ بَعْدَ ذٰلِكَ فَاُولٰۗىِٕكَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ۔ (۲۴/۵۵)

جو لوگ ہمارے قوانین کی صداقت پر یقین رکھیں گے اور ہمارے تجویز کردہ پروگرام پر عمل پیرا ہونگے ہم وعدہ کرتے ہیں کہ ہم انہیں دنیا میں حکومت عطا کر دیں گے۔ اسی طرح جس طرح ہم نے اس طرح زندگی بسر کرنے والی قوموں کو ان سے پہلے حکومت عطا کی تھی۔ اس حکومت سے مقصد یہ ہوگا کہ وہ

نظامِ زندگی (الدین) جسے ہم نے ان کے لئے پسند اور تجویز کیا ہے، مستحکم ہو جائے،
ان کا خوف امن سے بدل جائے اور اس طرح وہ اس قابل ہو جائیں کہ صرف ہمارے احکام و
قوانین کی اطاعت کریں اور دنیا کی کوئی قوّت انہیں اس پر مجبور نہ کر سکے کہ وہ خدا کے سوا کسی اور کی
محکومیت اختیار کریں۔

یہ سلسلہ اس وقت تک قائم و دائم رہے گا جب تک یہ لوگ اس پروگرام پر عمل پیرا رہیں گے۔
جب یہ اس روش کو چھوڑ دیں گے تو یہ تمکّن ان سے چھن جائے گا کیونکہ یہ تو نتیجہ تھا ایمان و اعمالِ صالحہ
کا اور جب یہ بیج ہی باقی نہیں رہے گا تو اس کے ثمرات کس طرح حاصل ہو سکیں گے؟

اس سے واضح ہے کہ جب ایک رسول "ایمان و اعمالِ صالحہ" کی دعوت دیتا تھا تو وہ گویا تخم ریزی کر رہا ہوتا تھا۔ اس فصل کی جس کا حاصل تمکّن فی الارض تھا۔ اس لئے یہ سمجھنا قطعاً غلط ہے کہ مکّی زندگی میں تو رسول اللہ کے پیشِ نظر محض "مذہبی وعظ و نصیحت" تھی اور جب مدنی زندگی میں کسی طرح قوّت حاصل ہو گئی، تو آپؐ کے دل میں مملکت قائم کرنے کا خیال ابھر آیا۔ آپ پہلے دن سے دین کے داعی تھے، اس لئے آپ کا ہر قدم اسی نصب العین (دین کے استحکام یعنی قیامِ مملکت) کی طرف اٹھ رہا تھا۔ اس پروگرام کا پہلا حصّہ ایک ایسی جماعت کی تشکیل تھا جس کے ایمان و اعمالِ صالحہ کا فطری نتیجہ استخلاف فی الارض تھا۔ مکّی زندگی اس پروگرام کا مرحلۂ اوّل تھی۔ اس کے بعد جب آپؐ نے دیکھا کہ مکّہ کے مقابلہ میں مدینہ کی فضا، اس مقصد کے حصول کے لئے زیادہ سازگار ہے، تو آپؐ اپنی جماعت کے ساتھ ہجرت کر کے، وہاں تشریف لے گئے۔ وہاں کی فضا میں، اس تخمِ صالحہ (یعنی جماعت کے ایمان و اعمالِ صالحہ کے شجرِ طیّب) نے بار آوری شروع کر دی — "ہجرت" اس لئے کہ مقصد کسی خاص مقام (مکّہ میں) مملکت قائم کرنا نہیں تھا، مقصد اس قسم کی مملکت کا قیام تھا، خواہ وہ کسی خطۂ زمین میں ہو اور یہ اس لئے کہ خود مملکت بھی مقصود بالذّات نہیں تھی۔ مقصد احکام و اقدارِ خداوندی کے مطابق زندگی بسر کرنے کی آزادی تھا اور مملکت اس مقصد کے حصول کا ذریعہ تھی۔

مکّی زندگی میں تصوّرِ مملکت

یہ حقیقت کہ مکّی زندگی میں حضورؐ کے پیشِ نظر یہی مقصد تھا، متعدّد تاریخی شواہد سے واضح ہے۔ تاریخ الکامل ابنِ اثیر میں ہے کہ رسول اللہ نے اپنی دعوت کے آغاز میں، خود اپنے اہلِ خاندان کے نام جو پیغامات بھیجے، ان میں ایک پیغام میں فرمایا تھا۔

یاد رکھو! تمہاری قوم میں آج تک کوئی ایسا جوان پیدا نہیں ہوا جس نے تمہارے سامنے اس

نصب العین سے بہتر نصب العین رکھا ہو جو میں پیش کر رہا ہوں۔ میں تمہارے پاس دنیا اور آخرت دونوں کی بہتری کے لئے آیا ہوں۔ خدا کی بالادست حکومت کی طرف سے مجھے ہدایت ملی ہے کہ میں تمہیں اس کی طرف دعوت دوں۔ مجھے اس حکومت (خداوندی) کے امور سرانجام دینے کے لئے وزراء کی ضرورت ہوگی۔ کون ہے جو میرے ساتھ وزیر کی حیثیت سے کام کرے؟

اس فرمان کو درج کرنے کے بعد ابن اثیرؒ نے لکھا ہے کہ نبوت کے تیسرے سال آپؐ نے 'ان لوگوں کو "خدا کے حکم" کے لئے جمع ہونے کی دعوت دی اور کہا کہ یاد رکھو! "یا تو خدا کا حکم غالب ہوگا اور یا میں اپنی جان سے گزر جاؤں گا۔"

قبیلہ عامر کے سردار کو جواب

اسی ضمن میں ایک اور واقعہ بھی قابلِ غور ہے جو تاریخ الکامل ہی میں مذکور ہے۔ شداد بن اوس کا بیان ہے کہ ہم میں سے کچھ لوگ دربارِ نبویؐ میں حاضر تھے کہ قبیلہ بنی عامر کا ایک معزز اور بزرگ سردار، اپنا عصا ٹیکتے اس حلقہ میں پہنچا۔ اس نے حضورؐ کی دعوت کے متعلق بہت سے سوالات کئے۔ اسی سلسلہ میں اس نے کہا کہ لکل قول حقیقۃ وما حقیقۃ قولک۔ ہر دعوے کا کوئی نہ کوئی ٹھوس ثبوت ہوتا ہے۔ آپ کے دعوے کی صداقت کا ٹھوس ثبوت کیا ہے؟ آپؐ نے فرمایا کہ میں اپنے باپ ابراہیمؑ اور اپنے بھائی عیسٰےؑ کی ذمہ داریوں، بشارتوں، اور عظمت و اقتدار کا حامل ہوں۔ عامری نے یہ سن کر کہا کہ اگر میں ان ذمہ داریوں کو پورا کردوں تو مجھے کیا ملے گا۔ آپؐ نے فرمایا کہ جنت کے باغات۔ اس نے کہا کہ یہ تو آخرت کی بات ہے۔ میں یہ معلوم کرنا چاہتا ہوں کہ اس سے اس دنیا میں کیا حاصل ہوگا۔ آپؐ نے فرمایا۔

نِعَمَ النَّصْرُ وَ التَّمْكِينُ فِي الْبِلَادِ۔

خوش آئند فتوحات اور ملکوں پر حکومت

اور یہ محض قیاس آرائی نہیں تھی۔ خدا کے اس وعدہ پر یقینِ محکم کا فطری نتیجہ تھا جس میں اس نے کہا تھا کہ ایمان و اعمالِ صالحہ کا لازمی نتیجہ استخلاف فی الارض ہے۔ (۲۴/۵۵) یہی وہ یقینِ محکم تھا جس کی بنا پر حضورؐ کبھی اعلان فرماتے تھے کہ "زمین کے مشرق و مغرب کے علاقے میرے ہاتھ میں دیئے گئے ہیں۔" کبھی اپنے صحابہؓ سے کہتے کہ "قیصر و کسریٰ کی شاہنشاہیتوں کا خاتمہ ہو جائے گا۔" کبھی اس تصریح کے ساتھ کہ "یمن فتح ہو جائے گا،

شام فتح ہو جائے گا، عراق فتح ہو جائے گا اور عرب و عجم کے علاقے فتح ہو جائیں گے۔" (یہ تمام ارشادات تاریخ کی کتابوں میں بھی منقول ہیں اور کتبِ احادیث میں بھی موجود) ان حقائق و شواہد کی موجودگی میں یہ کہنا کہ قیامِ مملکت بعد کا خیال (AFTER THOUGHT) تھا، حقیقت سے لاعلمی کی دلیل ہے۔ مقصودِ رسالت 'دینِ خداوندی کا تمکن تھا' اور دین کا تمکن اپنی مملکت کے بغیر ناممکن ہوتا ہے۔

اس مملکت کے قیام کے سلسلہ میں، ایک اور حقیقت کا پیشِ نظر رکھنا بھی ضروری ہے۔ دین کے تمکن کے لئے قیامِ مملکت ضروری ہے لیکن اس کے یہ معنی نہیں کہ آپ کسی دوسرے کی مملکت چھین کر اس میں دین کو متمکن کر دیں۔

کسی دوسرے کی مملکت چھینی نہیں جاتی

"کسی دوسرے کی مملکت چھین لینا" جوع الارض ہے اور استبدادِ ملوکیت، جس کی اسلام میں قطعاً اجازت نہیں۔ حضورؐ مدینہ تشریف لے گئے تو وہاں کسی کی مملکت قائم نہیں تھی ـــــ مملکت تو عرب کے اس پورے علاقے میں کسی کی نہیں تھی۔ وہاں مسلمان (انصار) پہلے سے موجود تھے۔ جب ان کے ساتھ مہاجرین شامل ہو گئے تو یہ جماعت بڑی مؤثر ہو گئی اور انہوں نے، قرآنی اصولوں کے مطابق، اپنی ہیئتِ اجتماعیہ کی تشکیل کر لی۔ اسی کا نام سب سے پہلی اسلامی مملکت ہے۔ اس کے بعد گرد و پیش کے قبائل بھی 'بطیبِ خاطر' اسلام لاتے گئے۔ اس طرح یہ جماعت (اُمّتِ مسلمہ) بھی وسیع ہوتی گئی اور ان کے ساتھ ان کی مملکت بھی وسیع۔ پھر جس طرح اس مملکت کا قیام، دین کا تقاضا تھا، اسی طرح اس کا تحفظ بھی دین ہی کا تقاضا تھا۔ اس کی حفاظت کے لئے اللہ تعالیٰ نے خاص طور پر تاکید کی تھی (۸:۶۰) زیرِ نظر کتاب کا تعلق، حضور نبی اکرمؐ کے عہدِ ہمایوں کی تاریخ سے نہیں۔ اس لئے اس میں، اُس دور کی لڑائیوں اور فتوحات کا تذکرہ نہیں آسکتا۔ اس کے لئے میری دوسری تصنیف ـــ معراجِ انسانیت ـــ ملاحظہ فرمایئے جو مشتمل ہے حضورؐ ختمی مرتبت کی سیرتِ طیبہ پر۔ اس وقت صرف اتنا واضح کر دینا کافی ہوگا کہ حضورؐ کے عہد کی لڑائیاں اولاً اور اساساً اس مملکتِ خداوندی کی حفاظت کے لئے تھیں۔

ہم جہاد کے عنوان میں دیکھ چکے ہیں کہ خدا کا حکم ہے کہ دنیا کے کسی علاقہ سے کوئی مظلوم مدد کے لئے پکارے تو اسلامی مملکت کا فریضہ ہے کہ وہ اس کی مدد کے لئے پہنچے۔ لہٰذا، بعض لڑائیاں اس مقصدِ جلیل کے لئے بھی لڑی گئیں۔ مقصد ان سے بھی نہ جوع الارض تھا نہ تغلّب و تسلّط۔ ان لڑائیوں کے سلسلہ میں ایسا بھی ہوا کہ فساد مٹانے اور امن و انصاف قائم کرنے کے لئے وہاں کا نظم و نسق بھی حکومتِ اسلامیہ کو سنبھالنا پڑا۔ اس طرح اس مملکت کی حدود میں وسعت بھی ہو گئی۔ رسول اللہ کی وفات تک عرب کے تمام قبائل اسلام لا چکے ہیں۔

اور اس طرح یہ تمام علاقہ اسلامی مملکت کی حدود کے اندر آ گیا تھا۔ یہ سلسلہ حضورؐ کے بعد بھی جاری رہا لیکن قبل اس کے کہ ہم اس سلسلہ دراز کے ساتھ، عہدِ صدیقیؓ میں سے ہوتے ہوئے عہدِ فاروقیؓ تک پہنچیں، ضروری معلوم ہوتا ہے کہ ان لڑائیوں کے ضمن میں عام طور پر جو اعتراضات کئے جاتے ہیں، ان پر بھی طائرانہ نگاہ ڈال لی جائے۔ یہ اعتراضات بالعموم اس نوعیت کے ہوتے ہیں۔

اسلامی جنگوں کے خلاف اعتراضات

(۱) اسلام بزورِ شمشیر پھیلایا گیا۔

(۲) جنگ کے قیدیوں کو غلام اور لونڈیاں بنایا گیا۔

(۳) غیر مسلموں کو ذمی بنایا گیا اور ان سے جزیہ وصول کیا گیا۔

قبل اس کے کہ ہم ان اعتراضات کے متعلق گفتگو کریں، ہم اس اصولی بات کو ایک بار پھر دہرا دینا ضروری سمجھتے ہیں، جسے ہم اس سے پہلے بالتصریح پیش کر چکے ہیں۔ یعنی یہ کہ قرآنی شہادات کے مطابق صدرِ اوّل کے مومنین (محمد رسول اللہ والذین معہٗ) قرآن کے متبع تھے۔ لہٰذا، اگر ان کے اعمال و کردار کے متعلق تاریخ میں کوئی ایسی بات ملے جو قرآنِ کریم کی تعلیم کے خلاف ہو، تو ہمیں سمجھ لینا چاہیئے کہ وہ تاریخی روایت غلط ہے۔ باقی رہے بعد کے مسلمان، سو ان کا کوئی عمل یا فیصلہ، اسلام کے متعلق سند نہیں قرار پا سکتا۔ اسلام کے سلسلہ میں سند اور حجت بہرکیف خدا کی کتاب ہے۔

اس اصولی بحث کے بعد آگے بڑھیئے۔ جہاں تک اسلام کے بزورِ شمشیر پھیلانے کے اعتراض کا تعلق ہے، یہ سمجھ لینا چاہیئے کہ قرآنِ کریم کی رُو سے، انسان کا امتیازی شرف جس کی رُو سے وہ حیوانات سے متمیّز اور مختص ہوتا ہے، اس کا صاحبِ اختیار و ارادہ ہونا ہے۔ اسی سے وہ اپنے اعمال کا ذمہ دار قرار پاتا ہے، اور اس کی یہی ذمہ داری، اسے جزا یا سزا (اعمال کے نتائج) کا مستوجب بناتی ہے۔ جس فیصلہ یا عمل میں انسان کے ارادے کو دخل نہیں، وہ اس کا ذمہ دار ہی قرار نہیں دیا جاتا۔ یعنی قرآن اسے اس فرد کا فیصلہ یا عمل تسلیم ہی نہیں کرتا۔

اسلام بزورِ شمشیر پھیلایا گیا؟

ایمان یا کفر، انسانی زندگی کے عظیم ترین اساسی فیصلہ کا نام ہے — یعنی اس فیصلہ کا کہ وہ اپنی زندگی میں کس راستے پر چلنا چاہتا ہے۔ ظاہر ہے کہ اگر وہ، یہ فیصلہ اپنے قلب و دماغ کی کامل رضامندی، اپنے پورے

پورے اختیار وارادے سے نہ کرے، یعنی اس میں کسی قسم کا جبر یا دباؤ شامل ہو، تو اسے اس فیصلہ کا ذمہ دار ہی قرار نہیں دیا جائے گا۔ قرآن کریم نے اس حقیقت کو بار بار واضح کر دیا ہے۔ اس نے کہا ہے کہ قُلِ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّكُمْ فَمَنْ شَآءَ فَلْيُؤْمِنْ وَّمَنْ شَآءَ فَلْيَكْفُرْ۔ (۱۸/۲۹) "اے رسولؐ! ان سے کہدو کہ حق تمہارے رب کی طرف آ گیا ہے۔ سو جس کا جی چاہے اسے قبول کر لے، جس کا جی چاہے اس سے انکار کر دے"۔ سورۂ دھر میں ہے کہ ہم نے انسان کو دیکھنے کے لئے آنکھیں اور سننے کے لئے کان دے دیئے۔ پھر اِنَّا هَدَيْنٰهُ السَّبِيْلَ۔ صحیح راستہ اس کے سامنے نکھار اور ابھار کر رکھ دیا۔ اِمَّا شَاكِرًا وَّ اِمَّا كَفُوْرًا (۷۶/۳) اب اس کا جی چاہے تو اسے اختیار کر لے، جی چاہے مسترد کر دے اور سورۂ بقرہ کی یہ آیت کہ لَآ اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ۔ قَدْ تَّبَيَّنَ الرُّشْدُ مِنَ الْغَيِّ۔ (۲/۲۵۶) "دین کے معاملہ میں کسی قسم کے جبر یا دباؤ کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ غلط اور صحیح راستے متمیز ہو کر اس کے سامنے آ چکے ہیں۔ ان میں کسی قسم کا الجھاؤ یا پیچیدگی نہیں رہی"۔ اب یہ اس کی اپنی مرضی پر موقوف ہے کہ ان میں سے کون سا راستہ اختیار کرنا چاہتا ہے۔

ایمان نام ہی قلب و دماغ کی رضامندی کا ہے

ایک طبیبِ مشفق کی طرح، رسول اللہ ہزار جان سے چاہتے تھے کہ غلط راستے پر چلنے والے، اس راہ کو چھوڑ کر صحیح راستہ اختیار کر لیں اور اس طرح تباہی سے بچ جائیں۔ (قرآن کی شہادت کے مطابق) حضورؐ ان کی تباہی کے خیال سے، ان کے غم میں گھلتے رہتے تھے۔ (۱۸/۶) اس پر اللہ تعالیٰ نے حضورؐ سے کہا کہ وَلَوْ شَآءَ رَبُّكَ لَاٰمَنَ مَنْ فِي الْاَرْضِ كُلُّهُمْ جَمِيْعًا ؕ اَفَاَنْتَ تُكْرِهُ النَّاسَ حَتّٰى يَكُوْنُوْا مُؤْمِنِيْنَ (۱۰/۹۹) اے رسولؐ! کیا تو لوگوں کو زبردستی مومن بنانا چاہتا ہے۔ اگر زبردستی مومن بنانا مقصود ہوتا تو خدا کے لیے یہ کیا مشکل تھا کہ وہ انسان کو بھی حیوانوں کی طرح مجبور پیدا کر دیتا اور اس طرح دنیا کے تمام باشندے ایک ہی راہ پر چلتے رہتے۔ لیکن اس کی مشیت کا یہ فیصلہ نہیں تھا۔ اس نے انسان کو صاحبِ اختیار و ارادہ بنایا ہے، اس لئے اسے صحیح راستہ اختیار کرنے پر مجبور نہیں کیا جا سکتا۔

قرآن کریم سے اس مضمون کی متعدد آیات پیش کی جا سکتی ہیں لیکن ہم انہی پر اکتفا کرتے ہیں۔ ان سے واضح ہے کہ جبر اور ایمان دو متضاد چیزیں ہیں۔ ایمان کے معنی ہیں، دل اور دماغ کی کامل رضامندی سے صداقت کا تسلیم کر لینا۔ لہٰذا، اگر کوئی شخص کسی قسم کے دباؤ سے ایمان کے الفاظ دہرا دیتا ہے تو قرآن اسے مومن تسلیم ہی نہیں

کرتا۔ وہ مومنین کی تعریف (DEFINITION) بالخصوصیت یہ بتاتا ہے کہ وَالَّذِیْنَ اِذَا ذُکِّرُوْا بِاٰیٰتِ رَبِّهِمْ لَمْ یَخِرُّوْا عَلَیْهَا صُمًّا وَّعُمْیَانًا (۲۵/۷۳) - یہ وہ لوگ ہیں کہ، اور تو اور، جب ان کے سامنے ان کے رب کی آیات بھی پیش کی جاتی ہیں تو وہ ان کے آگے بہرے اور اندھے بن کر نہیں جھک جاتے۔ وہ انہیں بھی عقل و بصیرت کی رُو سے تسلیم کرتے ہیں۔ "بزورِ شمشیر" تو ایک طرف، وہ اس ایمان کو بھی ایمان تسلیم نہیں کرتا جو محض تقلیدًا یا وراثتًا اختیار کیا جائے۔ بالفاظِ دیگر، قرآنِ مجید کی رُو سے کسی شخص کو محض اس بنا پر مومن تسلیم نہیں کیا جا سکتا کہ وہ مسلمانوں کے گھر میں پیدا ہوا تھا، نہ ہی اس کی اس دلیل کو صحیح مانا جا سکتا ہے کہ اس نے فلاں مسلک اس لئے اختیار کیا ہے کہ اسلاف سے ایسا ہوتا چلا آرہا ہے۔ (جیسا کہ اوپر بتایا جا چکا ہے) ایمان، قلب و دماغ کی کامل، بلا جور و اکراہ، رضامندی سے، صداقت کو قبول کرنے کا نام ہے، اور جب تک کوئی شخص اس (صداقت) کو اس طرح قبول نہیں کرتا، اسے صاحبِ ایمان تسلیم نہیں کیا جا سکتا۔ اس باب میں قرآنِ کریم کہاں تک آگے جاتا ہے، اس کا اندازہ اس سے لگائیے کہ جب مدینہ میں اسلامی مملکت قائم ہوئی، تو بعض بدوی قبائل نے، اس کی شوکت و حشمت کو دیکھ کر، اس کے سامنے سرِ تسلیم خم کر دیا اور اس طرح اپنے آپ کو مومن شمار کرنے لگ گئے۔ قرآنِ کریم نے انہیں فوراً ٹوکا، اور کہا اپنے آپ کو مومن مت کہو۔ قُلْ لَّمْ تُؤْمِنُوْا وَلٰکِنْ قُوْلُوْٓا اَسْلَمْنَا وَلَمَّا یَدْخُلِ الْاِیْمَانُ فِیْ قُلُوْبِکُمْ (۴۹/۱۴) - "ان سے کہو کہ اپنے آپ کو ابھی مومن مت کہو۔ یہ کہو کہ تم نے اسلامی حکومت کے سامنے اپنا سر جھکا دیا ہے۔ اپنے آپ کو مومن اس وقت کہنا اور سمجھنا جب ایمان تمہارے دل کی گہرائیوں تک پہنچ جائے، ابھی تو ایسا نہیں ہوا۔"

آگے بڑھنے سے پہلے، اس مقام پر ایک اہم نکتہ کا سمجھ لینا ضروری ہے۔ جو لوگ پیدائشی مسلمان ہوں گے، یا یونہی رسمًا اسلام قبول کر لیں گے انہیں غیر مسلم نہیں کہا جائے گا۔ وہ مسلمان ہی کہلائیں گے اور مسلمان قوم کے افراد ہوں گے لیکن وہ مومن اس وقت کہلائیں گے جب "ایمان ان کے دل کی گہرائیوں میں اتر جائے گا۔" قرآنِ کریم کی رُو سے کسی کو جبرًا مومن بنانا تو ایک طرف اسے جبرًا مسلمان بھی نہیں کہا جا سکتا۔

ان تصریحات کی روشنی میں آپ سوچئے کہ جس قرآن کا موقف اور تعلیم یہ ہو، کیا اس کے ماننے والوں (خلفائے راشدین اور صحابہ کبارؓ) کا مسلک یہ ہو گا کہ وہ غیر مسلموں کو تلوار کے زور سے مسلمان کرتے ہوں گے!

عام حالات تو ایک طرف، جنگ کی حالت میں بھی قرآنِ کریم کی تعلیم یہ تھی (اور ہے) کہ وَاِنْ اَحَدٌ مِّنَ الْمُشْرِکِیْنَ اسْتَجَارَکَ فَاَجِرْهُ حَتّٰی یَسْمَعَ کَلٰمَ اللّٰهِ ثُمَّ اَبْلِغْهُ مَاْمَنَهٗ ط ذٰلِکَ

بِاَنَّهُمْ قَوْمٌ لَّا يَعْلَمُوْنَ. (۹/۶) - اگر دشمن کا کوئی فرد تم سے پناہ طلب کرے تو اُسے پناہ دو۔ اسے قرآن سناؤ۔ اس کے بعد اگر وہ اپنے مأمن (جائے حفاظت) کی طرف جانا چاہے تو اسے بحفاظت وہاں تک پہنچا دو۔ یہ اس لئے کہ یہ لوگ تمہاری دعوت اور تعلیم کو اچھی طرح سمجھتے نہیں (اس لئے تمہاری مخالفت کرتے ہیں)۔

ان تصریحات قرآنیہ کے بعد اس موضوع پر کچھ اور کہنے کی ضرورت نہیں رہتی۔ بایں ہمہ، ہم عہد فاروقیؓ کے دو ایک واقعات درج کرتے ہیں جن سے اندازہ ہو سکے گا کہ اُس دور میں، اسلام کی اشاعت میں جبر کا کس

حضرت عمرؓ کا عیسائی غلام

قدر ہاتھ تھا۔ حضرت عمرؓ کا ایک رومی نژاد غلام تھا، جس کا نام وثیق تھا ___ وہ عیسائی تھا۔

حضرت عمر! ان کا دُرّہ (یعنی وہ دُرّہ، تاریخ جس کا غلط تصور پیش کرتی ہے)۔ پھر ان کا غلام اور عیسائی!! کہاں گیا وہ جبر جس کی رُو سے غیر مسلموں کو مسلمان کیا جاتا تھا؟

بات یہیں پر ختم نہیں ہو جاتی۔ جب مملکت وسیع ہوئی تو اس کا حساب کتاب رکھنے کے لئے کسی ماہر حساب دان (اکاؤنٹنٹ) کی ضرورت محسوس ہوئی۔ عربوں کے پاس ایسے ماہر حساب داں کہاں ہو سکتے تھے، جو مملکت کا حساب کتاب رکھ سکتے۔ وثیق ماہر حساب دان تھا۔ لوگوں نے کہا کہ اسے اس کام پر مامور کر دیا جائے۔ حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ قرآن کریم کا ارشاد ہے کہ کسی غیر مسلم کو رموزِ مملکت میں شریک نہیں کیا جا سکتا[1] (۳/۱۱۷) اس لئے لا ینبغی ان استعین علی امانتھم بمن لیس منھم۔ "یہ جائز اور مناسب نہیں کہ مسلمانوں کی امانت کے کام میں، میں اس شخص سے مدد لوں جو ان میں کا نہیں"۔ ہاں، اگر وہ اسلام لے آئے تو پھر اس کے سپرد یہ خدمت کی جا سکتی ہے۔ وثیق سے کہا گیا تو اس نے اسلام لانے سے انکار کر دیا۔ وہ عمر بھر عیسائی رہا ___ "عمرؓ کا دُرّہ" خود اپنے غلام کیخلاف بھی حرکت میں نہ آیا حالانکہ اس سے مملکت کی ایک اہم ضرورت بھی رُکی رہی۔

دوسرا واقعہ اس سے بھی زیادہ نمایاں ہے۔ فتح مصر کے وقت بہت سے قبطی اور رومی گرفتار ہوئے جو مذہب عیسائیت کے پیرو تھے۔ حضرت عمرو بن عاصؓ نے دربارِ خلافت کو لکھا کہ ان کے متعلق کیا کیا جائے۔ حضرت عمرؓ نے جواب میں کہا کہ ان سے کہہ دو کہ انہیں اختیار ہے کہ وہ جی چاہے مسلمان ہو جائیں اور جی چاہے اپنے سابقہ مذہب پر قائم رہیں۔ اگر یہ مسلمان ہو جائیں گے تو انہیں وہ تمام حقوق حاصل ہو جائیں گے جو باقی مسلمانوں

---

[1] یہ اسلامی نظام اور نظریۂ قومیت کا بڑا بنیادی اصول ہے جس کی تشریح اس کے مقام پر کی جائے گی۔

کو حاصل ہیں۔ اگر عیسائی رہنا چاہیں گے تو انہیں صرف جزیہ دینا ہوگا۔ حضرت عمرو بن عاص نے ان قیدیوں کو بھی بلایا اور ان کے سرداروں کو بھی اور انہیں دربارِ خلافت کا فیصلہ پڑھ کر سنایا۔ ان قیدیوں میں بعض ایسے تھے جنہوں نے اس دوران میں اسلام کا مطالعہ کیا تھا، اس لئے وہ مسلمان ہونا چاہتے تھے۔ باقی عیسائی رہنا چاہتے تھے۔ طبری میں ہے کہ ایک طرف عیسائی سردار بیٹھ گئے اور دوسری طرف مسلمان اور درمیان میں یہ ہزاروں قیدی۔ جب کوئی قیدی اسلام کا اظہار کرتا تو مسلمان جوشِ مسرت سے نعرۂ تکبیر بلند کرتے لیکن کوئی عیسائیت کا اعلان کرتا تو تمام عیسائیوں میں مسرت کی لہر دوڑ جاتی اور مسلمان ایسے غمزدہ ہو جاتے کہ ان کی آنکھوں سے آنسو ٹپک پڑتے۔

ایک فاتح قوم کے افراد غم سے آنسو تو بہاتے لیکن اپنی مفتوح قوم کے قیدیوں کو اسلام لانے پر مجبور نہ کرتے، کہ وہ، قرآنِ کریم کی تعلیم کی رُو سے ایسا کر نہیں سکتے تھے۔ کیا اس کے بعد بھی آپ کہہ سکتے ہیں کہ اُس دور میں کسی کو بزورِ شمشیر مسلمان بنایا گیا ہوگا! هٰذَا بُهْتَانٌ عَظِيمٌ ہاں یہ ضرور ہے کہ اگر کسی فرد، کسی قبیلہ یا کسی قوم نے، اسلامی مملکت کی شان و شوکت سے متاثر ہو کر اس کے سامنے سرِ تسلیم خم، اور اس طرح اسلام قبول کر لیا ہو، تو اسے مسلمان تسلیم کر لیا ہوگا ——— اور ایسا کرنا بھی چاہیئے تھا ——— لیکن جیسا پہلے لکھا جا چکا ہے قرآنِ کریم نے اس طرح مسلمان ہونے اور ایمان لانے میں جس لطیف فرق کی وضاحت کی ہے، انہوں نے اسے ملحوظ رکھا ہوگا۔

(۵)

غلام اور لونڈیاں

جہاں تک "غلام اور لونڈیوں" کا تعلق ہے، عربوں کے ہاں رواج اور معمول تھا کہ وہ جنگ میں گرفتار ہونے والے قیدیوں میں مردوں کو غلام اور عورتوں کو لونڈیاں بنا لیتے تھے۔ غلاموں سے ہر قسم کی خدمت لیتے اور لونڈیوں سے جنسی تمتع کرتے۔ ظہورِ اسلام کے وقت، عربی معاشرہ میں غلاموں اور لونڈیوں کی بھرمار تھی۔ وہ اس معاشرہ کا جزو بن چکے تھے۔

نزولِ قرآن کا ایک بنیادی مقصد یہ تھا کہ وہ انسان کو اس کے صحیح مقام سے آشنا کر دے۔ اس سلسلہ میں اس نے اساسی طور پر اعلان کر دیا کہ ہر انسان، محض انسان ہونے کی جہت سے، یکساں واجب التکریم ہے۔ (۱۷/۷۰) اس کے ساتھ ہی اس نے واضح الفاظ میں کہہ دیا کہ "کسی انسان کو اس کا حق حاصل نہیں، خواہ اسے قانون سازی کے اختیارات حاصل ہوں، یا حکومت مل جائے، حتیٰ کہ خواہ اسے نبوت بھی کیوں نہ مل جائے، کہ وہ لوگوں سے کہے

کہ تم خدا کے نہیں بلکہ میرے غلام اور محکوم بن جاؤ۔" (۳/۷۸) سوچئے کہ جس قرآن کی یہ تعلیم ہو وہ کبھی گوارا کر سکتا تھا کہ ایک انسان کو دوسرے انسان کا غلام بنا دیا جائے! وہ انسانیت کی اس تحقیر و تذلیل کو برداشت ہی نہیں کر سکتا تھا۔ لہٰذا اس کے نزدیک، غلامی کا رواج بارگاہِ خداوندی میں معصیتِ کبیر اور انسانیت کی عدالت میں جرمِ عظیم تھا۔ وہ اسے ہمیشہ کے لئے ختم کر دینا چاہتا تھا۔

لیکن اسلام ایک عملی نظام تھا اس لئے وہ اپنے عالمگیر، ابدی، اصولوں کی عملی تنفیذ میں، اپنے زمانہ اور قومِ مخاطب کے احوال وظروف پر نگاہ رکھتے ہوئے، اس منتہیٰ تک بتدریج پہنچاتا تھا۔ اگر وہ حکم دے دیتا کہ غلاموں اور لونڈیوں کو یک لخت آزاد کر دیا جائے تو اس سے نہ صرف اس معاشرہ کے نظم و نسق میں انتشار واقعہ ہو جاتا بلکہ خود ان غلاموں اور لونڈیوں کے لئے بھی عجیب عملی مشکلات پیدا ہو جاتیں۔ اس لئے قرآنِ کریم نے اپنی حکمتِ بالغہ کی رو سے ایسی تدابیر اختیار کیں جن سے ان کے معاشرہ سے غلاموں اور لونڈیوں کا وجود بتدریج ختم ہو جائے۔ یہ جو آپ قرآنِ کریم میں " مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ " کے متعلق احکامات دیکھتے ہیں؛ یہ وہی تدابیر ہیں جن کی رُو سے غلامی کا بتدریج ختم کیا جانا مقصود تھا۔ آپ سارے قرآن میں دیکھئے، ان احکامات کے سلسلہ میں آپ کو ہر گز ماضی کا صیغہ (ملکت) ملے گا ــــ یعنی وہ "جنہیں تم غلام یا لونڈیاں بنا چکے ہو"۔ کہیں یہ نہیں ملے گا کہ "جنہیں تم غلام اور لونڈیاں بناؤ"۔ ان کے متعلق یوں کرو۔[1] قرآنِ کریم میں آپ کو ہر جگہ غلاموں کو آزاد کرنے کے احکام ملیں گے۔ کسی ایک جگہ بھی غلام بنانے کا حکم نہیں ملے گا۔

یہ تو رہا ان غلاموں اور لونڈیوں کے متعلق، جو انسدادِ غلامی کے متعلق حتمی حکم نازل ہونے سے پہلے غلام بنائے جا چکے تھے اور نزولِ قرآن کے وقت عربی معاشرہ میں موجود تھے۔ جہاں تک آئندہ کا تعلق تھا، غلام اور لونڈیوں کا بنیادی سرچشمہ ایک ہی تھا، یعنی جنگ کے قیدی، ان کے متعلق قرآنِ کریم نے واضح الفاظ میں کہہ دیا کہ جو لوگ جنگ میں قید ہو کر آئیں۔

فَاِمَّا مَنًّا بَعْدُ وَ اِمَّا فِدَآءً۔ (۴۷/۴)

انہیں یا تو فدیہ لے کر رہا کر دو۔ اور یا بطورِ احسان۔

---

[1] غلام اور لونڈیاں ــــ اور لَآ اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ کے موضوع پر ادارہ طلوعِ اسلام کی طرف سے شائع کردہ کتابچہ "قتل مرتد ــــ اور ــــ غلام اور لونڈیاں" ملاحظہ فرمایئے۔

سارے قرآن میں، جنگ کے قیدیوں کے متعلق یہی ایک حکم ہے۔ آپ اس حکم کو دیکھئے اور غور کیجئے کہ اس میں کسی پہلو سے بھی انہیں غلام بنانے کی صورت نکل سکتی ہے؟ کیا اس سے اس قسم کا گمان بھی گزر سکتا ہے کہ قرآن کا منشاء یہ ہے کہ اسیرانِ جنگ کو غلام بناؤ۔ ان کی عورتوں سے جنسی تمتع کرو اور پھر انہیں جب جی چاہے، بھیڑ بکریوں کی طرح دوسروں کے ہاتھ فروخت کر دو! سُبْحَانَ اللّٰهِ تَعَالٰى عَمَّا يَصِفُوْنَ۔

قرآنِ کریم کی ان تصریحات کے بعد، اس کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا تھا کہ عہدِ خلافتِ راشدہ میں جو جنگیں ہوئیں، ان میں گرفتار شدہ قیدیوں کو غلام اور لونڈیاں بنا لیا جاتا تھا لیکن ہماری تاریخ میں، اس عہد میں بھی، عربی معاشرہ میں غلاموں اور لونڈیوں کی بھرمار دکھائی جاتی ہے۔ (جیسا کہ ہم متعدد بار لکھ چکے ہیں، اسلام کے معاملہ میں ساری مصیبتوں کی جڑ ہماری تاریخ ہے) ہوا یہ کہ صدرِ اول کے بعد، جب مسلمانوں میں ملوکیت در آئی، تو ان بادشاہوں نے وہی کچھ کیا، جو باقی دنیا کرتی چلی آ رہی تھی اور کر رہی تھی لیکن ان میں ہنوز اتنی جرأت نہیں تھی کہ وہ اس خیال کو عام ہونے دیتے کہ وہ خلافِ اسلام حرکات و شعار کے مرتکب ہوتے ہیں۔ اس کا علاج انہوں نے یہ سوچا کہ جو کچھ خلافِ قرآن کرنا چاہا، اس کی تائید میں یا تو کوئی حدیث وضع کر دی اور یا صدرِ اول کی تاریخ میں کوئی ایسا واقعہ درج کر دیا جس سے اس کا جواز مل جائے۔ ہماری تمام "مستند" کتبِ احادیث، جنہیں صحاح ستّہ کہا جاتا ہے، ہماری سب سے پہلی تفسیرِ قرآنِ کریم (یعنی امام طبری کی تفسیر) اور سب سے پہلی مبسوط تاریخ (انہی امام طبری کی مرتب کردہ تاریخ) سب عباسیوں کے زمانے میں مرتب ہوئیں اور ان میں یہ وضعی روایات، کہیں حدیث کی شکل میں، کہیں حدیث پر مبنی تفسیر کے رنگ میں اور کہیں تاریخی واقعات کی صورت میں، جمع ہو گئیں۔ اس کے بعد انہی کی روشنی میں ہماری فقہ مرتب ہوئی اور ان کا مجموعہ، اسلام کا لبادہ اوڑھ کر امت میں رائج ہو گیا اور متوارث چلا آ رہا ہے۔ اسی اسلام کی رُو سے اب "شریعت" کا فیصلہ یہ ہے کہ

> حکومت کو اختیار ہے کہ (جنگ میں گرفتار شدہ عورتوں کو) چاہے رہا کر دے چاہے ان سے فدیہ لے، چاہے ان کا تبادلہ ان مسلمان قیدیوں سے کرے جو دشمن کے ہاتھ میں ہوں اور چاہے تو انہیں سپاہیوں میں تقسیم کر دے اور سپاہی انہیں اپنے استعمال میں لائیں۔
>
> (تفہیم القرآن[1]، از سید ابوالاعلیٰ مودودی صاحب، جلد اول ص ۳۴۰، ایڈیشن ۱۹۵۱ء)

---

[1] ہم نے "تفہیم القرآن" کا حوالہ اس لئے دیا ہے کہ یہ ہمارے زمانہ کی (اردو میں) اولیں کہئیے کہ (LATEST) تفسیر ہے جس میں متقدمین کی تفاسیر کو یکجا کر دیا گیا ہے۔

اس جنسی تمتّع کے لئے نہ نکاح کی ضرورت ہے نہ تعداد کی شرط۔ ایک شخص جب تک جی چاہے اور جتنی تعداد میں چاہے، انہیں اپنی ملکیّت میں رکھے اور جب جی چاہے انہیں دوسروں کی طرف منتقل کر دے یا فروخت کر دے[1]۔

ہم نے اوپر کہا ہے کہ قرآنِ کریم نے غلامی کا دروازہ بند کر دیا تھا لیکن یہ دروازہ اس وقت کھلا جب وضعی روایات اور تاریخی تلبیسات کو دین میں سند تسلیم کیا جانے لگا۔ (مثلاً جب مودودی صاحب پر اعتراض کیا گیا کہ غلاموں اور لونڈیوں کے متعلق جو کچھ آپ کہہ رہے ہیں، وہ قرآن کے خلاف ہے تو انہوں نے جواب میں لکھا کہ:۔

(معترض کی) غلطی کا اصلی سبب یہی ہے کہ انہوں نے صرف قرآن سے غلامی کا قانون اخذ کرنے کی کوشش فرمائی ہے۔ (تفہیمات۔ ایضاً صفحہ ۳۹۲)

یعنی انہیں خود اس کا اعتراف ہے کہ اگر "صرف قرآن" سے غلامی کے متعلق قانون اخذ کیا جائے، تو وہاں سے غلامی کا جواز نہیں مل سکتا۔ اس کے جواز کے لئے خارج از قرآن مآخذ کی طرف رجوع کیا جائے گا۔

ہمارا ایمان بہرحال یہی ہے کہ دین میں سند خدا کی کتاب ہے اور مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ وَالَّذِيْنَ مَعَهٗ اسی قرآن کے متبع تھے۔ اس لئے اگر کتبِ روایات و تاریخ میں کوئی ایسی بات ان کی طرف منسوب شدہ ملتی ہے جو قرآن کے خلاف ہے، تو وہ روایت، یا تاریخ کا بیان وضعی ہے۔ عہدِ فاروقی میں ہمیں تاریخ میں ایسے بیانات ملتے ہیں جن سے واضح ہو جاتا ہے کہ اسیرانِ جنگ کو رہا کیا جاتا تھا، غلام نہیں بنایا جاتا تھا۔ مثلاً جب خوزستان کے شہر اہواز کو فتح کیا ہے (جسے ایرانی ہرمز کہتے تھے) تو وہاں ہزاروں مرد اور عورتیں قید ہو کر آ گئے۔ حضرت عمرؓ نے حکم دیا کہ ان سب کو رہا کر دیا جائے۔ فتحِ مصر کے وقت گرفتار شدگان کو کس طرح نہ صرف آزاد کیا گیا بلکہ انہیں مذہبی آزادی بھی دی گئی، اس کے متعلق ہم پہلے دیکھ چکے ہیں۔ لہٰذا، صحیح بات یہی ہے کہ اس زمانے میں جنگ کے قیدیوں کو غلام نہیں بنایا جاتا تھا کیونکہ قرآنِ کریم کا یہی حکم تھا۔ اگر اُس دور کے کسی شخص کے نام کے ساتھ "غلام" کا لفظ آئے تو اس سے مراد ایسا شخص ہوگا جو اس معاشرہ میں پہلے سے بہ حیثیتِ غلام موجود تھا اور یا تو بعد میں آزاد ہو چکا تھا یا ہنوز آزاد نہیں ہوا تھا۔ انہیں آجکل کی اصطلاح میں گھریلو ملازم سمجھنا چاہیئے جیسے وثیق (جس کا ذکر اوپر آ چکا ہے) جو پہلے سے غلام چلا آ رہا تھا اور جسے حضرت عمرؓ نے بعد میں آزاد کیا تھا۔ اس عہد میں جدید

---

[1] ملاحظہ ہو، مودودی صاحب کی کتاب، تفہیمات، حصہ دوم۔ ایڈیشن ۱۹۵۱ء۔ صفحات ۲۹۰ تا ۳۲۴۔

غلاموں یا لونڈیوں کا بہر حال سوال پیدا نہیں ہوتا تھا کہ قرآنِ کریم نے اس دروازہ کو ہمیشہ کے لئے بند کر دیا تھا۔

جزیہ اور ذمی

جزیہ کا لفظ قرآنِ کریم میں صرف ایک جگہ آیا ہے۔ اس کے لغوی معانی، اور جس مقام پر قرآنِ کریم میں یہ لفظ آیا ہے، اس سے اس کا پورا پورا مفہوم سامنے آجاتا ہے۔ ذمّی یا اہل الذمّہ کے الفاظ قرآنِ کریم میں نہیں آئے۔ یہ جزیہ کا لازمی یا فطری نتیجہ تھے۔ یا یوں کہیے کہ جزیہ اور ذمّہ لازم و ملزوم تھے۔ اب ان اصطلاحات کا مفہوم سامنے لائیے۔

قرآنِ کریم میں، جن مقاصد کے لئے مسلمانوں کو جنگ کرنے کی اجازت دی ہے، یا جن حالات میں ان پر جنگ کرنا فرض ہو جاتا ہے، ان کی تفصیل سابقہ باب (جہاد) میں دی جا چکی ہے۔ اسے ایک نظر پھر دیکھ لیجئے۔ مختصراً یہ کہ اسلام میں جنگ کی اجازت (یا حکم) حسبِ ذیل حالات میں ہے:۔

(۱) اپنی مملکت کی حفاظت کے لئے۔

(۲) مظلومین کی امداد کے لئے، خواہ وہ کوئی ہوں، اور کہیں بھی ہوں۔

(۳) اگر کسی جگہ لاقانونیت پھیل جائے اور کوئی قدرِ انسانیت محفوظ نہ رہے، تو اس کی روک تھام کے لئے۔

(۴) غیر مسلموں کی مذہبی آزادی کے تحفظ کے لئے۔

جب اسلامی مملکت ان مقاصد میں سے کسی مقصد کے لئے جنگ کرنے کا فیصلہ کرتی تھی تو یہ نہیں کہ اس علاقہ پر یکایک حملہ کر دیا جاتا تھا، وہ وہاں کی حکومت اور باشندوں پر واضح کرتی تھی کہ ان کے خلاف اس اقدام کی ضرورت کیوں پیش آئی ہے۔ اس کے بعد ان کے سامنے تین شرطیں رکھ دی جاتی تھیں۔

(۱) اگر تم برضا و رغبت، دل و دماغ کے پورے اطمینان کے بعد، اسلام کو سچا دین سمجھو تو اسے اختیار کر لو۔ اس صورت میں، تم ہم میں سے ہو جاؤ گے۔

(۲) اگر ایسا نہیں چاہتے تو تم صرف ہمارے اقتدار کی برتری کو تسلیم کر لو۔ تمہاری مملکت بھی تمہارے پاس رہے گی اور ہم تمہاری جان۔ مال، عزّت، آبرو، مذہب، معابد، غرضیکہ ہر قابلِ حفاظت شے کی حفاظت کا ذمّہ لیں گے۔ اور

(۳) اگر تمہیں یہ بھی منظور نہیں تو پھر فیصلہ میدانِ جنگ میں ہوگا۔

یہ صورت تھی جنگ سے پہلے کی۔ اگر معاملہ جنگ تک پہنچ جاتا اور اس علاقہ کو فتح کر لیا جاتا تو اس مفتوح قوم کے سامنے

پہلی دو شکلیں پھر سے رکھ دی جاتیں۔ یعنی اگر بطیبِ خاطر اسلام لانا چاہو تو ہم میں سے ہو جاؤ اور اگر ایسا نہ چاہو تو پھر ہمارے اقتدار کی برتری تسلیم کر کے ہماری ذمہ داری قبول کر لو۔ جو قوم اس پر رضامند ہو جاتی، اس سے معاہدہ کر لیا جاتا ـــــ یعنی مفتوح قوم کے ساتھ معاہدہ ـــــ اگر وہ اس پر بھی رضامند نہ ہوتے تو پھر ان کے ملک کو اپنے زیرِ اقتدار لے آیا جاتا۔ جو قوم اس دوسری شرط کو قبول کر لیتی یعنی اسلامی مملکت کے زیرِ حفاظت آجانے کی شرط کو، تو اس سے تھوڑا سا ٹیکس وصول کر لیا جاتا۔ اُسے **جزیہ** کہا جاتا ہے۔ جزیہ کے لغوی معنی ہیں کسی خدمت کا صلہ یا معاوضہ ـــ ایسا معاوضہ جو اس خدمت کے لئے کافی سمجھا جائے اور اس سے زیادہ کچھ اور طلب نہ کیا جائے۔

اگرچہ بظاہر یہ ٹیکس، اس حفاظت کے بدلے میں لیا جاتا تھا۔ جس کی ذمہ داری اسلامی مملکت پر عائد ہو جاتی تھی۔ لیکن درحقیقت یہ علامت (T O K E N) ہوتی تھی اس امر کی کہ اس قوم نے اسلامی حکومت کے اقتدار کی برتری کو تسلیم کر لیا ہے اور عہد کیا ہے کہ وہ اس کے خلاف بغاوت نہیں کرے گی۔ (لغت میں، لفظ **جزیہ** معاہدہ کے معنوں میں بھی آتا ہے۔) چنانچہ قرآنِ کریم میں جس مقام پر یہ لفظ آیا ہے، وہاں سے اس مفہوم کی وضاحت سامنے آجاتی ہے۔ سورۂ توبہ میں ہے کہ ان لوگوں سے جنگ کرو۔ حَتّٰی یُعْطُوا الْجِزْیَةَ عَنْ یَّدٍ وَّ ھُمْ صٰغِرُوْنَ (۹/۲۹) تاآنکہ وہ اپنی سرکشی چھوڑ کر، تمہارے اقتدار کی برتری تسلیم کر لیں۔ (وَ ھُمْ صٰغِرُوْنَ) اور اس کی علامت کے طور پر جزیہ دینا قبول کر لیں۔

جزیہ کی رقم کتنی ہوتی تھی، اس کے متعلق تاریخ میں مختلف بیانات ملتے ہیں، جن سے مترشح ہوتا ہے کہ

جزیہ کی رقم

اس کی مقدار ہر قوم کے حالات کے مطابق مختلف ہوتی تھی لیکن تاریخ میں جو زیادہ سے زیادہ شرح ملتی ہے اسے امام ابو یوسفؒ نے کتاب الخراج میں اس طرح درج کیا ہے کہ مالداروں سے اڑتالیس درہم سالانہ، متوسط الحال لوگوں سے چوبیس درہم اور کم آمدنی والوں سے بارہ درہم۔ واضح رہے کہ درہم تقریباً ایک چونی کے برابر ہوتا تھا۔ اس لحاظ سے جزیہ کی رقم زیادہ سے زیادہ بارہ روپے فی کس سالانہ اور کم از کم تین روپے سالانہ ہوتی تھی۔ عورتیں، بچے، بوڑھے، اپاہج، محتاج، اس سے مستثنیٰ ہوتے تھے۔ یہ قلیل سی رقم انہیں ادا کرنی پڑتی تھی اور اس کے عوض انہیں، ان کی جان، مال، عزت، آبرو، مذہب، معابد، حتیٰ کہ ان کی مملکت کی حفاظت کی ضمانت دی جاتی تھی۔ آپ سوچئے کہ کیا دنیا میں اس سے زیادہ سستا سودا کوئی اور بھی ہو سکتا ہے! آپ صرف اپنے گھر کی رکھوالی کے لئے چوکیدار ملازم رکھیں، تو ایک روپیہ ماہوار (بارہ روپے سالانہ) پر وہ بھی نہیں ملے گا! اور پھر یہ معاملہ کیا جاتا تھا مفتوحہ قوم کے ساتھ! یہ ضمانت، زبانی کلامی نہیں ہوتی تھی۔ اس کے لئے

ان کے ساتھ باقاعدہ تحریری معاہدہ ہوتا تھا۔ ان معاہدات کی تفصیل تو "فتوحات" کے سلسلہ میں سامنے آئے گی

ذمیوں کیساتھ معاہدات

لیکن اس حقیقت کی وضاحت کے لئے کہ اتنی سی رقم کے عوض مفتوحہ اقوام کو کس کس قسم کے تحفظات کی ضمانت دی جاتی تھی، اس مقام پر دو ایک معاہدات کا (مثال کے طور پر) درج کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے۔ نجران (یمن) کے عیسائیوں کے ساتھ خود حضور رسالتمآبؐ نے جو معاہدہ کیا تھا، اس کے الفاظ یہ تھے :۔

نجران اور اس کے گرد و پیش کے باشندے، اللہ کے جوار (ہمسائیگی) اور محمدؐ رسول اللہ کی ذمہ داری میں ہیں۔ ان کے اموال، جانیں، اراضیات، مذہب، ان کے غائب اور حاضر خاندان، ان کی عبادت گاہیں، غرضیکہ ان کی ہر چیز جو ان کے قبضہ میں ہے، تھوڑی ہو یا بہت، سب محفوظ رہیں گی۔ کسی پادری کو اس کے منصب سے، کسی راہب کو اس کی رہبانیت سے، کسی کاہن کو اس کی کہانت سے ہٹایا نہیں جائے گا۔ نہ کوئی شخص ان کے کسی فرد کو نقصان پہنچائے گا، نہ ہی ان پر کسی قسم کی سختی کی جائے گی، نہ ہی کوئی اور ان پر حملہ آور ہو سکے گا۔ ان میں کا جو شخص اپنے کسی حق کا مطالبہ کرے گا، اس کے ساتھ انصاف کیا جائے گا۔ اس طرح کہ ان میں نہ کوئی ظالم ہو گا نہ مظلوم۔ کسی کے جرم کی وجہ سے کسی اور کو گرفتار نہیں کیا جائے گا۔

رسول اللہ کے بعد حضرت صدیق اکبرؓ نے اس معاہدہ کی باقاعدہ تجدید کی اور ایسا ہی حضرت عمرؓ نے بھی کیا لیکن ان کے دورِ خلافت میں، اہلِ نجران نے سازشیں اور بغاوتیں شروع کر دیں تو حضرت عمرؓ نے ان سے کہا کہ وہ شام اور عراق کی طرف منتقل ہو جائیں۔ اس سلسلہ میں انہیں یہ فرمان لکھ کر دیا کہ :۔

ان میں سے جو شخص جانا چاہے وہ ہر طرح سے محفوظ رہے گا اور کوئی مسلمان انہیں کسی قسم کا نقصان نہیں پہنچائے گا۔ رسول اللہ اور ابو بکرؓ کے معاہدات کی سختی کے ساتھ پابندی کی جائے گی۔

انہیں اس امر کی ضمانت دی اور عراق اور شام کے گورنروں کو لکھ کر بھیجا کہ

(۱) جس علاقے میں یہ اہلِ نجران آباد ہوں، انہیں فراخدلی کے ساتھ زمینیں دی جائیں۔

(۲) مسلمان ان کے جان و مال کی پوری پوری حفاظت کریں۔

(۳) کوئی دوسرا بھی ان پر ظلم نہ کرنے پائے۔ اگر اس کی نوبت آ جائے تو مسلمان خود اس کی مدافعت کریں۔

(۴) انہیں دو سال تک سرکاری محاصلات کی معافی دی جائے۔

اسی طرح جب، خیبر کے یہودیوں کو ان کی سازشوں کی وجہ سے دوسری جگہ منتقل کرنا پڑا، تو ان کی تمام غیر منقولہ جائیداد (باغات اور زمینوں) کا حساب لگا کر، رقم ان کے حوالے کر دی۔

(۲) دوسرا عہد نامہ جسے ہم مثال کے طور پر درج کرنا چاہتے ہیں، وہ ہے جسے حضرت عمرؓ نے باشندگانِ ایلیا (بیت المقدس) کو لکھ کر دیا تھا۔ وَھُوَ ھٰذَا۔

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ یہ وہ امان نامہ ہے جو عبداللہ[1] (اللہ کے بندے) عمرؓ امیر المومنین نے اہلِ ایلیاء کو لکھ کر دیا ہے۔

> یہ امان، ان کی جان، مال، گرجا، صلیب، تندرست، بیمار اور ان کے تمام اہلِ مذاہب کے لئے ہے۔ اس طرح پر کہ نہ ان کے گرجاؤں کو ڈھایا جائے گا، نہ انہیں مسکن بنایا جائے گا۔ حتیٰ کہ ان کے احاطے کو بھی کوئی نقصان نہیں پہنچایا جائے گا۔ نہ ان کی صلیبوں یا ان کی جائیدادوں میں کوئی کمی کی جائے گی۔ مذہب کے معاملہ میں ان پر کسی قسم کا جبر نہیں کیا جائے گا، نہ ہی ان میں سے کسی کے ساتھ بدسلوکی روا رکھی جائے گی۔ ایلیا میں ان کے ساتھ یہودی نہیں رہنے پائینگے۔ اہلِ ایلیاء پر فرض ہوگا کہ وہ دیگر شہروں کی طرح جزیہ ادا کریں اور یونانیوں اور چوروں کو اپنے ہاں سے نکال دیں۔ ان یونانیوں میں سے جو شہر سے نکلے گا، اس کی جان اور مال محفوظ رہیں گے تا آنکہ وہ اپنی پناہ گاہ میں پہنچ جائے۔ جو ایلیاء ہی میں رہنا چاہے اسے بھی امن ہوگا بشرطیکہ وہ بھی اہلِ ایلیاء کی طرح جزیہ ادا کرے۔ ایلیاء والوں میں سے جو لوگ یونانیوں کے ساتھ چلے جانا چاہیں ان کے جان، مال اور صلیبوں کی حفاظت کی ضمانت دی جاتی ہے تا آنکہ وہ اپنی پناہ گاہ تک پہنچ جائیں۔ اگر یہ لوگ اپنی فصلوں کے کاٹنے تک یہاں رہنا چاہیں، تو بھی انہیں ہر طرح کا

---

[1] اپنے آپ کو عبداللہ (اللہ کا بندہ، محکوم) کہنا ازرہِ انکسار نہیں۔ یہ عظیم انقلابی اعلان ہے۔ مومن دنیا میں کسی (بڑی سے بڑی) طاقت کا بھی محکوم (عبد) نہیں ہوتا۔ وہ صرف قوانینِ خداوندی کا محکوم ہوتا ہے۔ اسی لئے (قرآنی شہادت کے مطابق) ہر رسول سب سے پہلے اسی عبدیت (صرف خدا کی محکومیت) کا اعلان کر کے دنیا کی ہر طاقت کے خلاف بغاوت کا علم بلند کرتا تھا۔ یہی اعتراف و اعلان ان رسولوں کے متبعین کرتے تھے ــــ خدا کے عبد اور ساری کائنات کے حاکم۔

امن ہو گا۔

جو کچھ اس امان نامہ میں تحریر ہے اس پر خدا اور رسولؐ کا خلفاء کا اور تمام مسلمانوں کا ذمہ ہے۔

اس ذمہ داری کے احساس کا یہ عالم تھا کہ آپ نے حضرت سعدؓ بن ابی وقاص کو ایک مکتوب میں لکھا۔

> اپنے لشکر کو ذمیوں کی بستیوں سے دور ٹھہراؤ اور وہاں صرف وہی لوگ جائیں جن کی دیانت پر تمہیں پورا پورا اعتماد ہو۔ وہاں کے کسی باشندے کو کسی قسم کی تکلیف نہ پہنچائی جاتے کیونکہ ان کی عزت اور حرمت کا تم نے ذمہ لے رکھا ہے اور تم پر اس کی پابندی لازم ہے۔ اہلِ ذمہ پر کسی قسم کا ظلم کر کے، دشمن پر غلبہ حاصل کرنے کی کوشش کبھی نہ کرنا۔

اس دورِ ہمایوں میں، پابندیٔ عہد کی ایسی ایسی مثالیں ملتی ہیں جنہیں دیکھ کر آج کا انسان محوِ حیرت ہو جاتا ہے۔ حضرت

معاہدات کی پابندی کی احتیاط کی انتہا

عبادہ بنؓ صامت، ایک دفعہ دمشق کے ایک گاؤں کے قریب سے گذرے۔ رفیقِ سفر سے کہا کہ گاؤں کے کسی درخت سے مسواک کاٹ لائیے۔ وہ اٹھا ہی تھا کہ آپ نے اسے یہ کہہ کر روک دیا کہ ان کے ساتھ جو معاہدہ ہوا ہے اس میں اس قسم کی کوئی بات طے نہیں ہوئی تھی، اس لئے ہمیں یہاں سے مسواک نہیں لینی چاہیے اسی طرح، حضرت ابو دردؓاء کا جب کسی اہلِ ذمہ کے گاؤں پر سے گذر رہتا اور آپ وہاں پانی پیتے، یا جانور کو چرنے کے لئے چھوڑ دیتے تو روانگی کے وقت، ایک ایک پائی کا حساب کر کے قیمت ادا کر دیتے اور اس میں یہ کہہ کر کچھ زاید بھی شامل کر دیتے کہ ہم ان کے درختوں کے سایہ تلے بھی تو بیٹھے تھے۔ اس آسائش کا بھی معاوضہ دینا چاہیئے۔

اسے نہ بھولئے کہ یہ ان کے مفتوحہ علاقے تھے اور وہاں کے باشندے ان کے محکوم!

ہم نے اوپر لکھا ہے کہ اہل الذمہ اپنے مذہب کے معاملات میں آزاد ہوتے تھے۔ "مذہب" میں ان

اہل الذمہ کے شخصی قوانین

کے عقائد، پرستش اور دیگر مذہبی رسوم ہی شامل نہیں تھے، اس میں ان کے شخصی قوانین (PERSONEL LAWS) بھی شامل تھے اور ان معاملات میں وہ اپنے مقدمات کے فیصلے بھی آپ ہی کر لینے کے مجاز تھے۔ انہیں اپنے رسوم و رواج کی کس حد تک آزادی تھی، اس کا اندازہ اس سے لگایئے کہ جب حضرت عمرؓ شام تشریف لے گئے ہیں تو اذرعات کے عیسائی، باجے بجاتے اور پھول برساتے آپ کے استقبال کے لئے نکلے۔ آپ نے انہیں روکنا چاہا تو حضرت

ابو عبیدہؓ نے آپ سے کہا کہ انہیں ان کے حال پر رہنے دیجئے، رد کیجئے نہیں۔ انہیں ان کے رسوم و رواج کی آزادی ہے۔ (اس سے واضح ہے کہ اگر کسی معاہد قوم کے رسوم و رواج ہمارے دین سے نہیں ٹکراتے تو انہیں اس کی بھی آزادی ہوگی کہ وہ اس کا مظاہرہ خود مسلمانوں کے سامنے بھی کر سکیں) عیسائی اہل الذمّہ کو اس کی بھی اجازت ہوتی تھی کہ وہ اپنی عید کے دن صلیب کا جلوس نکالیں اور دن رات میں جب جی چاہے ناقوس بجائیں، البتہ نماز کے اوقات اس سے مستثنیٰ ہوتے تھے[1]۔

اُن کی زبان

حضرت عمرؓ نے مفتوحہ علاقوں کی دفاتری زبان بھی نہیں بدلی تھی۔ اسلام سے پہلے عراق کا دفتر فارسی زبان میں، شام کا رومی زبان میں اور مصر کا قبطی زبان میں تھا۔ ان ممالک کے فتح ہونے کے بعد، دفاتری کاروبار انہی زبانوں میں باقی رکھا گیا۔

بہرحال، یہ ہے جزیہ کی حقیقت، اور ذمیوں کے ساتھ صدرِ اوّل کی اسلامی حکومتوں کا سلوک! اُس جزیہ کی حقیقت اور ان ذمیوں کے ساتھ سلوک جن کے متعلق غیر مسلم مصنّفین (بالخصوص عیسائیوں) نے اس قسم کا پراپیگنڈہ کر رکھا ہے کہ ان الفاظ کے سنتے ہی، ایک ناواقف کی آنکھوں میں خون اُتر آتا ہے اور وہ مسلمانوں کو دنیا کی وحشی ترین قوم خیال کرنے لگتا ہے۔ یہ کیفیت تھی صدرِ اوّل کے مسلمانوں کی جن کی حکومت اقدارِ خداوندی کے خطوط پر متشکل تھی اور جن کی سیرت حضور نبیٔ اکرمؐ کے اسوۂ حسنہ کے قالب میں ڈھلی ہوئی۔

ان کے بعد، سلاطین نے کیا کیا، اس کا ذمّہ دار نہ اسلام ہے، نہ صدرِ اوّل کے مسلمان۔ اس کے ذمّہ دار

مسلمان بادشاہوں کی روش

وہ خود ہیں — لیکن اس کا کیا علاج کہ ان کے جرائم کی سزا (بے چارے) اسلام کو بھگتنی پڑتی ہے۔ میری اس کوشش کا ایک مقصد یہ بھی ہے کہ صدرِ اوّل کی صحیح تاریخ (یعنی قرآنی معیار کے مطابق صحیح تاریخ) دنیا کے سامنے پیش کی جائے تاکہ اسلام کے دامن سے وہ دھبے دھل سکیں جو ہماری نادانستہ عاقبت نااندیشیوں یا دانستہ مفاد پرستیوں نے اس پر ڈال رکھے ہیں۔ وما توفیقی الا باللہ۔

اس تمہید کے بعد، اب آیئے فتوحات کی طرف لیکن اس سلسلہ میں بھی ایک بنیادی حقیقت کا سمجھ لینا ضروری ہے۔ زیرِ نظر کتاب کا اساسی مقصد حضرت عمرؓ (والّذین معہٗ) کی سیرت کو نمایاں طور پر سامنے لانا ہے۔

---

[1] فقہ کا فیصلہ یہ بھی ہے کہ اگر کوئی مسلمان ان کے خنزیر یا خمر کو ضائع کر دے تو اسے اس کی قیمت ادا کرنی پڑے گی۔

نہ کہ ان کے عہد کی تفصیلی تاریخ مرتب کرنا۔ لہٰذا، (اس عہد کے دیگر گوشوں کی طرح) فتوحات کے سلسلہ میں بھی انہی واقعات کو درج کیا جائے گا جن میں ان حضرات کے حسنِ سیرت و کردار کے کسی نہ کسی گوشے کی جھلک سامنے آتی ہو۔ دیگر جزئیات و تفاصیل کو چھوڑ دیا جائے گا کیونکہ ان تفاصیل کے لئے ضخیم مجلدات کی ضرورت ہوگی۔ ویسے بھی وہ تاریخ کی ہر کتاب میں مل جائیں گی۔ میرا مطمحِ نگاہ، عام وقائع نویسی سے الگ ہے۔ مجھے تو یہ بتانا ہے کہ قوت

لادیں ہو تو ہے زہرِ ہلاہل سے بھی بڑھ کر
ہو دیں کی حفاظت میں تو ہر زہر کا تریاق

سلسلۂ فتوحات

وَاَوْرَثْنَا الْقَوْمَ الَّذِيْنَ كَانُوْا يُسْتَضْعَفُوْنَ
مَشَارِقَ الْاَرْضِ وَمَغَارِبَهَا الَّتِىْ بٰرَكْنَا فِيْهَا (۷/۱۳۷)
اور جس قوم کو انتہائی کمزور کر دیا گیا اور اسے بڑی ناتواں سمجھا جاتا تھا، اسے ہم نے اس بابرکت ملک کے مشارق و مغارب کا مالک بنا دیا۔

عہدِ فاروقی کے سلسلۂ فتوحات کو بنظرِ غائر دیکھنے کے لئے اس کے پسِ منظر پر ایک طائرانہ نگاہ ڈالنا ضروری ہے اور اس پسِ منظر کا نقطۂ آغاز، عہدِ رسالت مآبؐ میں ملے گا۔ اس لئے سلسلۂ کلام وہیں سے شروع ہونا چاہیئے۔

عرب کا جغرافیہ

نقشہ پر نگاہ ڈالئے، محلِ وقوع کے اعتبار سے عرب کے مشرق میں خلیج فارس، جنوب میں بحیرۂ عرب اور مغرب میں بحیرۂ قلزم واقعہ ہے۔ اس اعتبار سے اسے جزیرہ نمائے عرب کہا جاتا ہے لیکن اس کے شمال میں دریائے دجلہ اور فرات بہتے ہیں۔ عربوں جیسی آب نادیدہ اور عطش گزیدہ قوم کے نزدیک، دریا بھی سمندر سے کم نہیں ہوتا۔ چنانچہ ان کے ہاں جس

جگہ بھی کچھ پانی جمع ہو، وہ بحر کہلاتا ہے۔ وہ دریا کو بھی کبھی بحر اور کبھی یم کہہ کر پکارتے ہیں۔ اسی لئے وہ اپنے ملک کو جزیرہ نما نہیں بلکہ جزیرۃ العرب کہتے ہیں۔

ظہورِ اسلام کے وقت، خلیجِ فارس کے اُس پار مجوسیوں کی قدیم اور عظیم سلطنت (ایران) تھی اور شمال میں، عیسائیوں کی وسیع مملکت (بازنطین)۔ رومن ایمپائر (مملکتِ روم) قدیم دنیا کی وسیع و عریض اور نہایت متمدّن مملکت تھی قیصر قسطنطین (CONSTANTINE) نے عیسائیت قبول کر کے، بازنطین کو اپنا دارالخلافہ بنایا جو قسطنطنیہ کے نام سے مشہور ہوا۔ چوتھی صدی عیسوی میں، سلطنت روما دو حصوں میں بٹ گئی تو مغربی حصہ کا دارالخلافہ روم (ROME) قرار پایا۔ اور مشرقی حصہ کا قسطنطنیہ اس (مشرقی مملکت) کو بازنطینی حکومت بھی کہتے ہیں اور اسی سے مسلمانوں کو واسطہ پڑا تھا۔ ویسے مورخین کبھی انہیں رومی کہہ دیتے ہیں اور کبھی بازنطینی۔ بعثتِ نبویؐ کے زمانے میں ہرقل، بازنطینی مملکت کا شاہنشاہ تھا۔ شام، فلسطین اور مصر وغیرہ کے علاقے سب اس کے زیرِ نگیں تھے۔ حدودِ شام پر قدیم عربی قبائل بستے تھے جنہوں نے مذہب عسائیت اختیار کر لیا تھا۔ انہی قبائل کے رؤسا، ہرقل کی طرف سے ان علاقوں کے حکمران تھے۔ انہیں غسانی کہا جاتا تھا۔ مسلمانوں کے جس قدر تصادمات ان علاقوں میں ہوئے، وہ بالواسطہ ہرقل کے ساتھ تھے کہ وہی اس سرزمین کا شاہنشاہ تھا، لیکن بلاواسطہ، غسانی حکمرانوں سے ہوئے، جو وہاں ہرقل کی نیابت کرتے تھے۔

بازنطینی حکومت

ایران اور روم کی سلطنتوں کی باہمی آویزش کا سلسلہ تو ہمیشہ جاری رہتا تھا کہ دونوں برابر کی ٹکر کی طاقتیں تھیں، لیکن عرب، بیرونی مداخلت سے مامون تھا ـــــ اس بے برگ و گیاہ قطعۂ زمین کو لے کر کسی نے کیا کرنا تھا! (البتہ یمن کا علاقہ جو سرسبز و شاداب تھا، ان آویزشوں کی آماجگاہ بنا رہتا تھا) جہاں تک اندرونی نظم و نسق کا تعلق تھا، عرب کبھی ایک مملکت بنا ہی نہیں تھا۔ وہاں کی بیشتر آبادی خانہ بدوش قبائل پر مشتمل تھی، جن کا نظام بھی (سیدھا سادہ) قبائلی تھا۔ ان کی سب سے بڑی خصوصیت یہ تھی کہ یہ کبھی کسی کے محکوم نہیں ہوتے تھے لیکن اس کے ساتھ ہی، سب سے بڑی کمزوری یہ تھی کہ یہ اجتماعی زندگی کے تصور تک سے ناآشنا تھے۔ اسلام نے نہ صرف انہیں اجتماعی زندگی سے آشنا کیا بلکہ پورے ملک کو ایک مملکت میں تبدیل کر دیا اور جب یہ ملک ایک مملکت کی شکل اختیار کر گیا تو ظاہر ہے کہ اس کا وجود، ایران اور روم (بازنطین) دونوں کی نگاہوں میں کھٹکنے لگا۔

جن لوگوں کی نگاہیں تاریخ پر ہیں وہ جانتے ہیں کہ سلطنتِ ایران اور روم[1] (اور ان کے مقبوضہ علاقوں) کی غریب، کمزور، محنت کش رعایا پر کس قدر مظالم توڑے جاتے تھے۔ وہ کیسی بے کسی اور کسمپرسی کی انسانیت سوز زندگی بسر کرنے پر مجبور تھے۔ حضور نبیٔ اکرم

عہدِ رسالتمآب میں

جب اندرونِ عرب نظامِ امن و اطمینان قائم کر چکے، تو آپؐ نے ان سلطنتوں کے فرمانرداؤں اور ان کے زیرِ اقتدار حکمرانوں کے نام پیاماتِ امن و اصلاح ارسال فرمائے۔ (ان کی تفصیل کا یہ مقام نہیں) جہاں تک حدودِ شام کے حکمرانوں کا تعلق ہے، تاریخ میں دو روایات سامنے آتی ہیں۔ ایک یہ کہ آپؐ نے ذات اَطلح کے مقام پر پندرہ نفوس پر مشتمل ایک وفد بھیجا لیکن انہوں نے، ان کے رئیس کے سوا سب کو قتل کر دیا، حالانکہ قاصدوں کا قتل، خود ان کے سیاسی اصولوں کی رُو سے بھی جائز نہیں تھا۔ دوسری روایت یہ ہے کہ آپؐ نے قیصر کے نام ایک خط لکھا جسے شام کے سرحدی علاقہ کے حکمران ـــ شرجیل بن عمرو ـــ کی وساطت سے قیصر تک پہنچانے کا اہتمام کیا۔ شرجیل نے آپؐ کے نامہ بر (حضرت حارث بن عمیرؓ) کو قتل کر دیا۔ یہ اس کی ایسی خلافِ ضابطہ و قانون حرکت تھی جسے ایک عالمگیر امن کی داعی مملکت کبھی برداشت نہیں کر سکتی تھی۔ چنانچہ اس کے قصاص کے لئے حضورؐ کو فوج کشی کرنی پڑی۔ یہ پہلی مہم تھی جو اپنی مملکت سے باہر وقوع پذیر ہوئی۔ حضورؐ کے آزاد کردہ غلام (حضرت زیدؓ بن

جنگِ موتہ ۸ھ ۶۲۹ء

حارث) اس فوج کے سپہ سالار تھے، اور حضرت خالد بن ولیدؓ پہلی بار اسلامی فوج میں رضاکارانہ طور پر سپاہی کی حیثیت سے شریک ہوئے تھے۔ اُدھر شرجیل نے کم و بیش ایک لاکھ فوج مقابلہ کے لئے تیار کی اور اس کے ساتھ ہی خود ہرقل، قبائلِ عرب کی ایک کثیر فوج ساتھ لے کر کمک کے لئے پہنچ گیا۔ اس سے اندازہ لگ سکتا ہے کہ رومی سلطنت کے نزدیک، اس

---

[1] اہلِ روما کے متعلق مشہور مغربی مؤرخ، ہنری تھامس ہیکل لکھتا ہے:۔

> پانچویں صدی کے آخر میں جب سلطنتِ روما کا شیرازہ بکھرا ہے تو اس کے بعد اس قوم پر جہالت اور جرائم کا ایک طویل عرصہ گزرا جسے بجا طور پر زمنۂ تاریک کہا جا سکتا ہے۔ حالت یہ تھی کہ اس زمانے میں اس قوم کے بڑے بڑے دانشور بھی توہم پرستیوں میں ڈوبے ہوئے تھے۔ اقتدار کلیۃً پادریوں کے ہاتھ میں تھا۔ حتیٰ کہ بڑے بڑے جابر حکمرانوں کے ضمیر پر بھی انہی کا قبضہ تھا۔ (ہسٹری آف سولیزیشن ان انگلینڈ، جلد دوم، ص ۱۰۸)

ایران کی حالت جس قدر ابتر تھی اس کے لئے براؤن کی تاریخِ فارس زندہ شہادت ہے۔

سب سے پہلے تصادم کی اہمیت کس قدر تھی، اور عربوں کی اس نوزائیدہ مملکت کو وہ کن نگاہوں سے دیکھتے تھے۔
مؤتہ کے مقام پر جنگ ہوئی اور اسلامی فوج کے تین جید سپہ سالار، حضرت زید بن حارثؓ، حضرت جعفر طیارؓ اور حضرت عبداللہ بن رواحہؓ یکے بعد دیگرے شہید ہوگئے۔ حضرت خالدؓ نے یہ دیکھا تو فوج کی رضامندی سے کمان اپنے ہاتھ میں لے لی۔ انہوں نے اندازہ لگا لیا کہ دشمن کا مقابلہ مشکل ہے اس لئے اس وقت اپنی فوج کو بچا کر لے جانا ہی دانشمندی اور مصلحت اندیشی ہے۔ چنانچہ انہوں نے ایسا ہی کیا اور بکمال حسنِ تدبر، باقیماندہ فوج کو بعافیت مدینہ واپس لے آئے۔ یہ ۸ھ کا واقعہ ہے۔

جیوشِ اسلامیہ کی اس پسپائی سے رومیوں کے حوصلے بہت بلند ہوگئے اور انہوں نے اسی وقت سے

تبوک کی مہم ۹ھ ۶۳۰ء

جارحانہ تیاریاں شروع کردیں۔ رجب ۹ھ میں، مدینہ میں یہ خبر پھیل گئی کہ رومیوں کا لشکر حملہ کرنے کے لئے آرہا ہے۔ حضورؐ نے حالات کا جائزہ لے کر فیصلہ فرمایا کہ دشمن کے حملہ کا انتظار کرنے کے بجائے بہتر یہ ہے کہ اس کی طرف سبقت کی جائے۔ مہم کی اہمیت کے پیشِ نظر، حضورؐ نے فوج کی کمان خود سنبھالی اور لشکر، شام کی طرف روانہ ہوگیا۔ **تبوک** کے مقام پر (جو مدینہ اور دمشق کی قریب نصف مسافت پر واقعہ ہے) معلوم ہوا کہ وہ خبر غلط تھی۔ وہاں آپؐ نے قریب بیس روز تک قیام فرمایا، اور گرد و نواح کے رؤسا کے ساتھ امن و اطاعت کے معاہدات کرکے، واپس تشریف لے آئے۔

تبوکؔ کی مہم کے وقت یہ خبر تو بے شک غلط ثابت ہوئی کہ رومی، مدینہ پر حملہ کرنے کے لئے آرہے تھے لیکن یہ حقیقت تھی کہ وہ ہر وقت اس گھات میں تھے کہ جب بھی موقعہ ملے، اس نوزائیدہ خطرہ (اسلامی مملکت) کو ہمیشہ کے لئے ختم کردیا جائے۔ چنانچہ اس قسم کی خبریں اکثر آتی رہتی تھیں۔ ان حالات کے پیشِ نظر حضورؐ نے ضروری سمجھا کہ اپنی سرحدوں کی حفاظت اس انداز سے کی جائے کہ یہ آئے دن کے خطرات و خدشات باقی نہ رہیں۔

لشکرِ اسامہ بن زیدؓ ۱۱ھ ۶۳۲ء

چنانچہ جب آپؐ حجتہ الوداع سے فارغ ہوکر مدینہ تشریف لائے، تو آپؐ نے ایک جرار لشکر کی تیاری کا حکم دیا۔ لشکر تیار ہوا تو آپؐ نے اس کی سپہ سالاری کے لئے (حضرت زید بن حارثؓ کے بیٹے) حضرت اسامہؓ کو منتخب فرمایا ــــ یعنی دنیا کے عام الفاظ میں، ایک غلام ابنِ غلام کو، اُس لشکر کا سپہ سالار مقرر فرمایا جس میں حضرت ابوبکرؓ و عمرؓ جیسے اولوالعزم صحابہؓ بطور سپاہی شریک تھے۔ لشکر کی روانگی کے انتظامات ہنوز مکمل بھی ہونے نہ پائے تھے کہ حضورؐ علیل ہوگئے اور یہ علالت اس قدر شدت اختیار کرگئی کہ لشکر کی روانگی ملتوی کرنی پڑی۔ اسی علالت میں

حضورؐ دنیا سے تشریف لے گئے اور حضرت اسامہؓ کا لشکر روانہ نہ ہو سکا۔ اس کے بعد کیا ہوا، اس کے لئے ہم عہدِ صدیقیؓ میں داخل ہوتے ہیں۔

(۷)

عہدِ صدیقیؓ

سنہ ۱۱ھ بمطابق سنہ ۶۳۲ء

حضرت ابوبکر صدیقؓ نے خلافت کی ذمہ داریاں سنبھالنے کے بعد پہلا کام یہی کیا کہ حضرت اسامہؓ کے لشکر کو روانگی کا حکم دے دیا۔ اس لشکر نے اس مقام کے قریب جا کر ڈیرے ڈال دیئے جہاں جنگِ موتہ ہوئی تھی۔

حضرت اسامہؓ کی مہم سنہ ۱۱ھ

ان کے مقابلہ کے لئے دشمن کا کوئی لشکر سامنے نہ آیا تو انہوں نے سرحدی علاقوں پر دھاوے بول دیئے۔ اس میں انہیں نمایاں کامیابی ہوئی اور وہ اس اعتبار سے فاتح و منصور واپس آئے۔ اس سے ایک طرف جیوشِ اسلامیہ کے حوصلے بلند ہو گئے اور دوسری طرف سرحدی علاقوں میں ان کی دھاک بیٹھ گئی۔

اُدھر حضرت اسامہؓ کا لشکر شام کی جانب روانہ ہوا، اور اِدھر اندرونِ ملک، مختلف بدوی قبائل نے علمِ بغاوت بلند کر دیا۔ آپ سورۃ حجرات کی اس آیت (۴۹/۱۴) کو ایک بار پھر سامنے لایئے جس میں کہا گیا تھا کہ ان بدوؤں سے کہدو کہ، یہ نہ کہیں کہ ہم ایمان لے آئے ہیں، یہ سرِدست اتنا ہی کہیں کہ ہم نے اسلامی مملکت کے سامنے سرِ تسلیم خم کر دیا ہے۔ ابھی، ایمان ان کے دل کی گہرائیوں میں نہیں اترا۔ یہی وہ غیر تربیت یافتہ "نو مسلم" قبائل تھے جنہوں نے رسول اللہ کی وفات کے بعد، یہ سمجھ کر کہ مملکت کا استحکام حضورؐ کی ذات سے وابستہ تھا مرکز سے

اندرونی بغاوتیں

بغاوت شروع کر دی۔ یہی تھے وہ باغی جنہیں تاریخ میں "مرتدین" کہا جاتا ہے اور چونکہ ان کی طرف سے بغاوت کی علامت یہ تھی کہ وہ مرکزی حکومت کے واجبات کی ادائیگی سے انکار کرتے تھے، اس لئے انہیں "مانعینِ زکوٰۃ" بھی کہا جاتا ہے۔ (اس سے زکوٰۃ کا مفہوم سمجھ میں آجائے گا یعنی زکوٰۃ، حکومت کے واجبات تھے جنہیں حکومت کے خزانے ہی میں جمع کرانا تھا۔ بغاوت یہ تھی کہ وہ قبائل ان واجبات کو مرکزی حکومت کے خزانہ میں جمع نہیں کرانا چاہتے تھے چونکہ اس آمدنی کا مقصد

افرادِ معاشرہ (اور اس کے بعد عالمگیر انسانیت) کے لئے سامان نشوونما بہم پہنچانا تھا، اس لئے اُسے زکوٰۃ کہتے تھے (زکوٰۃ کے معنی نشوونما ہیں) ضمناً یہ جو ہمارے ہاں کہا جاتا ہے کہ اسلام میں "مرتد" کی سزا قتل ہے، تو اس میں "مرتد" سے مراد حکومت کا باغی ہے نہ کہ مذہب تبدیل کرنے والا۔ (جیسا کہ پہلے بیان کیا جا چکا ہے) قرآن کی رُو سے، ہر شخص کو اس امر کی آزادی حاصل ہے کہ وہ جونسا مذہب جی چاہے قبول کرے اور جس مذہب کو چاہے چھوڑ دے۔ جب دین میں اکراہ (جبر) نہیں تو مذہب کی تبدیلی پر سزا کیسی؟ بہرحال، یہ تھے وہ قبائل، جنہوں نے حکومت کے خلاف سرکشی اور بغاوت اختیار کی، اور یہ آگ دُور دُور تک پھیل گئی۔ انہی قبائل میں بعض زیرک اور فطین ایسے بھی تھے جنہوں نے دیکھا کہ نبی اکرمؐ نے دعویٰ نبوّت کیا، تو انہیں اس قدر عظیم مملکت حاصل ہو گئی۔ اس سے وہ اس زعمِ باطل میں مبتلا ہو گئے کہ جو شخص بھی دعوائے نبوّت کرے اسے مملکت حاصل ہو سکتی ہے۔ چنانچہ قبیلہ بنی حنیفہ میں مسیلمہ اور قبیلہ بنی اسد میں، طلیحہ نے دعوائے نبوّت کر دیا ـــــ حتیٰ کہ ایک عورت، سجاح نے بھی۔ (بعد میں مسیلمہ اور سجاح کی شادی ہو گئی تھی ـــــ پہنچی وہیں پہ خاک جہاں کا خمیر تھا) چونکہ ہمارے پیشِ نظر عہدِ صدّیقی کے کوائف و احوال کا تفصیلی تذکرہ نہیں، اس لئے ہم ان بغاوتوں اور ان کے فرو کرنے کی مہموں کی تفصیل میں نہیں جانا چاہتے۔ صرف اتنا کہہ دینا کافی ہوگا کہ ان کے فرو کرنے کے بعد ملک میں دوبارہ امن و سکون پیدا کرنے میں قریب ایک سال کا عرصہ لگ گیا۔ اس لئے اس دوران میں، خارجی معاملات کی طرف توجّہ دینے کی فرصت اور مہلت نہ مل سکی۔ حضرت خالدؓ بن ولیدؓ نے ان مہمات کے سر کرنے میں نمایاں خدمات سرانجام دیں۔ اس میں جنگ یمامہ کو خاص شہرت حاصل ہے۔

اس کے بعد آپ خارجی امور کی طرف آیئے۔

ـــــــــ (۵) ـــــــــ

پہلے لکھا جا چکا ہے کہ اسلامی مملکت (عرب) کی شمالی سرحدوں (شام، فلسطین، عراق وغیرہ) میں عربی قبائل آباد تھے جنہوں نے عیسائی مذہب اختیار کر رکھا تھا۔ شام اور فلسطین، رومی (بازنطینی) سلطنت کے زیرِ اقتدار تھے، اور عراق، ایرانی سلطنت کے قبضہ میں۔ شام اور فلسطین پر، رومیوں کی طرف سے غسّانی حکمران تھے اور عراق کا اقتدار حیرہ کے حاکم کے ہاتھ میں تھا۔ اس وضاحت کی ضرورت اس لئے پیش آئی کہ آگے چل کر انہی حکمرانوں کے ساتھ تزاحمات ہمارے سامنے آئیں گے۔

عراق کی سرحدوں پر جن بدوی قبائل نے اسلامی مملکت کے خلاف بغاوت کی تھی، ایرانی حکومت انہیں بھڑکا بھی رہی تھی اور ان کی مدد بھی کرتی تھی لیکن ان کا مقابلہ وہیں کے مخلص مسلمانوں نے کیا اور اس میں ایسی نمایاں کامیابی حاصل کی کہ باغی قبائل تو ایک طرف، خود ایرانی حکومت پر بھی ان کا دبدبہ چھا گیا۔ بحرین کے قبیلہ بکر بن وائل کا ایک مردِ مجاہد — مثنیٰ بن حارث — ان کا سردار تھا۔ وہ وہاں کی بغاوت فرو کرنے کے بعد مدینہ حاضر ہوا اور عراق کے مظلومین کی حالتِ زار خلیفہ سے بیان کی۔ حضور نبئ اکرمؐ نے جو پیغامات روم اور ایران کے شاہنشاہوں کے نام بھیجے تھے، ان میں تحریر فرمایا تھا کہ اگر تم لوگوں نے امن و سلامتی کی راہ اختیار نہ کی، تو تمہاری مملکت کے کاشتکاروں اور محنت کشوں پر جو مظالم ہو رہے ہیں، ان کی ذمہ داری تمہارے سر پر عائد ہوگی۔ مثنیٰؓ نے حضرت ابوبکرؓ کو بتایا کہ عراق کے کاشت کاروں کی حالت یہ ہے کہ بیچارے سال بھر محنت کرتے رہتے ہیں اور جب ان کی فصلیں پک کر تیار ہو جاتی ہیں، تو ایرانی زمیندار سارا غلّہ سمیٹ کر لے جاتے ہیں اور انہیں خیرات کے طور پر چند ٹکے دے دیتے ہیں۔ ہم پر لازم ہے کہ ہم ان ستم رسیدگان کی مدد کریں۔

ایرانیوں کے ساتھ تصادم

آپ دیکھئے کہ قرآنِ کریم نے جنگ کے لئے جو شرائط عائد کی تھیں ان میں سے دو اہم شرطیں یہیں پوری ہو گئیں — یعنی مملکتِ اسلامیہ کی سرحدات کی حفاظت اور مظلومین کی امداد۔ بنا بریں، حضرت صدیق اکبرؓ نے مثنیٰؓ کو جنگ کی اجازت دیدی، اور اس کی مدد کے لئے، حضرت خالد بن ولیدؓ کو بھیجا۔ ایرانیوں کی طرف سے ہرمز اس علاقہ کا حاکم تھا اور اردشیر اس زمانے میں ایران کا شاہنشاہ۔ جیوشِ اسلامیہ کا مختلف مقامات پر، ایرانیوں کے ساتھ مقابلہ ہوا اور انہوں نے ہر معرکہ میں نمایاں کامیابی حاصل کی۔ سب سے بڑا معرکہ کاظمہ کے مقام پر ہوا جس میں ہرمز قتل ہو گیا اور مسلمانوں کو فتح عظیم حاصل ہوئی۔ اس کے بعد حیرہ بھی فتح ہو گیا، جسے مفتوحہ علاقہ کا دارالحکومت بنایا گیا۔ یہ اسلامی مملکت کا پہلا دارالحکومت تھا جو جزیرۃ العرب کے باہر قائم کیا گیا۔

حضرت خالدؓ اور مثنیٰؓ

جنگ کاظمہ ۱۲ھ / ۶۳۳ء

(٥)

جس زمانے میں اسلامی لشکر، عراق کی مہمات میں مصروف تھا، ہرقل اسلامی مملکت پر حملہ کی غرض سے شام کی سرحدات پر لشکرِ جرار جمع کر رہا تھا۔ ایرانیوں کی طرف سے مطمئن ہو جانے کے بعد مملکتِ اسلامیہ

رُومیوں سے ٹکراؤ

کی توجہ رومیوں کے خطرہ کی طرف منعطف ہوگئی۔ شام کی سرحدوں پر جو اسلامی فوج متعین تھی، اس کے کمانڈر، خالد بن سعید بن عاص تھے... لیکن وہاں کامیاب ثابت نہ ہوئے تو حضرت ابوبکرؓ نے اس مہم کی اہمیت کے پیشِ نظر، مختلف سرکردہ سپہ سالاروں کی زیرِ قیادت، کثیر افواج شام کی طرف روانہ کر دیں ___ حضرت ابوعبیدہؓ، عمرو بن عاصؓ، یزید بن ابی سفیان وغیرہ ___ اور ان کے بعد حضرت خالد بن ولیدؓ کو بھی اُدھر منتقل کر دیا جو اس وقت عراق میں تھے۔

یرموک کا معرکہ اور فتح، اسلامی تاریخ کا درخشندہ کارنامہ ہے۔ اس سے رومیوں کی کمر ٹوٹ گئی۔ اسی کا

جنگِ یرموک ۱۳ھ ۶۳۴ء

نتیجہ تھا کہ یہاں سے فارغ ہونے کے بعد جیوشِ اسلامیہ نے دمشق کا رُخ کیا اور اس کا محاصرہ کر لیا اور پھر دمشق بھی فتح ہوگیا۔ اس طرح کہ جب اس کے مشرقی دروازہ سے خالد بن ولیدؓ بطورِ فاتح داخل ہوئے، تو دوسری طرف رومی سپہ سالار نے حضرت ابوعبیدہؓ سے

فتحِ دمشق ۱۳ھ ۶۳۴ء

صلح کر لی۔ بعد میں یہ سوال سامنے آیا کہ شہر کو مفتوحہ تصور کیا جائے یا معاہد ___ اور فیصلہ یہ ہوا کہ جب جیوشِ اسلامیہ میں سے کسی ایک نے بھی معاہدہ کر لیا ہو تو اس معاہدہ کو تسلیم کرنا، سارے لشکر پر لازم قرار پا جاتا ہے۔

اور ابھی دمشق کا محاصرہ جاری تھا کہ حضرت ابوبکرؓ کا انتقال ہوا۔

(۵)

ہم دیکھ چکے ہیں کہ حضرت خالد بن ولیدؓ اور مثنّٰیؓ بن حارث، دونوں عراق میں تھے۔ جب حضرت خالدؓ شام کی مہم سر کرنے کے لئے روانہ ہوئے، وہ نصف فوج اپنے ساتھ لے گئے تھے اور باقی نصف عراق کی حفاظت کے لئے مثنّٰیؓ کے زیرِ قیادت تھی۔ ایرانیوں نے اس موقعہ کو غنیمت سمجھا اور ایک کثیر لشکر عراق پر چڑھائی کرنے کی غرض سے بھیجدیا۔ وہ لشکر ابھی وہاں سے روانہ ہوا ہی تھا کہ مثنّٰیؓ نے پیشقدمی کی اور (ایران کے دارالسلطنت) مدائن سے پچاس میل دُور، بابل کے کھنڈرات کے قریب، ایک اونچے مقام پر خیمہ زن ہوگئے۔ جب ایرانی لشکر

مثنّٰیؓ کا ایرانیوں کیساتھ ٹکراؤ

وہاں پہنچا تو عساکرِ اسلامیہ نے اسے ایسی شکستِ فاش دی کہ انہوں نے بدحواس ہو کر بھاگنا شروع کر دیا اور مجاہدین نے مدائن کے دروازے تک ان کا تعاقب کیا۔ مثنّٰیؓ جانتے تھے کہ اگر اسلامی فوج نے ایک ہلہ اور بول دیا تو ایران ان کے قبضے میں ہوگا لیکن یہ معاملہ بڑا اہم تھا۔ اس کے لئے وہ خود مدینہ آئے۔ اس وقت حضرت ابوبکر صدیقؓ

زندگی کے آخری سانس لے رہے تھے اور حضرت عمرؓ کو اپنا جانشین مقرر کر چکے تھے۔ انہوں نے اپنی آخری وصیت کی رُو سے اس معاملہ کو حضرت عمرؓ کے سپرد کیا اور پورے اطمینان اور سکون کے ساتھ دنیا سے تشریف لے گئے۔

اس مقام پر ہم اسلام کے اس بطلِ جلیل، "اس ثانی اسلام و غار و بدر و قبر"، اس خلوص و دیانت کے مجسمہ، اس کوہ آسا عزم و ہمت کے پیکر کی بارگاہِ عظمت مآب میں باصد نیاز، ہدیۂ احترام و عقیدت پیش کرنے کے لئے رُکتے ہیں جو رسول اللہ کی وفات کے بعد، خلفشار و انتشار کی تلاطم خیزیوں اور سرکشیوں اور بغاوتوں کی طوفان انگیزیوں میں روشنی کے مینار کی طرح، ثبات و استقامت کی محکم چٹان بن کر کھڑے رہے، اور اسلام کی کشتی کو، بہ خیر و عافیت ساحلِ مراد تک پہنچا کر، اپنے رفیقِ اعلےٰ سے جا ملے۔

نرم دمِ گفتگو، گرم دمِ جستجو ∴ رزم ہو یا بزم ہو، پاک دل و پاکباز

اُولٰٓئِكَ عَلَيْهِمْ صَلَوٰتٌ مِّن رَّبِّهِمْ وَرَحْمَةٌ

اس مقدس فریضہ کی ادائیگی کے بعد ہم عہدِ فاروقیؓ کی حدود میں قدم رکھتے ہیں۔

پا ایم بہ پیش از سرِ ایں کو، نمی رود
یاراں خبر دہید کہ ایں جلوہ گاہ کیست

عہدِ فاروقیؓ

جمادی الآخر ۱۳ھ، بمطابق اگست ۶۳۴ء

حضرت عمرؓ حضرت ابوبکر صدیقؓ کی تجہیز و تکفین کے بعد گھر آئے تو عراق کے متعلق حضرت صدیق اکبرؓ کی وصیت ان کے ذہن میں تھی۔ وہ ساری رات اس معاملہ پر غور کرتے رہے۔ دو تین دن کے غور و تدبر اور صحابہؓ کے ساتھ مشورہ کے بعد بالآخر یہی طے پایا کہ ایران کی قوت کا توڑنا از بس ضروری ہے۔ بنا بریں، آپؓ نے مثنیٰؓ کو فی الفور واپس بھیج دیا کہ وہ وہاں جا کر جنگ کی تیاری کریں۔ اس کے ساتھ ہی آپ نے حضرت ابو عبیدہؓ بن

مسعود الثقفی سے کہا کہ وہ ایک لشکرِ جرار تیار کریں اور اس کے سپہ سالار کی حیثیت سے مثنیٰؓ کے ساتھ جا ملیں۔ چنانچہ وہ ایک مہینے کے بعد وہاں پہنچے۔ اب ہم اس دور میں داخل ہوتے ہیں جس میں مملکتِ اسلامیہ کا ایران کے ساتھ فیصلہ کُن ٹکراؤ ہوتا ہے ـــ یہ دَور، مسلمانوں کی تاریخ ہی میں نہیں بلکہ اقوامِ عالم کی تاریخ میں عظیم اہمیت کا حامل ہے۔ اس سے دنیا کا نقشہ بدل گیا۔

ایران کی سلطنت کا چوتھا دَور، جو ساسانیوں کا عہد کہلاتا ہے، نوشیرواں عادل کی وجہ سے بہت مشہور ہے۔ نبئ اکرمؐ کے زمانے میں، نوشیرواں کا پوتا، خسرو پرویز تخت نشین تھا۔ اس کے زمانے تک یہ سلطنت بڑی طاقتور رہی لیکن اس کے مرنے کے بعد مملکت میں سخت تباہی پھیل گئی۔ اس کے بیٹے شیرویہ نے کل آٹھ مہینے حکومت کی اور اپنے تمام بھائیوں کو جو کم و بیش پندرہ تھے، قتل کر دیا۔ اس کے بعد اس کا بیٹا

تختِ ایران کی ابتری

اُردشیر تخت پر بیٹھا جس کی عمر سات برس تھی۔ ڈیڑھ سال کے بعد ایک افسر نے اسے قتل کر دیا اور خود بادشاہ بن بیٹھا۔ چند روز بعد درباریوں نے اسے قتل کر کے جوان شیر کو تخت نشین کیا۔ وہ ایک برس کے بعد مر گیا۔ اب خاندان میں یزدگرد کے سوا (جو اس وقت بچہ تھا) کوئی اولادِ ذکور باقی نہ رہی تو پوران دخت کو اس شرط پر تخت پر بٹھا دیا کہ جب یزدگرد سنِ شعور کو پہنچے گا تو وہی تخت کا مالک ہوگا۔ چنانچہ جس سال (۱۳ھ) حضرت عمرؓ نے زمامِ خلافت سنبھالی اسی سال یزدگرد سنِ بلوغت کو پہنچ کر ایران کے تخت پر بیٹھا تھا۔ اس وقت اس کی عمر سولہ سال اور بعض روایات کی رو سے اٹھارہ سال کی تھی۔ (ہم نے اس کی عمر کی تصریح کیوں کی ہے، اس کی وجہ ذرا آگے چل کر سامنے آئے گی)۔ رُستم اس کا وزیرِ اعظم اور وزیرِ جنگ تھا۔

رُستم نے جو جرار لشکر مسلمانوں کے مقابلہ کے لئے بھیجے، ان میں سے ایک کا سپہ سالار جابان تھا جس

ایرانیوں کے ساتھ ٹکراؤ

کا (نمارق کے مقام پر) اسلامی لشکر سے مقابلہ ہوا۔ ایرانیوں کو شکست ہوئی اور جابان کو ایک مسلمان سپاہی نے گرفتار کر لیا۔ (اسے معلوم نہیں تھا کہ اس کا قیدی کون ہے) جابان نے اس سے کہا کہ تم مجھے گرفتار یا قتل کر کے کیا کرو گے؟ یہ لو دو غلام اور مجھے امان دے دو۔ اس نے اسے امان دے دی۔ وہ چھوٹ کر چلا تو ایک اور سپاہی نے اسے پہچان لیا اور گرفتار کر کے اپنے سپہ سالار (حضرت ابو عبیدہؓ) کے پاس لے آیا۔ جابان نے حضرت ابو عبیدہؓ سے کہا کہ مجھے تمہارے فلاں سپاہی نے امان دے دی ہے۔ آپ نے اسے بلا کر پوچھا تو اس

ایک سپاہی کے عہد کی سب پر پابندی

نے اس بات کی تصدیق کر دی۔ حضرت ابوعبیدہؓ کے ساتھیوں نے کہا کہ اسے قتل کر دیجئے۔ یہ ایرانی فوج کا سپہ سالار ہے۔ آپ نے فرمایا کہ سپہ سالار ہے تو پھر کیا۔ جب اسے ایک مسلمان نے امان دے دی ہے تو اس امان کی پاسداری تمام مسلمانوں پر فرض ہو گئی ہے۔ اس لئے اب اسے کچھ نہیں کہا جا سکتا اور اسے رہا کر دیا۔

عراقی سرداروں کے ساتھ معاہدات

مسلمانوں کی اسی کامیابی کا اثر تھا کہ عراق کے مختلف سرداروں نے حضرت ابوعبیدہؓ سے صلح کے معاہدے کر لئے۔ یہی وہ سردار تھے جنہوں نے حضرت ابوعبیدہؓ کی وہ دعوت کی تھی جس میں انواع و اقسام کے کھانے دسترخوان پر چنے گئے تھے لیکن جنہیں، حضرت ابوعبیدہؓ نے یہ کہہ کر چھونے سے انکار کر دیا تھا کہ جب تک عام لشکر کے لئے اسی قسم کے کھانوں کا اہتمام نہیں کیا جائے گا، میں انہیں ہاتھ نہیں لگا سکتا۔

اور یہی وہ مقام تھا جہاں اسلامی لشکر نے وہ اعلیٰ درجہ کی کھجوریں جو ایرانی بادشاہوں کے لئے مخصوص ہوتی تھیں، ان کاشتکاروں میں بانٹ دی تھیں، جن کی محنت کے پسینے سے وہ کھجوریں اگتی اور پکتی تھیں۔

یہ تھے اسلامی لشکر کے سپاہی اور وہ تھا ان کا سپہ سالار! اور اسی میں تھا ان کی فتوحات کا سارا راز ـــ ان فتوحات کا جن کے تصور سے تاریخ کی آنکھیں حیران اور ششدر رہ جاتی ہیں۔

خوشا وہ قافلہ جس کے امیر کی ہے متاع
تخیلِ ملکوتی و جذبہ ہائے بلند

معرکہ جسر (پل)

ایرانی، اپنی شکست کا انتقام لینے کے لئے، تازہ دم لشکر لے کر پھر میدان میں آ گئے۔ اس دفعہ مقابلہ دریائے فرات کے کنارے ایک پُل پر ہوا (اسی نسبت سے اسے معرکہ جسر کہتے ہیں) ایرانیوں کے ساتھ بہت سے جنگی ہاتھی بھی تھے۔ اس مقام پر، کمانڈر کی ایک تدبیری غلطی سے نہ صرف یہ کہ مسلمان فوج کو شکست ہوئی بلکہ ان کا بہت زیادہ نقصان بھی ہوا ـــ اس میں سب سے زیادہ اور ناقابلِ تلافی نقصان،

حضرت ابوعبیدہؓ ثقفی کی شہادت ۱۳ھ ۶۳۴ء

حضرت ابوعبیدہؓ کی شہادت تھی، جنہیں دشمن کے ایک ہاتھی نے کچل دیا تھا۔

یہی وہ معرکۂ جسر تھا جس کے شکست خوردہ سپاہی جب مدینہ پہنچے ہیں تو مارے شرم کے کسی کو منہ نہیں دکھاتے تھے لیکن حضرت عمرؓ نے ان کی بکمال شفقت و رافت حوصلہ افزائی فرمائی تھی۔

اس شکست کے باوجود مثنیٰؓ نے ہمت نہ ہاری اور جب بویب کے مقام پر ایرانیوں سے پھر مقابلہ ہوا

معرکۂ بویب

تو انہیں ایسی استخواں شکن شکست دی جس کی صدائے بازگشت نے مدائن کے در و دیوار تک کو ہلا دیا اور ایرانیوں نے فیصلہ کر لیا کہ اب عربوں سے فیصلہ کن جنگ کی جانی ضروری ہے۔ ابنِ خلدون کی روایت ہے کہ اس جنگ میں ایرانیوں کے قریب ایک لاکھ سپاہی کام آئے اور مسلمانوں کے صرف ایک سو مجاہد شہید ہوئے۔

بویب کی فتح سے مدینہ میں خوشی کی لہر دوڑ گئی لیکن جب ان تک ایرانیوں کی تازہ تیاریوں کی اطلاع پہنچی تو اس سے بڑی تشویش بھی لاحق ہوئی۔ چنانچہ اس مقصد کے لئے ایک تازہ لشکر تیار کیا گیا۔ یہی وہ لشکر تھا جس کے متعلق حضرت عمرؓ نے فیصلہ کیا تھا کہ وہ بہ حیثیتِ سپہ سالار خود میدانِ جنگ میں جائیں گے لیکن آپ کے دیگر مشیروں نے آپ کو اس سے روک دیا تھا۔ آپ کی جگہ حضرت سعد بن ابی وقاصؓ سپہ سالار منتخب ہوئے۔

مثنیٰؓ کی وفات ۱۳ھ / ۶۳۴ء

مثنیٰؓ کو معرکۂ جسر میں ایک کاری زخم لگا تھا۔ وہ حضرت سعدؓ کا انتظار کر رہے تھے کہ اس زخم کی وجہ سے ان کا انتقال ہو گیا۔ اب ایرانیوں کا مقابلہ حضرت سعدؓ بن ابی وقاص سے تھا۔

لیکن قبل اس کے کہ ہم اگلے معرکہ تک پہنچیں، ضروری ہے کہ ہم مثنیٰؓ جیسے مردِ جلیل کی یادگار میں ہدیۂ تہنیت کے لئے رُک جائیں۔ یہ نہ قریشی تھے نہ رسول اللہؐ کے صحابی لیکن حضورؐ نے مومن کی زندگی کے سلسلہ میں جو فرمایا تھا کہ "جب جہاد ہو رہا ہو تو وہ اس میں شریک ہو اور جب نہ ہو رہا ہو تو اس کی تیاریوں میں مصروف"۔ تو ان کی ساری زندگی اس کی زندہ شہادت تھی۔ خدا کی ہزار ہزار رحمتیں ہوں مثنیٰؓ پر، اور ان کے رفیقِ جلیل حضرت ابو عبیدہؓ پر، جن کی جرأت و بسالت کے صدقے اسلام کو ایسا قابلِ فخر غلبہ حاصل ہوا۔

بنا کردند خوش رسمے بخاک و خون غلطیدن
خدا رحمت کند ایں عاشقانِ پاک طینت را

=== (۰) ===

حضرت سعدؓ وہاں پہنچے ہی تھے کہ فاروقِ اعظمؓ کا فرمان پہنچا کہ اپنے لشکر کو لے کر قادسیہ کی طرف

بڑھو ___ وہ قادسیہ کہ جسے تاریخِ انسانیّت کا عظیم موڑ کہا جائے تو قطعاً مبالغہ نہیں ہوگا ___ چونکہ ایران نے ایک فیصلہ کن جنگ کا فیصلہ کر لیا تھا اس لئے اب خود رستم سپہ سالار کی حیثیّت سے میدان میں آیا۔

حضرت عمرؓ نے، حضرت سعدؓ کو لکھا کہ جنگ شروع کرنے سے پہلے اسلامی آئین کے مطابق، یزدگرد کے سامنے صلح کی شرائط پیش کر دی جائیں اور اس مقصد کے لئے مدائن (جو ایران کا دارالسلطنت تھا) سفیر بھیجے جائیں۔

یزدگرد کو سفراء کی آمد کی اطلاع ملی تو اس نے خاص طور پر دربار کو آراستہ کیا ___ اس نے محسوس کیا کہ اتنی عظیم مملکت کے سفیروں کے شایانِ شان، اہتمام تزک و احتشام کرنا چاہیے لیکن جب سفیروں کا وفد وہاں پہنچا، تو ان کی حالت یہ تھی کہ ستے ہوئے چہرے، کندھوں پر بوسیدہ چادریں، ہاتھوں میں چابک، پاؤں

اسلامی وفد یزدگرد کے دربار میں

میں موزے، دبلے پتلے گھوڑوں پر سوار، جو خاک اڑاتے چلے آ رہے تھے۔ یزدگرد باور نہیں کرتا تھا کہ اس مملکت کے یہی سفیر ہیں۔ اُسے ان سے بات کرنا بھی گوارا نہ تھا لیکن جب اس کے اہلِ دربار نے اس پر زور دیا تو وہ طوعاً و کرہاً ان سے ملنے کے لئے آمادہ ہو گیا۔ وفد دربار میں پہنچا تو ان کے رئیس نے حسبِ معمول، شاہنشاہِ ایران سے کہا کہ یا تو اسلام قبول کر کے ہم میں سے ہو جاؤ، یا اسلامی مملکت کے اقتدار کی برتری تسلیم کر لو تاکہ تم بھی محفوظ رہو اور تمہارا ملک اور اس کے باشندے بھی اور اگر یہ بھی قبول نہیں تو پھر تلوار کے فیصلے کا انتظار کرو۔

یزدگرد نے یہ سُنا تو غصّہ کے مارے آگ بگولا ہو گیا۔ کہنے لگا کہ تم وحشی اور بدتہذیب عرب (فردوسی کے الفاظ میں) سوسمار کھانے اور اونٹوں کا دودھ پینے والے گنوار اور تمہاری جرأتوں کا یہ عالم! کیا تم بھول گئے ہو کہ تم ذرا سی سرکشی اختیار کیا کرتے تھے تو ہم (ایرانی) خود تمہارے مقابلہ کے لئے نہیں نکلا کرتے تھے (ہم اسے باعثِ ننگ و عار سمجھتے تھے) اپنے سرداروں سے کہہ دیا کرتے تھے اور وہ تمہاری گوشمالی کر کے تمہیں سیدھا کر دیتے تھے۔ اب اگر تم لوگوں کو بھوک اور افلاس نے تنگ کر کے آمادہ بہ جنگ کر دیا ہے تو ہم تمہارے روٹی کپڑے کا انتظام کر دیتے ہیں۔ جاؤ! آرام سے بیٹھو۔ کیوں اپنی جان کے لاگو ہو رہے ہو۔

رئیسِ وفد نے یزدگرد کی باتوں کو نہایت سکون اور اطمینان سے سُنا اور اس کے بعد کہا کہ تم نے ہماری پہلی حالت کے متعلق جو کچھ کہا ہے وہ بالکل ٹھیک ہے۔ ہم اس سے بھی زیادہ جاہل اور زبوں حال تھے لیکن خدا کی کتاب اور اس کے رسولؐ کی تعلیم و تربیّت نے ہمارے اندر جو انقلاب برپا کر دیا ہے تمہیں اس کا علم

نہیں۔ ہم اب ایک اور ہی قوم ہیں۔

نگاہِ کم سے نہ دیکھ ان کی کج کلاہی کو ∴ یہ بے کلاہ ہیں سرمایۂ کلاہ داری

میں ان تین شرطوں کو پھر سے دہرائے دیتا ہوں جو پہلے پیش کی گئی ہیں۔ کہو تمہارا جواب کیا ہے؟

یہ سن کر یزدگرد آپے سے باہر ہو گیا اور بپھر کر بولا کہ اگر قاصدوں کا قتل کرنا خلافِ آئین نہ ہوتا تو میں تمہاری

خاکِ ایران

گردنیں اڑا دیتا۔ جاؤ! اور جو تمہارے جی میں آئے کرو۔ لیکن جاتے جاتے ایک تحفہ ضرور لیتے جاؤ۔ یہ کہہ کر اس نے مٹی کا ایک ٹوکرا منگایا اور اسے رئیسِ وفد کے سامنے رکھ دیا ــــ انہوں نے ٹوکرا اٹھایا اور شاداں و فرحاں حضرت سعدؓ کے پاس پہنچے۔ سارا ماجرا سنایا اور اس کے بعد وہ مٹی کا ٹوکرا پیش کرتے ہوئے کہا کہ مبارک ہو، یزدگرد نے خود ہی اپنی زمین ہمارے حوالے کر دی[1]۔

قلندراں کہ بہ تسخیرِ آب و گل کوشند ∴ ز شاہ باج ستانند و خرقہ می پوشند

اور بعد کے واقعات نے ثابت کر دیا کہ اس مٹی کے ٹوکرے میں فی الواقعہ ایران کی ساری زمین سمٹ کر آ گئی تھی۔

اِدھر یہ آئے، اور اُدھر سے رُستم مقابلہ کے لئے روانہ ہوا۔ اس کے جلو میں ایک لاکھ اسی ہزار فوج تھی......

......قریب تین سو جنگی ہاتھی فوج کے ہمراہ تھے اور آلاتِ حرب و ضرب اور سامانِ جنگ کا کوئی ٹھکانہ نہ تھا...

ــــ یہ اہتمام تھا اور ایک مشتِ پَر کے لئے ــــ اس اہتمام کے باوجود، رستم جنگ کو ٹالنا چاہتا تھا۔ وہ مجاہدین سے واقف تھا اس لئے ان کے سامنے آنے کی ہمت اپنے اندر نہیں پاتا تھا۔ چنانچہ اس نے مدائن سے قادسیہ تک پہنچنے میں (کہ جن کا درمیانی فاصلہ تیس چالیس میل سے زیادہ نہ تھا) چھ ماہ صرف کر دیئے اور جب اس نے دیکھا کہ (یزدگرد کے تقاضوں کے پیشِ نظر) کوئی اور چارۂ کار نہیں رہا تو قادسیہ کے قریب، مقامِ عتیق میں خیمہ زن ہو گیا۔ چونکہ وہ چاہتا تھا کہ اب بھی کسی طرح مقابلہ کی نوبت نہ آئے اس لئے اس نے حضرت سعدؓ کے پاس پیغام بھیجا کہ کسی سفیر کو بھیج دیں تاکہ اس سے گفتگوئے مصالحت ہو سکے۔ چنانچہ حضرت ربعی بن عامرؓ کو سفیر بنا کر رستم کے پاس بھیجا گیا۔

رُستم نے بھی (یزدگرد کی طرح) نہایت شان و شوکت اور تجمل و تکلف کے ساتھ دربار کو پیراستہ کیا۔ سونے کا تخت آراستہ کیا۔ اس کے چاروں طرف حریر و اطلس اور رومی قالینوں کا فرش بچھوایا۔ اوپر زرنگفت کے شامیانے

---

[1] تاریخ میں اس وفد سے متعلق مختلف روایات آئی ہیں۔ ہم نے یہاں ان سب کا ملخص پیش کر دیا ہے۔

لگوائے جن کی جھالریں موتیوں کی تھیں لیکن اسے معلوم نہیں تھا کہ

نگاہِ فقر میں شانِ سکندری کیا ہے!

حضرت ربعیؓ اپنے مخصوص سکندرانہ جلال لیکن قلندرانہ اداؤں کے ساتھ دربار میں پہنچے۔ ایک خندۂ استغناء سے گردوپیش پر نظر ڈالی۔ لبِ فرش اپنا نیزہ گاڑ کر اس کے ساتھ اپنا گھوڑا باندھا اور نہایت بے تکلفی سے تخت کے ایک طرف رستم کے ہمدوش بیٹھ گئے۔ اہلِ دربار نے روکنا چاہا تو آپ نے کہا کہ ہمارے ہاں اس کی سخت ممانعت ہے کہ ایک شخص خدا بن کر بیٹھ جائے اور باقی انسان اس کے سامنے ہاتھ باندھے کھڑے ہوں۔ رستم نے اپنے لوگوں سے کہا کہ ان سے تعرّض مت کرو۔

سچ کہا ہے اقبالؒ نے کہ

پادشاہاں در قبا ہائے حریر ⁂ زرد رُو از سہم آں عریاں فقیر

سوال جواب یہاں بھی اسی انداز کے ہوئے جیسے ہم یزدگرد کے دربار میں دیکھ آئے ہیں۔ دورانِ گفتگو رستم نے حضرت ربعیؓ سے کہا کہ تمہاری تلوار کا نیام بہت بوسیدہ ہے۔ آپ نے جواب دیا کہ سپاہی کا مقصد تلوار سے ہوتا ہے۔ نہ کہ اس کے نیام سے۔ تم نے اس تلوار کی آب کو نہیں دیکھا۔ اسے دیکھو گے تو سمجھ میں آجائے گا کہ یہ کیا ہے؟ پھر اس نے کہا کہ تمہارے نیزے کا پھل بہت چھوٹا سا ہے، یہ لڑائی میں کیا کام دیتا ہو گا۔ آپ نے کہا کہ وہی کام جو ایک چنگاری، نیستاں کے لئے دیتی ہے۔

روایات میں ہے کہ سفراء کی آمد و رفت کا یہ سلسلہ تین دن تک جاری رہا لیکن مصالحت کی کوئی شکل پیدا نہ ہو سکی — جو، دو اور دو چار کہتا ہوا حق پر ہو، وہ مصالحت کس بات پر کرے؟ کیا وہ دو اور دو تین یا پانچ مان لے؟ باطل اپنے مقام سے جتنا جی چاہے اِدھر اُدھر ہو جائے اس کا کچھ نہیں بگڑتا۔ وہ جیسا، باطل پہلے تھا ویسا ہی باطل پھر رہتا ہے لیکن حق اگر اپنے مقام سے ذرّہ برابر بھی سرک جائے تو وہ حق نہیں رہتا، باطل ہو جاتا ہے۔ غلط جواب سینکڑوں ہو سکتے ہیں، صحیح جواب ایک ہی ہوتا ہے۔ یہ وجہ ہے جو حق، باطل کے ساتھ مفاہمت نہیں کر سکتا۔ یہی اسلام کا پیغام ہے، یہی دین کی بنیاد ہے۔

باطل دوئی پسند ہے حق لاشریک ہے ⁂ شرکت میانۂ حق و باطل نہ کر قبول

چنانچہ سفیرِ اسلام، باطل کے ساتھ مفاہمت کے لئے آمادہ نہ ہوئے۔

اس کا نتیجہ قادسیہ کا زلزلہ انگیز معرکہ تھا۔ ایرانی لشکر کی تفصیل ہم دیکھ چکے ہیں۔ اس کے مقابلہ میں اسلامی

لشکر کل تیس ہزار مجاہدین پر مشتمل تھا، جن کے پاس وہی بوسیدہ نیاموں کی تلواریں اور چھوٹی چھوٹی انیوں والے تیر اور نیزے تھے۔ لیکن ان کے سینوں میں وہ بیقرار دل تھے جن کے شوقِ شہادت کا یہ عالم تھا کہ

سینۂ شمشیر سے باہر تھا دم شمشیر کا

معرکۂ قادسیہ ۱۴ھ ۶۳۵ء

معرکۂ کارزار گرم ہوا۔ سوءِ اتفاق کہ حضرت سعدؓ کو عرق النساء (یا بروایت دیگر کاربنکل) کی شدید تکلیف تھی، جس کی وجہ سے وہ گھوڑے پر سوار ہو کر میدان میں نہیں آ سکتے تھے۔ چنانچہ وہ میدانِ جنگ کے ایک سرے پر ایک عمارت میں لیٹے ہدایات پر ہدایات دیتے چلے جاتے تھے۔ تین دن کے جرأت آزما معرکہ کے بعد ایرانیوں کو شکست ہوئی۔ رستم مارا گیا۔ تاریخ ایک اہم موڑ مڑ گئی۔

ہم میدانِ کارزار کے شور و شغب میں اس قدر محو اور شمشیر و سناں کی جھنکار میں اس قدر جذب ہوئے کہ

ابو محجن ثقفی کا نشۂ جہاد

ابو محجن کے جذبۂ بے اختیارِ شوق کی یاد ہی دل سے اتر گئی۔ محجن ثقفی عربوں کے مشہور شہ سوار تھے لیکن حضرت سعدؓ نے انہیں قید کر رکھا تھا (یہ آگے چل کر بیان ہو گا کہ انہیں کیوں قید کر رکھا تھا) جب معرکۂ کارزار گرم ہوا اور مجاہدین کے نعرہ ہائے تکبیر بار بار ان کے کانوں سے ٹکرائے تو ان سے نہ رہا گیا۔ پا بہ زنجیر گھسٹتے ہوئے حضرت سعدؓ کے پاس پہنچے اور معافی کی درخواست کے ساتھ جنگ میں شریک ہونے کی اجازت چاہی لیکن حضرت سعدؓ اس کے لئے راضی نہ ہوئے۔ وہاں سے مایوس ہو کر وہ حضرت سعدؓ کی زوجہ محترمہ سلمٰی کے پاس پہنچے اور ان سے کہا کہ آپ میری بیڑیاں کھول کر حضرت سعدؓ کا گھوڑا (بلقاء) مجھے دے دیں۔ میں وعدہ کرتا ہوں کہ اگر میں زندہ رہا تو انہی بیڑیوں کو خود پہن کر پھر داخلِ زنداں ہو جاؤں گا۔ پہلے تو انہوں نے انکار کر دیا لیکن جب ابو محجن نے بہت زیادہ لجاجت سے کہا تو ان کا دل پسیج گیا۔ انہوں نے ان کی بیڑیاں بھی کھول دیں اور گھوڑا بھی دے دیا۔ وہ نعرۂ تکبیر بلند کرتے ایرانیوں کے لشکر میں جا گھسے اور اس بے جگری سے لڑنا شروع کیا کہ رَن کانپ اٹھا۔ حضرت سعدؓ اپنے بالاخانے سے یہ منظر دیکھ رہے تھے لیکن کچھ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ یہ کون شخص ہو سکتا ہے۔ بار بار دل میں کہتے کہ اگر ابو محجن قید میں نہ ہوتا تو میں کہہ دیتا کہ یہ وہی ہے اور اگر میرا گھوڑا اصطبل میں نہ بندھا ہوتا تو مجھے یہ کہنے میں قطعاً تامل نہ ہوتا کہ وہ بلقاء ہے۔

رن ختم ہوا تو ابو محجن حسبِ وعدہ زنداں کے دروازے پر پہنچ گئے۔ گھوڑا اصطبل میں باندھ دیا اور خود بیڑیاں پہن لیں۔ حضرت سعدؓ نے اصطبل میں گھوڑے کو دیکھا تو وہ پسینہ سے شرابور ہو رہا تھا۔ دریافت کرنے پر بیوی نے سارا ماجرا سنا دیا۔ آپ ابو محجن کے پاس گئے۔ معافی قبول کی اور انہیں رہا کر دیا۔

بعض روایات میں ہے کہ ابو محجن کو شراب نوشی کے جرم میں قید کیا گیا تھا۔ لیکن ایک روایت میں یہ بھی آیا ہے کہ جب حضرت سعدؓ کی بیوی نے ان سے پوچھا کہ سعدؓ نے انہیں کس جرم کی پاداش میں قید کیا ہے تو انہوں نے کہا کہ انہوں نے کسی حرام شے کا استعمال نہیں کیا تھا۔ ہوا یہ تھا کہ میں عہد جاہلیت میں شراب پیا کرتا تھا اور شاعری بھی کرتا تھا، اس لئے میری خمریات بھی مشہور تھیں۔ میں ایک دن یونہی اُس زمانے کے اشعار گنگنا رہا تھا۔ ان میں یہ شعر بھی تھا۔

اذا مت فادفنی الی جنب کرمۃ
تروی عظامی بعد موتی عروقہا

جب میں مر جاؤں تو مجھے پہلوئے تاک میں دفن کرنا تاکہ میری ہڈیاں اس کا رس چوستی رہیں[1]۔
(حضرت) سعدؓ نے سمجھا کہ یہ ظالم ابھی تک میرے مُنہ سے چھوٹی نہیں، اس لئے مجھے قید کر دیا۔
ہمارا مقصد جرم کی تحقیق نہیں۔ اس کا معاملہ خدا سے ہے۔ ہم نے تو دیکھنا یہ ہے کہ ان لوگوں کے جذبۂ جہاد اور شوقِ شہادت کا کیا عالم تھا!
(واضح رہے کہ اس معرکہ میں صرف حضرت سعد کی رفیقۂ محبت ہی ان کے ہمراہ نہیں تھیں۔ بیشتر فوجیوں کی بیویاں ان کے ہمراہ تھیں اور زخمیوں کی مرہم پٹی اور دیکھ بھال کا کام انہی کے سپرد تھا۔ صدرِ اوّل کے معرکوں میں ایسا ہی ہوتا تھا۔)
اور یہی تھی وہ جنگِ قادسیہ جس کے حالات معلوم کرنے کے لئے حضرت عمرؓ ہر صبح اس راستے کی طرف نکل جایا کرتے تھے جو قادسیہ کی طرف سے آتا تھا۔ بایں امید کہ شاید اِدھر سے کوئی آنے والا مل جائے اور ابھی کی فتح کی خوشخبری لے کر وہ قاصد آیا تھا جس کی اونٹنی کے ساتھ ساتھ امیر المومنین دوڑتے اور حالات سنتے مدینہ تک پہنچے تھے۔ رضی اللہ عنہم

(۵)

قادسیہ کی ذلّت آمیز شکست کے بعد، حالت یہ تھی کہ ایرانی آگے آگے بھاگے جا رہے تھے اور اسلامی فوج ان کا تعاقب کر رہی تھی۔ مختلف مقامات (بابل، کوثی، بہرہ شیر وغیرہ) پر ان کی جھڑپیں بھی ہوئیں اور ایرانیوں کو ہر میدان

---

[1] مر مٹے پر بھی تعلق ہے یہ میخانے سے ٭ میرے حصّے کی چھلک جاتی ہے پیمانے سے۔ (ریاض خیر آبادی)

میں ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا۔ تا آنکہ وہ دریائے دجلہ عبور کر کے مدائن میں جا پہنچے۔

مجاہدین کی نگاہیں مدائن پر تھیں لیکن راستے میں دجلہ اپنی تند و تیز طغیانیوں کے ساتھ حائل تھا اور ایرانی جاتے جاتے تمام پُل توڑ گئے تھے اور اسلامی لشکر کے پاس دریا عبور کرنے کا کوئی سامان نہ تھا۔

تو کیا یہ اللہ کے سپاہی، یہ خدا کا لشکر، یہ حزب اللہ، یہ کفن بدوش و شمشیر بکف جانباز، دریا کے کنارے ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر بیٹھ گئے کہ جب ہمارے پاس دریا عبور کرنے کا کوئی سامان ہی نہیں تو ہم کیا کر سکتے ہیں؟ نہیں وہ تو ایسا سوچ بھی نہیں سکتے تھے۔ بے سروسامانی کا تصور اگر کسی وقت ذرا بھی ان کے دل میں مایوسی پیدا کرنے کے لئے آگے بڑھتا، تو ان کی قوتِ ایمانی اسے یہ کہہ کر جھٹک دیتی کہ

بے دست و پا نیم، کہ ہنوز از وفورِ عشق
سوداست در سرم کہ بہ سامان برابر است

اپنے مقصد کی صداقت اور اس کے حصول کی بے پناہ تڑپ انہیں پکار پکار کر کہتی کہ

میاآ بزم بر ساحل کہ آنجا ؞ نوائے زندگانی نرم خیز است
بدریا غلط و با موجش درآویز ؞ حیاتِ جاوداں اندر ستیز است

اور یہ ولولہ ان کے نزدیک یونہی شاعری نہیں تھا، ایک زندہ حقیقت تھی اور یہی وہ حقیقت تھی جس کے پیش نظر

بحرِ ظلمات میں دوڑا دیئے گھوڑے ہم نے

آسمان کی آنکھ کیا دیکھتی ہے کہ انہوں نے بِسْمِ اللّٰہِ مَجْرٖىهَا وَمُرْسٰىهَا۔ کہہ کر دریا میں گھوڑے ڈال دیئے اور دریا کی پُرجوش طغیانیوں کے ساتھ یوں ہنستے کھیلتے آگے بڑھتے چلے گئے جیسے نسیم سحری کے ساتھ اٹھکیلیاں کرتے سیرِ چمن کے لئے نکلے ہوں۔ یہی وہ مقام تھا جس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اقبالؒ نے کہا تھا کہ

محفلِ کون و مکاں میں سحر و شام پھرے ؞ مئے توحید کو لے کر صفتِ جام پھرے
کوہ میں، دشت میں لے کر ترا پیغام پھرے ؞ اور معلوم ہے تجھ کو کبھی ناکام پھرے؟

دشت تو دشت ہیں، دریا بھی نہ چھوڑے ہم نے
بحرِ ظلمات میں دوڑا دیئے گھوڑے ہم نے

ایرانیوں نے انہیں دیکھا تو پہلے تو بے ساختہ پکار اٹھے کہ یہ "دیوانے ہیں دیوانے"، لیکن جب وہ اور قریب آ گئے تو

یہ کہہ کر بھاگ کھڑے ہوئے کہ یہ انسان نہیں' جن ہیں اور جنات کا مقابلہ کون کرے!
اور اس کے بعد اسلامی لشکر اس مدائن کے اندر تھا جسے یزدگرد اور تمام ایرانی پہلے ہی خالی کر کے' بھاگ چکے تھے۔

فتح مدائن ۱۶ھ ۶۳۷ء

جب حضرت سعدؓ شاہنشاہِ ایران کے قصرِ ابیض میں داخل ہوئے تو ان کی زبان پر بے ساختہ قرآنِ کریم کی یہ آیات آگئیں کہ

كَمْ تَرَكُوْا مِنْ جَنّٰتٍ وَّعُيُوْنٍ ۙ وَّ زُرُوْعٍ وَّمَقَامٍ كَرِيْمٍ ۙ وَّ نَعْمَةٍ كَانُوْا فِيْهَا فٰكِهِيْنَ ۙ كَذٰلِكَ ۖ وَ اَوْرَثْنٰهَا قَوْمًا اٰخَرِيْنَ ۝ (۴۴/۲۵-۲۸)

انہوں نے کس قدر سرسبز و شاداب باغات، خنک و شیریں چشمے، لہلہاتی کھیتیاں اور بلند و بالا مقاماتِ عزّ و شرف اپنے پیچھے چھوڑ دیئے۔ یعنی وہ تمام سامانِ آسائش و زیبائش جو ان کی خوشحالیوں کا آئینہ دار تھا، وہ اسے چھوڑ کر چلے گئے اور ہم نے ایک اور قوم کو اس کا وارث بنا دیا۔

حضرت سعدؓ کی زبان پر یہ عبرت انگیز اور تشکر آمیز آیات تھیں' اور ادھر سے خدا کا قانونِ مکافات پکار پکار کر کہہ رہا تھا کہ فَمَا بَكَتْ عَلَيْهِمُ السَّمَآءُ وَ الْاَرْضُ وَ مَا كَانُوْا مُنْظَرِيْنَ (۴۴/۲۹) ان کی اس تباہی پر نہ آسمان رویا نہ زمین اور نہ ہی انہیں اتنی سی مہلت بھی ملی کہ وہ اس ساز و سامان کو اپنے ساتھ اٹھا کر لے جاتے۔

وہی قوم جس کے ساتھ یہ ایرانی ابھی کل تک جنگ کرنا بھی باعثِ ننگ و عار سمجھتے تھے' آج ان کے تخت و تاج، سلطنت و حکومت اور دولت و حشمت' سب کی مالک تھی۔ کیا سورج کی آنکھ نے ایسا محیّر العقول انقلاب اس سے پہلے بھی کبھی دیکھا تھا! حضرت سعدؓ وفورِ جذباتِ تشکر و امتنان سے

مالِ غنیمت

کبھی خدا کے حضور جھکتے' کبھی اٹھتے تھے۔ اتفاق سے یہ جمعہ کا دن تھا۔ انہوں نے صلوٰۃ جمعہ اسی قصرِ ابیض میں ادا فرمائی اور یوں ایران کے آتشکدوں کی آگ ہمیشہ کے لئے ٹھنڈی ہو گئی۔ قصرِ ابیض میں جابجا نہایت نادر مجسمے اور شاہکار تصاویر آویزاں تھیں۔ ان عربوں نے' جنہیں یورپ کے تنگ نظر مورخ نہایت وحشی کہہ کر پکارتے ہیں' انہیں اسی طرح رہنے دیا۔ کسی کو توڑا پھوڑا نہیں۔ (ہیکل' اور دیگر مورخین کی بیان کردہ تفاصیل کے مطابق) حضرت سعدؓ کو کسریٰ کے خزانوں سے تیس کھرب دینار ملے اور محل میں جو ساز و سامان تھا اس کی قیمت کا کوئی ٹھکانہ نہ تھا۔ یزدگرد مدائن سے بھاگ کر حلوان چلا گیا تھا۔ مسلمانوں کی فوج نے اس کا پیچھا کیا' تو وہ حلوان چھوڑ کر اور آگے بھاگ گیا۔ یہ لوگ وہاں سے کسریٰ کا موتیوں کا ہار اور جواہرات سے مرصّع تاج اور

زرکار ریشمی ملبوسات لے کر آئے جن میں جواہرات ٹکے ہوتے تھے۔ کسریٰ کی زرہ اور تلواریں بھی جواہرات سے مرصع تھیں۔ جب اس مالِ غنیمت کا خُمس (پانچواں حصّہ) مدینہ پہنچا ہے تو اہلِ مدینہ کی آنکھیں جو کچھ دیکھ رہی تھیں، ان کا اسے ذہن باور نہیں کرتا تھا۔ ساٹھ مربع گز کا تو صرف ایک قالین تھا جس پر مملکت کا نقشہ بنا ہوا تھا اس کی زمین سونے کی تھی۔ جا بجا موتیوں کی نہریں تھیں۔ کناروں پر چمنستان تھا، جس پر منقوش درختوں کے تنے سونے کے، پتے ریشم کے اور پھل جواہرات کے تھے۔ حضرت سعدؓ نے لکھا تھا کہ یہ تمام زر و جواہرات مسلمان سپاہیوں کے قبضے میں تھے اور ایسے ایسے مقامات سے ملے تھے جہاں انہیں کوئی دیکھنے والا نہیں تھا لیکن ان میں سے کسی نے ایک سوئی بھی اپنے پاس نہیں رکھی۔ سب کچھ لا کر اپنے قائد کے سامنے رکھ دیا۔ یہ معلوم ہونے پر حضرت عمرؓ نے کہا کہ اس قسم کی دیانت اور امانت کی مثال اور کہاں مل سکے گی؟

سپاہ دیانتدار کیوں تھی

اس کے جواب میں جو کچھ حضرت علیؓ نے فرمایا، اس دیانت اور امانت کا راز اس میں تھا۔ آپ نے فرمایا کہ

> چونکہ آپ کا دامن پاک ہے اس لئے آپ کی رعایا بھی پاک دامن ہے۔ اگر آپ کی نیّت ٹھیک نہ ہوتی تو اس کی نیّت میں بھی فرق آجاتا۔ (بحوالہ ہیکل)

دوسری صبح جب سارا مالِ غنیمت صحنِ مسجد میں جمع کر دیا گیا تو حضرت عمرؓ نے اس پر ایک عبرت آمیز نگاہ ڈالی اور آپ کی آنکھوں سے بے اختیار آنسو ٹپک پڑے۔ حضرت عبدالرحمٰن بن عوفؓ نے کہا کہ امیر المومنین! یہ تو مقامِ تشکر تھا، آپ رونے کیوں لگے۔ آپ نے جواب دیا کہ جس قوم میں دنیا کی فراوانی آجائے، اس میں رشک اور حسد پیدا ہو جاتا ہے اور اس سے اس قوم میں تفرقہ پڑ جاتا ہے۔ میں ڈرتا ہوں کہ کہیں ہمارا حشر بھی ایسا نہ ہو۔

یہ ٹھیک ہے لیکن قوموں میں یہ خرابی اس وقت پیدا ہوتی ہے جب دولت کو اقدارِ خداوندی کے مطابق صرف نہ کیا جائے۔ جب تک پانی کشتی کے نیچے رہتا ہے، وہ کشتی کے تیرنے کا سہارا بنتا ہے۔ جب وہی پانی کشتی کے اوپر چڑھ آئے تو کشتی ڈوب جاتی ہے۔ قوموں کی تباہی کا باعث دولت و ثروت کی فراوانی نہیں ہوتی۔ قومیں اس وقت تباہ ہوتی ہیں، جب اسی دولت کو پست جذباتِ حیوانیہ کی تسکین کا ذریعہ بنا لیا جائے۔ خود ہماری تاریخ اس پر شاہد ہے اور یہی حضرت عمرؓ کا خدشہ تھا۔

اس وقت جبکہ امیر المومنین، مالِ غنیمت کی تقسیم میں مصروف ہیں، اور فاتحِ ایران حضرت سعدؓ، قصرِ ابیض میں تکان اتار رہے ہیں، آیئے ہم دیکھیں کہ یزدگرد پر کیا بیت رہی ہے۔ ہم دیکھ چکے ہیں کہ مدائن سے بھاگ کر

یزدگرد کی دشت نوردیاں وہ حلوان پہنچا تو وہاں بھی جیشِ اسلامیہ نے اُن کا تعاقب کیا. جلولہ کے مقام پر ایرانیوں سے مقابلہ ہوا اور وہ شکست کھا کر اپنے "شہنشاہ" سمیت پھر بھاگ اٹھے. اس کے بعد وہ رَے میں جا کر مقیم ہوا. وہاں سے اصفہان کی طرف چلا گیا. اصفہان سے کرمان پہنچا. اس کے بعد پھر اصفہان واپس آ گیا. جب اسلامی جیوش نے صوبہ اہواز پر قبضہ کر لیا، تو یزدگرد، خراسان کے شہر مَرو میں آ کر مقیم ہوا. وہاں اس نے اِدھر اُدھر سے ایرانی فوج جمع کر کے اپنی متاعِ بُردہ کی بازیابی کے لئے آخری کوشش کی. نہاوند کے مقام پر اس نے قریب ڈیڑھ لاکھ فوج جمع کر لی. اس سے اسلامی

نہاوند کی جنگ ۲۱ھ ۶۴۲ء مملکت کو ایسا خطرہ لاحق ہوا کہ فاروقِ اعظمؓ نے اس کے مقابلہ کے لئے خود جانا ضروری سمجھا لیکن اپنے رفقاء کے مشورہ پر کاربند ہوتے ہوئے (ایک بار پھر) آپ نے اپنا ارادہ بدل دیا. نہاوند کے معرکہ میں اسلامی فوجوں کو فتحِ عظیم حاصل ہوئی. حضرت حذیفہ بن الیمانؓ سپہ سالارِ لشکر تھے.

فاروقِ اعظمؓ کا قاتل، فیروز ابولولو، نہاوند کا باشندہ تھا اور اسی جنگ میں قید ہو کر مدینہ پہنچا تھا. تفصیل اس اجمال کی اپنے مقام پر آئے گی.

فتحِ نہاوند کے بعد، ایران کے مختلف صوبے، یکے بعد دیگرے مسلمانوں کے قبضے میں آتے چلے گئے. آذربائیجان، طبرستان، آرمینیہ، ۲۲ھ (مطابق ۶۴۳ء) میں. کرمان، سیستان اور مکران ۲۳ھ (مطابق ۶۴۴ء) میں.

ہم دیکھ چکے ہیں کہ معرکۂ نہاوند کے وقت یزدگرد خراسان کے شہر مَرو میں مقیم تھا. جب اسلامی فوجوں نے یہاں بھی دباؤ ڈالا تو وہ بلخ کی طرف بھاگ گیا اور جب مسلمانوں نے بلخ بھی فتح کر لیا تو یزدگرد کے لئے

یزدگرد کا فرار اس کے سوا چارہ نہ رہا کہ وہ اپنے ملک (ایران) کو چھوڑ کر ترکستان چلا جائے. وہاں اس نے خاقان کے پاس سمرقند میں پناہ لے لی. جب حضرت عمرؓ نے یہ سنا تو آپ نے مسجدِ نبویؐ میں اجتماع سے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ

> آج مجوسیوں کی حکومت فنا ہو چکی ہے. اب وہ اپنے ملک میں چپہ بھر زمین کے مالک بھی نہیں ہو سکیں گے. مسلمانو! اللہ تعالیٰ نے تمہیں مجوسیوں کی زمین، مجوسیوں کی مملکت، مجوسیوں کے مال و دولت کا مالک بنا دیا ہے تاکہ اب یہ دیکھے کہ تم کس قسم کے کام کرتے ہو. لہٰذا، تم احتیاط

برتنا اور اپنے احوال میں تغیّر پیدا نہ ہونے دینا ورنہ خدائے تعالیٰ تم سے بھی یہ مملکت چھین لے گا اور کسی دوسری قوم کے حوالے کر دے گا۔

اس کے چند روز بعد حضرت عمرؓ کی شہادت ہو گئی (لیکن اس کا تذکرہ یہاں ضمناً آگیا ہے) یزدگرد ملک بدر بھی ہو گیا، لیکن اپنی چھنی ہوئی سلطنت کی بازیابی کا خیال اس کے دل میں پھر بھی کروٹیں لیتا رہا۔ اس مقصد کے لئے وہ اہلِ خراسان سے خط و کتابت کرتا رہا۔ جب حضرت عثمانؓ کے زمانے میں خراسان میں بغاوت ہوئی تو اس نے اس موقعہ کو غنیمت جانا اور ترکستان سے مَرو پہنچکر لوگوں کو اپنے ارد گرد جمع کرنا شروع کر دیا لیکن مسلمانوں نے اس بغاوت کو جلد فرو کر دیا تو یزدگرد پھر بھاگ نکلا لیکن اب اس کے لئے کوئی جائے فرار نہیں تھی کیونکہ مسلمانوں

یزدگرد کی عبرت آمیز موت

نے اس کا خاص اہتمام کر رکھا تھا کہ وہ جہاں بھی ملے اسے گرفتار کر لیا جائے۔ اسے جب اس کا علم ہوا تو وہ جان بچانے کے لئے ایک پن چکی میں روپوش ہو گیا اور وہاں بری طرح قتل کر دیا گیا۔ بعض روایات میں ہے کہ اسے اہلِ خراسان نے قتل کر دیا تھا۔ بعض میں یہ کہا گیا ہے کہ چکی والے ہی نے لالچ میں آکر اسے قتل کر دیا تھا۔ قتل کسی نے بھی کیا ہو، کیا اس سے بڑھ کر مقامِ عبرت کوئی اور بھی ہو سکتا ہے کہ ایران جیسی عظیم مملکت کا شاہنشاہ اور روپوشی کی حالت میں ایک پن چکی میں مقتول! فاعتبروا یا اولی الابصار۔ یہ ۳۰ھ کا واقعہ ہے۔

ایران فتح ہو گیا اور اس کے آخری کسریٰ کا بھی خاتمہ ہو گیا لیکن اس سلسلہ میں دو ایک واقعات ایسے ہیں جن کا تذکرہ ضروری ہے۔

(٥)

ہرمزان' ایران کا ایک نامور گورنر' جری سپہ سالار' ماہر سیاست دان' اور نہایت مکار اور عیار حریف تھا۔ قادسیہ میں شکست کھانے کے بعد وہ اہواز کی طرف بھاگ گیا اور وہاں از سرِ نَو فوجوں کو مرتب کر کے

ھرمزان کی روباہ بازیاں

مسلمانوں کے مقابلہ کے لئے میدان میں اتر آیا۔ جب وہ وہاں بھی مصیبت میں گھرا تو مسلمانوں سے صلح کی درخواست کی جسے انہوں نے منظور کر لیا۔ وہ صلح کرنے کے بعد وہاں سے نکلا تو معاہدۂ صلح کو پسِ پشت ڈال کر پھر میدانِ جنگ میں آگیا۔ جب وہاں پھر گھر گیا تو دوبارہ معاہدۂ صلح کی درخواست کی' جسے بحکم امیر المومنین منظور کر لیا گیا۔ اس نے پھر معاہدہ شکنی کی اور رامہرمز کے مقام پر پھر میدانِ کارزار میں اتر آیا۔ وہاں سے شکست کھائی تو بھاگ کر خوزستان کے دارالسلطنت

تستر جا پہنچا۔ ایران میں یہ صوبہ بڑی اہمیت کا حامل تھا۔ مسلمانوں نے اس کا تعاقب کیا اور گرفتار کر لیا۔ اس نے درخواست کی کہ اسے وہیں قتل کرنے کے بجائے، امیر المومنین کے پاس مدینہ بھیجدیا جائے۔ چنانچہ اُسے انس بن مالکؓ

تستر کی فتح ۱۹ ہجری

اور احنف بن قیسؓ کی معیت میں مدینہ روانہ کر دیا۔ مدینہ میں یہ جس شان و شوکت سے ساتھ داخل ہوا، اور امیر المومنین کو جس عالم میں صحن مسجد میں فرش خاک پر سوتے ہوئے پایا، اس کا ذکر سابقہ باب میں کیا جا چکا ہے۔

حضرت عمرؓ نے اس کے تمام جرائم کو ایک ایک کر کے گنایا اور کہا کہ ان کی سزا قتل کے سوا اور کیا ہو سکتی ہے

ہرمزان، حضرت عمرؓ کے حضور

اس کے بعد جو کچھ ہوا اسے مورخین نے نہایت ڈرامائی انداز میں بیان کیا ہے اور حقیقت یہ ہے کہ اگر واقعہ ایسے ہی ہوا تھا تو وہ تھا ہی ایک ڈرامہ۔ کہا گیا ہے کہ ہرمزان نے کہا کہ مجھے پیاس لگی ہے۔ پانی پلا دیجئے۔ پانی منگایا گیا۔ اس نے پیالہ ہاتھ میں لیا اور اسے لب تک لے جا کر پیچھے ہٹا لیا، اور کہا کہ ایسا تو نہیں ہوگا کہ مجھے پانی پیتے ہی میں قتل کر دیا جائے۔ حضرت عمرؓ نے کہا کہ نہیں، تم اطمینان سے پانی پیو۔ جب تک تم پانی نہ پی لو گے تمہیں کوئی خطرہ لاحق نہیں ہوگا۔ ہرمزان نے یہ سن کر پانی انڈیل دیا۔ حضرت عمرؓ نے حکم دیا کہ اس کے لئے اور پانی لایا جائے۔ اس پر ہرمزان نے کہا کہ نہیں! مجھے پانی کی ضرورت نہیں۔ میں تو اپنی جان بچانا چاہتا تھا۔ اس پر مجلس میں حسب ذیل گفتگو ہوئی۔

حضرت عمرؓ:۔ تم سزائے قتل کے مستحق ہو۔ میں تمہیں ضرور قتل کروں گا۔

ہرمزان:۔ لیکن آپ تو مجھے امان دے چکے ہیں۔

حضرت عمرؓ:۔ تو جھوٹ کہتا ہے۔

انس بن مالکؓ:۔ یہ سچ کہتا ہے، امیر المومنین! آپ اسے امان دے چکے ہیں۔

حضرت عمرؓ:۔ اُنسؓ! تم کیا کہتے ہو؟ میں اس قسم کے غدار اور مسلمانوں کے قاتل کو امان کیسے دے سکتا ہوں۔
تم نے یہ مفہوم میرے کن الفاظ سے اخذ کیا ہے؟

انسؓ بن مالک:۔ آپ نے اس سے کہا تھا کہ جب تک تم پانی نہ پی لو، تمہیں کوئی خطرہ لاحق نہیں ہوگا اور اس نے پانی پیا نہیں۔

احنفؓ بن قیس اور دیگر حاضرین نے بھی انسؓ کی تائید کی اور کہا کہ امیر المومنین! آپ واقعی ہرمزان کو امان دے چکے ہیں۔ اس پر حضرت عمرؓ نے ہرمزان پر غضب آلود نگاہ ڈالی اور کہا کہ تم نے مجھے دھوکا دیا ہے۔ میں ایک

مسلمان کی خاطر تم سے دھوکا کھا رہا ہوں اور اسے رہا کر دیا۔

اس کے بعد ہرمزان نے اسلام قبول کر لیا۔ حضرت عمرؓ نے اس کا دو ہزار روپے سالانہ روزینہ مقرر کر دیا اور اسے مدینہ میں رہنے کی اجازت فرما دی۔ اس سے آپ ایران کے معاملات کے بارے میں اکثر مشورے لیا کرتے تھے۔

حیرت اندر حیرت

سفرِ حیات میں بعض مقامات ایسے بھی آجاتے ہیں جہاں منطق ساتھ چھوڑ دیتی ہے، دلائل مفلوج ہو جاتے ہیں اور فکری کڑیاں ایک ایک کر کے ٹوٹ اور بکھر جاتی ہیں اور انسان کے سامنے وادیٔ حیرت کے سوا کچھ نہیں رہتا۔ اگر مذکورہ صدر واقعہ اسی طرح ہوا تھا تو پھر یہ مقام ایسا ہی ہے۔

اس المیہ کے دو اہم کردار ہیں۔ ہرمزان اور حضرت عمرؓ۔ پہلے ہرمزان کو لیجئے۔ یہ ایران کا ایک نہایت معزز، سربلند، صاحبِ شوکت و حشمت فرزند تھا۔ اس ایران کا جس کی عظیم سلطنت کا خاتمہ ابھی ابھی عربوں کے ہاتھوں ہوا تھا، جس کی ہزاروں سال کی پرانی تہذیب، جس پر انہیں بصد فخر تھا، پامال ہو چکی تھی۔ جس کا شہنشاہ، اپنی جان بچانے کے لئے در بدر دھکے کھا رہا تھا۔ سوچئے کہ اس ایران کے باشندوں کے دل پر بالعموم، اور ان کے اس قدر صاحبِ عزت و سطوت ابناءِ قوم کے جگر پر بالخصوص، ان ذلت آمیز شکستوں کے زخم کس قدر گہرے ہوں گے اور عربوں کے خلاف ان کی آتشِ انتقام کی حدت کس قدر شدید! خود ہرمزان ایک صوبہ کا نامور گورنر تھا۔ اس کی ریاست چھن گئی تھی۔ اس کی حکومت کا تختہ الٹ گیا تھا۔ اسے پے در پے نہایت رسوا کن شکستیں ہوئی تھیں۔ اور اب وہ ان عربوں کے سامنے پابجولاں کھڑا تھا جن کے ساتھ یہ (ایرانی) جنگ کرنا بھی اپنی کسرِ شان سمجھا کرتے تھے۔ سوچئے کہ اس کے سینے میں غصے اور انتقام کے کیا کیا طوفان نہ اُٹھ رہے ہوں گے۔

پھر اسے بھی فراموش نہ کیجئے کہ ایرانیوں کے متعلق عربوں کی حتمی رائے تھی کہ وہ ایک بڑی مکار قوم ہے جس سے محتاط رہنے کی اشد ضرورت ہے۔ اس ضمن میں آپ اس خط کو ایک بار پھر سامنے لایئے جسے حضرت عمرؓ نے حضرت سعدؓ بن ابی وقاص کے نام لکھا تھا اور جو سابقہ باب میں درج کیا جا چکا ہے۔

دوسری طرف حضرت عمرؓ کو لیجئے۔ بلا مبالغہ کہا جا سکتا ہے کہ ان جیسا بالغ نظر، دیدہ ور، دور اندیش، معاملہ فہم، ماہرِ نفسیات سیاست دان، تاریخ کی آنکھ نے کم دیکھا ہو گا۔ ان کی نگاہ کتنی دور تک پہنچتی تھی، اس کا اندازہ اس سے لگایئے کہ ایک دفعہ کسی شخص نے کہا کہ مومن کسی کو دھوکا نہیں دیتا۔ آپ نے کہا کہ بات پوری کرو۔ "مومن نہ کسی کو دھوکا دیتا ہے، نہ کسی سے دھوکا کھاتا ہے۔" یہ تھے حضرت عمرؓ۔

انہوں نے ہرمزان کے قتل کا فیصلہ یونہی جذباتی طور پر نہیں کیا تھا. اس نے بار بار عہد شکنی کی تھی. قدم قدم پر دھوکا دیا تھا. متعدد مسلمانوں کو شہید کیا تھا. آپ نے اس کے جرائم کی فہرست اس کے سامنے رکھ دی تھی اور اس کے بعد اس کے قتل کا فیصلہ کیا تھا.

اب یہ دیکھئے کہ اس فیصلہ کو بدلا کس طرح گیا. ظاہر ہے کہ حضرت عمرؓ نے ہرمزان کو امان نہیں دی تھی. اس کے جرائم کو معاف نہیں کر دیا تھا. اسے صرف اس امر کی ضمانت دی تھی کہ وہ اطمینان سے پانی پی لے. اس نے الفاظ کے ہیر پھیر سے ناجائز فائدہ اٹھا کر ایک مکارانہ چال چلی. اگر دوسرے لوگ اس کے اس فریب میں آ گئے تھے، تو کم از کم حضرت عمرؓ سے تو اس کی توقع کی جا سکتی تھی کہ وہ اس کے فریب کا پردہ چاک کر دیتے. وہ جانتے تھے کہ ہرمزان دھوکہ دے رہا ہے. انہوں نے واضح الفاظ میں کہا تھا کہ میں ایک مسلمان کی وجہ سے دھوکا کھا رہا ہوں! عمرؓ اور یوں دھوکا کھا جائے!! اگر الفاظ کا ایسا ہی پاس تھا تو ہرمزان کو قید میں رکھنا چاہیئے تھا. اس کے بعد جب وہ پیاس سے تنگ آتا تو خود ہی پانی مانگتا اور اسے پی لیتا. جب وہ پانی پی چکتا تو اسے کیفر کردار تک پہنچا دیا جاتا. اور اگر وہ اپنی ضد پر اڑا رہتا اور پانی نہ مانگتا تو شدتِ پیاس سے ہلاک ہو جاتا. حیرت ہے کہ حضرت عمرؓ نے ایسا بھی نہ کیا اور ایک زخم خوردہ سانپ کو دودھ دے کر پالتے رہے. یعنی نہ صرف یہ کہ اس کی جان بخشی کر دی، بلکہ اسے مدینہ میں رہنے کی اجازت دے دی اور اس سے مشورے بھی لیتے رہے.

اور آپ کو معلوم ہے کہ اس سانپ پالنے کا نتیجہ کیا نکلا؟

خود حضرت عمرؓ کی شہادت، جو اسی ہرمزان کی سازش سے ہوئی!

تاریخ انسانیت کا سب سے بڑا الم انگیز حادثہ!!

محرومیِ آدم کی خونچکاں داستان!!!

اے کاش حضرت عمرؓ کو اس کا احساس ہوتا کہ ان کی زندگی اسلام اور عالمِ انسانیت کے لئے کس قدر اہمیت رکھتی تھی! اگر وہ اپنی طبیعی موت مرتے اور اس طرح دس بیس برس اور زندہ رہتے تو آج دنیا کا نقشہ کچھ اور ہوتا، انسان، شرف و مجد کی انتہائی بلندیوں تک پہنچا ہوتا.

سچ ہے کوئی جتنی بڑی شخصیت ہو، اس کی اجتہادی غلطی اتنے ہی زیادہ دور رس نتائج کی حامل ہوتی ہے.

اور بھی ہیں وہ مقامات جہاں انسان ورطۂ حیرت میں گم ہو جانے کے سوا کچھ کہہ سکتا ہے نہ کر سکتا.

عام لوگ اسے نوشتۂ تقدیر کہہ کر اپنے آپ کو جھوٹا اطمینان دلا لیتے ہیں لیکن جس کی نگاہیں قرآن پر ہوں وہ ایسا بھی نہیں کر سکتا۔ خود حضرت عمرؓ نے مسئلۂ تقدیر کی جو بصیرت افروز تشریح فرمائی تھی، اس کے پیشِ نظر وہ بھی اس حادثہ کو نوشتۂ تقدیر کہنے کے لئے تیار نہ ہوتے، تو راہِ صواب یہی ہے کہ کچھ بھی کہا جائے اور ایک سرد آہ کھینچ کر آگے بڑھا جائے اور کہا جائے تو اتنا کہ یہ واقعہ اس طرح سرزد نہیں ہوا ہوگا۔

(۵)

یزدگرد کی بیٹیوں کا قصہ

ہمارے ہاں ایک قصہ یہ بھی مشہور ہے کہ جب فارس فتح ہوا تو یزدگرد، شاہنشاہِ فارس کی تین بیٹیاں گرفتار ہو کر مدینہ آئیں۔ حضرت عمرؓ نے حکم دیا کہ انہیں عام لونڈیوں کی طرح سرِ بازار فروخت کر دیا جائے۔ اس پر حضرت علیؓ نے فرمایا کہ خاندانِ شاہی کے ساتھ اس قسم کا سلوک نہیں کرنا چاہیئے۔ ان لڑکیوں کی قیمت کا اندازہ لگا لیا جائے اور انہیں، اس قیمت کے عوض، معزز اشخاص کے سپرد کر دیا جائے۔ چنانچہ حضرت علیؓ نے انہیں خود اپنی سپرداری میں لے لیا، اور ان میں سے ایک حضرت امام حسینؓ کو، ایک محمدؓ بن ابی بکرؓ کو اور ایک عبداللہ بن عمر کو عنایت کر دی۔ جو لڑکی امام حسینؓ کو ملی، وہ ان کی زوجۂ محترمہ، شہر بانو کے نام سے مشہور ہے۔

یہ قصہ بوجوہ ناقابلِ تسلیم ہے۔

(۱) جیسا کہ ہم پہلے لکھ چکے ہیں، جنگ کے قیدیوں کے متعلق قرآنِ کریم نے واضح حکم دے دیا تھا کہ انہیں فدیہ لے کر رہا کیا جائے گا یا احساناً۔ انہیں غلام اور لونڈیاں بنانا احکامِ خداوندی کے یکسر خلاف تھا۔ اس لئے ایسے تمام واقعات جن میں کہا گیا ہو کہ ان حضرات نے جنگ کے قیدیوں کو غلام اور لونڈیاں بنا لیا تھا، غلط اور وضعی ہیں۔ ہم دیکھ رہے ہیں کہ خلافتِ صدیقی اور فاروقی میں جنگوں کا سلسلہ متواتر چلا آ رہا ہے۔ اگر وہ جنگ کے قیدیوں کو غلام اور لونڈیاں بناتے، تو اس وقت تک عرب میں، ان غلاموں اور لونڈیوں کی تعداد، خود عربوں کی آبادی سے بھی زیادہ ہو جاتی۔ ان حضرات نے کسی کو غلام بنایا نہ لونڈی۔ اس کے برعکس، تاریخ میں ایسے واقعات ملتے ہیں جن میں حضرت عمرؓ نے تاکیدی ہدایات نافذ کی تھیں کہ جنگ کے قیدیوں کو رہا کر دیا جائے۔ (تفصیل پہلے آ چکی ہے۔)

(۲) ہم دیکھ چکے ہیں کہ جب حضرت سعدؓ مدائن میں داخل ہوئے تو وہ شہر خالی تھا، اور یزدگرد، مع اپنے اہل و عیال کے، پہلے ہی فرار ہو چکا تھا۔ اس کے بعد بھی مسلمان فوجیں جس مقام پر بھی پہنچیں، یزدگرد پہلے ہی وہاں سے

فرار ہوچکا تھا۔ لہذا، مدائن یا اس کے بعد کی فتوحات کے ضمن میں یزدگرد کی لڑکیوں کے گرفتار ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اگر یزدگرد کے اہل وعیال میں سے کوئی گرفتار ہوا ہوگا تو اس وقت جب وہ پن چکی میں قتل ہوا ہے لیکن وہ حضرت عثمانؓ کی خلافت کے زمانہ (۳۰ھ) کا واقعہ ہے۔

(۳) امام حسینؓ کی پیدائش ۵ھ میں ہوئی اور مدائن کی فتح ۱۶ھ میں۔ اس لحاظ سے اُس وقت اُن کی عمر گیارہ بارہ برس کی تھی۔ یہ باور نہیں کیا جاسکتا کہ حضرت علیؓ نے انہیں اتنی چھوٹی سی عمر میں لونڈی عطا فرمادی ہو۔

(۴) اور سب سے آخر میں یہ کہ (جیسا کہ ہم دیکھ چکے ہیں) یزدگرد ۱۳ھ میں (جب حضرت عمرؓ نے اقتدار سنبھالا) تخت نشین ہوا۔ اس وقت اس کی عمر سولہ یا اٹھارہ سال کی تھی۔ مدائن کی فتح ۱۶ھ میں ہوئی۔ اس وقت اس کی عمر زیادہ سے زیادہ انیس یا اکیس سال کی ہوسکتی ہے۔ کیا اس عمر کے لڑکے کے ہاں، تین بیٹیاں اتنی بڑی عمر کی ہوسکتی ہیں کہ وہ تمتّع کے قابل ہوسکیں!

آپ اس ایک قصّہ سے اندازہ لگا لیجئے کہ ہماری تاریخ میں کس کس قسم کے واقعات درج ہیں، اور وہ پھر کس طرح صدیوں سے بلاتحقیق صحیح تسلیم ہوتے چلے آرہے ہیں۔

(۵)

معجزات

آپ قرآنِ کریم پر ایک نگاہ ڈال لیجئے۔ آپ دیکھیں گے کہ مخالفین حضور نبئ اکرمؐ سے بار بار تقاضا کرتے تھے کہ ہمیں کوئی معجزہ دکھایئے، تب ہم ایمان لائیں گے لیکن قرآن، ہر بار ان کے اس مطالبہ کو جھٹک دیتا تھا۔ وہ ان سے کہتا تھا کہ معجزہ سے تمہاری مراد یہی ہے نا کہ کوئی خارقِ عادت واقعہ ظہور میں آئے۔ یعنی ایسا واقعہ جو فطرت کے قانونِ علّت ومعلول کے خلاف ہو۔ اگر معجزہ سے یہی مراد ہے تو یہ سارا سلسلۂ کائنات، ایک عظیم، زندہ معجزہ ہے۔ اللہ تعالیٰ اسے عدم سے وجود میں لایا ہے اور کسی شے کا عدم (NOTHINGNESS) سے وجود میں آجانا، فطرت کے قانونِ علّت ومعلول (CAUSE AND EFFECT) کے یکسر خلاف ہے۔

جب وہ اس پر بھی نہ مانتے تو آپؐ ان سے کہتے کہ میرا معجزہ یہ قرآن ہے۔ تم عرب ہو، تمہیں اپنی فصاحت و بلاغت پر بڑا ناز ہے۔ یہ قرآن، تمہاری زبان میں ہے۔ اگر تم سمجھتے ہو کہ یہ خدا کا کلام نہیں، انسان کا کلام ہے، تو تم سب مل کر، اس کی ایک سورۃ کی مثل، تصنیف کرکے دکھاؤ۔ بات صاف ہوجائے گی۔ انہوں نے اس چیلنج کو بھی قبول نہ کیا لیکن اپنا مطالبہ دہراتے چلے گئے، تو آپؐ نے ان سے کہا کہ آؤ! میں تمہارے سامنے ایک ایسا

"معجزہ" پیش کرتا ہوں جس سے اس بات کا حتمی طور پر فیصلہ ہو جائے گا کہ میں اپنے دعویٰ میں سچا ہوں یا جھوٹا اور وہ "معجزہ" یہ ہے۔

فَقَدۡ لَبِثۡتُ فِیۡکُمۡ عُمُرًا مِّنۡ قَبۡلِہٖ ؕ اَفَلَا تَعۡقِلُوۡنَ ۔ (۱۰/۱۶)

میں تم میں کوئی اجنبی نہیں. کہیں باہر سے نہیں آیا. میں نے اپنے دعویٰ نبوت سے پہلے اپنی ساری عمر تمہارے اندر بسر کی ہے. تم سوچو اور بتاؤ کہ کیا ایسی زندگی جھوٹے کی ہوتی ہے یا سچے کی!

اور اس کا وہ کوئی جواب نہ دے سکے. اس شہادت کو سب نے سچا تسلیم کر لیا اور حضورؐ کا یہ وہ "معجزہ" ہے جو قیامت تک کے لئے زندہ و تابندہ ہے۔

اور اس کے ساتھ ہی معجزہ یہ کہ آپؐ نے یتیمی کی حالت میں پرورش پائی، غربت کی حالت میں ہجرت کی لیکن اس کے چھ سات سال کے بعد آپؐ کی سطوت و حشمت کا یہ عالم تھا کہ آپؐ قیصر و کسریٰ کو پورے جلال کے ساتھ مخاطب کر کے تنبیہ فرماتے ہیں کہ تمہاری مملکت میں کاشتکاروں اور محنت کشوں پر جو مظالم ہو رہے ہیں، اگر تم نے ان کا سدباب نہ کیا تو تم سے اس کا مواخذہ کیا جائے گا اور پھر ان سے سچ مچ مواخذہ کیا گیا۔

یہ تھے حضورؐ کے "معجزات" جن کا اقرار ساری دنیا نے کیا۔

حضورؐ کے بعد آپؐ کے صحابہ کبارؓ کی طرف آئیے. ان میں سے بھی کسی نے نہ "روحانیت" کا دعویٰ کیا، نہ اُن سے کشف و کرامات سرزد ہوئے. آپ دیکھیں گے کہ اس عہد کی زبان میں کشف و کرامات، الہام وغیرہ قسم کی اصطلاحات ہی نہیں ملتیں. نبی اکرمؐ کے متعلق قرآنِ کریم نے

کشف و کرامات

کہا تھا کہ وَ اِنَّکَ لَعَلٰی خُلُقٍ عَظِیۡمٍ ۔ (۶۸/۴) "بے شک آپؐ سیرت و کردار کے بلند ترین مقام پر فائز ہیں". حضورؐ کے اتباع میں یہی خصوصیت آپؐ کے دست پروردگان (صحابہ کبارؓ) کی تھی. ان کی سیرت کی پاکیزگی اور کردار کی بلندی ان کی سب سے بڑی خصوصیت اور نمایاں "کرامت" تھی ـــ اور اس سے آگے یہ "کرامت" کہ انہوں نے دس سال کی قلیل ترین مدت میں، ایران اور روما جیسی عظیم مملکتوں کا تختہ اُلٹ دیا اور ان کی جگہ ایک ایسی مملکت متشکل فرما دی جس میں اطمینان و امن کا یہ عالم تھا کہ (حضورؐ کے ارشاد کے مطابق) ایک عورت، زیور میں لدی پھندی تنہا یمن سے چل کر صحراؤں، جنگلوں، یا بیابانوں کو عبور کرتی شام تک پہنچ جاتی تھی اور اسے راستے میں نہ کسی قسم کا خوف ہوتا تھا نہ حزن. وہ مملکت جس میں رات کو کوئی فرد بھوکا نہیں سوتا تھا اور کسی بدو کی بچی تک "دودھ میں پانی نہیں ملاتی تھی". (تفصیل آگے چل کر آئے گی)

یہ تھیں ان حضرات کی "کرامات" جو تاریخ کے صفحات پر سورج کی کرنوں سے منقوش ملتی ہیں اور جو آج بھی اُسی طرح تحیر انگیز اور اثر آفریں ہیں جیسے چودہ سو سال پہلے۔ اقبالؒ کے الفاظ میں، وہ حضرات زبانِ حال سے کہتے تھے کہ

قلندریم و کراماتِ ما جہاں بینی ست زما نگاہ طلب، کیمیا چہ می جوئی

بعد میں جب مسلمانوں میں تصوف نے بار پایا تو ان حضرات (صوفیاء) کو اپنے مسلک کی سند کے لئے صدرِ اوّل میں "کشف و کرامات" کی تلاش ہوئی..... ان کے ہاں کوئی اس قسم کی شے ہوئی تو ملتی۔ مگر جب مقصد اپنے دعویٰ کا اثبات ہو، تو ناموجود کو موجود کر دکھانا کونسا مشکل ہوتا ہے؟ چنانچہ انہوں نے حضرت عمرؓ کی بھی ایک "کرامت" وضع کر ڈالی اور اسے تاریخ میں درج کر دیا۔ ملاحظہ فرمائیے۔

یاساریہ! الی الجبل

ایرانی مہمات کے سلسلہ میں، ایک مقام پر حضرت ساریہ بن زنیم ایک فوجی دستے کے کمانڈر تھے۔ ایک دن حضرت عمرؓ مسجدِ نبویؐ میں خطبہ دے رہے تھے کہ آپ نے دفعتہً پکار کر کہا ـــ یا ساریہ! الی الجبل ـــ ساریہ! پہاڑ کی طرف ہٹ جاؤ ـــ لوگوں کی سمجھ میں کچھ نہ آیا کہ آپ نے اچانک اور غیر متعلق طور پر یہ کیا کہہ دیا۔

کچھ عرصہ کے بعد ساریہ کا قاصد فتح کی خوشخبری لے کر مدینہ آیا تو لوگوں کے پوچھنے پر اس نے کہا کہ ایک دن ہم ایک مہم میں مصروف تھے اور محویت کا یہ عالم کہ ہماری نگاہ اِدھر اُدھر اٹھ ہی نہیں رہی تھی کہ اتنے میں ہم نے حضرت عمرؓ کی یہ گرجدار آواز سنی کہ ـــ یا ساریہ! الی الجبل ـــ یہ سُنکر ساریہ ہمیں فوراً پہاڑ کی اوٹ میں لے آئے۔ اس وقت ہم نے دیکھا کہ دشمن ہماری کمین میں تھا اور اگر ہم اس آواز پر اس طرف کو نہ ہو جاتے تو دشمن کے ہاتھوں تباہ ہو جاتے۔

یہ ہے وہ "کرامت" جسے حضرت عمرؓ کی طرف منسوب کیا جاتا ہے اور جسے اہلِ تصوف اس دعویٰ کے ثبوت میں بطور سند پیش کرتے ہیں کہ اہل اللہ کو غائب کا علم ہوتا ہے اور ان کی نگاہیں وہ کچھ دیکھتی ہیں، جو عام لوگ نہیں دیکھ سکتے اور ان کی آواز وہاں تک پہنچ سکتی ہے جہاں تک ہمارے تصوّر کی رسائی بھی ممکن نہیں ہوتی۔ یہ سند پیش کرتے ہیں اور پھر اس بنیاد پر حضرات اولیاء کرام کے کشف و کرامات کی فلک بوس عمارات استوار ہوتی چلی جاتی ہیں۔

ہمارا قدامت پرست طبقہ اس روایت کی صحت پر وحیٔ منزّل کی طرح ایمان رکھتا ہے کیوں کہ یہ ان کے

معتقداوں کے دعاوی کے لئے سند کا کام دیتی ہے. ہیکل اس کے متعلق تذبذب میں ہے اور کہتا ہے کہ

میں کوئی ایسی علمی توجیہہ نہیں پاتا جو مجھے اس روایت پر مطمئن کر دے، اس لئے کہ وحی کا سلسلہ رسول اللہ کی وفات پر ختم ہو گیا تھا اور "لاسلکی پیغام رسانی (WIRELESS) نہ صرف یہ کہ اس زمانے میں نامعروف تھی بلکہ اس کا خیال بھی کسی کے ذہن میں نہیں آسکتا تھا. پھر یہ بھی قطعیت کے ساتھ نہیں کہا جاسکتا کہ یہ بات "انتقالِ افکار" (TELEPATHY) کے ذریعے پہنچی تھی اور حضرت عمرؓ کی روحانی کیفیت اس رات ساریہ کے نفس پر طاری ہو گئی تھی جس کے زیرِ اثر وہ امیر المومنین کا حکم اس طرح بجالا رہے تھے. جس طرح عملِ تنویم (HYPNOTISM) کا معمول اپنے عامل کے احکام کی تعمیل کرتا ہے.

لیکن ہمیں اس مخمصہ میں پڑنے کی ضرورت کیا ہے. قرآن کا فیصلہ ہے کہ وحی کے سوا (جس کا سلسلہ حضورؐ کی ذاتِ اقدس پر ختم ہو گیا) علمِ غائب کسی کو حاصل نہیں ہو سکتا. اس لئے حضرت عمرؓ مدینہ میں بیٹھے میدانِ کارزار کا منظر اپنی آنکھوں سے دیکھ سکتے تھے، نہ ایسی ہدایت ان تک پہنچا سکتے تھے.

اور اس کے وضعی ہونے کا بدیہی ثبوت یہ ہے کہ جو (حضرت) عمرؓ ہزار ہا میل کے فاصلے پر میدانِ کارزار کو اس طرح اپنی آنکھوں کے سامنے دیکھ سکتے تھے وہ اپنے اس قاتل (فیروز ابو لولو) کو کیوں نہ دیکھ سکے جو ان کے بالمقابل اوٹ میں کھڑا تھا اور جس نے وہاں سے نکل کر، دندناتے ہوتے، خنجر کے وار سے انہیں شہید کر دیا.

حقیقت یہ ہے کہ جب کوئی قوم اپنی قوتِ ایمانی سے محروم اور زورِ بازو سے مجبور ہو جاتی ہے تو وہ اس قسم کے انسانوں میں جھوٹا اطمینان تلاش کرنے لگ جاتی ہے. اقبالؒ کے الفاظ میں.

محکوم کو پیروں کی کرامات کا سودا
ہے بندۂ آزاد خود اک زندہ کرامات

ان اعجوبہ پسند ذہنوں کو "یا ساریہ! الی الجبل" کی آواز تو سنائی دیتی ہے لیکن حضرت عمرؓ کا " لا غالب الا ھو" کا وہ تہلکہ انگیز نعرہ سنائی نہیں دیتا جو آج تک اقصائے عالم میں غلغلہ انداز ہے. انہیں کون بتائے کہ حضرت عمرؓ کی "کرامت" وہ بائیس لاکھ مربع میل پر پھیلی ہوئی مملکت تھی جو دین کے تمکن اور حق کے غلبہ کے لئے قوتِ بازو سے حاصل کی گئی تھی. ان کے "معجزات" قرآن اور شمشیر کے پیدا کردہ تھے، درود اور وظائف کے نہیں.

(o)

اسی قسم کا ایک اور افسانہ حضرت عمرؓ کی طرف منسوب کیا جاتا ہے ۔ بلکہ وہ تو اس قدر لغو ہے کہ اسے درخورِ اعتنا قرار دینے کو جی نہیں چاہتا لیکن چونکہ اس نے بھی تاریخ میں خاصی شہرت حاصل کر رکھی ہے، اس لئے اس کا ذکر بھی ضروری معلوم ہوتا ہے۔ یہ "عروسِ نیل" کی کہانی ہے جس کے متعلق کہا جاتا ہے کہ جب حضرت عمرو بن عاصؓ مصر کے والی مقرر ہوئے تو سربرآوردہ قبطیوں کا ایک وفد ان کے پاس آیا اور کہا کہ ہماری زندگی کا دارومدار دریائے نیل کے پانی پر ہے۔ اس میں از خود روانی نہیں ہوتی۔ اس کے لئے ہم کرتے یہ ہیں کہ سال میں ایک بار، ایک دوشیزہ کا انتخاب کرتے ہیں اور اس کے ماں باپ کو رضامند کر کے اسے بہترین لباس پہناتے اور قیمتی زیورات سے آراستہ کرتے ہیں۔ اس کے بعد اسے دریا میں ڈال دیتے ہیں اور وہ بہنے لگ جاتا ہے۔ یہ سن کر حضرت عمرو بن عاصؓ نے کہا کہ یہ بات اسلام کے خلاف ہے۔ اس لئے ہم اس وحشت و بربریت کی رسم کی اجازت نہیں دے سکتے۔ اس پر قبطیوں نے کہا کہ پھر ہم ترکِ وطن پر مجبور ہو جائیں گے کیونکہ اس کے بغیر دریا میں روانی پیدا نہیں ہوگی اور ہم بھوکے مر جائیں گے۔

عروسِ نیل کی کہانی

حضرت عمرو بن عاصؓ نے یہ سارا ماجرا حضرت عمرؓ کو لکھ کر بھیجا۔ اس کے جواب میں حضرت عمرؓ نے انہیں خط لکھا اور اس کے ساتھ ایک پُرزہ منسلک کیا اور کہا کہ اس پُرزہ کو دریائے نیل میں ڈال دینا۔ انہوں نے اس پُرزے کو کھول کر پڑھا، تو اس میں لکھا تھا۔

> اللہ کے بندے امیر المومنین عمرؓ کی طرف سے دریائے نیل کے نام،
>
> اما بعد! اگر تو اپنی مرضی سے بہتا ہے تو نہ بہ۔ لیکن اگر تجھ میں روانی پیدا کرنے والا خدائے واحد و قہار ہے تو ہم اس خدا سے التجا کرتے ہیں کہ وہ تجھ میں روانی پیدا کر دے۔

حضرت عمرو بن عاصؓ نے لوگوں کو اس پرزے کے مضمون سے آگاہ کیا اور رسم سے ایک دن (یعنی عیدِ صلیب سے ایک دن) پہلے اسے دریا میں ڈال دیا۔ جب وہ لوگ دوسری صبح اُٹھے تو دریا کا پاٹ سولہ ہاتھ ہو گیا تھا۔ اس سے اس قبیح رسم کا خاتمہ ہو گیا۔

ہمارے افسانہ نگاروں نے اس سے گنڈے تعویذ کے جواز کی سند تو حاصل کر لی لیکن یہ نہ سوچا کہ اس سے اسلام، اسلام کے خدا، اور اس خدا کے عبد امیر المومنین حضرت عمرؓ کے متعلق کس قسم کا توہم پرستانہ تصور قائم ہوتا ہے۔ اگر حضرت عمرؓ کے پُرزہ سے دریائے نیل میں روانی آسکتی تھی تو ان کے عہد میں، عرب میں خشک سالی کی وجہ سے جو عالمگیر قحط پڑا تھا اور جس سے بڑی تباہی آگئی تھی، آپ نے بادلوں کی طرف کوئی پرزہ کیوں نہ بھیجا کہ بارش

ہوجاتی اور قحط کی بلاٹل جاتی۔ یاد رکھیئے! یہ سب افسانے خانقاہوں اور درگاہوں کے طلسم خانوں کی تخلیق ہیں۔
جہاں تک تاریخی تحقیق کا تعلق ہے، مغربی محققین نے صاف کہہ دیا ہے کہ مصر میں (رومن امپائر کے زمانے میں) اس قسم کی کوئی رسم ہی رائج نہیں تھی

(۹۸)

(۲)

رومیوں کے ساتھ تصادمات کا سلسلہ

ہم دیکھ چکے ہیں کہ اس دور میں، دو ہی سلطنتیں تھیں جن کی طرف سے مملکتِ اسلامیہ کو خطرہ تھا۔ ایران کی سلطنت اور بازنطینی (رومیوں) کی سلطنت۔ رومیوں کی طرف سے خطرہ خود رسول اللہ کے زمانے میں سامنے آگیا تھا اور ان کے ساتھ تصادمات کا سلسلہ حضرت صدیق اکبرؓ کے زمانۂ خلافت میں بھی جاری رہا۔ ایرانیوں کیطرف

پس منظر

سے خطرہ کی ابتداء عہدِ صدیقی میں ہوئی۔ اسلامی جیوش ان دونوں سلطنتوں کے ساتھ مصروفِ معرکہ آرائی تھے کہ حضرت صدیق اکبرؓ کی وفات ہوگئی۔ عہدِ فاروقی میں ان تصادمات کا سلسلہ آگے بڑھا لیکن چونکہ (ان میں سے) ایران کے خلاف معرکے زیادہ شدت اختیار کر گئے تھے۔ اس لئے ہم نے اس داستان کو مسلسل بیان کرنا مناسب سمجھا تاآنکہ ہم اس مقام تک پہنچ گئے جہاں ایران مکمل طور پر اسلامی مملکت کے قبضہ میں آگیا۔ اب، جبکہ ہم اُدھر سے فارغ ہوگئے ہیں تو ضروری ہے کہ اپنی توجہ کا رُخ رومیوں کے خلاف معارک آرائی کی طرف موڑیں۔ تجدیدِ یادداشت کے لئے ضروری معلوم ہوتا ہے کہ ہم چند الفاظ میں دہرادیں کہ نبرد آزمائیوں کا یہ سلسلہ عہدِ صدیقی میں کس مقام تک پہنچا تھا۔

(۱) رسول اللہ کے عہدِ مبارک میں، رومیوں کے خلاف پہلا معرکہ مؤتہ کے مقام پر ہوا تھا۔ وہاں مسلمانوں کو کامیابی نہیں ہوئی تھی۔ اور حضرت خالد بن ولیدؓ کا حسنِ تدبر اپنی افواج کو بحفاظت نکال لانے میں کامیاب ہوا تھا۔

(۲) پھر حضورؐ نے خود لشکر کشائی کی لیکن تبوک کے مقام پر جاکر معلوم ہوا کہ رومیوں کی طرف سے حملے کی جو خبریں پھیلی تھیں وہ غلط تھیں۔ اس لئے یہ لشکر بلا تصادم واپس آگیا۔

(۳) اپنی حیاتِ ارضی کے آخری ایام میں حضورؐ نے رومیوں کی روک تھام کے لئے ایک لشکرِ جرار حضرت

اسامہ بن زیدؓ کی زیرِ سرکردگی مرتب فرمایا لیکن وہ ابھی روانہ بھی نہیں ہُوا تھا کہ حضورؐ دنیا سے تشریف لے گئے۔

(۴) حضرت صدیق اکبرؓ نے اسی لشکر کو روانہ کر دیا۔ وہاں کوئی خاص معرکہ تو نہیں ہُوا البتہ مختلف مقامات پر جو جھڑپیں ہوئیں ان میں اسلامی لشکر کو نمایاں کامیابی حاصل ہوئی۔

(۵) حضرت ابو بکر صدیقؓ نے پھر ایک عظیم لشکر رومیوں کے خلاف بھیجا۔ اس نے یرموک کے مقام پر رومیوں کو شکستِ فاش ہوئی۔

(۶) اور آخر الامر دمشق بھی فتح ہو گیا۔ اس کے بعد حضرت ابو بکر صدیقؓ کی وفات پا گئی۔

اب آیئے عہدِ فاروقی کی طرف۔ واضح رہے کہ حضرت ابو بکر صدیقؓ نے شام کی طرف چار لشکر روانہ فرمائے تھے، جن کے سپہ سالار حضرت عمرو بن عاصؓ، شرحبیل بن حسنہؓ، خالد بن ولیدؓ اور ابو عبیدہ ابن الجراحؓ تھے اور طے یہ پایا تھا کہ ان لشکروں کی بہ ہیئتِ مجموعی کمان حضرت ابو عبیدہ کے ہاتھ میں ہوگی۔ (واضح رہے کہ یہ ابو عبیدہؓ، ان ابو عبیدہ ثقفی سے مختلف ہیں جو معرکہ جسر میں شہید ہو گئے تھے۔ یہ ابو عبیدہؓ ابن الجراح مشہور صحابی ہیں۔)

فتح دمشق کے بعد فحل اور بیسان کے مقامات پر رومیوں کے ساتھ ٹکراؤ ہوا۔ جن میں انہیں شدید شکست کا سامنا کرنا پڑا .... اسی سال حمص کا معرکہ پیش آیا جو بڑی اہمیت کا حامل ہے۔

حمص کی فتح ۱۵ھ ۶۳۵ء

حمص، شام کے اضلاع میں سب سے بڑا ضلع تھا اور بڑی شہرت کا مالک لیکن یہ بھی بڑی آسانی سے فتح ہو گیا۔ اس کے بعد چند ایک چھوٹے چھوٹے مقامات پر مقابلہ ہوا اور ہر مقابلہ میں مسلمانوں کو فتح حاصل ہوئی۔ یوں حماۃ، شیزر، لاذقیہ، سلمیہ، قنسرین، اور حلب بھی مسلمانوں کے قبضے میں آ گئے۔ یہ کامیابیاں حضرت ابو عبیدہؓ ابن الجراح کے حسنِ تدبّر اور حضرت خالد بن ولیدؓ کی اس شمشیر خارہ شگاف کے تصدق حاصل ہوئیں جسے رسول اللہؐ نے سیف اللہ کہہ کر پکارا تھا۔ ان کی وجہ سے حضرت عمرؓ کے دل میں حضرت خالدؓ کی بڑی قدر و قیمت تھی ــــ اور ہونی بھی چاہیئے تھی (یہ ۱۵ھ مطابق ۶۳۵ء کے واقعات ہیں)

ان فتوحات کے بعد انطاکیہ کی باری آئی جو قیصر کا ایشیائی دارالسلطنت تھا اور جہاں تمام شکست خوردہ عیسائی

انطاکیہ کا معرکہ ۱۵ھ ۶۳۵ء

بھاگ بھاگ کر جمع ہو گئے تھے۔ اس مقام پر ہرقل نے تمام بڑے بڑے مدبّر اور دانشور عیسائی معزّزین کو جمع کیا اور ان سے پوچھا کہ مسلمانوں کی اس قدر محیّر العقول کامرانیوں اور عیسائیوں کی پے در پے شکستوں کی وجہ کیا ہے؟ ایک نہایت جہاندیدہ، پختہ کار،

عمر رسیدہ مدبر نے کہا کہ اس کی اصل وجہ یہ ہے کہ:۔

ان لوگوں کے اخلاق ہم سے بہت بلند ہیں۔ وہ دن کو روزے رکھ کر مصروفِ جہاد رہتے ہیں اور راتوں کو خدا کے حضور سجدہ ریز۔ وہ کسی پر ظلم نہیں کرتے۔ خواہ وہ ان کا مفتوح و مغلوب ہی کیوں نہ ہو۔ آپس میں برادرانہ

مسلمانوں کی فتوحات کا راز

مساوات کا برتاؤ کرتے ہیں۔ ان میں نہ کوئی بڑا ہے نہ چھوٹا۔ ہمارا حال یہ ہے کہ شرابیں پیتے ہیں، بدکاریاں کرتے ہیں، قول و اقرار کی پابندی نہیں کرتے۔ دوسروں پر ظلم کرتے ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ ان کے ہر کام میں جوش اور استقلال ہوتا ہے اور ہمارا جو کام بھی ہو، ہمت اور عزم سے خالی ہوتا ہے

یہ وہ حقیقت تھی جس کا اعتراف دشمن بھی کرتے تھے۔ مسلمانوں کی ان محیر العقول کامیابیوں کا راز ان کی بلندیٔ اخلاق اور پاکیزگیٔ سیرت میں تھا۔ یہ سب نتیجہ تھا اقدارِ خداوندی کی پابندی کا۔

ہرقل شام سے فرار ہو جانا چاہتا تھا لیکن جب اس نے دیکھا کہ چاروں طرف سے شکست خوردہ عیسائی پناہ لینے کے لئے اس کی طرف اُمنڈے چلے آرہے ہیں تو اس کی غیرت نے گوارا نہ کیا کہ وہاں سے بھاگ نکلے۔ چنانچہ اس نے مقابلہ کرنے کا فیصلہ کیا اور اس کے لئے بڑے عظیم پیمانے پر تیاریاں شروع کر دیں لیکن شاید اسے اس تصادم کا بھی انجام معلوم تھا اس لئے وہ خود انطاکیہ کے بجائے رہا کے مقام پر بیٹھا رہا جو اس کے نزدیک یا تو انطاکیہ سے زیادہ محفوظ تھا اور یا وہاں سے بآسانی قسطنطنیہ کی طرف بھاگا جا سکتا تھا۔

جیوشِ اسلامیہ نے انطاکیہ کا محاصرہ کیا تو عیسائیوں نے فوراً اطاعت قبول کر لی اور حضرت ابو عبیدہؓ نے انہیں معاہدۂ امن لکھ دیا۔

لیکن انہوں نے چند دنوں کے بعد اس معاہدہ کو توڑ دیا ــــ یہ حرکت صرف انطاکیہ تک محدود نہیں تھی۔ عیسائیوں نے اکثر و بیشتر مقامات پر ایسا ہی کیا تھا اور ان کی اس عادتِ مستمرہ کے پیشِ نظر مسلمانوں کو سوچنا پڑا تھا کہ ان فتنوں کا حتمی علاج کرنا نہایت ضروری ہے۔ اس مقصد کے لئے انہوں نے عیسائیوں کے خلاف فیصلہ کن جنگ کا تہیہ کیا۔ ادھر عیسائیوں نے بھی یہ سوچ لیا کہ اب ایسا وقت آپہنچا ہے کہ یا تو عربوں کو شام کا علاقہ خالی کرنا پڑے گا اور یا ہم ہمیشہ کے لئے اسے خیر باد کہہ دیں گے۔ چنانچہ انہوں نے مختلف مقامات سے فوجوں کو جمع کیا۔ دوسری طرف حضرت ابو عبیدہؓ نے بھی اپنی مختلف مقامات میں بکھری ہوئی فوجوں کو اس مرکز پر جمع ہو جانے کے احکام بھیج دیئے ــــ یہی وہ ضرورت تھی جس کے پیشِ نظر اسلامی فوجوں کو حمص چھوڑنا پڑا۔

تھا اور جزیہ کی جو رقم ان سے لی تھی اسے واپس کر دیا تھا۔ (تفصیل پہلے گزر چکی ہے) حقیقت یہ ہے مسلمانوں نے جزیہ کی رقم صرف اہلِ حمص کو واپس نہیں کی تھی بلکہ جس جس مقام کو بھی اسلامی فوجوں نے چھوڑا تھا، جزیہ کی رقم واپس کر دی تھی۔

یہ فیصلہ کن جنگ، یرموک کے قریب ہوئی تھی۔ جہاں عہدِ صدیقی میں بھی رومیوں کو شکست کھانی پڑی تھی اور

ہرقل کا فرار، شام کی مکمل فتح ۱۵ھ ۶۳۵ء

یہاں پھر ایسی شکست کھائی کہ ہرقل نے شام کو آخری سلام کہہ کر، قسطنطنیہ میں جا کر پناہ لی۔ اب شام مکمل طور پر فتح ہو چکا تھا۔

ہم اوپر دیکھ چکے ہیں کہ حضرت صدیق اکبرؓ نے شام کی طرف چار لشکر، چار مختلف سپہ سالاروں کی زیرِ سرکردگی بھیجے تھے۔ ان میں سے حضرت عمرو بن عاصؓ کے سپرد فلسطین کا علاقہ کیا گیا تھا۔ انہوں نے اس دوران میں اس علاقہ کے چند ایک مقامات کو فتح بھی کر لیا تھا لیکن وہاں ہنوز کوئی فیصلہ کن معرکہ پیش نہیں آیا تھا۔ فلسطین کا مرکزی مقام بیت المقدس تھا۔ بیت المقدس کی اہمیت قسطنطنیہ سے کم نہیں تھی، بلکہ ایک نقطۂ نگاہ سے اس سے بھی زیادہ تھی۔ قسطنطنیہ رومیوں (عیسائیوں) کا قومی یا دنیاوی مرکز تھا لیکن بیت المقدس ان کا مذہبی اور روحانی نشیمن جس سے کروڑوں عیسائیوں کے قلوب وابستہ تھے۔ اسکی عظمت و عقیدت ان کے دل کی گہرائیوں میں اس

بیت المقدس

حد تک پیوست تھی کہ وہ اس کی حفاظت کی خاطر اپنا سب کچھ نثار کر دینے کو اپنی انتہائی خوش بختی سمجھتے تھے۔

لیکن جذباتی عقیدتمندیاں بھی اسی وقت خوشگوار نتائج پیدا کر سکتی ہیں جب قوم کی ہمتیں جوان اور عزائم پُرشباب ہوں۔ شکست خوردہ، ہزیمت گزیدہ، دوں ہمت قوم کے لئے یہ بھی کوئی محکم سہارا نہیں بن سکتیں۔ چنانچہ جب عیسائیوں نے دیکھا کہ مسلمانوں کو پے در پے کامیابیاں ہو رہی ہیں، تو وہ بجائے اس کے کہ بیت المقدس کی حفاظت کے لئے مر مٹنے پر آمادہ ہو جاتے "انہوں نے وہاں کے تبرکات کو قسطنطنیہ منتقل کر دیا لیکن اس کے باوجود، اس کی اہمیت اس قدر تھی کہ ہرقل نے وہاں کثیر تعداد میں فوجیں جمع کر دیں جن کی قیادت روم کا سب سے بڑا سپہ سالار اطربون کر رہا تھا اور عیسائی سپاہیوں کے مذہبی جذبات کو برانگیختہ کرنے کے لئے وہاں کا اسقفِ اعظم صفرنیوس، معبد میں موجود تھا۔ فتح بیت المقدس کے متعلق ہمارے ہاں بہت سی روایات مذکور ہیں، جو ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔ ان کی رُو سے کہا یہ جاتا ہے کہ جب مسلمانوں نے اس کا محاصرہ کیا تو اطربون وہاں سے پہلے ہی

بھاگ چکا تھا اور صفرینوس نے حضرت عمرو بن عاصؓ کے پاس پیغام بھیجا کہ ہم بلا مقابلہ اطاعت کے لئے تیار ہیں، بشرطیکہ معاہدۂ صلح پر آپ کا امیر المومنین خود یہاں آکر دستخط کرے۔ اس مقصد کے لئے حضرت عمرؓ مدینہ سے بیت المقدس تشریف لے گئے تھے۔

لیکن یہ روایات چنداں قابلِ اعتماد نہیں۔ عیسائی رومی، بیت المقدس جیسے مقام کو اتنی آسانی سے چھوڑنے والے نہیں تھے۔ روایات وہی قابلِ اعتماد ہیں جن میں کہا گیا ہے کہ اہلِ بیت المقدس نے بڑی شدت سے مقابلہ

فتح بیت المقدس

۱۶ھ، ۶۳۷ء

کیا اور جب محاصرہ طول کھینچ گیا اور کامیابی مشکل نظر آئی، تو حضرت عمرو بن عاصؓ نے مدینہ سے کمک طلب کی۔ معاملہ کی اہمیت اور مقابلہ کی سنگینی کے پیشِ نظر حضرت عمرؓ نے یہی مناسبت سمجھا کہ خود کمک لے کر بیت المقدس جائیں۔ چنانچہ وہ اس طرح تشریف لائے اور جابیہ کے مقام پر، جو صحرائے شام اور سرزمینِ اُردن کے اتصال پر واقعہ ہے، خیمہ زن ہو گئے۔ یہاں بیٹھ کر حضرت عمرؓ نے دیگر سپہ سالاروں کے مشورہ سے، جنگ کا نیا نقشہ مرتب کیا۔ جب اہلِ بیت المقدس کو اس کا علم ہوا تو انہوں نے اندازہ لگالیا کہ مسلمانوں کا مقابلہ ممکن نہیں۔ چنانچہ اطربون تو کچھ فوج ہمراہ لے کر چپکے سے مصر کی طرف کھسک گیا اور بوڑھے پادری (صفرینوس) نے اسی میں راہِ نجات دیکھی کہ مسلمانوں سے صلح کا معاہدہ کر لیا جائے۔ چونکہ اسے معلوم تھا کہ حضرت عمرؓ جابیہ میں فروکش ہیں، اس لئے اس نے (اپنی اہمیت اور عزتِ نفس کے خیال سے) یہ شرط لگادی کہ امیر المومنین بہ نفسِ نفیس معاہدہ کے لئے تشریف لائیں۔ حضرت عمرؓ کا سفرِ بیت المقدس جس کی تفصیل روایات میں شرح و بسط سے مذکور ہے، جابیہ سے بیت المقدس کا سفر تھا۔

آیئے، اس "شاہانہ جلوس" کی ایک جھلک ہم بھی دیکھ لیں کہ اس طرح کے فردوس بداماں مناظر کب کب

حضرت عمرؓ کا سفرِ بیت المقدس

دیکھنے کو ملتے ہیں۔ کتبِ تاریخ میں اس سفر کی مختلف تفاصیل مذکور ہیں۔ ان کا ملخص درج ذیل ہے۔

> بائیس لاکھ مربع میل پر پھیلی ہوئی مملکت کا یہ سربراہ فاتحِ ایران و روم کی حیثیت سے عازمِ سفر ہوا تو بایں نمط ایک اونٹنی پر سوار تھے جس پر ایک ادنیٰ کمبل پڑا تھا۔ یہ کمبل بحالتِ قیام بستر کا کام بھی دیتا تھا۔ سر پر نہ ٹوپی تھی نہ عمامہ۔ دونوں پاؤں بے رکاب کجاوے میں ایک دوسرے سے رگڑ کھا رہے تھے۔ خرجی کھال کی تھی، جس میں کھجور کی چھال بھری ہوئی تھی۔ اسے ضرورت کے وقت تکیہ

بنا لیا جاتا تھا۔ اِدھر اُدھر دو تھیلے لٹک رہے تھے، جن میں سے ایک میں ستو تھے اور دوسرے میں کھجوریں، سامنے پانی کا مشکیزہ تھا۔ رفقاء کی جماعت ساتھ تھی۔ آپ ہر روز صبح اپنے رفقاء کے ساتھ بیٹھتے، اپنا زادِ راہ دسترخوان پر رکھ دیتے جسے سب مل کر کھا لیتے۔ راستے میں چلتے بھی جاتے اور اپنے ہمسفروں کو دین کی تعلیم بھی دیتے جاتے۔ بعض روایات میں ہے کہ ایک ایک اونٹ دو دو سواروں کے حصے میں آیا تھا اور آپ کا زمیل آپ کا غلام (ملازم) تھا طے یہ پایا تھا کہ ایک منزل آپ سوار ہوتے اور وہ غلام مہار پکڑتا اور دوسری منزل وہ (غلام) سوار ہوتا اور آپ مہار پکڑتے۔ ایک جگہ راستے میں پانی آ گیا تو آپ اونٹنی سے اترے، موزے اتار کر ہاتھ میں پکڑ لئے اونٹنی کو ساتھ لے کر پانی میں اتر گئے۔ حضرت ابو عبیدہؓ نے دیکھا تو کہا کہ آج آپ نے وہ کام کیا ہے جس کی اہل زمین کے نزدیک بڑی عظمت ہے۔ آپ نے یہ کیا اور وہ کیا ہے۔ آپ نے سُنا تو فرمایا۔ "ابو عبیدہ! یہ بات تمہارے کہنے کی نہیں تھی۔ ہم سب سے زیادہ غریب، سب سے زیادہ حقیر اور سب سے زیادہ قلیل تھے

ہماری عزت اسلام کا صدقہ ہے

اللہ نے ہمیں اسلام سے عزت دی۔ یہی ہمارے لئے وجۂ شرف ہونا چاہیئے۔ اگر ہم نے اللہ کے سوا کسی اور سے عزت طلب کی تو اللہ ہمیں ذلیل کر دے گا۔"

بیت المقدس سے کچھ فاصلہ پر تھے تو سواروں کا وہ دستہ آ پہنچا جسے حضرت ابو عبیدہؓ نے آپ کے استقبال کے لئے بھیجا تھا۔ اس وقت کیفیت یہ تھی کہ آپ مدے کا کُرتہ پہنے ہوتے تھے جس میں چودہ پیوند لگے ہوتے تھے اور ان میں بعض پیوند چمڑے کے تھے۔ ہمراہیوں نے عرض کیا کہ آپ ایک نئے ملک میں، اجنبی قوم کے ہاں، فاتح کی حیثیت سے جا رہے ہیں۔ بہتر ہو کہ آپ اونٹنی کے بجائے اس ترکی گھوڑے پر سوار ہو جائیں اور وہ لباس پہن لیں جسے حضرت ابو عبیدہؓ نے آپ کے بھیجا ہے۔ آپ نے ان کا مشورہ قبول فرما لیا اور وہ لباس فاخرہ پہن کر ترکی گھوڑے پر سوار ہو گئے۔ چار قدم ہی چلے ہوں گے تو گھوڑے سے اتر گئے اور اپنے رفقاء سے کہا کہ "عزیزانِ من! تم میری اس لغزش سے درگزر کرو۔ اللہ قیامت میں تمہاری لغزش سے درگذر کرے گا۔ جس نخوت اور تکبر نے اس وقت میرے دل میں راہ پائی وہ یقیناً تمہارے امیر کو ہلاک کر دیتے۔" اس کے بعد وہ پوشاک اتار کر پھر وہی پیوند لگے کپڑے پہن لئے۔

آ گے گئے تو حضرت ابو عبیدہ ' حضرت خالد بن ولیدؓ اور حضرت یزید بن سفیانؓ آپ کے استقبال کیلئے آئے . انہوں نے ریشمی کرتے پہن رکھے تھے . آپ نے دیکھا تو سخت برافروختہ ہوئے اور کہا کہ 'تم لوگ اتنی جلدی بدل گئے . تم نے دو ہی برس میں اس قسم کی تن آسانی اختیار کر لی . اگر تمہارا یہی طرز عمل رہا تو ' خدا کی قسم ' خدا تمہاری جگہ دوسری قوم لے آئے گا اور تمہاری حکومت اسے دے دے گا کہ حریر و اطلس پہننے والی قومیں حکومت کی اہل نہیں رہتیں . انہوں نے معذرت چاہی اور عرض کیا کہ امیر المومنین! ہم نے یہ کرتے ' اس قوم کی خاطر اوپر سے پہن رکھے ہیں . دیکھ لیجئے ، ان کے نیچے وہی ہتھیار موجود ہیں . اس پر آپ کا غصہ ٹھنڈا ہوا .

لیجئے ! یہ "شاہانہ جلوس" داخلِ بیت المقدس ہو گیا . اُس قوم کا سردار ' جلوس کے استقبال کے لئے آیا تو آپ نے اس سے فرمایا .

میرا کرتہ سفر کی وجہ سے پھٹ گیا ہے . اسے دھو بھی دیجئے اور سی بھی لائیے اور اتنی مدت کیلئے مجھے کوئی اور کرتہ دے دیجئے . اس نے وہ کرتہ بھی دھو اور سی دیا اور ایک اور کرتہ بھی تیار کر لیا اور کہا کہ اسے میری طرف سے قبول فرما لیجئے . آپ نے اپنا کرتہ پہن لیا اور اس کا کرتہ واپس کرتے ہوئے فرمایا کہ میرا کرتہ اس سے زیادہ پسینہ جذب کرتا ہے .

اس سردار (پادری) نے بھی یہ کہا تھا کہ آپ شہر میں داخل ہو رہے ہیں ، ذرا اچھے کپڑے پہن لیجئے اور گھوڑے پر سوار ہو جائیے . اس سے رومیوں کی نگاہ میں آپ کی عظمت بڑھے گی . اس کے جواب میں آپ نے فرمایا کہ

ساری عزت اسلام سے ہے

خدا نے ہمیں جو عزت دی ہے وہ اسلام سے ہے ' ان اضافی چیزوں سے نہیں . اس لئے ہمیں ان کی ضرورت نہیں .

سچ ہے ، جب تک مسلمانوں نے اسلام کو اپنے لئے وجۂ عزّ و شرف سمجھا ' وہ آسمانِ عظمت و وقار کے درخشندہ ستارے بن کر چمکے . جب انہوں نے اسے چھوڑ دیا ' تو ان بلندیوں سے ٹوٹے ہوئے تاروں کی طرح گرے اور فضائے زمانہ کی گردش میں پس کر راکھ ہو گئے .

خدا ایں سخت جاں را یار بادا
کہ افتاد است از بامِ بلندے

آپ نے بیت المقدس کے اسقفِ اعظم ' صفر نیوس کو معاہدہ لکھ کر دیا ___ اس معاہدہ کا متن ہم پہلے درج کر چکے ہیں

اس لئے اسے یہاں نقل کرنے کی ضرورت نہیں۔ اس معاہدہ سے فارغ ہونے کے بعد، آپ گئی رات تک بحضور ربّ العزت سجدہ ہائے شکرانہ ادا کرتے رہے ۔۔۔ یہ مقام تھا بھی انتہائے تشکّر و امتنان کا۔ دنیائے یہود و نصاریٰ کا دینی اور دنیاوی مرکز، سلطنتِ روما کا قلبِ حساس، اور حضرت عمرؓ کی مٹھی میں!

جاں نذر دینی بھول گیا اضطراب میں

صبح ہوئی تو صفر نیوس حاضر خدمت ہوا کہ آپ کو شہر کے آثار اور مقاماتِ مقدسہ کی سیر کرائے۔ بیت المقدس میں زیارت گاہوں کی کیا کمی تھی! یہ شہر ہزار ہا سال سے یہودی تہذیب و ثقافت کا محور اور حکومت و سطوت کا مرکز رہا تھا۔ اس کے بعد، عیسائیوں کے قلب و نگاہ کا نقطہ تقدیس و احترام بھی یہی شہر تھا لیکن چونکہ یہ شہر اب صدیوں سے عیسائیوں کے قبضے میں چلا آرہا تھا جنہیں یہودیوں سے سخت عداوت اور نفرت تھی، اس لئے وہاں ان کی (یہودیوں کی) زیارت گاہوں کے صرف کھنڈر اور نام باقی رہ گئے تھے۔ مثلاً "صخرۂ یعقوب" کی یہ حالت تھی کہ رومی وہاں کوڑا کرکٹ لا لا کر ڈالا کرتے تھے۔ آپ نے گندگی کا یہ ڈھیر دیکھا تو اپنے ساتھیوں سے کہا کہ جو کچھ میں کرتا ہوں تم بھی کرو۔ یہ کہہ کر آپ جھکے اور کوڑے کرکٹ کو اٹھا اٹھا کر دور پھینکنے لگے۔ آپ کے رفقاء نے بھی یہی کچھ کیا اور اس جگہ کو غلاظت سے پاک اور صاف کر دیا۔ اس کے بعد مسلمانوں نے صخرہ کو اپنی نگرانی میں لے لیا کہ عیسائی پھر ایسا کچھ نہ کرنے پائیں۔

آپ، صفرنیوس کی معیّت میں "کلیسائے قیامت" میں تھے کہ نماز کا وقت آگیا۔ اس نے کہا کہ آپ بیشک وہیں نماز ادا کر لیں لیکن آپ نے یہ کہہ کر معذرت چاہی کہ

> اگر میں نے آج یہاں نماز پڑھ لی تو مسلمانوں کے ہاں اس کی طرح پڑ جائے گی اور اس طرح ہو سکتا ہے کہ وہ تمہارے گرجاؤں کو مسجدیں بنا لیں۔ میں ایسی طرح نہیں ڈالنا چاہتا۔

اسی طرح جب آپ کلیسائے قسطنطین کے دروازے پر تھے تو نماز کا وقت آگیا اور عیسائیوں نے آپ کے نماز پڑھنے کے لئے بساط بچھائی، تو آپ نے پھر معذرت چاہی اور ہیکلِ سلیمانی کے کھنڈروں کے قریب ایک کھلی جگہ نماز پڑھی۔

اس مقام پر آپ ذرا آواز دیجئے ان غیر مسلم معترضین کو جو کہا کرتے ہیں کہ ان مسلمانوں نے غیر مسلموں کی پرستش گاہوں کو ڈھا کر مسجدوں میں تبدیل کر دیا تھا۔ انہیں آواز دیجئے اور کہیئے کہ ذرا پوچھئے بیت المقدس کے یہودیوں اور عیسائیوں سے کہ کیا اس اعتراض کی کوئی حقیقت ہے؟ ایک سربراہِ مملکت، فاتح کی حیثیت سے،

بیت المقدس داخل ہوتا ہے۔ نماز کے وقت خود عیسائی اسقف اور بطریق کہتے ہیں کہ آپ گرجا ہی میں نماز ادا کر لیجئے لیکن وہ یہ کہہ کر کہ مبادا بعد میں آنے والے 'میرے اس عمل کو سند قرار دے کر' ان گرجوں کو مسجدوں میں تبدیل کر دیں، وہاں نماز پڑھنے سے انکار کر دیتا ہے؛

آپ نے اتنا ہی نہیں کیا، بلکہ مزید احتیاط کے طور پر، بطریق کو ایک عہدنامہ لکھ دیا جس میں اس امر کی وضاحت کر دی کہ یہ گرجے ہمیشہ عیسائیوں کی تحویل میں رہیں گے اور مسلمان زائرین میں سے، ایک وقت میں صرف ایک، ان کے اندر جا سکے گا۔

کیا تاریخ، اس قسم کی مذہبی رواداری کی کوئی اور مثال بھی پیش کر سکتی ہے؟

(٥)

یہاں ایک لطیف نکتہ ہمارے سامنے آتا ہے۔ ان زیارت گاہوں میں، کعب احبار بھی حضرت عمرؓ کے ساتھ تھے۔ جب حضرت عمرؓ نے گرجا سے باہر آکر نماز پڑھنے کا ارادہ کیا تو کعب سے پوچھا کہ نماز کہاں پڑھی جائے۔ انہوں نے کہا کہ آپ صخرہ کے پیچھے نماز پڑھیں۔ سارا بیت المقدس آپ کے سامنے ہوگا۔ آپ نے ان سے کہا کہ "تم میں ابھی تک یہودیت کا اثر باقی ہے جو یہ مشورہ دے رہے ہو۔ میں نے دیکھا تھا کہ تم نے صخرہ کے قریب آکر جوتی اتار دی تھی"۔۔۔ اور آپ نے کعبہ کی طرف رُخ کر کے نماز پڑھی کہ وہی مسلمانوں کا قبلہ ہے۔

یہاں دو باتیں غور طلب ہیں۔ ایک یہ کہ حضرت عمرؓ نے "صخرہ یعقوب" پر سے کوڑہ کرکٹ اپنے ہاتھوں سے صاف کیا تھا کہ ایک ایسے مقام کی، جو یہودیوں کے نزدیک واجب الاحترام تھا، بے حرمتی نہیں ہونی چاہیئے لیکن نماز کے وقت اپنا رُخ بیت المقدس کی طرف نہیں کیا بلکہ کعبہ کی طرف کیا، کہ خدا نے اسی کو مسلمانوں کا قبلہ قرار دیا تھا۔ واضح رہے کہ یہ جو ہمارے ہاں مشہور ہے کہ نبی اکرمؐ تیرہ سال مکہ میں اور ابتدائی دو سال مدینہ میں بیت المقدس کی طرف

مسلمانوں کا قبلہ

مُنہ کر کے نماز پڑھتے رہے اور اس کے بعد تحویلِ قبلہ کا حکم آیا، تو آپؐ نے کعبہ کی طرف رُخ کر کے نماز پڑھنی شروع کر دی (قرآنِ کریم کی روشنی میں) صحیح نہیں۔ اسلام میں، کعبہ کو پہلے دن ہی سے مرکزِ ملت (قبلہ) قرار دیا گیا تھا۔ (قبلہ کی اہمیت کے متعلق میری کتاب "معراجِ انسانیت" میں دیکھئے۔)

دوسری بات یہ کہ مذہبی عقاید اس قدر گراں نشین اور اعماقِ قلب میں پیوست ہوتے ہیں کہ مذہب تبدیل کرنے پر بھی وہ، خون میں حلول شدہ جراثیم کی طرح ساتھ ہی آجاتے ہیں۔ انہیں الگ کرنے کے لئے مسلسل تعلیم و

تربیت اور فکری جدّ و جہد کی ضرورت ہوتی ہے ۔ رسول اللہ کے زمانے میں آپؐ کے گرد و پیش قریشِ مکہ تھے، نیز یہودی، نصرانی اور مجوسی ۔ اوّل الذکر کسی خاص مذہب کے پیرو نہیں تھے ۔ ان کی اصنام پرستی اور دیگر رسومات کی حیثیت قومی شعار کی سی تھی چنانچہ جب وہ اسلام لاتے ہیں تو کوئی خاص عقائد سینوں میں مستور نہیں لاتے ۔ اسی لئے وہ دینِ خالص کے

مذہب پرست نو مسلم

پیرو ہو گئے لیکن یہودی، نصاریٰ، مجوس میں سے خال خال ہی کسی نے اسلام قبول کیا اور جنہوں نے اسلام قبول کیا وہ بھی اپنے قدیم معتقدات و نظریات کو ساتھ لے کر آئے ۔ اسلام کا یہ بہت بڑا المیہ ہے کہ بعد میں جتنی قومیں شبا شب مسلمان ہو گئیں، ان کی تعلیم و تربیت کا کوئی مناسب انتظام نہ ہوا ۔ نتیجہ اس کا یہ کہ وہ نام کو تو مسلمان ہو گئیں لیکن ان کے عقائد و تصوّرات اسی قدیم مذہب کے رہے، اور پھر یہی معتقدات و نظریات عین اسلام بن گئے ۔ ہمارا مروّجہ اسلام انہی نو مسلموں کا درآستین پوشیدہ و تراشیدہ مذہب ہے ۔ یہ موضوع بڑا تحقیق طلب اور گہرے مطالعہ کا محتاج ہے ۔ اصل یہ ہے کہ کہ ہمارے ہاں ابھی تک " اسلام کی تاریخ " لکھی ہی نہیں گئی ۔ ہماری تاریخ " مسلمانوں کی تاریخ " ہے اور ان دونوں

اسلام کی تاریخ

میں بڑا بنیادی فرق ہے ۔ اسلام کی تاریخ سے مراد یہ ہے کہ وہ اسلام کیا تھا جسے اللہ تعالیٰ نے نوعِ انسان کے لئے حضور نبئ اکرمؐ کی وساطت سے عطا فرمایا تھا، اور وہ رفتہ رفتہ، اس اسلام میں کس طرح تبدیل ہو گیا جو صدیوں سے مسلمانوں میں متوارث چلا آرہا ہے اور جو آج تمام مسلم ممالک میں رائج ہے ۔ مجھے اس کی اہمیت کا خاص طور پر احساس ہے ۔ اس لئے بھی کہ یہ خود میری " آپ بیتی " ہے ۔ مجھے اگر فرصت میسّر آگئی اور حالات مساعد رہے تو میرا ارادہ ہے کہ اسلام کی اس قسم کی تاریخ مرتّب کر دوں، میں چونکہ ان تمام وادیوں سے ایک " مسلمانِ نامسلمانے[1] " کی طرح گزرا ہوں، اور اس کے بعد ذاتی مطالعہ اور تحقیق کے بعد، قرآنِ کریم کی راہ نمائی میں (یوں کہئے کہ) از سرِ نو " مسلمان ہوا ہوں، " اس لئے اس قسم کی تاریخ کی تدوین میرے لئے چنداں دشوار بھی نہیں ہو گی لیکن اس کے لئے حالات کی مساعدت اور قرآنِ کریم کے متعلق جو کچھ مجھے ابھی لکھنا ہے، اس کی تکمیل شرط ہے ۔

دکھاؤں گا تماشہ، دی اگر فرصت زمانے نے
مرا ہر داغِ دل اِک تخم ہے سروِ چراغاں کا

---

[1] چہ گویمت ز مسلمانِ نامسلمانے ۔ جز ایں کہ پورِ خلیل است و آذری داند (اقبالؒ)

سرِدست، میں نے اتنا ہی کیا ہے کہ اس کتاب کے آخری باب میں ان راستوں کی نشاندہی کر دی ہے جن سے گزر کر، حقیقی اسلام، مروّجہ اسلام میں تبدیل ہو گیا ہے۔

ہاں تو، سلسلۂ کلام کعب الاحبار سے چلا تھا۔ یہ یہودیوں کا بہت بڑا عالم تھا اور نبئ اکرمؐ کی خدمت میں اکثر حاضر ہوتا رہتا تھا لیکن اسلام نہیں لایا تھا۔ کہا کرتا تھا کہ میں اسلام کا اعلان اس وقت کروں گا جب میں دیکھ لوں گا کہ اس سے وہ تمام علامات ظہور میں آ گئی ہیں جو دینِ حقّہ کے سلسلہ میں ہمارے ہاں مذکور ہیں۔ حضرت عمرؓ کے زمانے میں بھی اس نے اپنے اسلام کا اعلان نہیں کیا تھا لیکن (ایسا معلوم ہوتا ہے) کہ بیت المقدس کے سفر میں ویسے ہی آپ کے ساتھ ہو لیا تھا۔ وہاں، قبۃ الصخرہ کے سلسلہ میں جو کچھ اس نے کیا اور کہا اس سے حضرت عمرؓ نے فرمایا تھا کہ یہودیّت کے اثرات ابھی تک تمہارے دل سے نہیں گئے۔ "گوسالہ کی محبت تمہارے دل کی گہرائیوں میں پیوست ہے۔" (وَ اُشْرِبُوا فِیْ قُلُوْبِهِمُ الْعِجْلَ ۔ ۲/۹۳)

کعب احبار کا اسلام

حضرت عمرؓ کا یہ قیاس وقتی نہیں تھا۔ یہودیّت کے اثرات اس کے خون کے ذرّات تک میں حلول کر چکے تھے۔ حضرت عمرؓ کی شہادت[^1] کے بعد جب حضرت عثمانؓ کی خلافت کا معاملہ طے ہو گیا تو اس نے اپنے اسلام کا اعلان کر دیا۔ بعض روایات میں ہے کہ حضرت عثمان کے زمانے میں جب اسلام کے معاشی نظام نے اپنے مقام سے سرکنا شروع کر دیا تو حضرت ابوذر غفاریؓ نے اس کے خلاف آواز بلند کی۔ وہ ایک دفعہ حضرت عثمانؓ سے ملنے کے لئے آئے تو وہاں (اتفاق سے یا بالارادہ) کعب بھی بیٹھے تھے۔ حضرت ابوذرؓ نے کہا کہ قرآن کریم کی نصوصِ صریحہ کی رُو سے، زاید از ضرورت مال کسی کے پاس رہ نہیں سکتا، قرآن نے اس کی سخت ممانعت کی ہے۔ اس پر کعب بیچ میں بول اُٹھے اور کہنے لگے کہ یہ غلط ہے۔ جب مال میں سے زکوٰۃ ادا کر دی جائے تو پھر (باقی مال) حلال و طیب ہو جاتا ہے۔ اس پر حضرت ابوذرؓ سخت برافروختہ ہوئے اور اپنا ڈنڈا اٹھا کر کہا کہ "او یہو... ! تو ہمیں اسلام سکھا رہا ہے؟"

اس ایک واقعہ سے ظاہر ہے کہ کعب کے متعلق حضرت عمرؓ کا اندازہ کس قدر صحیح تھا۔ جس نظام کو وہ پیش کر رہے تھے وہ قرآن کا نظامِ ربوبیت نہیں تھا، یہودیّت کا نظام سرمایہ داری تھا۔ "اسلام کی تاریخ" مرتّب کرتے وقت

[^1]: بعض قرآن اس کے غمّاز ہیں کہ حضرت عمرؓ کی شہادت کی سازش میں اس کا بھی ہاتھ تھا۔ یا کم از کم اسے اس کا علم تھا۔ تفصیل حضرت عمرؓ کی شہادت سے متعلق باب میں ملے گی۔

اسی قسم کے "احباروں اور رہبانوں" کی جستجو اور نشاندہی کرنی ضروری ہوگی۔

یہ نکات ضمناً سامنے آگئے تھے۔ اب آگے چلئے۔

(۰)

ہم نے دیکھا ہے کہ حضرت عمرؓ نے، کلیسا کے بجائے، ہیکل کے کھنڈرات پر، صخرہ کے قریب نماز ادا فرمائی تھی۔ اس واقعہ کی یاد میں وہاں ایک سادہ سی مسجد تعمیر کردی گئی۔ اس کے بعد، اموی خلیفہ عبدالملک بن مروان نے (۷۲ھ مطابق ۶۹۱ء) میں اس جگہ ایک قُبہ تعمیر کرادیا جو اُس دور کے فنِ تعمیر کا نادر شاہکار ہے۔ عباسی خلیفہ

قبۃ الصخرہ

مامون الرشید (۸۱۳-۳۳ء) نے، اس قُبہ کی مرمت کرائی تو اس پر عبدالملک کے بجائے اپنا نام نقش کرادیا لیکن (حسنِ اتفاق دیکھئے، کہ اس کے عمّال قُبہ کا سنِ تعمیر تبدیل کرنا بھول گئے چنانچہ وہ، وہی کا وہی (یعنی ۷۲ھ) رہا اور آج تک ویسے ہی محفوظ ہے[۱]۔

عبدالملک بن مروان نے قبۃ الصخرہ کے قریب ایک عالی شان مسجد بھی تعمیر کرائی تھی جسے مسجدِ اقصیٰ کہتے ہیں۔ بعد

مسجدِ اقصیٰ

میں زلزلہ سے اس کے کچھ حصّے مسمار ہوگئے تو عباسی خلیفہ منصور نے اسے (۷۷۱ء میں) دوبارہ تعمیر کردیا۔ صلیبی جنگوں میں بیت المقدس عیسائیوں کے قبضہ میں چلا گیا، تو قبۃ الصخرہ اور مسجدِ اقصیٰ بھی ان کی تحویل میں چلے گئے۔ انہیں، انہوں نے کلیسا بنا لیا لیکن صلاح الدین ایّوبی نے بیت المقدس کو (۱۱۸۷ء میں) دوبارہ فتح کرلیا اور ان مقاماتِ مقدسہ کو پھر سے ان کی پہلی حیثیت حاصل ہوگئی[۱]۔

اب دیکھتے ہوئے جگر شق ہوتا ہے کہ، بیت المقدس، یہودیوں کے قبضہ میں ہے اور دنیا کے ساٹھ ستر کروڑ مسلمان سوائے آہیں بھرنے اور دعائیں مانگنے کے، کچھ نہیں کر سکے۔

بجھی عشق کی آگ اندھیر ہے مسلماں نہیں، راکھ کا ڈھیر ہے

(۰)

مسجدِ اقصیٰ اور شبِ معراج

مسجدِ اقصیٰ کا ذکر آگیا تو ایک اور گوشہ کا سامنے لانا بھی ضروری سمجھا گیا۔ سورہ بنی اسرائیل کا آغاز اس طرح ہوتا ہے۔

---

[۱] HISTORY OF THE ARABS. (P.K. HITTI)

سُبۡحٰنَ الَّذِیۡۤ اَسۡرٰی بِعَبۡدِہٖ لَیۡلًا مِّنَ الۡمَسۡجِدِ الۡحَرَامِ اِلَی الۡمَسۡجِدِ الۡاَقۡصَا الَّذِیۡ بٰرَکۡنَا حَوۡلَہٗ لِنُرِیَہٗ مِنۡ اٰیٰتِنَا ؕ اِنَّہٗ ہُوَ السَّمِیۡعُ الۡبَصِیۡرُ ۔ (۱۷/۱)

اس کا عام ترجمہ یوں کیا جاتا ہے۔

> پاک ہے وہ خدا جو اپنے بندے کو رات ہی رات میں مسجدِ حرام سے مسجدِ اقصیٰ تک لے گیا جس کے آس پاس ہم نے برکت دے رکھی ہے اس لئے کہ ہم اسے اپنی قدرت کے بعض نمونے دکھائیں یقیناً اللہ خوب سننے والا، دیکھنے والا ہے۔

اس آیت میں 'مسجدِ حرام سے مراد لیا جاتا ہے کعبہ اور مسجدِ اقصیٰ سے بیت المقدس کی مسجد اور کہا یہ جاتا ہے کہ یہ واقعہ شبِ معراج کا ہے، جس میں جبریلِ امین تشریف لائے اور حضورؐ کو براق پر سوار کرا کر پہلے بیت المقدس لے گئے اور وہاں سے آسمانوں کی سیر کراتے ہوئے عرشِ معلّٰے تک۔ اور پھر اسی طریق اور اسی راستے سے مکّہ کی طرف واپسی ہوگئی۔ ہمارے سامنے اس وقت تفسیر ابنِ کثیر ہے جو ہمارے ہاں بڑی مستند اور قابلِ اعتماد تفسیر سمجھی جاتی ہے۔ ہم اس سفر کے ضروری حصّوں کے متعلق اس تفسیر سے اقتباسات پیش کرتے ہیں۔ اور وہ بھی صرف مکّہ سے بیت المقدس تک، کیونکہ اس وقت زیرِ نظر نکتہ مسجدِ اقصیٰ سے متعلق ہے۔ اس میں لکھا ہے کہ جب حضورؐ، براق پر سوار،

> بیت المقدس کی مسجد کے پاس اس دروازے پر پہنچے جسے بابِ محمدؐ کہا جاتا ہے تو وہاں ایک پتھر تھا جسے حضرت جبریلؑ نے اپنی انگلی لگائی تو اس میں سوراخ ہوگیا۔ وہیں آپ نے براق کو باندھا اور مسجد پر چڑھ گئے۔ (۹) وہاں تمام انبیاء سابقہ نے حضورؐ کی امامت میں نماز پڑھی۔

اور پھر آپؐ آسمانوں کی طرف تشریف لے گئے۔

تفسیری روایات

ہم دیکھ چکے ہیں کہ رسول اللہ کا عہدِ مبارک تو ایک طرف حضرت عمرؓ کے زمانہ تک بھی بیت المقدس میں کوئی مسجد نہیں تھی۔ وہاں عبد الملک بن مروان نے (۷۲ھ میں) مسجد تعمیر کی جسے مسجدِ اقصیٰ کہا جاتا ہے۔ (اقصیٰ کے معنی ہیں ـــ بہت دُور ـــ یعنی وہ مسجد جو مکّہ یا مدینہ، حتّیٰ کہ امیّہ خاندان کے دارالسلطنت دمشق سے بھی بہت دُور، کافی فاصلہ پر واقع تھی۔ اسی جہت سے اسے مسجدِ اقصیٰ کہا گیا ہوگا) لیکن ہماری کتبِ روایات میں اتنا ہی نہیں کہ بیت المقدس کی اس مسجد کا مجملاً ذکر کیا گیا ہو، اس کی تفاصیل تک دی گئی ہیں۔ تفسیرِ ابنِ کثیر میں ہے کہ جب (اسلام کے ابتدائی ایّام میں) ابو سفیان ہرقل کے پاس گیا، تو اس نے رسول اللہ

کے خلاف جو کچھ کہا اس میں یہ بھی تھا کہ

بادشاہ سلامت سنیئے! میں ایک واقعہ بیان کروں جس سے آپ پر یہ بات کھل جائے گی کہ محمد معاذ اللہ بڑے جھوٹے آدمی ہیں۔ ایک دن وہ (محمدؐ) کہنے لگا کہ اس رات وہ مکہ سے چلا اور آپ کی اس مسجد میں یعنی بیت المقدس کی مسجدِ قدس میں آیا اور پھر واپس صبح سے پہلے مکہ پہنچ گیا ــــ یہ بات سنتے ہی بیت المقدس کا لاٹ پادری جو شاہِ روم کی اس مجلس میں اس کے پاس بڑی عزت سے بیٹھا تھا، فوراً ہی بول اٹھا کہ یہ بالکل سچ ہے مجھے اس رات کا علم ہے۔ قیصر نے تعجب خیز نظروں سے اس کی طرف دیکھا اور ادب سے پوچھا کہ جناب کو کیسے معلوم ہوا۔ اس نے کہا۔ سنیئے! میری عادت تھی اور یہ کام میں نے اپنے متعلق کر رکھا تھا کہ جب تک مسجد شریف کے تمام دروازے اپنے ہاتھ سے بند نہ کر لوں، سوتا نہ تھا۔ اس رات میں دروازے بند کرنے کو کھڑا ہوا۔ سب دروازے اچھی طرح بند کر دیئے لیکن ایک دروازہ مجھ سے بند نہ ہو سکا۔ میں نے ہر چند زور لگایا لیکن کواڑ اپنی جگہ سے سرکا بھی نہیں۔ میں نے اسی وقت اپنے آدمیوں کو آواز دی۔ وہ آئے۔ ہم سب نے مل کر طاقت لگائی لیکن سب کے سب ناکام رہے۔ بس یہ معلوم ہو رہا تھا گویا ہم کسی پہاڑ کو اس کی جگہ سے سرکانا چاہتے ہیں لیکن وہ جُنبش تک نہیں، ہلا بھی نہیں۔ میں نے بڑھئی بلوائے۔ انہوں نے دیکھا بھالا، ترکیبیں کیں، کوششیں کیں لیکن وہ بھی ہار گئے اور کہنے لگے صبح پر رکھیئے۔ چنانچہ وہ دروازہ اس شب یوں ہی رہا۔ دونوں کواڑ یوں ہی کھلے رہے۔ صبح ہی میں اس دروازے کے پاس گیا تو دیکھا کہ اس کے پاس کونے میں جو چٹان پتھر کی تھی، اس میں ایک سوراخ ہے اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس میں رات کو کسی نے کوئی جانور باندھا تھا۔ اس کا اثر اور نشان موجود تھے۔ میں سمجھ گیا اور میں نے اسی وقت اپنی جماعت سے کہا کہ آج کی رات ہماری یہ مسجد کسی نبی کے لئے کھلی رکھی گئی ہے اور اس نے یہاں ضرور نماز ادا کی ہے۔ (تفسیر ابن کثیر، شروع پندرھواں پارہ)

یہ ہے سند اور شہادت بیت المقدس میں "مسجد اقصیٰ" کی موجودگی کی۔

ہم سمجھتے ہیں کہ اس پر کسی تبصرہ کی ضرورت نہیں۔

سورۃ بنی اسرائیل میں جو کہا گیا ہے کہ

پاک ہے وہ ذات، جو راتوں رات اپنے بندے کو مسجدِ حرام سے مسجدِ اقصیٰ کی طرف لے گئی۔

مسجدِ اقصیٰ سے مراد

تو (ہماری قرآنی بصیرت کے مطابق) یہ حضورؐ کی شبِ ہجرت کا بیان ہے، جب آپ مکہ سے جانبِ مدینہ روانہ ہوتے تھے۔ مدینہ میں پہلے سے مسلمان موجود تھے جن کی دعوت پر حضورؐ وہاں تشریف لے گئے تھے۔ صدرِ اوّل میں مسجد صرف نماز پڑھنے کے لئے مخصوص نہیں ہوتی تھی۔ وہ مسلمانوں کا جماعتی مرکز تھا جہاں نظامِ خداوندی کے قیام و استحکام سے متعلق جملہ امور سرانجام پاتے تھے۔ مدینہ میں وہاں کے مسلمانوں کا اجتماعی مرکز موجود تھا اور اس کے بعد رسول اللہؐ نے اُسے ایسا اجتماعی مرکز بنایا کہ مکہ فتح ہونے کے بعد بھی مرکز مدینہ ہی رہا۔ یہ تھی وہ "مسجدِ اقصیٰ" (مدینہ کی بستی) جس کی طرف حضورؐ شبِ ہجرت تشریف لے گئے تھے اور مقصد اس انتقالِ مکانی (ہجرت) سے یہ تھا کہ وہاں اسلام ایک عملی نظام کی شکل اختیار کر لے اور اس طرح "خدا کی عظیم نشانیاں" (انقلاب) ظہور میں آئیں۔ بیت المقدس (سوائے ان چند سالوں کے جب صلیبی جنگوں میں اس پر عیسائیوں نے قبضہ کر لیا تھا) ہمیشہ مسلمانوں کے زیرِ تسلط رہا لیکن وہ نہ کبھی ان کا اجتماعی مرکز بنا اور نہ ہی وہاں سے انقلابِ اسلامی کی کوئی خاص نشانیاں (آیاتِ خداوندی) نمودار ہوئیں۔ لہٰذا قرآن میں بیان کردہ "مسجدِ اقصیٰ" سے مراد عبدالملک بن مروان کی تعمیر کردہ مسجد نہیں بلکہ مدینہ کا اسلامی مرکز ہے۔ (باقی رہا حضورؐ کا آسمانوں پر تشریف لے جانا، سو اس کا ذکر قرآنِ کریم میں کہیں نہیں)

(٥)

حضرت عمرؓ بیت المقدس سے متعلق جملہ امور سے فارغ ہونے کے بعد، واپس تشریف لے جا رہے ہیں اس لئے ہمیں بھی ان کی ہم رکابی کی سعادت حاصل کرنے کے لئے، عازمِ سفر ہو جانا چاہیئے لیکن ہمارے سامنے ایک ایسا دلکش اور جاذبِ قلب و نگاہ حسین منظر ہے جس سے قدم آگے نہیں اٹھ سکتے۔

جشنِ فتح

فتح بیت المقدس ایک ایسا عظیم واقعہ تھا جس سے مجاہدین کے دل مسرتوں کے جھولے جھول رہے تھے۔ حضرت عمرؓ نے فیصلہ کیا کہ اس کی یاد میں جشن منانا چاہیئے۔ یہ وہی جشن ہے جس کے لئے ہم یہاں رُک گئے ہیں۔

حضرت بلال حبشیؓ، رسول اللہؐ کے مؤذن تھے لیکن رقیق القلب ایسے کہ حضورؐ کی وفات کے بعد انہوں نے پھر اذان نہیں دی۔ وہ بیت المقدس میں حضرت عمرؓ کے ساتھ تھے۔ آپ نے ان سے کہا کہ "بلال! آج کا دن ایسا یادگار ہے کہ ہمیں جشنِ مسرت منانا چاہیئے"۔ انہوں نے کہا کہ ضرور منانا چاہیئے۔ آپ نے فرمایا کہ پھر یہ جشن یوں منایا جائے گا کہ نماز کے لئے اذان آپ دیں گے ــــ اور حضرت بلالؓ اس کے لئے آمادہ ہو گئے۔

فتحِ بیت المقدس کا جشنِ مسرت، فلسطین کی ارضِ مقدس، تاروں کی چھاؤں، نورِ سحر کی آیئنہ پاشی، حضرتِ بلالؓ نے عشق و مستی میں ڈوبی ہوئی آواز سے جو اذان دی تو شمعِ رسالت کے پروانوں کی نگاہوں کے سامنے وہ جنت بداماں منظر آگیا جب وہ حضورؐ کی امامت میں صفیں باندھ کر نماز ادا کیا کرتے تھے۔ حضرت بلالؓ کی آواز سینوں کو چیر کر دلوں کی انتہائی گہرائیوں میں اتر گئی۔ رفقائے رسولؐ تڑپ اٹھے، روتے روتے ان کی ہچکیاں بندھ گئیں۔ خود حضرت عمرؓ بے تاب ہو گئے۔ حضرت بلالؓ کی ہمنوائی میں ساری وادی اللہ اکبر کی آواز سے گونج اٹھی اور جب انہوں نے کہا اَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ تو دشت و جبل پکار اٹھے کہ

خودی کا سرِ نہاں لا الٰہ الا اللہ خودی ہے تیغ، فساں لا الٰہ الا اللہ
یہ مال و دولتِ دنیا یہ رشتہ و پیوند بتانِ وہم و گماں لا الٰہ الا اللہ
یہ نغمہ فصلِ گل و لالہ کا نہیں پابند بہار ہو کہ خزاں لا الٰہ الا اللہ

اور یوں صحرائے سینا نے صدیوں کے بعد اس فراموش کردہ حقیقت کی گواہی دی کہ

یہ سحر جو کبھی فردا ہے کبھی ہے امروز نہیں معلوم کہ ہوتی ہے کہاں سے پیدا
وہ سحر جس سے لرزتا ہے شبستانِ وجود ہوتی ہے بندۂ مومن کی اذاں سے پیدا

اس کے بعد نماز پڑھی اور پھر اس کاروانِ شوق نے اپنا رختِ سفر باندھا۔ طوبیٰ لھم وحسن مآب۔

یہ قافلہ جانبِ بطحا روانہ ہوا لیکن ہمیں دجلہ و فرات کی گذرگاہوں کی طرف چلنا چاہیئے کہ وہاں فتوحات کا مزید سلسلہ جاری ہے۔

حمص پر عیسائیوں کی یورش (۱۷ھ)

عراق کے شمال میں، دجلہ اور فرات کے درمیانی علاقہ کو الجزیرہ کہتے تھے۔ وہاں کے لوگوں نے جب دیکھا کہ مسلمانوں کی فتوحات کا سلسلہ بڑھتا چلا آرہا ہے تو انہیں اپنے متعلق خدشہ لاحق ہوا۔ انہوں نے قیصر کو لکھا کہ اگر تم ہمت کرو تو ہم اور تم مل کر مسلمانوں کا مقابلہ کر سکتے ہیں۔ چنانچہ اس نے ایک کثیر فوج جمع کی اور اسے حمص کی طرف بھیجدیا۔ ادھر سے جزیرہ والوں نے بھی حمص کا رُخ کیا۔ عساکرِ اسلامیہ نے ان کے مقابلہ کی تیاریاں

کیں، اور اگرچہ حضرت ابو عبیدہؓ اور خالد بن ولیدؓ وہاں موجود تھے، موقعہ کی نزاکت کے پیشِ نظر حضرت عمرؓ خود دمشق تشریف لے آئے۔ حمص کے قریب سخت معرکہ برپا ہوا لیکن عیسائیوں کو ایسی شکست ہوئی کہ اس کے بعد انہیں پھر کبھی پیشقدمی کا حوصلہ نہ ہوا۔

ادھر جزیرہ والوں کو بھی ایسی شکست ہوئی کہ چند دنوں میں اس سارے علاقہ پر مسلمانوں کا قبضہ ہو گیا۔

(۰)

جندی سابور کی فتح

ہرمزان کے، شوستر (یا تستر) کی فتح کے بعد، مسلمانوں نے جندی سابور پر حملہ کیا جو شوستر سے قریب ہی ہے۔ کئی دنوں کے محاصرہ کے بعد مسلمانوں نے دیکھا کہ اہلِ شہر نے خود ہی دروازے کھول دیئے ہیں اور اپنے اپنے کاروبار میں اطمینان سے مصروف ہیں۔ دریافت کرنے پر انہوں نے کہا کہ ہمیں مسلمانوں نے امان دے دی ہے، اس لئے ہم محفوظ ہیں۔ امان نامہ دیکھا تو وہ ایک غلام کی طرف سے تھا جس نے از خود ہی یہ فیصلہ کر دیا تھا۔ حضرت ابو موسےٰ اشعریؓ (سپہ سالار) کہتے تھے

ایک غلام نے امان دے دی

کہ ایک غلام کی امان حجت نہیں ہو سکتی۔ شہر والے کہتے تھے کہ ہم آزاد اور غلام کو نہیں جانتے، ہمیں ایک مسلمان نے امان دی ہے۔ بالآخر حضرت عمرؓ کی طرف رجوع کیا گیا تو آپ نے کہا کہ مسلمانوں کا غلام بھی مسلمان ہے، اس لئے اس نے جسے امان دی ہے وہ امان تمام مسلمانوں کی طرف سے ہے۔ ہمارے ہاں غلام اور آزاد کی کوئی تفریق نہیں۔ لہٰذا، وہ امان بدستور قائم رہی۔

مُسلم خدا کے حکم سے مجبور ہو گیا!

(۰)

فتحِ مصر

(۲۰ھ مطابق ۶۴۱ء)

مصر دنیا کی قدیم ترین تہذیب کا گہوارہ تھا۔ جس زمانے کا ہم ذکر کر رہے ہیں، یہ رومیوں کے قبضہ میں تھا۔ لیکن ایرانی اس پر یورشیں کرتے رہتے تھے۔ ۶۱۶ء میں انہوں نے اسے فتح کر لیا اور نو برس تک اس پر قابض رہے۔ (قرآنِ کریم سورۃ الروم (۳۰) میں ایرانیوں اور رومیوں کی اسی آویزش کا ذکر ہے) اس کے بعد رومیوں

نے اسے پھر فتح کر لیا۔ حضرت عمرؓ کے زمانے میں 'مقوقس (قبطی عیسائی) رومیوں کی طرف سے مصر کا حاکم تھا۔
جب حضرت عمرؓ فلسطین تشریف لے گئے ہیں تو حضرت عمرو بن عاصؓ نے آپ سے مصر فتح کرنے کا خیال ظاہر کیا تھا لیکن حضرت عمرؓ نے اس وقت اس تجویز کے متعلق خاموشی اختیار فرمائی۔ (یہ سنہ ۱۶ھ کی بات ہے) اس کے بعد بھی حضرت عمرو بن عاصؓ اپنی تجویز کو برابر دہراتے رہے لیکن حضرت عمرؓ نے اس پر اظہار رضامندی نہ فرمایا۔
اس کے بعد، اس نوزائیدہ اسلامی مملکت کو دو ایسے حادثاتِ سماوی سے دوچار ہونا پڑا جنہوں نے ان کی تمام توجہات کا رُخ اپنی طرف کھینچ لیا ـــــ فلسطین کے شہر عمواس میں طاعون پھوٹی اور اس نے پھیلتے پھیلتے شام اور عراق تک کے علاقہ کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ اس کی ہلاکت آفرینیاں ہی کچھ کم نہ تھیں کہ اِدھر عرب میں ایسا قحط پڑا کہ سارا علاقہ راکھ کا ڈھیر بن کر رہ گیا (تفصیل ان حوادث کی آئندہ چل کر سامنے آئے گی) ان حوادث کی وجہ سے کسی نئے علاقہ کی طرف یورش کرنے کا خیال تک بھی نہ کیا جا سکتا تھا۔ جب مملکت کو ان بلاؤں سے نجات حاصل ہو گئی، تو حضرت عمرو بن عاصؓ نے پھر اپنی تجویز کو دہرایا۔ وہ اس کے حق میں جو دلائل دیتے تھے' ان کا ملخص یہ تھا۔

(۱) رومی سپہ سالار' اطربون' فلسطین سے فرار ہو کر مصر پہنچ گیا تھا اور وہاں اتنی جمعیت فراہم کر رہا تھا کہ اس سے ہر وقت خطرہ تھا کہ وہ شام یا فلسطین پر حملہ کر دے گا۔ اس کی روک تھام ضروری تھی اور اس کا مؤثر ترین طریق یہ تھا کہ مصر کی طرف پیش قدمی کر دی جائے۔

(۲) مصر میں قبطی کاشتکاروں اور محنت کشوں کی حالت اس سے بھی زبوں تر تھی جو عراق میں ایرانیوں کے محکوم سرحدی قبائل کی تھی۔ مصر بڑا زرخیز علاقہ تھا لیکن وہاں کی ساری پیداوار رومی سمیٹ کر لے جاتے تھے اور قبطی بیچارے نانِ شبینہ تک کے محتاج رہ جاتے تھے۔ نبی اکرمؐ نے قیصر کے نام اپنے مکتوب گرامی میں انہی کی زبوں حالی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے لکھا تھا کہ اگر ان کے خلاف مظالم کی روک تھام نہ کی گئی تو اس کا خمیازہ تمہیں بھگتنا پڑے گا۔ حضرت عمرو بن عاصؓ کا کہنا تھا کہ اب ہم اس قابل ہو گئے ہیں کہ ان مظلوموں کی مدد کر سکیں' اس لئے یہ اب ہمارا دینی فریضہ ہو چکا ہے۔

(۳) مصر رومیوں اور ایرانیوں کی یورشوں کی آماجگاہ بنا رہتا تھا جس کا نتیجہ یہ تھا کہ وہاں کی مقامی آبادی مسلسل پامال ہوتی رہتی تھی۔ وہاں ایک مستحکم' عادل' حکومت کا قیام' ان کی فلاح و بہبود کے لئے لاینفک تھا۔ اس کے بغیر وہ انسانی سطح زندگی تک آ نہیں سکتے تھے۔

(۴) قبطی بھی عیسائی تھے اور ہرقل بھی عیسائی لیکن ان کے فرقے مختلف تھے۔ جب ہرقل نے ایرانیوں کو شکست

دے کر مصر پر دوبارہ قبضہ کر لیا تو اس نے اس حقیقت کا احساس کیا کہ رومی سلطنت کے اس قدر عظیم ہونے کے باوجود، اس کی کمزوری کی وجہ یہ ہے کہ عیسائیوں کے مختلف فرقے باہمدگر مصروفِ جنگ و قتال رہتے ہیں۔ اس نے اس کا علاج یہ سوچا کہ مختلف فرقوں کے مشترک عقائد پر مبنی ایک مذہب مرتب کیا جائے اور مختلف فرقوں سے کہا جائے کہ وہ اسے اختیار کریں۔ اس مقصد کے لئے اس نے، مصر کے دارالسلطنت اسکندریہ کی مذہبی پیشوائیت کی سربراہی، قیرس نامی اسقف کے سپرد کی۔ وہ بڑا متشدد تھا اور سرکاری مذہب کو بزور منوانا چاہتا تھا۔ قبطیوں نے اس کی مخالفت کی، تو اس نے ان پر اس قدر وحشیانہ مظالم توڑے جن کے تصور سے روح کانپ اٹھتی ہے۔ اس سے پورے ملک میں کہرام مچ گیا۔ دس برس تک قبطی اس کی وحشت اور بربریت کا شکار ہوتے رہے۔ وہ اس کے مظالم کے خلاف چیختے چلاتے تھے لیکن کوئی ان کی فریاد نہیں سنتا تھا۔ حضرت عمروبن عاصؓ کا کہنا تھا کہ ان کی امداد بھی ہمارا دینی فریضہ ہے۔

ان دلائل کے پیشِ نظر حضرت عمرؓ نے حضرت عمروبن عاصؓ کی تجویز پر اظہارِ رضامندی کر دیا۔ پہلا معرکہ فرما کے مقام پر ہوا جو مصر کا ایک مشہور شہر تھا۔ ایک ماہ کے محاصرہ کے بعد، رومیوں کو ذلت آمیز شکست ہوئی۔ دوسرا

بلبیس کا معرکہ ۱۸ھ ۶۳۹ء

معرکہ بلبیس کے مقام پر ہوا جہاں اطربون ...... ایک لشکرِ جرار کے ساتھ مقابلہ کے لئے آیا۔ مسلمانوں کو وہاں بھی فتح نصیب ہوئی اور اطربون میدانِ جنگ میں کام آگیا۔ اس کے بعد، بابلیون کے قلعہ پر باہمی تصادم ہوا۔ اس قلعہ میں خود مقوقس موجود تھا اور سپہ سالار جارج نامی ایک رومی تھا جس کی شہرت دور دور تک پھیلی ہوئی تھی (جیسا کہ سابقہ باب میں لکھا جا چکا ہے) اس معرکہ میں، مقوقس نے ایک وفد حضرت عمروبن عاصؓ کی خدمت میں بھیجا تھا۔ وفد کی واپسی پر مقوقس نے ان کے تاثرات معلوم کرنے چاہے تو رئیسِ وفد نے کہا کہ

> ہم نے ایک ایسی قوم کو دیکھا ہے جس کا ہر فرد زندگی کے مقابلہ میں موت کو، اور تکبر و سرکشی کے بجائے انکسار و اطاعت کو ترجیح دیتا ہے۔ ان میں کوئی بھی ایسا نہیں جسے دنیا کی کوئی دلکشی اپنی طرف کھینچ سکتی ہو۔ وہ زمین پر بیٹھتے ہیں، گھٹنوں پر رکھ کر کھاتے ہیں۔ ان کا امیر انہی میں کا ایک فرد ہے۔ ان میں بڑے اور چھوٹے، آقا اور غلام کی کوئی تمیز نہیں۔ جب نماز کا وقت آتا ہے، تو پیچھے کوئی نہیں رہتا۔ سب وضو کرتے ہیں اور نہایت خشوع و خضوع کے ساتھ خدا کے حضور سجدہ ریز ہو جاتے ہیں۔

مجاہدین کے یہ اوصاف سُن کر مقوقس سوچ میں پڑ گیا۔ اس کے بعد اس نے اپنے ساتھیوں سے کہا کہ "قسم ہے اس ذات

کی جس کی قسم کھائی جا سکتی ہے کہ یہ لوگ چاہیں تو پہاڑ کو بھی اپنی جگہ سے ہلا سکتے ہیں۔ ان سے کوئی نہیں لڑ سکتا ہمیں ان سے صلح کر لینی چاہیے۔ اگر ایسا نہ کیا گیا تو ہمیں ذلیل و خوار ہونا پڑے گا۔"

جب ہرقل تک مقوقس کے یہ خیالات پہنچے تو اس نے اسے بلا بھیجا اور جب اس نے وہاں بھی یہی کہا کہ

بابلیون کی فتح ۲۰ھ ۶۴۱ء

ہمیں مسلمانوں سے صلح کر لینی چاہیئے تو ہرقل نے اسے بڑا ذلیل کیا اور بزدلی اور غداری کے جرم میں اسے ملک بدر کر دیا۔ لیکن واقعات نے ثابت کر دیا کہ مقوقس کا خیال صحیح تھا۔ بابلیون کے قلعہ کا محاصرہ اگرچہ کافی طول کھینچ گیا لیکن بالآخر رومیوں کو اسے خالی کرنا پڑا۔ یہ اپریل ۶۴۱ء کا واقعہ ہے۔ ہرقل اس سے دو ایک ماہ قبل وفات پا چکا تھا۔

ازاں بعد مسلمانوں نے اسکندریہ کا محاصرہ کیا۔ اس محاصرہ کی مدت کے متعلق تاریخ میں مختلف روایات

فتح اسکندریہ ۲۰ھ ۶۴۱ء

ہیں لیکن قرین قیاس یہی ہے کہ یہ محاصرہ اواخر جون ۶۴۱ء میں شروع ہوا اور ۱۸۔ نومبر ۶۴۱ء کو اہل شہر نے ہتھیار ڈال دیئے۔ یوں مصر فتح ہو گیا۔

اس زمانہ میں مصر بالعموم، اور اسکندریہ بالخصوص، کس شوکت و عظمت کے مظہر اور حسن و تجمل کے آئینہ دار تھے۔ تاریخ کے اوراق اس کے تذکرہ سے آج تک جگمگا رہے ہیں۔ جب حضرت عمروؓ بن عاصؓ نے معاویہ بن حدیج کو، فتح اسکندریہ کی نوید جانفزا دے کر امیر المومنین کی خدمت میں بھیجا تو انہوں نے کہا کہ کیا آپ کوئی خط نہیں دیں گے؟ حضرت عمروؓ بن عاصؓ نے کہا کہ میں خط میں کیا کچھ لکھ سکوں گا۔ تم خود عرب ہو، جو کچھ تم نے یہاں دیکھا ہے اسے زبانی بتا دینا۔ جب قاصد مدینہ پہنچا تو حضرت عمرؓ نے بے تابانہ پوچھا کہ کیا خبر لائے ہو؟ جب اس نے کہا کہ اسکندریہ فتح ہو گیا ہے تو آپ اُسے ساتھ لے کر فوراً مسجد میں تشریف لے گئے۔ مؤذن سے اذان دینے کو کہا۔ جب لوگ جمع ہو گئے تو آپ نے معاویہ سے کہا کہ تم جو پیغام لائے ہو، اسے خود اپنی زبانی بیان کرو۔ معاویہ نے فتح کی خوشخبری کے بعد جب اسکندریہ کی تفصیلات سنائیں تو سامعین کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں۔ انہوں نے مدائن کا مالِ غنیمت بھی اسی مسجد میں دیکھا تھا لیکن جو کچھ اسکندریہ کے متعلق سُنا اس سے وہ مبہوت ہو کر رہ گئے۔

امیر المومنین کا کھانا

اس کے بعد حضرت عمرؓ قاصد کو لے کر گھر پہنچے۔ کھانے کے لئے کہا تو ملازمہ نے سوکھی روٹی اور زیتون کا روغن لا کر دستر خوان پر رکھ دیا۔ معاویہ نے جھجک جھجک کر

اسے کھایا۔ دورانِ گفتگو حضرت عمرؓ نے اس سے پوچھا کہ جب تم دوپہر کے وقت یہاں پہنچے تھے تو میرے متعلق تمہارا کیا خیال تھا۔ اس نے کہا کہ میرا خیال تھا کہ آپ قیلولہ فرما رہے ہوں گے۔ آپ نے فرمایا تم نے غلط سمجھا۔

میں سو کیسے سکتا ہوں

اگر میں دن کو سوؤں تو رعیّت کا نقصان ہے اگر رات کو سوؤں تو میرا اپنا نقصان ہے۔ ان صورتوں میں معاویہ! نیند کیسے آسکتی ہے۔

سچ ہے، جب تک سربراہِ مملکت جاگے نہیں، رعایا چین کی نیند کیسے سو سکتی ہے؟ قرآنِ کریم نے اس اُمّت کو طائفین کہہ کر پکارا ہے، یعنی راتوں کو پہرہ دینے والے۔ یہ پہرہ دیتے ہیں تاکہ نوعِ انسانی اطمینان کی نیند سو سکے۔

(۰)

حضرت عمرو بن عاصؓ قلعہ بابلیون کے اثنائے محاصرہ میں جس خیمہ میں قیام پذیر تھے، جب فتح بابلیون کے بعد وہاں سے کوچ کرنے لگے تو دیکھا کہ خیمہ میں ایک کبوتر نے بچے دے رکھے ہیں۔ انہوں نے کہا کہ جب تک یہ بچے بڑے ہو کر اڑ نہ جائیں، خیمہ اکھیڑا نہ جائے۔ فتح اسکندریہ کے بعد انہوں نے سوچا کہ اگر اہلِ لشکر کے لئے کوئی اور جائے سکونت نہ ہوئی تو یہ لوگ اسکندریہ کے باشندوں کو ان کے گھروں سے نکال کر ان میں خود رہائش پذیر ہو جائیں گے۔ اس خطرہ کے پیشِ نظر انہوں نے طے کیا کہ عسکریہ کے لئے ایک الگ شہر بسایا جائے۔ یہ شہر اس مقام پر بسایا گیا جہاں وہ خیمہ نصب تھا۔ یہی شہر فسطاط ہے جس نے تاریخ میں خاصی شہرت حاصل کر لی تھی۔

حضرت عمرو بن عاصؓ نے فسطاط کی مسجد میں ایک منبر بنوایا جس پر کھڑے ہو کر وہ لوگوں سے خطاب کرتے تھے، حضرت عمرؓ کو اس کی اطلاع ملی تو آپ نے انہیں ایک خط لکھا جس میں تحریر فرمایا کہ "مجھے معلوم ہوا ہے کہ تم نے ایک منبر بنوایا ہے جس پر، مسلمانوں سے اونچے ہو کر بیٹھتے ہو۔ کیا یہ اعزاز تمہارے لئے کافی نہیں کہ تم مسلمانوں کے امیر ہو، لیکن اس کے معنی یہ نہیں کہ تم اونچے بیٹھو اور دوسرے مسلمان تمہارے قدموں میں نیچے بیٹھے ہوں۔ منبر تڑوا دو اور لوگوں کو کھڑے ہو کر مخاطب کرو۔ حضرت عمرو بن عاصؓ نے منبر تڑوا دیا۔

انہوں نے اس شہر میں، حضرت عمرؓ کے لئے بھی ایک مکان بنوایا اور اس کی اطلاع انہیں دی۔ آپ نے جواب میں لکھا کہ میں سمجھ ہی نہیں سکا کہ

حجاز میں رہنے والے ایک آدمی کا مکان مصر میں کیسے ہو سکتا ہے؟ اس مکان کو رفاہِ عامہ کے لئے کھلا چھوڑ دو۔

(۰)

اسکندریہ کا کتب خانہ

فتح اسکندریہ کے ضمن میں، تاریخ نے ایک ایسا افسانہ وضع کیا جس کے سننے کے بعد ہر علم دوست، مہذب انسان کا خون کھولنے لگے۔ کہا یہ گیا کہ اسکندریہ میں ایک عظیم کتب خانہ تھا جس میں مختلف علوم و فنون کی قریب سات لاکھ کتابیں جمع تھیں۔ (کہا یہ جاتا ہے کہ) قبطیوں کا ایک پادری تھا ــــ یوحنا نحوی ــــ اسے اسقفوں کی ایک مجلس نے جرمِ ارتداد کی بنا پر معزول کر دیا تھا۔ فتحِ اسکندریہ کے بعد وہ حضرت عمرو بن عاصؓ کے پاس پہنچا اور ان سے کہا کہ مذکورہ بالا کتب خانہ کی کتابیں اسے دے دی جائیں۔ حضرت عمرو بن عاصؓ نے حضرت عمرؓ کو لکھا تو انہوں نے جواب میں کہا کہ "اگر ان کتابوں میں وہی کچھ ہے جو کتاب اللہ میں ہے تو ہمیں ان کی ضرورت نہیں اور اگر وہ اس کے خلاف ہیں تو ہمارے کس کام کی، انہیں جلا دو۔" اس فیصلہ کی تعمیل میں حضرت عمرو بن عاصؓ نے اِن کتابوں کو شہر کے حماموں میں تقسیم کر دیا جہاں وہ چھ ماہ تک آگ روشن کرتی رہیں۔

یہ افسانہ ہماری کتبِ تاریخ میں پہلی بار تیرھویں صدی عیسوی میں سامنے آتا ہے۔ اس کے بعد کے مؤرخین اسے بلا تحقیق اپنے ہاں درج کرتے چلے گئے اور مغربی معترضین نے اسے خوب خوب اچھالا۔ نتیجہ اس کا یہ کہ اس سے حضرت عمرؓ ایک ایسے "وحشی انسان" کی شکل میں سامنے آنے لگے جو علم و فن کا دشمن اور تہذیب و تمدن کا حریف ہو۔ جو ایسے سنگین جرم کا مرتکب ہو جسے انسانیت کی عدالت میں کبھی قابلِ عفو نہیں سمجھا جا سکتا۔

پانچ چھ سو سال تک یہ افسانہ فضائے عالم میں آتش بازرہا، اور اس کے بعد خود مغرب ہی کے محققین مثلاً گبن، رینان، گستاؤلی بان، بٹلر وغیرہ نے تحقیق کے بعد اسے یکسر خرافات قرار دے دیا۔ انہوں نے لکھا ہے کہ یہ کتب خانہ ۴۸ ق م میں اس وقت جل گیا تھا جب سیزر کے مصر فتح کر کے جہازوں کو آگ لگائی تھی اور یوحنا نحوی، جس سے اس افسانہ کا آغاز ہوتا ہے، مسلمانوں کے اسکندریہ فتح کرنے سے قریب سو سال پہلے مر چکا تھا۔

اندریں حالات، ہمیں اس باب میں کچھ لکھنے کی ضرورت نہیں، بجز اس کے کہ جو کچھ ہماری کتبِ تاریخ در وایاتِ میں مذکور ہے، اسے بلا تحقیق و تفتیش قبول کر لینا کس قدر مضرت رساں ہے۔ اس قسم کی افسانہ طرازیوں کے محرکات کیا تھے، اس کی وضاحت میں اس وقت کروں گا جب (اور اگر) میں نے "اسلام کی تاریخ" مرتب

کی سرِدست میں نے اس کا مختصر ساذکر اس کتاب کے آخری باب میں کردیا ہے۔ وہ آپ کے سامنے آجائے گا۔

(٥)

تخریب نہیں، تعمیر

عہدِ فاروقی کے آغاز میں، اسلامی مملکت ایک محدود سے رقبہ کو محیط تھی لیکن اس کے آخر میں، اس کی وسعتیں دور دراز علاقوں تک پھیل چکی تھیں۔ دس سال کے قلیل عرصہ میں، اس قدر فتوحات بجائے خویش ایک عظیم کارنامہ ہے۔ لیکن یہ کارنامہ منفرد نہیں کہلا سکتا۔ تاریخ میں کئی ایسے فاتح ملیں گے، جن کی فتوحات کی وسعتیں اس سے بھی زیادہ تھیں۔ جس خصوصیت کے اعتبار سے یہ کارنامہ منفرد قرار پاتا ہے، وہ یہ ہے کہ ان فتوحات کے نتیجہ میں یہ علاقے تباہ و برباد نہیں ہوئے۔ یہ پہلے سے بھی زیادہ آباد و شاداب ہوئے اور اس تہذیب و تمدن کا گہوارہ بنے جس نے ساری دنیا میں اپنا سکہ بٹھا دیا۔ یہ وہ حقیقت ہے جس کی گواہی (اپنے ہی نہیں) بیگانے بھی دیتے ہیں۔ مشہور مستشرق گب (H-A-R-GIBB) اپنی کتاب (MOHAMMADANISM) میں لکھتا ہے۔

> ان فتوحات کی رفتار کی تیزی سے کہیں زیادہ حیرت انگیز وہ نظم و ضبط تھا جو ان میں ملحوظ رکھا گیا۔ اس میں شبہ نہیں کہ ان جنگوں کے دوران تھوڑی بہت تخریب بھی ہوئی لیکن بہ ہیئتِ مجموعی ان عربوں نے اپنے پیچھے کھنڈرات کے آثار چھوڑنے کے بجائے مفتوحہ قوموں اور ان کے تمدن کے امتزاج کے لئے نئی نئی شاہراہیں تعمیر کیں۔ وہ نظام کو جسے نبی اکرمؐ نے اپنے ورثار (خلفار) کو ترکہ میں دیا تھا اس نے ان بدوی لشکروں کے سیلاب کو، قوانین و ضوابط کے ساحلوں میں محصور رکھ کر، جریدۂ عالم پر اپنی قدر و قیمت ثبت کردی۔ ان فتوحات کی رُو سے، اسلام بیرونی دنیا میں لوٹ مار کی خاطر تباہیاں مچانے والے جھگڑے کی شکل میں متعارف نہیں ہوا بلکہ ایک ایسی اخلاقی قوت کی شکل میں متعارف ہوا جس کے احترام میں ان مفتوحہ اقوام کے قلوب جھک گئے اور اس نے ایک ایسا نظریۂ حیات پیش کیا جس کی حریف نہ مشرقی روم کی عیسائیت ہوسکی اور نہ ہی ایران کی مجوسیت۔ (ص۴)

اور (M-A-ENAN) اپنی کتاب (MOMENTSHISTORY OF ISLAM

میں رقمطراز ہے۔

ان (عربوں) نے ظلم اور انصاف، حدود فراموشی اور اعتدال، سلب و نہب اور ضبطِ خویش، مذہبی جنون اور رواداری میں جو فرق ملحوظ رکھا، وہ ان بنیادی عناصر میں سے ایک تھا جنہوں نے ان کی فتوحات کے لئے راستے کشادہ کر دیئے تھے۔ ان کا یہی وہ حسن سلوک تھا جس نے مفتوحہ قوموں کے دل موہ لئے اور انہیں اس امر کا اطمینان اور یقین ہو گیا کہ ان نئے آقاؤں کے زیرنگیں ان کی حالت پہلے کے مقابلہ میں کہیں بہتر ہو جائے گی۔ اس نے اس خوف کو زائل کر دیا جو ہر نئے فاتح کی طرف سے مفتوح اقوام کے دل میں پیدا ہوتا ہے۔ عربوں کی آمد ان خدشات و خطرات کو اپنے جلو میں نہیں لائی تھی جو ہر غالب دشمن کے ہمرکاب ہوتے ہیں۔ (ص۱۱)

اتنا ہی نہیں کہ ملتِ اسلامیہ کی یہ فتوحات امن و سلامتی کی پیامبر تھیں، عربوں کے ساتھ ان روابط کے نتیجہ میں، ان مفتوحہ اقوام نے جو کچھ حاصل کیا، اس کی مدح و ستائش میں غیر مسلم مورخین رطب اللسان ہیں۔ (JOSEPH HELL) اپنی کتاب (THE ARAB CIVILISATION) میں لکھتا ہے:۔

ایرانی، بازنطینی اور مصر کے قبطی، ایک ناقابلِ علاج جمود کا شکار ہو چکے تھے اور اس قابل ہی نہ تھے کہ اپنی جدّ و جہد کے ذریعے وہ شاہراہِ ترقی پر گامزن ہو سکتے۔ عربوں کے ساتھ رابطہ نے ان کے جمود کو توڑا اور انہیں ایک تازہ حیاتِ دانش و بینش کے لئے بیدار کر دیا۔ اسلامی تمدن کی تاریخ میں یہ ایک عظیم واقعہ ہے اور اس زمانے میں عربوں کے مشن کی اہمیت کا ناقابلِ تردید ثبوت۔

(انگریزی ترجمہ، پروفیسر خدا بخش۔ ص۷)

یہی مورخ دوسرے مقام پر لکھتا ہے:۔

عربوں نے اپنے ملک ہی میں نہیں بلکہ ان مفتوحہ علاقوں میں بھی نئی نئی درسگاہیں کھولیں یہ ایک ایسا کارنامہ ہے جس کی مثال نہ عہدِ قدیم کی تاریخ پیش کر سکتی ہے اور نہ ہی ابتدائی عہد کی عیسائیت۔

(ایضاً ص۵۲)

اہلِ زمین کی طرف سے ان مجاہدینِ اسلام کو اس طرح خراجِ تحسین پیش کیا گیا اور آنسوئے افلاک سے ان پر اس نویدِ جانفزا کے ساتھ تبریک و تہنیت کے پھول برسائے گئے کہ

هُوَ الَّذِیْ یُصَلِّیْ عَلَیْكُمْ وَ مَلٰٓىِٕكَتُهٗ لِیُخْرِجَكُمْ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِؕ

وَ كَانَ بِالْمُؤْمِنِیْنَ رَحِیْمًا۔ (۳۳/۴۳)

خدا اور اس کے فرشتے ان پر درود و سلام کی بارش کرتے ہیں تاکہ وہ انہیں تاریکیوں سے نکال کر روشنی کی طرف لے آئے۔ خدا کی رحمتیں ان کے شامل حال ہیں۔

یہ انہی کے حسنِ عمل کا صدقہ ہے کہ ہم آج (نام ہی کے سہی) مسلمان کہلاتے ہیں اور ایسی ایسی وسیع و عریض مملکتوں کے مالک بنے بیٹھے ہیں۔ کتنے زور کا تھا وہ تحرک جس سے ملّتِ اسلامیہ کا "ڈبہ" انجن کے بغیر" چودہ سو سال سے رواں دواں چلا آ رہا ہے[1]۔

(۵)

حضرت خالدؓ بن ولیدؓ کی معزولی

"حضرت عمرؓ نے حضرت خالدؓ بن ولیدؓ کو معزول کر دیا تھا"

(جیسا کہ اس عنوان کے آخر میں لکھا جائے گا) ہمارے نزدیک یہ واقعہ کچھ ایسا اہم نہیں تھا کہ اسے ہم ایک الگ عنوان کے تحت تفصیل سے لکھتے۔ لیکن ہماری تاریخ نے اسے ایسی اہمیت دے رکھی ہے کہ ہو نہیں سکتا کہ عہدِ فاروقیؓ کی تاریخ کسی کے سامنے آئے اور وہ فہرست میں اس واقعہ کو تلاش نہ کرے۔ چونکہ ہمیں اس کا اندازہ اور احساس ہے کہ ہمارے قارئین بھی ایسا ہی کریں گے، اس لئے ہم ان کے ذوقِ تجسس کی تسکین کے لئے اسے تفصیل سے لکھتے ہیں۔ جیسا کہ ہمارا انداز اور اسلوب ہے' ہم پہلے ان احوال و کوائف کو من و عن درج کر دیں گے جو اس سلسلہ میں ہماری کتبِ تاریخ میں مذکور ہیں' اور اس کے بعد ان پر تبصرہ کریں گے۔

حضرت خالدؓ بن ولیدؓ حضرت عمرؓ کے ماموں زاد بھائی تھے اور عہدِ جاہلیت ہی میں فنِ سپہ گری کے مشہور ماہر۔ چنانچہ قریش کے رسالہ کی افسری انہی کے سپرد تھی۔ جنگِ اُحد میں قریش کے اکھڑے ہوئے قدم انہی کی عسکری

---

[1] گاڑیوں کی شنٹنگ کے وقت بعض اوقات انجن اتنے زور سے دھکا لگا دیتا ہے کہ ڈبے' انجن کے بغیر' کتنی دور تک بھاگے چلے جاتے ہیں۔ ہماری ملت کی گاڑی' جو اس وقت تک مصروفِ خرام ہے' وہ صدرِ اوّل کے تحرک ہی کا نتیجہ ہے۔

تدبیر کی بنا پر سنبھلے تھے اور حدیبیہ کے موقعہ پر بھی، قریش کی طرف سے (مسلمانوں کے خلاف) جنگ کی تیاریاں انہی کی زیرِ نگرانی ہو رہی تھیں لیکن تاریخ کا یہ واقعہ بھی عجائبات اور نوادرات میں شامل کئے جانے کے قابل ہے کہ جو سپہ سالار، حدیبیہ کے موقعہ پر، مسلمانوں کے خلاف جنگ کی تیاریاں کر رہا تھا، وہ صلح حدیبیہ کے بعد مکہ سے مدینہ پہنچا اور بارگاہِ نبوی میں حاضر ہو کر مشرف بہ اسلام ہو گیا۔ (حضرت عمرو بن عاصؓ بھی انہی کیساتھ اسلام لاتے تھے ۔۔۔ ایک فاتحِ شام و عراق اور دوسرا فاتحِ مصر!) اور وہی خالدؓ، جو حدیبیہ کے موقعہ پر قریش کے سپہ سالار

سیفُ اللہ

تھے، فتح مکہ کے دن، قریش کے خلاف، مسلمانوں کے ایک دستہ کے افسر تھے۔ حضور نبی اکرمؐ نے اسی موقعہ پر انہیں سیف اللہ کے زندۂ جاوید لقب سے سرفراز فرمایا تھا۔ وہ لقب جس سے قرطاسِ زمانہ پر ان کا دوام ثبت ہو گیا۔

جب نبی اکرمؐ نے ۸ھ میں زید بن حارثؓ کے زیرِ قیادت رومیوں کے خلاف سب سے پہلا لشکر روانہ فرمایا ہے تو (جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا ہے) حضرت خالدؓ اس میں، اپنی رضامندی سے، بطور ماتحت شامل ہو گئے تھے لیکن میدانِ جنگ میں جب اسلامی لشکر کے تین علمبردار ۔۔۔ حضرت زید بن حارثؓ، حضرت جعفرِ طیارؓ اور حضرت عبداللہ بن رواحہؓ ۔۔۔ یکے بعد دیگرے شہید ہو گئے تو اہلِ لشکر کی رضامندی سے حضرت خالدؓ نے علمِ قیادت اٹھایا اور اپنے حسنِ تدبر سے لشکر کو محفوظ نکال کر واپس لے آئے۔ ان کی یہ تدبیر بڑی کامیاب قرار پائی۔

عہدِ صدیقیؓ میں "مانعینِ زکوٰۃ" کی سرکوبی کی مہم حضرت خالدؓ کے سپرد ہوئی جسے انہوں نے بڑی جرأت و بسالت سے سر کیا۔ جنگِ یمامہ کے تو نام ہی سے معرکہ نگاری کی وادیاں گونج اٹھتی ہیں۔ ان مہمات کو انہوں نے سر کیا اور مقامِ حیرت ہے کہ یہی وہ مہمات ہیں جن سے اس آویزش کی ابتدا ہوئی جس نے آگے جا کر ان کی معزولی کی شکل اختیار کر لی۔ ان میں پہلا واقعہ مالک بن نویرہ کے قتل کا ہے۔

نبی اکرمؐ نے بنی تمیم کی مختلف شاخوں کے لئے مختلف امیر مقرر فرمائے تھے۔ ان میں مالک بن نویرہ بھی تھا جو بنی یربوع کا سردار تھا۔ رسول اللہ کی وفات پر جن سرداروں نے یہ فیصلہ کیا تھا کہ زکوٰۃ کی رقم مرکز میں نہ بھیجی جائے، ان میں مالک بن نویرہ بھی تھا۔ حضرت خالدؓ نے سخت مقابلہ کے بعد اسے گرفتار کر لیا۔ چاہیئے تو یہ تھا کہ حضرت ابوبکرؓ کی ہدایات کے مطابق اسے مدینہ بھیج دیتے تاکہ امیرالمؤمنین خود اس کے متعلق فیصلہ کرتے لیکن حضرت خالدؓ نے ایسا نہ کیا بلکہ اسے وہیں قتل کر دیا۔ اس کی وجہ کیا تھی، اسے تاریخ کی ان تاسف انگیز روایات سے اخذ کیجئے جن میں کچھ معلوم نہیں کہ کس قدر

حقیقت ہے اور کس قدر افسانہ۔ ان میں کہا گیا ہے کہ

مالک بن نویرہ کا قتل

جب مالک بن نویرہ گرفتار ہونے کے بعد، خالدؓ سے باتیں کر رہا تھا تو اس کی بیوی لیلےٰ اس کے ساتھ تھی۔ وہ حُسن وجمال میں بے نظیر تھی۔ جب خالدؓ نے مالک سے کہا کہ میں تجھے قتل کر دوں گا تو لیلےٰ خالدؓ کے قدموں میں گر پڑی اور ان سے اپنے خاوند کے لئے طلبگارِ عفو ہوئی۔ اس کے بال کندھوں پر بکھرے ہوئے تھے اور اس کی آنکھوں سے آنسوؤں کی لڑی جاری تھی۔ اس حال میں اس کی خوبصورتی دوبالا ہو گئی۔ جس نے خالدؓ کو مسحور کر دیا۔ خالدؓ کے لئے لیلےٰ کو اپنے قبضہ میں لے لینے کا طریق اس کے سوا کوئی نہ تھا کہ مالک کو قتل کر دیا جائے۔ چنانچہ مالک نے اپنے قتل کے وقت کہا تھا کہ افسوس! میری بیوی میرے قتل کا موجب بن گئی۔

اور ابھی مالک کی لاش سامنے تڑپ رہی تھی کہ خالدؓ نے لیلےٰ سے شادی کر لی۔ ایک مسلمان کی بیوی سے اس کے عدت گزارنے سے بھی پہلے شادی!!

اسی طرح روایات میں ہے کہ جنگِ یمامہ میں مخالفین کے ایک سردار، مجاعہ نے صلح کی درخواست کی۔ حضرت خالدؓ نے

مجاعہ کی بیٹی سے شادی

معاہدہ صلح کی تکمیل کے ساتھ ہی مجاعہ سے کہا کہ وہ اپنی لڑکی کی شادی ان سے کر دے۔ اس نے انکار کیا تو حضرت خالدؓ نے اس پر سختی کی تا آنکہ اسے مجبوراً اپنی بیٹی کی شادی حضرت خالدؓ سے کرنی پڑی۔

یہ دَورِ صدیقی کے واقعات ہیں۔ جب ان کی اطلاع مدینے پہنچی تو حضرت خالدؓ کی طلبی ہوئی ــــ اس مقام پر تاریخ ایک اور شوشہ چھوڑتی ہے اور کہتی ہے کہ حضرت عمرؓ کی حضرت خالدؓ کے ساتھ پرانی دشمنی چلی آ رہی تھی۔ انہوں نے اس موقعہ کو غنیمت سمجھا اور حضرت ابوبکرؓ سے کہا کہ انصاف کا تقاضا ہے کہ خالدؓ کو معزول کر دیا جائے اور اسے اس کے جرائم کی عبرتناک سزا دی جائے۔ اس پر حضرت ابوبکرؓ نے کہا کہ آپ کی بات تو ٹھیک ہے لیکن اس وقت ملک میں عام بغاوتیں ہو رہی ہیں جنہیں خالدؓ کے سوا کوئی اور فرو نہیں کر سکتا، اس لئے مصلحت کا تقاضا یہی ہے کہ اسے کچھ نہ کہا جائے۔ اس پر حضرت عمرؓ نے کہا کہ دین کے معاملہ میں مصلحت کا کیا کام! خالدؓ کے جرائم بڑے سنگین ہیں۔ اسے ان کی سزا ملنی چاہیئے لیکن حضرت ابوبکرؓ نہ مانے اور حضرت خالدؓ کو معمولی سی سرزنش سے زیادہ کچھ نہ کہا۔ حضرت عمرؓ نے اس بات کو اپنے دل میں رکھا اور جونہی وہ برسرِ اقتدار آئے، (یعنی ۱۳ھ میں) تو سب سے پہلا حکم جو نافذ

فرمایا وہ حضرت خالدؓ کی معزولی کا تھا۔

لیکن تاریخ یہ بھول گئی کہ حضرت عمرؓ کے عہدِ خلافت میں، شام اور عراق میں جو عظیم معرکہ آرائیاں ہوئیں اور مسلمانوں کو جس قدر شاندار کامیابیاں نصیب ہوئیں، وہ بیشتر سیف اللہ ہی کے تصدق تھیں۔ ہم یہ بھی دیکھ چکے ہیں کہ جب حضرت عمرؓ (سنہ ۱۶ھ میں) بیت المقدس تشریف لے گئے ہیں تو جو تین زعمائے ملت ان کے استقبال کے لئے آئے تھے، ان میں ایک حضرت خالد بن ولیدؓ بھی تھے۔ نیز تاریخ میں یہ بھی مذکور ہے کہ سنہ ۱۷ھ میں، جب حضرت خالدؓ قنسرین کے امیر تھے، ان کی بہت سی بے اعتدالیوں کی خبریں بارگاہِ خلافت میں پہنچیں۔ ان میں ایک یہ بھی تھی کہ حضرت خالدؓ نے ایک شاعر اشعثؔ بن قیس کو دس ہزار درہم بطور انعام دیئے تھے اور ایک یہ کہ انہوں نے ایک حمام میں شراب ملے ہوئے پانی سے مالش کرائی تھی۔ حضرت عمرؓ نے ان سے جواب طلبی کی تو انہوں نے کہا کہ "ہم شراب کو اس قدر کمزور کردیتے ہیں کہ وہ بالکل پانی ہوجاتی ہے۔" حضرت عمرؓ اس جواب سے مطمئن نہ ہوئے، اور انعام والے قصہ میں حضرت خالدؓ نے جواب دینا ضروری نہ سمجھا۔ اس پر حضرت عمرؓ نے حضرت ابو عبیدہؓ بن جراح کو (جو اس علاقہ کے امیر تھے) لکھا کہ خالدؓ کو بلا کر اس کی مشکیں کسو، سر سے اس کی ٹوپی اتارو، اور اس سے پوچھو کہ اس نے اشعثؔ کو انعام اپنے پاس سے دیا ہے یا مالِ غنیمت میں سے۔ اگر مالِ غنیمت میں سے دیا ہے تو یہ خیانت ہے اور اگر اپنے پاس سے دیا ہے تو یہ اسراف ہے۔ ہر دو صورتوں میں خالدؓ کو معزول کرکے اس کے علاقہ کو اپنی ولایت میں شامل کرلو۔" یہ خط حضرت بلالؓ کے ہاتھ بھیجا گیا۔ حضرت ابو عبیدہؓ نے معاملہ حضرت بلالؓ پر چھوڑا کہ وہ جس طرح چاہیں خلیفہ کے حکم کی تعمیل کریں۔ انہوں نے لوگوں کو جمع کیا۔ حضرت خالدؓ کا عمامہ اتار کر اس سے ان کے ہاتھ پیٹھ کے پیچھے باندھ دیئے اور ان کے سر سے ٹوپی اتار کر، پوچھا کہ انعام کس مد سے دیا تھا۔

معزولی کا قصہ

حضرت خالدؓ نے اس تمام ذلت آمیز سلوک کو نہایت ضبط و تحمل سے برداشت کیا اور جواب میں کہا کہ انہوں نے انعام اپنے پاس سے دیا تھا۔ اس پر انہوں نے اور دوسرے لوگوں نے سمجھا کہ معاملہ ختم ہوگیا لیکن حضرت عمرؓ نے انہیں مدینہ بلالیا اور ان سے کہا کہ "تم کہاں کے ایسے دولت مند تھے کہ اس قدر خطیر رقم انعام میں دے دی۔ انہوں نے کہا کہ ان فتوحات میں ساٹھ ہزار درہم بطورِ مالِ غنیمت میرے حصہ میں آیا ہے۔ آپ حساب کرلیجئے۔ جس قدر اس سے زاید ہو، وہ لے لیجئے۔ چنانچہ حساب کیا گیا تو اسی ہزار درہم نکلے۔ ان میں سے ساٹھ ہزار چھوڑ دیئے گئے اور باقی بیس[20] ہزار بیت المال میں داخل کردیئے گئے لیکن اس کے ساتھ ہی حضرت عمرؓ نے انہیں معزول بھی کردیا۔ یہ سنہ ۱۷ھ کی بات ہے۔

تاریخ اپنے اس تضاد کو اس طرح رفع کرتی ہے کہ ۱۳ھ میں حضرت عمرؓ نے انہیں سپہ سالاری کے منصب سے تنزلی کے بعد نائب سپہ سالار بنا دیا تھا اور ۱۷ھ میں انہیں ان کے عہدہ ہی سے معزول کر دیا تھا چنانچہ

تنزلی اور معزولی

وہ حمص کے قریب ایک جگہ جا کر مقیم ہو گئے اور اسی غم و اندوہ میں، چار سال بعد مدینہ میں وفات پا گئے، جہاں وہ اپنی والدہ کو ملنے کے لئے آئے تھے۔ حضرت عمرؓ کو ان کی وفات کا سخت صدمہ اور رنج ہوا۔

تاریخ یہ بھی بتاتی ہے کہ حضرت خالدؓ کی معزولی پر صحابہؓ میں بہت سی چہ میگوئیاں ہوئیں لیکن نہ تو حضرت خالدؓ نے کسی قسم کی اشتعال انگیز بات کی اور نہ ہی فوج میں، جس کے دلوں میں حضرت خالدؓ کا اس قدر احترام تھا، کوئی فتنہ برپا ہوا۔ ان کی معزولی کے حکم کے ساتھ ہی حضرت عمرؓ نے ملک میں اعلان کر دیا کہ

> میں نے خالدؓ کو کسی ناراضگی یا خیانت کی بنا پر معزول نہیں کیا۔ بات یہ ہے کہ لوگ ان کے بے حد گرویدہ ہو گئے تھے۔ اس سے مجھے اندیشہ ہوا کہ لوگ کہیں ان پر بھروسہ کر کے نہ بیٹھ جائیں۔ اس لئے میں نے مناسب سمجھا کہ لوگوں کو بتا دیا جائے کہ فتح و ظفر خدا کی نصرت سے ہوتی ہے۔ یہ کسی شخصیت سے وابستہ نہیں ہوتی۔

یہ ہے ملخص ان روایات کا جو اس باب میں ہماری کتبِ تاریخ میں مذکور ہیں اور چونکہ اس واقعہ (یا قصہ)

مسلمانوں کے مختلف گروہ

سے، صدرِ اوّل کی تین عظیم شخصیتیں متعلق (یا مخالفین کے الفاظ میں، ملوث) ہیں، اس لئے ان کی بنا پر بحث و تمحیص کا بازار گرم چلا آ رہا ہے۔ ایک گروہ ایک ہی تیر سے ان تینوں شخصیتوں کو اپنے طعن کا ہدف بنا دیتا ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ

(۱) مالک کی بیوی لیلےٰ اور بنتِ مجاعہ کے ساتھ شادی کرنے سے (حضرت) خالد بن ولیدؓ نے ایسے کردار کا ثبوت دیا جو ایک مسلمان کے قطعاً شایانِ شان نہ تھا۔ اس سے حضرت خالدؓ ہدفِ طعن قرار پا گئے۔

(۲) حضرت ابوبکرؓ نے مصلحت کی بنا پر، ان کے خلاف کوئی اقدام نہ کیا حالانکہ دین اور عدل کے معاملہ میں مصلحت کا کوئی دخل نہیں ہونا چاہیئے تھا۔ اس سے حضرت ابوبکرؓ موردِ الزام قرار پا گئے۔

(۳) حضرت عمرؓ کو حضرت خالدؓ کے خلاف شروع سے حسد چلا آ رہا تھا۔ اس لئے انہوں نے اس ذاتی عناد کی بنا پر پہلے حضرت ابوبکرؓ کو اکسایا کہ وہ (حضرت) خالدؓ کے خلاف سخت کارروائی کریں اور جب وہ اس پر رضامند نہ

ہوئے تو اشعث کے انعام کا بہانہ رکھ کر انہیں خود معزول کر دیا۔ اس سے حضرت عمرؓ مطعون قرار پا گئے۔
دوسرا گروہ وہ ہے جو ان ہر سہ حضرات کی بلندیٔ مرتبت کا قائل ہے۔ اس لئے ان کی کوشش یہ ہے کہ وہ ان میں سے کسی کو بھی مطعون قرار نہ دیں۔ وہ ان روایات کی طرح طرح کی تاویلیں کرتے ہیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ ان تاویلات کی بات ٹھکانے کی بن نہیں پڑتی۔ ان تاویلات سے اگر ایک واجب الاحترام ہستی بری الذمہ قرار پاتی ہے، تو دوسری موردِ الزام قرار پا جاتی ہے۔ یہ گروہ حضرت خالدؓ کے متعلق کہتا ہے کہ وہ حساب کتاب کے معاملہ میں احتیاط نہیں برتتے تھے اور حضرت عمرؓ اس باب میں بڑے متشدد واقعہ ہوئے تھے۔ انہوں نے انہیں اس پر کئی بار تنبیہ بھی کی لیکن وہ اس پر بھی محتاط نہ ہوئے تو حضرت عمرؓ کو مجبوراً ایسا سخت قدم اٹھانا پڑا۔

یہ کشمکش اسی صورت میں پیدا ہوتی ہے، جب ہم تاریخی روایات کی صحت و سقم کا معیار اپنے رجحانات، یا ان کتابوں کے مؤلفین کے متعلق اپنی آراء کو قرار دے لیں۔ اگر ان کے پرکھنے کا معیار قرآنِ کریم کی شہادت قرار دے لیا جائے تو پھر اس قسم کی کوئی کشمکش پیدا نہیں ہوتی۔ قرآنِ کریم نے مومنین کی خصوصیت یہ بتائی ہے کہ

اَلَّذِیۡنَ یَجۡتَنِبُوۡنَ کَبٰٓئِرَ الۡاِثۡمِ وَ الۡفَوَاحِشَ اِلَّا اللَّمَمَ ؕ (۵۳/۳۲)

مومنین کی خصوصیت

یہ لوگ بڑے بڑے جرائم (کبیرہ گناہوں) اور بے حیائی کی باتوں سے مجتنب رہتے ہیں۔ البتہ ان سے یونہی چھوٹی موٹی سی لغزشیں سرزد ہو سکتی ہیں۔

یعنی وہ ایسی تمام حرکات سے مجتنب رہتے ہیں، جن سے ایک مومن کی سیرت داغدار ہو جائے لیکن وہ معصوم بھی نہیں ہوتے کہ بہ تقاضائے بشریت ان سے چھوٹی موٹی لغزشیں بھی سرزد نہ ہوں۔ یہ عام مومنین کے متعلق ہے اور صحابہ کبارؓ (مہاجرین و انصار) کے متعلق یہ قرآنی شہادت ہمارے سامنے ہے کہ وہ "مومن حقاً" تھے یعنی پکے اور سچے مومن (تفصیل کتاب کے مقدمہ میں گزر چکی ہے)۔ لہٰذا حضرت ابوبکرؓ ہوں یا حضرت عمرؓ یا حضرت خالدؓ، ان سے معمولی لغزشیں تو سرزد ہو سکتی ہیں لیکن تاریخ میں اگر کوئی ایسی بات ان کی طرف منسوب کی جاتی ہے جو ایک پکے اور سچے مومن کے شایانِ شان نہیں — یعنی وہ کبائر الاثم والفواحش کے ذیل میں آتی ہے — تو ہم بلا تامل کہہ دیں گے کہ وہ روایت صحیح نہیں۔ اس معیار کے مطابق اگر واقعہ زیرِ نظر کو پرکھا جائے تو اس سے کوئی کشمکش پیدا ہی نہیں ہو سکتی۔ قرآنِ کریم میں، مُحَمَّدٌ رَّسُوۡلُ اللّٰہِ ؕ وَ الَّذِیۡنَ مَعَہٗۤ (حضور نبی اکرمؐ اور آپؐ کے صحابہؓ) کے متعلق بالتصریح مذکور ہے کہ وہ اَشِدَّآءُ عَلَی الۡکُفَّارِ رُحَمَآءُ بَیۡنَہُمۡ (۴۸/۲۹) — تھے، یعنی مخالفین کے مقابلہ میں چٹان کی طرح سخت، لیکن آپس میں نہایت محبت

اور ہمدردی سے رہنے والے۔ قرآن کی اس شہادت کی بنا پر یہ تصور بھی نہیں کیا جا سکتا کہ حضرت عمرؓ نے حضرت خالدؓ کے خلاف یہ اقدام ذاتی حسد، عداوت یا جذبۂ انتقام کی بنا پر کیا ہو۔ اس کی وجہ مصالحِ مملکت اور مفادات کے سوا کوئی اور نہیں ہو سکتی۔

ہم نے شروع میں لکھا ہے کہ ہمارے نزدیک اس واقعہ کو وہ اہمیت حاصل ہی نہیں جو اسے خواہ مخواہ دے دی گئی ہے۔ حضرت عمرؓ ایک عظیم مملکت کے سربراہ اور کثیر افواجِ اسلامیہ کے "ہائی کمان" تھے۔ اس کیساتھ ہی وہ احکامِ خداوندی کے شدت سے پابند اور دین کے استحکام اور فروغ کے معاملات میں بڑے متشدّد تھے۔ وہ خود بھی اسی معیار کی زندگی گزارتے تھے اور اپنے عمّال سے بھی اسی انداز کی زندگی بسر کرنے کی توقع

یہ امورِ مملکت سے متعلق عام معاملہ تھا

رکھتے تھے۔ بنا بریں، وہ ان کی حرکات و سکنات کی جزئیات تک پر کڑی نگاہ رکھتے تھے اور جہاں کسی کو دیکھتے کہ اس سے کوئی ذرا سی لغزش سرزد ہوئی ہے، اسے سخت تنبیہ کرتے تھے۔ حضرت عمرو بن عاصؓ کچھ کم بلند مرتبہ کی حامل شخصیت نہ تھے۔ ہم دیکھ چکے ہیں کہ انہوں نے ایک منبر بنوا لیا تو آپ نے انہیں سخت سرزنش کی اور منبر تڑوا ڈالا۔ ایک دفعہ انہیں اپنے خط میں لکھا کہ "مجھے معلوم ہوا ہے کہ تم مجلس میں تکیہ لگا کر بیٹھتے ہو۔ عام لوگوں کی طرح بیٹھا کرو۔ تکیہ نہ لگایا کرو۔" مصر کے ایک حاکم عیاض بن غنم کے متعلق شکایت پہنچی کہ وہ باریک کپڑے پہنتے ہیں اور انہوں نے دروازے پر دربان مقرر کر رکھا ہے۔ حضرت عمرؓ نے انہیں ان کے عہدے سے معزول کیا، مدینے بلا لیا اور ان سے کہا کہ

> اپنی قمیص اتار کر کمبل کا جبہ پہنو۔ بکریوں کا گلّہ لے کر جنگل کی طرف جاؤ۔ وہاں بکریاں چراؤ اور ہر راہگذر کو پانی پلاؤ۔ اس سے تمہیں معلوم ہو جائے گا کہ راعی کے فرائض کیا ہیں اور رعیت کے حقوق کیا۔

جب انہوں نے سُنا کہ خود ان کے (حضرت عمرؓ کے) اپنے بیٹے کو سزا دیتے وقت، حضرت عمرو بن عاصؓ نے کچھ رعایت برتی ہے تو بیٹے کو مدینہ بلایا اور اسے از سرِ نو سزا دی (تفصیل ان امور کی آگے چل کر سلے گی)۔ یہاں صرف یہ بتانا مقصود ہے کہ حضرت عمرؓ اپنے عمّال کی چھوٹی چھوٹی باتوں پر بھی نگاہ رکھتے تھے۔ وہ ان سے کہا کرتے تھے کہ یاد رکھو! جو باتیں عام لوگوں کے سلسلہ میں لمم کہلاتی ہیں (یعنی معمولی لغزشیں) تمہارے سلسلہ میں کبائر الاثم بن جاتی ہیں کیونکہ تمہاری رفتار، گفتار، کردار کا اثر تمہاری اپنی ذات تک محدود نہیں رہتا بلکہ وہ دوسروں کے لئے نمونہ بن جاتا ہے

اس لئے ہمیں ایسے امور میں خاص طور پر محتاط رہنا چاہیئے۔

ہو سکتا ہے کہ حضرت خالدؓ سے کچھ اسی قسم کی لغزشیں سرزد ہوئی ہوں اور حضرت عمرؓ نے انہیں ان پر سرزنش کی ہو۔ جہاں تک ان کی تنزلی یا معزولی کا تعلق ہے، حضرت عمرؓ نے اپنے عہدِ خلافت میں، بے شمار عمالِ مملکت کو متعین کیا۔ انہیں ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل کیا۔ بعض کو معطل کیا، بعض کو معزول کیا۔ انصرامِ امورِ مملکت کے ضمن میں ایسا ہوتا رہتا ہے اور حضرت عمرؓ کو بھی ایسا کرنا پڑتا تھا۔ اسی سلسلہ میں اگر انہوں نے اپنے ایک امیرؓ یا سپہ سالار (حضرت خالدؓ) کو معطل یا معزول کر دیا تو کون سی قیامت آ گئی۔! فاتحِ ایران حضرت سعدؓ بن ابی وقاص کا مرتبہ جس قدر بلند تھا، اس کے متعلق کچھ کہنے کی ضرورت نہیں۔ حضرت عمرؓ نے انہیں کوفہ کا گورنر مقرر کیا لیکن جب ان کے خلاف کچھ شکایات موصول ہوئیں تو انہیں معزول کر دیا۔ اس قسم کے اور متعدد واقعات تاریخ میں مذکور ہیں۔ بنا بریں، حضرت خالد بن ولیدؓ کی معزولی کے واقعہ میں کون سی منفرد استثنائی صورت ہے جسے خصوصیت کے ساتھ بحث کا موضوع بنایا جائے۔

اور اصل سوال تو یہ ہے کہ ہم اس قسم کی بحثوں میں پڑیں ہی کیوں، جن میں اشخاص کے محاکمہ کی ضرورت لاحق ہو جائے۔ ہمارے لئے قرآنِ کریم نے ایسی راہنمائی دی ہے جس کی روشنی میں ہمیں ضرورت ہی نہیں رہتی کہ ہم اپنے اسلاف کے متعلق اس قسم کے محاکموں میں اُلجھ جائیں۔ اس نے کہا کہ جہاں تک اسلاف کا تعلق ہے۔

تِلْكَ أُمَّةٌ قَدْ خَلَتْ لَهَا مَا كَسَبَتْ وَلَكُم مَّا كَسَبْتُمْ
وَلَا تُسْأَلُونَ عَمَّا كَانُوا يَعْمَلُونَ (۲/۱۴۱)

یہ لوگ اپنے اپنے وقت میں دنیا سے چلے گئے۔ جو کچھ انہوں نے کیا اس کا بدلہ انہیں ملے گا۔ جو کچھ تم کرو گے اس کا بدلہ تمہیں ملے گا۔ اور ہم تم سے پوچھیں گے بھی نہیں کہ انہوں نے کیا کیا تھا۔

ہمارا خدا تو یہ کہتا ہے کہ ہم تم سے ان کے متعلق کچھ نہیں پوچھیں گے اور ہم ہیں کہ ہزار برس سے ان حضرات کے "کفر و ایمان" یا حسنات و سیّئات کا فیصلہ کرنے میں دماغ سوزیاں اور قلم کاریاں کر رہے ہیں اور باہمی سر پھٹول سے تباہ ہو رہے ہیں۔ اقبالؒ نے کس قدر درد و غم میں ڈوب کر کہا تھا کہ :۔

ایکہ نشناسی خفی را از جلی ہشیار باش
اے گرفتارِ ابوبکرؓ و علیؓ ہشیار باش

ہمارے نزدیک یہ تمام حضرات وہ تھے جن کے متعلق خدا نے کہا تھا کہ

رضی اللہ عنھم و رضوا عنہ۔ و ذالک ھو الفوز العظیم۔

اللہ ان سے راضی ہوگیا اور وہ اللہ سے راضی ہو گئے اور یہ ان کی بہت بڑی کامیابی اور کامرانی تھی اور یہی اس باب میں حرفِ آخر ہے۔

ساتواں باب

آئینِ جہانداری

نظم و نسقِ مملکت

رسم و راہ و دین و آئینش زحق
زشت و خوب و تلخ و شیرینش زحق

عہدِ رسالتمآبؐ میں، اسلامی مملکت، جزیرہ نمائے عرب تک محدود تھی اور اس کا کل رقبہ قریب دس لاکھ مربع میل تھا۔ عہدِ فاروقی میں، عرب کے علاوہ ایران، عراق، فلسطین، شام، مصر، جزیرہ، خوزستان، آرمینیا آذربائیجان، خراسان، کرمان، مکران (جس میں کچھ حصہ بلوچستان کا بھی شامل تھا) اس مملکت میں شامل ہو گئے اور اس کا رقبہ قریب ساڑھے بائیس لاکھ (۲۲،۵۱،۰۳۰) مربع میل تک پھیل گیا۔

عرب، جنگجو قوم تھی اس لیے ان لڑائیوں میں انہوں نے جو کارہائے نمایاں سرانجام دیئے، وہ ایک حد تک قابلِ فہم تھے لیکن مملکت و حکومت کے تو وہ تصور تک سے ناآشنا تھے۔ ان کی ساری تاریخ میں، نہ کسی غیر قوم نے ان پر حکومت کی، نہ ہی ان کی اپنی کوئی حکومت تھی۔ وہ قدیم قبائلی زندگی بسر کرتے تھے۔ قبیلہ کے اندر متنازعہ فیہ معاملات کا تصفیہ سردارانِ قبیلہ کرتے تھے اور قبائل کے اندر اکثر سلسلۂ جنگ و جدال جاری رہتا تھا۔ اگر کبھی مصالحت کی نوبت آتی تو وہ بھی قبائل کے سربراہوں کی باہمی مفاہمت سے طے پاجاتی۔

بالکل نئی بات

ذرا سوچئے کہ اس قسم کی قوم کے قبضے میں دیوں کہیئے کہ گویا شب بھر) ایسی وسیع و عریض مملکت آجائے جس میں گوناگوں نسلوں، مختلف مذاہب

متنوّع تہاذیب و تمدّن' اور الگ الگ روایات کی حامل قومیں آباد ہوں تو اس (قوم) کے لئے اس کا نظم و نسق کس قدر مشکل ہو گا۔ یہ وہ مقام ہے جہاں نظر آتا ہے کہ جنابِ فاروق اعظمؓ فی الحقیقت ایک نابغہ (GENIUS) تھے۔ انہوں نے جس حُسنِ تدبر سے امورِ مملکت کو سنبھالا، سنوارا اور اسے مثالی بنایا' اپنے تو ایک طرف' غیر بھی اس پر ندرانۂ تحسین و آفرین پیش کرنے پر مجبور ہو جاتے تھے۔ تاریخ اس مقام پر بے ساختہ پکار اٹھتی ہے کہ اس قسم کی مثالی مملکت کی نظیر کہیں نہیں ملتی۔

اسلام کا سیاسی نظام کیا ہے' یہ ایک مستقل موضوع ہے جسے ہم الگ (باب نمبر ۹ میں) بیان کریں گے۔ اس مقام پر صرف اتنا کہنے پر اکتفا کیا جاتا ہے کہ قرآنِ کریم کی رُو سے' دنیا کے تمام مسلمان ایک اُمّت کے افراد

اسلامی نظامِ مملکت

ہوتے ہیں۔ (یعنی مسلمانوں کی مختلف اقوام نہیں ہوتیں، وہ سب ایک قوم ہوتے ہیں) اس اُمّت کی ایک مملکت ہوتی ہے (یعنی مسلمانوں کی الگ الگ قومیں اور ان کی الگ الگ مملکتیں نہیں ہوتیں) اس مملکت کا ایک سربراہ ہوتا ہے جسے اُمّت کے مشورہ سے منتخب کیا جاتا ہے۔ وہ سربراہ' امورِ مملکت' اُمّت کے مشورہ سے سرانجام دیتا ہے۔ قرآنِ کریم کا ارشاد ہے کہ۔ اَمْرُهُمْ شُوْرٰى بَيْنَهُمْ (۴۲/۳۸) "ان کے معاملات باہمی مشاورت سے سرانجام پائیں گے۔" قرآنِ کریم نے مشاورت کا اصولی حکم دیا ہے۔ مشاورت کی مشینری کا تعیّن خود نہیں کیا' اسے اُمّت کی صوابدید پر چھوڑا ہے کہ اپنے حالات اور اپنے زمانے کے تقاضوں کے مطابق جس قسم کی مشینری مناسب سمجھیں وضع و اختیار کرلیں۔

زیرِ نظر اسلامی مملکت کا مرکزی مقام مدینہ تھا اور حضرت عمر فاروقؓ اس کے سربراہ (امیرالمومنین)۔ ان کی ایک مجلسِ مشاورت تھی جو اعیانِ مدینہ (انصار و مہاجرین) کے منتخب افراد پر مشتمل تھی۔ اس میں حضرت علیؓ' حضرت عثمانؓ' عبدالرحمٰن بن عوف' زید بن ثابتؓ' معاذ بن جبل وغیرہ (رضی اللہ عنہم) جیسے اولوالعزم صحابہؓ شامل تھے۔ جب اس کی میٹنگ بلانی ہوتی تو ایک منادی اعلان کرتا۔۔۔ اَلصَّلٰوةُ جَامِعَةٌ ۔۔۔ صلوٰۃ کے لئے جمع ہو جاؤ ۔۔۔ (یہاں

صلوٰۃ جامعۃ

سے "صلوٰۃ" کا مفہوم و منطوق واضح ہو جاتا ہے) جب ارکانِ مجلس جمع ہو جاتے تو پہلے امیرالمومنین کے زیرِ امامت' دو رکعت نماز پڑھی جاتی جس سے اس امر کا اعتراف و اظہار و اعلان مقصود تھا کہ ہم قوانینِ خداوندی کے سامنے سرِ تسلیم خم کرنے (یعنی احکامِ خداوندی کی اطاعت کرنے) کی غرض سے جمع ہوئے ہیں۔ اس کے بعد حضرت عمرؓ خطبہ دیتے (یعنی ارکانِ مجلس سے خطاب کرتے) جس میں بحث طلب معاملہ پیش کیا جاتا۔ امورِ زیرِ نظر کے سلسلہ میں (عام طور پر) زیادہ بحث و تمحیص کی ضرورت نہ پڑتی کیونکہ ہر

معاملہ کا فیصلہ، قرآنِ کریم کے غیر متبدّل اصولوں کی چار دیواری کے اندر رہتے ہوئے کرنا ہوتا تھا۔ لہٰذا سوال سارا جزئیات کے تعین یا انتظامی مشینری کے متعلق سوچ بچار تک محدود ہو کر رہ جاتا تھا۔

جب کوئی زیادہ اہم معاملہ زیرِ غور ہوتا تو انصار و مہاجرین مدینہ کا عام اجلاس منعقد ہوتا اور اگر مسئلہ ایسا ہوتا جس سے صوبے بنیادی طور پر متعلق ہوتے تو وہاں کے منتخب افراد کو بھی دعوتِ شرکت دی جاتی۔

اس کے علاوہ، ایک مخصوص و مختصر مجلس بھی تھی جسے آج کی اصطلاح میں کابینہ کہا جائے گا۔ روزمرہ کے معاملات اس کے مشورہ سے طے پاتے تھے۔

مسجد کی حیثیت

یہ تمام اجتماعات مسجدِ نبویؐ میں منعقد ہوتے تھے۔ اسلام میں جس مقام پر اُمّت کے معاملات طے پائیں، اسے مسجد کہہ کر پکارا جاتا ہے — یعنی قوانینِ خداوندی کے سامنے سربسجود ہونے کا مقام — صدرِ اوّل میں مسجد ہی حکومت کا سیکرٹریٹ، وہی ایوانِ مملکت، پارلیمان کی نشست گاہ، عدالت، اور مرکزِ معاشرہ (COMMUNITY CENTRE) ہوتی تھی۔ چنانچہ ایک حدیث کی رُو سے حضورؐ نے حبشیوں کا ناچ بھی صحنِ مسجد ہی میں دیکھا تھا۔

صوبے اور اضلاع

۲۔ حضرت عمرؓ نے پوری مملکت کو آٹھ صوبوں میں تقسیم کر دیا تھا۔ ہر صوبے کا گورنر الگ تھا جسے والی کہا جاتا تھا۔ (صوبہ اس زمانے میں ولایت کہلاتا تھا اور اسی نسبت سے وہاں کے حاکم کو والی کہا جاتا تھا) پھر ہر صوبہ میں متعدّد اضلاع تھے جن کے نظم و نسق کے لئے مختلف شعبوں کے انچارج مختلف عمالِ حکومت ہوتے تھے۔ بڑے بڑے صوبوں میں کمشنریاں بھی تھیں۔ مثلاً مصر کو دو حصّوں (کمشنریوں) میں تقسیم کیا گیا تھا۔ ایک حصّے میں (۲۸) اضلاع تھے اور دوسرے میں (۱۵)۔ حضرت عمروؓ ابن عاص مصر کے والی تھے۔

حج سے مقصود

یوں تو ان صوبوں کے والیان کا مرکز میں اکثر آنا جانا رہتا تھا لیکن حج کے اجتماع میں سب کی شرکت لازمی تھی۔ ان کے ساتھ ہی ان لوگوں کو بھی دعوتِ عام دی جاتی تھی، جنہیں ان میں سے کسی کے خلاف کوئی شکایت ہو۔ ان شکایات کے فیصلے بھی حج کے موقعہ پر ہوتے تھے اور مملکت کے بین الصوبائی معاملات پر بحث و تمحیص بھی اسی اجتماع میں۔ وہ جو جبلِ رحمت سے امام کے عام خطاب (خطبہ) کے بعد، منیٰ میں تین دن کا قیام ہوتا ہے، وہ اسی زندگی بخش نظام کی بے روح یادگار ہے۔ وہاں ان مشترکہ معاملات پر، جن کا ذکر امام نے اپنے خطبہ میں کیا تھا، بحث و تمحیص بھی

ہوتی تھی اور ایک دوسرے کی ضیافتیں بھی۔ انہی ضیافتوں نے اب "قربانی" کی شکل اختیار کر رکھی ہے۔

رہ گئی رسم اذاں روحِ بلالی نہ رہی

اور یہ کچھ، اجتماعاتِ صلوٰۃ و حج تک ہی محدود نہیں۔ اسلامی نظامِ زندگی کے تمام ارکان کی یہی حالت ہو چکی ہے۔ جب دین، مذہب میں تبدیل ہو جائے تو اس میں ہوتا ہی یہ ہے کہ اُس حیات بخش نظام کے مختلف اجزاء کی شکلیں باقی رہ جاتی ہیں لیکن ان کا مقصود و مطلوب باقی نہیں رہتا۔ انہیں ایک جسدِ زندہ کی ممی شدہ لاشیں کہیئے۔ اقبالؒ کے الفاظ میں:۔

رگوں میں وہ لہو باقی نہیں ہے ؞ وہ دل، وہ آرزو باقی نہیں ہے

نماز و روزہ و قربانی و حج ؞ یہ سب باقی ہیں تو باقی نہیں ہے

بہرحال یہ تھا دورِ فاروقی کی اسلامی مملکت کا تنظیمی نقشہ۔ یہ چیز یقیناً وجۂ حیرت بن جاتی ہے کہ اُس زمانے میں، جب نظامِ رسل و رسائل کا اس قدر فقدان اور وسائلِ مواصلات کی اتنی قلت تھی، اتنے وسیع رقبے پر پھیلی ہوئی مملکت کا انتظام، اور وہ بھی اس حسن و خوبی سے کہ کسی جگہ کسی قسم کا کوئی خلفشار یا انتشار پیدا نہ ہو،

کامیابی کا راز

کس طرح ممکن تھا؟ اس کی بنیادی وجہ تو ہم آگے چل کر بتائیں گے، جہاں یہ حقیقت سامنے آئے گی کہ مملکت کی انتظامی مشینری بے شک اپنی جگہ اہمیت رکھتی ہے لیکن اس کی کامیابی کا دارومدار ان "ہاتھوں" پر ہوتا ہے جو اس مشینری کو چلاتے ہیں۔ حضرت عمرؓ کے حسنِ تدبّر کی کرشمہ زائی اس وقت سامنے آتی ہے، جب ہم دیکھتے ہیں کہ وہ ان "ہاتھوں" کا انتخاب کس طرح کرتے تھے اور پھر انہیں قاعدے اور قانون کے مطابق مصروفِ حرکت و عمل کس طرح رکھتے تھے؟ جہاں تک تنظیم کا تعلق ہے، مرکزی حکومت کے "پرچہ نویس" مملکت کے طول و عرض میں اس طرح پھیلاتے ہوتے تھے کہ چھوٹے

پرچہ نویس

سے چھوٹا واقعہ بھی ان کی نگاہوں سے اوجھل رہتا تھا اور نہ ہی امیر المومنین کے علم سے باہر۔ وہ "پرچہ نویس" قابلِ اعتماد اس قدر تھے کہ ان کی کوئی رپورٹ کبھی غلط یا جانبدارانہ ثابت نہیں ہوئی۔

شعبۂ محاصل (REVENUE DEPARTMENT)

جسمِ انسانی کی مشینری میں جو مقام نظامِ ہضم کا ہے، مملکت کی مشینری میں وہی اہمیت شعبۂ محاصل کو حاصل ہے۔ اس سے آپ اندازہ لگا سکتے ہیں کہ اس قدر وسیع و عریض مملکت کے محاصلی نظام کو صحیح خطوط پر تشکیل کرنے اور عمدگی سے چلانے کے لئے کس قدر دقتِ نظر اور انتظامی صلاحیت درکار ہوگی۔ اس کی اہمیت اور بھی بڑھ جاتی ہے جب یہ حقیقت پیشِ نظر رہے کہ مملکت کی آمدنی میں ایک پائی بھی ناجائز طریق سے نہ آنے پائے اور ایک پائی بھی بے جا خرچ نہ ہو۔ حضرت عمرؓ سے ایک دفعہ کسی نے پوچھا تھا کہ آپ اپنے تجربہ کی بنا پر بتایئے کہ "خلافت" کسے کہتے ہیں۔ اس کے جواب میں آپ نے فرمایا تھا کہ میں تو اتنا ہی سمجھ سکا ہوں کہ خلافت سے مراد یہ ہے کہ خدا کے سامنے حساب دیتے وقت یہ بتایا جا سکے کہ

کہاں سے لیا تھا اور کسے دیا تھا۔

اگر اس کا جواب اطمینان بخش ہے تو یہ خلافت ہے ورنہ ملوکیت۔

آپ سوچئے کہ اس پابندی کے ساتھ، شعبۂ محاصل و مخارج کس قدر اہمیت در آغوش ہو جاتا ہے۔

اراضیات کا انتظام

اس زمانے میں انڈسٹری (صنعت) ہنوز معاشی نظام کے طور پر وجود میں نہیں آئی تھی۔ معاشی نظام زرعی تھا۔ (تفصیل ان امور کی "نظامِ معاشی" سے متعلق باب میں ملے گی) حضرت عمرؓ نے مملکت کی اراضیات کی پیمائش کرائی۔ پیداوار کے لحاظ سے ان کے درجات مقرر کئے۔ ان درجات کے مطابق لگان کی شرحیں مقرر کیں۔ لگان کا حساب کرنے کے لئے نہایت آسان اصول مقرر کئے اور اس کی وصولی کے لئے ایسے اربابِ دیانت و امانت کہ پوری مملکت میں کسی ایک شخص کو ان کے خلاف کوئی شکایت نہیں ہوئی۔ زمین کی اصلاح کے لئے ضروری اقدامات کئے گئے۔ تمام ممالکِ مفتوحہ میں آبپاشی کے لئے نہریں کھدوائیں، بند بنوائے، تالاب تیار کرائے، پانی کی تقسیم کے لئے دہانے یا "موگے" بنائے یہ تمام امور ایک خاص شعبہ کے سپرد تھے۔ نتیجہ اس کا یہ تھا کہ زمین سے جس قدر آمدنی حضرت عمرؓ کے زمانے میں ہوئی اس کے بعد کبھی نہیں ہوئی۔

جیسا کہ اوپر کہا گیا ہے، معاشی نظام کا تفصیلی تذکرہ ایک الگ باب میں کیا جائے گا۔

نہروں کی ضرورت آبپاشی کے لئے ہی نہیں تھی۔ ان ممالک میں پینے کے پانی کی بھی بڑی قلت تھی۔

نظامِ آب رسانی

چنانچہ اس مقصد کے لئے بھی نہریں کھدوائی گئیں۔ بصرہ میں پانی کی قلت دور کرنے کے لئے دجلہ سے نو میل لمبی نہر کاٹ کر شہر تک پہنچائی گئی جس سے گھر گھر پانی کی افراط ہو گئی۔ اسی طرح دجلہ سے ایک اور نہر کاٹی گئی تھی جو اس کے مہتمم کے نام کی نسبت سے "نہر معقل" کہلائی۔ سب سے بڑی نہر خود امیر المومنین کی طرف منسوب تھی اور اپنی اہمیت کے لحاظ سے وہ تھی بھی ایسی جس کا انتساب، خود امیر المومنین کی طرف ہونا چاہیئے تھا۔ اس زمانے میں دریائے نیل کی حالت یہ تھی کہ وہ اپنے دھانے کے قریب جا کر اس قابل نہیں رہتا تھا کہ اس سے جہاز بحیرۂ قلزم میں داخل ہو سکیں۔ جب ۱۸ھ میں عرب میں قحط پڑا ہے تو حضرت عمرؓ نے تمام مملکت کے صوبوں کو لکھا تھا کہ جس قدر ممکن ہو، زیادہ سے زیادہ غلّہ مدینہ بھیجیں۔ غلّہ بافراط شام اور مصر سے آ سکتا تھا لیکن ان مقامات سے خشکی کا راستہ اس قدر طویل تھا کہ قافلہ کو مدینہ پہنچتے پہنچتے بہت دیر لگ جاتی تھی۔ قحط ختم ہوا تو حضرت عمرؓ نے سوچا کہ اس

نیل اور بحیرۂ قلزم

مستقل دقّت کا رفع کیا جانا نہایت ضروری ہے۔ اس کیلئے فسطاط سے ایک نہر کاٹ کر بحیرۂ قلزم سے ملا دی گئی۔ یہ نہر قریب ستر میل لمبی تھی، اور ایسی کہ اس سے جہاز باآسانی بحیرۂ قلزم تک پہنچ سکتے تھے۔ اس سے مکّہ اور مدینہ کی بندرگاہ جدّہ اور مصر گویا ایک ہو گئے۔

اس زمانے میں نہر سویز نہیں تھی۔ اس لئے بحیرۂ قلزم اور بحیرۂ روم ایک دوسرے سے الگ تھے۔ ان کے درمیان قریب ستر میل لمبا خشکی کا قطعہ تھا۔ حضرت عمروؓ بن عاص نے تجویز کیا کہ اس خشکی کے قطعہ میں سے نہر نکال کر، ان دونوں سمندروں کو ملا دیا جائے۔ تجویز تو معقول تھی لیکن حضرت عمرؓ نے کہا کہ اس سے ایک سیاسی

نہر سویز کا تصوّر

خطرہ ہے اور وہ یہ کہ اس طرح یونانی، جہازوں کے ذریعے آ کر حاجیوں کو لوٹ لیا کریں گے۔ اس لئے ہمیں ایسا نہیں کرنا چاہیئے۔ اگر وہ نہر کھد جاتی تو "سویز" کا سہرا بھی صدرِ اوّل کے مسلمانوں کے سر ہوتا۔ بایں ہمہ، اس تجویز اور اس کے امکان کے خیال کی اوّلیت کا سہرا تو پھر بھی انہی کے سر ہے۔

نہروں کے علاوہ مملکت میں مناسب مقامات پر بڑے بڑے شہر بسائے۔ ان میں بصرہ اور کوفہ

نئے شہر

خاص شہرت کے مالک ہیں۔ حضرت عمرؓ نے ان شہروں کے محلِ وقوع کا تعیّن خود کیا۔ ان کے نقشے خود مرتب کرائے جن میں شاہراہوں اور گلیوں کی الگ الگ نشاندہی کی گئی۔

مکانات ابتداءً گھاس پھونس کے تھے لیکن آگ سے نقصان پہنچنے پر انہیں پختہ کر دیا گیا۔ حکم یہ تھا کہ کوئی شخص تین کمروں سے زاید پر مشتمل مکان نہ بنائے۔ ان شہروں کی وسعت اور آبادی کا اندازہ اس سے لگایئے کہ کوفہ کی جامع مسجد اس قدر وسیع تھی کہ اس میں چالیس ہزار نمازی آسکتے تھے اور اس کے باوجود آئندہ ضرورت کے لئے، اس کے ارد گرد کافی زمین کھلی چھوڑ دی گئی تھی۔

سڑکیں ساری مملکت میں سڑکوں کا جال بچھا دیا گیا اور ضروری مقامات پر بڑے مضبوط پُل تعمیر کر دیئے گئے۔ ان شاہراہوں پر تھوڑے تھوڑے فاصلے پر حفاظت کے لئے چوکیاں اور مسافروں کے لئے سرائیں تعمیر کرا دی گئیں۔

جدید عمارات میں، مساجد کو خاص اہمیت حاصل تھی جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا ہے، اس زمانے میں مسجد،

مساجد صرف نماز پڑھنے کا مقام نہیں تھی۔ وہ مسلمانوں کی اجتماعی زندگی کے ہر شعبہ کا مرکز تھی۔ اس سے مساجد کی ضرورت اور اہمیت کا اندازہ لگ سکتا ہے۔ بعض روایات کے مطابق عہدِ فاروقی میں قریب چار ہزار جدید مساجد تعمیر ہوئی تھیں۔

ان کے علاوہ، مرکزی مقامات میں بیت المال کی عمارات نہایت مستحکم طریق پر بنوائی گئیں۔ حفاظت

بیتُ المال کی غرض سے انہیں مساجد کی عمارت کے ساتھ ملحق کر دیا جاتا تھا۔ (ضمناً) جب سے اسلام، دین سے مذہب میں تبدیل ہوا ہے، زکوٰۃ کی طرح بیت المال کے ساتھ بھی "مذہبی تقدس" کا تصور چسپاں ہو گیا ہے، حالانکہ زکوٰۃ، اسلامی مملکت کی آمدنی کو کہتے تھے (جس سے نوعِ انسان کی نشوونما کا سامان بہم پہنچایا جانا مقصود تھا) اور بیت المال حکومت کے خزانہ کو۔ دین و سیاست کی اسی ثنویت (الگ الگ ہونے) کا نتیجہ ہے کہ ہمارے مذہبی طبقہ کے نزدیک، حکومت کے ٹیکس اور زکوٰۃ — اور سرکاری خزانہ اور بیت المال کو ایک قرار دینا "کفر" نہیں تو "بے دینی" ضرور ہے۔ آپ نے دیکھا نہیں کہ آئے دن مطالبہ ہوتا رہتا ہے کہ حکومت، زکوٰۃ کی وصولی کے لئے الگ محکمہ کھولے اور "بیت المال" قائم کرے! اسلامی حکومت میں، ان میں کوئی فرق نہیں ہوتا تھا۔

عہدِ رسالتمآبؐ میں مسجدِ نبویؐ اُس زمانے کی ضروریات کے لئے کافی تھی لیکن عہدِ فاروقی میں مدینہ کی روز افزوں آبادی کے لئے وہ کافی نہیں رہی تھی۔ چنانچہ ۱۷ھ میں حضرت عمرؓ نے مسجد کے گرد و پیش کے مکانات خرید کر اسے وسیع کر دیا۔ اسی طرح حرمِ کعبہ کی بھی ضروری توسیع کرائی۔

عسکری نظام

اسلام میں ہر مومن، مجاہد (سپاہی) ہوتا ہے اس لئے حکومت کو الگ فوج تیار کرنے کی ضرورت نہیں پڑتی تھی۔ ہر مسلمان، عام حالات میں اپنا اپنا کاروبار کرتا اور جنگ کی صورت میں، ان میں سے جتنے سپاہیوں کی ضرورت ہوتی، وہ فوج کی شکل میں میدانِ کارزار کی طرف چلے جاتے۔ صورتِ حال تو حضرت عمرؓ کے زمانے میں بھی یہی تھی لیکن آپ نے اس میں ایک نظم اور باقاعدگی پیدا کی جس سے (یوں سمجھیے کہ) "فوجی محکمہ" کا وجود عمل میں آگیا۔ سب سے پہلے تو یہ کہ آپ نے رجسٹر مرتب کئے جن میں فوجی خدمت کے قابل تمام افراد کے نام اور کوائف درج تھے۔ چونکہ جنگوں کا سلسلہ متواتر جاری تھا، اس لئے آپ نے ان افراد کو دو حصوں میں تقسیم کیا — ایک وہ جو مہمات میں مسلسل مصروف رہتے تھے۔ (انہیں آج کی اصطلاح میں ریگولر آدمی کہیے) اور دوسرے وہ جنہیں ہنگامی ضرورت کے وقت بلایا جاتا تھا۔ (انہیں ریزرو سٹس کہہ لیجئے) مختلف مقامات پر چھاؤنیاں بنوائیں۔ ان چھاؤنیوں میں جدید طرز کی بارکیں تعمیر کرائیں۔ اس زمانے میں، جنگ کا بنیادی دارومدار گھوڑوں پر ہوتا تھا اس لئے آپ نے گھوڑوں کی افزائش، پرورش اور نگہ پرداخت کے لئے خصوصی انتظامات کئے۔ ان کے لئے چراگاہیں مختص کی گئیں، اصطبل بنوائے گئے۔ مرکزی مقامات پر ایک ایک اصطبل میں چار چار ہزار گھوڑے، سامانِ حرب وضرب سے لیس، ہر وقت تیار رہتے تھے۔ ان گھوڑوں کو جو داغ دیا جاتا تھا اس میں " جَیْشٌ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ " کے الفاظ مرتسم ہوتے تھے۔ رسد، سامانِ رسل ورسائل اور ذرائع مواصلات کے لئے الگ الگ محکمے قائم کئے۔ موسم کے لحاظ سے فوجوں کی ایک چھاؤنی سے دوسری چھاؤنی میں تبدیل ہوتی رہتی تھی۔ سپاہیوں کے لئے رخصت پر جانے کا خاص خیال رکھا جاتا تھا۔ فوج کے "پرچہ نویس" الگ تھے۔

یہ تمام انتظامات اس شخص نے کئے تھے جسے اپنی دس سالہ مدتِ خلافت میں، ایک دن بھی ایسا میسّر نہیں آیا تھا جس میں کہیں نہ کہیں جنگ نہ ہو رہی ہو اور ان جنگوں کا بھی یہ نقشہ تھا کہ ایک طرف فوجیں سرحدِ چین پر تھیں تو دوسری طرف مصر کے میدانوں میں اور ٹکراؤ تھا ایران اور روم کی ان سلطنتوں کے ساتھ جن کی ہیبت سے تاریخ کے اوراق آج بھی کپکپاتے ہیں۔

اس کے ساتھ اس حقیقت کو بھی پیشِ نظر رکھئے کہ اس تمام دوران میں، اندرونِ ملک بغاوت

تو ایک طرف، کسی قسم کا کوئی خلفشار تک نمودار نہیں ہوا۔ آج داخلی فسادات اور بغاوتوں کو دبانے کے لئے حکومت کے پاس فوج (STANDING ARMY) ہوتی ہے لیکن حضرت عمرؓ کے زمانے میں حکومت کی اپنی الگ کوئی فوج نہیں تھی۔ ساری قوم ہی فوج تھی جو ملک میں بکھری ہوئی تھی۔ ان حالات میں، ملک میں کسی قسم کا فساد رونما نہ ہونا، حسنِ نظم و نسق کی ایسی شہادت ہے جس سے بڑھ کر کوئی اور شہادت نہیں ہو سکتی۔

کیا ایسے منتظم کے فطین اور نابغہ ہونے میں کوئی شُبہ ہو سکتا ہے؟

(۰)

سپاہی، مبلّغِ اسلام

لیکن یہ سپاہی، یہ "حزب اللہ" کے جانباز، زمینوں کو فتح کرنے والے ہی نہیں تھے، انسانی قلوب کو مسخر کرنے والے بھی تھے۔ یہ اشاعتِ اسلام کا مؤثر ترین ذریعہ تھے۔ ان کی وجہ سے اسلام بڑی تیزی سے پھیلا — لیکن ان کی تلوار سے نہیں، ان کی سیرت و کردار سے، ان کے حسنِ اخلاق سے، ان کی پاکیزگیٔ قلب و نگاہ سے، ان کی دیانت و امانت سے، ان کی خوش معاملگی سے۔ آپ نے "فتوحات" کے باب میں دیکھا نہیں کہ ایرانیوں اور رومیوں کا جو وفد بھی ان کے پاس آیا، اس نے واپس جا کر یہی رپورٹ دی کہ یہ لوگ جس حسنِ سیرت اور پاکیزگیٔ کردار کے حامل ہیں، اس کے پیشِ نظر دنیا کی کوئی قوم بھی ان کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔ اس لئے ہمیں ان سے صلح کر لینی چاہیئے۔ پاکیزگیٔ کردار کے علاوہ حضرت عمرؓ جس فوجی افسر کا انتخاب کرتے، یہ دیکھ لیتے کہ اسے دین کا علم اور تفقہ حاصل ہے۔ چنانچہ آپ نے دیکھا ہے کہ ان فوجیوں کے جو وفد ایرانی اور رومی درباروں میں پہنچے، انہوں نے وہاں اسلام کی خصوصیات اور اس کی انقلاب آفریں تعلیم کے اصول و مبانی کس حسن بلاغت سے پیش کئے تھے۔

قرآنِ کریم کی نشر و اشاعت

اُس زمانے میں، اشاعتِ اسلام کا عملی مفہوم قرآنِ کریم کی تعلیم و تعلّم، درس و تدریس اور نشر و اشاعت تھا۔ حضرت عمرؓ کو قرآنِ مجید کے ساتھ جس قدر والہانہ شیفتگی تھی، اسے ہم "حَسْبُنَا کِتَابُ اللّٰہِ" کے باب (چہارم) میں دیکھ چکے ہیں۔ اپنے عہدِ خلافت میں انہوں نے قرآن کریم کی تعلیم کا عام انتظام کیا۔ مفتوحہ علاقوں میں ہر جگہ قرآنی درس کے حلقے قائم کئے۔ مدینہ منورہ میں جن صحابہؓ کو قرآنی مفاہیم پر زیادہ عبور تھا انہیں مفتوحہ علاقوں میں بھیجا جاتا تاکہ وہ وہاں کی آبادی کو قرآنی تعلیم سے آشنا کرائیں۔ ہم دیکھ چکے ہیں کہ اعراب (بدو)، اسلام کی سیاسی سیادت قبول کر چکے تھے لیکن اسلامی تعلیم سے آشنا نہیں تھے۔ ان کے لئے قرآن کی تعلیم جبری قرار

دی گئی۔ مکاتب میں، قرآن کی تعلیم کے علاوہ، کتابت بھی سکھائی جاتی تھی تاکہ ملک میں (کم از کم) نوشت و خواند عام ہو جائے۔ اس زمانے میں چونکہ تعلیم عام نہیں تھی اس لئے حفاظتِ قرآن مجید کا بہترین طریقہ حفظِ قرآن تھا۔ بنابریں، عہدِ فاروقی میں بھی حفاظ کی خاص طور پر حوصلہ افزائی کی جاتی تھی۔ عام حفاظ کے علاوہ، وہ سورتیں جن میں بیشتر قرآنی احکام ہیں، ان کا حفظ کرنا ہر ایک کے لئے لازمی قرار دیا گیا۔ حفاظ کے علاوہ قرآن کریم کے مصدقہ نسخے ساری مملکت میں عام کئے گئے۔ امام ابن حزم کے بیان کے مطابق، عہدِ فاروقیؓ میں مملکت میں قرآنِ کریم کے کم و بیش ایک لاکھ نسخے پھیلے ہوئے تھے۔ جہاں تک فقہ، قرآنی کا تعلق ہے، اس کی تعلیم امیرالمومنین اپنے خطبات میں خود دیتے تھے اور اس کے بعد انہیں تحریری طور پر مملکت کے مختلف مرکزی مقامات میں بھیجا جاتا تھا وہاں کے فقہاء معاملات کے فیصلوں میں ان سے مدد لیتے اور راہ نمائی حاصل کرتے تھے۔ واضح رہے کہ اس زمانے میں ہر شخص مسائل کی تعلیم دینے کا مجاز نہیں تھا۔ یہ سب حکومت کے زیرِ اہتمام ہوتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ نہ

ہر شخص مجاز نہیں تھا

اس زمانے میں مسلمانوں میں فرقے پیدا ہوئے تھے، نہ ان میں باہمی سر پھٹول ہوتی تھی۔ تفرقات و فسادات تو مذہبی پیشوائیت کے پیدا کردہ ہوتے تھے۔ اسلامی حکومت میں مذہبی پیشواؤں کا وجود ہی نہیں ہوتا۔

متفرق تدابیر میں حضرت عمرؓ کا سب سے نمایاں کارنامہ سنِ ہجری کی تعیین و ترویج ہے۔ ہوا یوں کہ ایک دفعہ آپ کے سامنے ایک اہم دستاویز آئی جس پر صرف "شعبان" لکھا ہوا تھا، سن کوئی نہیں تھا۔ اس سے یہ متعین کرنے میں بڑی دشواری پیش آئی کہ اس دستاویز کا تعلق کس سال سے ہے۔ اس پر حضرت عمرؓ

سنِ ہجری کا تعیّن

نے سن متعین کرنے کی تجویز پیش کی۔ باہمی مشاورت سے طے پایا کہ ہمیں اپنے سن کا آغاز نبیء اکرمؐ کی ہجرت سے کرنا چاہیئے کیونکہ وہ دین کی تاریخ میں عظیم انقلابی واقعہ ہے۔ ہجرت، ربیع الاوّل کے مہینے میں ہوئی تھی لیکن چونکہ عرب نیا سال محرم سے شروع کیا کرتے تھے۔ اس لئے فیصلہ یہ ہوا کہ تاریخ ہجرت کو دو ماہ پیچھے ہٹا کر، سنِ ہجری کا آغاز اسی سال کے محرم سے کیا جائے۔ یہی سنِ ہجری آج تک رائج چلا آ رہا ہے۔ عرب میں مروجہ دستور کے مطابق حساب قمری مہینوں کا رکھا گیا۔ واضح رہے کہ قرآنِ کریم کی رُو سے حساب قمری بھی رکھا جا سکتا ہے اور شمسی بھی۔ سورۂ انعام میں ہے۔ وَالشَّمْسَ وَالْقَمَرَ حُسْبَانًا۔ (۶/۹۷) (نیز ۱۰/۵؛ ۱۷/۱۲) "سورج اور چاند دونوں حساب کے لئے بنائے گئے ہیں۔"

امورِ مملکت کی سرانجام دہی کے لئے حضرت عمرؓ نے سیکرٹریٹ قائم کیا تو ہر شعبہ کے لئے الگ الگ

سیکرٹریٹ کا کاروبار

دفاتر اور ہر دفتر میں مختلف امور سے متعلق الگ الگ رجسٹر تیار کروائے۔ مملکت کا تمام کاروبار تحریری ہوتا تھا اور اہم واقعات و حوادث اور اعداد و شمار کا ریکارڈ رکھا جاتا تھا۔ دوسری مملکتوں کے ساتھ جس قدر معاہدات کئے جاتے تھے اور مفتوحہ علاقوں کے ذمیوں کو جس قدر ضمانتیں دی جاتی تھیں، ان سے متعلق دستاویزات امیرالمومنین کی اپنی حفاظت میں رہتی تھیں۔

یہ تھا امورِ مملکت سے متعلق طریقِ کار۔ اس مقام پر ایک نہایت اہم بات سامنے آتی ہے۔ اسلامی مملکت رسول اللہؐ کے زمانے میں قائم ہوئی۔ عہدِ صدیقیؓ میں اس میں وسعت ہوئی۔ حضرت عمرؓ کے دورِ خلافت میں اس کی وسعتیں قریب ساڑھے بائیس لاکھ مربع میل پر پھیل گئیں۔ اس تمام اثنار میں بلکہ خلافتِ عثمانیؓ میں بھی مدینہ، اس مملکت کا دارالخلافہ رہا۔ عہدِ فاروقیؓ میں کاروبارِ مملکت کے متعلق دفاتر بھی قائم ہو گئے، ان میں فائلیں بھی کھل گئیں، دستاویزات محفوظ رکھی گئیں، خط و کتابت کا ریکارڈ رکھا گیا، اعداد و شمار کے رجسٹر مرتب کئے گئے۔

لیکن یہ چیز انتہائی حیرت کا موجب نہیں کہ اُس دَور کا ایک پرزہ کاغذ بھی کہیں موجود نہیں۔ مدینہ منوّرہ اس

یہ ریکارڈ کہاں چلا گیا

چودہ سو سال کے عرصہ میں، ہر بلائے ارضی و سماوی سے محفوظ رہا، نہ اس میں کوئی سیلاب آیا نہ زلزلہ، نہ کوئی ایسی بڑی آگ لگی جس سے شہر تباہ ہو گیا ہو، نہ کسی قوم نے اس پر یورش کی کہ اس نے وہ سارا ریکارڈ ضائع کر دیا ہو۔ اس تمام عرصہ میں یہ بلدِ طیّب مسلمانوں ہی کے قبضے میں رہا اور اس کا تقدّس و احترام ہر مسلمان کے دل میں جاگزیں۔ اس کے بعد کیا یہ بات کسی کی سمجھ میں بھی آ سکتی ہے کہ اس تمام ریکارڈ کو بالآخر ہوا کیا۔ وہ گیا کہاں! اُسے کون لے گیا۔ کس نے اُسے تلف کر دیا اور تلف بھی اس طرح کیا کہ اس کا نام و نشان تک کہیں باقی نہ رہا! مورّخین نے اپنی کتابوں میں جو اس زمانے کی بعض دستاویزات کو نقل کیا ہے تو انہوں نے کہیں یہ نہیں لکھا کہ انہوں نے انہیں کہاں دیکھا تھا۔ پھر انہیں کیا ہوا۔ وہ کہاں چلی گئیں۔ ہماری تاریخ میں اس اوریجنل (ORIGINAL) ریکارڈ کا کہیں پتہ نشان نہیں ملتا۔ نہ ہی ان کی نقول کے متعلق کسی نے یہ بتایا ہے کہ ان کے مصدّقہ ہونے کی سند کیا ہے؟ ہر روایت زبانی ہے اور درج ہے ان کتابوں میں جو عہدِ رسالت مآبؐ اور خلافتِ راشدہ کے دو تین سو

سال بعد مدون ہوئیں۔ ہمارے ہاں عام طور پر دو ایک مکتوباتِ گرامیؐ کے عکس شائع ہوتے رہتے ہیں، جن کے متعلق کہا جاتا ہے کہ حضورؐ نے وہ کسریٰ و قیصر (یا مقوقس) کو بھیجے تھے۔ ان مکتوبات کا احترام اپنی جگہ پر، لیکن جہاں تک ہماری معلومات ہماری راہ نمائی کرتی ہیں، ان کے متعلق بھی کسی نے وثوق سے نہیں بتایا کہ ان کی اصل (ORIGINAL) کہاں ہے اور ان کے حصول کا ذریعہ کیا؟ جہاں تک جعلی دستاویزات وضع ہونے کا تعلق ہے، اس کا اندازہ ایک واقعہ سے لگایئے۔

اُس دور کی جعلی دستاویزات

امام ابن فرحون کی کتاب الدیباج المذھب کے حاشیہ میں لکھا ہے کہ یہودیوں نے ایک بار مسلمانوں کے رئیس کے سامنے رسول اللہ کی طرف سے ایک عہدنامہ پیش کیا جس میں تحریر تھا کہ خیبر کے یہودیوں سے جزیہ نہ لیا جائے۔ اس کی بنیاد پر ان کا مطالبہ تھا کہ ان سے جزیہ ساقط کیا جائے۔ لوگ اس معاہدہ سے حیرت زدہ ہو گئے۔ اُس زمانے میں امام ابوبکر خطیب بغدادی موجود تھے۔ ان کے سامنے اس معاہدہ کو پیش کیا گیا تو انہوں نے کہا کہ یہ جعلی ہے۔ اس لئے کہ اس پر تاریخ ۷ھ درج ہے اور اس پر گواہوں میں امیر معاویہؓ کا نام ہے جو ۸ھ میں فتح مکہ کے بعد مسلمان ہوئے تھے اور واقعۂ خیبر میں شریک نہیں تھے۔ علاوہ ازیں، اس پر سعد بن معاذ رئیسِ انصار کے بھی دستخط ہیں جو فتح خیبر سے پہلے واقعۂ بنی قریظہ میں وفات پا چکے تھے۔

لہٰذا، یہودیوں اور عیسائیوں کی طرف سے اس قسم کی جعلی دستاویزات وضع کرنا کچھ بعید نہیں۔ علامہ اسلم جیراجپوریؒ کے الفاظ میں "جو قوم اپنی آسمانی کتابوں میں تحریف کر سکتی ہے اس کے لئے اس قسم کے پروانے بنا لینے کچھ بھی مشکل نہیں[1]۔"

ہم یہ کہہ رہے تھے کہ صدرِ اوّل میں مسلمانوں کی اتنی وسیع و عریض مملکت قائم رہی لیکن (دیگر مقامات تو ایک طرف) خود اس کے دارالخلافہ (مدینہ) میں بھی اس کے ریکارڈ میں سے کاغذ کا ایک پُرزہ تک نہیں ملتا۔ کیا اس سے لامحالہ ذہن اس طرف منتقل نہیں ہوتا کہ یہ کوئی بہت بڑی سازش تھی جس کی رُو سے اُس دورِ ہمایوں کے ریکارڈ کی ایک چِٹ تک بھی باقی نہ رہنے دی گئی تاکہ کسی کو معلوم نہ ہو سکے کہ صحیح اسلامی مملکت کا نقشہ اور اندازِ حکومت کس قسم کا ہوتا ہے ___ نہ یہ معلوم ہو سکے اور اس لئے نہ ہی کوئی دورِ ملوکیت کے کسی اقدام کے خلاف یہ

---

[1] نوادرات علامہ اسلم جیراجپوری صفحہ ۲۸، ایڈیشن دوم (۱۹۸۹ء) مطبوعہ طلوعِ اسلام ٹرسٹ، لاہور۔

کہہ کر اعتراض کرسکے کہ یہ اس حکومت کے انداز کے خلاف ہے جو رسالتمآبؐ اور خلافتِ راشدہ میں قائم تھی۔

اُف کس قدر مہیب تھی یہ سازش؛

ہمارے اوریجنل مآخذ کی تو کیفیت یہ اور تاریخ کا یہ عالم کہ اس میں وہ گفتگو بھی لفظاً لفظاً درج ہوتی ہے جو میدانِ جنگ میں ان دو سپاہیوں کے درمیان ہوئی تھی جب وہ آپس میں گتھم گتھا ہو رہے تھے اور جن میں سے کوئی بھی زندہ نہیں رہا تھا۔

اور یہ ہے وہ تاریخ جس کی بنیادوں پر ہمارا "مروّجہ اسلام" منضبط ہوا ہے۔ یاد رکھئے، ہمارے پاس

محفوظ صرف قرآن مجید ہے

محفوظ صرف خدا کی کتاب (قرآنِ مجید) ہے۔ جس کا ایک ایک لفظ بلاشک و شبہ وہی ہے جسے خدا نے اپنے آخری رسولؐ پر وحی کیا اور جسے رسول اللہؐ نے امت کو دیا۔[1] یہی ہمارا اوریجنل ریکارڈ ہے اور یہی دین میں سند اور حجّت۔ فقہ ہو یا حدیث، تاریخ ہو یا تفسیر، جو کچھ ان میں، قرآنِ مجید کے مطابق ہے، اسے صحیح باور کیا جاسکتا ہے، جو اس کے خلاف ہے وہ بلا تامل مسترد کردینے کے قابل۔ جب حضرت عمرؓ نے فرمایا تھا کہ

حَسْبُنَا كِتَابُ اللهِ

تو اس سے یہی مقصود تھا۔

نظامِ عدل

اگر یہ پوچھا جائے کہ انسانی ہیئتِ اجتماعیہ کے لئے حکومت کی ضرورت کیوں ہے تو اس کا ایک ہی جواب ہو سکتا ہے اور وہ یہ کہ حکومت کی ضرورت عدل کے لئے ہے۔ یہی اس کی وجۂ جواز ہے، یہی اس کے قیام کی اساس و بنیاد۔ جس مملکت میں عدل نہیں وہ انسانوں کی دنیا نہیں، درندوں کا مسکن ہے جہاں "جس کی لاٹھی اس کی بھینس" نہجِ زندگی ہے۔ ظاہر ہے کہ جب ایک عام حکومت میں عدل کو یہ اہمیّت حاصل ہے تو اسلامی حکومت میں، جو خدا کے نام پر، خدا کے قوانین و احکام کے نفاذ کے لئے قائم کی گئی ہو، عدل کا جو مقام ہوگا، وہ

---

[1] تفصیل کے لئے دیکھئے میری کتاب "مذاہبِ عالم کی آسمانی کتابیں" آخری باب

واضح ہے۔ چنانچہ قرآنِ کریم میں عدل و انصاف کے لئے بڑے تاکیدی احکام آئے ہیں۔ ایک مختصر لیکن جامع آیت میں کہا گیا ہے۔ اِنَّ اللّٰهَ يَأْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْاِحْسَانِ..... (۱۶/۹۰) اللہ عدل اور احسان کا حکم دیتا ہے۔ (احسان کا صحیح مفہوم، معاشی نظام سے متعلق باب میں بتایا جائے گا) دوسری جگہ ہے۔ قُلْ اَمَرَ رَبِّيْ بِالْقِسْطِ۔ (۷/۲۹) "اے رسولؐ! ان سے کہہ دو کہ میرے رب نے انصاف کرنے کا حکم دیا ہے۔" سورۃ شوریٰ میں ہے۔ وَاُمِرْتُ لِاَعْدِلَ بَيْنَكُمْ۔ (۴۲/۱۵) "مجھے حکم دیا گیا ہے کہ میں تم میں عدل کروں۔" عدل کا مقام کون سا ہوتا ہے، اس کے متعلق فرمایا۔ وَاِذَا حَكَمْتُمْ بَيْنَ النَّاسِ اَنْ تَحْكُمُوْا بِالْعَدْلِ (۴/۵۸ نیز ۵/۴۲) "خدا نے یہ حکم دیا ہے کہ جب تم لوگوں کے متنازعہ فیہ معاملات کا فیصلہ کرو تو ہمیشہ عدل کے مطابق فیصلہ کرو۔" واضح رہے کہ حُكْمٌ کے معنی فیصلہ کرنا ہیں اور یہیں سے "حکومت" کا لفظ بنا ہے۔ لہٰذا، قرآنی نقطۂ نگاہ سے 'حکومت' سے مراد ہے وہ ادارہ جو عدل کے مطابق فیصلے کرے۔

قرآنِ کریم میں عدل کی تاکید

ظاہر ہے کہ متنازعہ فیہ معاملات کا فیصلہ کرنے کے لئے، عدالت کے علاوہ، مدعی، مدعا علیہ اور گواہ بھی ضروری ہوں گے۔ اس باب میں قرآنِ کریم نے جو جامع احکام دیئے ہیں، اُن سے نظامِ عدل کا پورا پورا نقشہ ذہن کے سامنے آجاتا ہے۔ فرمایا۔

> اے جماعتِ مومنین! تم قیامِ عدل کے ذمہ دار بن کر رہو۔ کسی معاملہ میں شہادت دینی ہو تو نہ مدعی کی طرف سے گواہ بن کر آؤ، نہ مدعا علیہ کی طرف سے، تم "خدا کی طرف سے" گواہی دینے کے لئے آؤ۔ بات سچی کہو خواہ وہ تمہارے اپنے خلاف ہی کیوں نہ جائے، تمہارے اپنے خلاف یا تمہارے والدین کے خلاف، یا تمہارے رشتے داروں کے خلاف۔ یہ مت دیکھو کہ فریقین میں کون غریب ہے اور کون امیر۔ تم تو خدا کی طرف سے گواہ بن کر آئے ہو۔ تم ان کی پوزیشن کا خیال مت کرو۔ خدا کا قانون خود دیکھ لے گا کہ فیصلہ کس کے حق میں جانا چاہیئے۔ بڑے محتاط رہو کہ کہیں تمہارے جذبات، حق گوئی کے راستے میں حائل نہ ہو جائیں۔ جب بات کرو، صاف صاف کرو، واضح، دو ٹوک بات کرو۔ نہ توڑ مروڑ کر بات کرو اور نہ ہی سچی گواہی دینے سے اعراض برتو۔ یاد رکھو! تم جو کچھ بھی کرتے ہو، اللہ اس سے باخبر ہوتا ہے۔ (۴/۱۳۵)

یہ تو پھر بھی اپنوں کی بات تھی۔ قرآنِ کریم اس باب میں ایک قدم اور آگے جاتا ہے اور کہتا ہے کہ

وَلَا یَجْرِمَنَّکُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ عَلٰٓی اَلَّا تَعْدِلُوْا ۔ اِعْدِلُوْا ھُوَ اَقْرَبُ لِلتَّقْوٰی۔ (۵/۸)

کسی قوم کی دشمنی تمہیں اس پر آمادہ نہ کر دے کہ تم ان سے عدل نہ کرو۔ ہر ایک سے عدل کرو۔ ہر حال میں عدل کرو۔ عدل تقویٰ سے بہت قریب ہے۔

لیکن عدل کے معاملہ میں ایک بنیادی نکتہ سمجھنے کے قابل ہے۔ دنیا کے عام معیار کے مطابق، عدل سے مراد ہے مروّج

عدل سے مراد

قوانین کے مطابق فیصلہ کرنا۔ یعنی اگر کسی معاملہ کا فیصلہ رائج الوقت قانون کے مطابق ہو، تو اسے مبنی بر عدل کہا جائے گا۔ اگر فیصلہ قانون کے خلاف ہو تو اسے بے انصافی یا دھاندلی سے تعبیر کیا جائے گا۔ یہ ٹھیک ہے کہ قانون کے مطابق فیصلے ہی کو عدل کہا جانا چاہیئے لیکن قرآنِ کریم یہ کہتا ہے کہ اگر خود وہ قانون ہی ظلم پر مبنی ہو تو اس کے مطابق فیصلہ، مبنی پر عدل کس طرح کہلا سکے گا؟ لہٰذا، قوانین بھی عدل پر مبنی ہونے چاہئیں لیکن انسانوں کے وضع کردہ قوانین کے متعلق تو اس امر کی ضمانت کبھی نہیں دی جا سکتی کہ ان میں، شعوری یا غیر شعوری طور پر، واضعینِ قوانین کے جذبات کی آمیزش شامل نہیں ہوئی۔ انسان مشین نہیں کہ اس میں جو کچھ ڈالا جائے وہ اپنے رُجحانات کی آمیزش کے بغیر اسے اسی طرح آگے گذار دے۔ وہ اپنے سینے میں دھڑکتا ہوا دل رکھتا ہے۔ جو بات اس دل میں سے ہو کر گزرے گی اس میں، اس کی رنگینی کے شائبہ کی آمیزش کا امکان ہو گا۔ قرآن کہتا ہے کہ جذبات سے بلند و بالا صرف خدا کی ذات ہے اور اسی طرف سے دیئے گئے قوانین کے متعلق ہی حتم و یقین سے کہا جا سکتا ہے کہ ان میں قانون وضع کرنے والے کے جذبات کی

قرآنی معیارِ عدل

آمیزش نہیں۔ اس نے وحی کی خصوصیت یہ بتائی ہے کہ وَمَا یَنْطِقُ عَنِ الْھَوٰی اِنْ ھُوَ اِلَّا وَحْیٌ یُّوْحٰی۔ (۵۳/۳-۴) یہ (قرآن) وحیِ خداوندی ہے۔ اس میں صاحبِ وحی کے اپنے خیالات و جذبات کی آمیزش قطعاً نہیں۔

لہٰذا، قرآنِ کریم کی رُو سے عدل مراد ہو گا وہ فیصلہ جو وحی پر مبنی قوانین و اقدار کے مطابق کیا جائے۔ اس طرح فیصلے کرنے والوں کے متعلق کہا کہ وَبِہٖ یَعْدِلُوْنَ (۷/۱۸۱) "یہ وہ لوگ ہیں جو الحق (وحیٔ خداوندی) کے مطابق عدل کرتے ہیں"؟ حضرت عمرؓ نے قرآنِ کریم کی عام نشر و اشاعت کے لئے جو اس قدر اہتمام کیا تھا تو اس سے بنیادی مقصد یہی تھا کہ معاملات کے فیصلے اس کی راہ نمائی میں کئے جائیں۔

عدل کی ضرورت زندگی کے ہر گوشے میں پڑتی ہے لیکن اس وقت ہم اس کے صرف اس گوشے سے بحث کریں

گے جس کا تعلق "قانونی عدل" سے ہے۔ اسی کو عام طور پر عدالتی فیصلے کہا جاتا ہے۔ حضرت عمرؓ نے مملکت کے گوشے گوشے میں عدالتیں قائم کیں جن میں مقرر کردہ ججوں کو (جنہیں قاضی ـــ یعنی فیصلہ کرنے والے کہا جاتا تھا) وہ وقتاً فوقتاً ہدایات بھیجتے رہتے تھے۔ یہ ہدایات صرف اس بنا پر نہیں بھیجی جاتی تھیں کہ مملکت کی آخری اتھارٹی' امیرالمومنین تھے۔ اس کی وجہ یہ بھی تھی کہ امیرالمومنین (حضرت عمرؓ) فقہ قرآنی کے جیّد عالم تھے اور اس باب میں ان کی نگاہ اس قدر وسیع اور عمیق تھی کہ کوئی اور ان کا مقابلہ نہیں کر سکتا تھا۔ حضرت ابن مسعودؓ (جو خود قرآن کے بہت بڑے عالم تھے) کا قول ہے کہ "اگر عمرؓ کا علم ایک پلڑے میں رکھ دیا جائے اور تمام عرب قبائل کا علم دوسرے پلڑے میں، تو بھی عمرؓ کے علم کا پلڑا جھکتا رہے گا۔" عہد جاہلیت میں ان کے ذوقِ علم و شوقِ تجسّس کے متعلق ہم پہلے دیکھ چکے ہیں۔ اسلام لانے کے بعد' انہوں نے انتہائی شغف و انہماک سے' ذاتِ رسالتمآبؐ سے تعلیم و تربیّت حاصل کی۔ عہدِ صدّیقی میں انہیں مدینہ کا مجسٹریٹ مقرر کیا گیا۔ خود اپنے دورِ خلافت کے ابتدائی ایام میں بھی قضاء کے فرائض وہ خود ہی سرانجام دیتے تھے۔ بنا بریں' امورِ قضا کے متعلق ان کی ہدایات ان کے وسیع علم' عمیق نگاہ' اور ذاتی تجربہ پر مبنی ہوتی تھیں۔ ان میں کچھ ہدایات جو تاریخ میں محفوظ ہیں' ان مکتوبات میں مندرج ہیں جو انہوں نے نامور قضاۃ اور امراء کی طرف بھیجے تھے۔ ان میں حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ اور ابو عبیدہ بن جراحؓ کے نام مکتوبات خاص اہمیّت کے حامل ہیں۔ ان میں مندرج ہدایات کا ملخّص درجِ ذیل کیا جاتا ہے۔

قانونی عدل

حضرت عمرؓ کا علم

حضرت عمرؓ کی ہدایات

(۱) قضا' فریضۂ خداوندی اور سنّتِ رسول اللہؐ ہے۔ اس سے اس ذمّہ داری کی اہمیّت واضح ہے۔

(۲) جب آپ کے سامنے کوئی مقدمہ آئے اور آپ اس کے ہر پہلو پر غور و تحقیق کے بعد کسی نتیجہ پر پہنچ جائیں تو اس کے فیصلے میں تاخیر نہیں کرنی چاہیئے۔ فیصلہ تحریری ہونا چاہیئے۔ زبانی فیصلہ بے سند ہوتا ہے اور فیصلہ وہی فیصلہ کہلا سکتا ہے جسے نافذ کر دیا جائے۔

(۳) دورانِ سماعت' فریقین کے ساتھ ایک جیسا برتاؤ کرو۔ کسی فریق سے بات کرنے' یا عدالت میں بٹھانے یا کسی اور نہج سے' کسی قسم کا امتیاز نہ برتو تاکہ اس سے باوقار فریق کے دل میں یہ خیال نہ پیدا ہو کہ آپ اس کی وجاہت سے متاثر ہو گئے اور کمزور فریق' انصاف کی طرف سے مایوس ہو جائے۔

(۴) بارِ ثبوت مدعی کے ذمّہ ہو گا اور مدعا علیہ اگر شہادت نہ پیش کر سکے تو اس سے حلف لے لینا چاہیئے

(۵) فریقین میں مصالحت کی کوشش کرنی چاہیئے مگر ایسی مصالحت نہیں جس میں حرام کو حلال اور حلال کو حرام کا درجہ دے دیا جائے۔

(۶) اگر آپ نے آج ایک فیصلہ کیا ہے اور کل کو اپنی غلطی کا احساس ہو گیا ہے تو اس فیصلہ سے رجوع کر لینا آپ کے منصب کے منافی نہیں۔

(۷) جب کسی معاملہ میں نصِ صریح نہ ملے تو اس کے نظائر و امثال کی جستجو کرو اور ان پر غور و فکر کے بعد فیصلہ کرو کہ کونسی بات حق سے زیادہ قریب ہے۔ اس پر اعتماد کرو۔

(۸) مدعی یا مدعا علیہ میں سے جو بھی ثبوت یا گواہ پیش کرنے کے لئے مہلت مانگے، اسے مہلت دے دو۔

(۹) گواہی کے لئے ہر مسلمان ثقہ ہے بجز ان کے جنہیں کسی جرم کی پاداش میں ساقط الاعتبار قرار دے دیا گیا ہو۔

(۱۰) فیصلہ ظاہری بیانات اور شہادت پر ہو گا۔ پوشیدہ امور اور نیّتوں کا علم صرف خدا کو ہے۔

(۱۱) تمہارے دل میں اہلِ مقدمہ کی طرف سے کبھی خفگی، اکتاہٹ یا چڑ چڑا پن پیدا نہیں ہونا چاہیے۔ ہمیشہ تحمّل اور بردباری سے کام لینا چاہیئے۔

(۱۲) شبہ کی صورت میں، سزا دینے کے مقابلہ میں سزا نہ دینا بہتر ہے۔

(۱۳) غصّے کی حالت میں فیصلہ نہ کرو۔ اسے ملتوی کر دو۔

(۱۴) یاد رکھو۔ قاتل، مقتول کا وارث نہیں ہو سکتا۔

(۱۵) لوگوں کے فیصلے کرتے وقت، ہمیشہ اپنے آپ کا محاسبہ کرتے رہو۔

اس قسم کی ہدایات آپ اکثر نافذ کرتے رہتے تھے۔ ان کے علاوہ، آپ نے بعض معاملات میں جو فیصلے خود صادر فرمائے، یا کسی اور ضمن میں کوئی اور حکم نافذ کیا، ان سے بھی قانونی عدل کے سلسلہ میں راہ نمائی ملتی ہے۔ مثلاً۔

دیگر ہدایات

(۱) آپ نے حضرت سعدؓ بن ابی وقاص کو ایک دفعہ لکھا کہ تم میں سے اگر کوئی شخص کسی عجمی (غیر عرب) کو امان دے یا کسی قسم کا اشارہ کرے، یا ایسی زبان میں اس سے بات کرے جسے وہ سمجھتا نہ ہو اور وہ اسے اپنے لئے امان سمجھ لے تو اسے امان ہی تصور کر دو۔ اگر تم اس قسم

کے الجھاؤ سے بچنا چاہتے ہو تو ایسا انتظام کرو کہ دوسرے سے بات اس انداز سے کی جائے جس سے صاف صاف مطلب اس کی سمجھ میں آجائے۔

اس سے قانونی عدل کے لئے ایک اہم اصول مستنبط ہوتا ہے۔

(۲)۔ (ہم پہلے بھی لکھ چکے ہیں کہ) ایک دفعہ ایک بدّو آپ کے پاس آیا اور کہا کہ میں نے حالتِ احرام میں ایک ہرن مار دیا ہے؛ اب مجھے کیا کرنا چاہیئے۔ حضرت عبدالرحمٰنؓ بن عوف، آپ کے پاس بیٹھے تھے۔ آپ نے ان سے کہا کہ فرمایئے! اس باب میں آپ کی کیا رائے ہے۔ انہوں نے کہا کہ یہ ایک بکری فدیہ میں دے دے۔ آپ نے بدّو سے یہی کہہ دیا۔ اس پر اس بدّو نے کہا کہ آپ کس قسم کے امیرالمومنین ہیں کہ آپ کو اتنے آسان سے مسئلہ کا جواب بھی خود معلوم نہیں تھا۔ دوسرے سے پوچھنا پڑا۔ آپ نے فرمایا کہ بات یہ نہیں بلکہ یہ ہے کہ قرآن کا حکم ہے کہ ایسے معاملات میں، دو صاحبِ عدل فیصلہ کریں۔ اس لئے مجھے، اپنے ساتھ ایک اور کی رائے لینے کی ضرورت تھی۔

اس سے واضح ہے کہ قانون کی رُو سے، کسی بڑی سے بڑی شخصیت، حتیٰ کہ سربراہِ مملکت، کی بھی رائے، ایک ہی تصوّر اور شمار کی جائے گی۔

(۳) ایک دفعہ ایک شخص سے آپ نے کہا کہ اپنی بات کی تائید کے لئے کسی ایسے آدمی کو لاؤ جو اعتماد کے قابل ہو۔ اس نے ایک آدمی کا نام لیا تو آپ نے اس سے پوچھا کہ

وہ قابلِ اعتماد ہے جو معاملات میں کھرا ہے

کیا تم نے کبھی اس کے ساتھ سفر کیا ہے؟

اس نے کہا۔ نہیں۔

پھر پوچھا:۔ کیا تم کبھی اس کے ہمسایہ رہے ہو؟

اس نے کہا۔ نہیں۔

آپ نے پھر پوچھا کہ:۔

کیا اس کے ساتھ تمہارا کبھی کوئی معاملہ پڑا ہے؟

جب اس نے اس پر بھی کہا کہ نہیں، تو آپ نے فرمایا کہ:۔

پھر تم اس کے متعلّق کچھ بھی نہیں جانتے۔ معلوم ہوتا ہے کہ تم نے اسے مسجد میں سر جھکاتے، سر اٹھاتے دیکھ

لیا ہوگا اور اس سے سمجھ لیا کہ وہ قابلِ اعتماد ہے۔

غور کیجئے کہ کسی کے ثقہ اور قابلِ اعتماد ہونے کے لئے آپ نے کیا معیار قرار دیا ہے:

(۴) ایک شخص کو دیکھا کہ حرم کا درخت کاٹ کر اونٹ کو کھلا رہا ہے۔ یہ جرم تھا۔ آپ نے اسے گرفتار کر لیا اور پوچھا کہ اس نے ایسا کیوں کیا ہے۔ اس نے کہا کہ میں دُور کا مسافر ہوں۔ توشہ اور نفقہ میرے پاس نہیں۔ اونٹ میرا بہت لاغر اور بھوکا تھا۔ مجھے خطرہ تھا کہ اگر میں نے اسے کچھ کھلایا نہیں تو یہ یہیں ڈھیر ہو کر رہ جائے گا اور میں اپنی منزل تک نہیں پہنچ سکوں گا۔ اس لئے جو کچھ میرے سامنے آیا، میں نے اسے کھلا دیا۔ آپ نے یہ سن کر فرمایا کہ اس کا عُذر معقول ہے' اسے آٹے سے لدا ہوا ایک فربہ اونٹ دے دو۔

معقول عُذر قابلِ قبول

(۵) زنا بالجبر کے مقدمہ میں آپ نے یہ کہہ کر عورت کو سزا نہیں دی کہ مجبور اپنے کسی فعل کے لئے قابلِ مؤاخذہ قرار نہیں پا سکتا۔

مجبور کو سزا نہیں

(۶) اسی سلسلہ میں حاطب بن ابی بلتعہ کے غلاموں کا واقعہ بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ انہوں نے ایک شخص کا اونٹ چرا کر، ذبح کر کے کھا لیا۔ ان کے خلاف چوری کا جرم ثابت ہو گیا۔ آپ نے حد (سزا) نافذ کرنے سے پہلے ان سے پوچھا کہ تم نے ایسا کیوں کیا؟ انہوں نے کہا کہ حاطب ہم سے کام تو سخت لیتا ہے لیکن کھانے کو اس قدر کم دیتا ہے کہ اس سے ہمارا پیٹ نہیں بھرتا۔ ہم نے انتہائی مجبوری کے عالم میں ایسا کیا ہے۔

بھوکوں کی چوری

یہ سُن کر آپ نے غلاموں کو تو معاف کر دیا اور حاطب کو بلا کر کہا کہ چاہیئے تو یہ کہ چوری کے جرم کی سزا میں تمہارا ہاتھ کٹوا دیا جائے کہ اس جُرم کے مرتکب تمہارے غلام نہیں' تم ہو جس نے انہیں اس حالت تک پہنچا دیا کہ وہ چوری کرنے پر مجبور ہو گئے لیکن میں تم سے نرمی برتتا ہوں۔ اس دفعہ تو اتنی سزا ہی کافی سمجھتا ہوں کہ تم اونٹ کی قیمت اس کے مالک کو ادا کر دو۔ اگر آئندہ تمہارے غلاموں کی یہی حالت ہو گئی تو پھر تمہارے لئے کسی سخت سزا کا سوچا جائے گا۔

اس سے ایک عظیم معاشی اصول مستنبط ہوتا ہے جس کی وضاحت 'معاشی نظام' سے متعلق باب میں کی جائے گی۔

(۷) ہم نے دیکھا ہے کہ حضرت عمرؓ نے اپنے قضاۃ کو ہدایت کی تھی کہ مقدمہ کا فیصلہ کرتے وقت فریقین میں

سے کسی کی پوزیشن کا قطعاً خیال نہ کیا جائے۔ فیصلہ، عدل کے تقاضے کے مطابق کیا جائے۔ اس ضمن میں خود حضرت عمرؓ کا ایک فیصلہ ایسا ہے جو انسانیت کی تاریخ میں سنہری حروف میں لکھے جانے کے قابل ہے۔

"فتوحات" سے متعلق باب میں ہم دیکھ چکے ہیں کہ عرب کی شمالی سرحدوں پر قدیم عربی قبائل آباد تھے۔ جنہوں نے عیسائی مذہب اختیار کر رکھا تھا۔ ان قبائل کے سردار، ہرقل کی طرف سے اپنے اپنے علاقہ کے حاکم تھے۔ وہ وہاں کے بادشاہ ہی متصور ہوتے تھے۔ انہیں غسانی کہا جاتا تھا۔ ان میں سے ایک قبیلہ کا سردار، جبلّہ بن ایہم، مع اپنے قبیلہ کے پانچسو افراد کے مسلمان ہو گیا اور مدینہ آگیا۔

جبلّہ بن ایھم کا واقعہ

وہاں اسے بڑی عزت و تکریم کے ساتھ رکھا گیا۔ حج کے موقعہ پر وہ حضرت عمرؓ کی معیت میں مکّہ آیا۔ وہ طواف کر رہا تھا کہ اس کے تہبند کا پلّو ایک بدّو کے پاؤں تلے آگیا۔ اس نے پیچھے مڑ کر اس بدّو کی ناک پر ایک مُکّہ دے مارا۔ بدّو نے حضرت عمرؓ سے شکایت کی اور جبلہ نے اس کا اقرار کیا۔ اس پر آپ نے اس سے کہا کہ تم اس بدّو کو منا کر مصالحت کر لو، ورنہ تمہیں اس جرم کی سزا دی جائے گی۔ اس نے برافروختہ ہو کر کہا کہ یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ میں بادشاہ ہوں اور وہ معمولی بدّو ہے۔ میں اس سے کیسے معافی مانگ سکتا ہوں۔ حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ "بادشاہ اور معمولی بدّو میں فرق، تمہارے اسلام لانے سے پہلے کی بات ہے۔ اسلام میں ان دونوں میں کوئی فرق نہیں ہو سکتا۔ یہاں سب برابر ہوتے ہیں۔" اس نے کہا کہ "امیر المومنین! میں تو سمجھا تھا کہ اسلام لانے کے بعد مجھے جاہلیّت کے مقابلہ میں زیادہ عزت دی جائے گی، لیکن یہاں معاملہ اس کے بالکل برعکس ہے۔" آپ نے فرمایا کہ "اسلام میں عزت کا معیار تقویٰ ہے اور قانون کی نگاہ میں سب برابر ہیں۔ تم یا تو اس بدّو کو راضی کر دو، ورنہ سزا کے لئے تیار ہو جاؤ۔" اس نے کہا کہ مجھے ایک رات کی مہلت دی جائے۔ اسے مہلت دیدی گئی۔

مدینہ میں اس واقعہ کا خاصا چرچا ہو گیا۔ حضرت عمرؓ کے گھر کے سامنے بہت سے لوگ اکٹھے ہو گئے۔ ان میں سے بعض نے آپ سے کہا کہ آپ اس معاملہ میں اس قدر متشدّد نہ ہوں۔ ذرا نرمی برتیں۔ آپ نے انہیں جواب دیا کہ اگر کسی شخص کی وجاہت کے اثر سے قانون کا پلڑا اس کے حق میں جھک جائے تو پھر خدا کی بادشاہت اور قیصر و کسریٰ کی ملوکیت میں فرق کیا ہوا! چنانچہ آپ ذرا نہ جُھکے اور جبلہ دوسری صبح، اپنے ساتھیوں سمیت پھر ہرقل کے پاس چلا گیا اور عیسائی ہو گیا۔

اس طرح اسلام لانے والے، اسی طرح واپس چلے جایا کرتے ہیں! اس سے اسلام کا رُخِ روشن اور زیادہ

تابناک ہو جاتا ہے۔

جبلہ کے متعلق، علامہ ابن عبدربہ نے اپنی (محاضرات کی مشہور) کتاب 'عقد الفرید' میں ایک ایسا واقعہ لکھا ہے جس کا ذکر کئے بغیر آگے بڑھنے کو جی نہیں چاہتا۔ جبلہ کے ہرقل کے پاس چلے جانے کے کچھ عرصہ بعد حضرت عمرؓ کا ایک قاصد 'دعوتِ اسلام لے کر ہرقل کے دربار میں گیا۔ اس نے کہا کہ تم آئے ہو تو جبلہ سے بھی ملتے جاؤ۔ وہ جبلہ کے پاس گیا تو وہاں بڑے شاہانہ ٹھاٹھ باٹھ دیکھے۔ جبلہ نے پہلے عامۃ المسلمین کی خیریت دریافت کی اور پھر حضرت عمرؓ کی بابت دریافت کیا۔ ان کی خیریت کی خبر سے اس کے چہرے پر ناگواری کے اثرات نمودار ہوئے۔ اس دوران میں قاصد' اس کے سنہری تخت سے اُٹھ کر دوسری جگہ جا بیٹھا۔ جبلہ نے کہا کہ میں نے تمہاری عزت افزائی کی اور سونے کے تخت پر بٹھایا اور تم اس سے دُور ہٹ گئے۔ قاصد نے کہا کہ ہمیں رسول اللہ نے سونے کی بنی ہوئی چیزوں کے استعمال سے منع فرمایا ہے۔ اس پر جبلہ نے حضورؐ پر درود و سلام بھیجا۔ قاصد کا بیان ہے کہ جب میں نے اسے حضورؐ پر سلام بھیجتے سنا، تو میرے دل میں اس کے دوبارہ اسلام لانے کی حرص پیدا ہوئی۔ چنانچہ میں نے اس سے کہا کہ تم دوبارہ اسلام کیوں نہیں لے آتے؟ اس نے کہا کہ کیا میں اپنی ان حرکات کے بعد' دوبارہ حریم اسلام میں داخل ہو سکتا ہوں؟ میں نے جواب دیا کہ کیوں نہیں ہو سکتے۔ اس پر اس نے کہا کہ اگر تم اس کی ضمانت دیتے ہو کہ حضرت عمرؓ اپنی بیٹی کا رشتہ مجھے دے دیں گے اور اپنے بعد مجھے مسلمانوں کا حکمران بنا دیں گے تو میں دوبارہ اسلام لے آؤں گا۔ قاصد نے کہا کہ حضرت عمرؓ کی بیٹی سے تمہارے نکاح تک کی تو میں ضمانت دے سکتا ہوں لیکن خلافت کے بارے میں ایسا نہیں کر سکتا۔ وہاں سے واپسی پر قاصد نے حضرت عمرؓ سے جبلہ کے اسلام لانے کی شرائط کا ذکر کیا اور کہا کہ میں نے اسے آپ کی بیٹی سے نکاح کی تو ضمانت دی تھی لیکن خلافت کی ضمانت نہیں دی۔ اس پر آپ نے فرمایا کہ تم اُس کی بھی ضمانت دے دی ہوتی۔ اگر وہ دوبارہ اسلام لے آتا تو پھر خدا کے احکام کے مطابق فیصلہ ہو جاتا۔

اس واقعہ سے (جس حد تک یہ صحیح نظر آتا ہے)' دو ایک نہایت بصیرت افروز نتائج سامنے آتے ہیں۔ سب سے پہلے یہ کہ یہ حضرات لوگوں کو اسلامی دائرہ میں لانے کے لئے کس شدت سے آرزومند رہتے تھے۔ جبلہ بڑا ذی اثر سردار تھا اور (قاصد اور حضرت عمرؓ کو) معلوم تھا کہ وہ اسلام لے آیا تو سارا قبیلہ پھر حلقہ بگوشِ اسلام ہو جائے گا۔ اس کے لئے امیر المومنین اسے اپنی بیٹی کا رشتہ تک دینے کے لئے آمادہ ہو جاتے ہیں۔

دوسرے یہ کہ ان حضرات (صحابہ کرامؓ) کا ایک دوسرے پر اعتماد کس قدر تھا کہ ایک ایلچی، حضرت عمرؓ کی طرف سے ان کی بیٹی کے رشتہ کی ضمانت دے دیتا ہے اور حضرت عمرؓ یہ نہیں کہتے کہ تمہیں اس کا کیا حق حاصل تھا۔

تیسرے یہ کہ، یہ جو ہمارے ہاں "بطور مسلّمہ" کہا جاتا ہے کہ اسلام میں مرتد کی سزا قتل ہے، تو یہ عقیدہ بعد کا وضع کردہ ہے۔ اگر اُس دَور میں مرتد کی سزا قتل ہوتی تو جبلہ قاصد سے فوراً کہتا کہ تمہارے ہاں تو مرتد کو قتل کر دیا جاتا ہے تم مجھے اسلام کی دعوت ہی نہیں بلکہ ایسی ضمانتیں کیسے دے سکتے ہو؟

جہاں تک خلافت کی ضمانت کا تعلق ہے، نظر آتا ہے کہ وقائع نگار نے اس باب میں زیادہ باریک بینی سے کام نہیں لیا۔ قاصد یا حضرت عمرؓ نے یہ کہا ہو گا کہ اسلام لے آنے کے بعد جبلہ (باقی مسلمانوں کی طرح) خلافت کا امیدوار قرار پا سکتا ہے، وہ اُسے اس کی ضمانت نہیں دے سکتے تھے کہ اسے (حضرت عمرؓ کے بعد) خلیفہ بنا دیا جائے گا۔ اس قسم کی ضمانت کوئی بھی نہیں دے سکتا تھا۔ حضرت عمرؓ نے جو فرمایا تھا کہ جب وہ مسلمان ہو جائے گا تو خلافت کا فیصلہ احکامِ خداوندی کے مطابق ہو گا تو اس سے یہی مترشح ہوتا ہے کہ انہوں نے جبلہ کو خلیفہ بنا دینے کی بات نہیں کی ہو گی۔ اسے صرف خلافت کے لئے امیدوار بننے کے حق کی ضمانت کا کہا ہو گا۔

یہ ضمنی واقعہ تھا۔ اس کے بعد ہم پھر اصل موضوع کی طرف رجوع کرتے ہیں یعنی عدلِ فاروقیؓ کی طرف۔

(۸) قانون کے سلسلہ میں یہ تصلّب و تشدّد، غیروں کے معاملہ میں ہی نہیں تھا خود اپنوں کے ساتھ بھی اسی قسم کا برتا ہوتا تھا۔ ان کے صاحبزادہ عبدالرحمٰن مصر میں تھے۔ وہاں انہوں نے اپنے ایک دوست کے ساتھ نبیذ پی لی جس سے انہیں نشہ ہو گیا۔ یہ جرم مستوجبِ سزا تھا۔ یہ دونوں حضرت عمرو بن عاصؓ کے پاس پہنچے اور ان سے کہا کہ انہیں سزا دی جائے۔ حضرت عاصؓ نے انہیں ڈانٹ ڈپٹ کر نکال دیا۔ عبدالرحمٰن نے ان سے کہا کہ اگر آپ نے ہمیں سزا نہ دی تو میں اس کی شکایت امیرالمومنین سے کروں گا۔ اس پر حضرت عمرو بن عاصؓ مجبور ہو گئے لیکن انہوں نے اتنی رعایت برتی کہ عبدالرحمٰن کو پبلک میں کوڑے لگانے اور سر مونڈ کر تشہیر کرنے کے بجائے، اپنے مکان کے اندر سزا دے دی اور حضرت عمرؓ کو اس بارے میں کوئی اطلاع نہ دی۔ چند دنوں کے بعد، حضرت عمرو بن عاصؓ کو امیرالمومنین کی طرف سے حسبِ ذیل مراسلہ موصول ہوا۔

اپنے بیٹے کا معاملہ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم۔ اللہ کے بندے، عمر کی جانب سے "عاصی ابن العاصی" کے نام۔

ابن العاص! تمہاری جرأت اور بدعہدی پر مجھے بے حد تعجب ہوا۔ میں تمہیں معزول کر کے چھوڑوں گا۔ تم نے عبدالرحمٰن کو اپنے گھر کے اندر کوڑے لگوائے اور اس نے وہیں اپنا سر مونڈا۔ حالانکہ تم جانتے تھے کہ یہ بات میری طبیعت کے خلاف ہے۔ عبدالرحمٰن تمہاری رعایا کا ایک فرد تھا۔ تمہیں اس کے ساتھ وہی سلوک کرنا چاہیئے تھا جو دوسرے مجرموں کے ساتھ کرتے ہو لیکن تم نے کہا کہ وہ امیرالمومنین کا بیٹا ہے' اس لئے اس کے ساتھ ترجیحی سلوک کرنا چاہیئے۔ حالانکہ تمہیں اچھی طرح معلوم ہے کہ میرے نزدیک کسی شخص سے حق لینے میں کسی قسم کی رعایت اور نرمی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ جس وقت تمہیں یہ خط ملے' عبدالرحمٰن کو ایک اونی جبہ پہناؤ اور پالان (ننگی پلیٹھ کے اونٹ) پر سوار کر کے مدینہ روانہ کر دو تاکہ وہ اپنی بدکرداری کا مزہ چکھے۔

حضرت عمرو بن عاصؓ نے اس حکم کی تعمیل کی۔ جب عبدالرحمٰن مدینے پہنچے تو ننگی پیٹھ کے اونٹ پر سواری کی وجہ سے ان سے چلا بھی نہیں جاتا تھا۔ حضرت عمرؓ نے حکم دیا کہ اسے باقاعدہ سزا دی جائے۔ حضرت عبدالرحمٰنؓ بن عوف پاس بیٹھے تھے۔ انہوں نے کہا کہ امیرالمومنین! مجرم کو سزا مل چکی ہے۔ اب اسے اسی جرم کی پاداش میں دوبارہ سزا کس طرح دی جا سکتی ہے۔ حضرت عمرؓ نے اسے ان سنی کر دیا۔ بیٹا چلایا کہ "میں بیمار ہوں۔ آپ مجھے مار ڈالنا چاہتے ہیں!" اس کے باوجود حضرت عمرؓ نے انہیں دوبارہ سزا دی اور قید کر دیا۔ وہ حالتِ قید میں بیمار ہوئے اور وہیں وفات پا گئے۔

اس میں (بظاہر) سختی دکھائی دیتی ہے لیکن اگر سربراہِ مملکت اپنی اولاد کے ساتھ اس قسم کی سختی کی ایک نظیر قائم کر دے تو مملکت سے جرائم کا خاتمہ ہو جاتا ہے۔

ہم آگے چل کر (کسی اور باب میں) بیان کریں گے کہ اس دور میں' سربراہِ مملکت کا رشتہ دار ہونا' اسے کس طرح (DISADVANTAGEOUS) پوزیشن میں رکھتا تھا۔ رشتہ دار ہونا تو ایک طرف' اس کے دوست بھی دوسروں کے مقابلہ میں خسارے میں رہتے تھے۔ ابن طباطبا نے اپنی کتاب "آداب السلطانیہ" میں ایک شخص کا ایک فقرہ نقل کیا ہے جس سے عدلِ فاروقیؓ' آفتابِ جہاںتاب کی طرح وجہ درخشندگی عالم بن جاتا ہے۔ آپ نے

مجھے اپنا دوست نہ بنایئے

ایک شخص سے کہا کہ میں تجھ سے محبت کرتا ہوں۔ اس نے جواب میں کہا کہ

ایسا نظر آتا ہے کہ آپ میرے حق میں کچھ کمی کرنا چاہتے ہیں۔

اس لئے معاف فرمایئے! مجھے اپنا دوست نہ بنایئے۔ دُور دُور ہی رہنے دیجئے۔

یہ ہیں سیرتِ فاروقیؓ کے وہ مقامات جہاں پہنچکر انسان بے ساختہ پکار اٹھتا ہے کہ

ایسا کہاں سے لاؤں کہ تجھ سا کہیں جسے!

(۹) اب آگے چلئے۔ یہ ہم دیکھ چکے ہیں کہ حضرت عمرؓ نے اپنے بیٹے کے ساتھ کیا کیا۔ اس کے بعد یہ دیکھئے کہ (مصر کے گورنر) حضرت عمروؓ بن عاص لے بیٹے کے ساتھ کیا بیتی۔ ان کے بیٹے (محمد) نے ایک قبطی کو کسی بات پر تازیانوں سے پیٹا۔ وہ تازیانے مارتا جاتا تھا اور اس سے کہتا جاتا تھا کہ دیکھ! بڑوں کی اولاد ایسی ہوتی ہے۔ اس نے آکر حضرت عمرؓ سے شکایت کی تو آپ نے باپ بیٹے دونوں کو بلا بھیجا۔ اعتراف جرم پر آپ نے اس قبطی

عمرو بن عاصؓ کے بیٹے کا معاملہ

سے کہا کہ جس طرح اس نے تمہیں تازیانوں سے پیٹا تھا، اسی طرح تم اس کے تازیانے لگاؤ۔ وہ اسے کوڑے مارتا جاتا تھا اور حضرت عمرؓ کہتے جاتے تھے کہ "مار ـــ بڑوں کی اولاد کو اور مار" جب وہ اسے پیٹ چکا اور کوڑا حضرت عمرؓ کو واپس کرنے لگا تو آپ نے اس سے کہا کہ دو ایک کوڑے اس کے باپ (حضرت عمرو بن عاصؓ) کے بھی مارو کہ اگر اس نے اس کی صحیح تربیّت کی ہوتی تو اس کے ذہن میں یہ خناس نہ سماتا کہ وہ بڑوں کی اولاد ہے۔ قبطی نے کہا کہ جس نے مجھے مارا تھا میں اس سے بدلہ لے چکا ہوں۔ میں انہیں پیٹنا نہیں چاہتا۔ آپ نے کوڑا اس سے لے لیا، سخت غضب آلود نگاہوں سے حضرت عمرو بن عاصؓ کی طرف دیکھا اور وہ فقرہ کہا جو تکریم آدمیت اور شرفِ انسانیّت کی تابندہ دلیل ہے۔ آپ نے فرمایا۔

عمروؔ! تم نے لوگوں کو کب سے غلام بنانا شروع کیا۔ ان کی

ماؤں نے تو انہیں آزاد جنا تھا۔

"ان کی ماؤں نے تو انہیں آزاد جنا تھا"۔ یہ ہے قرآنِ کریم کے اس ابدی اصول کی درخشندہ تشریح جس میں کہا گیا ہے کہ وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِيْٓ اٰدَمَ۔ (۱۷/۷۰) ہم نے ہر انسان کو، اس کے انسان ہونے کی جہت سے، واجب التکریم پیدا کیا ہے۔ اقبالؒ کے الفاظ میں۔

اصلِ تہذیب احترامِ آدم است

(۱۰) اور خود اپنے خلاف۔

حضرت عمرؓ نے ایک شخص سے پسند کی شرط پر گھوڑا خریدا اور امتحاناً اس پر سوار ہوئے۔ گھوڑا چوٹ کھا کر

داغی ہو گیا۔ آپ نے اسے واپس کرنا چاہا۔ مالک نے انکار کر دیا۔ آپ نے کہا کہ اس معاملہ میں تصفیہ کے لئے کسی کو ثالث مقرر کر لو۔ اس نے کہا کہ میں شُریح کو ثالث ٹھہراتا ہوں۔ انہوں نے ماجرا سُنا تو کہا کہ امیر المومنین! یا گھوڑا خرید یئے اور یا جیسا وہ تھا ویسا اُسے واپس کیجیے۔ آپ اس فیصلہ پر بہت خوش ہوئے اور شُریح سے کہا کہ آپ منصبِ قضاۃ کے لئے بہایت موزوں ہیں۔

اپنے خلاف فیصلہ

یہی ہیں کوفہ کے مشہور قاضی شُریح جنھوں نے ساٹھ برس تک اس فریضہ کو بکمالِ حُسن و خوبی سرانجام دیا۔

(۱۱) اس سے بھی آگے بڑھیئے۔ آپ ایک مقدمہ میں مدعا علیہ کی حیثیت سے حضرت زید بن ثابتؓ کی عدالت میں پیش ہوئے۔ انہوں نے آپ کو تعظیماً بٹھانا چاہا تو آپ نے ان سے کہا کہ زیدؓ! تم سے انصاف کی توقع کس طرح کی جا سکتی ہے جب تم نے ابتدا ہی میں، فریقین میں امتیاز کرنا شروع کر دیا ہے!! یہ کہہ کر مدعی کے قریب بیٹھ گئے۔ آپ کو دعویٰ سے انکار تھا۔ فریقِ مخالف (ابی بن کعب) نے آپ سے حلف لینے کو کہا۔ اس پر حضرت زیدؓ نے ان (مدعی) سے کہا کہ امیر المومنین سے قسم نہیں لینی چاہیئے۔ اس پر حضرت عمرؓ سخت برافروختہ ہوئے اور کہا کہ زیدؔ! تم منصبِ قضا کے اہل نہیں۔ جو قاضی کسی فریقِ مقدمہ کی پوزیشن کا خیال رکھتا ہو وہ انصاف نہیں کر سکتا۔

حضرت عمرؓ عدالت میں

(۱۲) لیکن اس قسم کی غلطی تو ایک دفعہ خود ان (حضرت عمرؓ) سے بھی سرزد ہو گئی تھی۔ ایک یہودی نے حضرت علیؓ کے خلاف، آپ کی عدالت میں مقدمہ دائر کر دیا۔ حضرت علیؓ نسبتاً متمیز جگہ پر بیٹھ گئے تو آپ نے کہا کہ "ابوالحسن! اٹھو اور اپنے مدعی کے مقابل جا کر بیٹھ جاؤ۔" حضرت علیؓ اٹھے اور مدعی کے قریب جا کر بیٹھ گئے لیکن آپ کے چہرے پر برافروختگی کے آثار تھے۔ مقدمہ ختم ہونے کے بعد، حضرت عمرؓ نے حضرت علیؓ سے کہا کہ فریقِ مخالف کے برابر بیٹھنا آپ کو ناگوار گذرا تھا؟

حضرت علیؓ عدالت میں

حضرت علیؓ بھی تو بالآخر دستِ پروردگانِ رسالتؐ میں سے تھے۔ سنیئے کہ آپ نے کیا جواب دیا۔ آپ نے فرمایا کہ "عمرؓ! مجھے یہ قطعاً ناگوار نہیں گزرا۔ ناگوار یہ گزرا کہ تم نے میرا نام لینے کی بجائے مجھے میری کنیت (ابوالحسن) سے پکارا اور فریقِ مقابل کو اس کے نام سے۔ اس سے تم نے جو عدمِ مساوات کا ثبوت دیا

مجھے وہ ناگوار گذرا تھا۔

(واضح رہے کہ عربوں کے ہاں کسی کو نام کے بجائے کنیّت سے پکارنا، اس کی تعظیم پر دلالت کرتا تھا۔)

یہ تھا عدل کا معیار اس دَور میں!

(●)

ہم نے شروع میں لکھا ہے کہ زیرِ نظر عنوان کو ہم "قانونی عدل" تک محدود رکھنا چاہتے ہیں۔ اس خود عائد کردہ پابندی کے پیشِ نظر ہم اس باب کو یہیں ختم کرتے ہیں۔ حضرت عمرؓ نے عدل کے دوسرے گوشوں میں کس قسم کی مثالیں قائم کیں، اُن کا تذکرہ الگ باب میں کیا جائے گا۔ حقیقت یہ ہے کہ ہمارے سامنے شخصیّت ایسی جامع ہے کہ اس کی سیرت کو جس زاویئے سے بھی دیکھئے، نگہ شوق بے ساختہ پکار اٹھتی ہے کہ

زفرق تا بقدم ہر کجا کہ می نگرم!
کرشمہ دامنِ دل می کشد کہ جا اینجاست

: :

آٹھواں باب

حوادثِ آفاقی

طاعون اور قحط ۱۸-۱۷ھ

جامِ جہاں نُما مجو، دستِ جہاں کُشا طلب!

جیوشِ اسلامیہ کو فتوحات پر فتوحات حاصل ہو رہی تھیں۔ علاقوں پر علاقے مملکتِ خداوندی کے جزو بنتے چلے جا رہے تھے۔ سلطنتوں کی سلطنتیں بارگاہِ خلافت میں باجگزاری کے لئے حاضر ہو رہی تھیں۔ دولت و ثروت ابرِ نیساں کی طرح برس رہی تھی۔ فراست و تدبرِ فاروقی ؓ نے ساری مملکت کو شادابیوں اور کامرانیوں کی جنّت بنا دیا تھا کہ اتنے میں مملکت کو دو ایسے ہولناک حوادثِ سماوی نے گھیر لیا جن کا سدِباب کسی کے بس میں نہیں تھا۔ یہ تھا شام کے علاقہ کا طاعون اور عرب کا قحط!

حوادثِ آفاقی اور انسان

ہم نے کہا ہے کہ یہ وہ حوادثِ سماوی تھے جن کا انسداد کسی کے بس میں نہیں تھا۔ یہ نکتہ وضاحت طلب ہے۔ قرآنِ کریم میں قصہ آدم کے تمثیلی بیان میں کہا گیا ہے کہ وَعَلَّمَ اٰدَمَ الْاَسْمَآءَ كُلَّهَا۔ (۲/۳۱) "خدا نے انسان میں، تمام اشیائے فطرت کے متعلق علم حاصل کرنے کی صلاحیّت رکھ دی۔" نیز کئی ایک مقامات میں کہا کہ وَسَخَّرَ لَكُمْ مَّا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا مِّنْهُ (۴۵/۱۳) "کائنات کی پستیوں اور بلندیوں میں جو کچھ ہے ہم نے اسے قوانین کی زنجیروں میں جکڑ دیا ہے کہ انسان انہیں اپنے کام میں لائے۔"

ان ارشادات خداوندی سے واضح ہے کہ حوادثِ ارضی و سماوی (طبیعی کائنات) میں سے کوئی حادثہ بھی ایسا نہیں ہو سکتا جس کا سدِّ باب انسان کے بس کی بات نہ ہو۔ یہ ٹھیک ہے۔ لیکن ان حوادث کا سدِّ باب، تو قوانینِ فطرت کے علم کی رُو سے ہو سکے گا۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ قوانینِ فطرت کے متعلق جس قدر انسان کا علم ہوگا، اسی قدر وہ ان حوادث پر قابو پا لینے کے قابل ہو سکے گا۔ آج سے چودہ سو سال تو ایک طرف، پچاس سال پہلے بھی حالت یہ تھی کہ ہیضہ، طاعون، انفلوئنزا (جیسے وبائی امراض) جنگل کی آگ کی طرح پھیلتے تھے، لاکھوں جانیں ضائع کر کے رکھ دیتے تھے اور انسان بے چارہ، بے کس و بے بس، کھڑا ان کا منہ تکتا رہ جاتا اور ان کے انسداد کے لئے کچھ بھی نہیں کر سکتا تھا لیکن اب ایسی ادویات ایجاد ہو گئی ہیں جن سے بطورِ حفظِ ماتقدّم ان کا سدِّ باب کر دیا جاتا ہے۔ یہی صورت قحط کی ہے۔ آج سے کچھ عرصہ پہلے تک خشک سالی کا کوئی علاج کسی کی سمجھ میں نہیں آتا تھا اور ذرائع مواصلات کی کمی کی وجہ سے، غلّہ کے ایک جگہ سے دوسری جگہ لے جانے میں بڑی دشواریاں پیش آتی تھیں لیکن اب ایک طرف ذرائع آبپاشی کی متنوّع صورتیں پیدا ہو جانے، اور دوسری طرف سامانِ رسل و رسائل کے عام اور تیز رفتار ہو جانے سے، قحط پر بڑی حد تک قابو پایا جا سکتا ہے۔ اس سلسلہ میں مزید ریسرچ جاری ہے۔ سُنا ہے کہ امریکہ اور کینیڈا میں مصنوعی بارشیں بھی برسانے لگ گئے ہیں۔ جب انسان نے قوانینِ فطرت کا پُورا پورا علم حاصل کر لیا اور اس طرح فطرت کی قوتوں کو مسخر کر لیا تو حوادثِ ارضی و سماوی پر قابو پا لینا کچھ بھی مشکل نہیں رہے گا۔ (مشکل تو اپنے آپ پر قابو پانا ہے، خارجی حوادث پر نہیں۔ ملائکہ (فطرت کی قوتیں) تو سب کی سب آدم کے سامنے سجدہ ریز ہو گئی تھیں۔ بغاوت اس کے اپنے سرکش جذبات نے کی تھی جسے قرآنی اصطلاح میں شیطان یا ابلیس کہا جاتا ہے)۔ آج سے چودہ سو سال پہلے، ان خارجی حوادث پر کماحقہ، قابو پانا تو مشکل تھا لیکن جو سعادت مند انسان، اقدارِ خداوندی کی اطاعت سے، اپنے آپ پر قابو پانے کے اہل ہو گئے تھے، ان کی دلگدازیاں اور حسنِ تدبّر کی کرشمہ سازیاں، ان حوادث کی تباہ کاریوں کی کافی حد تک تلافی کر دیتی تھیں۔ اس وقت ہمارے سامنے آفاقی حوادث کی تباہ کاریوں اور ان کے مقابلہ کے لئے "دستِ جہاں کُشا" کی سعی و کاوش کی عبرت آموز و بصیرت افروز داستان کا ایک باب ہے۔

عمواس کا طاعون

۱۸ھ کے اواخر کی بات ہے کہ فلسطین کے شہر عمواس میں طاعون پھوٹا اور دیکھتے ہی دیکھتے شام سے عراق تک سارے علاقہ میں سیلاب کی طرح پھیل گیا۔ یہ وہ علاقے تھے جن میں اُس وقت مملکتِ اسلامیہ کی فوجیں یہاں سے وہاں تک پھیلی

ہوئی تھیں۔ یہ سب اس طوفان کی لپیٹ میں آگئیں۔ یہ وبا مہینوں تک پھیلی رہی اور ایک اندازہ کے مطابق قریب پچیس ہزار مسلمان اس کی نذر ہو گئے۔ ان میں بڑے بڑے جلیل القدر صحابہؓ مثل حضرت ابو عبیدہ ابن الجراحؓ، معاذ بن جبلؓ، یزیدؓ بن ابی سفیانؓ، عقبہ بن سہیلؓ وغیرہ شامل تھے۔

حضرت عمرؓ شام کا نظم و نسق بچشمِ خویش دیکھنے کی غرض سے، اس سے پہلے مدینہ سے روانہ ہو چکے تھے۔ جب آپ تبوک کے قریب پہنچے تو طاعون کی تباہ کاریوں کی خبر ملی۔ وہاں صحابہؓ سے مشورہ کیا گیا کہ آگے جانا چاہیئے

ایک تقدیر سے دوسری تقدیر کی طرف

یا نہ اور طے یہ پایا کہ آپ کو، اپنے ساتھیوں سمیت واپس تشریف لے جانا چاہیئے۔ یہی وہ فیصلہ تھا جس کے خلاف حضرت ابو عبیدہؓ نے کہا تھا کہ "کیا آپ تقدیرِ الٰہی سے بھاگ رہے ہیں"۔ اور آپ نے جواب میں فرمایا تھا کہ "ہاں! میں خدا کی ایک تقدیر سے اس کی دوسری تقدیر کی طرف جا رہا ہوں"۔ (تفصیل اس نکتہ کی "حسبنا کتاب اللہ" سے متعلق چوتھے باب میں گذر چکی ہے) اور یہی وہ "مرگِ مفاجات" تھی جس سے بچانے کے لئے آپ نے حضرت ابو عبیدہؓ کو لکھا تھا کہ آپ ایک ضروری مشورہ کے لئے مدینہ آ جائیے اور انہوں نے جواب میں عرض کیا تھا کہ میں جانتا ہوں کہ آپ مجھے اس بلا سے محفوظ رہنے کے لئے بلا رہے ہیں لیکن میں اپنے لشکر کا سپہ سالار ہوں۔ اپنے سپاہیوں کو خطرہ میں چھوڑ، اپنی جان بچانے کے لئے یہاں سے نکل جانا باعثِ ننگ سمجھتا ہوں۔ اس لئے آپ مجھے تعمیلِ ارشاد سے معذور رکھیئے۔ آپ وہاں سے نہ نکلے اور اپنے رفقاء کی معیت میں وہیں، جان، جان آفرین کے سپرد کر دی۔ رضی اللہ عنہم ورضوا عنہ۔

فاروقِ اعظمؓ اس سیلاب کو تو نہ روک سکے لیکن اس کی آوردہ تباہیوں کی تلافی کے لئے بڑی تگ و تاز کی۔ یہ غنیمت ہوا کہ اس دوران میں یزدگرد یا ہرقل نے، ان علاقوں کی بازیابی کے لئے حملہ نہ کر دیا، ورنہ مشکل اندر مشکل پیدا ہو جاتی۔ (انہوں نے غالباً طاعون کے ڈر سے ایسا نہ کیا) وبا ختم ہو گئی، تو آپ ان تباہیوں کا جائزہ لینے اور ان کے ازالہ کے لئے مناسب انتظام کرنے کی غرض سے خود شام کی طرف تشریف لے گئے۔ آپ کے اس سفر کا حال، فتوحات سے متعلق باب میں ہماری نظروں سے گزر چکا ہے۔

(۵)

عرب میں قحط

اُدھر شام و عراق میں یہ طوفانِ بلا امنڈا ہوا تھا اور اِدھر پورے کے پورے عرب کو نہایت شدید اور مہیب قحط نے گھیر لیا۔ خشک سالی ایسی آتش فشاں تھی کہ

اس نے زندگی کی ہر نمود کو راکھ بنا کر رکھ دیا۔ چنانچہ بعد میں اسے یاد ہی "عام الرمادہ" ـ سالِ خاکستر ـ کے نام سے کیا جاتا تھا۔

جیسا کہ اس قسم کے حالات میں ہوتا ہے، ارد گرد کی ساری صحرائی آبادیاں، ہجوم کر کے مدینہ آ گئیں۔ مدینہ اگرچہ مملکت کا مرکزی مقام بھی تھا اور (اب) خوشحال بھی، لیکن وہاں اتنا غلہ ریزرو میں تو نہیں رکھا تھا کہ وہ اس قدر کثیر آبادی کے لئے کافی ہو جائے۔ یہ ایک ایسا لاینحل مسئلہ اور ناگہانی آفت تھی جس سے بڑی سے بڑی مستحکم اور وسیع مملکت کے مدبرین بھی حواس باختہ ہو جاتے لیکن حضرت عمرؓ نہ تو اس قدر پریشان ہوئے کہ آپ کے اوسان خطا ہو جاتے۔ اور نہ ہی یہ کہہ کر ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے رہے کہ یہ "خدا کی طرف سے آئی ہوئی بلا ہے۔ بندے اس کا علاج کیا کر سکتے ہیں!" انہوں نے ایک تقدیرِ الٰہی سے دوسری تقدیرِ الٰہی کی طرف رخ موڑا اور کامل دل جمعی سے اس مصیبت کا مقابلہ کرنے کے لئے تیار ہو گئے۔ انہوں نے سب سے پہلے شام، فلسطین،

غلہ کے قافلے

عراق، کے گورنروں کے نام "خطرہ کا الارم" (S.O.S) بھیجا اور کہا کہ "کیا تم اسے گوارا کرو گے کہ ہم ہلاک ہو جائیں اور تم زندہ رہو۔" اس امداد طلبی پر انہوں نے دل کی اس کشاد سے لبیک کہا جس کی ان سے توقع تھی۔ حضرت عمرو بن عاصؓ نے جواب میں کہا کہ اطمینان رکھئے، میں غلہ کا ایسا قافلہ بھیج رہا ہوں جس کا اگلا سرا آپ کے پاس ہو گا اور پچھلا سرا میرے پاس۔ حضرت ابو عبیدہؓ ابن الجراح چار ہزار اونٹوں کا قافلہ لے کر خود عازم مدینہ ہو گئے۔ حضرت معاویہ بن ابی سفیان نے شام سے تین ہزار اور سعد بن ابی وقاصؓ نے ایک ہزار اونٹوں کے قافلے روانہ کئے۔ علاوہ بریں، حضرت عمرو بن عاصؓ نے پانچ ہزار کمبل اور حضرت معاویہؓ نے تین ہزار چغے بھیجے۔ انہوں نے امداد بھیجنے میں تو ذرا سا تساہل نہ برتا لیکن اونٹوں نے تو اپنی رفتار سے چلنا تھا۔ وہ انہیں ہوائی جہاز یا ریل نہیں بنا سکتے تھے۔ مدینہ کے باہر ہزار ہا کی تعداد میں بھوکے مرد، عورتیں، بچے، پکار پکار کر کہہ رہے تھے کہ

به لبم رسیده جانم، تو بیا که زنده مانم
پس ازاں که من نه مانم، بچه کار خواهی آمد

حضرت عمرؓ اس "صبر طلبیٔ عشق اور بیتابیٔ تمنا" کی کش مکش سے غافل نہیں تھے۔ انہوں نے رسد کی آمد تک

حسنِ تدابیر

مقامی انتظامات اپنے ہاتھ میں لے لئے۔ سب سے پہلے انہوں نے یہ کیا کہ مدینے میں جس قدر کھاتے پیتے گھرانے تھے، ان کے افرادِ خاندان کی تعداد کے برابر باہر سے

آنے والے افراد ان کے ساتھ ملا دیئے اور کہہ دیا کہ جتنا کھانا روز پکتا تھا وہ کھانا اس دگنی تعداد میں تقسیم کر لیا جائے۔ ان کا ارشاد تھا کہ نصف خوراک سے انسان مرتا نہیں۔

لیکن جب آنے والوں کا ہجوم زیادہ ہو گیا تو آپ نے اس انتظام کو بدل دیا اور حکم دے دیا کہ مدینہ میں کسی کے گھر میں انفرادی طور پر کچھ نہیں پکے گا۔ غذا کا سامان یکجا کر لیا جائے اور جو کچھ پکے' اہل مدینہ اور باہر سے آنے والے' ایک مشترکہ دسترخوان پر بیٹھ کر کھالیں۔ اس انتظام کی

مشترکہ دسترخوان

ابتداء انہوں نے خود اپنے ہاں سے کی۔ چنانچہ آپ بھی اسی مشترکہ دسترخوان پر بیٹھ کر' ماحضر تناول فرمالیتے تھے۔ اس دسترخوان کی وسعت کا اندازہ اس سے لگائیے کہ اس پر کھانے والوں کی تعداد قریب دس ہزار تھی اور جن مریضوں' معذوروں' بوڑھوں' بچوں' عورتوں کو ان کی اقامت گاہوں پر کھانا پہنچایا جاتا تھا' ان کی تعداد قریب پچاس ہزار۔

اس اشتراکِ طعام کی کیفیت یہ تھی کہ ایک دن آپ' ایک بدو کے ساتھ مل کر' ایک ہی طشت میں کھانا کھا رہے تھے۔ طشت میں' گھی میں چوری کی ہوئی روٹی تھی۔ آپ نے دیکھا کہ وہ بدو "ندیدوں" کی طرح طشت میں اُس طرف ہاتھ مار رہا ہے جس طرف گھی زیادہ تھا۔ حضرت عمرؓ نے اس سے پوچھا کہ کیا تم نے گھی کبھی نہیں کھایا۔ اس نے کہا کہ جب سے قحط پڑا ہے نہ خود اس نے گھی یا تیل کھایا ہے' نہ کسی اور کو کھاتے دیکھا ہے۔ یہ سن کر آپ نے قسم کھائی کہ جب تک قحط رہے گا وہ گوشت اور گھی کو ہاتھ تک نہیں لگائیں گے۔ صرف زیتون کے تیل کے ساتھ سوکھی روٹی کھائیں گے — مسلسل پریشانی' پیہم مشقت' دن رات کی تگ و تاز اور اس پر اس تبدیلیٔ غذا کا نتیجہ یہ ہوا کہ آپ کے چہرے کا رنگ سیاہ پڑ گیا (حالانکہ وہ سرخ و سپید تھے) پیٹ میں قراقر رہنے لگا۔ دن بدن لاغر ہوتے چلے گئے۔ اس پر آپ کے رفقاء کو تشویش لاحق ہوئی اور انہوں نے آپ سے کہا کہ آپ اس تبدیلیٔ غذا کو برداشت نہیں کر سکیں گے اس لئے آپ اپنے معمول کی غذا کی طرف پلٹ آئیے۔ اس کے جواب میں آپ نے وہ فقرہ کہا کہ جسے اگر دنیا کے سربراہانِ مملکت اپنی زندگی کا اصول بنالیں تو یہ جہنم آج مبدل بہ فردوس ہو جائے۔ آپ نے فرمایا کہ

> مجھے لوگوں کی تکلیف کا احساس کس طرح ہو سکتا ہے جب تک مجھ پر بھی وہی کچھ نہ گذرے جو ان پر گذرتی ہے۔

اور قحط کا سارا زمانہ اسی سوکھی روٹی اور روغنِ زیتون پر گزار دیا! معمول یہ تھا کہ صبح اُٹھتے ہی پہلے مطبخ کی طرف

جاتے جہاں مشترکہ دسترخوان کے لئے پروگرام کے مطابق کچھ پکتا تھا۔ پھر قحط زدگان کی قیام گاہوں کی طرف جاتے تاکہ دیکھ لیں کہ انہیں کوئی خاص تکلیف تو نہیں۔ جو کھانا انہیں بھیجا جاتا اس کی نگرانی بھی خود کرتے اور اکثر اوقات، کھانا پہنچانے والوں کے ساتھ مل کر اور خود کھانا اٹھا کر ان تک پہنچاتے۔ صبح سے رات تک یہ معمول ہوتا اور (حضرت عبداللہ بن عمرؓ کا بیان ہے کہ) رات کو سجدے میں پڑے روتے، گڑگڑاتے اور خدا سے فریاد کرتے کہ "ربّ العالمین! اگر یہ مصیبت میری کسی کوتاہی کی وجہ سے ہے تو مجھے معاف کر دے"۔ جن لوگوں نے آپ کی یہ حالت دیکھی تھی وہ کہتے تھے کہ اگر کچھ وقت اور تک قحط دور نہ ہوتا تو ہمیں خدشہ تھا کہ عمرؓ مسلمانوں کے غم میں اپنی جان گھلا دیتے۔

غم تمام مسلمانوں کا تھا، ساری اُمّت کا تھا۔ اس میں اپنے اور بیگانے کی کوئی تمیز نہیں تھی۔

عمرؓ کا پوتا پھل کھا رہا ہے!

ایک دن آپ نے دیکھا کہ آپ کا پوتا ککڑی (یا تربوز) کھا رہا ہے۔ (حضرت) عبداللہ بن عمرؓ کو بلایا اور ڈانٹ کر کہا کہ "محمدؐ کی امت بھوکی مر رہی ہے اور عمرؓ کا پوتا پھل کھا رہا ہے؟" بیٹے نے کہا کہ ابا جان! خفا نہ ہوجیے۔ عمرؓ کے پوتے کو "پھل" کسی خصوصی امتیاز کی بنا پر نہیں ملا۔ صبح کے ناشتے میں بچوں کو جو کھجوریں ملی تھیں، اس نے ایک بدو لڑکے سے ان کے عوض یہ ککڑی (یا تربوز) خرید لیا تھا۔

ایک دن گلی میں دیکھا کہ ایک بچی جا رہی ہے ــــ زرد رُو، نحیف و نزار ــــ اسے دیکھ کر آپ کو بڑا

یہ عمرؓ کی پوتی تھی

صدمہ ہوا۔ پوچھا یہ کس کی بچی ہے۔ بیٹا ساتھ تھا۔ کہا کہ "یہ امیر المومنین کی پوتی ہے!" فرمایا کہ اس کی ایسی حالت کیوں ہے۔ کہا کہ اس قحط میں جو کچھ ملتا ہے بدوؤں کے بچے تو اس کے عادی ہیں لیکن ہمارے بچے اس کے عادی نہیں۔ اس لئے ان کی یہ حالت ہو رہی ہے۔ فرمایا کہ حالت کچھ بھی ہو، اس عالمگیر مصیبت میں کسی کے ساتھ ترجیحی سلوک نہیں کیا جا سکتا۔

بعض فاقہ زدہ لوگ اس حالت میں مدینہ پہنچتے کہ ان میں خود کچھ پکا کر کھانے کی سکت بھی نہ ہوتی۔ ایسی حالت میں آپ ان کے لئے خود کھانا تیار کر دیتے۔ حضرت ابو ہریرہؓ کا بیان ہے کہ انہوں نے دیکھا کہ آپ چمڑے کے دو تھیلے اور روغنِ زیتون کا کنستر اٹھائے چلے جا رہے ہیں۔ انہیں لے کر چند قحط زدہ لوگوں کے پاس پہنچے اور خود کھانا تیار کر کے انہیں کھلایا۔

انہی کیمپوں میں ایک دفعہ دیکھا کہ ایک عورت عصید (ایک قسم کا کھانا) پکا رہی ہے لیکن اُسے پکانا نہیں آتا۔ آپ اس کے پاس بیٹھ گئے اور خود کف گیر چلا کر بتایا کہ عصید ایسے پکایا کرتے ہیں۔

خشک سالی کئی مہینوں تک رہی۔ اس کے بعد رحمتِ ایزدی کے سحاب کرم نے گہر باری کی۔ بارش شروع ہوئی اور ایسی کہ اس نے جل تھل ایک کر دیا۔ لوگ شاداں و فرحاں اپنے اپنے گھروں کو لوٹ گئے۔ یہ آفت اس قدر

بالآخر بارش ہو گئی

عالمگیر، مہیب اور تباہ کن تھی لیکن حضرت عمرؓ کی دلگدازی، جگر سوزی اور حسنِ تدبر نے اس کا اس طرح مقابلہ کیا کہ اس سے کم از کم نقصان ہوا اور لوگوں کی مصیبتوں کی تلخیاں، ہمدردی کی شیرینیوں میں تبدیل ہو گئیں۔

دنیا میں حوادث تو رُونما ہوتے ہی رہتے ہیں لیکن خوش بخت ہیں وہ آفت رسیدگان جنہیں اس قسم کا سربراہ میسر آ جائے جو ان تیرِ حوادث کو اپنے سینے پر لے اور اس کی پناہ میں سر چھپانے والوں کے کانوں تک ان کی سنسناہٹ بھی نہ پہنچنے دے۔

خوشا وہ قافلہ جس کے امیر کی ہے متاع
تخیلِ ملکوتی و جذبہ ہائے بلند

(۶)

وبا اور قحط کی خار دار وادیوں سے نکل کر اب ہمیں اپنا سفر پھر اسی نہج و انداز سے شروع کر دینا چاہیئے لیکن اس پُر خار راستے کا ایک کانٹا ایسا ہے جس کا اسی مقام پر نکال دینا ضروری ہے۔

تاریخ میں ہے کہ جب قحط کی شدت اور طوالت بڑھ گئی تو حضرت عمرؓ نے نمازِ استسقاء ادا کرنے کا فیصلہ کیا اور والیانِ ریاست کو لکھا کہ وہ بھی فلاں دن اور فلاں وقت اپنے اپنے ہاں یہ نماز ادا کریں اور خدا سے دُعا مانگیں کہ وہ بارش برسائے۔ آپ خود، معہ صحابہؓ کبار نماز کے لیے میدان میں جمع ہوئے۔ نماز کے بعد اس خشوع و خضوع سے بارگاہِ ایزدی میں گڑگڑائے کہ آپ کی ڈاڑھی آنسوؤں سے تر ہو گئی لیکن اس پر بھی بارش

حضرت عباسؓ کا وسیلہ

کا ایک قطرہ نہ برسا۔ اس پر آپ نے حضرت عباسؓ بن عبد المطلب کا ہاتھ پکڑا اور آسمان کی طرف سر اٹھا کر کہا کہ "یا اللہ! ہم تیرے رسولؐ کے چچا کو تیرے حضور وسیلہ بنا کر دُعا کرتے ہیں کہ تو ہماری حالت پر رحم فرما۔" یہ کہنا تھا کہ بارش برسنے لگ گئی اور خوب زور سے برسی۔ اس سے قحط رفع ہو گیا۔

کسی اور کے متعلق یہ کہا جاتا تو اسے باور بھی کیا جا سکتا تھا لیکن جو عمرؓ، شخصیت پرستی کے اس قدر خلاف تھا کہ اس نے اس درخت تک کو کٹوا دیا تھا جس کے نیچے حضورؐ نے بیعتِ رضوان لی تھی اور جسے بعد میں لوگوں نے مقدس تصوّر کر لیا تھا' اس کے متعلق یہ کہنا کہ اس نے رسول اللہؐ کے چچا کو وسیلہ قرار دے کر خدا سے بارانِ رحمت کی دعا کی تھی' بعید از قیاس ہے۔

وضعی روایات

ہماری روایات' عباسیوں کے عہدِ حکومت میں جمع اور مرتب ہوئی تھیں اور انہی کے زمانے میں وضعی حدیثوں کی بھرمار ہوئی تھی۔ ان کے عہدِ حکومت میں' ان کے (عباسی خلفاء کے) ابوالآباء (حضرت عباسؓ) کی مبالغہ آمیز عظمت و عقیدت کی روایات کا وضع ہو جانا فطری امر تھا (ملوکیّت میں ایسا ہی ہوتا ہے) چنانچہ یہ حدیث بھی ہمارے ہاں موجود ہے کہ

> ایک مرتبہ حضرت عباسؓ بن عبدالمطلب نے رسول اللہؐ سے شکایت کی۔ قریش جب آپس میں ملتے ہیں تو بڑی خندہ پیشانی سے ملتے ہیں لیکن ہم سے اس ہنسی خوشی کے ساتھ نہیں ملتے۔ یہ سن کر آپ بہت رنجیدہ ہوئے اور فرمانے لگے، خدا کی قسم جس کے قبضے میں میری جان ہے، کسی کے دل میں ایمان داخل نہیں ہو سکتا' جب تک وہ خدا کے لئے اور اس کے رسولؐ کی وجہ سے تم سے محبّت نہ رکھے۔ (مسند احمد)

سو جب اس قسم کی حدیثیں وضع ہو گئیں جن کی رُو سے' ایمان کو حضرت عباسؓ کے ساتھ محبّت سے مشروط کر دیا گیا، تو ایسی روایات کے وضع کرنے میں کونسا تامل ہو سکتا تھا جن میں اجابتِ دعا کے لئے حضرت عباسؓ کو وسیلہ بنانے کا ذکر ہو۔

(دعاؤں کے متعلق حضرت عمرؓ کا موقف کیا تھا، اس کے متعلق بارہواں باب دیکھئے۔)

یہاں تک لکھا جا چکا تھا کہ طبقاتِ ابن سعد کی ایک روایت سامنے آئی جس سے اس واقعہ پر ایک نئے زاویہ سے روشنی پڑتی ہے۔ عرب، ستاروں سے راستوں کا تعین بھی کیا کرتے تھے اور موسموں کے تغیرات کا اندازہ بھی۔ روایت میں ہے کہ حضرت عمرؓ نے منبر پر کھڑے ہو کر بارش کے لئے دعا مانگی اور پھر نیچے اُتر آئے۔ لوگوں نے پوچھا کہ آپ نے نمازِ استسقاء کیوں نہیں ادا کی۔ فرمایا کہ میں نے آسمان کے ان ستاروں سے جو بارش کی نوید دیتے ہیں' بارش کی بابت پوچھا ہے۔ پھر آپ نے حضرت عباسؓ سے پوچھا کہ (فلاں) ستاروں کے طلوع ہونے کو کتنے روز باقی ہیں؟ انہوں نے کہا کہ قریب آٹھ دن۔ آپ نے کہا کہ امید ہے اللہ جلد خیر کرے گا۔

معلوم ہوتا ہے کہ بات اتنی تھی (اور یہ حضرت عمرؓ کے مزاج اور قرآنی راہ نمائی کے مطابق ہے۔)

نواں باب

سیاسی نظام

از کلیدِ دیں درِ دُنیا کُشاد

قرآن کے سیاسی نظام (یا بالفاظِ دیگر، ہیئتِ اجتماعیۂ انسانیہ) کا اصل الاصول، عروہ الوثقیٰ، یا اساسِ محکم سورۂ آلِ عمران کی وہ آیۂ جلیلہ ہے جس میں کہا گیا ہے کہ

> کسی انسان کو اس کا حق حاصل نہیں ـــ خواہ خدا نے اُسے ضابطۂ قوانین کا حامل، یا منصبِ حکومت پر سرفراز یا مقامِ نبوّت پر فائز بھی کیوں نہ کر دیا ہو، کہ وہ لوگوں سے کہے کہ تم اللہ کے نہیں بلکہ میرے محکوم بن جاؤ۔ اسے یہی کہنا چاہیئے کہ تم اس کتابِ خداوندی کی رُو سے جسے تم پڑھتے پڑھاتے ہو اور جس کے حقائق و غوامض پر غور و فکر کرنے سے اس کے معانی و مقاصد کی حقیقت تک پہنچتے ہو، ربّانی بن جاؤ۔" (۳/۷۸)

یہ انسانی آزادی کا وہ عظیم انقلابی منشور ہے جس کی نظیر آپ کو کہیں نہیں ملے گی۔ انسانی فکر نے بھی غلامی اور محکومی

انسانی آزادی کا منشور

کے استبداد سے تنگ آکر، اس سے نجات حاصل کرنے کی تدابیر سوچیں۔ پہلے اس نے شخصی حکومت (ملوکیّت) کی لعنت سے چھٹکارا حاصل کرنے کے لئے ہاتھ پاؤں مارے۔ پھر مذہبی پیشوائیت (تھیاکریسی) کی دسیسہ کاریوں کے دامِ ہمرنگِ زمین کو توڑا۔ اس کے بعد اس نے جمہوری نظام اختیار کیا۔ انسانی فکر ابھی تک اسی مقام تک پہنچ سکی ہے لیکن وہ اس سے بھی مطمئن نہیں۔ اس لئے کہ انسانوں کی محکومی سے نجات، جمہوری نظام میں بھی نہیں مل سکتی۔ اس میں صرف

اتنا ہوتا ہے کہ ایک شخص (ملوکیت) کی محکومی کے بجائے، انسانوں کے ایک گروہ (اکثریت) کی محکومی اختیار کرنی پڑتی ہے[1]۔ یہ گروہ، دوسرے انسانوں سے اپنی اطاعت "ذاتی حکم" کی رو سے نہیں کراتا، اپنے وضع کردہ قوانین کی رو سے کراتا ہے لیکن محکومی، کسی کے ذاتی فیصلہ کی ہو، یا اس کے فیصلہ کو قانون کا نام دے دینے کی بات ایک ہی ہے۔ اس سے انسان، دوسرے انسانوں کی محکومی کی زنجیروں سے رستگاری حاصل نہیں کر سکتا۔ اس لعنت سے نجات حاصل کرنے کا طریقہ ایک ہی ہے اور وہ، وہ طریق ہے جسے مندرجہ بالا قرآنی منشورِ آزادی کے آخری حصہ میں بیان کیا گیا ہے۔ اس میں کہا یہ گیا ہے کہ قانون سازی کا حق بھی کسی انسان (یا انسانوں کے گروہ) کو حاصل نہیں۔ یہ حق صرف خدا کو حاصل ہے۔ اسی کو خدا کا "حقِ حکومت" کہا گیا ہے۔ سورۂ یوسف میں ہے:

اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ ؕ اَمَرَ اَلَّا تَعْبُدُوْٓا اِلَّآ اِيَّاهُ ؕ ذٰلِكَ الدِّيْنُ الْقَيِّمُ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ ۔ (۱۲/۴۰)

یاد رکھو! حقِ حکومت خدا کے سوا کسی کو حاصل نہیں۔ اس نے حکم دیا ہے کہ اس کے سوا کسی کی محکومیت اختیار نہ کی جائے۔ یہی محکم نظامِ حیات ہے لیکن اکثر لوگ اس حقیقت کو سمجھتے نہیں۔

خدا کا یہ حقِ حکومت اس طرح خالصتًا اسی کے لئے مختص ہے کہ وہ اس میں کسی اور کو شریک نہیں کرتا۔

لَا يُشْرِكُ فِىْ حُكْمِهٖٓ اَحَدًا ۔ (۱۸/۲۶)

وہ اپنے دائرۂ حکومت میں کسی کو شریک نہیں کرتا۔

لیکن خدا تو ہمارے سامنے (محسوس شکل میں) نہیں آتا۔ اس لئے یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس کی اطاعت

کتاب اللہ کی حکومت

(محکومیت) کس طرح اختیار کی جائے۔ اس کا جواب اس نے خود ہی یہ کہہ کر دے دیا کہ اس کی اطاعت، اس کے عطا کردہ ضابطۂ قوانین (کتاب اللہ) کی رو سے کی جائے۔ سورۃ الانعام میں ہے۔

اَفَغَيْرَ اللّٰهِ اَبْتَغِىْ حَكَمًا وَّهُوَ الَّذِىْٓ اَنْزَلَ اِلَيْكُمُ الْكِتٰبَ مُفَصَّلًا ؕ (۶/۱۱۴)

(اے رسول! ان سے کہو) کہ کیا تم یہ چاہتے ہو کہ میں خدا کے سوا کسی اور کو اپنا حاکم قرار دے

---

[1] تفصیل کے لئے دیکھئے میری کتاب "اسلام کیا ہے"۔

لوں، حالانکہ اس نے تمہاری طرف وہ کتاب نازل کر دی ہے جو ہر بات کو نکھار کر بیان کرتی ہے۔

یہی کفر اور ایمان میں خطِ امتیاز ہے۔

وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْكٰفِرُوْنَ۔ (۵/۴۴)

جو اس کے مطابق فیصلے (حکومت) نہیں کرتا جسے خدا نے نازل کیا ہے، تو یہی لوگ ہیں جنہیں کافر کہا جائے گا۔

لیکن کتاب تو ساکت و صامت حروف و نقوش کا مجموعہ ہوتی ہے۔ اس کی اطاعت کس طرح کی جائے؟ یہاں سے مذہب اور دین کا بنیادی فرق ہمارے سامنے آتا ہے۔

دین اور مذہب میں فرق

بعض لوگوں نے یہ خیال کیا (اور دنیا کے تمام اہلِ مذاہب اسی خیال کے حامل ہیں) کہ یہ اطاعت انفرادی طور پر کی جائے گی، یعنی ہر فرد اپنے اپنے طور پر جس طرح جی چاہے احکامِ خداوندی کی اطاعت کرتا رہے۔ اسے "**مذہب**" کہتے ہیں جس میں "خدا کی اطاعت" سے مراد اس کی **پرستش** ہوتی ہے، **محکومیت** نہیں ہوتی لیکن قرآن، انفرادی نہیں بلکہ اجتماعی نظامِ حیات کی تاکید کرتا ہے۔ اسے دین کہا جاتا ہے[1]۔ وہ کہتا ہے کہ وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِيْعًا۔ (۳/۱۰۲) "تم اس ضابطۂ خداوندی کو اجتماعی طور پر تھامے رہو۔" ظاہر ہے کہ اس کے لئے نظامِ حکومت کی ضرورت ہوگی۔ اس سلسلہ میں قرآنِ کریم نے واضح الفاظ میں کہہ دیا کہ تمہارے ایمان و اعمالِ صالحہ کا لازمی نتیجہ استخلاف فی الارض ہوگا۔ (یعنی تمہاری اپنی حاکمیت و حکومت) اسی سے تمہارے دین (اجتماعی نظامِ زندگی) کو تمکّن حاصل ہوگا اور اسی سے تم اس قابل ہو سکو گے کہ خالصۃً خدا کی محکومیت اختیار کر سکو (۲۴/۵۵)۔ اس نظام (کی مرکزی اتھارٹی) کی اطاعت، خدا کی اطاعت کہلائے گی۔ ان امور کی تفصیل تیسرے اور ساتویں باب میں گزر چکی ہے لیکن اس مقام پر اس کا دہرانا اس لئے ضروری سمجھا گیا ہے کہ اس کے بغیر عہدِ فاروقی کا سیاسی نظام (جو اس کتاب کا عمودی موضوع ہے) اچھی طرح سمجھ میں نہیں آ سکے گا۔ (اس تکرار کے لئے میں قارئین کے حسنِ ذوق سے معذرت خواہ ہوں۔)

اسلام اپنی آزاد مملکت چاہتا ہے

اس حقیقت کو اچھی طرح ذہن نشین کر لیجئے کہ اسلام ایک زندہ نظام (یعنی دین) کی حیثیت صرف اپنی

---

[1] مذہب اور دین کے اس فرق کے لئے میرے مجموعہ مضامین ـ بہارِ نو ـ میں "قیامتِ موجود" کا عنوان دیکھئے یا میری انگریزی زبان کی کتاب۔ ISLAM A CHALLENGE TO RELIGION

آزاد مملکت میں اختیار کر سکتا ہے۔ غیروں کی حکومت میں، یا خود مسلمانوں کی ایسی حکومت میں جس کی بنیاد کتاب خداوندی پر نہ ہو، اسلام ایک رسمی مذہب بن کر رہ جاتا ہے، دین کی شکل اختیار نہیں کر سکتا۔ اس قسم کی حکومتوں کے تابع، مسلمان، اسلام کے مطابق زندگی بسر کر ہی نہیں سکتا۔ تقسیمِ ہند سے پہلے، تحریکِ پاکستان کے دوران، ہندوستان کے علماء کی ایک جماعت کا مؤقف یہ تھا کہ آزاد ہندوستان میں بیشک حکومت اکثریت (یعنی ہندوؤں) کی ہوگی، لیکن وہ جب ہمیں "مذہبی آزادی" کی ضمانت دیتے ہیں تو پھر مسلمانوں کے لئے الگ مملکت کا مطالبہ کیا معنی رکھتا ہے؟ اس کے جواب میں علامہ اقبالؒ نے کہا تھا کہ:-

ملاّ کو جو ہے ہند میں سجدے کی اجازت
ناداں یہ سمجھتا ہے کہ اسلام ہے آزاد

اسلام کو آزادی صرف اپنی آزاد مملکت میں میسر آ سکتی ہے۔ جب تک مسلمانوں کی اپنی آزاد حکومت نہ ہو، قرآن کے احکام، قانونی شکل میں نافذ ہی نہیں کئے جا سکتے[1] اور (ظاہر ہے کہ) جو احکام، قانونی شکل میں نافذ نہ کئے جا سکیں، ان کی حیثیت محض "وعظ" کی رہ جاتی ہے۔ "امر بالمعروف و نہی عن المنکر" کے قرآنی فریضہ سے مقصود ہی یہ ہے کہ احکامِ قرآنی کو قانوناً نافذ کیا جائے۔ اس کے بغیر معاشرہ کی اصلاح ہو نہیں سکتی۔ حضرت عثمانؓ کے ارشاد کے مطابق يَزَعُ اللّٰهُ بِالسُّلْطَانِ اَكْثَرَ مِمَّا يَزَعُ بِالْقُرْاٰنِ۔ تنہا قرآن سے اتنی اصلاح نہیں ہو سکتی جتنی اصلاح (قرآنی) حکومت کے ذریعے ہو سکتی ہے۔ اسی لئے کہا گیا ہے کہ

مومناں را تیغ با قرآں بس است؛ (اقبالؒ)

سب سے پہلے حضور نبی اکرمؐ نے اس حکومت کو قائم کیا اور وہی اس کی مرکزی اتھارٹی تھے۔ اس لئے خدا نے، حضورؐ کی اطاعت کو خود خدا کی اطاعت قرار دیا جب فرمایا کہ مَنْ يُّطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰهَ۔ (۴/۸۰) "جس نے رسولؐ کی اطاعت کی اس نے درحقیقت خدا کی اطاعت کی۔" قرآن کریم نے "اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ۔" (خدا اور رسول کی اطاعت) کا جو حکم بار بار دیا ہے[2] اس سے مراد اس نظامِ خداوندی کی اطاعت ہے جسے رسول اللہ نے متشکل فرمایا تھا[3]۔ چونکہ اطاعت درحقیقت، خدا کی یعنی خدا کی کتاب کی، مقصود تھی۔ اس لئے رسول اللہ سے کہا گیا کہ

---

[1] تفصیل کے لئے دیکھئے ۔ "اسلام میں قانون سازی کا اصول" ۔ شائع کردہ: ادارہ طلوعِ اسلام لاہور۔

فَاحْكُمْ بَيْنَهُمْ بِمَآ أَنْزَلَ اللّٰهُ (۵/۴۸)

تم ان میں کتاب اللہ کے مطابق فیصلے کرو۔

(۲) لیکن قرآنِ کریم کی صورت یہ ہے کہ اس میں چند ایک احکام تو بالتصریح دیئے گئے ہیں لیکن باقی تمام

اصول و جزئیات کی پوزیشن

ہدایات بطور اصول دی گئی ہیں۔ اس نے ان جزئیات کو خود متعین نہیں کیا۔ ایسی کتاب کو جس نے تمام بنی نوع انسان کے لئے قیامت تک مکمل اور غیر متبدل ضابطۂ حیات بننا تھا، ہونا بھی ایسا ہی چاہیئے تھا کہ اس کے اصول و اقدار تو ہمیشہ کے لئے غیر متبدل رہیں لیکن ان اصولوں کی روشنی میں، جزئی احکام، ہر زمانے کے تقاضوں اور امت کے احوال و ظروف کے مطابق مرتب ہوتے اور بدلتے رہیں۔ اس سلسلہ میں اس نے واضح طور پر کہہ دیا کہ جن احکام کو ہم نے صرف اصولی طور پر دیا ہے اور ان کی جزئیات خود مرتب کر کے نہیں دیں، اس سے یہ نہ سمجھنا کہ خدا کو ایسا کرنا چاہیئے تھا لیکن یہ (معاذ اللہ) اس سے سہواً رہ گیا ہے۔ سورۂ مائدہ میں ہے۔ يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَسْئَلُوْا عَنْ اَشْيَآءَ اِنْ تُبْدَ لَكُمْ تَسُؤْكُمْ وَاِنْ تَسْئَلُوْا عَنْهَا حِيْنَ يُنَزَّلُ الْقُرْاٰنُ تُبْدَ لَكُمْ۔ (۵/۱۰۱) "اے جماعتِ مومنین! جن امور کے متعلق کتاب اللہ خاموش ہے، ان کے متعلق خواہ مخواہ سوالات نہ کیا کرو۔ ابھی وحی کا سلسلہ جاری ہے۔ اگر تمہارے سوالات کے جواب میں، وحی کے ذریعے مزید احکام دے دیئے گئے تو ان کا نباہنا تمہارے لئے دشوار ہو جائے گا۔ سو تم بیٹھے بٹھائے اپنے اوپر مزید پابندیاں عائد کرانے کا موجب کیوں بنتے ہو۔ قَدْ سَاَلَهَا قَوْمٌ مِّنْ قَبْلِكُمْ ثُمَّ اَصْبَحُوْا بِهَا كٰفِرِيْنَ۔ (۵/۱۰۲) اس سے پہلے ایک قوم (بنی اسرائیل)، ایسی حماقت کر چکی ہے۔ اس نے خواہ مخواہ اپنے اوپر قسم قسم کی پابندیاں عائد کر کے زندگی کو ناقابلِ برداشت زنجیروں میں جکڑ لیا اور جب انہیں نباہ نہ سکے تو دین ہی سے برگشتہ ہو گئے۔ تم ایسا نہ کرنا۔ جن امور کے متعلق وحی خاموش ہے، یہ نہیں کہ ہم ان کے متعلق ہدایات دینا بھول گئے ہیں۔ ایسا دانستہ کیا گیا ہے۔ اس آیۂ جلیلہ کی تشریح نبی اکرمؐ نے اپنی ایک حدیث میں یوں فرما دی کہ اِنَّ اللّٰهَ فَرَضَ فَرَائِضَ فَلَا تُضَيِّعُوْهَا۔ وَحَرَّمَ حُرُمَاتٍ فَلَا تَنْتَهِكُوْهَا۔ وَحَدَّ حُدُوْدًا فَلَا تَعْتَدُوْهَا وَسَكَتَ عَنْ اَشْيَآءَ مِنْ غَيْرِ نِسْيَانٍ فَلَا تَبْحَثُوْا عَنْهَا۔ اللہ نے کچھ امور کو فرض قرار دیا ہے انہیں ضائع مت کرو۔ کچھ چیزوں کو حرام قرار دیا ہے، ان کے پاس تک نہ پھٹکو۔ کچھ حدود متعین کی ہیں، ان سے تجاوز نہ کرو اور دیگر امور کے متعلق دانستہ خاموشی اختیار کی ہے، ان کے متعلق کرید مت کرو۔

زبانِ وحی جن امور کے متعلق خاموشش ہے، ان میں ان احکام کی جزئیات بھی شامل ہیں جنہیں صرف اصولی طور پر بیان کیا گیا ہے اور کتاب اللہ میں بیشتر اصول ہی دیئے گئے ہیں۔ باقی رہے وہ احکام جنہیں متعین طور پر بیان کر دیا گیا ہے، ان کے متعلق بھی یہ سمجھ لینا چاہیئے کہ قرآنِ کریم نے نہ تو ان احوال و ظروف کا تعین کیا ہے جن کے مطابق ان احکام کو نافذ کیا جائے گا اور نہ ہی ان شرائط کا ذکر ہے جن سے وہ مشروط ہیں۔ (مثلاً اس میں سرقہ (چوری) کو قابلِ سزا جرم قرار دیا گیا ہے لیکن سرقہ کی قانونی تعریف (DIFINITION) خود متعین نہیں کی۔ یا (مثلاً) اس نے اضطراری حالت میں بعض حرام چیزوں کے کھانے کی اجازت دی ہے لیکن ان حالات و کیفیات کی وضاحت نہیں کی جنہیں اضطراری کہا جائے گا۔ اس نے خمر اور میسرہ کو ممنوع قرار دیا ہے لیکن ان کی نوعیتوں اور شکلوں کی تصریحات خود بیان نہیں کیں۔

بنا بریں، قرآنِ کریم نے ان احکام کی جزئیات کا تعین جنہیں اس نے اصولی طور پر بیان کیا ہے اور جن احکام کو بالتصریح بیان کیا ہے، ان کی شرائط و احوال کی تبیین، نظامِ حکومتِ اسلامی پر چھوڑ دی ہے۔ جو کچھ قرآن میں آیا ہے وہ تو ہمیشہ کے لئے غیر متبدل رہے گا لیکن ان کی تفاصیل و جزئیات، جنہیں حکومتِ قرآنی متعین کرے گی، حالات کے تقاضے کے مطابق، بدلتی رہیں گی۔ اس طرح ثبات و تغیر کے حسین امتزاج سے کتاب اللہ تمام نوعِ انسانی کے لئے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ضابطۂ زندگی بنتی چلی جائے گی۔

ان تفاصیل و جزئیات کا تعین سب سے پہلی اسلامی حکومت کے سربراہ، حضور اکرمؐ نے فرمایا۔ قرآنِ کریم میں حضورؐ سے ارشاد ہے کہ وَ شَاوِرْهُمْ فِي الْاَمْرِ (۳/۱۵۸) "امورِ مملکت میں اپنے صحابہؓ سے مشورہ کیا کرو۔" ظاہر ہے کہ جہاں تک وحیِ خداوندی کا تعلق ہے، اس میں کسی کے مشورہ کا تو ایک طرف، خود صاحبِ وحی کے ذاتی خیالات کا بھی کوئی دخل نہیں تھا۔ (۵۳/۳-۴) لہٰذا، مشورہ کا حکم، ان احکامِ خداوندی کی جزئیات و تفاصیل کے متعلق تھا جنہیں خدا نے اصولی طور پر دیا تھا یا جن کی شرائط و قیود بیان نہیں کی تھیں۔ ان جزئیات و شرائط کو حضورؐ نے اپنے زمانے کے تقاضوں اور قومِ مخاطب کے احوال و ظروف کے مطابق صحابہؓ کے مشورہ سے متعین فرمایا۔

رسول اللہؐ کی متعین کردہ جزئیات

ظاہر ہے کہ ان جزئیات و شرائط کے متعلق یہ مقصود نہیں تھا کہ وہ ہمیشہ کے لئے غیر متبدل رہیں گی۔ اگر انہیں بھی غیر متبدل رکھنا مطلوب ہوتا، تو انہیں وحی کے ذریعے، قرآن کے اندر محفوظ کر دیا جاتا۔ یا، جس طرح حضورؐ نے قرآنِ کریم مرتب اور محفوظ شکل میں اُمت کو دیا تھا، اسی طرح اپنے

فیصلوں کا مستند اور مصدقہ مجموعہ، محفوظ طور پر اُمّت کو دے جاتے لیکن نہ خدا نے قرآنِ کریم میں ان تفاصیل کا ذکر کیا اور نہ ہی رسول اللہؐ نے انہیں محفوظ طور پر اُمّت کو دیا (احادیث کے متعلق حضرت ابوبکر صدیقؓ اور حضرت عمر فاروقؓ کا طرزِ عمل باب چہارم بتایا جاچکا ہے۔ اس کی وجہ بھی یہی تھی۔) اس سے واضح ہے کہ ان جزئیات کا ہمیشہ کے لئے غیر متبدل رکھنا نہ منشائے خداوندی تھا، نہ مقصودِ رسالت۔ حضورؐ نے ان کے برعکس ایک ایسا اصول بیان فرمایا جس سے واضح ہو جاتا ہے کہ امت کے لئے، اپنے زمانے کے اسلامی نظام کے فیصلوں کا اتباع ہی مقصودِ خدا و رسولؐ تھا۔ آپؐ نے فرمایا کہ

عَلَيْكُمْ بِسُنَّتِي وَسُنَّةِ الْخُلَفَاءِ الرَّاشِدِيْنَ الْمَهْدِيِّيْنَ۔

(مشکوٰۃ۔ باب الاعتصام بالکتاب والسنۃ)

تم پر میرے طریقے اور میرے صاحبِ رشد و ہدایت جانشینوں کے طریقے کی پیروی لازم ہے۔

حضورؐ کا یہ ارشادِ گرامی قرآنِ کریم میں بیان کردہ اس حقیقت کی تبیین ہے کہ

وَمَا مُحَمَّدٌ اِلَّا رَسُوْلٌ ۚ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ ۭ اَفَاۡئِنْ مَّاتَ اَوْ قُتِلَ انْقَلَبْتُمْ عَلٰٓى اَعْقَابِكُمْ ۔ (۳/۱۴۳)

محمدؐ بجز ایں نیست کہ اللہ کے رسول ہیں۔ ان سے پہلے بھی بہت سے رسول ہو گزرے ہیں سو اگر یہ وفات پا جائیں یا قتل کر دیئے جائیں تو کیا تم (یہ سمجھ کر کہ دین کا نظام آپؐ کی ذات تک محدود تھا) پھر الٹے پاؤں پھر جاؤ گے؟

بات بالکل واضح ہے کہ دین کا نظام حضورؐ کی ذات تک محدود نہیں تھا۔ اسے آپؐ کے بعد بھی بدستور آگے چلنا تھا۔ اس نظام میں جس طرح حضورؐ کی زندگی میں، مرکزِ نظام کی اطاعت، "خدا اور رسولؐ کی اطاعت" تھی، یہی شکل حضورؐ کے جانشینوں کے زمانے میں بھی رہے گی۔ اسی نظام کو قرآنِ کریم نے "سبیل المؤمنین" کہہ کر پکارا ہے یعنی جماعت مؤمنین کا راستہ۔ (۴/۱۱۵)

ہم اس بحث میں نہیں پڑنا چاہتے کہ ایسا کیوں ہوا، لیکن (عام عقیدہ کے مطابق) خلافتِ راشدہ اوّلین چار خلفاءؓ تک محدود ہو کر رہ گئی۔ اس لئے حضورؐ نے جو فرمایا تھا کہ "تم پر میری اور میرے خلفاء راشدین کے طریقے کی پیروی لازم ہے۔" اس کا اب علی مفہوم، حضورؐ کے بعد خلفائے راشدینؓ (چار خلفاء) کی سنّت (طریق) لیا جاتا ہے لیکن یہ نہ تو حکمِ خداوندی تھا، نہ ارشادِ نبویؐ کہ خلافتِ راشدہ، چار خلفاء تک محدود رہے گی۔

دین کے نظام کا تو ہمیشہ کے لئے جاری رہنا مطلوب تھا۔ یہ اتفاق تھا (اور اُمّت بلکہ نوعِ انسانی کی بدقسمتی) کہ وہ نظام زیادہ عرصہ تک قائم نہ رہا۔ لیکن اگر وہ قائم رہتا (اور جب تک قائم رہتا) تو اس کی اطاعت "خلافتِ راشدہ" کی اطاعت قرار پاتی۔ یعنی اُمّت کے لئے اطاعت، اپنے زمانے کے نظامِ اسلامی کی لازم ہوتی، نہ کہ کسی سابقہ زمانے کے نظام کی اور اس کی وجہ حضورؐ نے خود ہی یہ کہہ کر بیان فرما دی کہ

الناس اشبہ بزمانھم من اسلافھم (جاحظ البیان والتبیین)

لوگ اپنے اسلاف کے مقابلہ میں اپنے زمانے کے زیادہ مشابہ ہوتے ہیں۔

اسی بنا پر امام ابو حنیفہؒ فرمایا کرتے تھے کہ

اگر نبی صلعم مجھے پاتے اور میں آپ کو پاتا (یعنی ہم دونوں ہمعصر ہوتے) تو آپ میرے اکثر اقوال کو اختیار فرما لیتے۔ دین اس کے سوا کیا ہے کہ وہ ایک اچھی اور عمدہ رائے کا نام ہے۔

(تاریخ بغدادی، جلد ۱۳، صفحہ ۲۹۰)

زمانے کے تقاضوں کے مطابق فیصلے

مطلب یہ ہے کہ نبی اکرمؐ، پیش آمدہ معاملات کے فیصلے، قرآن کے اصولی احکام کی روشنی میں صحابہؓ کے مشورہ سے کیا کرتے تھے۔ اگر میں (یعنی امام اعظمؒ) اس زمانے میں ہوتا تو آپ اکثر معاملات میں میری رائے قبول فرما لیتے اور اس طرح میری رائے شریعت کا حکم قرار پا جاتی۔ امام اعظمؒ کے اسی مسلک کی تشریح کرتے ہوئے بغدادی نے لکھا ہے کہ

ابو عوانہ نے بیان کیا کہ میں ایک روز ابو حنیفہؒ کے پاس بیٹھا تھا کہ سلطان کی طرف سے ایک ایلچی آیا۔ اس نے کہا کہ امیر نے پوچھا ہے کہ ایک آدمی نے شہد کا چھتہ چرا لیا ہے، اس کے بارے میں کیا حکم ہے۔ آپ نے بلا کسی ہچکچاہٹ کے جواب دیا کہ اس کی قیمت اگر دس درہم ہو تو اس کا ہاتھ کاٹ دو۔ ایلچی چلا گیا تو میں نے ابو حنیفہؒ سے کہا کہ تم خدا سے نہیں ڈرتے۔ رسول اللہ..... کا ارشاد ہے کہ پھل پھلواری کی چوری میں ہاتھ نہیں کاٹا جا سکتا۔ فوراً اس کی مدد کو پہنچیے ورنہ اس شخص کا ہاتھ کاٹا جائے گا۔ آپ نے پھر بلا کسی ہچکچاہٹ کے کہا کہ وہ حکم گزر چکا اور ختم ہو چکا ہے۔

(بغدادی، جلد ۱۳، صفحہ ۲۹۰)

مطلب واضح ہے کہ حضورؐ کا وہ فیصلہ اُس زمانے کے حالات کے مطابق تھا۔ آج حالات بدل چکے ہیں اس لئے اس فیصلہ میں بھی تبدیلی ہونی چاہیئے۔ اسی اصول کے مطابق "تعلیل الاحکام" میں آیۂ وَمَا أَرْسَلْنَاكَ إِلَّا رَحْمَةً لِّلْعَالَمِينَ۔ (۲۱/۱۰۷) کی تفسیر میں کہا گیا ہے کہ

> زمانے کے بدلنے سے نئے نئے مصالح پیدا ہوتے رہتے ہیں۔ ایسی حالت میں اگر صرف منصوص ہی کا اعتبار کیا جائے تو لوگ سخت مصیبت میں پھنس جائیں۔ یہ بات رحمت کے منافی ہوگی۔
>
> (تعلیل الاحکام صہ ۲۸۸)

یعنی حضورؐ کے رحمت للعالمین (تمام زمانوں کے لئے رحمت) ہونے کا تقاضا ہے کہ ہر زمانے کے حالات کے مطابق احکام نافذ کئے جائیں۔ امام ابن قیمؒ نے اُسے اور بھی واضح الفاظ میں بیان کیا ہے جب کہا کہ

> شریعت اللہ کا مقصود بندوں میں عدل وانصاف کا قیام ہے۔ جس طریق کے ذریعے عدل وانصاف قائم کیا جانے گا وہی دین ہوگا۔ اسے دین کے خلاف نہیں کہا جائے گا۔ (الطریق الحکمیہ)

یعنی دین کے اصول تو ہمیشہ غیر متبدل رہیں گے لیکن ان اصولوں پر عمل اپنے اپنے زمانے کے حالات کے مطابق کیا جائے گا۔ علامہ اقبالؒ نے اس اصول کے متعلق اپنے خطبات (تشکیلِ جدید) میں بڑی بصیرت افروز بحث کی ہے۔ وہ پہلے شاہ ولی اللہؒ کا قول نقل کرتے ہیں کہ

> پیغمبر کا طریق یہ ہوتا ہے کہ وہ ایک خاص قوم تیار کرتا ہے اور اسے ایک عالمگیر شریعت کے لئے بطورِ خمیر استعمال کرتا ہے۔ اس مقصد کے لئے وہ ان اصولوں پر زور دیتا ہے جو تمام نوعِ انسان کی معاشرتی زندگی کو اپنے سامنے رکھتے ہیں لیکن ان اصولوں کا نفاذ اس قوم کی عادات وخصائل کی روشنی میں کرتا ہے جو اُس وقت اُس کے سامنے ہوتی ہے۔ اس طریق کار کی رُو سے اس رسول کے احکام اس قوم کے لئے خاص ہوتے ہیں اور چونکہ ان احکام کی ادائیگی بجائے خویش مقصود بالذات نہیں ہوتی اس لئے انہیں آنے والی نسلوں پر من وعن نافذ نہیں کیا جا سکتا۔ (چھٹا خطبہ)

اس کے بعد علامہ اقبالؒ لکھتے ہیں کہ

> غالباً یہی وجہ تھی کہ امامِ اعظمؒ نے جو اسلام کی عالمگیریت کی خاص بصیرت رکھتے تھے اپنی فقہ کی تدوین میں حدیثوں سے کام نہیں لیا۔ انہوں نے تدوینِ فقہ میں استحسان کا اصول وضع کیا جسکا مفہوم یہ ہے کہ قانون وضع کرتے وقت اپنے زمانے کے تقاضوں کو سامنے رکھنا چاہیئے۔ اس سے یہ واضح

ہو جاتا ہے کہ انہوں نے اپنی فقہ کا مدار حدیثوں پر کیوں نہیں رکھا۔

اس کے بعد انہوں نے (علامہ اقبالؒ نے) لکھا ہے کہ

اسلام کا پیش کردہ تصور یہ ہے کہ حیاتِ کلّی کی روحانی اساس تو ازلی اور ابدی ہے لیکن اس کی نمود تغیرات کے پیکروں میں ہوتی ہے۔ جو معاشرہ حقیقتِ مُطلقہ کے متعلق اس قسم کے تصور پر متشکل ہو اس کے لئے ضروری ہوگا کہ وہ اپنی زندگی میں مستقل و تغیر پذیر عناصر میں موافقت پیدا کرے۔ اس کے لئے ضروری ہے کہ اس کے پاس اپنی اجتماعی زندگی کے نظم و ضبط کے لئے مستقل اور ابدی اصول ہوں۔ اسلئے کہ اس دنیا میں جہاں تغیر کا دَور دَورہ ہے، ابدی اصول ہی وہ محکم سہارا بن سکتے ہیں جن پر انسان اپنا پاؤں ٹکا سکے لیکن ابدی اصولوں کے متعلق اگر یہ سمجھ لیا جائے کہ ان کے دائرے میں تغیر کا امکان ہی نہیں۔ وہ تغیر جسے قرآن نے عظیم آیات اللہ میں شمار کیا ہے۔ تو اس سے زندگی، جو اپنی فطرت میں متحرک واقعہ ہوئی ہے، یکسر جامد و مُنصلب بن کر رہ جائے گی۔ یورپ کو عمرانی اور سیاسی زندگی میں جو ناکامی ہوئی اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کے ہاں کوئی ابدی اور غیر متبدل اصولِ حیات نہیں تھے۔ اس کے برعکس، گزشتہ پانچ سو سال میں اسلام جس قدر جامد اور غیر متحرک بن کر رہ گیا ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ مسلمانوں نے مستقل اقدار کے دائرے میں اصولِ تغیر کو نظر انداز کر رکھا ہے۔ (ایضاً)

اس کے بعد وہ لکھتے ہیں کہ:۔

یہ سوال کہ اسلامی قوانینِ شریعت میں ارتقاء کی گنجائش ہے یا نہیں، بڑا اہم ہے اور بہت سی ذہنی جدوجہد کا متقاضی۔ اس سوال کا جواب یقیناً ہاں میں ہونا چاہیئے بشرطیکہ اسلامی دنیا عمرؓ کی روح کو لے کر آگے بڑھے ـــــ وہ عمرؓ جو اسلام کا سب سے پہلا تنقیدی اور حریت پسند قلب ہے وہ جسے رسول اللہؐ کی حیاتِ ارضی کے آخری لمحات میں یہ کہنے کی جرأت ہوئی کہ

حَسْبُنَا كِتَابُ اللّٰهِ

ہمارے لئے خدا کی کتاب کافی ہے

(۰)

دَورِ فاروقی میں اس اصول پر عمل

اب ہم اُس دَور کی کچھ مثالیں سامنے لاتے ہیں (یعنی دَورِ فاروقؓ کی) جس میں یہ "روحِ عمرؓ" عملی پیکروں

میں کارفرما تھی۔ جب حضرت عمرؓ نے خلافت کی ذمہ داریاں سنبھالی ہیں تو حضورؐ کے زمانہ کو گزرے ہوئے تھوڑا سا عرصہ ہوا تھا۔ یعنی یہی دو تین برس۔ لیکن چونکہ اب مملکت کا دائرہ بہت وسیع ہو گیا تھا اس لئے حالات میں کافی تبدیلی آرہی تھی۔ اسی حقیقت کے پیشِ نظر آپ نے (حضرت عمرؓ نے) فرمایا تھا کہ

> بے شک خدائے بزرگ و برتر حالات اور زمانے کے تقاضوں سے لوگوں کے لئے نئے نئے مسائل پیدا کرتا رہتا ہے۔ (کتاب المیزان)

چنانچہ ان کا طریق کار یہ تھا کہ جب کوئی نیا معاملہ سامنے آتا آپ سابقہ ادوار کی حکومتوں، (یعنی عہدِ رسالتمآبؐ اور عہدِ صدیقیؓ) کو دیکھتے۔ اگر وہاں سے کوئی ایسا فیصلہ ملتا جو اس معاملہ کے تقاضوں کو پورا کر دیتا تو اسے من و عن نافذ کر دیتے۔ اگر اس میں کسی ترمیم و تنسیخ یا حک و اضافہ کی ضرورت ہوتی تو ترمیم شدہ فیصلہ صادر فرما دیتے اور عند الضرورت اپنا جدید فیصلہ نافذ کر دیتے اور بعض اوقات (حالات کی تبدیلی کے پیشِ نظر) خود اپنے سابقہ فیصلہ میں بھی تبدیلی کر دیتے، یعنی وحی کے متعین کردہ احکام و اصول اپنی جگہ غیر متبدل رہتے لیکن ان کے عملی نفاذ کی شکلوں اور جزئیات میں حالات کے مطابق تبدیلیاں ہوتی رہتیں۔ ثبات و تغیر کا یہی حسین امتزاج ہے جس سے اسلام ایک عالمگیر اور ابدی نظام حیات بن سکتا ہے اور عہدِ فاروقیؓ اس کی درخشندہ مثال پیش کرتا ہے۔

(۱) نظامِ مشاورت

کسی سابقہ حکم کا من و عن نافذ کر دینا کچھ بھی مشکل نہیں ہوتا، لیکن ان احکام کا اپنے زمانے کے حالات کے مطابق نافذ کرنا یا غیر متبدل اصولوں کی جزئیات کا، پیشِ نظر تقاضوں کے مطابق متعین کرنا، بڑا کٹھن مرحلہ ہوتا ہے، بالخصوص جب ان احکام و جزئیات نے دین کی حیثیت اختیار کر لی ہو۔ اسی مشکل کے پیشِ نظر، قرآنِ کریم نے رسول اللہ کو بھی حکم دیا کہ ان امور میں اپنے رفقاء سے مشورہ کیا کرو۔ (۳/۱۵۸) اور حضورؐ کے بعد اُمت سے بھی کہا کہ ان کے معاملات باہمی مشاورت سے طے پائیں گے۔ (۴۲/۳۸) یہ وجہ ہے جو دین کے نظام میں مشاورت کو بنیادی اہمیت حاصل ہے۔

یورپ نے، ملوکیت اور تھیاکریسی سے تنگ آکر، جمہوریت (ڈیماکریسی) کا نظام وضع کیا اور اس

کے حق میں ایسی ڈگڈگی بجائی کہ ساری دنیا اسے آیۂ رحمت سمجھنے لگ گئی۔ ان کی دیکھا دیکھی، مسلم اقوام نے بھی اسے اپنے ہاں رائج کر لیا اور طرفہ تماشہ یہ کہ اسے عین مطابق اسلام قرار دے دیا۔ چنانچہ آج اس نظریہ کو مسلّمہ

مغربی جمہوریّت اور اسلام

کے طور پر تسلیم کیا جاتا ہے کہ "جمہوریّت عین اسلام" ہے، بلکہ یہ کہ جمہوریّت کی طرح ہی اسلام نے ڈالی تھی۔ یہ تصور غلط اور یکسر اسلام کے خلاف ہے۔ مغربی جمہوریّت کا بنیادی اصول یہ ہے کہ اقتدارِ مطلق (SOVEREIGNTY) عوام کو حاصل ہے۔ عوام کے نمائندے جس قسم کا جی چاہے قانون مرتب کر سکتے ہیں۔ انہی کا فیصلہ حرفِ آخر ہے۔ ان سے بالا کوئی اتھارٹی نہیں۔ یہ سیکولرازم ہے جو اسلام کی نقیض ہے۔ اسلام میں اقتدارِ اعلیٰ کسی ایک ملک کے عوام یا ان کے نمائندگان تو ایک طرف، پوری نوعِ انسان کو بھی حاصل نہیں۔ اقتدارِ مطلق صرف خدا کو حاصل ہے اور اسلامی نظام (یعنی اُمّت کے نمائندگان) کتاب اللہ کی حدود کے اندر رہتے ہوئے قوانین مرتب کر سکتے ہیں۔ مغربی اندازِ جمہوریّت اور اسلام کے نظامِ مشاورت میں یہ بنیادی فرق ہے جسے کبھی نظر انداز نہیں کرنا چاہیئے۔ اسلامی نظام کو آپ "کنٹرولڈ ڈیماکریسی" کہہ سکتے ہیں یعنی وہ جمہوریّت جس پر قرآن کا کنٹرول ہو۔

قرآنِ کریم نے اُمّت کے لئے مشاورت کو ضروری تو قرار دیا، لیکن اپنے مخصوص انداز کے مطابق مشاورت

مشاورت کی مشینری

کی مشینری خود وضع نہیں کی۔ اسے اُمّت کی صوابدید پر چھوڑ دیا ہے کہ وہ اپنے زمانے کے تقاضوں کے مطابق مشاورت کا طریق کار خود متعین کرے۔ خلافتِ راشدہ کے زمانے میں زندگی بڑی سادہ سی تھی اس لئے مشاورت کی مشینری بھی کچھ ایسی وسیع و عریض نہیں تھی۔ اس کے لئے طریق کار کیا تھا، اسے ساتویں باب کے شروع میں بیان کیا جا چکا ہے۔ آپ اسے ایک نظر پھر دیکھ لیں۔ مختصراً، امیر المومنین کی مجلسِ مشاورت، اعیانِ مدینہ تک محدود تھی اور اہم معاملات میں صوبوں کے نمائندوں کو بھی بُلا لیا جاتا تھا۔ مجلسِ مشاورت میں حضرت علیؓ، حضرت عثمانؓ، حضرت عبدالرحمٰن بن عوفؓ، حضرت معاذ بن جبلؓ، حضرت ابی بن کعبؓ، حضرت زید بن ثابتؓ جیسے اولوالعزم صحابہؓ شامل تھے۔ یہ سب معمر اور پختہ کار تھے لیکن حضرت عمرؓ نوجوانوں کی بھی حوصلہ افزائی فرماتے رہتے

نوجوانوں اور عورتوں سے مشورہ

اور اکثر معاملات میں ان سے بھی مشورہ لیا کرتے۔ حتیٰ کہ عورتوں سے بھی[1]۔ عام انتظامی امور اور بند و بست کے سلسلہ میں آپ

---

[1] ابن الجوزی، بحوالہ طنطاوی، ۲۷ (مطبوعہ بیروت) صـ ۱۷۳۔

ذمی رعایا کو بھی شریکِ مشاورت کر لیتے تھے کیونکہ ان معاملات کا تعلق بیشتر ان سے ہوتا تھا[1]۔ آپ دیگر مملکتوں کے آئین و قوانین کا بھی مطالعہ کرتے رہتے تھے۔ واضح رہے کہ اس زمانے میں، غیر مسلم، بلا روک ٹوک مکہ معظمہ آتے جاتے تھے۔ (کتاب الخراج، امام یوسف۔ بحوالہ شبلی نعمانی) دیگر ممالک کے احوال و کوائف اور قوانین و ضوابط کے متعلق ان کے ذریعے بھی معلومات حاصل کی جاتی تھیں۔

اکثریت کے فیصلے

مغربی اندازِ جمہوریت میں یہ سوال بڑی اہمیت رکھتا ہے کہ سربراہِ مملکت، پارلیمان کی اکثریت کے فیصلوں کا پابند ہوتا ہے یا اسے ویٹو کے اختیارات بھی حاصل ہوتے ہیں۔ ہمارے ہاں آئین سازی کے سلسلہ میں، اس موضوع پر بڑی بحث و تمحیص ہوتی رہی اور (جیسا کہ عام طور پر ہوتا ہے) اسے اسلامی معیار کے مطابق پرکھنے کے مدعی، اپنے اپنے نقطۂ نگاہ کی تائید اور مخالفین کی تردید میں صدرِ اوّل سے اسناد پیش کرنے لگے۔ آگے بڑھنے سے پہلے، ہم اس اصول کی وضاحت کر دینا ضروری سمجھتے ہیں کہ اسلامی نظام میں یہ انداز ہی صحیح نہیں کہ جو معاملہ پیش آئے اس کے فیصلہ کے لئے صدرِ اوّل کے طریق کو بطورِ سند پیش کر دیا جائے۔ اوّل تو اُس دَور کی تاریخ میں مخالف، موافق، ہر قسم کے شواہد اور اقوال مل جاتے ہیں۔ (اور مسلمانوں میں صدیوں سے چلے آنے والے اختلافات کا بنیادی سبب یہی ہے۔) دوسرے، قرآنی نظام کی رُو سے، کسی سابقہ دَور کا کوئی فیصلہ آنے والے دَور کیلئے قولِ فیصل نہیں قرار پا سکتا۔ اُن کا فیصلہ اُن کے زمانے کے احوال و ظروف کے مطابق تھا۔ ہمارا فیصلہ، ہمارے زمانے کے تقاضوں کے مطابق ہو گا۔ سابقہ ادوار کے فیصلوں سے بطورِ نظائر تو فائدہ اٹھایا جا سکتا ہے، انہیں سند اور حرفِ آخر قرار نہیں دیا جا سکتا۔ بنا بریں، اس قسم کی بحثیں، بجز اس کے کہ ان سے اختلافات بڑھیں، کوئی مفیدِ مطلب نتیجہ مرتب نہیں کر سکتیں۔

اس سوال کے متعلق کہ سربراہِ مملکت، اکثریت کے فیصلوں کا پابند ہے یا اُسے ویٹو کا اختیار بھی حاصل ہے، صدرِ اوّل کی تاریخ میں دونوں قسم کے شواہد مل جاتے ہیں۔ ایسے واقعات بھی جن میں امیر المومنین نے اکثریت کے فیصلوں کو تسلیم کر لیا ہو ــــ حتیٰ کہ طبقات ابن سعد میں، عمالِ حکومت کے نام حضرت عمرؓ کی یہ ہدایت

---

[1] یاد رکھیئے! غیر مسلموں سے مشورہ لیا جا سکتا ہے انہیں شریکِ حکومت نہیں کیا جا سکتا۔ جس حکومت کا مقصد کتاب اللہ کے احکام کا عملی نفاذ ہو اس میں وہ لوگ کیسے شریک ہو سکتے ہیں جو اس کتاب پر ایمان ہی نہ رکھیں۔

بھی ملتی ہے کہ "جس معاملہ میں کوئی صریح حکم موجود نہ ہو اس میں صحابہؓ کی اکثریت کی رائے کے مطابق فیصلہ کرنا چاہیئے" اور حضرت صدیق اکبرؓ اور عمر فاروقؓ کے ایسے فیصلے بھی جو اکثریت کی رائے کے خلاف تھے۔ (مثلاً) رسول اللہ کی وفات کے بعد، مانعینِ زکوٰۃ کا جو پہلا معاملہ زیر غور آیا تو حضرت ابوبکرؓ کی رائے یہ تھی کہ ان کے خلاف جنگ کی جائے اور صحابہؓ کی بڑی اکثریت اس کے خلاف تھی۔ (ان میں حضرت عمرؓ بھی شامل تھے۔) لیکن حضرت ابوبکرؓ نے اکثریت کی رائے کو نظر انداز کرتے ہوئے، عمل اپنے فیصلے کے مطابق کیا۔ اور اس فیصلہ کی اطاعت، مخالف و موافق سب نے بدل و جان کی۔ (یہی اس دور کی خوبی تھی) اس ضمن میں دو اہم امور پیشِ نظر رکھنے کے قابل ہیں۔ ایک تو یہ کہ ہر معاملہ کے متعلق اصولی ہدایت قرآنِ کریم میں موجود ہوتی تھی اور فیصلہ طلب معاملہ صرف یہ ہوتا تھا کہ اس اصول پر عمل کس طرح کیا جائے۔ دوسرے یہ کہ امیر المومنین اگر اکثریت کی رائے کو مسترد کرتا تھا تو وہ ایسا دھاندلی سے نہیں کرتا تھا۔ وہ اپنے فیصلے کے حق میں دلائل و براہین پیش کرتا اور اختلاف رکھنے والوں کو مطمئن کرنے کی کوشش کرتا۔ وہ جو کچھ کرتا کھلے بندوں کرتا اور اس کے لئے قرآنی سند پیش کرتا (مثلاً جب عراق کی زمینوں کا سوال سامنے آیا ہے۔ (جس کی تفصیل معاشی نظام میں پیش کی جائے گی) تو صحابہؓ کی اکثریت نے حضرت عمرؓ کی رائے سے اختلاف کیا۔ اس پر کئی دنوں تک بحث ہوتی رہی اور بحث میں ہر شخص پوری جرأت اور بے باکی سے اپنا نقطہ نظر پیش کرتا رہا۔ (اسی کو روحِ جمہوریت کہتے ہیں)۔ اس پر بھی معاملہ جب کسی فیصلہ کن مرحلہ تک نہ پہنچ سکا تو حضرت عمرؓ نے مزید غور و فکر کے لئے مہلت چاہی۔ اس مہلت کے وقفہ کے بعد، جب انہوں نے اس مسئلہ کو مجلس مشاورت کے سامنے دوبارہ پیش کیا تو انہوں نے اس سلسلہ میں جو افتتاحی تقریر فرمائی، وہ غور طلب ہے۔

سند کتاب اللہ کی ہوتی تھی

آپ نے فرمایا:

> میں نے آپ حضرات کو اس لئے تکلیف دی ہے کہ آپ اس امانت کے بارے میں میرا ہاتھ بٹائیں جسے میرے کندھوں پر رکھ دیا گیا ہے۔ اس لئے کہ میں بھی آپ ہی جیسا ایک انسان ہوں۔ آج آپ حضرات نے حق کے مطابق فیصلہ کرنا ہے۔ بعض لوگوں نے میری مخالفت کی ہے اور بعض نے موافقت۔ میں نہیں چاہتا کہ آپ میری بات محض اس لئے مان لیں کہ وہ میری بات ہے۔ آپ لوگوں کے پاس کتابِ خداوندی ہے جو حق کے ساتھ بات کرتی ہے۔ اگر میں بھی کسی معاملہ میں لب کشائی کرتا ہوں تو حق کے لئے ایسا کرتا ہوں۔

اس کے بعد آپ نے فرمایا کہ اس دوران میں غور و فکر کے بعد مجھے قرآنِ کریم سے ایسی راہ نمائی مل گئی ہے،

جس کی روشنی میں اس مسئلہ کا حل بآسانی ہو سکتا ہے اور وہ یہ آیات ہیں۔ اس پر مخالفین نے کہا کہ اب ہمارا سینہ بھی کشادہ ہو گیا ہے اور ہم آپ سے اتفاق کرتے ہیں۔ یہ تھا اختلافی امور میں انداز اپنی رائے کے پیش کرنے کا اور اسی بنا پر حضرت ابن مسعودؓ فرمایا کرتے تھے کہ

جب عمرؓ کوئی راہ اختیار کر لیتے تو وہ بات ہمارے لئے آسان ہو جاتی تھی۔

اس کے باوجود، آپ اپنی رائے اور وحی کے بنیادی فرق کو ہمیشہ ملحوظ رکھتے تھے۔ آپ نے ایک دفعہ کسی

وحی اور اپنی رائے میں فرق

معاملہ میں رائے دی تو کسی نے کہا کہ یہ " اللہ اور عمرؓ کی رائے ہے۔" آپ نے اسے فوراً ڈانٹا اور فرمایا کہ "تو نے یہ بہت بڑی بات کہی ہے۔ یہ صرف عمرؓ کی رائے ہے۔ اگر درست ہے تو اللہ کی طرف سے ہے، اور غلط ہے تو عمرؓ کی طرف سے۔" اس کے بعد تھوڑی دیر کے لئے خاموش رہے اور پھر فرمایا کہ "یاد رکھو! رائے غلط بھی ہو سکتی ہے، اسے اُمت کے لئے سنّت نہ بناؤ۔" اس باب میں وہ اس قدر محتاط تھے کہ اپنی زندگی کے آخری سانس میں، جب جسم سے اس قدر خون بہ رہا تھا اور آپ درد کی شدت سے نڈھال تھے، آپ نے اپنے بیٹے (حضرت عبداللہ بن عمرؓ) سے کہا کہ " وہ ہڈی لاؤ، جس پر میں نے دادا کے حصّہ کے متعلق کچھ لکھا تھا۔" اس سے مقصد یہ تھا کہ اس تحریر کو مٹا دیا جائے۔ بیٹے نے کہا کہ آپ اس وقت سخت تکلیف میں ہیں، یہ کام آپ کی طرف سے ہم بھی کر سکتے ہیں لیکن آپ نے سختی سے کہا کہ تم اس کی اہمیت اور میری ذمہ داری کو نہیں سمجھتے۔ جاؤ، وہ ہڈی لاؤ۔ چنانچہ آپ اطمینان سے نہ بیٹھے جب تک وہ ہڈی نہ آگئی اور آپ نے اپنی تحریر کو اپنے ہاتھوں سے نہ مٹا ڈالا ـــــ احتیاط یہ تھی کہ عمرؓ کی رائے بعد میں آنے والوں کے لئے سند نہ بن جائے۔

آیئے اب ہم دیکھیں کہ خدا کی وحی اور اپنی رائے میں فرق کرنے والوں کے دور میں قانون سازی کا طریق کار کیا تھا ـــ یہ گوشہ گہری توجہ اور غور و فکر کا متقاضی ہے کہ اس میں ثبات و تغیّر کا وہ امتزاج جو دین کی ابدیّت کا ضامن ہے، بڑے حسین انداز میں نکھر کر ہمارے سامنے آتا ہے۔

۲۔ قانون سازی کا طریق

ہو کوہ و بیاباں سے ہم آغوش و لیکن
ہاتھوں سے تیرے دامنِ افلاک نہ چھوٹے

اسلامی مملکت کے متعلق ہم دیکھ چکے ہیں کہ وہ قرآنی احکام وضوابط کی تنفیذ اور اس کے اصول واقدار کی ترویج کا ذریعہ ہے۔ اس کے لئے اس کا طریق کار یہ ہے کہ ہر دَور کی حکومت:

(۱) اپنے سے پہلے دَور کی حکومت کے فیصلوں کو علیٰ حالہٖ قائم رکھتی ہے۔

(۲) لیکن اگر زمانے کے بدلے ہوئے حالات کے مطابق، ان میں کسی ردّ و بدل کی ضرورت ہوتی ہے تو وہ ان میں مناسب ترمیم و تنسیخ اور حک و اضافہ کر دیتی ہے اور

(۳) اگر کسی معاملہ کے متعلق پہلے سے کوئی فیصلہ موجود نہ ہو تو وہ نیا فیصلہ صادر کر دیتی ہے لیکن

(۴) سابقہ فیصلوں میں تغیّر و تبدل ہو یا کسی نئے فیصلہ کا صدور، اس کا کوئی اقدام قرآنی حدود سے تجاوز نہیں کر سکتا۔ اقبالؒ کے الفاظ میں، اس کی کیفیت یہ ہوتی ہے کہ آزادی کی فضائے بسیط میں اڑنے والے پرندے کی طرح:

بپرد در وسعتِ گردوں یگانہ نگاہِ اُو بشاخِ آشیانہ

یہ "شاخِ آشیانہ" خدا کی کتابِ عظیم تھی جسے اس نے حبل اللہ (اللہ کی محکم رسّی) اور عروۃ الوثقیٰ (ناقابلِ شکست سہارا) کہہ کر پکارا ہے۔ اس "سہارے" کو حضرت عمرؓ نہایت مضبوطی سے تھامے ہوئے تھے۔ انہوں نے جابیہ کے خطبہ میں فرمایا:

قرآن کے مطابق احکام

مجھے اللہ نے جو حکومت عطا کی ہے اس کی اصلاح صرف تین چیزوں سے ہو سکتی ہے۔ امانت کی ادائیگی، مجرمین اور مخالفین کی، قوت کے ساتھ گرفت اور کتابِ خداوندی کے مطابق حکم دینا۔

اپنے ایک اور خطاب میں فرمایا۔

حاکم کا سب سے بڑا فرض یہ ہے کہ وہ دیکھے کہ رعایا ان فرائض کا لحاظ کر رہی ہے یا نہیں جو اللہ نے ان پر عائد کر رکھے ہیں۔ ہم تمہیں انہی باتوں کا حکم دینگے جن کا اللہ نے حکم دیا ہے اور ان چیزوں

سے روکیں گے جن سے اللہ نے روکا ہے۔

یہ واقعہ مشہور ہے کہ جب حضرت عمرؓ نے دیکھا کہ لوگ اپنی بیویوں کا مہر مقرر کرنے میں بڑی افراط سے کام لے رہے ہیں تو آپ نے ایک اجتماع میں اس کا ذکر کیا اور چاہا کہ مہر کی زیادہ سے زیادہ حد مقرر کر دی جائے۔ اس پر ایک کونے سے ایک عورت کی آواز آئی کہ یہ کیا؟ اللہ تعالیٰ نے تو فرمایا ہے کہ وَ اٰتَیْتُمْ اِحْدٰىهُنَّ قِنْطَارًا فَلَا تَاْخُذُوْا مِنْهُ شَیْــٴًـا۔ (۴/۲۰) "اور تم نے بیویوں میں سے کسی کو ڈھیروں مال بھی دے دیا ہو تو اس میں سے کچھ واپس نہ لو۔" حضرت عمرؓ یہ سنکر بول اٹھے کہ عورت نے سچ کہا ہے، عمرؓ غلطی پر تھا۔

(ضمناً) ہم سمجھتے ہیں کہ اگر یہ روایت صحیح ہے تو حضرت عمرؓ نے یہ بات اصولِ مساوات کی اہمیت اور قرآن کے مطابق رہنے کے سلسلہ میں لوگوں کی حوصلہ افزائی کے لئے کہی ہوگی، ورنہ قرآن کے اس حکم سے یہ لازم نہیں آتا کہ مہر پر کوئی پابندی عائد نہیں کی جا سکتی۔ اوّل تو اس آیت میں صرف یہ کہا گیا ہے کہ تم جس قدر مہر مقرر یا ادا کر چکے ہو، اس میں سے کچھ واپس نہیں لے سکتے۔ دوسرے یہ کہ قرآن نے جس بات کو مطلق (بلا قیود و شرائط) چھوڑا ہے، اسلامی نظام، مصالحِ امت کے پیشِ نظر اسے مقید کر سکتا ہے یعنی اس پر شرائط عائد کر سکتا ہے۔ بہرحال، یہ ایک ضمنی گوشہ تھا۔ ہم کہہ یہ رہے تھے کہ خلافتِ فاروقیؓ میں بھی اصلاً و اساساً اطاعت احکامِ خداوندی ہی کی تھی۔ باقی رہیں ان احکام کی جزئیات اور ان کے تعین کا طریقِ کار، سو اس باب میں حضرت عمرؓ نے اصولاً ان فیصلوں کو برقرار رکھا جو ان سے پہلی حکومتوں (عہدِ رسالتمآبؐ اور دورِ صدیقیؓ) نے صادر کئے تھے، لیکن تغیرِ حالات کے ماتحت جن فیصلوں میں کسی تبدیلی کی ضرورت محسوس ہوئی، ان میں تبدیلی بھی کر دی۔ کتبِ روایات میں ان اختلافی فیصلوں کی تفاصیل موجود ہیں۔ ہم ان میں سے چند ایک بطور مثال پیش کرتے ہیں:-

اختلافی فیصلے

(۱) سب سے پہلی مثال تو وہ ہے جو آج تک اہلِ حدیث اور اہلِ فقہ حضرات میں مابہ النزاع چلی آرہی ہے۔ روایات میں ہے کہ اگر کوئی شخص بیک وقت تین دفعہ طلاق کہہ دے، تو رسول اللہؐ اور حضرت صدیقؓ کے زمانے تک اسے ایک طلاق ہی شمار کیا جاتا تھا۔ حضرت عمرؓ کے ابتدائی زمانۂ خلافت میں دو سال تک یہی قانون رہا لیکن اس کے بعد حضرت عمرؓ نے دیکھا کہ لوگ اس باب میں بڑے غیر محتاط ہوتے جا رہے ہیں تو انہوں نے فیصلہ کیا کہ ایسی طلاقیں تین شمار ہوں گی (یعنی یہ ایسی طلاق

متصور ہو گی جس کے بعد یہ میاں بیوی آپس میں نکاح نہیں کر سکیں گے۔

(ضمناً، ہماری بصیرت کے مطابق، قرآنِ کریم کی رُو سے "تین طلاقوں" کا مفہوم اور قاعدہ کچھ اور ہے۔ اس کی وضاحت میری کتاب "قرآنی قوانین و اقدار" میں ملے گی۔ اس روایت کو جس مقصد کے لئے درج کیا گیا ہے، وہ ذرا آگے جا کر سامنے آئے گا۔)

(۲) رسول اللہ کے زمانے میں قانون یہ تھا کہ اگر کوئی غیر مسلم، اسلام قبول کر لیتا تو جائیدادِ منقولہ اور غیر منقولہ اس کے پاس رہتی لیکن حضرت عمرؓ نے اس میں یہ تبدیلی کر دی کہ اس کی جائیدادِ غیر منقولہ اس بستی کے غیر مسلموں میں تقسیم کر دی جاتی اور اس کی کفاف کے لئے حکومت کی طرف سے (باقی مسلمانوں کی طرح) وظیفہ مقرر کر دیا جاتا۔

(۳) رسول اللہ کے زمانے میں شراب خوار کو جوتے وغیرہ مار کر چھوڑ دیا جاتا تھا۔ حضرت ابوبکر صدیقؓ نے شرابی کی سزا چالیس کوڑے مقرر کی اور حضرت عمرؓ نے اُسے بڑھا کر اسّی کوڑے کر دیا۔

(۴) حضرت عمرؓ نے قحط کے زمانے میں چوری کی سزا موقوف کر دی۔ نیز ہم یہ بھی دیکھ چکے ہیں کہ جن غلاموں نے بھوک سے مجبور ہو کر ایک شخص کی اونٹنی ذبح کر کے کھالی تھی، آپ نے انہیں سزا نہیں دی تھی بلکہ ان کے مالک پر تاوان عاید کر دیا تھا۔ (واضح رہے کہ قرآنِ کریم میں چوری کی سزا بغیر کسی شرط کے مقرر کی گئی ہے آپ نے اسے مشروط بہ حالات کر دیا) نیز آپ نے جنگ کے دوران سزا دینے سے بھی منع کر دیا۔

(۵) قرآنِ کریم نے صدقات میں مؤلفۃ القلوب کا حصہ رکھا تھا۔ یعنی جن لوگوں کو اسلام قبول کرنے پر کسی قسم کا ناقابلِ برداشت نقصان پہنچے، ان کے نقصان کی تلافی کے لئے حکومت ان کی مالی امداد کرے۔ یہ حکم عہدِ رسالتمآبؐ اور دورِ صدیقی میں جاری رہا لیکن حضرت عمرؓ نے یہ کہہ کر اسے بند کر دیا کہ اب مسلمانوں کے حالات بہت بہتر ہو گئے ہیں، اس لئے اس امداد کی ضرورت نہیں رہی۔

(۶) ارکانِ حج میں رَمل بھی ایک رکن ہے۔ یعنی طواف کے وقت، پہلے تین چکر ذرا تیز چل کر لگائے جاتے ہیں۔ اس کی ابتداء یوں ہوئی کہ رسول اللہ جب مکہ سے مدینہ تشریف لائے تو مخالفین نے مشہور کر دیا کہ وہاں جا کر مسلمان بہت کمزور ہو گئے ہیں۔ اس پر حضورؐ نے مسلمانوں سے کہا کہ وہ طواف میں ذرا اکڑ کر تیز چلا کریں تاکہ مخالفین دیکھ لیں کہ ہم یہاں آ کر کمزور نہیں ہو گئے۔ اس سے یہ روش حج کا ایک رکن (ضروری معمول) بن گئی لیکن حضرت عمرؓ نے اپنے زمانہ میں کہا کہ اب ہمیں ایسا کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ نہ وہ حالات

رہے، نہ وہ مصلحت، نہ وہ مخالفین رہے نہ ان کا طنز۔ اب ہمیں معمول کے مطابق طواف کرنا چاہیئے۔

(۷) قرآنِ کریم نے مسلمانوں کے لئے اہلِ کتاب کی عورتوں سے نکاح اور ان کے ہاں کا کھانا حلال قرار دیا ہے لیکن حضرت عمرؓ نے ان کی عورتوں سے، یہ کہہ کر نکاح کو ممنوع قرار دے دیا کہ یہ عورتیں مسلمانوں کے معاشرہ میں فتنہ کا باعث بن جاتی ہیں اور مسلمانوں کی بستیوں سے یہود و نصاریٰ کے ذبیحہ خانے یہ کہہ کر بند کرا دیئے کہ اب ہمیں ان کی ضرورت نہیں رہی۔

(۸) حضرت عمرؓ نے اُمِ ولد (یعنی وہ لونڈی جس کے مالک سے اسے اولاد ہو گئی ہو۔) کی بیع ممنوع قرار دے دی حالانکہ رسولؐ اللہ اور حضرت ابوبکرؓ کے زمانے میں اس کی ممانعت نہیں تھی۔ (واضح رہے کہ یہ حکم ان لونڈیوں کے متعلق تھا جو اسلام سے پہلے عربوں کے معاشرہ میں موجود تھیں۔ "غلام اور لونڈیوں" کے متعلق تفصیلی بحث چھٹے باب میں آ چکی ہے۔)

(۹) اس سلسلہ کی سب سے اہم مثالیں دو (اور) ہیں۔ ایک، عراق کی زمینوں کے متعلق فیصلہ۔ اس اہم واقعہ کی تفصیل تو ہم "معاشی نظام" سے متعلق باب میں بیان کریں گے۔ اس وقت صرف اتنا کہہ دینا کافی ہو گا کہ (جیسا کہ اس سے پہلے بھی ضمناً لکھا جا چکا ہے) رسولؐ اللہ اور خلافتِ صدیقیؓ میں قانون یہ تھا کہ مالِ غنیمت مجاہدین میں تقسیم کر دیا جاتا تھا۔ فتحِ عراق کے وقت، مالِ غنیمت میں کثیر مزروعہ زمینیں بھی ملیں۔ سابقہ قاعدہ کے مطابق، مطالبہ ہوا کہ انہیں بھی سپاہیوں میں تقسیم کر دیا جائے لیکن حضرت عمرؓ نے اس سے اختلاف کیا اور کہا کہ ان زمینوں کی پیداوار پر ساری امت اور آنے والی نسلوں کی پرورش کا دارومدار ہے اس لئے انہیں انفرادی ملکیت میں نہیں دیا جا سکتا۔ یہ مملکت کی تحویل میں رہیں گی۔ کافی بحث و تمحیص کے بعد، فیصلہ حضرت عمرؓ کا برقرار رہا۔ یہ سابقہ قانون سے بڑا اہم اختلاف تھا۔

دوسری مثال، افرادِ امت کے وظائف کے تعین کا معیار تھا۔ رسولؐ اللہ اور حضرت صدیقِ اکبرؓ کے زمانے میں اس کا معیار، ہر فرد یا خاندان کی معاشی ضرورت تھا۔ حضرت عمرؓ نے اس قانون کو بدل دیا اور اسلام کی خدمت کے لحاظ سے مدارج مقرر کر کے انہیں وظائف کا معیار قرار دے دیا۔ یہ اختلاف بھی بہت اہم تھا جس کی تفصیل "معاشی نظام" میں پیش کی جائے گی۔ وہیں یہ بھی بتایا جائے گا کہ ہماری قرآنی بصیرت کے مطابق یہ حضرت عمرؓ کی اجتہادی غلطی تھی جس کا بعد میں انہیں خود بھی احساس ہو گیا، لیکن قبل اس کے کہ

وہ اس کا ازالہ کرتے، ان کی شہادت ہوگی۔

(٠)

یہ ان امور کی چند ایک مثالیں ہیں جن میں، حضرت عمرؓ نے عہدِ رسالتمآبؐ اور دورِ صدّیقی کے فیصلوں سے اختلاف کیا۔ ان کے علاوہ، جو نئے امور سامنے آئے ان کے متعلق آپ نے (پہلی بار) اپنے فیصلے صادر فرمائے۔ انہیں حضرت عمرؓ کی "اوّلیات" کہا جاتا ہے اور ان کی فہرست طول طویل ہے۔ ظاہر ہے کہ جب مملکت کی وسعت اس قدر بڑھ گئی تھی اور نئے نئے امور نہایت تیزی سے سامنے آ رہے تھے، تو مملکت کے لئے ضروری تھا کہ ان کے تصفیہ کیلئے ضروری احکام نافذ اور قواعد و ضوابط منضبط کرے۔ ان میں سے چند ایک (تمثیلاً) درج ذیل کئے جاتے ہیں۔

اوّلیاتِ حضرت عمرؓ

(۱) خزانہ قائم کیا۔ (۲) سنِ ہجری رائج کیا۔ (۳) دفاتر قائم کئے اور رجسٹر مرتب کرائے۔ (۴) مردم شماری کرائی۔ (۵) شہر آباد کرائے، نہریں کھدوائیں۔ (۶) عشورہ (یعنی محصول چنگی) کی ابتدا کی۔ (۷) دریائی پیداوار اور گھوڑوں پر زکوٰۃ (حکومت کا ٹیکس) عائد کیا۔ (۸) نمازِ تراویح جماعت سے قائم کی۔ (۹) نمازِ فجر کی اذان میں اَلصَّلوٰةُ خَيْرٌ مِّنَ النَّوْمِ کا اضافہ کیا۔ (۱۰) مساجد میں روشنی کا انتظام کرایا۔ وغیرہ ذالک۔

(٠)

حاصلِ بحث

ان تفصیلات سے آپ نے دیکھ لیا ہوگا کہ اسلامی نظام میں:۔

(۱) قانون کا سرچشمہ، قرآنِ کریم ہے۔ اس کے احکام، اصول اور اقدار سب غیر متبدّل ہیں، ان میں کسی قسم کے تغیّر و تبدّل کا کسی کو حق حاصل نہیں۔

(۲) جن امور کو قرآن نے جائز قرار دیا ہے، اگر اسلامی نظام چاہے تو (بہ تقاضائے حالات) انہیں ممنوع قرار دے سکتا ہے۔ یاد رہے کہ اسلامی نظام انہیں ابداً حرام قرار نہیں دے سکتا۔ مصالحِ اُمّت کے مطابق ان پر وقتی پابندی عائد کر سکتا ہے، نہ ہی وہ کسی حرام کو حلال قرار دے سکتا ہے۔

(۳) جن احکام کو قرآن نے مطلق (بلا شرائط و قیود) بیان کیا ہے، اسلامی نظام ان پر عندالضرورت، قیود اور شرائط عائد کر سکتا ہے اور بعض احکام کو وقتی طور پر ساقط العمل بھی قرار دے سکتا ہے۔

(۴) سابقہ ادوار کے فیصلوں میں، خواہ وہ رسول اللہؐ کے زمانے میں ہی کیوں نہ صادر ہوئے ہوں، ردّ و بدل کر سکتا ہے اور بعض فیصلوں کو منسوخ بھی کر سکتا ہے۔

(۵) نئے پیش آمدہ معاملات کے متعلق نئے احکام بھی صادر کر سکتا ہے۔

یہ ہے اسلامی حکومت میں قانون سازی کا اصول۔ اس مقام پر اتنا سمجھ لینا ضروری ہے کہ احکام و قوانین میں کسی قسم کا ردّ و بدل، یا حک و اضافہ، صرف اسلامی نظامِ حکومت کر سکتا ہے۔ کسی فرد یا کسی جماعت کو اس کا حق حاصل نہیں ہو سکتا۔ اس باب میں حضورؐ کا ارشادِ گرامی واضح ہے کہ

رسول اللہؐ نے فرمایا کہ فیصلہ کرنے کا حق امیر کو حاصل ہے یا اسے جسے امیر اس مقصد کے لئے مقرر کرے۔

حضرت عمرؓ نے اس کی تشریح میں فرمایا تھا کہ

یہ کام اس کے لئے رہنے دینا چاہیئے جو اس کے نفع و ضرر کا ذمہ دار قرار پا سکتا ہے۔

یہ تھا اسلامی نظام میں قانون سازی کا اصول۔ لیکن جب (بعد میں) مسلمانوں کی گاڑی دوسری پٹڑی پر جا پڑی، تو پھر یہ تمام اصول بدل گئے۔ اُس وقت، نہ اسلامی نظامِ حکومت باقی رہا نہ اس کا مرکز۔ دین اور سیاست میں ثنویت پیدا ہو گئی۔ امورِ سیاست، حکومت نے اپنی تحویل میں لے لئے، اور مذہبی امور علماء کے سپرد کر دیئے۔ "مذہبی امور" سے مراد تھی عقائد کی بحث اور پرسنل لاز (شخصی قوانین)۔ بالفاظِ دیگر، اُس وقت، اسلام (دین کے بجائے) مذہب بن کر رہ گیا اور مسلمانوں کی حکومت سیکولر ہو گئی...... مملکت کے معاملات میں فرمانرواؤں نے اپنی من مانی کی اور مذہبی امور میں علماء اور فقہائے نے اپنا حکم چلایا۔ اُمت کے مرکز (اسلامی نظام) کے خاتمے کا لازمی نتیجہ تھا کہ اُمت میں فرقے پیدا ہو جاتے ــــ فرقے، جن کے وجود کو قرآن نے شرک قرار دیا ہے۔ (۳۰/۳۱) چنانچہ فرقے پیدا ہوئے اور ہر فرقے نے اپنے اپنے مسلک کے مطابق فتوے دینے شروع کر دیئے۔ یہ سلسلہ صدیوں سے چلا آ رہا ہے۔

پاکستان میں

تشکیلِ پاکستان کا بنیادی مقصد یہ تھا کہ یہاں پھر سے صدرِ اوّل کے اسلامی نظام کا احیا کیا جائے۔ اس سلسلہ میں سب سے پہلا سوال قانون سازی کا تھا۔ جب یہ بحث چھڑی تو اسلامی نظام کا تصوّر کسی کے سامنے نہیں تھا۔ اس لئے ہر فرقہ نے اپنی اپنی بات کہنی شروع کر دی۔

(۱) ایک فرقے نے کہا کہ جو کچھ کتبِ احادیث میں درج ہے، اسلامی حکومت کو اس کا حق نہیں پہنچتا کہ اس میں سے کسی حکم کو معطل یا منسوخ کر دینا تو درکنار، اس میں کسی قسم کا ردّ و بدل بھی کر سکے۔ ایسا کرنا انکارِ سُنّت ہوگا۔ نیز اسلامی حکومت کو اس کا حق بھی حاصل نہیں کہ وہ کوئی نیا حکم نافذ کر سکے۔ یہ بدعت ہوگی، جس کی دین میں قطعاً اجازت نہیں۔

(۲) دوسرے فرقے نے کہا کہ جو کچھ ہمارے ائمہ فقہ نے فیصلہ کر دیا ہے، اسلامی حکومت کے لئے ضروری ہے کہ وہ من وعن ان فیصلوں کو نافذ کرے۔ ان میں کسی قسم کے تغیر و تبدل کا اسے حق حاصل نہیں۔

جدید امور کے متعلق ان میں سے بعض لوگ اتنی اجازت دیتے ہیں کہ اسلامی حکومت، فقہا کے فیصلوں کی روشنی میں نئے احکام نافذ کر سکتی ہے لیکن دوسرے حضرات اس کی بھی اجازت نہیں دیتے۔ وہ کہتے ہیں کہ اب اجتہاد کا دروازہ یکسر بند ہے۔

(۳) جہاں تک قرآنی احکام کا تعلق ہے، اہلِ حدیث کا عقیدہ ہے کہ رسول اللہ کی حدیث، قرآنی حکم کو منسوخ کر سکتی ہے[۱] اور اہلِ فقہ کا عقیدہ کہ اگر قرآن کی کوئی آیت، ان کے ائمہ کے کسی فیصلہ کے خلاف ہو، تو اوّل تو اس آیت کی ایسی تاویل کرنی چاہیئے جو ائمہ کے فیصلہ کے مطابق ہو اور اگر ایسا نہ ہو سکتا ہو تو قرآن کی آیت کو منسوخ سمجھنا چاہیئے۔ (تاریخِ فقہِ اسلامی، علامہ خضری ص۴۲۱)

(ان امور پر تفصیلی بحث آخری باب میں ہوگی)

اس وقت ہمارے علماء کرام کا یہی مسلک ہے اور تعجب ہے کہ اہلِ حدیث حضرات ہوں یا اہلِ فقہ، حضرت عمرؓ کو مومنِ حقا اور خلیفہ راشد تسلیم کرتے ہیں اور ان کے عہدِ خلافت کو اسلامی حکومت کا بہترین آئینہ دار قرار دیتے ہیں۔

ان حضرات کا جو مسلک اوپر بیان کیا گیا ہے اور جس کے متعلق انہیں اصرار ہے کہ وہ عین اسلام ہے، ظاہر ہے کہ اس کی رُو سے قانون سازی کے سلسلہ میں کوئی حکومت بھی، دورِ حاضر کے تقاضوں کو پورا نہیں کر سکتی۔ لیکن چونکہ (اس پچیس سال میں) کسی حکومت میں اس کی جرأت نہیں تھی کہ وہ ..... عہدِ فاروقی کی نظیر پیش کر کے، قانون سازی کے لئے صحیح اسلامی طریق اختیار کرے اور اس طرح علماء حضرات سے جھگڑا

---

[۱] مثلاً قرآن کی آیت متعلقہ وصیت کو ایک حدیث نے منسوخ کر دیا ہے۔ (ملاحظہ ہو "فتنہ انکارِ حدیث" از علامہ محمد ایوب مرحوم ص۸۵)

مول لے۔ اس لئے انہوں نے اسی میں مصلحت سمجھی کہ آئین میں تو یہ الفاظ درج کر دیئے جائیں کہ "پاکستان میں کوئی قانون کتاب و سنت کے خلاف نہیں ہوگا" لیکن عملاً وہی کچھ ہونے دیا جائے جو ہو رہا ہے۔ لہٰذا، ہم آج بھی اُسی مقام پر کھڑے ہیں جہاں انگریز کے عہدِ حکومت میں تھے۔ (اس سلسلہ میں راقم الحروف اپنے اقدامات کا تذکرہ کرنے کے لئے قارئین سے معذرت خواہ ہے۔)

میں نے جرأت کی اور کہا کہ قانون سازی کے لئے ہمارے سامنے عہدِ فاروقیؓ بہترین نمونہ ہے۔ ہمیں ان اصولوں کے مطابق ضابطۂ قوانین مرتب کر لینا چاہیئے۔ علماء حضرات نے اُسے "انکارِ سنت" قرار دے کر کفر کا فتویٰ صادر کر دیا اور اس کے بعد مطمئن ہو کر بیٹھ گئے — اسلامی ضابطۂ قوانین نہ بننا تھا، نہ بنا، نہ بن سکے گا۔ اس کا اعتراف خود ان حضرات نے بھی کر لیا ہے کہ کتاب و سنت کی رُو سے کوئی ایسا ضابطۂ قوانین مرتب نہیں ہو سکتا جو تمام فرقوں کے نزدیک قابلِ قبول ہو۔[1] یہ اعتراف بھی ہے اور اس پر اصرار بھی کہ ضابطۂ قوانین "کتاب و سنت کے مطابق مرتب ہونا چاہیئے۔ یا للعجب!

یاد رکھئے! وہی اسلامی حکومت، اسلامی ضابطۂ قوانین مرتب کر سکے گی جو خلافتِ فاروقیؓ کو اپنے لئے اُسوہ (نمونہ) قرار دے کر وہ عہد، عہدِ رسالتمآبؐ اور عہدِ صدیقی دونوں کو اپنے اندر سموئے ہوئے ہے۔

لیکن ایسا وہی کر سکے گا جو صرف خدا کے احکام کی خلاف ورزی سے ڈرے، علماء حضرات کے کفر کے فتوؤں سے نہ ڈرے۔ اس مقام پر ہم ایک بار پھر اقبالؒ کے الفاظ دہرا دینا چاہتے ہیں کہ:

ایسا وہی حکومت کر سکے گی جو رُوحِ عمرؓ کو لے کر آگے بڑھے۔
معلوم نہیں اس کی سعادت کس ملک کے حصے میں آئے گی۔

آوازۂ حق اٹھتا ہے کب اور کدھر سے
مسکیں دلکم ماندہ دریں کشمکش اندر

═══ (۵) ═══

---

[1] "اگر مسلمانوں کی ایک متحدہ اسلامی ریاست قائم ہونے کے لئے یہ شرط قرار دے دی جائے کہ ملک میں جتنے مختلف مسلکوں کے مسلمان موجود ہیں وہ سب کسی ایک مسلک پر متفق ہو جائیں تو یہ شرط نہ کبھی پوری ہوگی نہ اس شرط کے ساتھ دنیا میں کوئی اسلامی ریاست قائم ہو سکے گی۔ ... "کتاب و سنت کی کوئی ایسی تعبیر ممکن نہیں جو ہر مسلک لا کے معاملے میں حنفیوں، شیعوں اور اہلحدیث کے درمیان متفق علیہ ہو۔" (ابوالاعلیٰ مودودی صاحب، بحوالہ ایشیا، ۲۳ اگست ۱۹۷۰ء)

۲۔ قانون سازی ہی نہیں ــــ سیرت سازی بھی

آنچہ حق می خواہد آں سازد ترا

حضرت عمرؓ اس حقیقت سے بھی باخبر تھے کہ قانون خواہ کیسا ہی مکمّل، جامع اور استقام سے منزّہ کیوں نہ ہو، وہ کبھی صحیح نتائج پیدا نہیں کر سکتا جب تک اس قانون کو نافذ کرنے والوں کی سیرت صحیح سانچوں میں نہ ڈھلی ہو۔ بنابریں، وہ قانون سازی کے ساتھ ساتھ، ان انسانوں کی سیرت و کردار پر بھی کڑی نگاہ رکھتے تھے جنہوں نے ان قوانین کو عملاً نافذ کرنا تھا۔ اس میں شک نہیں کہ آپ کے رفقاء کا گروہ بھی ان مہاجرین و انصار پر مشتمل تھا، جن کے مومنِ حقا ہونے کی شہادت خود قرآن نے دی تھی (۸/۷۴) لیکن مومنین کے متعلق قرآن نے کہا ہے کہ وہ "کبائر الاثم" (بڑے بڑے عیوب و جرائم) سے مجتنب رہتے ہیں۔ البتہ معمولی لغزشوں (لَمَم) کا ان سے امکان ہو سکتا ہے۔ (۵۳/۳۲) اس قسم کی معمولی لغزشیں، عام لوگوں کی صورت میں کوئی خاص مضر اثر پیدا نہیں کرتیں (کیونکہ ان کے اعمال و افعال کا اثر متعدی نہیں ہوتا) لیکن جن اربابِ نظم و نسق کے ہاتھ میں لاکھوں (کروڑوں) انسانوں کا حال اور مستقبل ہو، اور ان کی قیادت کی اہم ذمہ داری جن کے کندھوں پر، ان کے لئے اس قسم کی عام لغزشوں سے بچنا بھی نہایت ضروری ہوتا ہے۔ یہ وجہ تھی جو حضرت عمرؓ اپنے ان جلیل القدر رفقاء کی ہر نقل و حرکت پر نگاہ رکھتے تھے ــــ سب سے پہلے، خود اپنے آپ پر، اور اس کے بعد ان عمّالِ حکومت پر۔ صدرِ اوّل کے اسلامی نظام نے جو اس قدر ابد در کنار درخشندہ و تابناک، انسانیت ساز، نتائج پیدا کئے تھے تو اس کی وجہ، قوانینِ حکومت کے مبنی بر حق ہونے کے علاوہ، اعیان و ارکانِ حکومت کی پاکیزگیٔ سیرت اور بلندیٔ کردار بھی تھی اور یہی وجہ تھی جو حضرت عمرؓ ان کے انتخاب میں بڑی احتیاط برتتے تھے۔

عمّالِ حکومت کے انتخاب کا معیار

قرآنِ کریم چونکہ اس نظام کا نقطۂ پرکار تھا، اس لئے، عمّال کے انتخاب میں، قرآنی علم کو بنیادی خصوصیت قرار دیا جاتا تھا۔ (جیسا کہ پہلے بھی لکھا جا چکا ہے۔) مکّہ کے گورنر، نافع بن عمر بن عبد الحارث آپ سے ملے تو آپ نے پوچھا کہ تم نے اہلِ وادی پر کسے حاکم مقرر کیا ہے۔ انہوں نے کہا کہ عبد الرحمٰن بن ابزی

کو. آپ نے پوچھا کہ وہ کون ہے۔ انہوں نے کہا کہ وہ (سابقہ) غلاموں میں سے ایک غلام ہے۔ پوچھا کہ اُسے کس خصوصیت کی بنا پر حاکم مقرر کیا ہے؟ تو انہوں نے جواب میں کہا کہ اس کی قرآن پر گہری نگاہ ہے اور فرائض دین کا علم حاصل ہے۔ اس پر آپ خوش ہوئے۔

(۲) اس واقعہ کو پھر سے سامنے لائیے جس میں ایک شخص نے کہا تھا کہ فلاں آدمی بڑا قابلِ اعتماد ہے تو آپ نے پوچھا تھا کہ کیا تم کبھی اس کے پڑوس میں رہے ہو؟ کیا تم نے کبھی اس کے ساتھ سفر کیا ہے؟ یا کیا تم نے اس کے ساتھ کوئی معاملہ کیا ہے؟ اور جب اس نے ان سوالات کا جواب نفی میں دیا تھا تو آپ نے کہا تھا کہ پھر تمہیں اس شخص کے متعلق کچھ بھی معلوم نہیں۔ تم نے اُسے مسجد میں اٹھتے بیٹھتے (نماز پڑھتے) دیکھ لیا اور یہ رائے قائم کر لی کہ وہ بڑا قابلِ اعتماد ہے۔

یہی معیار آپ عمالِ حکومت کے انتخاب کے سلسلہ میں اختیار فرماتے تھے۔ وہ کسی کے نماز روزے

حُسنِ معاملت

کو نہیں دیکھتے تھے بلکہ منصبِ متعلقہ کے لئے اس کی صلاحیّت اور حسنِ معاملت کو دیکھتے تھے اور ان صلاحیتوں میں جو بھی سب سے آگے ہوتا، اسے منتخب کرتے تھے اور اس باب میں کسی کی رُو رعایت نہیں کرتے تھے۔ آپ اکثر کہا کرتے تھے کہ "میں کبھی پسند نہیں کرتا کہ کسی ایسے شخص کو گورنر مقرر کر دوں جس سے اعلیٰ صلاحیتوں کا حامل کوئی دوسرا شخص موجود ہو۔"

(۳) انتخاب کے لئے آپ کے اصولوں میں سے ایک اصول ملاحظہ فرمائیے اور پھر آپ خود ہی اندازہ لگا لیجئے کہ آپ جس شخص کو منتخب کرتے تھے وہ کس سیرت و کردار کا حامل ہوتا تھا۔ آپ فرمایا کرتے

ایک بلند اصول

تھے کہ میں سیادت (اعلیٰ منصب) کے لئے ایسے شخص کو منتخب کرنا پسند کرتا ہوں کہ :

> جب وہ اس منصب پر فائز نہ ہو تو اپنی قوم کا سردار نظر آئے اور جب اسے قوم کا سردار بنا دیا جائے تو وہ انہی میں کا ایک فرد معلوم ہو۔

کہیئے! اس معیار کو دیکھ کر آپ کی نگہِ بصیرت وجد میں آگئی ہے یا نہیں!

(۴) آپ یہ بھی فرمایا کرتے تھے کہ

> خدا خائن کی قوت اور ثقہ انسان کے عجز (کمزوری) سے بچائے۔

یعنی قوتوں اور صلاحیتوں کا مالک انسان اگر خائن ہے تو وہ بھی خطرناک ہے اور ایک شخص نہایت دیانتدار

ثقاہت اور قوّت اور قابلِ اعتماد ہے لیکن ہے کمزور، تو وہ بھی مضرت رساں ہے۔ لہٰذا انتخاب کا اصول تھا، ثقاہت اور قوّت۔

(۵) لیکن "قوّت" سے مراد سنگدلی اور شقاوتِ قلبی نہیں تھی، عدل کے لئے جرأت و بسالت تھی۔ آپ نے ایک دفعہ ایک شخص کو گورنری کے لئے منتخب کیا۔ اس کی تعیّناتی کا پروانہ لکھا رہے تھے کہ ایک بچّہ آیا۔ آپ کی گود میں بیٹھ گیا اور آپ نے اسے پیار کیا۔ اس (منتخب شدہ شخص) نے کہا کہ امیرالمومنین! میرے دس

شفقت اور محبّت بچے ہیں مگر کوئی میرے پاس نہیں پھٹک سکتا۔ آپ نے کہا کہ اس میں میرا کیا قصور؟ اگر خدا نے تیرے دل سے رحم نکال لیا ہے تو میں کیا کروں؟ اس سے یہ کہا اور کاتب سے کہا کہ دستاویز پھاڑ دو۔ جو شخص اپنی اولاد کے ساتھ شفقت اور محبّت سے پیش نہیں آسکتا، وہ رعایا پر کیسے رحم کرے گا۔

(۶) کسی صوبے کی گورنری کے لئے ایک شخص آپ کے ذہن میں تھا لیکن اس نے ایک دن آکر آپ

طلب گار کو نہیں سے کہا کہ مجھے گورنر تعیّنات کر دیجئے۔ آپ نے فرمایا کہ میں تجھے ہی گورنر بنانیوالا تھا لیکن اب نہیں بناؤں گا کیونکہ جو شخص خود کسی عہدہ کا خواہشمند ہو، اسے اس عہدہ پر فائز نہیں کرنا چاہیئے۔

(۷) آپ نے نعمان بن عدی کو ایک صوبہ کا گورنر مقرّر کیا۔ کچھ عرصہ کے بعد اس کے کچھ ایسے اشعار

شاعر نہ ہو آپ کے سامنے آئے جس میں اس نے شاہد و شراب کی وجد آور کیفیّات بیان کی تھیں۔ آپ نے اُسے بلا کر پوچھا تو اس نے کہا کہ امیرالمومنین! بخدا میں نے آج تک کبھی شراب کو چکھا تک نہیں۔ یہ تو محض شاعری ہے۔ آپ نے کہا کہ یہ ٹھیک ہے۔ میں بھی ایسا ہی سمجھتا ہوں۔ تو شاعر تو بہت اچھا ہے لیکن گورنری کے قابل نہیں۔ اس لئے تجھے معزول کیا جاتا ہے۔ (یہ حضرت عمرؓ کے اپنے قبیلے کا آدمی تھا)

(۸) صحابہؓ میں سے جو لوگ زیادہ صاحبِ اثر تھے آپ انہیں اپنے پاس رکھتے تھے۔ مدینہ سے باہر نہیں

اشخاص پرستی کے خلاف جانے دیا کرتے تھے۔ ایک دفعہ حضرت عبدالرحمٰن بن عوفؓ نے پوچھا کہ آپ ہم لوگوں کو باہر کیوں نہیں جانے دیتے۔ آپ نے فرمایا کہ "اس سوال کا جواب نہ دینا جواب دینے سے بہتر ہے۔"

اور وجہ ظاہر ہے کہ یہ حضرات باہر جاتے تو نو مسلموں میں شخصیت پرستی شروع ہوجاتی۔

(۹) اہلِ کوفہ کی طرف سے آپ ہمیشہ پریشان رہتے تھے۔ اگر وہاں کسی نرم مزاج آدمی کو گورنر بنا کر بھیجا جاتا تو وہ اسے خاطر میں نہ لاتے۔ اگر وہ سخت مزاج ہوتا تو اس کی شکائتیں کرتے۔ ایک مرتبہ آپ نے تنگ آکر کہا کہ اگر مجھے کوئی ایسا آدمی مل جائے جو نہایت قوی بھی ہو اور امین بھی تو میں اسے وہاں کا گورنر مقرر کروں۔ ایک شخص پاس بیٹھا تھا۔ اس نے کہا کہ میں آپ کو ایسا آدمی بتاتا ہوں۔ آپ نے پوچھا کہ وہ کون ہے۔ اس نے کہا کہ

اپنے بیٹے کو گورنر نہیں بنایا

عبداللہ ابن عمرؓ (یعنی خود آپ کے صاحبزادہ)

یہ سن کر آپ نے فرمایا کہ خدا تجھے غارت کرے! (اس سے زیادہ اور کیا کہوں!)

(٠)

اس قدر احتیاط کے بعد، آپ عمالِ حکومت کا تقرر کرتے لیکن اس کے یہ معنی نہیں کہ کسی شخص کے تقرر کے بعد آپ اس کی طرف سے مطمئن ہو کر بیٹھ جاتے۔ آپ ان میں سے ہر ایک پر کڑی نگاہ رکھتے۔ (اس کی تفصیل چند سطور آگے چل کر ملے گی۔) اور کسی کے متعلق کوئی شکایت سنتے تو اسے وہاں سے تبدیل کر دیتے اور شکایت کے درست ثابت ہونے پر اسے معزول کر دیتے۔ آپ کا مقولہ تھا کہ اگر کوئی حاکم کسی جگہ کوئی زیادتی کرتا ہے اور میں اُسے، اس کا علم ہوجانے کے بعد بھی، وہاں سے تبدیل نہیں کرتا تو یہ سمجھئے کہ وہ ظلم و زیادتی گویا خود میں نے کی ہے۔

تبادلے

فرمایا:۔

کیا تم لوگوں کا خیال ہے کہ اگر میں کسی ایسے شخص کو گورنر تعینات کردوں جو میرے خیال میں تم سب سے بہتر ہو۔ پھر اسے انصاف کرنے کی تاکید بھی کردوں، تو کیا میں اپنی ذمہ داری سے عہدہ برآ ہو جاؤں گا!

لوگوں نے کہا کہ ہاں؛

آپ نے فرمایا۔

نہیں! جب تک میں یہ نہ دیکھ لوں کہ وہ میری ہدایات کے مطابق کام بھی کر رہا ہے یا نہیں میں اس وقت تک اپنی ذمہ داری سے سبکدوش نہیں ہوسکتا۔

(٠)

۴۔ ہدایات

عمال کی تعیناتی کے وقت اور اس کے بعد بھی، وقتاً فوقتاً آپ جو ہدایات دیتے اور نافذ کرتے رہتے تھے' ان سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ آپ انہیں کس سیرت و کردار کا حامل اور امور مملکت کو کن خطوط پر سرانجام پاتے دیکھنا چاہتے تھے۔ (مثلاً)

(۱) آپ جب کسی کو گورنر بنا کر بھیجتے تو فرماتے :۔

یاد رکھو! میں تم لوگوں کو مستبد اور ظالم بنا کر نہیں بھیج رہا بلکہ رعایا کا راہ نما (امام) بنا کر بھیج رہا ہوں۔ کبھی کسی بے قصور کو نہ مارنا کہ وہ ذلیل ہو جائے اور کبھی کسی کی بے جا تعریف نہ کرنا کہ وہ مچل جائے۔ لوگوں کے کاموں میں رکاوٹ پیدا کرنے کے بجائے سہولتیں مہیا کرنا۔

(۲) آپ نے حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ کو لکھا۔

اپنی مجلس میں لوگوں کو مساوی درجہ دو تاکہ کمزور آدمی تمہارے عدل سے ناامید نہ ہو جائے اور صاحب منصب اس سے ناجائزہ فائدہ نہ اٹھا سکیں۔

(۳) جب کسی حاکم کے متعلق سنتے کہ وہ مریضوں کی عیادت کے لئے نہیں جاتا اور صاحب احتیاج اس کے پاس آنے سے گھبراتے ہیں تو آپ اسے برخاست کر دیتے۔

(۴) حضرت ابوعبیدہ بن جراحؓ کے نام ایک خط میں لکھا۔

یاد رکھو! لوگوں کے معاملات وہی سنوار سکتے ہیں جن کا عزم راسخ ہو اور وہ کسی سے دھوکا نہ کھائیں۔

نہ دھوکا دیتا ہے نہ دھوکا کھاتا ہے ضمناً' ایک دفعہ ایک شخص نے کہا کہ مومن کسی کو دھوکا نہیں دیتا۔ آپ نے فرمایا کہ بات مکمل کرو۔ مومن نہ کسی کو دھوکا دیتا ہے' نہ دھوکا کھاتا ہے۔

(۵) ہر عامل سے عہد لیا جاتا تھا کہ وہ (۱) ترکی گھوڑے پر سوار نہیں ہو گا کہ اس میں رعونت اور نخوت پائی جاتی ہے۔ (۲) باریک کپڑے نہیں پہنے گا۔ (۳) چھنا ہوا آٹا نہیں کھائے گا۔ (۴) اپنے دروازے پر

دربان نہیں بٹھائے گا۔ (۵) اہلِ حاجت کے لئے اپنا دروازہ کھلا رکھے گا۔ یہ شرائط تقرری کے پروانے میں درج کر دی جاتی تھیں اور انہیں مجمع عام میں پڑھ کر بھی سنا دیا جاتا۔

(۶) آپ نے ایک دفعہ اپنے عمّال کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

> یاد رکھو! رعیت اس وقت تک امام کی پیروی کرتی ہے جب تک وہ اللہ کی اطاعت کرتا ہے جب وہ احکامِ خداوندی سے سرکشی برتتا ہے تو رعایا اس کے احکام سے سرکشی اختیار کر لیتی ہے۔ جب وہ فسق و فجور اختیار کر لیتا ہے تو رعایا اس سے بڑھ کر فاسق و فاجر ہو جاتی ہے۔

(۷) ایک دفعہ ایک شخص نے آپؓ کی اور حضرت عثمانؓ کی دعوت کی۔ جب وہاں سے واپس آئے تو آپؓ نے حضرت عثمانؓ سے کہا کہ کاش! میں یہ دعوت قبول نہ کرتا۔ انہوں نے پوچھا کہ کیوں؟ فرمایا "مجھے ڈر ہے کہ کہیں یہ دعوت اس لئے نہ کی گئی ہو کہ وہ لوگوں سے یہ کہے کہ دیکھو! میں کتنا بڑا آدمی ہوں جس کے گھر اتنے اتنے بڑے لوگ کھانے کے لئے آتے ہیں۔" اسی بنا پر وہ عمالِ حکومت کو بھی دعوتیں قبول کرنے سے روکا کرتے تھے۔

عصبیتِ جاہلیہ کے خلاف

(۸) حضرت سعد بن ابی وقاصؓ کو ایک مراسلہ میں لکھتے ہیں کہ مجھے اطلاع ملی ہے کہ کسی جھگڑے میں قبیلہ ضبّہ نے اپنے امیر کی طرف رجوع کرنے کے بجائے "آلِ ضبّہ (اپنے قبیلہ) کو مدد کے لئے پکارا تھا۔ یاد رکھو! جب کوئی شخص اپنے قبیلے کو آواز دے تو سمجھ لو کہ وہ شیطان کی آواز ہے۔ اس سے عہدِ جاہلیت کی قبائلی عصبیت، جسے مٹانے کیلئے اسلام آیا تھا، پھر سے بیدار ہو جائے گی۔ اس رُجحان کو سختی سے روکو۔ اب اگر وہ دو ہی ہوں گے۔ ظالم (زیادتی کرنیوالا) اور مظلوم۔ اور مظلوم صرف امیر کو مدد کے لئے پکارے گا۔

(۹) حضرت عمرو بن عاصؓ کو ایک خط میں لکھا۔ اور غور سے سنئے کہ کیا لکھا۔ لکھا کہ

> تم اپنی رعایا کے لئے ایسے بن جاؤ جیسے تم اگر رعایا ہو تو چاہو کہ تمہارا امیر ایسا ہو۔ مجھے معلوم ہوا ہے کہ تم مجلس میں تکیہ لگا کر بیٹھتے ہو۔ ایسا ہرگز نہ کرو۔ عام لوگوں کی طرح بیٹھا کرو۔

(۱۰) آپ نے سپہ سالاروں کو ہدایت دے رکھی تھی کہ جنگ کے دوران کسی کو سزا نہ دو، مبادا وہ دشمن کے ساتھ جا ملے۔

(۱۱) حضرت ابو موسےٰ اشعریؓ کو (جب وہ بصرہ کے گورنر تھے) لکھا کہ مجھے معلوم ہوا ہے کہ تم عوام کے ہجوم کو

ایک ساتھ بلا لیتے ہو۔ مساوات بیشک اپنی جگہ ہے لیکن اہلِ علم و دیانت کی قدر افزائی بھی ضروری ہے۔ اس لئے قرآن دان اور صاحبِ دیانت لوگوں کو پہلے بلا لیا کرو۔ (ایسا کرنا علاوہ ان حضرات کی قدر افزائی کے، دوسروں کے دل میں قرآن دانی اور دیانت کا شوق پیدا کریگا۔)

(۱۲) ایک قول سنیئے اور جھوم جایئے۔ فرمایا۔

نرمی بلا ضعف۔ سختی بلا جبر

وہی حکومت درست رہ سکتی ہے جس میں نرمی ہو لیکن کمزوری کی وجہ سے نہیں اور جس میں سختی ہو لیکن استبداد کی بنا پر نہیں ــــ بلا ضعف نرمی، اور بلا جبر قوت ــــ یہ ہے اصل الاصول۔

(۱۳) حضرت مغیرہؓ کو کوفہ کا گورنر بنایا تو کہا کہ

مغیرہ! ایسا بن کر رہنا کہ پُر امن تجھ سے بے خوف رہیں اور بدمعاش خوف زدہ۔

(۱۴) ایک اور وجد آفریں قول ــــ فرماتے ہیں۔

وجد آفریں قول

جو شر پیدا کر کے غالب آیا، وہ غالب نہیں مغلوب ہے۔

جس نے ناجائز طریق سے کامیابی حاصل کی، وہ کامیاب نہیں، ناکام ہے۔

ایک دفعہ حضرت عمیر بن سعدؓ نے حمص میں منبر پر کھڑے ہو کر لوگوں سے کہا کہ

جب تک اسلام میں حکومت کا زور ہے وہ ناقابلِ شکست رہے گا لیکن حکومت کے زور کا مطلب تلوار سے قتل کرنا اور تازیانے مارنا نہیں بلکہ حق کے ساتھ فیصلہ اور انصاف کے ساتھ مواخذہ کرنا ہے۔

حضرت عمرؓ نے سُنا تو فرمایا۔ اے کاش! عمیرؓ جیسا آدمی میرے قریب ہوتا تو میں اس سے مسلمانوں کے کتنے کام لیتا۔

(۱۵) ایک دفعہ عراق کا ایک وفد آیا جس میں حضرت احنف بن قیسؓ بھی تھے۔ سخت گرمی کا دن تھا۔ دیکھا کہ حضرت عمرؓ دھوپ میں کھڑے بیت المال کے ایک اونٹ کو تیل مل رہے ہیں اور اپنی عبا کو لپیٹ کر سر پر بطور عمامہ باندھ رکھا ہے۔ وفد کو دیکھا تو فرمایا۔

احنف! کپڑے اتار کر آجا اور میری مدد کر۔ یہ بیت المال کا اونٹ ہے۔ جس میں یتیموں، بیواؤں اور مسکینوں کا حق ہے۔

ایک شخص نے کہا ــ امیر المومنین! آپ کسی غلام (خادم) سے کیوں نہیں کہتے کہ وہ یہ کام کر دے۔ آپ نے فرمایا کہ مجھ سے اور احنف سے بڑا غلام کون ہو گا۔

اور اس کے بعد وہ انقلاب آفریں فقرہ ارشاد فرمایا جس کے لئے ہم نے اس واقعہ کو نقل کیا ہے. کہا۔

غلام کی طرح مخلص اور امیں | جو شخص مسلمانوں کا والی بنے اس کے لئے ضروری ہے کہ وہ غلام کی طرح مخلص اور امین رہے۔

(۱۷) عام تاکید یہ تھی کہ

کھردرے بنو اور عجمیوں کی طرح ناز و انداز نہ کرو۔ اپنے آپ کو ان کے لباس سے بھی بچاؤ کہ وہ تمہیں آرام طلب بنا دے گا۔ سخت بنو۔ جھوٹا موٹا کھاؤ۔ گاڑھا گزی پہنو۔ پرانے کپڑے استعمال کرو۔ سواریوں کو خوب فربہ کرو۔ ڈٹ کر گھوڑ سواری کرو اور جم کر تیر اندازی کی مشق کرتے رہو۔ ہمیں تکلف سے منع کیا گیا ہے اس لئے کبھی تکلف نہ کرو۔ دین میں تفقہ حاصل کرو۔ کتاب کے ظرف اور علم کے سرچشمے بنو۔ سیادت و قیادت حاصل کرنے کی خواہش ہے تو پہلے سمجھ پیدا کرو۔ جس میں تکبر دیکھو، سمجھ لو کہ وہ احساسِ کمتری کا شکار ہے۔

(۱۸) اور آخر میں وہ ہدایت، جس میں تمام ہدایات سمو جاتی ہیں۔ فرمایا۔

محاسبۂ خویش | اپنا محاسبہ آپ کرو قبل اس کے کہ تمہارا محاسبہ کیا جائے کیونکہ محاسبۂ خویش تمہارے حساب کتاب کو آسان کر دے گا۔

اپنے آپ کا وزن کرتے رہو قبل اس کے کہ تمہارے لئے میزان کھڑی کی جائے۔ اپنے آپ کو "عرضِ اکبر" (عدالت کی بڑی پیشی) کے لئے تیار رکھو جس دن تمہاری کوئی بات بھی پوشیدہ نہیں رہے گی۔

آئیے ــ ہم دیکھیں کہ یہ محاسبہ کس طرح ہوا کرتا تھا۔ اپنا بھی اور دوسروں کا بھی۔

(۰)

۵۔ اِحتساب

احتساب کا پہلا قدم یہ تھا کہ ہر عامل کی تقرری کے وقت اس کے مقبوضات کی فہرست مرتب کرلی جاتی اور اسے وقتاً فوقتاً چیک کرتے رہتے۔ اس کے ساتھ ہی التزام یہ تھا کہ ہر عامل کو اتنا دیا جائے جس سے اس کی اور اس کے متعلقین کی ضروریات باطمینان پوری ہوتی رہیں۔ (تفصیل اس کی معاشی نظام میں ملے گی۔)

مقبوضات کی فہرست

(۲) اس فہرست کی چیکنگ میں بڑی شدت برتی جاتی۔ حضرت ابو ہریرہؓ کو بحرین کا گورنر مقرر کیا تو وہ واپسی پر دس ہزار دینار ساتھ لائے۔ آپ نے فوراً مواخذہ کیا کہ وہ مال کہاں سے آیا۔ انہوں نے کہا کہ انہوں نے گھوڑیاں پال رکھی تھیں؛ ان سے آمدنی ہوئی۔ عذر معقول تھا، قبول کرلیا گیا۔ (حضرت ابو ہریرہؓ کو ان کے عہدہ پر واپس بھیجنے لگے تو انہوں نے یہ کہہ کر انکار کردیا کہ یہ ذمہ داری بڑی سخت ہے۔ اگر اس میں نادانستہ بھی کوئی بات خلافِ عدل ہوگئی تو آپ کے مواخذہ سے بچ نہیں سکوں گا۔ اس لئے معذرت خواہ ہوں۔)

(۳) آپ نے احکام جاری کر رکھے تھے کہ کوئی گورنر مدینہ آئے تو دن کے وقت آئے اور لوگوں کے سامنے شہر میں داخل ہو۔ رات کے وقت نہ آئے۔

(۴) یہ احتساب مال تک محدود نہیں تھا۔ عمّال کے رہن سہن، طرزِ بود و ماند، تمدن و معاشرت، اخلاقِ عامہ، غرضیکہ ان کی ہر نقل و حرکت پر آپ کی نگاہ رہتی تھی۔ مصر کے گورنر (حضرت) عیاض بن غنمؓ کا واقعہ پہلے گذر چکا ہے۔ ان کے خلاف شکایت یہ تھی کہ وہ باریک کپڑے پہنتے ہیں اور انہوں نے دربان مقرر کر رکھا ہے۔ شکایت کے صحیح ثابت ہونے پر آپ نے ان سے کہا کہ یہ لو، اون کا جبہ پہنو۔ ایک عصا لو اور بیت المال کی تین سو بکریاں چراؤ تاکہ تمہیں معلوم ہو کہ راعی (گڈریا) کی ذمہ داری کیا ہوتی ہے۔

راعی کی ذمہ داری

حمص کے گورنر، (حضرت) عبداللہ بن قرط کے خلاف یہ شکایت تھی کہ انہوں نے اپنے رہنے کے لئے بالاخانہ بنوالیا تھا جس کی اجازت نہیں تھی۔ بالاخانہ کو تو آپ (حضرت عمرؓ) نے آگ لگوادی اور گورنر کو ایک جُبّہ

پہنوا کر، ہاتھ میں ایک ڈول دیا اور کہا کہ بیت المال کے اونٹوں کو پانی پلایا کرو۔ اس سے دماغ سے تفاخر کی بُو نکل جائے گی۔

۵۔ فاتحِ مصر حضرت عمرو بن عاصؓ کے بیٹے کا واقعہ پہلے گزر چکا ہے جس نے ایک قبطی کو بلا وجہ پیٹ دیا تھا۔ آپ نے اس قبطی کے ہاتھوں اسے کوڑے لگوائے تھے اور یہ بھی کہا تھا کہ خود (حضرت) عمرو بن عاصؓ کے بھی ایک آدھ تازیانہ لگا دیا جائے جس نے اپنے بیٹے کی صحیح تربیت نہیں کی۔

۶۔ شکایت سننے پر یونہی اندھا دھند مؤاخذہ نہیں کر لیا جاتا تھا۔ شکایت کی پوری پوری چھان بین کی جاتی اور جس کے خلاف شکایت ہوتی، اسے اپنی مدافعت کا موقعہ دیا جاتا۔ لوگوں نے حمص کے گورنر (حضرت) سعید بن عامر کے خلاف چار شکایتیں کیں۔ (۱) وہ دن چڑھے تک گھر سے نہیں نکلتے۔ (۲) رات کے وقت کسی کی پکار نہیں سنتے۔ (۳) مہینہ میں ایک دن بالکل ہی باہر نہیں آتے۔ اور (۴) کبھی کبھی ایسا ہوتا ہے جیسے ان پر سکتہ طاری ہو گیا ہو۔

مدافعت کا موقعہ دیا جاتا

مقدمہ پیش ہوا تو آپ نے سعید سے پوچھا کہ پہلی شکایت کا تمہارے پاس کیا جواب ہے۔ انہوں نے کہا۔ بخدا مجھے یہ پسند نہ تھا کہ میں اس بات کو عام کروں لیکن آپ پوچھتے ہیں تو مجھے بتانا ہی پڑے گا۔ واقعہ یہ ہے کہ میری بیوی کے پاس کوئی خادمہ نہیں۔ میں نے اس کا کچھ کام اپنے ذمہ لے رکھا ہے۔ صبح اُٹھ کر آٹا گوندھتا ہوں۔ اس کے خمیر ہونے تک انتظار کرتا ہوں۔ پھر روٹی پکاتا ہوں۔ ازاں بعد وضو کر کے باہر آتا ہوں۔

دوسری شکایت یہ تھی کہ وہ رات کے وقت باہر نہیں آتے۔ آپ نے جواب میں کہا کہ میں یہ راز بھی سربستہ ہی رکھنا چاہتا تھا لیکن اب اسے بھی کھولنا پڑا۔ میں نے دن رعایا کے لئے اور رات کو اللہ کے لئے وقف کر رکھا ہے۔

تیسری شکایت یہ ہے کہ میں مہینے میں ایک دن باہر نہیں نکلتا۔ سو میرے پاس خادم نہیں جو میرے کپڑے دھوئے، نہ ہی کپڑوں کا کوئی فالتو جوڑا ہے۔ مہینے میں ایک دن کپڑے دھوتا ہوں اور ان کے خشک ہونے تک انتظار میں بیٹھا رہتا ہوں۔

اب رہا چوتھا الزام، کہ مجھ پر کبھی کبھی سکتہ طاری ہو جاتا ہے تو یہ بات ذرا لمبی ہے۔ اس میں مجھے عمرِ رفتہ کو آواز دینی پڑے گی۔ مکہ میں مشرکین نے حضرت خبیبؓ انصاری کو گرفتار کر لیا اور ان کی

بوٹیاں اڑا کر انہیں کھجور کے تنے کے ساتھ لٹکا دیا اور پوچھا کہ کیا تو پسند کرتا ہے کہ اس وقت تیری جگہ **محمدؐ** ہوتا۔

انہوں نے جواب دیا کہ ملعونو! تم یہ کیا کہتے ہو۔ میں تو اسے بھی پسند نہیں کر سکتا کہ میں آرام سے رہوں اور حضورؐ کے پاؤں میں کانٹا بھی چبھ جائے۔ اس پر قریش نے انہیں سخت اذیت دیکر صلیب دی۔

جب کبھی مجھے وہ دن یاد آجاتا ہے تو کانپ اٹھتا ہوں کہ خدا میرا یہ گناہ کبھی نہیں بخشے گا کہ میں نے اپنے سامنے یہ سب کچھ ہوتے دیکھا اور خبیبؓ کی کوئی مدد نہ کی۔ میں ان دنوں مشرک تھا۔ خدا پر ایمان نہیں رکھتا تھا۔ بایں ہمہ، میں سمجھتا ہوں کہ مجھے ایک مظلوم کی مدد کرنی چاہیئے تھی۔ جب اپنے اس گناہ کا احساس غالب آجاتا ہے تو مجھ پر سکتہ طاری ہو جاتا ہے۔

یہ تھے اس دور کے گورنر۔ اور اس کے باوجود، سربراہِ مملکت ان کی رفتار، گفتار اور کردار پر کڑی نگاہ رکھتا تھا۔ ہم یہ بھی دیکھ چکے ہیں کہ شکایتوں کی تحقیق و تفتیش سرِ عام (پبلک کے سامنے) ہوتی تھی اور

عام سزا

الزام صحیح ثابت ہونے پر، سزا بھی پبلک میں دی جاتی تھی۔ حضرت عمرو بن عاصؓ نے ایک دفعہ اس طریقِ کار کے خلاف احتجاج بھی کیا تھا اور کہا تھا کہ اس سے عمالِ حکومت بددل ہو جائیں گے اور رعایا کی ان کے خلاف جرأتیں بڑھ جائیں گی۔ اس پر آپ نے فرمایا تھا کہ جو عامل انصاف کا تقاضا پورا کرنے پر بددل ہوتا ہے، وہ منصبِ حکومت کے قابل ہی نہیں۔ باقی رہا سزا کا پبلک میں دیئے جانا تو یہ قرآنِ کریم کے ارشاد کے عین مطابق ہے جہاں اس نے کہا ہے کہ سزا پبلک میں دی جائے اور اس باب میں ذرا سی بھی نرمی نہ برتی جائے۔ (۲/۲۴)

آپ عمالِ حکومت کے بارے میں اس قدر سختی کیوں برتتے تھے، اس کی وجہ بھی آپ نے بیان فرما

ہمارا ہر عمل عوام کے لئے سند بن جاتا ہے

دی تھی۔ ایک دفعہ آپ نے دیکھا کہ حضرت طلحہؓ طواف میں رنگا ہوا کپڑا پہنے تھے۔ آپ نے کہا کہ طلحہؓ! طواف میں رنگدار کپڑا، چہ معنی دارد؟ انہوں نے کہا کہ یہ تو مٹی کا رنگ ہے۔ آپ نے فرمایا۔ "طلحہؓ! دوسرے لوگوں کی نسبت آپ حضرات کو بہت زیادہ محتاط ہونے کی ضرورت ہے۔ آپ لوگوں کے امام ہیں جن کی اقتدار عوام کرتے ہیں۔ اگر کوئی جاہل آپ کو دیکھے گا تو وہ اپنے لوگوں سے کہے گا کہ میں نے حضرت طلحہؓ کو بحالتِ طواف رنگدار کپڑے پہنے دیکھا تھا۔ یوں تمہارا یہ معصوم سا عمل لوگوں کے

لئے سند بن جائے گا۔ لہٰذا ہم لوگوں کو بڑی احتیاط برتنی چاہیئے۔
اور یہی وجہ تھی کہ آپ ان ذمہ دار حضرات کا چھوٹی چھوٹی باتوں پر بھی موأخذہ کرتے تھے۔

لیکن دوسروں کا محاسبہ اور موأخذہ کرنے سے پہلے، امیرالمومنین خود اپنا محاسبہ کرتے اور اپنے آپ کو لوگوں کے سامنے موأخذہ کے لئے پیش کرتے تھے۔ واقعہ مشہور ہے

خود اپنا محاسبہ

کہ یمنی چادریں آئیں تو آپ نے سب کو ایک ایک چادر دے دی۔ ایک دن آپ منبر پر تشریف لائے اور حسب معمول مجمع سے کہا کہ ــــ اسمعوا و اطیعوا۔ "سنو جو کچھ میں کہتا ہوں اور پھر اس کی اطاعت کرو۔"

یمنی چادریں

مجمع میں سے آواز آئی ــــ "ہم نہ تمہاری سنیں گے، نہ اطاعت کریں گے۔" کہنے والے حضرت سلمان فارسیؓ تھے۔ سربراہِ مملکت منبر سے نیچے اُتر آئے اور کہا کہ ابو عبداللہ! کیا بات ہے؟

کہا۔ عمر! تم نے دنیاداری برتی ہے۔ تم نے ایک ایک چادر تقسیم کی تھی اور خود دو چادریں پہن کر آئے ہو؟

فرمایا۔ عبداللہ بن عمرؓ کہاں ہے!

حاضر ہوں! امیرالمومنین!

فرمایا، بتاؤ! ان میں سے ایک چادر کس کی ہے ــــ عرض کیا میری ہے، امیرالمومنین۔

آپ نے حضرت سلمانؓ سے مخاطب ہو کر فرمایا، ابو عبداللہ! تم نے جلدی کی جو بات پوچھے بغیر احتجاج کر دیا۔ میں نے اپنے میلے کپڑے دھوئے تھے۔ باہر آنے کے لئے ایک چادر کافی نہیں تھی۔ اس لئے میں نے (اپنے بیٹے) عبداللہ سے چادر مانگ لی تھی۔

(حضرت) سلمانؓ نے کہا، ہاں! اب کہیئے، یا امیرالمومنین! ہم سنیں گے بھی اور اطاعت بھی کریں گے۔

آپ خود اپنا یہ قول کیسے بھول سکتے تھے کہ

رعیت اس وقت تک امیر کی اطاعت کرتی ہے جب تک وہ خدا کی اطاعت کرتا رہے۔

(۲) حضرت معیقیبؓ بیت المال کے خزانچی تھے۔ ایک دن بیت المال میں جھاڑو دینے لگے تو کوڑے

ایک درہم

میں سے ایک درہم (اس وقت کا کم از کم سکہ) ہاتھ لگا۔ اتفاق سے حضرت عمرؓ کے گھر کا ایک بچہ پاس کھڑا تھا۔ خزانچی نے وہ درہم اس بچے کو دے دیا اور گھر چلا گیا ابھی گھر پر پہنچا ہی تھا کہ امیر المومنین کا بلاوا آگیا۔ وہ آیا تو دیکھا کہ وہی درہم آپ کے ہاتھ میں تھا۔ کہا کہ معیقیب! میں نے تمہارے ساتھ کونسی زیادتی کی تھی جو تم نے مجھ سے اس طرح بدلہ لینا چاہا۔ تم سوچو کہ قیامت کے دن جب اُمتِ محمدیہ مجھ سے اس درہم کی بابت پوچھے گی تو میں کیا جواب دوں گا۔

(۳) ایک شخص نے آپ سے بھرے مجمع میں کہا کہ عمرؓ! خدا سے ڈر۔ وہ بار بار اس جملہ کو دہراتے چلا گیا۔

عمر! خدا سے ڈر

تو مجمع میں سے ایک شخص نے اس سے کہا کہ اب بس بھی کرو۔ تم بہت کہہ چکے حضرت عمرؓ نے اسے روکا اور کہا کہ نہیں! اسے کہنے دو۔ اگر لوگ ایسی بات نہ کہیں تو سمجھ لو کہ ان میں خیر کا ذرّہ تک نہیں رہا اور اگر ہم اسے نہ سنیں تو سمجھ لو کہ ہم میں خیر کی رمق تک نہیں رہی۔

(۴) ایک دن آپ نے برسرِ منبر کہا کہ صاحبو! اگر میں دنیا کی طرف جُھک جاؤں تو تم کیا کرو گے؟ ایک شخص کھڑا ہو گیا۔ تلوار نیام سے نکالی اور کہا کہ ہم تمہارا سر اڑا دیں گے۔ آپ نے اسے آزمانے کے لئے کہا کہ کیا تو میری شان میں یہ بات کہتا ہے۔ اس نے نہایت سکون سے کہا کہ ہاں! تمہاری شان میں۔ آپ نے فرمایا کہ الحمدللہ!

خلیفہ ٹھیک نہ چلے تو

قوم میں ایسے لوگ موجود ہیں کہ اگر عمر بھی کج رو ہو جائے تو وہ اس کا سر اڑا دیں۔

(۵) اور یہ "سر اڑا دینے کی بات" تو خود آپ ہی نے انہیں بتائی تھی۔ ایک دفعہ آپ نے کہا کہ اگر خلیفہ ٹھیک ٹھیک چلے تو لوگوں کو چاہیئے کہ اس کی اطاعت کریں لیکن اگر وہ غلط راستہ اختیار کر لے تو اسے قتل کر دینا چاہیئے۔

حضرت طلحہؓ پاس بیٹھے تھے۔ انہوں نے کہا کہ آپ نے یہ کیوں نہ کہا کہ اگر خلیفہ ٹھیک نہ چلے تو اسے معزول کر دینا چاہیئے۔ آپ نے فرمایا ——— "نہیں؛ قتل کر دینا بعد میں آنے والوں کے لئے زیادہ عبرتناک ہو گا۔"

اس مقام پر اتنا سمجھ لینا ضروری ہے کہ اس کا یہ مطلب نہیں کہ اسلامی نظام میں ہر شخص کو اس کا حق حاصل ہوتا ہے کہ اگر وہ اپنی دانست میں سمجھے کہ خلیفہ غلطی کر رہا ہے تو وہ اٹھ کر اس کا سر اڑا دے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ جن جرائم کی سزا موت ہے اگر وہ خلیفہ سے بھی سرزد ہوں تو اسے بھی وہی سزا دینی چاہیئے۔

اس باب میں سربراہِ مملکت اور عام لوگوں میں فرق نہیں کرنا چاہیئے۔

(o)

لیکن حضرت عمرؓ یہ بھی جانتے تھے کہ سربراہِ مملکت کا احتساب اس کی ذات تک محدود نہیں ہونا چاہیئے۔

اہل وعیال کا احتساب

اس میں اس کے اہل وعیال بھی برابر کے شریک ہونے چاہئیں۔ قرآنِ کریم نے جو بعض بیوی بچوں کو انسان کا دشمن (۶۴/۱۴) اور مال اور اولاد کو فتنہ (۶۴/۱۵) کہا ہے تو یہ خطرناک گھاٹی ان کی نگاہوں سے اوجھل نہیں تھی۔ چنانچہ آپؓ کا دستور تھا کہ

> جب لوگوں کو کسی بات سے منع کرتے تو اپنے گھر والوں کو جمع کر کے، ان سے کہتے کہ میں نے لوگوں کو فلاں فلاں چیز سے منع کیا ہے۔ یاد رکھو! لوگ تمہاری طرف اس طرح دیکھ رہے ہیں جس طرح پرندہ گوشت کی طرف دیکھتا ہے۔ اگر تم بچو گے تو وہ بھی بچیں گے اور اگر تم پھنسو گے تو وہ بھی پھنسیں گے۔ اگر تم میں سے کسی شخص نے ان باتوں کا ارتکاب کیا تو خدا کی قسم! میں اپنے ساتھ تمہارے تعلق کی وجہ سے تمہیں دگنی سزا دوں گا۔ اب تمہیں اختیار ہے، جو چاہے حدود سے تجاوز کرے، جو چاہے ان کے اندر رہے۔

اور یہ "دگنی سزا" کا فیصلہ قرآن کریم کے اس ارشاد کے مطابق تھا جس میں نبی اکرمؐ کی ازواج مطہراتؓ سے کہا گیا تھا کہ یاد رکھو! تم عام عورتوں کی طرح نہیں ہو۔ تم میں سے جو کسی جرم کی مرتکب ہو گی، اسے دگنی سزا ملے گی۔ (۳۳/۳۰۔۱) حضرت عمرؓ نے اپنے ارشادِ گرامی سے اس نکتہ کی وضاحت کر دی کہ قرآن کا وہ حکم، مملکتِ اسلامیہ کے ہر سربراہ پر یکساں عائد ہوتا ہے۔

یہ تھا مملکت کی ذمہ داریوں کا احساس جس کے پیشِ نظر آپ نے (جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا ہے۔) مصر کے قاصد (حضرت) معاویہ بن خدیجؓ سے کہا تھا کہ تم نے خیال کیا کہ دوپہر کا وقت ہے، امیر المومنین

ذمہ دار کو نیند کہاں!

اس وقت قیلولہ فرما رہے ہوں گے۔ معاویہ! جس کے ذمے مملکت کے فرائض ہوں، دن تو ایک طرف اُسے رات کے وقت بھی نیند نہیں آسکتی۔

ذمہ داریوں کا احساس

اسی ذمہ داری کا احساس تھا جس پر نگاہ رکھتے ہوئے حضرت عباسؓ نے اس شخص کے سوال پر کہ حضرت عمرؓ کیسے تھے، جواب میں کہا تھا کہ

> وہ اس خوف زدہ پرندے کے مانند تھے جسے ہر طرف جال ہی جال نظر آ رہے ہوں۔

حضرت انسؓ کی روایت ہے کہ ایک سفر میں، میں حضرت عمرؓ کے ساتھ تھا۔ وہ راستہ میں ایک احاطہ کے اندر داخل ہو گئے۔ میں نے پسِ دیوار کان لگا کر سنا تو آپ کہہ رہے تھے۔

خطاب کا بیٹا عمر اور امیر المومنین! اللہ اکبر! خطاب کے چھوکرے۔ اللہ سے ڈرتا رہ ورنہ وہ تجھے ہلاک کر دے گا۔

ایک دن آپ نے اعلان کیا کہ "الصلوٰۃ جامعہ" لوگوں نے حسبِ معمول سمجھا کہ کوئی اہم معاملہ درپیش ہے جس کے لئے اجتماعی اعلان ہوا ہے۔ وہ جمع ہوئے تو آپ منبر پر تشریف لے گئے اور فرمایا:

اے لوگو! میں اپنی مخزومی خالاؤں کے اونٹ چرایا کرتا تھا اور ان کا پانی بھرا کرتا تھا جس کے عوض وہ مجھے مٹھی بھر چھوہارے دے دیا کرتی تھیں۔

یہ کہہ کر آپ منبر سے اتر آئے۔ حضرت عبدالرحمٰن بن عوفؓ نے کہا کہ امیر المومنین! ہم سمجھے نہیں کہ اس اجتماع اور اعلان کا مطلب کیا تھا۔ فرمایا۔ آج میں تنہا بیٹھا تھا کہ دل نے کہا کہ تو امیر المومنین ہے۔ تیرے اور اللہ کے درمیان کوئی قوت نہیں۔ تجھ سے افضل کون ہو سکتا ہے۔ اس پر میں کانپ اٹھا اور کہا کہ ضروری ہو گیا ہے کہ میں اپنے نفس کو بتا دوں کہ وہ ہے کیا؟ اس اجتماع اور خطاب سے یہی مقصد تھا۔

ایک دن حضرت عمرؓ، حضرت علیؓ اور حضرت عثمانؓ بیت المال کے اونٹوں کا جائزہ لینے کے لئے گئے۔ حضرت عمرؓ اونٹوں کو دیکھ دیکھ کر ان کے احوال و کوائف بولتے جاتے تھے، حضرت علیؓ سن سن کر حضرت عثمانؓ کو املا کراتے جاتے تھے اور وہ انہیں، ایک درخت کے نیچے بیٹھے، لکھتے جاتے تھے۔ حضرت عمرؓ دھوپ میں کھڑے تھے۔ دھوپ سخت تھی لیکن وہ کام میں ایسے منہمک تھے کہ انہیں اس کی شدت کا قطعاً احساس نہیں تھا۔ حضرت علیؓ نے حضرت عثمانؓ کو مخاطب کر کے کہا کہ آپ نے قرآنِ مجید میں حضرت شعیبؑ کی بیٹی کا یہ قول پڑھا ہو گا جس نے کہا تھا کہ یٰاَبَتِ اسْتَاْجِرْهُ ۔ اِنَّ خَیْرَ مَنِ اسْتَاْجَرْتَ

القوی الامین

الْقَوِیُّ الْاَمِیْنُ ۔ (۲۸/۲۶) " ابا جان! اسے (حضرت موسیٰؑ کو) ملازم رکھ لیجئے کیونکہ بہترین خدمت گزار وہ ہے جو قوی بھی ہو اور امین بھی۔" حضرت علیؓ نے حضرت عمرؓ کی طرف اشارہ کر کے کہا: یہ ہے قوی الامین۔

اَلْقَوِیُّ الْاَمِیْنُ ۔ ان دو لفظوں میں حضرت عمرؓ کی ساری شخصیت سمٹ کر آجاتی ہے۔

اور اس دور کے عمالِ حکومت جو اس قدر امین تھے تو اس کا راز بھی اسی میں تھا کہ سربراہِ مملکت

خود امین تھا۔ آپ کو یاد ہو گا کہ مدائن کی فتح کے بعد حضرت سعد بن ابی وقاصؓ نے مالِ غنیمت مدینہ بھیجا تو زر و جواہرات کی اس قدر کثرت اور نوادرات کے ایسے تنوع کو دیکھ کر اہلِ مدینہ کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئی تھیں۔ حضرت سعدؓ نے اپنے خط میں لکھا تھا کہ امیر المومنین! یہ مال و متاع اس قدر وجۂ تعجب اور باعثِ مسرت نہیں جس قدر یہ امر کہ جب ہم نے یہ شہر فتح کئے ہیں تو یہ تمام زر و جواہرات آپ کی فوج کے سپاہیوں کے سامنے پڑے تھے اور کوئی باہر کا دیکھنے والا بھی نہیں تھا لیکن ان میں سے کسی نے ایک سوئی تک بھی اپنے

جیسا سربراہ ویسے عمال

پاس نہیں رکھی۔ سارے کا سارا مال لا کر مرکز میں ڈھیر کر دیا۔ یہ پڑھ کر حضرت عمرؓ کی آنکھوں میں خوشی کے آنسو بھر گئے۔ حضرت علیؓ پاس کھڑے تھے۔ فرمایا کہ

ابنِ خطاب! تمہارے سپاہی اس لئے امین ہیں کہ تم امین ہو۔

یہ تھا سارا راز اس دور کی حکومت کی درخشندگی اور تابندگی کا۔ اس دور میں سربراہِ مملکت کا فریضہ یہ تھا مملکت کے انتظام کی درستگی ہی نہیں تھا، اس کا فریضہ حکومت کے اعضاء و جوارح کی سیرت و کردار کی درستگی بھی تھا۔ بلکہ ہم تو یہ کہیں گے کہ اس کا اولین فریضہ، ارکانِ حکومت کی سیرت و کردار کی درستگی تھا۔ انتظام کی درستگی اس کی سیرت کی درستگی کا فطری نتیجہ تھا۔

"سمیعٌ و بصیر"

اور اس حسنِ عمل اور درستگی نظم و نسق کا راز یہ تھا کہ سربراہِ مملکت تمام رعایا کے حالات سے باخبر رہتا تھا۔ ایک شخص نے آپ کے ایک پڑوسی سے دریافت کیا کہ امیر المومنین تک پہنچنے کی کیا سبیل ہے۔ اس نے کہا کہ

ہر ایک کی رسائی

نہ تو ان کے گھر پر کوئی پھاٹک ہے، نہ وہ پسِ پردہ بیٹھتے ہیں۔ وہ نماز پڑھ کر بیٹھ جاتے ہیں، پھر جو چاہتا ہے ان سے آ کر باتیں کرنے لگ جاتا ہے۔

یہ نو رہا رعایا کا امیر المومنین تک پہنچنا لیکن امیر المومنین خود رعایا تک پہنچتا تھا۔ وہ بازاروں میں پھرتے، رعایا کے معاملات کا خود مشاہدہ اور مطالعہ کرتے، ضروری امور کا فیصلہ وہیں بر سرِ موقعہ کر دیتے۔ زیادہ اہم معاملات مجلسِ مشاورت میں پیش کر دیتے۔ دن کے وقت فرصت کم ملتی، تو راتوں کو گشت کرتے اور بغیر کسی کو علم ہوئے، رعایا کے حالات براہِ راست معلوم کرتے۔ کتبِ تاریخ میں اس گشت کے بڑے

دلچسپ اور سبق آموز واقعات مذکور ہیں۔ (مثلاً) ایک دفعہ ایک قافلہ آیا اور شہر سے باہر اترا۔ اس کی خبر گیری کے لئے خود تشریف لے گئے۔ گشت لگاتے پھر رہے تھے کہ ایک طرف سے ایک شیر خوار بچے کے رونے کی آواز آئی۔ ادھر گئے اور اس کی ماں کو تاکید کی کہ وہ بچے کو بہلائے۔ تھوڑی دیر بعد پھر ادھر سے گزرے تو بچے کو روتے پایا۔ سخت غصہ کے عالم میں اس کی ماں سے کہا کہ تم بڑی بے رحم ماں ہو۔ اس نے کہا کہ راہرو! تمہیں حقیقت کا علم نہیں اور مجھے خواہ مخواہ تنگ کرتے ہو۔ بات یہ ہے کہ عمرؓ نے حکم دے رکھا ہے کہ بچوں کا وظیفہ اس وقت سے شروع کیا جائے جب وہ دودھ چھوڑ دیں۔ میں اس کا دودھ چھڑاتی ہوں اور یہ روتا ہے۔ یہ سن کر حضرت عمرؓ کو سخت رقت ہوئی اور کہا کہ ہائے عمرؓ! نہ معلوم تو نے کتنے بچوں کا خون کیا ہوگا۔ اسی دن منادی کرادی کہ بچوں کی پیدائش کے ساتھ ہی ان کا وظیفہ مقرر کر دیا جائے۔

بچہ رو رہا تھا

(۲) آپ کے خادم اسلمؓ کا بیان ہے کہ ایک دفعہ حضرت عمرؓ رات کے وقت گشت کو نکلے۔ شہر کے باہر ایک مقام پر دیکھا کہ ایک عورت کچھ پکا رہی ہے اور دو تین بچے رو رہے ہیں۔ حقیقت حال معلوم کرنے پر اس نے کہا کہ تین وقت سے بچوں کو کچھ کھانے کو نہیں ملا۔ میں نے خالی ہانڈی میں پانی ڈال کر چولھے پر چڑھا رکھا ہے کہ بچوں کا دل بہلا رہے۔ حضرت عمرؓ اٹھے، بیت المال سے آٹا، گھی، کھجوریں لیں اور اسلم سے کہا کہ انہیں میری پیٹھ پر لاد دو۔ اسلم نے کہا کہ مجھے دیجئے، میں لئے جاتا ہوں۔ فرمایا کہ اسلم! اس معاملہ کا تعلق قیامت سے ہے اور قیامت میں تم میرا بوجھ نہیں اٹھاؤ گے۔ اس لئے یہ بوجھ مجھے خود اٹھانے دو۔ یہ چیزیں لاکر اس عورت کو دیں۔ اس نے ہانڈی چڑھائی تو آپ چولہا پھونکتے رہے۔ کھانا تیار ہوا۔ بچوں نے سیر ہو کر کھایا اور اُچھلنے کودنے لگے۔ حضرت عمرؓ انہیں دیکھ کر بہت خوش ہو رہے تھے۔ چلنے لگے تو اس عورت نے کہا کہ خدا تمہیں جزائے خیر دے۔ امیرالمومنین ہونے کے قابل تم تھے 'نہ کہ عمرؓ۔

خالی ہانڈی چڑھا رکھی تھی

فی الحقیقت امیرالمومنین ہونے کے قابل یہی تھے۔

(۳) اسی طرح ایک رات گشت میں ایک بدو کے پاس' اس کے خیمے سے باہر بیٹھ کر اِدھر اُدھر کی باتیں کرنے لگے۔ دفعتہً خیمہ سے رونے کی آواز آئی۔ آپ کے پوچھنے پر اس نے کہا کہ میری بیوی دردِ زہ میں مبتلا ہے اور اس وقت کوئی عورت پاس نہیں۔ آپ خاموشی سے

بدو کی بیوی

اٹھے، گھر آئے، اپنی زوجہ محترمہ اُمِّ کلثومؓ (جو حضرت علیؓ کی صاحبزادی تھیں) کو ساتھ لیا اور بدّو کی اجازت سے انہیں خیمہ کے اندر بھیج دیا اور خود باہر بدّو سے باتیں کرنے لگے۔ اسے کچھ معلوم نہیں تھا کہ وہ کس سے باتیں کر رہا ہے کہ اندر سے اُمِّ کلثومؓ کی آواز آئی، "امیر المومنین! اپنے دوست کو بچے کی مبارکباد دیجئے"

امیر المومنین!!! — یہ سنکر بدّو کی جو حالت ہوئی ہوگی، وہ ظاہر ہے۔ آپ نے اسے مبارکباد دی اور فرمایا کہ کل میرے پاس آنا تاکہ اس بچے کا وظیفہ مقرر کر دیا جائے۔

(۴) اور اسی گشت کی ایک شبِ تاریک میں آپ کو وہ گوہرِ تابدار مل گیا جس نے کاشانۂ فاروقی کو بقعۂ نور بنا دیا۔ واقعہ یہ ہے کہ آپ لوگوں کو دودھ میں پانی ملانے سے منع کرتے تھے۔ ایک رات گشت کرتے

دودھ میں پانی نہ ملانے والی لڑکی

کرتے تھک گئے تو ایک مکان کے باہر اس کی دیوار سے ٹیک لگا کر بیٹھ گئے۔ سنا تو اندر ایک عورت اپنی لڑکی سے کہہ رہی تھی کہ اٹھو اور دودھ میں تھوڑا سا پانی ڈال دو۔

اس نے کہا — امّاں! تمہیں معلوم نہیں کہ امیر المومنین نے دودھ میں پانی ملانے سے شدت سے منع کر رکھا ہے۔

ماں نے کہا — اٹھ اور دودھ میں پانی ڈال، اس جگہ کونسا امیر المومنین تمہیں دیکھ رہا ہے۔

بیٹی نے کہا — اماں! امیر المومنین نہیں دیکھ رہا..... تو وہ خدا تو دیکھ رہا ہے۔ جس کا حکم امیر المومنین ہم تک پہنچاتے ہیں۔

صبح ہوئی تو آپ نے اپنی بیوی سے کہا کہ جلدی سے جا اور دیکھ کہ وہ لڑکی شادی شدہ ہے یا ابھی اس کی شادی ہونی ہے۔ اگر وہ غیر شادی شدہ ہے تو اسے بہو بنا کر گھر لے آ کہ اس قسم کی نعمتیں روز روز نہیں ملا کرتیں۔ معلوم ہوا کہ لڑکی بیوہ ہے۔ آپ نے اپنے بیٹے عاصمؓ سے اس کی شادی کردی۔

اسی لڑکی کی اولاد سے حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ پیدا ہوئے تھے جنہوں نے خلافتِ راشدہ کی یاد تازہ کر دی تھی — اسی نسبت سے آپ (حضرت عمرؓ) حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کے نانا کہلاتے ہیں۔

(۵) ایک دفعہ لوگوں کو کھانا کھلا رہے تھے کہ دیکھا کہ ایک آدمی بائیں ہاتھ سے کھانا کھا رہا ہے۔ اس سے کہا کہ میاں! دائیں ہاتھ سے کھانا کھاؤ۔ دوبارہ ادھر سے گزرے تو وہ پھر بھی بائیں ہاتھ ہی سے کھانا کھا رہا تھا۔ ذرا سختی سے کہا کہ دائیں ہاتھ سے کھانا کیوں نہیں کھاتے؟ اس نے کہا کہ میرا دایاں ہاتھ کام

آچکا ہوا ہے۔ معلوم ہوا کہ کسی جہاد میں اس کا دایاں ہاتھ کٹ گیا تھا۔ حضرت عمرؓ اس کے پاس بیٹھ گئے۔ روتے جاتے تھے اور کہتے جاتے تھے کہ افسوس ہے تمہیں وضو کون کراتا ہوگا، سر کون دھوتا ہوگا، کپڑے کون پہناتا ہوگا۔ پھر ایک ملازم مقرر کر دیا کہ اس کے ضروری کام کر دیا کرے۔

یہ تھا رعایا کے افراد پر سربراہ کی نگاہ کا عالم!

(۶) اس عورت کے واقعہ میں جو خالی ہانڈی چولھے پر چڑھائے، بھوکے بچوں کو بہلا رہی تھی، ہم نے ایک

ہمارا حاکم اور ہماری حالت سے بیخبر!

اہم کڑی دانستہ چھوڑ دی تھی۔ جب اس نے کہا تھا کہ بچوں کو تین دن سے کچھ کھانے کو نہیں ملا، تو آپ نے اس سے کہا تھا کہ تم نے امیر المومنین کو اس کی اطلاع دی ہے! اس کے جواب میں اس نے جو کچھ کہا تھا اس سے اندازہ لگ سکتا ہے کہ اس دور میں عام عورتیں تک حکومت کی ذمہ داریوں کو کس حد تک جانتی تھیں۔ اس نے کہا تھا کہ

جو شخص حاکم ہو کر رعایا کے حالات سے بے خبر رہے، اس تک شکایت پہنچانے سے کیا حاصل!

اور یہیں سے ہمارے سامنے وہ واقعہ آجاتا ہے کہ جب بھی عمرؓ اسے یاد کرتے، آنکھوں میں آنسو آجاتے تھے۔

شام کے ویرانے کی بڑھیا

آپ شام کے سفر سے واپس آرہے تھے تو راستے میں ایک خیمہ دیکھا۔ ویرانے میں ایک خیمہ! قریب گئے تو دیکھا کہ اس میں ایک بڑھیا بیٹھی ہے۔ پوچھا کہ تمہیں عمرؓ کا بھی کچھ حال معلوم ہے۔ اس نے کہا کہ سنا ہے وہ شام سے چل پڑا ہے۔ اس سے زیادہ نہ مجھے اس کی بابت کچھ علم ہے، نہ معلوم کرنے کی ضرورت۔ آپ نے پوچھا کہ ایسا کیوں؟ اس نے کہا کہ جس نے آج تک یہ معلوم نہیں کیا کہ مجھ پر کیا گذر رہی ہے، میں اس کے حالات معلوم کر کے کیا کروں گی۔ ؟ آپ نے کہا کہ تم نے عمرؓ تک اپنی حالت کی اطلاع پہنچائی تھی! اس نے کہا کہ یہ میرا کام نہیں تھا، عمر کا کام تھا۔ آپ نے کہا کہ عمرؓ کو اتنی دور کا حال کیسے معلوم ہو سکتا ہے! اس کے جواب میں اس بڑھیا نے جو کچھ کہا وہ غور سے سننے کے قابل ہے اس نے کہا کہ

اگر عمرؓ اپنی رعایا کے ہر فرد کے حالات کا علم نہیں رکھتا تو اسے حکومت کرنے کا کیا حق حاصل ہے۔

حضرت عمرؓ جب بھی اس واقعہ کو یاد کرتے تو آنکھوں میں آنسو آجاتے اور کہتے کہ خلافت کا مفہوم کیا ہے، مجھے شام کی اس بڑھیا نے بتلایا۔

خداوندا! خدائی دردِ سر ہے۔

اسی کا احساس تھا کہ آپ نے ایک دفعہ فرمایا کہ

اگر میں زندہ رہا تو رعایا کا حال معلوم کرنے کے لئے سال بھر تک مسلسل سفر میں رہوں گا کیونکہ دور دراز علاقوں کے لوگ مجھ تک پہنچ نہیں سکتے اور میں نہیں کہہ سکتا کہ میرے عمّال ان میں سے ہر ایک کی ضروریات سے مجھے آگاہ کرتے ہوں۔ میں شام، جزیرہ، مصر، بحرین، بصرہ جاؤں گا اور ہر مقام پر دو دو ماہ قیام کرکے لوگوں کے حالات براہِ راست معلوم کروں گا۔

لیکن عمرؓ نے اتفاق کی اور اس دورہ کا موقعہ ہی نہ ملا۔

(۵)

ظاہر ہے کہ جب ان کی اپنی یہ حالت تھی تو اپنے عمّال کو کس قدر سخت تاکید نہیں کرتے ہوں گے کہ وہ لوگوں کے لئے اپنے دروازے کھلے رکھیں۔ ہم دیکھ چکے ہیں کہ (حضرت) عیاض بن غنمؓ کو اس "جرم" کی پاداش میں کہ انہوں نے اپنے دروازے پر دربان بٹھا دیا تھا، کیسی عبرت آموز سزا دی تھی۔

حضرت سعد بن ابی وقاصؓ کے مکان کے سامنے بازار تھا جس سے ہر وقت شور و شغب کی آواز آتی رہتی تھی۔ آپ نے اس طرف کا دروازہ بند کر دیا۔ حضرت عمرؓ کو معلوم ہوا تو آپ نے محمد بن مسلمہؓ (انسپکٹر امورِ عامہ) کو بلا کر کوفہ روانہ کیا اور کہا کہ جا کر سعدؓ کے دروازے کو آگ لگا دے۔ اس سلسلہ میں آپ نے جو خط حضرت سعدؓ کو لکھا تھا اس میں کہا تھا کہ

جس محل کے دروازے عوام پر بند ہو جائیں، وہ قصرِ سعد نہیں، قصرِ فساد ہے۔ اس کا منہدم ہو جانا ہی بہتر ہے۔

آپ نے گورنروں کے نام تاکیدی احکام نافذ کر رکھے تھے کہ

وہ پردوں کے پیچھے چھپ کر نہ بیٹھیں، عوام کے سامنے بیٹھیں۔ اپنا حق وصول کریں، ان کے حقوق کی ادائیگی کریں۔

یہ تو سال بھر کا معمول تھا اور سال کے بعد حج کا اجتماع ہوتا تھا جس میں لاکھوں افراد شریک ہوتے تھے۔

ترسیبا پر شکایات

اس میں آپ تمام صوبوں کے گورنروں کو بلاتے۔ دوسری طرف ملک میں عام اعلان کیا جاتا کہ جسے کسی کے خلاف کوئی شکایت

ہو وہ اس اجتماع میں آجائے۔ وہاں شکایات سنی جاتیں، پیشی ہوتی اور جس کے خلاف شکایت صحیح ثابت ہوتی اسے لاکھوں کے اجتماع میں سزا دی جاتی یا سرزنش کی جاتی۔

(٥)

یہ تھا امیر المومنین، حضرت عمر فاروقؓ کا رعایا کے حالات سے باخبر رہنے کا طریق اور معمول۔ سچ ہے، جو خدائے سمیع و بصیر و خبیر کے نام پر لوگوں سے اطاعت لے، اسے خود ایسا ہی (بحدِ بشریت) سمیع و بصیر و خبیر ہونا چاہیئے۔ یہی صحرائے شام کی اس بڑھیا نے کہا تھا کہ

> اگر عمرؓ کے پاس رعایا کے حالات سے باخبر رہنے کا انتظام نہیں تو اسے چاہیئے کہ حکومت چھوڑ دے۔

ان مقامات پر، رہ رہ کر میرے جی میں آتا ہے کہ میں فاروقِ اعظمؓ کی اس بات کو بھی نوکِ قلم پر لے آؤں جس کے تصور سے رہگذرِ خیال روشِ صد بہار ہو جاتا ہے لیکن کوئی جذبہ ہے جو غیر شعوری طور پر یہ کہہ کر میرا ہاتھ روک لیتا ہے کہ

> اپنے سینے میں اسے اور ذرا تھام ابھی۔

اس لئے میں اُسے، اس جادۂ جنت نگاہ کی کسی اگلی منزل[1] پر اٹھا رکھتا ہوں۔ ویسے بھی، انتظار کی لذت بڑی دلفریب ہوتی ہے۔ غالب تو یہاں تک کہہ گیا ہے کہ جسے تمنا کہا جاتا ہے وہ انتظار ہی کی سحر آفرینی کا دوسرا نام ہے۔

> پھونکا ہے کس نے گوشِ محبت میں اے خدا۔ افسونِ انتظار، تمنا کہیں جسے

اور اقبالؒ اس "افسونِ انتظار" کے ختم کرنے کے حق ہی میں نہیں، جب وہ کہتا ہے کہ

> طپیدن و نرسیدن چہ عالمے دارد ⁂ خوشا کسے کہ بدُنبالِ محمل است ہنوز

(٥)

اب آیئے اس سفرِ شوق کی اگلی منزل کی طرف۔

---

[1] اس کے لئے دیکھئے بارہواں باب۔

دسواں باب

معاشرتی زندگی

بسیار شیوہ ہاست بتاں را کہ نام نیست

ہم دیکھ چکے ہیں کہ عہدِ فاروقیؓ کا سیاسی نظام کس قدر محکم بنیادوں پر استوار تھا اور وہاں کا ضابطہ قوانین کس طرح ان کی اجتماعی زندگی کے تقاضوں کو پورا کرنے کا کفیل، لیکن زندگی سیاسی دوائر کے اندر ہی تو محصور نہیں ہوتی۔ وہ ترتیب پلتی ہے ان چھوٹے چھوٹے (بظاہر نہایت معمولی) روابط سے جو صبح سے شام تک، قدم قدم پر، ایک فرد کو دیگر افرادِ معاشرہ سے منوط کرتے، اور باہمی تعلقات کے رشتے میں پروتے ہیں۔ یہ رشتے اور یہ تعلقات، قانون کی زنجیروں سے نہیں جکڑے جا سکتے۔ ذرا تصور میں لائیے اس معمولی سے واقعہ کو کہ ایک شخص کو آپ سلام کرتے ہیں اور وہ نہایت بے رُخی سے اس کا جواب دیتا ہے۔ فرمائیے کہ وہ کون سی عدالت ہے جس میں جا کر آپ، اس کے اس طرزِ عمل کے خلاف دعویٰ دائر کریں گے اور وہ کونسا قانون ہے جس کی رُو سے وہ عدالت اسے مجبور کر سکے گی کہ وہ آپ کے ساتھ خندہ پیشانی سے پیش آیا کرے۔ ان روابط کی استواریاں قانون کی زنجیروں سے نہیں بلکہ جذبات کے نہایت نرم و نازک ریشمی دھاگوں سے پیوست ہوتی ہیں۔ یہی وہ روابط ہیں جن کے متعلق اقبالؔ نے کہا ہے کہ

یک نگہ، یک خندۂ دُزدیدہ یک تابندہ اشک
بہرِ پیمانِ محبّت نیست سوگندے دگر

بلکہ غالبؔ کی نازک مزاجی تو " نگہ " اور " نگاہ " میں بھی فرق کرتی ہے۔ چنانچہ وہ کہتا ہے کہ

وہ اِک نگہ جو بظاہر نگاہ سے کم ہے بہت دنوں کے تغافل نے تیرے کی پیدا

سوچئے کہ وہ کون سی میزانِ عدل ہے جو نگہ اور نگاہ کے اس فرق کا وزن کر کے بتا سکے گی؟ سچ ہے۔

بسیار شیوہ ہاست بتاں را کہ نام نیست

یا، اس سے نیچے اتر کر یہ سوچئے کہ دنیا کا وہ کونسا قانون ہے جس کی رُو سے آپ کسی کو (حکماً) یہ کہہ سکیں کہ میاں اصاف ستھرے رہا کرو۔

اب سوچئے کہ آپ قانوناً ایسا کر بھی نہیں سکتے اور معاشرہ کو علیٰ حالہ چھوڑ بھی نہیں سکتے۔ اس کے لئے آپ کو اور طریقے اختیار کرنے پڑیں گے۔ یہ کام سرزنش اور فہمائش سے نہیں ہو سکے گا۔ افہام و تفہیم اور غم خواری و دلسوزی سے ہو سکے گا، اور دوسروں سے کچھ کہنے سے پہلے خود نمونہ بننے سے۔ اس بطلِ جلیل کو، جو قیصر و کسریٰ کے تاج و تخت کا وارث تھا، ان امور کا بھی خیال رہتا تھا اور وہ معاشرہ کی اصلاح کا کوئی موقعہ ہاتھ سے نہیں جانے دیتا تھا۔ (مثلاً)

قانون سے نہیں غمخواری سے

(۱) ایک عورت اپنے خاوند کو آپؐ کے پاس لائی۔ وہ بڑا میلا کچیلا، پراگندہ مُو اور ژولیدہ حال تھا۔ اس نے آپ سے کہا کہ "نہ میں اس شوہر کے قابل ہوں، نہ یہ میرے قابل، مجھے اس سے آزادی (طلاق) دلا دیجئے[1]"۔ آپ نے پہلی نظر میں محسوس کر لیا کہ وہ عورت کس بات سے کراہت کر رہی ہے۔ اُسے تو آپ نے گھر بھیج دیا اور اپنے آدمی سے کہا کہ اُس شخص کو حمام کراؤ، اس کے ناخن ترشواؤ، بال کٹواؤ، صاف ستھرے کپڑے پہناؤ اور پھر میرے پاس لے آؤ۔ وہ جب اس نئی ہیئت ("آدم جون") میں آیا تو آپ نے اس کی بیوی کو بلا بھیجا۔ اس نے پہلے اپنے شوہر کو دیکھا، پھر آپ کی طرف نگاہ اٹھائی اور ایک خفیف سی ہنسی اس کی آنکھوں میں پھر گئی۔ آپ نے فرمایا کہ جاؤ، بسو رسو۔ اور اس کے شوہر سے کہا کہ یاد رکھو! اگر تم نے پھر ایسی صورت بنائی تو تمہیں عمرؓ کا دُرّہ سیدھا کر دے گا۔

غلیظ صورت خاوند

(۲) اکثر کہا کرتے تھے کہ

قبیح صورت اور کمینہ خصلت (زمیم) مردوں سے اپنی عورتوں کی شادیاں نہ کیا کرو۔

بدصورتی

---

[1] آپ نے دیکھا کہ اس دور میں گھر بیٹھے طلاق، طلاق، طلاق کہہ کر قصہ ختم نہیں کر دیتے تھے۔ میاں اور بیوی دونوں کو حقِ طلاق حاصل ہوتا لیکن اس کے لئے حکومت کی طرف رجوع کرنا پڑتا تھا۔

یاد رکھو! جو کچھ تم اپنی بیوی کے سلسلہ میں پسند کرتے ہو، وہی کچھ عورتیں، اپنے خاوندوں کے سلسلہ میں پسند کرتی ہیں۔

(۳) لوگوں کو تاکید کیا کرتے تھے کہ

بالغ اولاد

جب تمہاری اولاد بالغ ہو جائے تو ان کا نکاح کر دیا کرو۔ خواہ مخواہ ان کے گناہوں کا بوجھ اپنے اوپر نہ لادو۔

حسب نسب کا بت

(۴) عربوں کے ہاں، نکاح کے رشتہ کے لئے سب سے پہلے حسب نسب دیکھا جاتا تھا۔ وہ اس باب میں بڑے متشدد واقع ہوئے تھے لیکن اسلام نسلی امتیاز کے بت کو توڑنے کے لئے آیا تھا۔ اس لئے آپ فرمایا کرتے تھے کہ

مرد کا حسب، اس کا دین ہے، نسب اس کی عقل .... اور مردانگی اس کا حسنِ خُلق ہے۔

تصورات کی دنیا میں نہ رہو

(۵) ایک شخص اپنی بیوی کو طلاق دینا چاہتا تھا۔ آپ نے وجہ پوچھی تو اس نے کہا کہ وہ میرے معیارِ محبت پر پوری نہیں اترتی۔ آپ نے فرمایا کہ میرے بھائی! میاں بیوی کے تعلقات میں تصوراتی (IDEAL) معیار تلاش نہیں کیا کرتے۔ یہ عملی زندگی ہوتی ہے، اس میں رعایت اور رواداری (GIVE AND TAKE) کا مسلک اختیار کرنا چاہیئے۔

(۶) ایک دفعہ میاں بیوی کے تعلقات کے سلسلہ میں باتیں کرتے ہوئے فرمایا کہ

بدترین اور بہترین بیوی

کفر بدترین شے ہے۔ اس کے بعد ایک تیز زبان اور بدخُلق بیوی سے بدتر شے کوئی نہیں۔ اسی طرح ایمان بہترین شے ہے اس کے بعد ایک خوش خُلق محبت کرنے والی بیوی سے بہتر کوئی شے نہیں۔

بدظنی کا موقعہ نہ دو

(۷) ایک دفعہ بازار سے گزر رہے تھے۔ دیکھا کہ ایک شخص، شارعِ عام پر ایک عورت سے باتیں کر رہا ہے۔ غصہ آ گیا۔ گئے اور اسے ایک بید رسید کر دیا۔ اس نے کہا۔ امیرالمومنین! یہ میری بیوی ہے۔ فرمایا۔ تیری بیوی ہے تو سرِبازار اس سے باتیں کیوں کر رہا ہے؟ خواہ مخواہ مسلمانوں کو غیبت کرنے پر مجبور کرتا ہے؟

اس نے کہا۔ امیرالمومنین! ہم نووارد ہیں۔ ابھی ابھی شہر میں داخل ہوئے ہیں۔ باہم مشورہ کر رہے

ہیں کہ ہم کہاں ٹھہریں! یہ بات بہر حال اسی جگہ کھڑے ہو کر کی جا سکتی تھی۔

یہ سُنکر آپ کو اپنی غلطی کا احساس ہوا۔ وہی بید اس کے ہاتھ میں دیا کہ "اے بندۂ خدا! اپنا بدلہ لے لے۔" اس نے معذرت کرتے ہوئے کہا کہ۔

امیر المومنین! یہ بید (درّہ) آپ کا ہے۔ آپ ہی اپنے ہاتھ میں رکھئے۔

اس کے جواب میں آپ نے فرمایا کہ

دُرّہ اللہ کا ہے

سنو میرے بھائی! یہ درّہ نہ میرا ہے نہ تمہارا، یہ اللہ کا درّہ ہے۔ اسے اللہ کی راہ میں اٹھنا چاہیئے۔

اس نے کہا کہ

یہ درست ہے کہ یہ دُرّہ اللہ کا ہے لیکن اللہ نے اسے آپ ہی کو دیا ہے۔ یہ آپکو مبارک ہو۔

اللہ اکبر! کیسا تھا وہ معاشرہ جس میں عام لوگ بھی اس قسم کی باتیں کیا کرتے تھے۔

تبرّج جاہلیہ

(۸) ایک عورت کو دیکھا کہ بناؤ سنگھار کئے "تبرّجِ جاہلیہ کا انداز لئے" بازار میں پھر رہی ہے۔ آپ نے دریافت کیا تو معلوم ہوا کہ اس کے خاوند نے اسے اس کی اجازت دے رکھی ہے۔ آپ نے فرمایا کہ اس باب میں اس کی اجازت کچھ معنی نہیں رکھتی۔ بناؤ سنگھار کی ممانعت نہیں لیکن اس کا اظہار اپنے باپ بھائی وغیرہ (محرموں) تک محدود رہنا چاہیئے۔ تبرّج جاہلیہ کی اجازت قرآن نہیں دیتا۔

ڈاڑھی سلیقہ سے رکھو

(۹) دوسری طرف آپ نے ایک آدمی کو دیکھا کہ اس نے بے ہنگم طریق سے اپنی ڈاڑھی بڑھا رکھی ہے۔ آپ نے اس کی ڈاڑھی پکڑ کر اسے اپنی طرف کھینچا اور کہا کہ اس بدہیئتی کے کیا معنی؟ پھر آپ نے قینچی منگائی اور اس کی وضع قطع درست کی۔ اس کے بعد فرمایا۔

بعض لوگ اپنے آپ کو اسطرح چھوڑ دیتے ہیں گویا وہ درندوں میں سے ایک درندہ ہے۔[۱]

اس سلسلہ میں اس قسم کے ارشاداتِ نبویؐ بھی ہمارے سامنے آتے ہیں۔ ایک روایت میں ہے کہ حضورؐ نے فرمایا۔

---

[۱] بیہقی، والہ "اسلامی معاشیات" از مولانا مناظر احسن گیلانی (مرحوم) صہ ۲۴۔

جب اللہ نے تمہیں خوشحال کیا ہے تو ضروری ہے کہ اس کی اس نعمت اور سرفرازی کا اظہار تمہاری وضع قطع اور رہن سہن سے ہو۔ (نسائی)

اسی ارشاد گرامی کی وضاحت میں دوسری جگہ آپ نے فرمایا کہ

اللہ تعالٰی اسے پسند کرتا ہے کہ جو نعمت اس نے اپنے کسی بندے کو عطا کی ہے، اس کے نشانات وعلامات اس بندے میں دیکھے۔ (ترمذی)

(۱۰) ایک دفعہ حضرت عمرؓ نے ایک زاہدِ مرتاض کو دیکھا جس نے دنیا کی ہر نعمت کو اپنے اوپر حرام قرار

زاہدِ مرتاض

دے رکھا تھا۔ اسے ایک ہنٹر رسید کیا اور فرمایا۔

خدا تجھے غارت کرے، ہمارے دین کا گلا کیوں گھونٹتا ہے۔

(۱۱) اچھے کھانے اور اچھے پہننے کی تاکید کے ساتھ ساتھ یہ بھی ارشاد تھا کہ

سخت کوش رہو

سخت کوش بنو اور عجمیوں کی طرح نازو انداز نہ کرو۔

اپنے آپ کو عجمیوں کے لباس سے بچاؤ۔

زیب و زینت کے لباس عورتوں کے لئے رہنے دو۔

اپنی ہیئت عورتوں جیسی کبھی نہ بناؤ۔

(۱۲) آپ سے دریافت کیا گیا کہ

کم مال اور کثرت عیال

دنیا میں سب سے بڑی مصیبت کون سی ہے!

فرمایا۔

کم مال اور کثرتِ عیال سب سے بڑی مصیبت ہے۔

(۱۳) آپ جوانوں سے اکثر کہا کرتے تھے کہ

جوانی میں احتیاط

جوانی کے زمانے میں ہر ایسی بات سے بچو جو تمہاری بدنامی کا باعث ہو، تاکہ اگر تم بعد میں بڑے آدمی بن جاؤ تو تمہارا ماضی تمہارے لئے وجہ ندامت نہ ہو۔

(۱۴) آپ نے اہلِ شام کو لکھا:۔

بچوں کی تربیت

اپنے بچوں کو کتابت، تیراکی، تیراندازی اور شہ سواری سکھاؤ۔ انہیں حکم دو کہ وہ گھوڑوں پر کود کر چڑھا کریں۔ نیز انہیں مشہور امثال اور اچھے اشعار

یاد کراؤ۔

خود اپنے بیٹے، عبدالرحمٰن سے فرمایا کہ "بیٹا! اچھے اچھے شعر یاد کیا کرو تاکہ تمہارے ادب میں اضافہ ہو جسے اچھے شعر یاد نہ ہوں وہ کبھی ادیب نہیں بن سکتا۔"

شعر سے دلچسپی

عربوں کی شاعری کے متعلق فرمایا۔

> اہلِ عرب کا بہترین فن اشعار ہیں کہ انسان اپنی ضروریات میں ان سے کام لیتا ہے۔ یہ سخی کو مائل بہ کرم کر دیتا ہے حتیٰ کہ بخیل کا دل بھی نرم کر دیتا ہے۔

ایک دفعہ فرمایا۔

> شعر ایک ایسی قوم کا فن تھا جس کے پاس اس سے بہتر کوئی فن نہیں تھا۔ جب اسلام آیا تو اہلِ عرب جہاد میں مصروف ہو گئے اور شعر اور اس کی روایات سے غافل ہو گئے۔ بعد ازاں جب اسلام پھیل گیا، فتوحات کی کثرت ہو گئی اور اہلِ عرب شہروں میں اطمینان سے بیٹھ گئے، تو پھر روایتِ شعر کی طرف رجوع کرنے لگے۔ ان کے پاس نہ کوئی مدوّن دیوان تھا نہ کوئی لکھی ہوئی کتاب۔ بہت سے عرب طبعی موت یا تلوار کی نذر ہو چکے تھے۔ لہٰذا جو کچھ انہوں نے پایا اسے یاد کر لیا، اگرچہ بہت سا شعری سرمایہ ضائع ہو گیا اور بہت کم محفوظ رہا۔

یہ تو بالتحقیق نہیں کہا جا سکتا کہ آپ خود بھی شعر کہتے تھے یا نہیں لیکن تاریخی واقعات اس کی شہادت دیتے ہیں کہ آپ کو اس قدر شعر یاد تھے کہ جو اہم بات بھی آپ کے سامنے آتی، اس کے متعلق آپ حسبِ حال شعر سنا دیا کرتے اور شعر کا ذوق اتنا بلند اور مذاق ایسا سلیم تھا کہ بڑے بڑے شعراء کا کلام آپ کے سامنے محاکمہ کے لئے پیش کیا جاتا اور آپ اس سلسلہ میں ایسے لطیف نکات بیان فرماتے کہ اہلِ مجلس عش عش کر اٹھتے۔ کتبِ محاضرات و ادب آپ سے متعلق اس قسم کی داستانوں سے بھری پڑی ہیں۔

ہم سمجھتے ہیں کہ یہ پڑھتے وقت آپ کے دل میں دو خیالات ضرور ابھر رہے ہوں گے۔ ایک یہ کہ قرآن کریم نے شعراء کی مذمت کی ہے اور دوسرے یہ کہ (جیسا کہ سابقہ باب میں ہمارے سامنے آ چکا ہے۔) حضرت عمرؓ نے نعمان بن عدی کے شعر سنے تو انہیں یہ کہہ کر گورنری کے عہدہ سے معزول کر دیا تھا کہ تم شاعر تو اچھے ہو لیکن گورنری کے اہل نہیں ہو سکتے۔ ان حالات کے پیشِ نظر آپ کے ذوقِ شعری کے متعلق کیا کہا جائے گا؟

پہلے اعتراض کے متعلق یہ سمجھ لینا چاہیئے کہ قرآنِ کریم نے جہاں شاعری کی مخالفت کی ہے تو اس

قرآن اور شاعری

سے یہ مراد نہیں کہ اگر ایک بات نثر میں بیان کر دی جائے تو وہ قرآن کے نزدیک مستحسن، یا کم از کم قابلِ قبول ہوگی، اور اگر اسی بات کو موزوں الفاظ (یعنی اشعار) میں بیان کر دیا جائے، تو وہ اس کی رُو سے مذموم و مردود قرار پا جائے گی۔ یہ صحیح نہیں۔ قرآن اسلوبِ بیان سے بحث نہیں کرتا، مقصودِ بیان سے بحث کرتا ہے۔ قرآن کے نزدیک شاعری ایک ذہنیت یا نفسیاتی کیفیت کا نام ہے، جو اُس ذہنیت کے خلاف ہے جسے قرآن پیدا کرنا یا ابھارنا چاہتا ہے۔ قرآنِ کریم زندگی کا ایک متعین مقصد بتاتا ہے اور انسان کے سامنے ایک واضح نصب العین رکھتا ہے۔ وہ اس نصب العین کو بدلائل و براہین پیش کرتا اور پھر اس راستے کی طرف راہنمائی کرتا ہے جو کاروانِ انسانیت کو سیدھا اس منزل تک لے جائے۔ اس کے برعکس، شاعری انسانی جذبات سے کھیلتی ہے۔ اس کے سامنے نہ زندگی کا کوئی متعین مقصد ہوتا ہے، نہ انسانی تگ و تاز کا کوئی واضح نصب العین۔ اس کی کشتی جذباتی طوفان کی موجوں کے رحم و کرم پر ہوتی ہے کہ — جس جگہ پر جا لگی وہ ہی کنارا ہو گیا۔ اس حقیقت کو قرآنِ کریم نے ان آیاتِ جلیلہ میں نہایت حسین اور بلیغ انداز میں بیان کیا ہے جن میں شعراء کی مذمت کی گئی ہے۔ وہ کہتا ہے کہ وَالشُّعَرَآءُ يَتَّبِعُهُمُ الْغَاوٗنَ۔ شاعروں کے پیچھے لگنے والے وہ فریب خوردہ لوگ ہوتے ہیں جو جذبات کی رَو میں بہلے چلے جاتے ہیں اور کبھی حقائق کا سامنا نہیں کرتے۔ تعداد کے لحاظ سے دیکھو تو ٹڈی دل کی طرح بے شمار لیکن نتیجہ کے اعتبار سے دیکھو تو تخریب ہی تخریب۔ اَلَمْ تَرَ اَنَّهُمْ فِيْ كُلِّ وَادٍ يَّهِيْمُوْنَ۔ باقی رہے خود شاعر، تو ان کی حالت اس اُونٹ کی سی ہوتی ہے جو جھوٹی پیاس کی بیماری میں مبتلا ہو اور اس کی وجہ سے مختلف وادیوں اور بیابانوں میں مارا مارا پھرتا رہے اور اس کی پیاس کہیں بجھنے نہ پائے — ساری عمر جذبات کی رو میں بہے چلے جانے والا اور جذبات بھی جھوٹے اور بناوٹی۔ وَاَنَّهُمْ يَقُوْلُوْنَ مَا لَا يَفْعَلُوْنَ۔ اور سب سے بڑی بات یہ کہ ان کی اپنی زندگی اس کے مطابق نہیں ہوتی جو وہ کہتے ہیں — ان کے قال اور حال — قول اور عمل میں تطابق نہیں ہوتا۔ اِلَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَذَكَرُوا اللّٰهَ كَثِيْرًا وَّانْتَصَرُوْا مِنْۢ بَعْدِ مَا ظُلِمُوْا وَسَيَعْلَمُ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْٓا اَيَّ مُنْقَلَبٍ يَّنْقَلِبُوْنَ — (۲۶/ ۲۲۴-۲۲۷) "ان کے برعکس وحی پر ایمان لانے والے ہیں جو ایک متعین نصب العین پر یقین رکھتے اور زندگی کے صلاحیت بخش پروگرام پر عمل پیرا رہتے ہیں۔ وہ زندگی کے ہر گوشے میں قانونِ خداوندی

کو اپنے سامنے رکھتے ہیں. جب کوئی ان پر ظلم و زیادتی کرتا ہے تو وہ (شاعروں کی طرح اس کی ہجو لکھ کر اپنا کلیجہ ٹھنڈا نہیں کر لیتے بلکہ) اس سے زیادتی کا بدلہ لیتے ہیں (اور ایک ایسا نظام قائم کرتے ہیں، جس میں ظلم اور زیادتی کرنے والے بدلگام نہ پھرتے رہیں کہ جو ان کے جی میں آئے کرتے رہیں، انہیں کوئی روکنے ٹوکنے والا ہی نہ ہو) اُس نظام میں ایسے لوگوں کو صاف نظر آجاتا ہے کہ انہیں ان کی غلط روش سے لوٹا کر کس مقام پر لایا جائے گا اور ان کا ٹھکانا کون سا ہوگا." یہ وجہ ہے جو اس نے کہا ہے کہ شاعری ایک داعیٔ انقلاب (رسول) کے شایانِ شان نہیں ہوتی. (۳۶/۶۹)

دوسری وجہ یہ ہے کہ (دیگر اقوامِ عالم مثلاً اہلِ یونان وغیرہ کی طرح) عربوں کا بھی یہ عقیدہ تھا کہ (کاہنوں اور نجومیوں کی طرح) شاعروں کو بھی "الہام" ہوتا ہے. ہاتف یا سروش ان کی طرف غیب سے پیغامات لاتا ہے. قرآنِ کریم نے اس تصور اور عقیدہ کی شدت کے ساتھ تردید کی. اس نے کہا کہ انسانی علم کا ذریعہ اس کی اپنی قوتِ فکر ہے جو مطالعہ، مشاہدہ، تجربہ سے جِلا پاتی ہے. اس میں "غیب" کا کوئی دخل نہیں ہوتا اس کلیہ میں استثنار صرف وحی کی ہوتی ہے جو مخصوص ہے نبوت کے ساتھ. نبی کے علاوہ اور کسی کو کوئی علم، غیب سے نہیں ملتا. کشف، الہام وغیرہ کے سب دعاوی باطل ہیں. بنا بریں، قرآنِ کریم نے، کاہنوں، نجومیوں، شاعروں (یعنی غیب سے علم حاصل کرنے کے مدعیوں) کو للکار کر کہا کہ تمہارا دعوےٰ باطل ہے. (تفصیل کے لئے دیکھئے لغات القرآن، عنوان ش. ع. ر. نیز اسی کتاب کا آخری باب).

یہ ہے شاعری کی وہ ذہنیت اور ادّعائیت جس کی قرآن نے تردید کی ہے. ورنہ جہاں تک موزوں اندازِ بیان کا تعلق ہے' اس کی مذمت کسی نے نہیں کی. حضرت حسان بن ثابتؓ خود رسول اللہؐ کے حضور شعر پڑھا کرتے تھے بلکہ بعض اوقات حضورؐ خود ان سے شعر خوانی کی فرمائش کیا کرتے تھے. حضورؐ کا ذوقِ شعر و

شعرا اور نبی اکرمؐ

ادب بڑا بلند تھا. فرق یہ تھا کہ جہاں کوئی شاعر (یا شعر) انسان کو غلط راستے کی طرف لے جاتا، اسے ٹوک اور روک دیا جاتا تھا. امراء القیس عرب کا نامور شاعر تھا. اس کے متعلق حضورؐ نے ایک موقع پر فرمایا تھا کہ اشعر الشعراء و قائدھم الی النار. وہ شاعروں کا سرتاج بھی ہے اور ان کے جہنّم کی طرف جانے والے قافلہ کا سالار بھی. ایک دفعہ مشہور شاعر عنترہ کا یہ شعر حضورؐ کے سامنے پڑھا گیا.

ولقد ابیت علی الطوی واظلہ - حتیٰ انال بہ کریم الماکل

(میں نے بہت سی راتیں محنت اور مشقت میں بسر کی ہیں تاکہ میں اکل حلال کے قابل ہو سکوں)

تو حضورؐ اسے سنکر بہت محظوظ ہوئے اور صحابہؓ سے فرمایا کہ "کسی معروف عرب کی ملاقات کا شوق میرے دل میں کبھی پیدا نہیں ہوا لیکن میں سچ کہتا ہوں کہ جس نے یہ شعر کہا ہے اسے دیکھنے کو میرا دل بے اختیار چاہتا ہے۔"

شعر و شاعری کے متعلق یہی انداز حضرت عمرؓ کا تھا۔ وہ شعر کو بدل پسند کرتے تھے لیکن اسی شعر کو جو حقائق کے آئینہ دار ہو اور زندگی اور حرارت کا پیغام بر۔ ایسے شعر کے کیا کہنے! اقبالؒ کے الفاظ میں:۔

وہ شعر کہ پیغامِ حیاتِ ابدی ہے
یا نغمۂ جبریل ہے یا بانگِ سرافیل

اب رہا دوسرا سوال کہ جب آپ خود شعر پسند کرتے تھے تو نعمان بن عدی کو ان کے شعر کہنے کی بنا پر گورنری کے عہدے سے معزول کیوں کر دیا تھا؟ بات واضح ہے۔ شاعر کی کیفیت یہ ہوتی ہے کہ جب اس کی ملاقات "ہاتف" سے ہو جائے تو وہ دنیا و مافیہا سے بے خبر ہو جاتا ہے۔ وہ جذبات نگاری اور نکات آفرینی میں اس قدر جذب اور محو ہوتا ہے کہ دنیائے ممکنات کا اسے کچھ ہوش نہیں رہتا۔ اس کی کیفیت یہ ہوتی ہے کہ ــــ افکار میں سرمست نہ خوابیدہ نہ بیدار ــــ آپ سوچئے کہ ایسا شخص گورنری جیسے اہم منصب کی ذمہ داریوں کو کیسے پورا کر سکتا ہے؟ آپ اپنے ہاں کے نامور شعراء کے حالاتِ زندگی پڑھیئے۔ اگر ان کا کہیں سے وظیفہ نہیں بندھ گیا، تو ان کی اور ان کے دحرمان نصیب ، بیوی بچوں کی ساری عمر فاقے کاٹتے گزر جاتی ہے۔ سو جو لوگ اپنی معاش تک کا انتظام نہیں کر سکتے وہ ایک ملک کا نظام کیسے سنبھال سکتے ہیں!

حضرت عمرؓ شاعری نہیں کرتے تھے، شعر سمجھتے اور اس سے کیف اندوز ہوتے تھے۔

موسیقی کا ذوق

شعر ہی نہیں، آپ موسیقی سے بھی لطف اندوز ہوتے تھے۔ عربوں کی موسیقی زیادہ تر حُدی خوانی اور رجز نوائی تک محدود تھی۔ اس سے آپ کیف اندوز بھی ہوتے تھے اور کبھی کبھی خود بھی ترنّم سے شعر پڑھا کرتے تھے۔ حضرت عبدالرحمٰن بن عوفؓ بیان فرماتے ہیں کہ ایک دفعہ میں حضرت عمرؓ کے مکان پر آیا تو میں نے سُنا کہ اندر حضرت عمرؓ حُدی خوانوں کی طرح گا رہے ہیں۔ میں اندر گیا تو انہوں نے مجھ سے پوچھا کہ جو کچھ میں پڑھ رہا تھا، تو نے اسے سُنا تھا۔ جب میں نے کہا ہاں، تو فرمایا کہ جب ہم تنہا

ہوتے ہیں تو جیسے عام لوگ گاتے ہیں، ہم بھی گاتے ہیں۔

تنہائی ہی میں نہیں بلکہ جلوت میں بھی۔ ایک دفعہ آپ کسی قافلے کے ساتھ جا رہے تھے تو ایک شعر اس ترنم کے ساتھ پڑھا کہ لوگ سننے کے لئے گرد جمع ہوگئے۔ آپ نے یہ دیکھا تو جھٹ سے قرآن پڑھنا شروع کر دیا۔ اس پر لوگ منتشر ہوگئے۔ پھر ویسے ہی شعر گایا تو لوگ جمع ہوگئے اور جب آپ نے پھر قرآن پڑھنا شروع کر دیا تو وہ منتشر ہوگئے۔ ہنس کر فرمایا کہ ان شیطانوں کی ذُرّیت کو دیکھو۔ گانا گاتا ہوں تو لپک کر آجاتے ہیں اور قرآن پڑھتا ہوں تو بھاگ جاتے ہیں۔

ایک قافلہ کے ساتھ، جس میں حضرت عمرؓ، حضرت عثمانؓ اور حضرت ابن عباسؓ بھی تھے، چرواہوں کی ایک ٹولی آملی۔ شام ہوئی تو چرواہوں نے رباح فہری سے، جو مشہور گانے والا تھا، حُدی خوانی کی فرمائش کی۔ رباح نے یہ کہتے ہوئے انکار کر دیا کہ قافلے کے ساتھ حضرت عمرؓ بھی ہیں۔ انہوں نے کہا کہ تم شروع کرو۔ اگر حضرت عمرؓ نے روک دیا تو بند کر دینا۔ اس نے شروع کیا تو حضرت عمرؓ نے کوئی اعتراض نہ کیا بلکہ سُنکر خوش ہوئے۔ جب صبح ہوئی، تو رباح سے کہا کہ اب بس کرو۔ ذکرِ الٰہی کا وقت آگیا ہے۔ دوسری شب چرواہوں نے رباح سے ایک اور گانے کی فرمائش کی۔ جو حُدی خوانوں ہی کے انداز کا تھا۔ اس سے بھی حضرت عمرؓ اسی طرح کیف اندوز ہوتے رہے۔ تیسری شب انہوں نے کچھ بازاری قسم کے گانے کی فرمائش کی تو اسے سُن کر آپ نے رباح سے کہا کہ یہ نہیں بھائی۔ اس سے دلوں میں انقباض اور کدورت پیدا ہوتی ہے۔

ان واقعات سے، موسیقی کے جواز و عدم جواز، اور سرودِ حلال و حرام، کا مسئلہ حل ہو جاتا ہے۔ حضرت عمرؓ کے کھینچے ہوئے یہی خطوطِ امتیاز تھے جن کی روشنی میں اقبالؒ نے کہا تھا کہ "سرودِ حلال" وہ ہے کہ —

— جس کی گرمی سے پگھل جائے ستاروں کا وجود —

جس کی تاثیر سے آدم ہو غم و خوف سے پاک
اور پیدا ہو ایازی سے مقامِ محمود

اس کے برعکس:

اگر نوا میں ہے پوشیدہ موت کا پیغام ؛ حرام میری نگاہوں میں نائے و چنگ و رباب

حسین مجسّمے

یہ ہم چھٹے باب (فتح مدائن کے سلسلہ) میں دیکھ چکے ہیں کہ جب مدائن کی فتح کے بعد، اسلامی لشکر کسریٰ کے قصرِ ابیض میں داخل ہوا تو اس میں یہاں وہاں

مجسموں کے حسین و جمیل شاہکار نصب تھے۔ حضرت سعد بن ابی وقاصؓ نے انہیں نہایت احتیاط سے محفوظ رکھا اور بارگہ خلافت نے ان کے اس فیصلے کی تصویب فرمائی۔ حقیقت یہ ہے کہ فنونِ لطیفہ، انسانی زندگی کے نرم و نازک غیر مرئی گوشوں کے محسوس مظاہرے ہوتے ہیں۔ اس لئے اسلام جیسے مبنی برحقیقت، انسانیت ساز، دین میں، جس کا مقصد انسانی ذات کی صلاحیتوں اور ذوق کی برومندی ہے، ان کی ممانعت کیسے ہو سکتی ہے۔ یہ انسان کی تحسینِ جمالیات کی صلاحیتوں کو بیدار کرنے، اور انہیں نشو و نما دینے کے ذرائع ہیں۔ اگر یہ اس مقصد کو پورا کرتے ہیں تو "حلال" ہیں اور اگر اس کے خلاف جاتے ہیں تو "حرام" ہیں۔ اس امتیازی خط کے لئے بھی ہمیں پھر حکیم الامتؒ ہی کی طرف رجوع کرنا پڑتا ہے۔ جنھوں نے کہا ہے کہ

اے اہلِ نظر، ذوقِ نظر خوب ہے لیکن ⁂ جو شے کی حقیقت کو نہ دیکھے وہ نظر کیا

بے معجزہ دنیا میں ابھرتی نہیں قومیں ⁂ جو ضربِ کلیمی نہیں رکھتا، وہ ہنر کیا

اسلام کے صدرِ اوّل کا "ہنر" ضربِ کلیمی کا مظہر تھا اور اسی لئے حضرت عمرؓ مختلف علوم و فنون کے ماہرین کی قدر افزائی فرمایا کرتے تھے۔ حتیٰ کہ آپ علمِ نجوم سیکھنے کی بھی تاکید کیا کرتے تھے تاکہ ستاروں سے صحیح سمت معلوم کی جا سکے۔ (علم نجوم سے مراد علم الافلاک ہے نہ "نجومیوں" کی طرح ستاروں سے قسمت معلوم کرنا)

(۱۵) انہی واقعات سے یہ حقیقت بھی ہمارے سامنے آ جاتی ہے کہ حضرت عمرؓ کے متعلق جو تصور عام طور پر ذہنوں میں راسخ ہوتا ہے کہ وہ بڑے درشت مزاج اور "عبوساً قمطریرا" (حارو یابس قسم کے انسان تھے، جن کے ہاتھ میں ہر وقت درہ (معاذ اللہ) منہ میں جھاگ، آنکھوں میں شعلے اور ماتھے پر شکن رہتے تھے، وہ ان کی غلط تصویر ہے۔ وہ نہایت لطیف حسیات کے حامل تھے۔ بلند ترین ذوقِ جمالیات کے پیکر، ان کے مزاج میں شگفتگی بھی تھی جو کبھی کبھی ہلکے سے کیف آور مزاح کے رنگ میں، چھلک بھی پڑتی ہے۔ ایک دفعہ آپ

شگفتہ مزاجی

نے ایک بدّو کو دیکھا کہ اس نے جلدی جلدی نماز پڑھی اور اس کے بعد دعا مانگی کہ یا اللہ! میری شادی کسی بڑی خوبصورت حور سے کر دے۔ آپ نے فرمایا کہ "اسے دیکھو! مہر کتنا کم باندھتا ہے اور بیوی کیسی بلند پایہ مانگتا ہے۔"

جس شخص کی طبیعت میں ایسی ملیح ظرافت ہو، وہ خشک مزاج کیسے ہو سکتا ہے! مومن خشک مزاج ہوتا ہی نہیں۔ وہ تو "عجم کے حسنِ طبیعت، عرب کے سوزِ دروں" کا دلآویز امتزاج ہوتا ہے لیکن وہ اپنے ذوقِ لطیف کو فرائضِ زندگی پر غالب نہیں آنے دیتا۔ وہ اسے زندگی کی گاڑی میں "موبل آئل" کی طرح

استعمال کرتا ہے۔ پٹرول کی ٹینکی اس سے نہیں بھر لیتا۔

(۱۶) مزاج کی شگفتگی ہی نہیں، قلب کی رقّت بھی۔

رقیق القلب بھی

ہم سمجھتے ہیں کہ" قلب کی رقّت" کا عنوان دیکھ کر آپ ضرور متعجب ہوئے ہوں گے کہ۔ حضرت عمرؓ اور رقیق القلب! جی ہاں، حضرت عمرؓ اور رقیق القلب۔ یعنی اقبالؒ کے اس تصوّر کا مردِ مومن ــ

تنے پیدا کن از مشتِ غبارے ⁂ تنے محکم تر از سنگیں حصارے

درونِ اُو دلِ دردآشنائے ⁂ چو جوئے در کنارِ کوہسارے

ہم سابقہ باب میں دیکھ چکے ہیں کہ جب آپ ایک شخص کی گورنری کی تعیناتی کی دستاویز لکھا رہے تھے تو کس طرح ایک بچہ آکر آپ کی گود میں بیٹھ گیا تھا اور آپ اس سے پیار کرنے لگ گئے تھے۔ پھر اُس (منتخب) گورنر نے کیا کہا تھا اور آپ نے اسے کس بنا پر اُس منصب کا نااہل قرار دے دیا تھا ــ اس بنا پر کہ اس کے دل میں رحم کے جذبات نہیں۔

(۲) ہم بابِ اوّل میں یہ بھی دیکھ چکے ہیں (حضرت) عمرؓ (زمانہ جاہلیہ میں) مسلمانوں کو کس قدر اذیتیں دیا کرتے تھے۔ جب اِن کی اِن اذیتوں سے تنگ آکر اُم عبداللہ بن ختمہؓ نے مکہ چھوڑ کر حبش کی طرف ہجرت کر جانے کا فیصلہ کیا تو حضرت عمرؓ ان کے پاس آئے اور کہنے لگے کہ اُم عبداللہ! کیا سچ مچ جا رہی ہو۔ اس نے کہا کہ ہاں! جا رہی ہوں۔

تم رہو اس دیس میں، ہم سے رہا نہ جائے۔

یہ سنکر عمرؓ پر عجیب کیفیت طاری ہوئی۔ منہ سے بس اتنا کہہ سکے کہ ــ" جاؤ۔ خدا حافظ "۔ زبان سے یہ کہا اور آنکھوں سے آنسو ٹپک پڑے۔

عمرؓ کی اس کیفیت کو دیکھ کر اُم عبداللہ نے کہا تھا کہ مجھے امید ہے عمرؓ اسلام لے آئے گا۔ کیسی ژرف بیں نگاہیں تھیں اس دور کی خواتین کی۔!!

اُسی باب میں ہم یہ بھی دیکھ چکے ہیں کہ جب عمر ابن خطاب نے رات کے سناٹے میں "غلافِ کعبہ

حریمِ کعبہ میں

کے پیچھے چھپ کر، نبی اکرمؐ کو قرآن پڑھتے سنا، تو آپ (عمرؓ) کے قلب پر کس طرح رقّت طاری ہوئی اور...... آنکھوں سے کس طرح آنسو ٹپ ٹپ کر کے گرنے لگے۔ یہی

وہ رقت تھی جو عمرؓ کو کشاں کشاں بابِ نبوی تک لے گئی اور یہ کہتے ہوئے لوٹی کہ

ابدی بادِ بہارے تو کہ در انجمنت ٭ کفِ خاک آمدم و جوشِ بہاراں رفتم

(۳) سنان بن سلمہ کا بیان ہے کہ ہم چھوٹے چھوٹے بچے، کھجوروں کے درختوں کے نیچے گری پڑی کھجوریں چنا کرتے تھے۔ ایک دن عمرؓ بن خطاب ادھر آنکلے تو سب بچے ان کے ڈر کے مارے بھاگ گئے لیکن مجھ سے بھاگا نہ گیا۔ جب وہ میرے پاس آئے تو میں نے کہا کہ امیر المومنین! یہ کھجوریں ہم نے درختوں کے نیچے سے چنی ہیں۔ آپ نے کہا کہ مجھے دکھاؤ۔ کھجوریں دیکھنے کے بعد کہا کہ ہاں ٹھیک ہے۔ تم جاؤ۔

میں نے کہا کہ امیر المومنین! میں اکیلا کیسے جاؤں۔ باقی لڑکے میری کھجوریں چھین لیں گے۔ آپ نے یہ بات سنی تو مجھے گھر تک چھوڑ آئے۔

(۴) انسان تو ایک طرف، وہ تو حیوانات کی تکلیف بھی نہیں دیکھ سکتے تھے۔ مسیب بن دارم نے کہا کہ میں نے ایک دن حضرت عمرؓ کو دیکھا، آپ ایک اونٹ والے کو ڈانٹ رہے تھے کہ اس نے اپنے اونٹ پر اتنا بوجھ کیوں لاد دیا ہے جسے وہ بہ مشقت اٹھا سکتا ہے۔

(۵) اور قرآنِ کریم کی آیات سن کر تو وہ ہچکیاں لے لے کر رونے لگ جاتے تھے۔ حضرت ابن عمرؓ کا بیان ہے کہ ایک دن میں نے آپ کے پیچھے نماز پڑھی تو تین صفوں کے پیچھے سے آپ کے رونے کی آواز سنائی دے رہی تھی۔

(۶) اور آپ کے خادم اسلم کی یہ روایت تو ہماری نظروں سے گزر چکی ہے کہ جب کسی نے پوچھا کہ حضرت عمرؓ کو سخت غصہ آتا ہے تو تم کیا کرتے ہو، تو اس نے کہا تھا کہ ہم اس وقت قرآنِ کریم کی کوئی مناسب آیت پڑھ دیتے ہیں، آپ کا غصہ فوراً فرو ہو جاتا ہے۔

اب ایک اور نازک مقام سامنے آتا ہے۔ ایک سربراہِ مملکت (یا ایسے ہی کسی اور ذمہ دار شخص) کے لئے

عدل و رحم کے تقاضے

نہایت مشکل ہوتا ہے کہ وہ عدل و انصاف کی ذمہ داریوں کے ساتھ ہمدردی اور رحم کے جذبات کو بھی نبھا لے۔ ایسے مقامات سے، جن میں عدل کا تقاضا کچھ اور ہو اور رحم کا تقاضا کچھ اور، صحیح و سلامت گزر جانا، بڑے ہی صاحبِ عزم و ہمت کا کام ہوتا ہے۔

ان متضاد جذبات کے تصادم اور تصادم میں اپنی ذمہ داریوں کو نظر انداز نہ ہونے دینے، کی بے نظیر مثالیں اسوۂ نبی اکرم میں جھلمل جھلمل کرتی سامنے آتیں اور وجہِ تابانیٔ فکر و بصیرت بنتی ہیں ــــــ

ایک اور واقعہ سنئے اور کلیجہ تھام کر رہ جایئے۔

آپؐ نے ایک قتل کے مجرم 'یہودی کو' موت کی سزا کا حکم سنایا۔ مجرم پا بجولاں سامنے کھڑا تھا اور جلاد تلوار ہاتھ میں لیے حضورؐ کے اشارہ کا منتظر کہ اتنے میں اس یہودی کی چھوٹی سی بچی، روتی چیختی دوڑے دوڑے آئی اور حضورؐ کی ٹانگوں سے لپٹ کر نالۂ جگر پاش کے ساتھ چلائی کہ میرے بابا کو قتل نہ کیجئے۔ مجھے یتیمی کے داغ سے بچایئے۔

یہودی کی لڑکی کا واقعہ

بچی کی گریہ وزاری سے حضورؐ کی آنکھوں سے آنسو رواں ہو گئے۔ آپ نے اس کے سر پر شفقت کا ہاتھ پھیرا۔ ارد گرد کھڑے لوگوں نے خیال کیا کہ اب آپ اس مجرم کو چھوڑ دیں گے لیکن حضورؐ نے انگلی کے اشارے سے جلاد کو حکم دے دیا کہ مجرم کا سر قلم کر دیا جائے۔

بعد ازاں صحابہؓ نے عرض کیا کہ حضورؐ! آپ کی آنکھوں کے آنسوؤں کے بعد، انگلی کا وہ اشارہ ہماری سمجھ میں نہیں آیا۔ اس کے جواب میں حضورؐ نے جو کچھ ارشاد فرمایا، اس پر غور کیجئے اور سوچیئے کہ کیا اس کی مثال کہیں اور بھی ملتی ہے؟ فرمایا کہ اس وقت

محمد ابن عبداللہ کی آنکھ رو رہی تھی اور محمدؐ رسول اللہ کی انگلی اشارہ کر رہی تھی۔

تضادِ جذبات کے ایسے "پل صراط" سے یوں صحیح وسلامت گزر جانا ہر ایک کے بس کی بات نہیں!

در جنوں از خود نرفتن، کارِ ہر دیوانہ نیست

عمر فاروقؓ نے نگہِ رسالتمآبؐ سے اسی قسم کی تربیت حاصل کی تھی۔

(۰)

تضادِ جذبات میں سب سے زیادہ کٹھن منزل وہ ہوتی ہے جہاں فرائضِ منصبی اور بال بچوں کی محبت میں تصادم واقعہ ہو۔ فاروقِ اعظمؓ اس منزل سے کس طرح قلندرانہ گذر گئے، اس کی کچھ مثالیں پہلے سامنے آچکی ہیں۔ مزید اب ملاحظہ فرمایئے۔

(۱۷) جو لوگ آغازِ اسلام میں مسلمان ہوئے تھے، ان کی شادیاں ان کے اپنے قبیلوں اور خاندانوں میں ہو چکی تھیں۔ اکثر ایسا ہوا کہ خاوند مسلمان ہو گیا اور بیوی نے اسلام قبول نہ کیا یا بیوی مسلمان ہو گئی اور خاوند مشرک رہا۔

کافرہ بیویوں کو طلاق

بعد ازاں، قرآنِ کریم میں حکم آگیا کہ کافرہ بیویوں کا عقد فسخ کر دیا جائے۔ (۶۰/۱۰) اس پر حضرت عمرؓ

نے اپنی دونوں (غیر مسلم) بیویوں کو طلاق دے دی۔

یہ تو خیر احکام خداوندی کی تعمیل میں تھا۔ جب آپ نے خلافت کی ذمہ داریوں کو سنبھالا تو آپ کی

امورِ مملکت میں دخل دینے والی بیوی

ایک بیوی تھی جس سے آپ کو بڑی محبت تھی۔ اس نے (غالباً اس لئے کہ وہ زیادہ منظورِ نظر تھی۔) امورِ مملکت میں دخل دینا شروع کر دیا۔ آپ نے اسے منع فرمایا کہ وہ اس دائرے میں قدم نہ رکھے لیکن وہ باز نہ آئی۔ ایک دفعہ آپ کسی گورنر پر ناراض ہو رہے تھے کہ اس (بیوی) نے پھر مداخلت کی اور آپ نے اسے طلاق دے دی۔

شاید یہ بات معمولی سی نظر آئے لیکن ذرا تاریخ عالم پر نگاہ ڈالئے اور دیکھئے کہ کتنی مملکتیں اس لئے تباہ ہو گئیں کہ فرمانرواؤں کی بیگمات امورِ مملکت میں دخیل ہوتی تھیں اور ان کے خاوند فرطِ محبت کی وجہ سے بے بس ہو جاتے تھے۔ ایسی مقام پر محبت کو فرائضِ منصبی کی قربان گاہ پر ذبح کر دینا ـــ کارِ ہر دیوانہ نیست۔ انہی کا کام ہے یہ جن کے حوصلے ہیں زیاد۔

بیوی کو تحفہ

(۱۸) اس باب میں آپ کی احتیاط کا یہ عالم تھا کہ ایک دفعہ حضرت ابو موسیٰؓ اشعری (گورنر) نے آپ کی بیوی (حضرت) عاتکہ کو ایک سجادہ بطور تحفہ دیا جو گز بھر لمبا اور چند بالشت چوڑا تھا۔ آپ کو معلوم ہوا تو حضرت ابو موسیٰؓ کو بلا کر سخت ڈانٹا۔ سجادہ ان کے سر پر دے مارا اور کہا کہ خبردار جو آئندہ ایسی حرکت کی۔

ملکہ روم کا ھدیہ

(۱۹) ایک دفعہ شاہِ روم کا قاصد آیا تو ملکہ کی طرف سے " فرماں روائے مملکتِ اسلامیہ کی بیگم" کے لئے ہدیۂ سلام لایا۔ آپ کی بیوی نے ایک دینار قرض لیا، عطر خریدا اور اسے شیشیوں میں بند کر کے ملکۂ روم کو بھیج دیا۔ اس نے تحفہ موصول ہونے پر، انہی شیشیوں کو جواہرات سے بھر کر واپس بھیج دیا۔ آپ کو معلوم ہوا تو آپ نے سارے جواہرات فروخت کر کے، ایک دینار بیوی کو دے دیا اور باقی رقم بیت المال میں داخل کر دی، اور بیوی کو آئندہ محتاط رہنے کی تلقین کی۔

(۲۰) بیت المال میں خوشبو آتی تو آپ اپنی بیوی کو دے دیا کرتے کہ وہ اسے فروخت کر کے رقم بیت المال میں جمع کرا دے۔ ایک دفعہ بیوی نے خوشبو بیچی تو جو انگلیوں سے لگی رہ گئی اسے اپنے دوپٹے

خوشبو لگی رہ گئی

پر مل لیا۔ خوشبو نے بہرحال غمازی کر دینی تھی، اس نے کر دی، تو آپ نے بیوی سے کہا کہ تمہیں خوشبو بیچنے کے لیے دی گئی تھی، نہ اس لیے کہ تو مسلمانوں کے مال سے نفع اندوز ہو جائے۔ یہ کہہ کر اس کے دوپٹے کو دھو ڈالا۔ اس پر بھی خوشبو نہ گئی تو اسے مٹی سے ملا۔ پھر سونگھا اور جب تک خوشبو اتر نہیں گئی، ایسا ہی کرتے رہے۔

(۲۱) ایک دفعہ بحرین سے کچھ مشک آئی تو آپ نے کہا کہ کوئی عورت صحیح وزن کرنے والی مل جائے تو اس سے وزن کرا لیا جائے۔ آپ کی بیوی (عاتکہ) نے کہا کہ میں خوب تولنا جانتی ہوں۔ لائیے میں وزن کئے دیتی ہوں۔

مشک کا وزن

آپ نے کہا کہ نہیں، تو نہیں۔ بیوی نے کہا کہ کیوں؟ فرمایا کہ تو مشک تولے گی۔ پھر جو ہاتھوں سے لگی رہ جائے گی اسے سر اور گردن پر (یوں یوں) مل لے گی اور اس طرح مسلمانوں کے مال سے نفع اندوز ہو جائیگی میں یہ طرح نہیں ڈالنا چاہتا۔

(۲۲) ایک دفعہ آپ کے سامنے (جلولا سے آئے ہوئے مالِ غنیمت کے) زیورات کا ڈھیر لگا ہوا تھا کہ اتنے میں آپ کا ایک بچہ آگیا۔ اس نے کہا کہ مجھے ایک انگوٹھی دے دیجئے۔ آپ نے اسے پیار کیا اور کہا کہ "اپنی ماں کے پاس جا۔ وہ تجھے ستو پلا دیگی"۔ اور اسے کچھ نہ دیا۔

بچہ اور انگوٹھی

(۲۳) اور آپ، امیر المومنین کی اس پوتی کا حال تو پڑھ ہی چکے ہیں جو فاقوں کے مارے نحیف و زار ہو رہی تھی اور بیٹے کے کہنے پر آپ نے فرمایا تھا کہ جو کچھ اور بچوں کو کھانے کو ملتا ہے وہی اُسے ملیگا امیر المومنین کی پوتی ہونے کی جہت سے اس کے ساتھ کوئی ترجیحی سلوک نہیں روا رکھا جا سکتا۔

اور آپ، امیر المومنین کے اس پوتے کا حال بھی پڑھ چکے ہیں جو قحط کے زمانے میں ککڑی (یا تربوز) کھا رہا تھا۔ اور اسے دیکھ کر آپ نے بیٹے کو ڈانٹا تھا کہ اُمت کے بچے بھوک سے مر رہے ہیں اور امیر المومنین کا پوتا پھل کھا رہا ہے؟ اور بیٹے نے یہ معذرت پیش کی تھی کہ اسے صبح کے ناشتے میں جو کھجوریں ملی تھیں، اس نے اس کے عوض ایک بدو بچے سے ککڑی (یا تربوز) لے لیا تھا۔ اسے الگ پھل نہیں دیا گیا۔

(۲۴) آپ کے بیٹے حضرت عبداللہؓ کا بیان ہے کہ "میں نے کچھ اونٹ خریدے اور انہیں سرکاری چراگاہ میں بھیجدیا۔ وہ موٹے ہو گئے تو انہیں بازار میں فروخت کرنے کے لئے لے آیا۔ اتفاق سے اسی وقت

حضرت عمرؓ کا گذر اُدھر سے ہوا۔ انہوں نے پوچھا کہ ایسے فربہ اونٹ کس کے ہیں؟ میں نے جواب دیا تو پوچھا

بیٹے کے اونٹ

کہ ایسے موٹے تازے کس طرح ہو گئے۔ میں نے کہا کہ میں نے انہیں سرکاری چراگاہ میں بھیجدیا تھا تاکہ جو فائدہ دوسرے مسلمان اٹھاتے ہیں، میں بھی اٹھاؤں۔

یہ سنکر آپ کو سخت غصہ آیا کہا کہ عام مسلمانوں کا ذکر کیوں کرتے ہو۔ کہو کہ امیرالمومنین کے بیٹے کے اونٹ تھے اس لئے حکومت کی چراگاہ میں بھیج دیئے۔ سنو! اونٹ فروخت کرو۔ راس المال رکھ لو اور سارا منافع بیت المال میں جمع کرادو۔

(۲۵) حضرت عمرؓ کے بیٹے عبداللہ اور عبیداللہ جہاد سے واپس آرہے تھے۔ راستے میں بصرہ کے گورنر

بیت المال کا روپیہ اور بیٹے

حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ سے ملے۔ انہوں نے کہا کہ میں نے کچھ روپیہ بیت المال میں داخل کرنے کیلئے بھیجنا ہے، وہ لیتے جاؤ۔ میں وہ روپیہ تمہیں بطور قرض دیئے دیتا ہوں۔ تم اس سے کچھ عراقی مال خرید لو مدینے جاکر مال بیچ دینا۔ اصل بیت المال میں جمع کرادینا اور منافع خود رکھ لینا۔ انہوں نے ایسا ہی کیا حضرت عمرؓ کو معلوم ہوا تو بیٹوں کی طلبی ہو گئی۔ دریافت کرنے پر انہوں نے کہا کہ گورنر نے یہ روپیہ انہیں ادھار دے دیا تھا۔ اس سے انہوں نے کاروبار کیا ہے۔ آپ نے فرمایا کہ کیا گورنر نے سارے لشکر کو اسی طرح ادھار دیا تھا یا صرف تم دونوں کو؟ انہوں نے کہا کہ سارے لشکر کو تو نہیں دیا تھا۔ اس پر آپ نے فرمایا کہ پھر اس نے تمہارے ساتھ یہ ترجیحی سلوک اس لئے کیا کہ تم امیرالمومنین کے بیٹے تھے۔ جاؤ! مال اور نفع دونوں بیت المال میں داخل کرو۔

مجلس مشاورت کے بعض رفقاء نے مداخلت کی تو بصد مشکل آپ اس پر راضی ہوئے کہ نصف منافع انہیں دے دیا جائے۔

(۲۶) اور آپ کے تیسرے بیٹے (عبدالرحمٰن) کا واقعہ تو ہم پہلے لکھ چکے ہیں کہ اسے کس طرح مصر سے بلا کر سزا دی تھی اور وہ قید کی حالت میں ہی وفات پا گئے تھے۔

(۲۷) (ام المومنین حضرت) حفصہؓ چہیتی بیٹی تھیں۔ ایک دفعہ آپ کے پاس کچھ مال آیا تو وہ آئیں

حضرت حفصہؓ کی دوہری حیثیت

اور کہا کہ اس میں سے کچھ مجھے بھی دے دیجئے۔

فرمایا کہ تمہیں کیسے دیدوں؛ انہوں نے کہا کہ قرآنِ کریم میں اقربار کے ساتھ حسن سلوک کا حکم آیا ہے اور میں آپ کے اقربار میں سے ہوں۔

یہ سُن کر آپ مسکرائے اور کہا کہ بیٹی! باپ کو دھوکا دیتی ہو! وہ حکم ذاتی مال کے لئے ہے اور یہ مال میرا ذاتی نہیں، مسلمانوں کا ہے۔ اس لئے اس پر قرآن کے اس حکم کا اطلاق نہیں ہوتا ـــــ جاؤ! بھاگ جاؤ۔

(۲۸) آپ کا معمول تھا کہ کوئی پھل یا کھانے پینے کی کوئی اور اچھی چیزیں آتیں تو انہیں حصہ رسدی اُمہاتُ المومنین (یعنی نبی اکرمؐ کی ازواجِ مطہرات) کو تحفۃً بھیجتے۔ حضرت حفصہؓ، امّ المومنین بھی تھیں لیکن اس کے ساتھ، حضرت عمرؓ کی بیٹی بھی۔ آپ امہات الامہؓ کے حصے لگاتے وقت، حضرت حفصہؓ کا حصہ سب سے آخر میں لگاتے کہ اگر مقدار میں کمی رہ جائے تو وہ آپ (حضرت حفصہؓ) کے حصہ میں ہو!

(۲۹) ہم آگے چل کر (معاشیات سے متعلق باب میں) دیکھیں گے کہ آپ نے لوگوں کے وظائف مقرر کرتے وقت، حضرت اسامہ بن زیدؓ کو چار ہزار سالانہ دیئے تو آپ کے بیٹے (حضرت) عبداللہ نے کہا کہ آپ نے مجھے تین ہزار دیئے اور اسامہؓ کو چار ہزار۔ حالانکہ جو فضیلت میرے باپ کو حاصل ہے، ان کے باپ کو نہیں اور نہ وہ میرے برابر ہیں۔

آپ نے فرمایا۔" میں نے اسے اس لئے زیادہ دیا ہے کہ وہ رسولؐ اللہ کو تجھ سے اور اس کا باپ تیرے باپ سے زیادہ محبوب تھا۔"

اس مقام پر آپ کو یقیناً اس شخص کی بات یاد آ گئی ہو گی جسے، جب حضرت عمرؓ نے کہا تھا کہ میں تم سے محبت کرتا ہوں تو اس نے کہا تھا کہ مجھے ایسے لگتا ہے کہ اس وقت مجھے حکومت کی طرف سے جو رعایتیں مل رہی ہیں، ان میں سے کوئی رعایت چھین لی جائے گی۔

سربراہِ مملکت سے جسے، جس قدر زیادہ تعلق، اسے اتنی ہی کم مراعات! کیا اس کے بعد بھی یہ تحقیق کرنے کی ضرورت رہے گی کہ وہ دور اس قدر انسانیت ساز اور جنّت بداماں کیوں تھا!

(۳۰) امیر المومنین، اپنے اور اپنے اہل و عیال کے لئے، سرکاری خزانہ سے، جو کچھ لیتے تھے، اس کا ذکر "معاشی نظام" کے باب میں آئے گا۔ اس وقت اتنا کہہ دینا کافی ہو گا کہ امیر المومنین کے ہاں عام مسلمانوں کے معیار کے مطابق راشن جاتا تھا، اور خود امیر المومنین، کپڑوں کا ایک جوڑا موسم سرما میں

اور ایک جوڑا موسمِ گرما میں پہنتے تھے۔ اسی لیے کپڑوں پر دس دس بارہ بارہ پیوند لگے ہوتے تھے۔ جب ان کا اپنا یہ حال تھا تو جو حالت ان کے اہلِ خانہ کی ہو سکتی ہے، ظاہر ہے۔

حضرت ساریہؓ کا قاصد آیا تو آپ اسے اپنے ساتھ گھر لے آئے۔ امیر المومنین کا دسترخوان بچھا۔ کھانا آیا تو وہ خشک روٹی، روغنِ زیتون اور پسے ہوئے نمک پر مشتمل تھا۔ آپ نے بیوی (اُمِّ کلثومؓ) کو آواز دی کہ کیا تم

بیوی کا دوپٹہ

کھانے کے لیے نہیں آؤ گی؟ اس نے کہا کہ اگر آپ چاہتے ہیں کہ میں اجنبی مردوں کے سامنے آؤں تو مجھے کوئی کام کا دوپٹہ لے دیجئے۔ یہ دوپٹہ اوڑھ کر کیسے باہر آؤں؟ آپ نے جواب دیا کہ کیا تمہارے لیے یہ شرف کافی نہیں کہ تم علیؓ کی بیٹی اور عمرؓ کی بیوی کہلواؤ۔ تنگ کر دلیں — بے اعتنائی کی بھی کوئی حد ہونی چاہیئے۔

حضرت عمرؓ نے قاصد کی طرف دیکھ کر کہا آؤ، کھانا کھاؤ۔ اُمِّ کلثوم ناراض نہ ہوتیں تو شاید اس سے اچھا کھانا مل جاتا۔!

(۳۱) لیکن اچھا کھانا ملِ کہاں سے جاتا؟ اس کے لیے تو کابینہ کی منظوری کی ضرورت تھی۔ ایک دفعہ

بیت المال کا شہد

آپ کی طبیعت ناساز ہوگئی۔ علاج کے لیے شہد تجویز کیا گیا۔ شہد بیت المال میں تو موجود تھا لیکن امیر المومنین کے ہاں راشن میں نہیں آتا تھا۔ آپ نے خود شہد نہیں لیا۔ کابینہ کی میٹنگ بلائی اور اس کی منظوری کے بعد شہد لیا۔

(۳۲) جو سربراہِ مملکت خود پیوند لگے کپڑے پہنے اور بیوی سے کہے کہ اسی پرانے دوپٹے سے گزارہ کرو، وہی رعایا کو سادگی سکھا سکتا ہے! ایک انصاریہ حاضرِ خدمت ہوئی اور کہا کہ امیر المومنین! مجھے نیا لباس دلوا دیجئے۔ آپ نے کہا کہ ابھی کپڑوں کی تقسیم کا وقت نہیں آیا۔ اس نے کہا کہ بخدا! میرے پاس تو اب ستر ڈھانپنے کے لیے بھی کچھ نہیں رہا۔

پرانے کپڑوں کی حفاظت

یہ سن کر آپ بیت المال گئے اور ایک سفید چادر لا کر اسے دے دی اور کہا کہ اسے اوڑھ لو لیکن پرانے کپڑوں کی حفاظت بھی کرو۔ ہانڈی روٹی کے وقت انہیں پہن لیا، باہر نکلتے وقت نئے کپڑے پہن لئے۔ یاد رکھو! جو پرانے کپڑوں کی حفاظت نہیں کرتا، اس کے پاس نئے کپڑے بھی نہیں رہتے۔

(۳۳) اور جس فرمانروا کے کھانے میں روغنِ زیتون اور پسا ہوا نمک آتا ہے، وہی رعایا کے خورد و نوش

مسلسل گوشت نہ خرید اکرو

ہر کڑی نگاہ رکھ سکتا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ کسی زمانے میں مدینے میں گوشت کی کمی واقع ہو گئی تھی۔ آپ مذبح میں تشریف لے جاتے اور جس شخص کو دیکھتے کہ دو دن متواتر گوشت لینے کے لئے آتا ہے، اسے بلاتے اور کہتے کہ تم مسلسل گوشت لے جاتے ہو، تمہیں خیال نہیں آتا کہ اس سے تم اپنے کسی بھائی کو گوشت سے محروم کر دیتے ہو۔ ناغہ کر کے گوشت لے جایا کرو۔

تقربِ خداوندی کا معیار

(۳۴) طرزِ بود و ماند کی طرف سے ہٹ کر پھر آجائیے حسنِ اخلاق کی طرف۔ آپ اپنے رفقاء کو تاکید کرتے رہتے کہ "ہمیشہ یہ دیکھو کہ مخلوقِ خدا تمہارے متعلق کیا کہتی ہے۔ اس اصول کو یاد رکھو کہ خدا کے ہاں تمہارا وہی مرتبہ ہوگا جو تمہارا مرتبہ مخلوق کی نگاہوں میں ہے"۔

دیکھا آپ نے، خدا کے مقرب بننے کا معیار؟

غصے کی حالت میں

(۳۵) کہا کرتے۔ کسی شخص کے اخلاق پر بھروسہ نہ کرو جب تک اسے غصے کی حالت میں نہ آزمالو۔

اصلاحِ خویش

(۳۶) کہا کرتے۔ انسان کی بھی عجیب حالت ہے۔ اس کے گدھے، بیل یا اونٹ میں کوئی نقص یا عیب ہو تو اس کی اصلاح کی فکر فوراً کرتا ہے لیکن اپنے عیوب و نقائص کی اصلاح کی فکر کبھی نہیں کرتا۔ یعنی یہ اپنے آپ کو اپنے جانوروں جتنی بھی اہمیت نہیں دیتا۔ یا للعجب!

مدحِ خویش

(۳۷) ایک شخص آپ کی تعریف کرنے لگا تو آپ نے فرمایا۔
کیا تو مجھے اور اپنے آپ، دونوں کو ہلاک کرنا چاہتا ہے۔

احترامِ آدمیت

(۳۸) دوسری طرف، احترامِ آدمیت کا اس قدر احساس، کہ حضرت عمرو بن عاصؓ نے ایک دفعہ ایک شخص کو منافق کہہ دیا۔ آپ نے فرمایا کہ اس سے زیادہ اس کی ذلت اور کیا ہو سکتی ہے۔ حضرت عمرو بن عاصؓ سے کہا کہ اس شخص سے معافی مانگ کر اسے راضی کر لو، ورنہ میں سزا دے دوں گا۔

اسی تربیت کا نتیجہ تھا کہ ایک دفعہ حمص کے حاکم، حضرت عمیرؓ بن سعدؓ کے منہ سے کسی ذمی کے متعلق یہ الفاظ نکل گئے ــــ اخزاک اللہ ــــ خدا تجھے رسوا کرے۔ اس پر انہیں اس قدر ندامت اور تاسف ہوا کہ حضرت عمرؓ کی خدمت میں حاضر ہو کر استعفےٰ دے دیا اور کہا کہ میں اس منصب کا اہل ہی نہیں۔

(۳۸) اور آپ کا یہ مقولہ بھی ہماری نظروں سے گذر چکا ہے کہ اگر کسی شخص میں غرور دیکھو تو سمجھ لو کہ وہ احساسِ کمتری میں مبتلا ہے۔

(۳۹) لیکن اس سے ہو سکتا تھا کہ لوگ اپنے عمدہ اخلاق اور اعلیٰ صلاحیتوں کا اظہار ہی نہ کریں کہ مبادا اسے خودنمائی اور کبرِ نفس پر محمول کر لیا جائے۔ فاروقِ اعظمؓ کی نگۂ حقیقت شناس سے کبرِ نفس اور اظہارِ

ظاہر بھی اچھا ہونا چاہیئے

حسنِ اخلاق کا نہایت نازک فرق پوشیدہ نہیں تھا۔ وہ معیوب تھا اور یہ مستحسن بھی اور ضروری بھی۔ اسی لئے آپ فرمایا کرتے تھے کہ جو شخص (کسرِ نفسی کی بنا پر ہی سہی) کسی معیوب بات کا اظہار کرے اور باز پرس پر کہے کہ میرا باطن اچھا ہے، تو ہم اس کے باطن کی تصدیق نہیں کریں گے، ظاہر پر فیصلہ دے دیں گے۔ باطن اچھا ہے تو اس کا اظہار بھی اچھائی سے کرنا چاہیئے۔

واعظ کو ڈانٹ

(۴۱) اس کے ساتھ ہی آپ پیشہ ور واعظوں کی اچھی طرح خبر لیا کرتے، فرمایا کرتے کہ اکثر وعظ شیطانی ہیجان کا نتیجہ ہوتے ہیں

(٠)

(۴۲) اور آخر میں ہم آپ کو پھر "درونِ خانہ" لئے چلتے ہیں کہ جس کے گھر کی زندگی اچھی نہیں، وہ زندگی کے کسی شعبے میں بھی اچھا نہیں ہو سکتا۔ اس سلسلہ میں حضرت فاروقِ اعظمؓ نے ایک ایسا اصول بیان فرمایا ہے کہ جب

اپنے اہل و عیال میں بچے کی طرح رہے

نگۂ بصیرت ان چار لفظوں پر غور کرتی ہے تو پہروں ورطۂ حیرت میں گم رہتی اور بار بار کہتی ہے کہ بارِالٰہا! تو نے اس مردِ دانا کو کیسی حقیقت رس نگاہ عطا فرمائی تھی؟ آپ فرمایا کرتے تھے کہ

> انسان کو چاہیئے کہ اپنے اہل و عیال میں بچے کی طرح رہے لیکن جب ان کی کوئی ضرورت اس کے سامنے آئے تو مرد بن جائے۔ (تاریخ عمر لابن الجوزی)

کہیئے! آپ پر بھی کچھ ایسی کیفیت طاری ہوتی ہے یا نہیں؟

گیارہواں باب

معاشی نظام

کس نباشد در جہاں محتاجِ کس
نکتۂ شرعِ مبیں این است و بس

دنیا کی تمام ناکامیوں میں، سب سے بڑی ناکامی خود انسان کی ہے۔ اس انسان کی جو سب سے زیادہ مدنی الطبع حیوان ہے اور سب سے زیادہ عقلمند بھی۔ اس کی وہ ناکامی یہ ہے کہ یہ آج تک کوئی ایسا نظام وضع نہیں کرسکا جسے دُور سے بھی اچھی حکومت کہا جاسکے۔ اس نے اس باب میں بڑی بڑی کوششیں کی ہیں۔ بہت سی ایسی جو فی الواقعہ محیّر العقول ہیں اور بہت سی ایسی جو بڑی جرأت آزما تھیں لیکن جب ان کی عملی تنفیذ کا وقت آیا تو نتیجہ حسرت و یاس کے سوا کچھ نہ تھا۔ اس کا سبب یہ تھا کہ نظری طور پر حکومت اس کے سوا کچھ نہیں کہ یہ افرادِ مملکت کی ضروریاتِ زندگی مہیا کرنے کا ذریعہ ہے اور اربابِ حکومت پبلک کے خادم ہیں۔ لیکن جب اس نظریہ پر عمل کا وقت آتا ہے تو حکومت کا فریضہ پبلک کی خدمت نہیں، سلب و نہب ہو جاتا ہے۔

یہ الفاظ کسی عہدِ قدیم کے سیاستدان یا مفکر کے نہیں جو اس نتیجہ پر اس زمانے میں پہنچا ہو جب انسان نے ہنوز دو ایک اسالیبِ حکومت کا تجربہ کیا تھا اور اسے ان نظامہائے حکومت کا علم نہیں تھا (نہ ہی اس وقت ان کا علم ہو سکتا تھا) جنہیں انسانوں نے بعد میں وضع کیا۔ یہ الفاظ خود ہمارے زمانے کے ایک نامور ماہرِ سیاست مسٹر مینکن (H. J. MENCKEN) کے ہیں جنہیں اس نے اپنی کتاب (TREATISE ON RIGHT AND WRONG) میں، عہدِ قدیم سے لے کر عصرِ حاضر تک کے تمام نظامہائے حکومت کا

جائزہ لینے کے بعد لکھا ہے[1]۔

مینکن نے ایک مثالی حکومت کے متعلق کہا یہ ہے کہ :۔

وہ افرادِ مملکت کی ضروریاتِ زندگی مہیا کرنے کا ذریعہ ہوتی ہے۔

آیئے ہم دیکھیں کہ عہدِ فاروقیؓ، مسٹر مینکن کے اس معیار کے مطابق، مثالی حکومت کا دور قرار پا سکتا ہے یا

مثالی حکومت

نہیں۔ اس سلسلہ میں اتنا واضح کر دینا ضروری ہے کہ مغربی ذہنیت کی رُو سے، چونکہ انسانی زندگی عبارت ہوتی ہے فقط انسان کی طبیعی زندگی (PHYSICAL LIFE) سے، اس لئے اس کی ضروریات بھی محدود ہوتی ہیں۔ طبیعی ضروریات (یعنی انسانی جسم کی نشوونما) تک۔ لیکن قرآنی نقطۂ نگاہ سے، انسان کی زندگی محض اس کی طبیعی زندگی نہیں۔ اس کے طبیعی جسم کے علاوہ ایک اور شے بھی ہے جسے انسانی ذات کہا جاتا ہے۔ انسانی ذات، نہ فطرت کے عملِ تخلیق کے طبیعی ارتقار کا نتیجہ ہوتی ہے، نہ ان طبیعی قوانین کے تابع جن کے مطابق اس کے جسم کی مشینری مصروفِ حرکت و عمل رہتی ہے۔ انسانی ذات میں خالقِ کائنات نے ایسی صلاحیتیں مضمر رکھی ہیں کہ اگر ان کی مناسب نشوونما ہو جائے تو انسان کی اس دنیا کی (انفرادی اور اجتماعی) زندگی بھی شادابیوں اور کامرانیوں کے جھولے جھولتی ہے اور آخرت کی زندگی بھی سرفرازیوں کے مدارج طے کرتی۔ یہ آخری الفاظ ذرا وضاحت طلب ہیں۔ جب انسان کے جسم کی مشینری (طبیعی قوانین کے تابع) حرکت کرنے سے رُک جائے تو اسے موت کہا جاتا ہے اور مغرب کے مادی نقطۂ نگاہ سے، موت سے اس فرد کا خاتمہ ہو جاتا ہے لیکن قرآنی نقطۂ نگاہ سے، اگر انسان کی ذات کی مناسب نشوونما ہو جائے تو جسم کی موت سے اس کا کچھ نہیں بگڑتا۔ یہ آگے چلتی ہے اور زندگی کے مزید ارتقائی مراحل طے کرنے کے لئے نئے پروگرام کی حدود میں داخل ہو جاتی ہے۔ اس طرح ایک نشوونما یافتہ ذات کی اس دنیا کی یہ زندگی بھی حسین ہوتی ہے اور آخرت کی زندگی بھی حسین۔ رَبَّنَآ اٰتِنَا فِی الدُّنْیَا حَسَنَةً وَّ فِی الْاٰخِرَةِ حَسَنَةً۔ (۲/۲۰۱) سے یہی مراد ہے۔

جسم اور ذات کی نشوونما

لیکن زندگی کی موجودہ سطح پر، انسانی ذات کے ارادے اور فیصلے انسان کی طبیعی زندگی کے ذریعے رُوبہ عمل آتے ہیں۔ اس لئے

---

[1] افسوس کہ اس کے سامنے اسلام کے صدرِ اوّل کا نظامِ حکومت نہیں تھا، ورنہ وہ اپنے کلیہ کی ایک استثناء ضرور دیکھ لیتا۔

یہ ضروری ہے کہ اس کے طبیعی جسم کی بھی صحیح نشوونما ہوتی جائے۔ مثال کے طور پر یوں سمجھیے کہ انسانی ذات ایک سوار ہے اور اس کا جسم' اس کا مرکب (گھوڑا) جس پر سوار ہو کر وہ زندگی کا سفر طے کر کے (موجودہ سطحِ زندگی کی) آخری منزل تک پہنچتا ہے۔ ایک سوار کے نزدیک' اس کا گھوڑا مقصود بالذات نہیں ہوتا، اس کے مقصد کے حصول کا ذریعہ ہوتا ہے لیکن چونکہ وہ اس ذریعے کے بغیر' اپنی منزلِ مقصود تک پہنچ نہیں سکتا، اس لئے اس کے گھوڑے کا تنومند و توانا ہونا اور رہنا ضروری ہوتا ہے۔ یہ حیثیت ہے قرآنی نقطۂ نگاہ سے انسان کی طبیعی زندگی کی۔

تصریحاتِ بالا سے واضح ہے کہ قرآنی نقطۂ نگاہ سے' انسانی زندگی کی ضروریات کو مندرجہ ذیل تین شقوں میں تقسیم کیا جائے گا۔

(۱) انسانی جسم کی پرورش کے لئے سامان و ذرائع۔ ان میں خوراک' لباس، مکان' علاج اور انفرادی اور اجتماعی زندگی کی آسائش کے دیگر اسباب شامل ہوں گے۔

(۲) عقل و فکر کی صلاحیتوں کی نشوونما جسے' اصولی طور پر تعلیم سے تعبیر کیا جائیگا اور

(۳) انسانی ذات کی نشوونما۔

انسانی ذات کی نشوونما مستقل اقدارِ خداوندی کے اتباع سے ہوتی ہے۔ اس کے لئے ضروری ہے

اقامتِ صلوٰۃ و ایتائے زکوٰۃ

کہ اسلامی مملکت ایسا معاشرہ قائم کرے جس میں افرادِ معاشرہ' مستقل اقدار کے مطابق زندگی بسر کرنے کے قابل ہو سکیں۔ اسے قرآنِ کریم کی جامع اصطلاح میں " اقامتِ صلوٰۃ " سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ واضح رہے کہ نظامِ صلوٰۃ اپنی کلی حیثیت سے' زندگی کے ہر گوشے کو محیط ہے اور صلوٰۃ (نماز) کے اجتماعات' اس نظامِ صلوٰۃ' کا ایک گوشہ ہیں۔ اس کی تفصیل میں جانے کا یہ موقع نہیں۔ اجمالی طور پر یوں سمجھیے کہ گذشتہ ابواب میں سیاسی اور معاشرتی زندگی کے متعلق جو کچھ لکھا گیا ہے وہ نظامِ صلوٰۃ ہی کی تشریحات پر مشتمل ہے۔ انسانی ذات کی نشوونما اسی نظام کی رُو سے ہوتی ہے۔ باقی دو شقوں (یعنی شق ۱ : ۲ کے لئے) مادی اسباب و ذرائع کی ضرورت ہوتی ہے۔ اسے' قرآنِ کریم نے " ایتائے زکوٰۃ " سے تعبیر کیا ہے — یعنی سامانِ نشوونما بہم پہنچانا — اور اقامتِ صلوٰۃ اور ایتائے زکوٰۃ دونوں کو' اسلامی حکومت کا فریضہ قرار دیا ہے۔ (۲۲/۴۱) عصرِ حاضر کی اصطلاح میں ایتائے زکوٰۃ کو " معاشی نظام سے تعبیر کیا جائے گا۔ (تفصیل اس اجمال کی ذرا آگے جا کر

سامنے آئے گی۔) اُس وقت ہم یہ دیکھیں گے کہ اسلامی مملکت اس فریضہ کو کس طرح ادا کرتی ہے اور عہدِ فاروقی میں اس کا عملی مظاہرہ کس طرح ہوا!

اس مقام پر ایک اور اہم نکتہ کی وضاحت بھی ضروری معلوم ہوتی ہے۔ وہ یہ کہ اگرچہ معاشی نظام کا تعلق طبیعی سامان و ذرائع سے ہے لیکن کوئی معاشی نظام کامیاب نہیں ہو سکتا جب تک اس کی بنیاد انسانی ذات کے تصور پر استوار نہ ہو۔ بظاہر یہ بات کچھ عجیب سی نظر آئے گی لیکن ہے یہ حقیقت۔ تفصیل اس حقیقت کی تو طول طویل ہے (اور میں اس موضوع پر بہت کچھ لکھ چکا ہوں) لیکن اجمالاً اسے دو فقروں میں سمٹایا جا سکتا ہے۔ آجکل جس معاشی نظام کو بہترین قرار دیا جاتا ہے، اس کا اصل الاصول یہ ہے کہ پیداوار کے ذرائع

معاشی نظام اور انسانی ذات

(زمین، کارخانے وغیرہ) حکومت کے قبضہ میں ہونے چاہئیں۔ ایسا کرنا مشکل نہیں۔ حکومت ایک قانون پاس کر کے تمام ذرائع پیداوار کو اپنے قبضے میں لے سکتی ہے۔ چنانچہ سوشلسٹ حکومتوں نے ایسا کیا بھی لیکن پھر بھی وہ نظام کامیاب ثابت نہ ہو سکا۔ اس کی وجہ یہ بتائی جاتی ہے کہ یہ تو قانون کی رو سے کیا جا سکتا ہے کہ ذرائع پیداوار، انفرادی ملکیت سے چھین کر حکومت کی اجتماعی ملکیت میں لے لئے جائیں لیکن یہ چیز کسی قانون کی رُو سے ممکن نہیں کہ ایک محنت کش، دن بھر جان مار کر محنت کرے، اور اس کے بعد، اپنی محنت کے ماحصل میں سے کم از کم اپنے لئے رکھ کر، باقی سب کا سب، دوسروں کی ضروریات پوری کرنے کے لئے دے دے۔ وہ بطیبِ خاطر ایسا کرنے پر آمادہ نہیں ہوگا۔ اور اگر اس سے اس کی محنت کا ماحصل زبردستی چھینا جائے تو وہ محنت کرنا چھوڑ دے گا۔ یہ ہے وہ چٹان جس سے ٹکرا کر سوشلسٹ نظاموں کی کشتی پاش پاش ہو جاتی ہے اور اس مشکل کا حل ان کے پاس کوئی نہیں۔

اس کا حل، انسانی ذات اور حیاتِ آخرت پر ایمان کی رُو سے مل سکتا ہے۔ انسانی جسم کی پرورش اور نشو و نما ہر اس چیز سے ہوتی ہے جسے انسان اپنے صرف میں لاتا ہے۔ یعنی جسے وہ اپنے لئے "لیتا ہے"۔ لیکن قرآن کی رُو سے انسانی ذات کی نشو و نما ہر اس چیز سے ہوتی ہے، جسے انسان دوسروں کے لئے دیتا ہے"۔ اس ایمان کی رُو سے، ایک فرد جان مار کر محنت کرتا ہے اور اپنی محنت کے ماحصل میں سے کم سے کم اپنی ضروریات کے لئے رکھ کر، باقی سب، دوسروں کی ضروریات پوری کرنے کے لئے دے دیتا ہے اور زیادہ سے زیادہ محنت کرتا ہے تاکہ وہ زیادہ سے زیادہ دوسروں کو دے سکے اور اس طرح اس کی

ذات کی نشوونما زیادہ سے زیادہ ہو سکے۔

یہ ہے وہ اساسِ محکم جس پر قرآن کے معاشی نظام کی عمارت استوار ہوتی ہے۔ (یہی وجہ ہے کہ قرآنِ کریم میں اقامتِ صلوٰۃ اور ایتائے زکوٰۃ کے فریضہ کو بیشتر اکٹھا بیان کیا گیا ہے۔ یہ دونوں لازم و ملزوم ہیں۔) اس نظام میں جملہ ذرائع پیداوار، مملکت (کی ملکیت میں نہیں اس) کی تحویل میں رہتے ہیں تاکہ ان سے وہ افرادِ مملکت کی ضروریاتِ زندگی پوری کرنے کی اہم ذمہ داری سے عہدہ برآ ہو سکے اور افرادِ معاشرہ میں سے ہر ایک زیادہ سے زیادہ محنت کرتا ہے تاکہ اس طرح وہ زیادہ سے زیادہ اپنی ذات کی نشوونما کر سکے۔

اس اصولی تمہید کے بعد، پہلے یہ دیکھئے کہ قرآنِ کریم اس عظیم مقصد کے حصول کے لئے طریقِ کار کیا تجویز کرتا ہے اور اس کے بعد ہم دیکھیں گے کہ اس طریقِ کار پر عہدِ فاروقیؓ میں عمل کس طرح کیا گیا۔

(۵)

معاشی مسئلہ کی پیچیدگی

معاشی مسئلہ کی پیچیدگی کا آغاز کہاں سے ہوتا ہے، اسے ایک مثال سے سمجھئے۔ ایک صبح کسی عظیم الشان کوٹھی کے ایک مزین کمرے میں ایک بچہ پیدا ہوتا ہے اور اسی وقت اس کوٹھی کے سرونٹس کوارٹر (نوکر گھر) میں، اس کوٹھی کے ملازم کے ہاں بھی ایک بچہ پیدا ہوتا ہے۔ ظاہر ہے کہ نہ تو کوٹھی میں پیدا ہونے والے بچے کی کوئی ہنرمندی یا اعلیٰ صلاحیت تھی جس کی وجہ سے وہ اس امیر گھرانے میں پیدا ہو گیا اور نہ ہی نوکر گھر میں جنم لینے والے بچے نے کوئی جرم کیا تھا جس کی پاداش میں اسے وہاں پھینک دیا گیا لیکن یہ امتیاز دونوں کی زندگی میں آخری دم تک ساتھ رہتا ہے۔ امیر کا بیٹا اپنے باپ کی دولت کے بل بوتے پر دنیا کی ہر آسائش سے متمتع اور ہر مقامِ عزت و تکریم پر فائز رہتا ہے اور غریب کے بیٹے کی ساری عمر محنت اور مشقت میں کٹ جاتی ہے۔ نہ اسے دنیا کی آسائشیں نصیب ہوتی ہیں نہ اپنی صلاحیتوں کی نشوونما کے لئے سامان و ذرائع اور نہ ہی ان کی نمود کے مواقع۔ یہ اس لئے کہ ہر شخص کی اولاد کی پرورش، تعلیم اور نشوونما کی ذمہ داری انفرادی قرار دی جاتی ہے یعنی جس کی اولاد، وہی اس کے رزق کا ذمہ دار۔

دوسری مثال یہ لیجئے کہ ایک مزدور دن بھر جان مار کر محنت کرتا ہے لیکن اسے جو اُجرت ملتی ہے، اس میں اس کا اور اس کے بیوی بچوں کا پیٹ نہیں پلتا۔ ان کی ضروریاتِ زندگی پوری نہیں ہوتیں لیکن معاشرہ میں اس سے کسی کو سروکار نہیں ہوتا کہ اس محنت کش کی ضروریات، اس کے معاوضہ سے پوری ہوتی ہیں یا

نہیں اور اگر وہ بیمار پڑ جائے، کسی حادثہ کی وجہ سے معذور ہو جائے، اسے کام نہ ملے یا وہ فوت ہو جائے تو ان مصائب کو بھی اس خاندان کو خود ہی بھگتنا پڑتا ہے۔ یہ کسی کی ذمہ داری نہیں ہوتی کہ ان کی ضروریات پوری کرے۔

یہ ہیں رزق کے سلسلہ میں وہ پیچیدگیاں جن کا حل، انسانوں کے وضع کردہ معاشی نظاموں میں سے کوئی نظام نہیں کر سکا۔ اس کا حل قرآن نے بتایا ہے۔ اس نے کہا ہے کہ ضروریاتِ زندگی کا پورا کرنا افراد کی ذمہ داری نہیں، یہ نظامِ مملکت کی ذمہ داری ہے۔ افراد کے ذمے، اپنی اپنی صلاحیت اور استعداد کے مطابق اس کام کا سرانجام دینا ہے جو ان کے سپرد کیا جائے۔ ان کی اور ان کے اہل و عیال کی ضروریاتِ زندگی پورا کرنا مملکت کا کام ہے ــــ صرف انہی افراد کی نہیں بلکہ مملکت کے دائرے کے اندر، ہر ذی حیات کے رزق کی ذمہ داری قرآنی حکومت کے سر پر ہے۔ قرآن کریم میں ہے۔

وَمَا مِنْ دَآبَّةٍ فِي الْاَرْضِ اِلَّا عَلَى اللّٰهِ رِزْقُهَا۔ (۱۱/۶)

زمین میں کوئی ذی حیات ایسا نہیں جس کے رزق کی ذمہ داری خدا پر نہ ہو۔

ہر ذی حیات کے رزق کی ذمہ داری

یہاں یہ کہا گیا ہے کہ " ہر ذی حیات کے رزق کی ذمہ داری خدا پر ہے "۔ لیکن خدا ایسا نہیں کرتا کہ ہر شخص تک رزق خود پہنچ جائے۔ قرآن کریم میں ہے کہ وَاِذَا قِيْلَ لَهُمْ اَنْفِقُوْا مِمَّا رَزَقَكُمُ اللّٰهُ۔ جب ان لوگوں سے کہا جاتا ہے کہ رزق کے وہ سرچشمے جو خدا نے سامانِ زیست کے طور پر تمہیں عطا کئے ہیں، کھلے رکھو تاکہ دنیا میں کوئی بھوکا نہ رہے۔ قَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا۔ تو جو لوگ اس بنیادی صداقت سے انکار کرتے ہیں، ان لوگوں سے جو اس حقیقت کو تسلیم کرتے ہیں، کہتے ہیں کہ اَنُطْعِمُ مَنْ لَّوْ يَشَآءُ اللّٰهُ اَطْعَمَهٗۤ ۔ یہ تم کیا کہتے ہو کہ ہم بھوکوں کی روٹی کا انتظام کریں، اگر خدا کو منظور ہوتا کہ یہ لوگ بھوکے نہ رہیں تو وہ انہیں خود رزق عطا کر دیتا ہے۔ یہ بات کہ ان لوگوں پر رزق کی تنگی ہے، خود اس امر کا ثبوت ہے کہ خدا چاہتا ہی نہیں کہ انہیں فراخیٔ رزق نصیب ہو۔ رزق کی تقسیم خدا نے اپنے ہاتھ میں رکھی ہے۔ ہم کون ہیں جو اس تقسیم کو بدل دیں؟ ان کے اس جواب کی تردید میں خدا نے کہا کہ اِنْ اَنْتُمْ اِلَّا فِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ (۳۶/۴۷)۔ تمہارا یہ عقیدہ، یہ ذہنیت، یہ طرزِ عمل ایسی گمراہی پر مبنی ہے جس کے ابطال کے لئے کسی دلیل کی ضرورت نہیں۔

یہاں سے سوال یہ پیدا ہوا کہ جب خدا، ہر شخص کو رزق خود نہیں پہنچاتا، تو پھر تقسیم رزق کا انتظام کیا ہے؟ اس کے جواب کے لئے آپ تیسرے اور نویں باب کو ایک بار پھر سامنے لائیے جن میں بتایا گیا ہے کہ خدا کی اطاعت کا عملی طریق اس حکومت کی اطاعت ہے جو احکام خداوندی کو نافذ کرنے کا فریضہ اپنے ذمہ لیتی ہے۔ اسی انداز سے ہر ذی حیات کے رزق کی ذمہ داری اس نظام پر عائد ہوتی ہے جو دنیا میں خدا کے نام پر حکومت قائم کرتا ہے۔ وہ نظام، خدا کی طرف سے (ON HIS BEHALF) یہ اعلان کرتا ہے کہ

نَحْنُ نَرْزُقُكُمْ وَ اِيَّاهُمْ۔ (۶/۱۵۲)

ہم تمہارے رزق کے بھی ذمہ دار ہیں اور تمہاری اولاد کے رزق کے بھی ذمہ دار۔

اس سے واضح ہے کہ انسانوں کے سلسلہ میں وہ ذمہ داریاں، جنہیں خدا نے اپنے اوپر عائد کر رکھا ہے، اس حکومت کے ہاتھوں پوری ہوتی ہیں جو خدا کے نام پر قائم ہوتی ہے۔

(۲) لیکن ظاہر ہے کہ مملکت اپنا یہ عظیم فریضہ اسی صورت میں پورا کر سکتی ہے جب ذرائع پیداوار افراد کی ملکیت میں رہنے کے بجائے، مملکت کی تحویل میں رہیں تاکہ وہ ایسا انتظام کر سکے جس سے ہر فرد کی ضروریات پوری ہوتی رہیں۔ رزق کا بنیادی ذریعہ ارض (زمین) ہے اور زمین کے متعلق قرآنِ کریم نے واضح الفاظ میں کہہ دیا کہ یہ "اللہ کی ملکیت ہے" کوئی انسان اس کا مالک نہیں ہو سکتا۔ (تفصیل آگے چل کر سامنے آئے گی۔)

(۳) لیکن مملکت کا نظام، خلا میں قائم نہیں ہوتا۔ یہ انسانوں کا قائم کردہ نظام ہوتا ہے۔ جن انسانوں

مومنین کا معاہدہ

(امّتِ مسلمہ) کے ہاتھوں وہ نظام قائم ہوگا اُس کی ذمہ داری، تمام افرادِ معاشرہ کی ضروریاتِ زندگی بہم پہنچانا ہوگا اور جس کے لئے رزق کے سرچشمے ان کی تحویل میں ہوں گے، وہ اپنے اللہ (یعنی حکومتِ خداوندی) سے ایک معاہدہ کریں گے جس کی شقیں یہ ہوں گی۔

اِنَّ اللّٰهَ اشْتَرٰى مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ اَنْفُسَهُمْ وَ اَمْوَالَهُمْ بِاَنَّ لَهُمُ الْجَنَّةَ۔ (۹/۱۱۱)

اس معاہدہ کی رو سے، ہر مومن، اپنی جان اور اپنا مال (اپنی کمائی) "خدا کے ہاتھ" بیچ دیتا ہے اور اس کے عوض "خُدا" اسے جنت کی زندگی عطا کر دیتا ہے۔ اس دنیا میں جنت کی یہ زندگی، نظامِ خداوندی کی

وساطت سے ملتی ہے۔ آخرت میں یہ براہِ راست خدا کی طرف سے ملے گی۔ اس دنیا کی جنت کی بنیادی خصوصیات یہ ہوں گی کہ وَكُلَا مِنْهَا رَغَدًا حَيْثُ شِئْتُمَا (۲/۳۵) اس میں، جہاں بھی کسی کو بھوک لگے اسے پیٹ بھر کر کھانے کو مل جائے گا۔ اس میں — اِنَّ لَكَ اَلَّا تَجُوْعَ فِيْهَا وَلَا تَعْرٰى. وَاَنَّكَ لَا تَظْمَؤُا فِيْهَا وَلَا تَضْحٰى- (۲۰/۱۱۸-۱۱۹) نہ کسی کو بھوک کی وجہ سے کسی قسم کی پریشانی ہوگی، نہ لباس کی طرف سے، نہ کسی کو پیاس ستائے گی نہ موسم کی گرمی (سردی) باعثِ تکلیف ہوگی۔ اس میں ہر فرد کو ضروریاتِ زندگی (روٹی، کپڑا، مکان وغیرہ) نہایت اطمینان سے مل جائے گا — اسے بھی اور اس کی اولاد کو بھی — جہاں تک اپنی محنت کی کمائی کو نظامِ مملکت کے سپرد کر دینے کا تعلق ہے، اس کا عملی طریق (اصولی طور پر) سورۂ بقرہ کی اس آیۂ جلیلہ میں بیان کر دیا جس میں کہا کہ

جنّتِ ارضی

يَسْئَلُوْنَكَ مَاذَا يُنْفِقُوْنَ. — اے رسولؐ! یہ تجھ سے پوچھتے ہیں کہ ہم اپنی کمائی میں سے کس قدر دوسروں کی ضروریات پوری کرنے کے لئے دیدیں؟

قُلِ الْعَفْوَ (۲/۲۱۹) — ان سے کہہ دو کہ جس قدر تمہاری اپنی ضروریات سے زاید ہے، وہ سب کا سب۔

اس سے بھی آگے بڑھ کر، ان کی کیفیت یہ ہوگی کہ يُؤْثِرُوْنَ عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ وَلَوْ كَانَ بِهِمْ خَصَاصَةٌ (۵۹/۹)۔ وہ خود تنگی ترشی میں گزارہ کرلیں گے اور دوسروں کی ضروریات کو اپنی ضروریات پر ترجیح دیں گے اور جن ضرورت مندوں کی ضروریات پوری کرنے کے لئے دیں گے ان سے کہہ دیں گے کہ لَا نُرِيْدُ مِنْكُمْ جَزَآءً وَّلَا شُكُوْرًا (۷۶/۹) ہم تم سے اس کا کوئی معاوضہ نہیں چاہتے — معاوضہ یا صلہ تو ایک طرف، ہم اس کے لئے شکریہ تک کے بھی متمنی نہیں، اس لئے کہ ہم نے یہ مال "بیچ دیا ہوا ہے"۔ یہ ہمارا ہے ہی نہیں۔

(۰)

یہ ہیں قرآن کے اس معاشی نظام کے اساسی خط و خال، جسے قائم کرنے کے لئے اسلامی مملکت وجود میں آتی ہے! لیکن ظاہر ہے کہ یہ نظام اپنی انتہائی اور مکمل شکل میں شباشب رائج نہیں کیا جاسکتا

اسے بتدریج عمل میں لایا؛ اور اس کا آغاز، قومِ مخاطب کے حالات کے مطابق مناسب کڑی سے کیا جاسکتا ہے. قرآنِ کریم نے اس سلسلہ میں جو احکام دیئے ہیں ان میں بھی اس تدریجی پروگرام کو ملحوظ رکھا گیا ہے. ہم مناسب سمجھتے ہیں کہ ان تدریجی مراحل کو تفصیل سے بیان کر دیا جائے تاکہ قرآن کا معاشی نظام اور اس کی تشکیل کا عملی پروگرام نکھر کر سامنے آجائے۔

منزلِ اوّل

انفرادی زندگی

جب قرآنِ کریم نازل ہوا تو اس کی رُو سے اس نظام کی آواز اس معاشرہ میں بلند کی گئی جو نظام سرمایہ داری کی زنجیروں میں جکڑا ہوا تھا. اُس میں ایک طرف، ایسے متموّل افراد تھے جو اپنی دولت کے نشہ میں بدمست تھے اور دوسری طرف ایسے مفلوک الحال جو نانِ شبینہ تک سے محروم تھے. اس معاشرہ میں سب سے پہلے متموّل لوگوں سے اپیل کی گئی کہ وہ ان ناداروں اور محتاجوں کی روٹی کا انتظام کریں جو خود اپنی زندگی کی ضروریات پوری کرنے سے کسی طرح معذور ہو چکے ہیں. ان سے کہا گیا کہ اگر تم نے ان مسکینوں اور محتاجوں

انفرادی اپیل

کے رزق کا انتظام نہ کیا تو یاد رکھو! تم پر جہنّم کا عذاب مسلّط ہو جائے گا. (۷۶/۸-۱۰ ز ۶۹/۳۴) اخروی زندگی میں یہ عذاب کس قسم کا ہوگا، اس کی تفصیل میں گئے بغیر انہیں یہ بتایا گیا کہ اگر تم نے معاشرہ کا موجودہ نقشہ نہ بدلا جس میں بیشتر انسان اپنی بنیادی ضروریاتِ زندگی تک سے محروم رہتے ہیں؛ تو ملک میں ایسا فساد برپا ہوگا جس میں تمہاری عزتیں خاک میں مل جائیں گی. اس وقت تم حواس باختہ ہو کر پوچھو گے کہ ایسا کیوں ہوا. فطرت کا اٹل قانون تمہیں بتائے گا کہ یہ اس لئے ہوا کہ تمہارے ہاں عزّت و تکریم کا معیار دولت اور جتھہ کی اکثریت تھی. تم میں جو تنہا رہ جاتا تھا تم اسے عزّت کا مستحق نہیں سمجھتے تھے اور جس کا چلتا ہوا کاروبار کسی حادثہ کی وجہ سے رُک جاتا تھا تم خود اس کی روٹی کا انتظام کرتے تھے نہ دوسروں کو اس کی ترغیب دلاتے تھے. (۸۹/۱۷-۲۰)
ان میں سے جو لوگ اس نئی آواز پر لبیک کہہ کر اس داعیٔ انقلاب کی رفاقت کا عہد کرتے انہیں جماعتِ

مومنین کہا جاتا تھا)۔ ان سے بھی کہا جاتا کہ یاد رکھو! اس آواز کی ہمنوائی سے تم بہت بڑی ذمہ داری اپنے سر پر لیتے ہو۔ تمہیں محتاجوں، یتیموں اور اسیروں کی روٹی کا انتظام کرنا ہوگا اور ستائش کی تمنا اور صلہ کی اُمید کے بغیر ایسا کرنا ہوگا۔ (۷۶/۸-۹) یہ ایک سخت گھاٹی ہے جس پر تمہیں چڑھنا ہوگا (۹۰/۱۱-۱۶) جو ایسا نہیں کرے گا وہ اپنے دعوائے ایمان کی تکذیب کرے گا۔ (۱۰۷/۱-۳) تمہارے دعوئ ایمان کی صداقت کا ثبوت یہ ہوگا کہ تم محتاجوں اور ناداروں کی ضروریات پوری کرنے کے لئے کیا کچھ دیتے ہو۔ (اسے قرآن کی اصطلاح

صدقات

میں صدقہ کہتے ہیں) اس کی ابتداء تم اپنے اعزّہ و اقارب سے کرو اور پھر، اس کا دائرہ وسیع کرتے ہوئے، اپنے اور بیگانے کی تمیز سے بلند ہو کر، ہر ضرورت مند کی ضروریات پوری کرنے کا انتظام کرو۔ (۲/۲۱۵ ؛ ۳۰/۳۸) لیکن ایسا نہ ہو کہ جس محتاج کی کوئی ضرورت پوری کرو، اس کے سر پر احسان کی من بھر کی سل رکھ دو کہ وہ بے چارہ ساری عمر اس کے بوجھ تلے دبا رہے۔ نہ ہی اسے لوگوں کو دکھا دکھا کر، اپنے پندارِ نفس کی تسکین کا سامان پیدا کرو۔ اسے انسانیت کا فریضہ سمجھ کر ادا کرو۔ عقلِ فریب کار تم سے کہے گی کہ ہم دوسروں پر خرچ تو کریں لیکن اس سے نہ ان لوگوں سے اپنا احسان منوائیں اور نہ ہی معاشرہ میں پاپولر ہونے کے لئے لوگوں میں اس کا چرچا کریں، تو ہم اپنی دولت دوسروں پر خرچ کیوں کریں؟ تم اسے سمجھاؤ کہ جو کچھ اس طرح سے خرچ کیا جائے گا وہ ضائع نہیں جائے گا۔ اس کی مثال یوں سمجھو جیسے کسان بیج کے دانے مٹی میں ملا دیتا ہے تو وہ ضائع نہیں جاتے۔ اسے ایک ایک دانے کے عوض سینکڑوں دانے واپس مل جاتے ہیں۔ ان صدقات سے ایسے معاشرہ کی بنیاد رکھی جائے گی جس میں حقوقِ انسانیت محفوظ ہو جائیں گے اور تم اس تباہی سے بچ جاؤ گے جو انسانی ناہمواریوں کا فطری نتیجہ ہوتی ہے۔ (۲/۲۶۱-۲۷۶) ؛ (۱۴/۳۱)

قرآنِ کریم نے اس پہلی اسٹیج پر، جہاں ایک طرف ضرورت مندوں کی ضروریات پوری کرنے کی انفرادی

مال و دولت میں اصلاح

طور پر ترغیب و تحریص دی، اس کے ساتھ ہی دوسری طرف مالی معاملات میں اصلاح کی ہدایات بھی دیں۔ اس نے کہا کہ دوسروں کا پیسہ باطل طور پر مت کھاؤ (۲/۱۸۸) ؛ (۴/۲۹) اس سلسلہ میں اس کی تصریح کر دی کہ مذہبی علماء و مشائخ لوگوں کا مال باطل طور پر کھا جاتے ہیں لہٰذا انہیں کچھ نہ دو۔ وہ خود محنت کر کے کمائیں کھائیں۔ (۹/۳۴) یتیموں کے مال کی حفاظت کرو۔ (۴/۶ ؛ ۶/۱۵۲ ؛ ۱۷/۳۴) اگر عورت بھی کچھ کمائے

تو مرد خواہ مخواہ غاصبانہ طور پر اس کا مالک نہ بن جائے۔ عورت اپنی کمائی کی مالک ہوگی، مرد اپنی کمائی کا (۴/۳۲) لین دین کے معاملات کے متعلق تاکید کی کہ انہیں ضبطِ تحریر میں لے آیا کرو۔ (۲/۲۸۲) مقروض اگر تنگدست ہو تو اسے قرض کی ادائیگی کے لئے مہلت دو اور اگر اس میں ادائیگی قرضہ کی استطاعت نہ ہو تو اسے قرض معاف کردو۔ (۲/۲۸۰) اپنے ترکہ کے متعلق وصیت کرو۔ (۲/۱۸۰ ز ۵/۱۰۶) اگر ایسی صورت پیدا ہو جائے کہ متوفی وصیت نہیں کرسکا، یا اس کی وصیت پورے ترکہ کو محیط نہیں ہوتی، تو ترکہ کی تقسیم ان احکام کے مطابق کردو جو قرآن کریم میں دیئے گئے ہیں (۴/۷ ز ۱۲-۴/۱۱) اور جن کی رُو سے دولت ایک جگہ مرکوز ہونے کے بجائے چھوٹے چھوٹے حصوں میں بٹ جاتی ہے۔ خرید و فروخت یا آجر و متاجر (مزدور) کے تعلقات میں حسنِ معاملہ کے سلسلہ میں بار بار تاکید کی کہ کبھی کم نہ تولو۔ خریدار کو اس کی قیمت کے بدلے میں صحیح صحیح چیز دو۔ مزدور کی مزدوری، قاعدے اور معاہدے کے مطابق ادا کرو۔ (۹/۱۵۳ ز ۷/۸۵ ز ۱۱/۸۴ ز ۱۷/۳۵ ز ۳-۸۳/۱)

زرعی اصلاح

عربوں کی معیشت (بالخصوص مکہ میں) زرعی نہیں تھی۔ اس لئے اس منزل میں زیادہ تر توجہ کاروباری معاملات کی اصلاح کی طرف مبذول کرائی گئی۔ زرعی اصلاح کے سلسلہ میں کہا گیا کہ جو کچھ تم اپنی محنت سے کماؤ اس میں سے بھی نادار ضرورت مندوں کی ضروریات پوری کرنے کے لئے دو اور زمین کی پیداوار میں سے بھی۔ (۲/۲۶۷) اسے " خدا کا حق" کہہ کر پکارا گیا۔ (۶/۱۴۲)۔ (ایسا کیوں کہا گیا، اس کی تفصیل ذرا آگے چل کر سامنے آئے گی)۔ جس طرح صدقات کے سلسلہ میں کہا گیا تھا کہ اگر تم نے مفلوک الحال محتاجوں کی ضروریات پوری نہ کیں، تو معاشرہ میں ایسا فساد برپا ہو جائے گا جو تمہارے موجودہ مقاماتِ عزت و تکریم کو الٹ کر رکھ دے گا، اسی طرح زمین کے سلسلہ میں بھی کہا کہ اگر تم نے اس میں سے " خدا کا حق" محتاجوں کو نہ دیا تو تمہارے کھیتوں کا ہر دانۂ گندم جل کر راکھ ہو جائے گا۔ (۳۳-۶۸/۱۷ ز ۴۴-۱۸/۳۲) اور تمہارے بال بچے تک تباہ ہو کر رہ جائیں گے۔ (۲/۲۶۶)

(0)

منزلِ دوم

اجتماعیت کی طرف اقدام

منزلِ اوّل میں تمام ہدایات اور تاکیدات انفرادی تھیں۔ اس دوران میں، وہ لوگ جو اس دعوتِ انقلاب کی صداقت کے قائل ہوگئے، اس داعیٔ انقلابؐ کے گرد جمع ہوتے چلے گئے اور اس طرح ان کا (یوں کہیئے کہ) ایک الگ معاشرہ وجود میں آنا شروع ہوگیا۔ یہ اس پروگرام کی دوسری منزل تھی۔ اس میں انفرادیت سے اجتماعیت کی طرف قدم اٹھایا گیا۔ منزلِ اوّل میں افراد سے کہا گیا تھا کہ وہ ناداروں اور محتاجوں کی اپنے اپنے طور پر مدد کریں۔ (اسے "صدقات" سے تعبیر کیا گیا تھا) اب کہا کہ نہیں۔ صدقات (اپنے عطیّات) کو اپنے اپنے طور پر خرچ نہ کرو بلکہ اسے اپنے نظام کے مرکز کے پاس جمع کرو۔ بلکہ اس مرکزِ نظام (یعنی نبی اکرمؐ) سے کہا گیا کہ ان کے صدقات خود وصول کرو (۹/۱۰۳) اور اس روپے کو معاشرہ کے فلاحی امور کے لئے اُن مدّات پر صرف کرو جن کا ذکر سورۂ توبہ کی آیت (۹/۶۰) میں آیا ہے۔[1] پہلے کہا گیا تھا کہ اہلِ حاجت کو قرض دیا کرو اور اس کی ادائیگی میں مقروض کی سہولت کو پیشِ نظر رکھا کرو۔ اب کہا کہ "قرضِ اللہ کو دیا کرو" (۵۷/۱۸ ؛ ۷۳/۲۰) یعنی جب تمہارے نظام کی مرکزی اتھارٹی (یعنی خود نبی اکرمؐ) کسی اجتماعی ضرورت کے لئے اپیل کرے تو جو کچھ کسی سے بن پڑے، اسے دے دیا کرو۔ وہ اس قرضہ کو تمہارے حفاظتی امور میں صرف کرے گا اور تھوڑے عرصہ کے بعد، جب تمہارا معاشرہ مضبوط ہوجائے گا اور یہ نظام پوری طرح متشکل، تو جو کچھ تم اب "اللہ کو" بطور قرض دو گے، اس کی پائی پائی تمہیں واپس مل جائے گی۔ (۸/۶۰) لیکن اگر تم نے اس وقت بخل سے کام لیا تو پھر تم تباہ ہو جاؤ گے۔ اس لئے تم اپنے ہاتھوں

صدقات کا اجتماعی نظم و نسق

---

[1] یہ "صدقات" کے مصارف ہیں جنہیں ہمارے ہاں (غلطی سے) "زکوٰۃ" کے مصارف سمجھ لیا گیا ہے۔ زکوٰۃ کا بیان آگے چل کر آئے گا۔

اپنی تباہی مول نہ لو۔ (۲/۱۹۵) یہ ہلاکت یا تباہی کیا ہوگی ؟ یہ کہ تم مٹ جاؤ گے اور تمہاری جگہ کوئی اور قوم لے لے گی جو تمہارے جیسی نہیں ہوگی۔ (۴۷/۳۸) انفرادی مفاد پرستی کے جذبات (جنہیں شیطانی وساوس کہا جاتا ہے) تمہیں ورغلائیں گے کہ اپنا پیسہ اپنے پاس رکھو۔ وقت پر تمہارے کام آئے گا۔ (۲/۲۶۸) لیکن تم اس فریب میں نہ آجانا۔ معاشرہ میں ناہمواریوں سے جو فساد رونما ہوتا ہے اس میں انفرادی ملکیتیں کچھ کام نہیں آیا کرتیں۔ ایسا سمجھنے والے (کہ ہمارا ذاتی پیسہ ہمیں تباہی سے بچا لے گا) اور دوسروں کو بھی اسی قسم کی پٹی پڑھانے والے، تباہیوں اور ہلاکتوں کو بلا بلا کر اپنا گھر دکھاتے ہیں۔ (۴/۳۷، ۵/۳۴، ۹۲/۸۔۹) یاد رکھو! جو کچھ تم اجتماعی مفادِ انسانیہ کے لئے دو گے اس سے تمہاری اہمیت ہی نہیں ہوگی بلکہ مزید نشوونما بھی ہوتی چلی جائے گی۔ (۹۲/۱۸) تمہاری طبیعی نشوونما بھی اور تمہاری ذات کی نشوونما بھی، جو درحقیقت منتہیٰ و مقصود ہے۔ موجودہ سطحِ زندگی کی تمام تگ و تاز جدّوجہد کا۔ انسانی ذات کی نشوونما کو اصطلاح میں "قربِ خداوندی" کہا جاتا ہے کیونکہ اس سے انسان میں (حدِ بشریت کے اندر) خدا کی صفات کی نمود ہوتی ہے۔ یہ "تقرب الی اللہ"، مال و دولت جمع کرنے سے حاصل نہیں ہوتا۔ اسے "خدا کو دے دینے" سے ہوتا ہے۔ (۳۴/۳۷) اس میں شبہ نہیں کہ زن و فرزند کی طرح، مال و دولت میں بھی کشش و جاذبیت ہے۔ (۳/۱۳) لیکن

مال و دولت کے نظام میں اصلاح

اگر زن و فرزند یا مال و دولت کی جاذبیت، اجتماعی مفادِ انسانیت پر غالب آجائے تو یہی زن و فرزند اور مال و دولت فتنہ بن جاتے ہیں۔ (۶۴/۱۵) اس لئے تم انفرادی مفاد پرستی کے فریب میں نہ آؤ۔ اسی سے تمہیں کامیابی نصیب ہوگی۔ (۶۴/۱۶-۱۷) انفرادی دولت جمع کر کے، یہ نہ سمجھ لو کہ تم معاشرہ کے اجتماعی تعاون سے مستغنی ہو گئے ہو، تم خود کفیل (SELF-SUFFICIENT) ہو گئے۔ قطعاً نہیں۔ جو ایسا سمجھتا ہے تباہ ہو جاتا ہے۔ (۹۲/۱۰، ۹۶/۷)

سائل و محروم کا حق

منزلِ اوّل میں، ضرورت مندوں کی امداد کے لئے اپیل کی گئی تھی، جس کے معنی یہ تھے کہ وہ تم سے اپنے حق کے طور پر کچھ نہیں مانگتے۔ تم انہیں بطورِ امداد کچھ دو..... لیکن اب کہا کہ تمہارے مال و دولت میں ضرورت مندوں کا حق ہے۔ یعنی وہ اس میں سے اپنی ضروریات کے بقدر، بطورِ استحقاق (AS OF RIGHT) لے سکتے ہیں۔ (۵۱/۱۹، ۷۰/۲۴-۲۵) اگر تم خود ان کے اس حق کو ادا نہ کرو گے، تو معاشرہ تم سے ان کا یہ حق دلوائے گا۔

آپ نے دیکھا کہ اس منزل میں صدقات کی حیثیت خیرات کی نہیں رہی، حق کی ہو گئی ہے۔ خیرات لینے والا ذلت محسوس کرتا ہے اور دینے والے کے دل میں اس سے جذبۂ احسان ابھرتا ہے لیکن جو چیز بطورِ حق وصول کی جائے، اس سے نہ لینے والے کے دل میں احساسِ کمتری (INFERIONITY COMPLEX) پیدا ہوتا ہے، نہ دینے والے کے دل میں جذبۂ برتری (SUPERIORITY COMPLEX)۔

مالِ غنیمت

عربوں کے ہاں، مالِ غنیمت بہت بڑا ذریعۂ آمدنی تھا، اور ان کے معاشرہ کا رواج یہ تھا کہ جنگ میں، جو کچھ کوئی دشمن کا لوٹ لے، وہ اسی کا ہو جاتا تھا۔ قرآنِ کریم نے اس میں بھی اصلاح کی اور کہا کہ مالِ غنیمت، انفرادی ملکیت نہیں ہوگا؛ اسے مرکز میں جمع کرنا ہوگا۔ مرکز اس میں سے ایک حصہ اجتماعی ضروریات کے لئے الگ کر کے، باقی مال سپاہیوں میں تقسیم کرے گا۔ (۸/۴۱) اس ایک تبدیلی سے، نہ صرف یہ کہ اس ذریعۂ آمدنی کی حیثیت اجتماعی ہو گئی بلکہ جنگ کا جذبۂ محرکہ بھی بدل گیا۔ پہلے جنگ کا جذبۂ محرکہ لوٹ کا مال حاصل کرنا تھا ـــ جو جتنا حاصل کر سکے، لے جائے ـــ اب جذبۂ حقوقِ انسانیت کی حفاظت قرار پا گیا۔ اسے قرآن کی اصطلاح میں "قتال فی سبیل اللہ" کہا جاتا ہے، یعنی اللہ کی راہ میں جنگ۔ واضح رہے کہ جو کچھ اجتماعی مفادِ انسانیہ کے لئے کیا جائے، اسے قرآن کی رو سے "فی سبیل اللہ" (یعنی اللہ کی راہ میں) کہا جاتا ہے۔

دولت کا اکتناز

دولت اُسی صورت میں اپنا مقصد پورا کر سکتی ہے جب یہ گردش میں رہے ـــ خود لفظ دولت کے معنی گردش کرنے کے ہیں ـــ لیکن انفرادی ہوسِ زر پرستی، اسے گردش میں رکھنے کے بجائے، جمع کر کے روک لیتی ہے۔ اس سے معاشرہ کا اقتصادی نظام الٹ جاتا ہے۔ قرآنِ کریم نے بڑے تہدید آمیز انداز میں کہا کہ دولت کا اکتناز ـــ یعنی اسے جمع کر کے روک رکھنا۔ سنگین ترین جرم ہے۔ اس سے جہنم کے شعلے بھڑکتے ہیں جن میں یہ دولت اور اس کے جمع کرنے والے، دونوں، بری طرح جھلستے اور جلتے ہیں۔ (۹/۳۴-۳۵) یہ شعلے، ان کے دلوں کو اپنی لپیٹ میں لے لیتے ہیں۔ (۱۰۴/۲-۷) یہ اس آگ سے لاکھ بچنا چاہیں لیکن وہ انہیں آوازیں دے دے کر بلا لیتی اور آتش فشاں پہاڑ کے لاوے کی طرح ان کا سب کچھ تباہ کر دیتی ہے۔ (۷۰/۱۵-۱۸)

دولت کو گردش میں رکھنے کے سلسلہ میں، اس کی بھی وضاحت کر دی کہ اس کے یہ معنی نہیں کہ یہ

اوپر کے طبقہ ہی میں گردش کرتی رہے۔ اسے پورے کے پورے معاشرہ کے رگ وپے میں اس طرح گردش کرتے رہنا چاہیئے، جس طرح انسانی جسم میں خون گردش کرتا ہے۔ (۵۹/۷)

ربٰو قرآنی نظام کیخلاف جنگ ہے

دولت جمع کرنے کے خلاف اس قسم کی تنبیہات و تاکیدات کے بعد، اس نے ایک ایسا حکم دیا جس سے دولت جمع کرنے کے مقصد اور جذبہ ہی کو جڑ سے کاٹ دیا۔ روپیہ ضروریاتِ زندگی کی خرید و فروخت کا ذریعہ ہے۔ اس سے از خود کچھ پیدا نہیں ہوتا۔ آپ ایک سو روپیہ کسی بکس میں رکھ دیجئے۔ اسے آپ دس برس کے بعد بھی نکالیں گے تو وہ سو کا سو ہی ہوگا۔ وہ ایک پیسہ بھی پیدا نہیں کرے گا۔ اگر روپے کی حیثیت یہی رہے کہ وہ جتنی دیر بھی چاہے پڑا رہے، اس میں کوئی اضافہ نہ ہو، تو ظاہر ہے کہ روپیہ جمع کر کے رکھ چھوڑنا حماقت ہوگا ـــ لیکن اگر آپ وہی سو روپیہ کسی ضرورت مند کو سود پر دے دیں تو وہ روپیہ اپنے ساتھ کچھ اور روپے لے کر آئے گا یعنی اب آپ کا روپیہ، اپنے جیسے اور روپے پیدا کرے گا۔ جو روپیہ محنت سے نہیں بلکہ روپے سے از خود پیدا ہو۔ اسے قرآنِ کریم کی اصطلاح میں ربٰو کہتے ہیں۔ قرآنِ کریم نے ربٰو کے متعلق واضح الفاظ میں کہہ دیا کہ وہ حرام ہے اور سنگین ترین جرم ـــ ایسا جرم، جسے اس نے، اسلامی نظام کے مدمقابل ایک باغی نظام قرار دیا اور کہہ دیا کہ ایسا نظام قائم کرنے والوں سے کہہ دو کہ اگر وہ اس سے باز نہ آئے تو ہماری طرف سے اعلانِ جنگ سمجھیں۔ (۲۷۹-۲۷۵/۲) دلیل کے طور پر اس نے کہا کہ ربٰو سے تمہاری انفرادی دولت میں بیشک اضافہ ہو جاتا ہے لیکن اس نظامِ معیشت کے نتائج و عواقب اس قدر مضرت رساں ہیں کہ انجام کار، اس سے اجتماعی دولت میں بے حد کمی واقع ہو جاتی ہے۔ ایک طبقہ، دوسروں کی محنت کا غاصب بن کر، قوتِ عمل سے محروم اور سعاداتِ انسانیہ سے عاری ہو جاتا ہے اور دوسرا طبقہ اپنی محنت کے ماحصل سے محروم ہو کر مفلس و نادار ہو جاتا ہے اور اس سے اس کے سینے میں انسانیت کے خلاف نفرت اور انتقام کی آگ پہلے سلگتی رہتی اور آخر الامر بھڑک اٹھتی ہے۔ (۱۳۰-۱۲۹/۳)

واضح رہے کہ قرآنِ کریم نے اتنا ہی نہیں کہا کہ کسی ضرورت مند کو قرضہ دے کر اس سے جو زائد روپیہ لیا جائے وہی ربٰو ہے۔ اس نے واضح الفاظ میں کہہ دیا کہ جو روپیہ تم، دوسروں کے روپے کے ساتھ اس مقصد سے شامل کر دو کہ اس سے تمہیں کچھ زائد حاصل ہو جائے گا، وہ بھی ربٰو ہے۔ (۳۰/۳۹) اسے دورِ حاضر کی اصطلاح میں کمرشل انٹرسٹ کہا جاتا ہے۔ نیز اس میں مضاربت (SLEEPING PARTNERSHIP)

اور مزارعت (زمین کی بٹائی یا کرایہ) وغیرہ سب آجاتے ہیں۔ اس نے اصول یہ بتایا کہ لَیْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَا سَعٰی (۵۳/۳۹) معاوضہ صرف محنت کا ہے سرمایہ کا نہیں۔ سرمایہ کا معاوضہ ربوٰ ہے خواہ اس کی کوئی سی شکل بھی کیوں نہ ہو۔

ربوٰ کو حرام قرار دیکر، قرآن نے روپیہ جمع کرنے کا مقصد اور جذبہ ہی ختم کر دیا۔

اب آگے بڑھیے۔ انسانی معیشت میں زمین کے مسئلہ کو خواہ مخواہ پیچیدہ بنا دیا گیا ہے حالانکہ بات

زمین کے متعلق اگلا قدم

اس قدر واضح اور صاف ہے کہ اسے سمجھنے کے لئے نہ کسی افلاطون کے دماغ کی ضرورت ہے نہ ارسطو کے منطق کی حاجت خدا نے اپنے آپ کو اَلْحَیُّ کہنے کے ساتھ ہی اَلْقَیُّوْمُ بھی کہا ہے۔ یعنی زندگی عطا کرنے والا اور زندگی کو قائم رکھنے والا۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ اس نے زندگی عطا کی تو زندگی قائم رہنے کے لئے جس قدر سامان و اسباب کی ضرورت تھی، اسے بھی ساتھ ہی عطا کر دیا۔ قیام زندگی کے لئے روشنی، حرارت، ہوا، پانی اور خوراک کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس نے ان تمام اشیاء کو، انسان کے پیدا کرنے سے پہلے مہیا کر دیا۔ روشنی، حرارت، ہوا اور پانی تو عام طور پر سطح ارض کے اوپر موجود رہتے ہیں۔ خوراک کے متعلق اس نے کہا کہ اس کے ذخائر زمین میں جمع کر دیئے گئے ہیں۔ انسان، انہیں اپنی ضرورت کے مطابق نکال لے۔ (۱۵/۲۱) ۔ وَجَعَلْنَا لَکُمْ فِیْھَا مَعَایِشَ وَمَنْ لَّسْتُمْ لَهٗ بِرٰزِقِیْنَ۔ (۱۵/۲۰) "ہم نے اس میں تمہارے لئے سامانِ معیشت رکھا ہے اور ان کے لئے بھی جن کے تم رازق نہیں ہو۔" آپ غور کیجئے کہ "معیشت" کا لفظ قرآن نے زمین کی پیداوار کے لئے استعمال کیا ہے۔ اس نے کہا ہے کہ اس میں سے تم خود بھی کھاؤ اور اپنے مویشیوں کو بھی کھلاؤ۔ (۲۰/۵۴) دوسری جگہ اس نے اسے مَتَاعًا لَّکُمْ وَلِاَنْعَامِکُمْ کہا ہے۔ (۷۹/۳۳؛ ۸۰/۳۲)

جیسا کہ ابھی ابھی کہا گیا ہے، ارض اور دیگر ذرائع حیات انسان کی پیدائش سے پہلے موجود تھے۔ اب آپ سوچئے کہ دنیا کے کسی مبنی بر عدل قانون اور قاعدے کی رو سے کوئی شخص، ان ذرائع حیات، (حرارت، روشنی، ہوا، پانی، زمین) میں سے کسی کا مالک قرار پا سکتا ہے جو تمام نوعِ انسان کے لئے مشترکہ اور یکساں وجۂ قیامِ زندگی ہوں۔ آج آپ کہہ سکتے ہیں کہ میں نے یہ قطعۂ زمین فلاں شخص سے خریدا ہے یا اپنے باپ سے ورثہ میں پایا ہے۔ آپ اس سلسلہ کو پیچھے کی طرف لوٹاتے جائیے اور اس شخص تک پہنچ

جائیے جس نے پہلی مرتبہ اس قطعہ اراضی کو اپنی ملکیت کہا تھا۔ آپ اس سے پوچھئے کہ اس نے اسے کس سے خریدا یا کس سے ورثہ میں پایا تھا؛ ظاہر ہے کہ اس نے دھاندلی سے اس قطعہ کو اپنی ملکیت بنا لیا تھا۔ اب جو چیز شروع میں دھاندلی سے کسی کے قبضہ میں آئی ہو، اس پر، اس کے بعد آنے والوں کا قبضہ کس طرح جائز قرار پا سکتا ہے؟ ذرائع حیات میں سے کسی پر، کسی کا مالک بن کر بیٹھ جانا، اس نوعِ انسان کے خلاف جرمِ عظیم ہے جس کی زندگی کے قیام کا اسے ذریعہ بنایا گیا ہے لیکن چونکہ یہ ظلم اور دھاندلی زمانۂ قدیم سے رواجاً قانوناً جائز چلی آ رہی تھی اس لئے قرآنِ کریم نے اس باطل تصور کو ذہن سے محو کرنے کے لئے بڑے محکم دلائل دیئے۔ اس نے خدا کو ماننے والوں سے کہا کہ تم جب آسمانوں کے اوپر خدا کے اقتدار و اختیار کو تسلیم کرتے ہو تو زمین پر اس کی الوہیت کو کیوں تسلیم نہیں کرتے؟ یاد رکھو! وہ جس طرح الٰہ السماء ہے اسی طرح الٰہ الارض بھی ہے۔ وَهُوَ الَّذِي فِي السَّمَاءِ إِلَٰهٌ وَفِي الْأَرْضِ إِلَٰهٌ (۴۳/۸۴) دوسری جگہ ہے۔ وَهُوَ اللَّهُ فِي السَّمَاوَاتِ وَفِي الْأَرْضِ۔ (۶/۳) اس نے واضح الفاظ میں کہہ دیا کہ آسمان میں اور خدا تسلیم کرنا اور ارض میں کوئی دوسرا خدا، کھلا ہوا شرک ہے۔ (۲۱/۲۱) سورۃ النحل میں ہے کہ خدا نے کہا ہے کہ تم دو الٰہ اختیار نہ کرو۔ الٰہ صرف ایک ہے اور وہ اللہ وہ ہے لَهُ مَا فِي السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ۔ (۵۲-۵۱/۱۶) سماوات اور ارض میں جو کچھ ہے سب اس کی ملکیت ہے۔ اس لئے تم انسانوں کو زمین کے رقبوں کا مالک قرار دے کر، انہیں خدا کا ہمسر نہ بناؤ۔ (۲/۲۲) اس کا مالک وہی ہو سکتا ہے جس نے انہیں پیدا کیا ہے اور تمام ذی حیات کے لئے ذریعہ رزق بنایا ہے۔ (۶۱-۶۰/۲۹)

اس قدر واضح دلائل دینے کے بعد اس نے کہا کہ اے رسول! اب تم ان سے پوچھو کہ ـــ لِمَنِ الْأَرْضُ وَمَنْ فِيهَا۔ زمین اور جو کچھ اس میں ہے وہ کسی کی ملکیت ہے۔ إِن كُنتُمْ تَعْلَمُونَ۔ لیکن اس کا جواب علم کی بارگاہ سے لے کر دو۔ اس کے بعد ہے کہ اگر انہوں نے علم و بصیرت سے کام لیا تو سَيَقُولُونَ لِلَّهِ۔ انہیں کہنا پڑے گا کہ یہ سب خدا کی ملکیت ہیں۔ قُلْ أَفَلَا تَذَكَّرُونَ۔ (۸۵-۸۴/۲۳) ان سے کہو کہ جب تمہیں خود اس کا اعتراف ہے کہ یہ سب خدا کی مِلک ہے تو پھر تم اس حقیقت کا سامنا کرنے سے کیوں گریز کرتے ہو کہ اس پر کسی انسان کی ملکیت نہیں ہو سکتی؟ اس حقیقت کو تسلیم کرو گے تو زمین کی پیداوار تمہارے لئے حلال و طیب ہوگی، ورنہ تم شیطان کے نقشِ قدم پر چلتے جاؤ گے جس نے تمہارے کان میں پھونک دیا ہے کہ تم ذرائع رزق کے مالک بھی ہو سکتے ہو۔ (۱۶۸/۱۱)

جیسا کہ پہلے کہا گیا ہے، روشنی، حرارت، ہوا، پانی اور زمین میں ایک فرق ہے۔ پہلی سب چیزیں اپنی استعمالی شکل میں از خود موجود ہیں لیکن خوراک کو زمین سے نکالنا پڑتا ہے، جس میں محنت صرف ہوتی ہے۔ قرآن کریم نے مختلف مقامات پر نہایت دل نشین انداز میں

معاوضہ محنت کا

واضح کر دیا کہ زمین کی پیداوار میں سے تم صرف اپنی محنت کے معاوضہ کے حقدار ہو، باقی "خدا کا حصہ" ہے مثال کے طور پر یوں سمجھو کہ تم کسی زمیندار سے بٹائی پر زمین لے کر اس میں کاشت کرتے ہو تو اس میں سے ایک حصہ خود لے لیتے ہو اور دوسرا حصہ زمیندار کو دے دیتے ہو جسے تم زمین کا مالک سمجھتے ہو اُسی قاعدے کے مطابق، زراعت میں اپنی محنت کا معاوضہ تم لے لو اور حقِ مالکانہ خدا کو دے دو۔ سورۃ الواقعہ کی آیات ۶۳ تا ۷۴ میں اس حقیقت کو بڑے دلکش انداز میں بیان کیا گیا ہے۔ غور سے سنیئے۔ فرمایا۔

(اس مقصد کے لئے تم ذرا اس نظام پر غور کرو جس کے مطابق تمہاری پرورش اور نشوونما ہوتی ہے اور سوچو کہ کیا یہ سب کچھ خدا کے قانون کے مطابق ہوتا ہے یا تمہارے وضع کردہ قوانین کے مطابق (مثلاً) تم جو کھیتی باڑی کرتے ہو تو غور کرو کہ اس میں تمہارا عمل دخل کتنا ہوتا ہے اور ہمارا قانون کیا کچھ کرتا ہے۔ تم زمین میں ہل چلا کر اس میں بیج ڈال دیتے ہو۔ اب بتاؤ کہ اس بیج سے فصل کون اگاتا ہے؟ کیا یہ تم ایسا کرتے ہو یا ہمارے قانون کی رو سے ایسا ہوتا ہے۔

اس کے بعد کہا۔

پھر کھیتی کے اُگنے کے بعد، اس کی حفاظت کون کرتا ہے؟ یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ کوئی ایسی آفت آجائے جس سے اُگی ہوئی کھیتی تہس نہس ہو کر رہ جاتے ۔۔۔ اس طرح تہس نہس کہ تم سر پکڑ کر بیٹھ جاؤ اور ایک دوسرے سے کہنے لگو کہ ہم بالکل تباہ ہو گئے۔ ہم یکسر محروم اور بے نصیب رہ گئے۔ اس کھیتی سے غلّہ ملنا تو ایک طرف، ہماری محنت اور بیج بھی بیکار ہیں گئے۔

اس کے بعد ہے:۔

پھر تم ذرا اس پانی پر غور کرو جس پر تمہاری کھیتی ہی کا نہیں بلکہ خود تمہاری زندگی کا دارومدار ہے۔ کیا اُسے بادلوں سے تم برساتے ہو؟ یا ہمارا قانونِ ربوبیت ایسا کرتا ہے۔

(یہ بادل سمندر کے پانی سے ترتیب پاتے ہیں جو اس قدر کھاری ہوتا ہے کہ نہ پینے کے کام آسکتا ہے نہ کھیتی باڑی کے) ذرا سوچو کہ اگر بادلوں کا پانی (بارش) ویسے کا ویسا کھاری رہتا تو تم کیا کرتے؟

حیرت ہے کہ تم اس قدر صاف اور سیدھے معاملہ پر اس نہج سے غور کر کے صحیح نتیجے تک کیوں نہیں پہنچتے اور نشو و نما کے متعلق خدا کے نظام کی قدر شناسی کیوں نہیں کرتے ؛

اس کے آگے ہے :۔

اسی طرح تم اس آگ پر غور کرو جسے تم روشن کر کے اس سے اتنے کام لیتے ہو؟ کہو کہ سبز درختوں کی شاخوں میں حرارت کو یوں سمٹا کر رکھ دینا ۔ رگِ خس میں شعلے کو نہاں کر دینا ۔ تمہاری کارگری سے ہے یا ہمارا قانون ایسا کرتا ہے ؟

ان حقائق کے بیان کرنے کے بعد کہا کہ :۔

(رزق پیدا کرنے کی اس تمام کائناتی مشینری پر غور کرو اور سوچو کہ یہ کس کے قانون کی کارفرمائی ہے پھر اس پر بھی غور کرو کہ اس تمام پروگرام میں تمہارا حصہ کس قدر ہے اور نظامِ خداوندی کا کس قدر ؟ تم کسی نہج سے بھی غور کرو ، بہرحال اسی نتیجہ پر پہنچو گے کہ اس کاروبار میں تم صرف محنت کرتے ہو، باقی سب کچھ خدا کا نظام کرتا ہے ۔ لہذا ، اس کے ماحصل (سامانِ زیست) میں بھی تمہارا حصہ بقدر تمہاری محنت کے ہو سکتا ہے ۔ تم پورے کے پورے مالک نہیں ہو سکتے) یہ تمام ذرائع پیداوار از خود موجود رہتے ہیں۔ یہ نہ تمہارے بنائے ہوئے ہیں نہ خریدے ہوئے ۔ یہ تمہیں اس حقیقت کی یاد دہانی کراتے ہیں کہ انہیں خدا نے بھوکوں کے لئے سامانِ زندگی بنایا ہے ۔

یعنی اس کاروبار میں محنت تمہاری ہے اور ذرائع پیداوار ہمارے ۔ لہذا ، تم اس میں سے اپنی محنت کا معاوضہ اپنے سامانِ پرورش کی صورت میں اپنے پاس رکھ لو اور " ہمارا حصہ ہمیں دے دو ۔" سوال پیدا ہوا کہ آپ کا حصہ آپ کو کس طرح پہنچائیں ؟ جواب دیا کہ متاع للمقوین ۔ یہ ان تک پہنچا دو جو اپنے لئے سامانِ پرورش حاصل کرنے کے قابل نہیں ۔ ان تک پہنچ گیا تو یہ سمجھ لو کہ ہم تک پہنچ گیا ۔ اسی حقیقت کو (۶۷/۲۱، ۳۰/۹۷ ، ۳۴-۳۳ ، ۸۰/۲۴) میں بھی بیان کیا گیا ہے ۔

قرآنِ کریم کی ان تصریحات کی روشنی میں ، اسلامی نظام نے عملی قدم اٹھایا اور جو لوگ "بے حد و نہایت" زمین کے رقبوں کے مالک بنے بیٹھے تھے ان کی ملکیت کی تحدید (حد بندی) کرنی شروع کر دی ۔ ظاہر ہے کہ اس کے لئے معیار یہی ہو گا کہ ایک شخص کے پاس اسی قدر رقبۂ اراضی رہے جس کی پیداوار اس کی اور اس کے اہل و عیال کی پرورش کے لئے کافی ہو ۔ اس طرح اس نے زمین پر ذاتی ملکیت ختم کرنے کے

عملی پروگرام کی ابتدا کردی. سورۃ الرعد میں ہے کہ داعئ انقلاب، حضور نبئ اکرمؐ کے دل میں یہ خیال پیدا ہوا

رقیبوں کی تحدید

کہ جس انقلاب کے لئے میں نے اپنی تمام عمر صرف کردی ہے، کیا اس کی تکمیل میری زندگی میں ہو جائے گی یا نہیں؛ اس کے جواب میں کہا کہ تم اس کی فکر میں نہ رہو کہ اس کی تکمیل تمہاری موجودگی میں ہوگی یا تمہاری وفات کے بعد. تم اس پیغام کو عام کرتے جاؤ. یہ مکمل ہوکر رہے گا، خواہ تمہاری زندگی میں اور خواہ اس کے بعد. تم دیکھتے نہیں کہ:

> ہم کس طرح زمین کے رقبوں کو ان بڑے بڑے سرداروں کے ہاتھوں سے سکیڑتے اور سمیٹتے (کم کرتے) چلے جارہے ہیں. یہ ہمارا فیصلہ ہے (کہ ان پر ان کی ملکیت ختم ہوگی) اور دنیا کی کوئی طاقت ہمارے فیصلے کو لوٹا نہیں سکتی. ہم بہت جلد حساب کرنے والے ہیں۔ (۱۳/۴۱)

سورۃ الانبیاء میں کہا ہے کہ انہیں اور ان کے آباؤ اجداد کو زمین متاعِ حیات حاصل کرنے کے لئے ملی تھی. اس پر زمانہ گزر گیا تو انہوں نے اس پر قبضۂ مخالفانہ جمالیا. اب ہم آہستہ آہستہ اسے ان کے ہاتھوں سے نکال رہے ہیں. ہمارے اس پروگرام کی تکمیل ہوکر رہے گی. یہ ہمیں مغلوب نہیں کرسکیں گے. (۲۱/۴۴)

یوں اس دوسری منزل میں اس نظام کے عملاً قیام کی ابتدا کردی.

(۰)

تیسری منزل

تکمیلِ کار

اب ہم اس پروگرام کی تیسری (اور آخری) منزل میں پہنچ رہے ہیں. اب اسلامی مملکت وجود میں آگئی ہے اور خدا نے ربوبیتِ عالمینی (یعنی تمام افراد کو سامانِ نشوونما دینے) کا جو وعدہ کیا تھا اُسے

اسلامی مملکت کی وجہ جواز

پورا کرنے کی ذمہ داری اس مملکت نے اپنے سر پر لے لی ہے. یہی اس مملکت کے وجود کی وجہ جواز تھی. سورۃ الحج میں ہے.

اَلَّذِیْنَ اِنْ مَّکَّنّٰهُمْ فِی الْاَرْضِ اَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَ اٰتَوُا الزَّکٰوةَ ..... (۲۲/۴۱)

یہ (مومنین)، وہ ہیں کہ جب انہیں زمین میں اقتدار حاصل ہوگا تو یہ اقامتِ صلوٰۃ اور ایتاءِ زکوٰۃ کا فریضہ ادا کریں گے۔

یہ آیۂ جلیلہ اسلامی مملکت کی وجہ جواز اور اس کی ذمہ داری کو نہایت واضح الفاظ میں بیان کرتی ہے۔ جیسا کہ ہم پہلے بھی بیان کر چکے ہیں، کہا یہ گیا ہے کہ اسلامی مملکت کا فریضہ اقامتِ صلوٰۃ اور ایتائے زکوٰۃ ہے۔ ایتائے زکوٰۃ کے معنی ہیں "زکوٰۃ دینا" یعنی قرآن نے کہا یہ ہے کہ اسلامی مملکت کا فریضہ یا ذمہ داری "زکوٰۃ دینا" ہے۔ یہ نکتہ بڑا توجہ طلب ہے۔ ہمارے ہاں زکوٰۃ سے مراد لی جاتی ہے وہ رقم جو ایک مالدار، ایک خاص شرح کے مطابق، اپنی دولت سے نکالتا ہے اور حکومت کا فریضہ یہ بتایا جاتا ہے کہ وہ اس رقم کو وصول کر کے اُسے متعیّن مصارف کے مطابق خرچ کرتی ہے۔ یعنی ہمارے مروجہ مفہوم کی رُو سے، حکومت کا فریضہ لوگوں سے زکوٰۃ لینا ہے لیکن قرآنِ کریم کی مندرجہ بالا آیت میں کہا یہ گیا ہے کہ اسلامی حکومت کا فریضہ "زکوٰۃ دینا" ہے۔ زکوٰۃ کا یہ مفہوم کہ وہ ایک متعیّنہ رقم ہے جسے مالدار (صاحب نصاب) اپنی دولت سے نکالتا ہے، قرآنِ کریم میں کہیں نہیں آیا۔ نہ ہی اس میں "زکوٰۃ کے مصارف" کا کوئی ذکر ہے۔ (جنہیں مصارفِ زکوٰۃ کہا جاتا ہے وہ صدقات کے مصارف ہیں نہ کہ زکوٰۃ کے۔ (دیکھئے ۹/۶۰) زکوٰۃ کے معنی ہیں "نشوونما"۔ لہٰذا، ایتائے زکوٰۃ کے معنی ہوں گے سامان نشوونما عطا کرنا۔ اس سے بات صاف ہو گئی۔ قرآنِ کریم نے کہا ہے کہ اسلامی حکومت کا فریضہ یہ ہے کہ وہ نوعِ انسان کی نشوونما کا سامان بہم پہنچائے اور اس طرح ربوبیّتِ عالمینی اور رزاقیّت کی وہ ذمہ داری، جسے خدا نے اپنے اوپر لیا تھا، پوری کرے۔

جیسا کہ پہلے بھی بتایا جا چکا ہے، یہ مملکت ان لوگوں (مومنین) کے ہاتھوں متشکل ہوتی ہے جو اپنے خدا سے ایک معاہدہ کرتے ہیں۔ یہ معاہدہ کہ:

خدا سے معاہدہ

اِنَّ اللّٰهَ اشْتَرٰی مِنَ الْمُؤْمِنِیْنَ اَنْفُسَهُمْ وَ اَمْوَالَهُمْ بِاَنَّ لَهُمُ الْجَنَّةَ۔ (۹/۱۱۱)

یعنی اس سوسائٹی کا ممبر بننے والا، اپنا مال اور اپنی جان، خدا کے ہاتھوں فروخت کر دیتا ہے اور اس کے بدلے میں خدا اسے جنت عطا کر دیتا ہے۔ ظاہر ہے کہ عملاً یہ معاملہ (TRANSACTION) اسلامی

مملکت کے ساتھ ہوتا ہے۔ (۴۸/۱۰۱) اس طرح ایک عبدِ مومن کا جان و مال، انفرادی ملکیت کے بجائے اسلامی نظام کی تحویل میں چلا جاتا ہے۔ اس کے عوض اُسے اِس دنیا میں بھی جنتی زندگی مل جاتی ہے اور آخرت میں بھی جنت، جس کا وعدہ خدا نے بے شمار مقامات پر کر رکھا ہے۔ لہٰذا، اسلامی نظام میں، مال پر انفرادی ملکیت کسی فرد کی نہیں رہتی، وہ "خدا کا مال" ہو جاتا ہے۔ (۲۴/۳۳)

اختلافِ صلاحیت

قرآن اسے تسلیم کرتا ہے کہ مختلف افراد میں اکتسابِ رزق کی صلاحیتیں مختلف ہوتی ہیں، مختلف بھی اور کم و بیش بھی۔ ہم اس وقت اس موضوع کی طرف نہیں جانا چاہتے کہ صلاحیتوں کا یہ فرق کیسے پیدا ہوتا ہے اور اس فرق کو کس طرح کم کیا جا سکتا ہے۔ اس وقت ہم اس حقیقت کو تسلیم کرتے ہوئے کہ مختلف افراد کی صلاحیتوں میں فرق ہوتا ہے، اس باب میں قرآنی نقطۂ نگاہ کو پیش کرنے پر اکتفا کریں گے۔ قرآنِ کریم میں ہے کہ صلاحیتوں کے اختلاف سے معاشرہ کے مختلف کام بآسانی سرانجام پاتے رہتے ہیں۔ (۴۳/۳۲) لیکن (وہ کہتا ہے کہ) اس اختلاف کو صرف اسی حد تک رکھو۔ اس سے معاشی ناہمواریاں نہ پیدا کرو۔ چنانچہ اس نے سورۃ النحل میں واضح الفاظ میں کہا کہ" اکتسابِ رزق کے سلسلہ میں، مختلف افراد میں صلاحیتوں کا فرق ہوتا ہے لیکن اس اختلاف کا مطلب یہ نہیں کہ جو لوگ زیادہ کمانے کی صلاحیت رکھتے ہیں، وہ اپنی کمائی کو اپنی ذاتی ملکیت سمجھ کر اسے دبا کر بیٹھ جائیں۔ انہیں چاہیے کہ اس فاضلہ کمائی کو اپنے ان ماتحتوں کی طرف لوٹا دیں جن کے تعاون و اشتراک سے کمائی میں اتنا اضافہ ہوا ہے۔ لوگ، یہ کہہ کر ایسا کرنے پر آمادہ نہیں ہوتے کہ واہ! اس سے تو اعلیٰ و ادنیٰ سب برابر ہو جائیں گے؟ ایسا کہنے والے اس فریب میں مبتلا ہوتے ہیں کہ انہیں جو زیادہ صلاحیت حاصل ہے وہ ان کی ذاتی پیدا کردہ ہے۔ یہ غلط ہے۔ بنیادی طور پر یہ صلاحیت ان کی اپنی پیدا کردہ نہیں، خدا کی عطا کردہ نعمت ہے جو انہیں بلا مزد و معاوضہ ملی تھی۔ (۱۶/۷۱؛ ۱۶/۵۳) اس نے کہا ہے کہ

قارونیت

قارون (جسے قرآن نظامِ سرمایہ داری کے نمائندہ کی حیثیت سے پیش کرتا ہے) بھی اسی فریب میں مبتلا تھا۔ جب اس نے کہا تھا کہ اِنَّمَآ اُوْتِیْتُهٗ عَلٰی عِلْمٍ عِنْدِیْ۔ (۲۸/۷۸) میرا مال و دولت، میری اپنی ہنرمندی کا نتیجہ ہے۔ میں اسے دوسروں کو کیوں دے دوں؟ قرآن کہتا ہے کہ یہی ذہنیت سارے فتنہ کی جڑ اور دنیا میں فساد برپا کرنے کی موجب ہے۔ (۳۹/۴۹) دوسرے مقام پر وہ کہتا ہے کہ اس قسم کی ذہنیت رکھنے والے سے جب کہا جاتا ہے کہ کیا تمہیں اسکا

احساس اور خیال نہیں کہ تم نے ایک دن خدا کے سامنے جانا ہے جہاں اس کی عطا کردہ نعمتوں کے متعلق پوچھا جائے گا۔ (۸/۱۰۲) تو (ہر چند اسے اس قسم کی باز پرس پر یقین نہیں ہوتا لیکن وہ خود فریبی یا فریب دہی کیلئے) یہ کہہ دیتا ہے کہ میں اس مال و دولت میں سے جو دو چار پیسے خیر خیرات کے طور پر "خدا واسطے" دے دیتا ہوں تو مجھے یقین ہے کہ اس کے عوض مجھے اُس دنیا میں بھی اسی طرح خوشگواریاں حاصل ہو جائیں گی جس طرح اِس دنیا میں حاصل ہیں۔ قرآن کہتا ہے کہ ایسا سمجھنا کفر ہے اور اس کا نتیجہ سخت عذاب۔ (۵۰/۴۱ تا ۴۷)

قُلِ الْعَفْوَ

یہ سب کچھ واضح کر دینے کے بعد، قرآنِ کریم نے وہ فیصلہ سنا دیا جس سے یہ مسئلہ ہمیشہ کے لئے اور قطعی طور پر طے ہو گیا اور جسے ہم پہلے بھی درج کر چکے ہیں۔ یعنی یَسْئَلُوْنَكَ مَاذَا يُنْفِقُوْنَ۔ اے رسولؐ! یہ لوگ تم سے پوچھتے ہیں کہ انہیں حتمی طور پر بتا دیا جائے کہ ان کی کمائی میں ان کا اپنا حق کس قدر ہے اور دوسروں کا کس قدر۔ کہا گیا کہ قُلِ الْعَفْوَ (۲/۲۱۹) ان سے کہہ دو کہ اس میں تمہارا حق صرف اس قدر ہے جس سے تمہاری ضروریات پوری ہو جائیں۔ باقی سب کا سب دوسروں کی ضروریات پوری کرنے کے لئے ہے۔ حتیٰ کہ اگر ایسا موقعہ آجائے کہ دوسرے کی ضرورت تمہاری ضرورت سے زیادہ شدید ہے تو تم اپنی ضرورت پر اس کی ضرورت کو ترجیح دو۔ (۵۹/۹)

مندرجہ بالا آیت (۲/۲۱۹) میں جو کہا گیا ہے کہ زاید از ضرورت (عفو) مال دوسرے ضرورت مندوں کے لئے دے دیا جائے تو یہ ایک اصولی ہدایت تھی۔ دوسرے مقام پر خود حکومت سے کہا گیا ہے کہ وہ زاید از ضرورت مال خود وصول کر کے اسے مناسب مقامات پر حسبِ ضرورت صرف کرے۔ (خُذِ الْعَفْوَ۔ ۷/۱۹۹) اسی حقیقت کو سورۃ انفال میں ان الفاظ میں بیان کیا گیا ہے کہ یَسْئَلُوْنَكَ عَنِ الْاَنْفَالِ۔ قُلِ الْاَنْفَالُ لِلّٰهِ وَ الرَّسُوْلِ۔ (۸/۱) اے رسولؐ! یہ لوگ تجھ سے زاید از ضرورت مال کے متعلق دریافت کرتے ہیں۔ ان سے کہہ دو کہ اسے "خدا اور رسولؐ" (مرکزی حکومتِ اسلامی) کی تحویل میں رہنا چاہیئے۔

(ضمناً) ہمارے ہاں عام طور پر انفال کا ترجمہ "مالِ غنیمت" کیا جاتا ہے لیکن ہم سمجھتے ہیں کہ یہ صحیح نہیں۔ اوّل تو، مالِ غنیمت کے لئے قرآنِ کریم نے (غنتم۔ مغانم) الگ الفاظ استعمال کئے ہیں۔ دوسرے، مالِ غنیمت کے متعلق کہا ہے کہ اس میں سے پانچواں حصہ، اللہ اور رسولؐ (مرکزی حکومت) کے لئے ہوگا اور باقی (۴/۵) مجاہدین میں تقسیم کر دیا جائے گا۔ (۸/۴۱) لہٰذا انفال "مالِ غنیمت نہیں"۔ انفال" جمع ہے نَفَلؔ کی۔ جس کے معنی زاید کے ہیں۔ (جیسے نماز میں فرضوں کے علاوہ نوافل پڑھے جاتے ہیں) مفہوم کے

اعتبار سے اس کی مختلف قسمیں ہو سکتی ہیں۔ مثلاً:-

(۱) ہمارے ہاں انکم ٹیکس حکومت کے واجبات میں سے ہوتا ہے، یعنی وہ ٹیکس جس کا ادا کرنا فرض ہے۔ اگر کوئی شخص، انکم ٹیکس کے علاوہ، ضروری امور کے لئے حکومت کو کچھ بطور عطیہ دیتا ہے تو یہ انفال میں داخل ہو گا۔ یعنی واجبات سے زاید۔ اسی کو صدقہ (جمع صدقات) بھی کہا جاتا ہے۔

(۲) انتظامی نقطۂ نگاہ سے، مرکزی حکومت، مقامی حکومتوں کو اجازت دے دے کہ وہ اس قسم کی آمدنی خود وصول کر کے اس میں سے اپنے اخراجات پورے کر لیا کریں۔ اگر ایسا ہو کہ کسی جگہ، اخراجات پورے کر لینے کے بعد کچھ روپیہ بچ جائے تو یہ انفال (زاید از ضرورت) ہو گا۔ اسے مرکز کی طرف منتقل کر دینا چاہیئے۔

(۳) اور تیسری شکل العفو کی ہے، یعنی اپنی ضروریات پوری کرنے کے بعد، جو کچھ افراد کے پاس بچ جائے، فرمایا کہ یہ زاید از ضرورت دولت حکومت کی تحویل میں جائے گی۔

اب ظاہر ہے کہ جب زاید از ضرورت مال کسی کے پاس نہیں رہے گا، تو نہ دولت جمع کرنے کا سوال پیدا ہو گا، نہ جائیدادیں کھڑی کرنے کا۔ ویسے بھی، جب ہر شخص (اور اس کی اولاد) کی ضروریاتِ زندگی پوری کرنے کی ذمہ داری حکومت اپنے اوپر لے لے، تو دولت جمع کس لئے کی جائے گی۔ یہ وجہ ہے جو قرآنِ کریم میں دولت جمع کرنے کے خلاف سخت تاکیدی اور تنبیہی احکام آئے ہیں۔ (تفصیل پہلے گزر چکی ہے۔)

زمین کا مسئلہ

ہم پہلے دیکھ چکے ہیں کہ قرآنِ کریم نے اس حقیقت کو واضح کر دیا تھا کہ زمین پر کسی کی ذاتی ملکیت کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ یہ تمام افرادِ انسانیہ (بلکہ تمام ذی حیات) کے لئے سامانِ زیست حاصل کرنے کا ذریعہ (۵۵/۱۰) اس لئے ایسا انتظام ہونا چاہیئے کہ یہ ذریعۂ رزق، تمام ضرورت مندوں کی ضروریات پوری کرنے کے لئے یکساں طور پر کھلا رہے۔ سَوَآءً لِّلسَّآئِلِيْنَ (۴۱/۱۰) یہ تمام نوعِ انسان کے لئے خدا کی طرف سے عطیہ ہے۔ وَمَا كَانَ عَطَآءُ رَبِّكَ مَحْظُوْرًا۔ (۱۷/۲۰) اور جو چیز تمام انسانوں کو بطورِ عطیہ ملی ہو، کسی کو اس کا حق حاصل نہیں کہ اس پر پھاٹک لگا کر "میری اور تیری" کی حد بندیاں قائم کرنے لگ جائے۔ جو لوگ رزق کے ان چشموں کو جنہیں "آبِ رواں" کی طرح بہتے رہنا چاہیئے تاکہ ہر ضرورت مند اپنی ضروریات بلا روک ٹوک پوری کر سکے، اپنے لئے روک

لیتے ہیں، وہ دیندار ہونے کے مدعی ہونے کے باوجود عملاً دین کی تکذیب کرتے ہیں۔ ان کی نمازیں لوٹا کر ان کے منہ پر مار دی جاتی ہیں۔ غور کیجئے کہ قرآن نے اس حقیقت کو کس قدر فکر انگیز انداز میں بیان کیا ہے۔ جب کہا ہے کہ اَرَءَیۡتَ الَّذِیۡ یُکَذِّبُ بِالدِّیۡنِ۔ کیا تو نے اس شخص کی حالت پر بھی غور کیا ہے، جو دین کی تکذیب کرتا ہے۔ فَذٰلِكَ الَّذِیۡ یَدُعُّ الۡیَتِیۡمَ وَ لَا یَحُضُّ عَلٰی طَعَامِ الۡمِسۡکِیۡنِ۔ یہ وہ ہے جو یتیم کو دھکے دے کر نکال دیتا ہے اور مسکین کی روٹی کا نہ خود انتظام کرتا ہے، نہ دوسروں کو ایسا کرنے کی ترغیب دلاتا ہے۔ یہ سمجھتا ہے کہ میں جو نماز پڑھ لیتا ہوں تو اس سے دین کا فریضہ ادا ہو جاتا ہے۔ یہ اس کی فریب خوردگی ہے۔ فَوَیۡلٌ لِّلۡمُصَلِّیۡنَ الَّذِیۡنَ هُمۡ عَنۡ صَلَاتِهِمۡ سَاهُوۡنَ۔ ایسے نمازیوں کے لئے انجامِ کار تباہی ہے جو صلوٰۃ کی حقیقت سے بے خبر اور اس کی غرض و غایت سے غافل رہتے ہیں اَلَّذِیۡنَ هُمۡ یُرَآءُوۡنَ۔ وہ سمجھتے یہ ہیں کہ نماز کے محسوس و مرئی ارکان کی ادائیگی کا نام صلوٰۃ ہے۔ وہ انہیں ادا کر لیتے ہیں۔ وَ یَمۡنَعُوۡنَ الۡمَاعُوۡنَ۔ (۱۰۷/۱-۷) اور رزق کے آب رواں کو روک کر بیٹھ جاتے ہیں۔ اگر یہ تکذیبِ دین نہیں تو اور کیا ہے؟

زمین کی اس پوزیشن کو قرآنِ کریم نے، قومِ ثمود کی تاریخی شہادت کی روشنی میں اس طرح واضح کر دیا کہ اس کے سمجھنے میں کسی قسم کا الجھاؤ نہ رہا۔

ارضُ الله

اس نے کہا کہ قومِ ثمود کی معیشت کا مدار گلّہ بانی (مویشی پالنے) پر تھا۔ ان کے گرد و نواح کھلی چراگاہیں اور پانی کے چشمے تھے لیکن قوم کے سرداروں نے ان پر اپنا ذاتی قبضہ جما رکھا تھا جس کا نتیجہ یہ تھا کہ کمزوروں کے مویشی بھوکے اور پیاسے رہ جاتے تھے۔ ان کی طرف حضرت صالحؑ پیامبرِ انقلاب بن کر آئے۔ انہوں نے سردارانِ قوم کے اس غصب و نہب کے خلاف آواز بلند کی۔ ان سرداروں نے آپ سے پوچھا کہ آپ بالآخر چاہتے کیا ہیں۔ انہوں نے فرمایا کہ میں صرف اتنا چاہتا ہوں کہ هٰذِهٖ نَاقَةُ اللّٰهِ لَكُمۡ اٰیَةً۔ فَذَرُوۡهَا تَاۡكُلۡ فِیۡۤ اَرۡضِ اللّٰهِ۔ (۷/۷۳) یہ زمین خدا کی ہے۔ نہ تمہاری ہے نہ میری۔ اور یہ مویشی بھی اسی کے پیدا کردہ ہیں۔ اس لئے ان مویشیوں کو آزادی ہونی چاہیئے کہ یہ اپنے خدا کی زمین سے چریں چگیں۔ تمہیں اس کا حق کیسے پہنچتا ہے کہ تم ارض اللہ (خدا کی زمین) پر اس طرح حدبندیاں قائم کر دو کہ اس کی مخلوق اس کی زمین میں تمہاری عائد کردہ حدود سے آگے نہ جا سکے۔ (۳۱/۷، ۱۱/۶۴)[1]۔ انہوں نے کہا کہ اس کا عملی طریق کیا ہونا چاہیئے۔

---

[1] سرزمین مدین میں اسی قسم کا واقعہ حضرت موسیٰ کے ساتھ پیش آیا تھا جہاں صاحبِ اقتدار سرداروں کے چرواہے کمزور و ناتواں لڑکیوں کے مویشیوں کو پانی نہیں پینے دیتے تھے۔ (۲۸/۲۲)

حضرت صالحؑ نے کہا کہ یہ بڑی آسان بات ہے لَّهَا شِرْبٌ وَّ لَكُمْ شِرْبُ يَوْمٍ مَّعْلُوْمٍ ۔ (۱۵۵/۲۶، ۹/۱۳)
تم جانوروں کی باریاں مقرر کر دو۔ ہر جانور' بلا تخصیص اس کے کہ وہ کس کا جانور ہے' اپنی اپنی باری پر پانی پی لے ۔
" باریاں مقرر کرنے" کے معنی ہی یہ ہیں کہ یہ کسی کی ملکیت نہیں۔ اس سے فائدہ اٹھانے میں ہر ایک کا اشتراک ہے۔

آپ نے غور فرمایا کہ ارض اللہ کے معنی کیا ہیں؟ یہ کوئی ذہنی تصور یا نظری عقیدہ نہیں۔ یہ قرآن کے معاشی نظام کی عملی بنیاد ہے کہ زمین تمام نوعِ انسان کے لئے ذریعۂ پرورش ہے۔ اس پر کسی کی ذاتی ملکیت نہیں ہو سکتی۔ ارض اللہ پر نظری عقیدہ رکھنا' اور عملاً اسے زید' بکر' عمر' کی ملکیت میں دے دینا' قرآن کی رو سے شرک ہے کفر ہے' تکذیبِ دین ہے۔ اقبالؒ کے الفاظ میں۔

باطنِ اَلْاَرْضُ لِلّٰہِ ظاہر است

ہر کہ ایں ظاہر نہ بیند کافر است

ضمناً' یہ سمجھ لینا ضروری ہے کہ نزولِ قرآن کے وقت چونکہ ابھی صنعتی نظام وجود میں نہیں آیا تھا' اس لئے اس نے اَرض کے متعلق ہی احکامات وضاحت سے دیئے ہیں لیکن ان احکام کی روشنی میں صنعتی تنظیمات کے متعلق بھی یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ ان پر بھی کسی کی ذاتی ملکیت نہیں رہ سکتی۔ وہ بھی مملکت کی تحویل میں رہے گی۔

اس مقام پر اتنا معلوم کر لینا خالی از دلچسپی نہیں ہوگا کہ اگرچہ وہ دور صنعتی نہیں تھا' بایں ہمہ' حضور نبی اکرمؐ کے ارشاداتِ گرامی میں بعض ایسی ہدایات ملتی ہیں کہ جن سے آجر و متاجر (مالک اور مزدور) کے تعلقات پر نہایت عمدہ روشنی پڑتی ہے۔ ایک حدیث میں ہے کہ حضورؐ نے فرمایا۔

> مزدور کو اس کی محنت کے ماحصل میں سے بھی حصہ دو کیونکہ "خدا کے عامل" کو محروم و نامراد نہیں رہنا چاہیئے۔ (مسند احمد)

مزدوروں کا اندازِ زیست کیا ہونا چاہیئے' اس کا اندازہ بخاری کی ایک روایت سے لگایا جا سکتا ہے جس میں حضورؐ نے فرمایا ہے کہ

مزدور اور مالک کے تعلقات

> وہ (مزدور) تمہارے بھائی ہیں جنہیں خدا نے تمہارے ماتحت کیا ہے۔ پس جس کے ماتحت خدا نے اس کے کسی بھائی کو کیا ہے' اسے چاہیئے کہ وہ جو خود کھائے وہی اس کو بھی کھلائے' جو خود پہنے

وہی اس کو بھی پہنائے اور جو کام اس کی طاقت سے باہر ہو' اسے اس کے سپرد نہ کرے اور اگر ایسا کرنا ناگزیر ہو تو پھر اس کی سرانجام دہی میں اس کی مدد کرے۔

ان ارشاداتِ گرامی سے یہ راہ نمائی ملتی ہے کہ مزدور کو اُجرت ہی نہیں ملنی چاہیئے بلکہ منافع میں بھی اس کا حصّہ ہونا چاہیئے' اور اجرت مقرّر کرنے کا معیار یہ ہونا چاہیئے کہ اس سے وہ ویسا ہی کھا پہن سکے' جیسا کارخانے کا مالک کھاتا' پہنتا ہے۔

استبداد نہیں

یہاں پر ایک اہم سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جب پیداوار کے تمام وسائل افراد کے بجائے' مملکت کی تحویل میں چلے جائیں اور کسی کے پاس ضرورت سے زاید روپیہ بھی نہ رہے، وہ بھی مملکت کی ملکیّت قرار پاجائے تو اس سے مملکت ایسی مستبد اور جابر بن جائے گی کہ وہ جب جی چاہے افراد کا گلا گھونٹ دے۔ اس سے بدتر مستبد نظام کوئی اور ہو نہیں سکتا۔

بیشک عام مملکتوں میں ایسا ہی ہوگا لیکن (جیسا کہ ہم دیکھ چکے ہیں) اسلامی مملکت اسی لئے وجود میں آتی ہے کہ وہ افراد کی نہ صرف طبیعی پرورش کا انتظام کرے بلکہ ان کی ذات (انفرادیت) کی نشوونما کے لئے بھی اسباب و ذرائع بہم پہنچائے۔ اس مملکت کی تحویل میں جو کچھ جاتا ہے وہ اس مقصد کے حصول کا ذریعہ ہوتا ہے۔ اگر وہ مملکت اپنے اس فریضہ کی ادائیگی میں قاصر رہتی ہے تو اُسے کوئی حق حاصل نہیں ہوتا کہ وہ ذرائع پیداوار یا افراد کی فاضلہ دولت کو اپنے قبضے میں لے لے۔ ان چیزوں کو اپنے قبضے میں لے لینا تو ایک طرف' اس کا حقِ حکومت ہی باقی نہیں رہتا۔ اسلامی مملکت تو وجود ہی میں اس لئے آتی ہے کہ وہ "اقامتِ صلوٰۃ اور ایتائے زکوٰۃ" کا فریضہ ادا کرے۔ اس لئے یہ مملکت ذریعہ ہوتی ہے افراد کی نشوونما کا' نہ کہ ان کے گلا گھونٹنے کا۔ جن افراد کے ہاتھوں میں اس مملکت کا نظم و نسق ہوتا ہے' ان کی سیرت و کردار کی جھلک اس کتاب میں نظر آجاتی ہے۔ کیا ان کے متعلق تصوّر بھی کیا جاسکتا ہے کہ وہ ذرائع رزق کو اپنی تحویل میں لے کر افرادِ انسانیہ کی آزادی سلب کریں گے؟

"ایتائے زکوٰۃ" کی بات پھر سامنے آگئی تو ہم نے ضروری سمجھا ہے کہ زکوٰۃ کے متعلق جو کچھ پہلے لکھا جاچکا ہے' اس کی مزید وضاحت کردی جائے۔ یہ اس لئے بھی ضروری ہے کہ زکوٰۃ کے متعلق ہمارا مروّجہ تصوّر (اور فقہی احکام) قرآنی تصوّر سے اس قدر مختلف ہیں کہ جب تک قرآنی تصوّر نہایت وضاحت سے سامنے نہ آئے' مروّجہ تصوّر کا غیر قرآنی ہونا سمجھ میں نہیں آسکتا۔ جیسا کہ پہلے بھی بتایا جاچکا ہے، قرآنِ کریم

میں یہ کہیں نہیں آیا کہ اتنا مال سال بھر تک جمع رہے تو اس میں سے اتنی رقم بطورِ زکوٰۃ ادا کر دی جائے۔ زکوٰۃ

زکوٰۃ کا قرآنی مفہوم

کا یہ قرآنی مفہوم ہے ہی نہیں۔ لفظ الزکوٰۃ کے بنیادی معنی ہیں نشوونما، بالیدگی بڑھنا، پھولنا پھلنا۔ قرآنِ کریم میں "اقیموا الصلوٰۃ و آتوا الزکوٰۃ" کا حکم متعدد بار آیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ "اقامتِ صلوٰۃ" اور "ایتائے زکوٰۃ" قرآنی نظام کے دو بنیادی ستون ہیں۔ ہم پہلے بتا چکے ہیں کہ اسلامی مملکت کا فریضہ ہے کہ وہ افرادِ معاشرہ کو سامانِ نشوونما بہم پہنچائے ــــ یعنی وہ سامان جس سے افرادِ معاشرہ کی طبیعی نشوونما بھی ہو جائے اور انسانی ذات کی صلاحیتوں کی نشوونما بھی۔ اسی کو ایتائے زکوٰۃ کہتے ہیں، یعنی سامانِ نشوونما کا بہم پہنچانا۔ قرآنِ کریم نے واضح الفاظ میں بتایا ہے کہ ایتائے زکوٰۃ (زکوٰۃ دینا) اسلامی مملکت کا فریضہ ہے۔ سورۂ حج میں ہے۔

اَلَّذِیْنَ اِنْ مَّکَّنّٰھُمْ فِی الْاَرْضِ اَقَامُوا الصَّلٰوۃَ وَ اٰتَوُا الزَّکٰوۃَ (۲۲/۴۱)

یہ (مومنین) وہ لوگ ہیں کہ جب ان کی حکومت قائم ہو گی تو یہ اقامتِ صلوٰۃ کریں گے اور زکوٰۃ دیں گے۔

دوسری جگہ ہے۔ وَالَّذِیْنَ ھُمْ لِلزَّکٰوۃِ فٰعِلُوْنَ۔ (۲۳/۴) یعنی یہ لوگ زکوٰۃ (افرادِ معاشرہ کو سامانِ نشوونما مہیا کرنے کے لئے) مصروفِ کار رہتے ہیں۔ آپ نے غور فرمایا کہ اسلامی مملکت کا فریضہ "ایتائے زکوٰۃ" (زکوٰۃ دینا) ہے۔ یعنی نوعِ انسان (یا بطورِ آغازِ کار، افرادِ معاشرہ) کو سامانِ نشوونما مہیا کرنا۔

یہ بھی ظاہر ہے کہ اسلامی حکومت 'ایتائے زکوٰۃ (سامان نشوونما مہیا کرنے) کا فریضہ اپنی آمدنی ہی سے ادا کرے گی۔ بالفاظِ دیگر، حکومت کی آمدنی (REVENUE OF THE STATE) ذریعہ ہو گی اس مقصد کے پورا کرنے کا۔ اس اعتبار سے، حکومت کی جملہ آمدنی کو 'اصطلاحی طور پر زکوٰۃ کہا جا سکے گا۔ یعنی ذریعہ کو خود مقصد کہہ کر پکارا جائے گا۔ اس میں بھی ایک دقیق اور لطیف نکتہ پنہاں ہے۔ یعنی جب حکومت کی آمدنی کو زکوٰۃ کہا جائے گا تو اس سے یہ حقیقت سامنے آ جائے گی کہ اس آمدنی کی غرض و غایت کیا ہے۔ حضرت صدیقِ اکبرؓ کے زمانے میں جن قبائل نے بغاوت اختیار کی تھی ان کا جرم یہ تھا کہ وہ حکومت کو "زکوٰۃ" ادا نہیں کرنا چاہتے تھے۔ یعنی وہ مرکزی حکومت کے واجبات ادا کرنے سے انکار کرتے تھے اور اس کا مطالبہ کرنے پر سرکشی پر اتر آتے تھے۔ یہ یقیناً حکومت کے خلاف بغاوت تھی۔

یہ تھا زکوٰۃ کا قرآنی مفہوم۔ آپ نے دیکھا کہ اس میں، مال و دولت جمع کر کے، سال کے بعد اس میں سے کچھ رقم بطور خیرات دے دینے کا تصور قطعاً نہیں تھا۔ صدرِ اوّل کے بعد جب مسلمانوں کی گاڑی دوسری پٹڑی پر جا پڑی، تو قرآن کے معاشی نظام کی جگہ (جو نظامِ سرمایہ داری کی جڑ کاٹنے کے لئے آیا تھا) پھر سے نظامِ سرمایہ داری قائم ہو گیا۔ لیکن مشکل یہ تھی کہ قرآنِ کریم کی وہ آیات جن میں مال و دولت جمع کرنے کی سخت ممانعت کی گئی ہے، اس کے راستے میں حائل ہوتی تھیں۔ اس رکاوٹ کو دُور کرنے کے لئے وضعی روایات کا سہارا تراشا گیا اور (حیرت اندر حیرت کہ) اس کے لئے سب سے اہم کردار ادا کرنے کے لئے حضرت عمرؓ کو چنا گیا ــــ یعنی اُس عمرؓ کو جس کی زندگی سرمایہ داری کے خلاف مجسّمہ انقلاب تھی)۔ آپ سورۂ توبہ کی ان آیات (۳۵-۹/۳۴) کو پہلے دیکھ چکے ہیں، جن میں کہا گیا ہے کہ مال و دولت کو جہنّم کی آگ میں تپایا جائے گا اور اس سے سرمایہ داروں کو داغ دیا جائے گا۔ اس آیت کی تفسیر کے سلسلہ میں ذیل کی روایت (مشکوٰۃ، کتاب الزکوٰۃ میں) درج ہے۔

ایک وضعی روایت

> (حضرت) ابن عباسؓ کہتے ہیں کہ جس وقت یہ آیت نازل ہوئی اَلَّذِیْنَ یَکْنِزُوْنَ الذَّھَبَ وَالْفِضَّۃَ ...... الخ (۳۵-۹/۳۴) تو مسلمانوں پر اس کا خاص اثر ہوا۔ یعنی انہوں نے اس حکم کو گراں خیال کیا۔ حضرت عمرؓ نے لوگوں سے کہا کہ میں تمہاری فکر کو دور کر دوں گا اور اس مشکل کو حل کروں گا۔ پس عمرؓ، رسولُ اللہ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا۔ یا نبیُّ اللہ! یہ آیت آپ کے صحابہؓ پر گراں گزری ہے۔ آپؐ نے فرمایا کہ خداوند تعالیٰ نے زکوٰۃ اس لئے فرض کی ہے کہ وہ تمہارے باقی مال کو پاک کر دے ..... (حضرت) ابن عباسؓ کہتے ہیں کہ حضورؐ کا یہ بیان سُن کر (حضرت) عمرؓ نے جوشِ مسرت سے اللہ اکبر کہا۔

آپ نے غور فرمایا کہ قرآن کے حکم کو (عملاً) منسوخ قرار دینے اور نظامِ سرمایہ داری کو پھر سے رائج کرنے کے لئے، ہمارے دورِ ملوکیت میں کیا کیا حیلے وضع اور اختیار کئے گئے تھے! آپ سوچئے کہ خدا کی طرف سے ایک واضح حکم نازل ہوتا ہے اور وہ صحابہ کبارؓ پر (معاذ اللہ) گراں گزرتا ہے! حضرت عمرؓ ان کی نمائندگی کرتے ہوئے (اس مشکل کے حل کی تلاش میں) رسولُ اللہ کے پاس جاتے ہیں اور حضورؐ فرما دیتے ہیں کہ تم لوگ خواہ مخواہ پریشان ہو گئے۔ جتنا جی چاہے مال و دولت جمع کرو۔ بس اس میں سے سال کے بعد اڑھائی روپے سینکڑہ کے حساب سے خدا کی راہ میں دے دیا کرو۔ باقی سارا مال حلال و طیّب ہو جائیگا اور حضرت عمرؓ

اس حل کو سن کر نعرۂ تکبیر بلند کرتے ہیں! (معاذ اللہ۔ ثم معاذ اللہ)

یہ ہے زکوٰۃ کا مروجہ مفہوم اور اس کی عملی شکل کے آغاز کی داستان! قرآنِ کریم کی آیات آپ کے سامنے آچکی ہیں۔ ان کی روشنی میں یہ حقیقت روزِ روشن کی طرح واضح ہو جاتی ہے کہ قرآن کے معاشی نظام کی رُو سے، زاید از ضرورت روپیہ کسی کے پاس رہتا ہی نہیں۔ وہ سب حکومت کی تحویل میں آجاتا ہے۔ یوں جماعتِ مومنین، اپنے اس معاہدہ کو عملاً پورا کرتی ہے جو اس نے اپنے اللہ سے استوار کیا تھا اور جس کی رُو سے "انہوں نے اپنی جان اور مال خدا کے ہاتھ فروخت کر دیا تھا۔" اور اس کے عوض انہیں جنّت کی زندگی عطا ہو گئی تھی۔

یہ ہیں قرآنِ کریم کے احکام و اصول معاشی نظام کے متعلق۔ حضور نبی اکرمؐ نے سب سے پہلے اسلامی مملکت قائم فرمائی اور اس میں اس معاشی نظام کی بھی بنیاد رکھی۔ اس کے لئے حضورؐ کو چونکہ بہت کم وقت ملا، اس لئے عہدِ رسالت مآبؐ میں یہ فی الجملہ اپنی ابتدائی منزل میں ہی رہا۔ لیکن یہ ایک عظیم حقیقت ہے کہ عام مسلمانوں پر تو اس نظام کی منزلِ اوّل سے متعلق احکام کا اطلاق ہوتا تھا لیکن خود نبی اکرمؐ کی حیاتِ

حضورؐ کی اپنی زندگی

طیبہ اس کے اُس انتہائی دور کی آئینہ دار تھی جس میں زاید از ضرورت کسی کے پاس کچھ نہیں رہتا۔ اس نظام کا آغاز حضورؐ کی مکی زندگی سے ہو گیا تھا جب اسلامی مملکت کا قیام تو ایک طرف، (مسلمانوں کی مختصر سی) جماعت کی زندگی بڑی عُسرت اور مفلوک الحالی میں گزر رہی تھی۔ اس زمانے میں حضورؐ نے جماعت کے لئے کیا طریقِ کار اختیار فرمایا تھا، اس کا اندازہ حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ کی اس روایت سے لگ سکتا ہے جس میں انہوں نے کہا ہے کہ:

> اشعر قبیلہ والوں کے ہاں یہ دستور تھا کہ جب کسی جنگ میں ان کے ہاں کھانا تھوڑا رہ جاتا یا ان کے ہاں (کسی حادثہ کی وجہ سے) فاقوں کی نوبت آجاتی تو یہ لوگ اپنے کھانے کی چیزوں کو ایک جگہ جمع کر لیتے اور ایک برتن میں برابر حصے لگا کر آپس میں تقسیم کر لیتے۔
>
> حضورؐ نے فرمایا کہ یہ لوگ مجھ سے ہیں اور میں ان میں سے ہوں۔ (صحیحین)

مدینہ پہنچنے کے بعد اسلامی مملکت کی بنیاد رکھی گئی۔ حضورؐ کی وفات کے وقت اس کی وسعت قریب دس لاکھ مربع میل پر پھیل چکی تھی لیکن اس سربراہِ مملکت (علیہ التحیۃ والسلام) کی اپنی زندگی کا یہ عالم

تھا کہ (حضرت عائشہؓ کی روایت کے مطابق):-

حضورؐ کا کوئی کپڑا تہ کر کے نہیں رکھا گیا۔ صرف ایک جوڑا ہوتا تھا، دوسرا نہیں ہوتا تھا جسے تہ کر کے رکھا جاتا۔ جن کپڑوں میں آپؐ نے وفات پائی، ان میں اوپر تلے پیوند لگے ہوئے تھے۔

ایک اور روایت میں ہے کہ:-

مرض الموت کے وقت حضورؐ کے ہاں چند دینار کہیں سے آئے تھے۔ حضورؐ نے فرمایا کہ انہیں صدقہ کر دو، (یعنی بیت المال میں بھیج دو تاکہ ان سے حاجتمندوں کی ضروریات پوری ہوں) لیکن اس کے بعد حضورؐ پر غشی طاری ہو گئی اور سب لوگ آپؐ کی تیمارداری میں مصروف ہو گئے۔ آپؐ کو ہوش آیا تو فرمایا، وہ دینار لاؤ۔ دینار کو حضورؐ نے اپنے ہاتھ پر رکھا اور کہا ــــ محمدؐ کا اپنے رب کے متعلق کیا گمان ہو گا جب وہ اپنے رب سے ملے اور اس کے پاس یہ دینار ہوں۔ اس پر حضورؐ نے انہیں خود صدقہ کر دیا۔ (یعنی بیت المال میں بھیج دیا)[1]

جہاں تک حضورؐ کے ترکہ کا تعلق ہے، بخاری میں یہ حدیث موجود ہے کہ حضورؐ نے فرما دیا تھا کہ

میرے ورثہ میں ایک دینار بھی بطورِ ترکہ تقسیم نہیں ہوگا۔ میری بیویوں کی ضروریات اور منتظم کے اخراجات کے بعد جو کچھ بھی بچے وہ صدقہ ہو گا۔

مسلم کی ایک روایت میں ہے کہ حضرت عائشہؓ نے فرمایا کہ

آنحضرتؐ نے نہ درہم چھوڑا، نہ دینار، نہ بکری نہ اونٹ اور نہ کسی چیز کی وصیت کی۔

اور بخاری میں ہے کہ حضورؐ نے اپنے خچر اور ہتھیاروں کے سوا کچھ نہیں چھوڑا تھا۔

یہ اس لئے کہ اگرچہ مملکت ایسی وسیع و عریض تھی لیکن اس کے ساتھ، رعایا جس قدر فلاکت زدہ تھی اور ان کی ضروریاتِ زندگی پوری کرنے کی جو عظیم ذمہ داری حضورؐ نے اپنے اوپر لے رکھی تھی، اس کی وجہ سے حضورؐ اپنا معیارِ زندگی اس سے بلند کر ہی نہیں سکتے تھے۔

معاشی ذمہ داریاں

سربراہِ مملکت کی ذمہ داریوں کا اندازہ حضورؐ کے ان ارشاداتِ گرامی سے لگایا جا سکتا ہے جو کتبِ تاریخ و احادیث میں ہمارے سامنے آتے

[1] اس قسم کی ایک روایت پانچویں باب میں بھی گزر چکی ہے۔ جس سے واضح ہے کہ حضورؐ کو یہ خیال اپنی حیات کے آخری لمحات ہی میں نہیں آیا تھا بلکہ حضورؐ کا زندگی بھر یہی مسلک رہا تھا کہ زائد از ضرورت مال گھر میں نہ رہے، بیت المال میں چلا جائے۔

ہیں. مسند امام احمد میں ہے کہ حضورؐ نے فرمایا کہ

جس بستی میں کسی شخص نے اس حال میں صبح کی کہ وہ رات بھر بھوکا رہا، اس بستی سے خدا کی نگرانی اور حفاظت کا ذمہ ختم ہو گیا۔

اسلامی حکومت کا فریضہ ہے کہ وہ کسی کو محسوس نہ ہونے دے کہ وہ تنہا یا لاوارث (یتیم) ہے. اسی لئے حضورؐ نے فرمایا کہ

جس کا کوئی سرپرست نہ ہو اس کا سرپرست "اللہ اور اس کا رسولؐ" (یعنی اسلامی نظام حکومت) ہے۔ (ترمذی)

حتیٰ کہ اگر کوئی شخص ایسی حالت میں مر جائے کہ اس پر کسی کا قرض ہو اور وہ تنگدستی کی وجہ سے اسے ادا نہ کر سکا ہو تو اس کے قرض کی ادائیگی بھی مملکت کے ذمہ ہوگی۔ چنانچہ حضورؐ نے اعلان فرما دیا تھا کہ

میں مسلمانوں سے، ان کے اپنے افرادِ خاندان کی نسبت زیادہ قریب ہوں. سو ان میں سے جو وفات پا جائے اس کے قرض کی ادائیگی میرے ذمے ہے۔ (ابو عبید۔ کتاب الاموال)

دیگر روایات (مسلم۔ ترمذی وغیرہ) میں ہے کہ ایسے شخص کے قرض کی ادائیگی تو حکومت کے ذمے ہوگی لیکن جو کچھ وہ بطور ترکہ چھوڑ جائے وہ اس کے ورثاء کا حق ہوگا. اسی سلسلہ میں حضورؐ نے فرمایا تھا کہ

جس شخص کو اللہ تعالیٰ مسلمانوں کے بعض امور کا نگران بنا دے اور وہ لوگوں کی ضروریات کی طرف سے لاپرواہی برتے تو اللہ تعالیٰ اس کی ضروریات اور احتیاجات کی طرف سے لاپرواہی برتے گا۔ (ابو داؤد)

یہی روایت ترمذی میں ان الفاظ میں آئی ہے کہ حضورؐ نے فرمایا:۔

جو امام، ضرورت مندوں، محتاجوں اور مسکینوں پر اپنے دروازے بند کر لیتا ہے اللہ تعالیٰ اس کی ضروریات اور احتیاجات کے لئے آسمان کے دروازے بند کر دیتا ہے۔

زاید از ضرورت

ہم پہلے لکھ چکے ہیں کہ قرآن کے معاشی نظام کی رُو سے، کوئی شخص اپنی ضروریات سے زاید مال اپنے پاس رکھ نہیں سکتا۔ حضورؐ کے زمانے میں اس انتہائی اصول پر کس انداز سے عمل ہوتا تھا، اس کا اندازہ مسلم کی اس روایت سے لگ سکتا ہے جس میں حضرت ابو سعیدؓ نے فرمایا کہ:۔

ہم لوگ رسول اللہؐ کے ساتھ سفر میں تھے. ایک شخص آیا اور دائیں بائیں دیکھنے لگا۔ آپ نے فرمایا:

کہ جس شخص کے پاس ضرورت سے زاید سواری ہو وہ اُس آدمی کو دے دے جسے اُس کی ضرورت ہو۔ جس کے پاس زاید زادِ راہ ہو وہ اُسے دے دے جس کے پاس زادِ راہ نہ ہو۔ اس طرح آپؐ نے بہت سی چیزوں کا ذکر فرمادیا۔ حتیٰ کہ ہم نے سمجھ لیا کہ ہم میں سے کسی کو بھی ضرورت سے زاید کسی چیز کے رکھنے کا حق حاصل نہیں۔

حضرت بلالؓ سے مروی ہے کہ:۔

رسولؐ اللہ نے فرمایا کہ جو رزق تجھے عطا کیا گیا ہے اسے چھپا کر نہ رکھ، اور جو کچھ تجھ سے مانگا جائے اس میں بخل سے کام نہ لے۔ میں نے کہا۔ اے اللہ کے رسولؐ، یہ کیسے ہو سکے گا؟ آپؐ نے فرمایا کہ یا یہ روش اختیار کرنی ہوگی یا جہنّم کا ایندھن بننا پڑے گا۔ (حاکم)

مسلم میں حضرت ابوہریرہؓ سے مروی ہے کہ:۔

رسولؐ اللہ نے فرمایا کہ بندہ میرا مال، میرا مال کہتا ہے۔ حالانکہ مال میں اس کا حصّہ تین چیزیں ہوتی ہیں۔ (۱) جو کچھ وہ کھا کر ہضم کر لیتا ہے۔ (۲) جسے وہ پہن کر پرانا کر دیتا ہے اور (۳) جو کچھ وہ دوسروں کے لئے دے کر اپنے لئے ذخیرۂ آخرت کر لیتا ہے۔ ان تین چیزوں کے علاوہ جو کچھ بھی ہوتا ہے وہ یا تو چلا جاتا ہے یا وہ دوسروں کے لئے چھوڑ کر مر جاتا ہے۔

یہ ہیں معاشی نظام کے متعلق وہ چیدہ چیدہ اقوال و اعمالِ نبویؐ جو ہمیں کتبِ روایات میں ملتے ہیں۔ جیسا کہ ہم نے پہلے لکھا ہے، حضورؐ، قرآن کے معاشی نظام کی (کہ جسے نظامِ ربوبیّت کہا جاتا ہے) صرف ابتدا کر سکے تھے لیکن حضورؐ کی سیرتِ طیّبہ میں، اس ابتدا میں بھی اس انتہا کی جھلک نظر آجاتی ہے۔ حضورؐ نے ضرورتمندوں کے لئے وظائف مقرر کرنے کا بھی سلسلہ شروع کر دیا تھا جسے حضرت صدیق اکبرؓ نے اپنے زمانے میں مزید ترقی دی تھی۔ (اس کی تفصیل حضرت عمرؓ کے زمانے کے معاشی نظام میں بیان کی جائے گی۔) حضورؐ مختلف قبائل میں اپنے عمّال بھیجتے کہ وہ وہاں کے ضرورتمند لوگوں کی فہرستیں مرتب کر کے مرکز میں بھیجیں۔ مرکز سے ان کی مناسب امداد کی جاتی۔ نیز آپؐ نے زرعی اصلاحات کا بھی آغاز فرما دیا تھا (اس کی تفصیل بھی عہدِ فاروقی کے نظام کے ضمن میں سامنے لائی جائے گی۔)

(۰)

رسولؐ اللہ کے بعد خلافت کا بارِ امانت حضرت صدیق اکبرؓ نے اٹھایا۔ ایک تو ان کا عہدِ خلافت

بڑا مختصر تھا اور دوسرے ان کا بیشتر وقت، اندرونی اور بیرونی سازشیں فرو کرنے میں صرف ہو گیا۔ اس لئے انہیں بھی معاشی نظام کو اس کے انتہا تک پہنچانے کا موقعہ نہ ملا۔ لیکن اس کے باوجود انہوں نے افرادِ مملکت کی ضروریاتِ زندگی کو وظائف کی صورت میں پورا کرنے کے لئے بڑے اہم اقدامات کئے (ان کی تفصیل آگے چل کر سامنے آئے گی)۔ جہاں تک ان کی اپنی ذات کا تعلق ہے، وہ اسوۂ رسول اللہ کی جگمگاتی تصویر تھے۔ خلافت سے پہلے، آپ تجارت کرتے تھے اور اچھے خوشحال تھے۔ خلافت کی ذمہ داریوں نے آپ کا سارا وقت لے لیا، تو آپؓ نے حضرت عمرؓ کی تجویز اور دیگر صحابہؓ کے مشورہ سے، بیت المال سے وظیفہ لینا قبول کر لیا لیکن وہ اتنا ہی تھا جس میں آپ کا اور آپ کے اہل و عیال کا غریبانہ انداز سے گزارہ ہو سکے۔ جب آپ کی وفات کا وقت قریب آیا تو آپ کو یہ خیال بار بار ستا رہا تھا کہ معلوم نہیں میں نے مسلمانوں کے بیت المال سے جس قدر لیا ہے اس کے مطابق ان کی خدمت بھی کر سکا ہوں یا نہیں۔ اس اضطراب کو مبدل بہ سکون کرنے کے لئے انہوں نے اپنے رشتہ داروں سے کہا کہ ایک مختصر سا قطعۂ زمین ان کے پاس ہے، اسے فروخت کر دیا جائے اور جس قدر رقم انہوں نے بیت المال سے لی ہے، اُسے واپس کر دیا جائے۔ چنانچہ ایسا ہی کیا گیا اور وہ اس حساب کو یہیں بیباق کر کے خدا کے سامنے گئے۔

سیرتِ صدیقیؓ

(۵)

مجھے اپنے "یادداشتوں کے کاغذات" میں دو واقعات ایسے ملے ہیں جن سے سیرتِ صدیقیؓ مہر تابندہ کی طرح جگمگاتی ہوئی سامنے آجاتی ہے۔ لیکن مجھے افسوس ہے کہ) میں ان کے حوالے لکھنا بھول گیا۔ اس لئے میں انہیں درجِ کتاب کرنے میں متأمل تھا لیکن چونکہ حضرت صدیق اکبرؓ کی حیاتِ طیبہ کے دیگر کوائف و احوال پر نگاہ ڈالنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ روایات صحیح ہوں گی، اس لئے میں انہیں قارئین کی خدمت میں پیش کرنے کی جرأت کر رہا ہوں، بایں اُمید کہ اگر ان میں سے کسی صاحب نے انہیں کتبِ تاریخ و سیر میں دیکھا ہو تو مجھے ان کے حوالے سے مطلع فرما دیں۔

پہلا واقعہ یہ ہے کہ جب یہ سوال زیر غور تھا کہ خلیفۃ المسلمین کا وظیفہ کیا ہونا چاہیئے تو حضرت صدیقؓ نے دریافت فرمایا کہ مدینہ میں ایک مزدور کی کم سے کم روزانہ اُجرت کیا ہے، وہی اجرت آپ نے اپنے لئے بطور وظیفہ مقرر کر لی۔ رفقاء میں سے کسی نے

وظیفہ کا تعیّن

آپ سے کہا کہ اتنے کم روزینے میں آپ کا گزارا کیسے ہوگا؟ تو آپؓ نے جواب میں فرمایا کہ اس میں میرا گزارا اسی طرح ہوگا جس طرح اس مزدور کا گزارا ہوتا ہے اور اگر گزار نہ ہوا تو میں اس مزدور کی اُجرت بڑھا دوں گا تاکہ اس طرح میرا وظیفہ بھی بڑھ جائے۔ جوں جوں مزدوروں کی اُجرت بڑھتی جائے گی، میرا معیارِ زندگی اُسی نسبت سے بلند ہوتا جائے گا۔

(۲) دوسرا واقعہ یہ ہے کہ ایک دن کھانے کے بعد آپؓ نے بیوی سے کہا کہ کوئی میٹھی چیز نہیں؟... ..... انہوں نے کہا کہ بیت المال سے جو راشن آتا ہے، اس میں میٹھی چیز کوئی نہیں ہوتی۔

زاید از ضرورت

بات آئی گئی ہو گئی۔ چند دنوں کے بعد آپ نے دیکھا کہ کھانے میں حلوہ بھی ہے۔ آپ نے بیوی سے کہا کہ تم نے تو کہا تھا کہ ہمارے راشن میں میٹھی چیز آتی نہیں تو آج یہ حلوہ کیسے پک گیا؟ انہوں نے کہا کہ میں نے جو اس دن محسوس کیا کہ آپ میٹھی چیز پسند کرتے ہیں تو میں نے یوں کیا کہ راشن میں جتنا آٹا ہر روز آتا تھا، اس میں سے مُٹھی بھر آٹا الگ رکھتی گئی۔ آج اتنا آٹا جمع ہو گیا کہ اس کے بدلے میں بازار سے کھجور کا شیرہ منگا لیا جائے۔ اس طرح یہ حلوہ پک گیا ہے۔ آپ نے اسے تناول فرمایا اور بیوی کا شکریہ ادا کیا۔

کھانے کے بعد سیدھے بیت المال کے مودی کے پاس پہنچے اور کہا کہ ہمارے ہاں راشن میں جس قدر آٹا جاتا ہے، آج سے اس میں ایک مُٹھی کے برابر کم کر دینا، کیونکہ ہفتہ بھر کے تجربہ نے بتایا ہے کہ ہمارا گذارا مُٹھی بھر کم آٹے میں بھی ہو جاتا ہے۔

یہ ہے عملی تفسیر قرآنِ کریم کے اس اصول کی جس میں کہا گیا ہے کہ یَسْئَلُوْنَکَ مَاذَا یُنْفِقُوْنَ۔ اے رسولؐ! یہ تجھ سے پوچھتے ہیں کہ ہم دوسروں کی ضرورت کے لئے کس قدر دے دیں؛ قُلِ الْعَفْوَ۔ (۲/۲۱۹) ان سے کہو کہ جس قدر تمہاری اپنی ضرورت سے زاید ہے، وہ سب۔ لہٰذا اگر ایک مُٹھی بھر آٹا بھی اپنی ضرورت سے زاید ہے تو ایک مردِ مومن اسے بھی اپنے صرف میں نہیں لائے گا۔ اسے دوسروں کی ضرورت پورا کرنے کے لئے دے دے گا۔

ایسے ہوتے ہیں وہ حضرات جن کے ہاتھوں اسلامی مملکت کا قیام عمل میں آتا ہے۔ طوبیٰ لھم وحسن مآب۔

عہدِ فاروقیؓ

قبل اس کے کہ ہم اس گوشے کی طرف آئیں کہ حضرت عمرؓ نے اسلامی حکومت کے بنیادی فریضہ (ایتائے زکوٰۃ یا ربوبیتِ عالمینی) کو کس انداز سے پورا کیا تھا اور اس کے لئے کیا کیا عملی اقدامات کئے تھے ضروری معلوم ہوتا ہے کہ یہ بتایا جائے کہ انہیں اس فریضہ کا احساس کس قدر شدت سے تھا اور انہوں نے (باتباعِ سنّتِ رسول اللہ) خود اپنی زندگی کو کس طرح قرآن کے معاشی نظام کی آخری منزل میں رکھا تھا۔

ہم دیکھ چکے ہیں کہ قرآنِ کریم میں ہے کہ

(۱) ہر ذی حیات کے رزق کی ذمہ داری خدا نے اپنے اوپر لے رکھی ہے۔ لیکن

(۲) وہ اپنی اس ذمہ داری کو براہِ راست پورا نہیں کرتا۔ اسے اسلامی مملکت پورا کرتی ہے۔

(جیسا کہ پہلے بھی لکھا جا چکا ہے) اس اصول کی تشریح کرتے ہوئے حضرت عمرؓ فرمایا کرتے تھے کہ:

رزق کی جستجو کرو

تم میں سے کوئی شخص، رزق کی طلب و جستجو سے باز نہ رہے اور یہ نہ کہتا رہے کہ اے اللہ! مجھے رزق دے۔ یاد رکھو آسمان سے ھُن نہیں برسا کرتا۔ اللہ ایک انسان کو دوسرے انسان کے ہاتھوں رزق پہنچاتا ہے۔

غور فرمائیے، قرآنی غوامض پر آپ کی نگاہ کسقدر عمیق تھی۔

یہ جو آپ نے کہا ہے کہ "اللہ تعالیٰ ایک انسان کو دوسرے انسان کے ہاتھوں رزق پہنچاتا ہے"، اس سے ہمیں (مسلم میں درج شدہ) ایک حدیثِ قدسی یاد آ گئی۔ ہمارے ہاں عام طور پر حقوق کو دو شقوں میں تقسیم کیا جاتا ہے۔ یعنی حقوق اللہ اور حقوق العباد۔ لیکن قرآن میں "حقوق اللہ" کا ذکر (سوائے ایک مقام کے) کہیں نہیں ملتا۔ ہر جگہ حقوق العباد (یعنی ایک انسان کے ذمے دوسرے انسانوں کے حقوق) ہی کی تاکید ملتی ہے۔ وہ ایک مقام جہاں "اللہ کے حق" کا ذکر آیا ہے، سورۃ انعام کی آیت ۱۴۲ ہے۔ جہاں پہلے یہ کہا

حقوق اللہ

گیا ہے کہ کھیتوں کی فصلیں اور باغات کے پھل سب عطیاتِ خداوندی ہیں۔ انہیں بطیب خاطر کھاؤ پیو۔ وَاٰتُوْا حَقَّهٗ يَوْمَ حَصَادِهٖ (۶/۱۴۲)۔ لیکن

فصل کاٹتے وقت، اس میں سے "خدا کا حق" بھی دے دیا کرو، اس "حق" کے متعلق دوسری جگہ فرمایا کہ یہ مَتَاعًا لِّلْمُقْوِیْنَ۔ (۵۶/۶۳-۷۳) یعنی "بھوکوں کا حصّہ" ہے یعنی جسے خدا نے اپنا حق کہا ہے، اس کے متعلق بھی وضاحت کر دی کہ وہ درحقیقت ضرورت مندوں اور محتاجوں کا حق ہے۔

آپ نے دیکھا کہ جس ایک مقام پر خدا نے اپنے حق کا ذکر کیا ہے، وہ بھی درحقیقت بندوں ہی کا حق ہے۔ قرآن کریم کے اس پس منظر میں اس حدیث کو دیکھئے جسے عام طور پر حدیثِ قدسی کہا جاتا ہے[1]۔ (روایت کے مطابق) رسول اللہ نے فرمایا:

خداوندِ عزّ وجل قیامت کے دن فرمائے گا۔

"اے ابنِ آدم! میں بیمار پڑا، تو تُو میری عیادت کو نہ آیا۔"

ابنِ آدم جواب دے گا۔ پروردگار! میں تیری عیادت کو کیسے آتا۔ تُو تو رب العالمین ہے۔ اس پر اللہ تعالیٰ فرمائے گا کہ میرا فلاں بندہ بیمار پڑا تو تُو اس کی عیادت کو نہ گیا۔ اگر تُو اس کی عیادت کو گیا ہوتا، تو مجھے اس کے پاس پاتا۔

اللہ تعالیٰ فرمائے گا: "اے ابنِ آدم! میں نے تجھ سے کھانا مانگا تو تُو نے مجھے کھانا بھی نہ کھلایا۔" وہ کہے گا پروردگار! میں تجھے کھانا کیسے کھلاتا، تُو تو خود ہی سارے جہانوں کا پروردگار ہے۔ اللہ تعالیٰ فرمائے گا۔ کیا تجھے یاد نہیں کہ میرے فلاں بندے نے تجھ سے کھانے کو مانگا تو تُو نے اسے کھانا نہیں کھلایا۔ اگر تو نے اسے کھانا کھلا دیا ہوتا تو اسے میرے پاس پا لیتا۔

(اسی طرح اللہ تعالیٰ پیاسے کو پانی پلانے کے متعلق کہے گا۔) (مسلم، بحوالہ العدل الاجتماعیہ، سید قطب)

---

[1] "احادیثِ قدسی" حدیثوں کی ایک خاص قسم ہے جس میں خدا کی طرف سے واحد متکلم کے صیغے میں بات کی جاتی ہے۔ ائمہ جرح و تعدیل کے نزدیک اس قسم کی حدیثیں عام طور پر وضعی ہوتی ہیں لیکن اس کے باوجود انہیں، عام احادیث سے بھی زیادہ "مقدس" سمجھا جاتا ہے۔ ہمارے نزدیک تو یہ تصوّر بنیادی طور پر غلط ہے کہ خدا کا کلام، کتاب اللہ (قرآن مجید) سے باہر بھی کہیں ہو سکتا ہے۔ اسی لئے اس قسم کی روایات کے وضعی ہونے میں کوئی شبہ نہیں ہو سکتا۔ بایں ہمہ، ہم نے اس حدیث کو اس لئے نقل کیا ہے کہ جو لوگ ان احادیث کو صحیح مانتے ہیں، ان پر واضح ہو جائے کہ "حقوق اللہ" درحقیقت حقوق العباد ہی کا دوسرا نام ہے؟ فی سبیل اللہ" کا مفہوم بھی عالمگیر نوعِ انسانی کی منفعت کے امور ہیں۔

یہ ہیں وہ " خدا کے حقوق " جو اسلامی حکومت کی وساطت سے پورے ہوتے ہیں۔

(۲) قرآنِ کریم نے رزق کی تنگی کو خدا کا عذاب قرار دیا ہے۔ سورۂ طٰہٰ میں ہے کہ:

رزق کی تنگی

وَ مَنْ اَعْرَضَ عَنْ ذِكْرِیْ فَاِنَّ لَهٗ مَعِیْشَةً ضَنْكًا وَّ نَحْشُرُهٗ یَوْمَ الْقِیٰمَةِ اَعْمٰى۔ (۲۰/۱۲۴)

جو ہمارے قوانین سے اعراض برتتا ہے ہم اس کی روزی تنگ کر دیتے ہیں اور اسے ہم قیامت کے دن بھی اندھا ہی اٹھائیں گے۔

اور سورۂ نحل میں ہے کہ " خوف اور بھوک خدا کا عذاب ہیں جس میں ان قوموں کو مبتلا کر دیا جاتا ہے، جو کفرانِ نعمت کرتی ہیں۔" (۱۶/۱۱۲)

دوسری طرف قرآنِ کریم میں ہے کہ اگر قوانینِ خداوندی کو فراموش کر دیا جائے تو رزق کی فراوانی بھی قوموں کی تباہی کا موجب بن جاتی ہے۔ (۲۸/۵۸)

حضرت عمرؓ نے افراط و تفریط کے ان دونوں گوشوں کو ایک ہی قول میں اس طرح سمٹا دیا کہ

اے اللہ! میرے لیے رزق کی اتنی افراط بھی نہ ہو جائے کہ میں تجھ سے سرکشی اختیار کروں اور نہ اتنی کمی کر دینا کہ میں تیری راہ کو فراموش کر کے (اور ہی راستے اختیار کرنے لگ جاؤں)

حضرت عمرؓ کا یہی احساس تھا جس کی بنا پر یہ واقعہ بھی ہمارے سامنے آتا ہے کہ جب جلولا کا مالِ غنیمت آیا تو

دولت کی افراط سے اندیشہ

اسے دیکھ کر اہلِ مدینہ کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں۔ لوگ اسے دیکھ کر فرطِ مسرت سے جھوم رہے تھے لیکن حضرت عمرؓ کو دیکھا کہ وہ مسجد کے ایک گوشے میں کھڑے آنسو بہا رہے ہیں۔ حضرت ابنِ عوفؓ نے کہا کہ امیرالمومنین! یہ وقت فخر و مسرت کا ہے یا رونے کا؟ آپ نے فرمایا۔ ابنِ عوف! اس وقت ہم لوگوں کی حالت کچھ اور ہے۔ لیکن میں ڈرتا ہوں کہ ہمارے بعد، ہماری قوم کی حالت بھی ویسی ہی نہ ہو جائے جیسی دولت کی افراط سے اقوامِ سابقہ کی ہو گئی تھی۔ دولت کی فراوانی سے وہ آپس میں ایک دوسرے کی دشمن ہو گئیں اور ان میں حسد کے جذبات ابھر آئے۔ اس کے بعد حضرت عمرؓ نے دونوں ہاتھ اٹھائے اور بحضور رب العزت عرض کیا کہ

الٰہ العالمین! تو میری حفاظت فرما کہ میں کہیں ہلاکت کی طرف نہ چلا جاؤں۔ میں نے قرآن میں (تیری اس بات کو) سن لیا ہوا ہے کہ سَنَسْتَدْرِجُهُمْ مِّنْ حَیْثُ لَا یَعْلَمُوْنَ۔ (۶۸/۴۴)

ہم ایسی قوموں کو اس طرح بتدریج تباہی کی طرف لے جاتے ہیں کہ انہیں اس کا پتہ بھی نہیں چلتا۔

(۳) ہم نے دیکھا ہے کہ اللہ تعالٰے نے فرمایا ہے کہ "ہر ذی حیات (دآبہ) کے رزق کی ذمہ داری خدا پر ہے" (۶/۱۱) یہ ذمہ داری اسلامی حکومت پر کس طرح عائد ہوتی ہے، اسے حضرت عمرؓ نے ایک فقرہ میں اس جامعیت سے بیان کر دیا ہے کہ اس سے زیادہ بلیغ انداز ذہن میں نہیں آسکتا۔ آپ نے فرمایا۔

اگر ایک کُتا بھی بھوک سے مرگیا

لو مات کلب علیٰ شاطی الفرات جوعًا لکان عمر مسئولا عنہ یوم القیمۃ۔ (توفیق الرحمٰن۔ مطبوعہ مصر)

اگر فرات کے کنارے کوئی کتا بھی بھوک سے مرگیا تو قیامت کے دن عمرؓ سے اس کی بھی باز پرس ہوگی۔

شاہ ولی اللہ نے ازالۃ الخفا میں، ایک اور قول نقل کیا ہے جس میں کلب (کتے) کی جگہ جمل (اونٹ) کہا گیا ہے۔ بہرحال، کتا ہو یا اونٹ، خلافت کی ذمہ داری کا اندازہ اس سے لگ سکتا ہے۔ وہ جو روایات میں ہے کہ حضورؐ نے فرمایا کہ ایک شخص کو خدا نے اس لئے اپنے دامانِ رحمت میں جگہ دی کہ اس نے پیاسے کتے کو پانی پلایا تھا اور ایک عورت کو اس لئے داخلِ جہنم کر دیا کہ اس نے ایک بلی کو باندھے رکھا تھا کہ نہ اُسے خود ہی کچھ کھانے پینے کو دیتی تھی اور نہ ہی کھلا چھوڑتی تھی کہ وہ اپنا پیٹ آپ بھر لے، تو یہ، اسی فریضہ خداوندی سے عہدہ برآ ہونے کی تاکید تھی۔

(۴) ایک دفعہ آپ کے خادم (حضرت) اسلمؓ نے کہا کہ بیت المال میں ایک اونٹنی آئی ہے جو اندھی ہے، اُسے کیا کیا جائے۔ آپ نے جب یہ دیکھا کہ اس کا کوئی مصرف نہیں تو فرمایا کہ اُسے ذبح کر لو۔ ذبح کرنے کے بعد آپ نے اس کا گوشت ازواج مطہراتؓ اور صحابہ کبارؓ کے ہاں تحفتہً بھیجدیا۔ گوشت ملنے پر حضرت عباسؓ آئے اور کہا کہ امیر المومنین! آپ ہمارے لئے ہر روز اسی طرح کیا کرتے تو کیا اچھا ہوتا؟ اس پر آپ نے فرمایا۔

محتاج عورتیں

عباسؓ! مدینے میں بہت سی بھوکی عورتیں ہیں۔ جن کا پرسانِ حال کوئی نہیں۔ ان کا بھی تو خیال رکھنا ہے۔

معاشرہ میں عورتیں سب سے زیادہ کس مپرسی کی حالت میں ہوتی ہیں۔ اس لئے، جب حضرت عمرؓ نے یہ کہنا چاہا کہ میں ایسا انتظام کرنا چاہتا ہوں کہ معاشرہ میں کوئی فرد محتاج نہ رہے تو آپ نے اسے ان الفاظ

میں بیان فرمایا کہ:

اگر میں زندہ رہا تو (مدینہ تو ایک طرف) عراق تک کی بیواؤں کو ایسا بنا دوں گا کہ وہ میرے بعد کسی کی محتاج نہ رہیں۔

(۵) کفالتِ عامہ کے سلسلہ میں آپ نے اعلان فرمایا کہ

قلمروِ خلافت میں بلا تخصیصِ مذہب و ملت، ہر تنگدست کی امداد کی جائے۔ ہر مقروض کا قرضہ ادا کیا جائے۔ ہر کمزور، ضعیف اور مظلوم کی اعانت کی جائے۔ ہر ظالم کو ظلم سے روکا جائے۔ ہر ننگے کو کپڑا پہنایا جائے۔

یعنی کوئی ضرورت مند ایسا نہ رہنے پائے جس کی ضرورت حکومت کی طرف سے پوری نہ کی جائے۔

(۶) ہم (سابقہ باب میں) دیکھ چکے ہیں کہ محتاجوں اور ناداروں کے لئے یہ ضروری نہیں تھا کہ وہ اپنی احتیاج کی اطلاع خود خلیفہ تک پہنچائیں۔ خلیفہ کا فرض تھا کہ وہ رعایا کے ہر فرد کی ضروریات سے باخبر رہے اور انہیں از خود پورا کرے۔ اس سلسلہ میں آپ کی احتیاط کا یہ عالم تھا کہ جو محتاج آپ تک پہنچ جاتا اس کی ضروریات کا پورا کرنا آپ کسی اور پر نہ چھوڑتے۔ خود دیکھئے کہ ایسا ہو گیا ہے۔ ایک دفعہ ایک قاصد (قیس اشجعی) آپ کے پاس آیا۔ اس کا بیان ہے کہ

میں آیا تو آپ لکڑی کی ٹیک لگائے اس طرح کھڑے تھے جس طرح چرواہا اپنے ریوڑ کے پاس کھڑا ہوتا ہے۔ آپ لوگوں کو کھانا کھلوا رہے تھے۔ آپ چکر لگاتے جاتے اور فرماتے جاتے۔ اے یرفا! اسے گوشت دے، اسے روٹی دے، اسے شوربا دے۔

اس طرح افرادِ معاشرہ کی ضروریات پوری کرتے تھے اور ایسا کرنے میں احترامِ آدمیت اور شرفِ انسانیت کا پورا پورا خیال رکھتے تھے۔ چنانچہ حضرت اسلم کی روایت ہے کہ ایک دن میں حضرت عمرؓ کے ساتھ بازار گیا تو وہاں ایک نوجوان عورت آپ سے ملی اور کہنے لگی کہ امیر المومنین! میرا شوہر مر گیا اور چھوٹے چھوٹے بچے چھوڑ گیا ہے۔ ان کے لئے کھانے پینے کا کوئی سامان نہیں۔ میں خفاف بن ایماء الغفاری کی بیٹی ہوں جو حدیبیہ میں رسول اللہ کے ساتھ تھے۔ آپ اس کی باتیں خاموشی سے سنتے رہے۔ گھر آئے اور ایک

احترامِ انسانیت

تنومند و توانا اونٹ پر سامانِ رسد اور دیگر اشیائے ضروریہ لاد کر اس کے پاس لے گئے اور کہا کہ بیٹی! اسے ہنکا لے جا۔ اب تجھے خود آنے کی ضرورت نہیں پڑے گی۔

تمام ضروری سامان تم تک خود بخود پہنچ جایا کرے گا۔ ایک شخص نے دیکھا تو کہا، امیر المومنین! آپ نے اس لڑکی کو بہت زیادہ دے دیا۔ فرمایا کہ تجھے کیا خبر کہ وہ کس باپ کی بیٹی اور کس بھائی کی بہن ہے؟ یہ میں جانتا ہوں۔

(۷) قحط کے زمانے میں آپ نے رعایا کے کھانے پینے کے جو انتظامات کئے تھے، انہیں ہم سابقہ باب میں بیان کر چکے ہیں۔ جب بدوی قبائل کے بھوکے لوگ ہجوم کر کے مدینہ آ گئے تھے، تو آپ نے پہلے یہ حکم دیا تھا کہ:۔

> جس جس گھر میں کچھ وسعت ہے، میں اس گھر کے افراد کی تعداد کے برابر، ان محتاجوں کو ان کے خاندانوں کا جزو بنا دوں گا تاکہ جو کچھ اس خاندان کے لئے ایک وقت میں پکتا ہے، اسے یہ سب مل کر کھالیں۔ اس سے لوگ ہلاکت سے بچ جائیں گے۔

اس کے بعد، دوسرا قدم یہ تھا کہ اہلِ مدینہ اور باہر سے آنے والوں کے لئے مشترکہ دسترخوان بچھا دیئے گئے۔ اور جو کچھ مدینہ میں موجود تھا اور جو کچھ باہر سے آیا اسے سب نے مل بانٹ کر کھالیا۔ یہ اس سنّتِ رسول اللہ کے اتباع میں تھا جس کی رو سے حضورؐ نے فرمایا تھا کہ میں اشعری قبیلہ والوں میں سے ہوں۔ اسی ارشادِ نبوی کی تشریح میں حضرت ابن عمرؓ کہا کرتے تھے کہ:۔

> اللہ کے نزدیک سب سے بہتر کھانا وہ ہے جسے سب مل کر کھائیں۔

بات ہم یہ کر رہے تھے کہ قرآنی مملکت میں رزق کی ذمّہ داری افراد کی الگ الگ نہیں ہوتی بلکہ اجتماعی نظام کی ہوتی ہے۔ مملکت میں جو سامانِ زیست بھی ہو، وہ سب کے لئے مشترک ہوتا ہے۔ اس میں ادنیٰ اور اعلیٰ کی کوئی تمیز نہیں ہوتی۔ ایک دفعہ حضرت عمرؓ کسی دعوت میں گئے تو دیکھا کہ اہلِ خانہ کے ملازم، دسترخوان پر موجود نہیں۔ دریافت کرنے پر صاحبِ خانہ نے کہا کہ ہم پہلے کھا لیتے ہیں وہ بعد میں کھاتے ہیں۔ اس پر آپ نے برافروختہ ہو کر فرمایا:۔

> خدایا! اس قوم کا کیا حشر ہوگا جو اپنے آپ کو اپنے ملازموں پر ترجیح دیتی ہے۔

پھر آپ نے ان ملازموں کو بلایا اور پہلے انہیں کھلایا اور بعد میں خود کھایا۔

پیاس سے مرجانے والے کا خون بہا

(۸) رزق کے معاملہ میں، حکومت کی ذمّہ داری کے سلسلہ میں فاروق اعظمؓ ایسی شدّت برتتے تھے کہ ایک دفعہ ایک

بستی کے رہنے والوں نے ایک پیاسے مسافر کو پانی نہ دیا اور وہ پیاس کی وجہ سے مر گیا تو آپ نے اس کا خون بہا ادا کیا اور پھر اُسے اُس بستی والوں سے وصول کیا۔ اسی فاروقی فیصلہ کی رو سے، قانون بن گیا کہ اگر کسی بستی میں کوئی شخص بھوک پیاس سے مر جائے تو اہلِ بستی پر اس کی دیت (خون کی قیمت) لازم آجاتی ہے۔

(ضمناً) امام ابن حزمؒ (وفات ۴۵۶ھ) اندلس کے مشہور محدث اور فقیہہ تھے۔ انہوں نے ان قوانین کو اپنی کتاب المحلّیٰ میں تفصیل سے بیان کیا ہے۔ وہ پہلے کہتے ہیں کہ

> فقہاء کا قول ہے کہ اگر کوئی پیاسا ہے اور اسے موت کا خطرہ لاحق ہو گیا ہے تو اُس پر فرض ہوجاتا ہے کہ وہ جہاں کہیں پانی پائے، چھین کر پی لے اگرچہ اس کے لئے اسے جنگ ہی کیوں نہ کرنی پڑے۔

اس کے بعد امام ابن حزم لکھتے ہیں:۔

امام ابن حزمؒ کے فتاوے

> پھر اس میں کیا فرق ہے کہ پیاس کی وجہ سے موت سے بچنے کے لئے جنگ کو جائز قرار دیا جائے اور بھوک اور عریانی کے سبب موت سے بچنے کے لئے قتال سے منع کیا جائے۔ حالانکہ نوعیت دونوں کی ایک جیسی ہے۔

اسی بنا پر وہ کہتے ہیں کہ:۔

> مضطر (یعنی جو بھوک پیاس سے مجبور ہو جائے) کو مقاتلہ کا حق حاصل ہے۔ اس مقاتلہ اور مقابلہ میں اگر وہ مضطر مارا جائے تو حق روکنے والے پر اس کا خون بہا لازم آجائے گا لیکن اگر وہ روکنے والا مارا جائے تو اس پر خدا کی لعنت ہوگی۔ اس لئے کہ کسی کے حق کو روکنے والا درحقیقت بغاوت کے جرم کا مرتکب ہوتا ہے۔ حضرت ابوبکر صدیقؓ نے جو مانعینِ زکوٰۃ کے خلاف جہاد کا اعلان کیا تھا، تو وہ اسی بنا پر تھا۔

یہ امام ابن حزمؒ کا فتوےٰ ہے لیکن ہم سمجھتے ہیں کہ مضطر کو مقاتلہ کا حق انفرادی طور پر نہیں دیا جانا چاہیئے۔ اس سے معاشرہ میں لاقانونیت (انارکی) پھیل جائے گی۔ یہ حق، مضطر کی طرف سے حکومت کو حاصل ہونا چاہیئے۔ بہرحال، یہ ایک ضمنی گوشہ تھا۔ ہم کہہ یہ رہے تھے کہ جس پیاسے کو اہلِ بستی نے پانی نہیں دیا تھا اور وہ پیاس

سے مر گیا تھا، اس کی دیت، حضرت عمرؓ نے خود ادا کر کے، اسے اہلِ بستی سے وصول کیا تھا۔ یہ تھا رزق کے معاملہ میں حکومت کی ذمہ داری کا عملی مفہوم۔

(۹) حضرت عمرؓ کا یہ بھی فیصلہ تھا کہ حکومت کے واجبات کی ادائیگی اس وقت لازم آتی ہے جب متعلقہ شخص حکومت کے رفاہِ عامہ سے مستفید ہو چکا ہو۔ اسی ضمن میں، ایک آزاد شدہ غلام (اسعید) کا بیان کردہ واقعہ بصیرت افروز ہے۔ ان کا بیان ہے کہ میں، اپنی آزادی حاصل ہونے کے بعد، حکومت کے واجبات کی رقم جمع کرانے کے لئے حضرت عمرؓ کے پاس آیا تو آپ نے پوچھا کہ کیا تم نے حکومت کے

حکومت کے واجبات کس کے ذمے ہو سکتے ہیں

بیت المال سے کچھ فائدہ بھی اٹھایا ہے؟ میں نے کہا کہ نہیں، ابھی تک تو میں نے کوئی فائدہ نہیں اٹھایا۔ اس پر آپ نے فرمایا کہ

پھر اپنی رقم واپس لے جاؤ۔ جب تمہیں ہماری طرف سے کچھ مل جائے تو پھر اسے لیکر آنا۔

(۱۰) یہ بھی مختصراً، رزق کے معاملہ میں خلافت (اسلامی حکومت) کی ذمہ داریوں کی ایک ہلکی سی جھلک۔ اور یہ بھی ظاہر ہے کہ جب حکومت، یہ فریضہ اپنی ذمہ داری کے طور پر ادا کرے، تو اس سے وہ رعایا کے سر پر احسان نہیں دھرے گی۔ (مثال کے طور پر) ہم دیکھ چکے ہیں کہ قحط کے دوران، حضرت عمرؓ نے کس طرح اپنے آپ کو فاقوں سے ادھ موا کر لیا اور جب تک اس کا اطمینان نہیں کر لیا کہ ہر بھوکے کو کھانے کے لئے مل گیا ہے، اپنے منہ میں ایک لقمہ تک نہیں ڈالا۔ اور وہ لقمہ اسی کھانے کا تھا جو ہر ایک نے کھایا تھا۔ جب قحط رفع ہو گیا اور قافلے اپنے اپنے گھروں کو واپس جانے لگے تو حضرت عمرؓ انہیں رخصت کرنے کے لئے خود تشریف لے گئے۔ وہ لوگ اپنا اپنا سامان لاد رہے تھے اور خوش و خرم واپس جا رہے تھے۔ اس منظر کو دیکھ کر حضرت عمرؓ کی آنکھوں میں مسرت کے آنسو بھر آئے۔ اہلِ قافلہ میں سے (بنی محارب کے) ایک شخص نے آپ

اللہ کا مال اللہ کے بندوں کے لئے

سے عرض کیا کہ اہلِ قافلہ کو آپ سے کوئی شکایت نہیں۔ وہ سب آپ کے ممنونِ احسان اور شکر گزار ہیں۔ اس پر حضرت عمرؓ نے فرمایا:۔

بھئی! تم نے ایسا کیوں کہا۔ جو کچھ میں نے آپ لوگوں پر خرچ کیا ہے، یہ مال میرا یا میرے باپ خطاب کا نہیں تھا۔ یہ اللہ کا مال تھا۔ (اس لئے میری شکر گزاری کیسی؟)

مال اللہ کا ہوتا ہے اور سربراہِ مملکت کی حیثیت (حضورؐ نبی اکرم کے ارشاد کے مطابق) قاسم کی ہوتی ہے۔ وہ اسے احکامِ خداوندی کے مطابق تقسیم کرتا ہے۔" (زاد المعاد) اور حضرت عمرؓ کی یہی تو سب سے بڑی خصوصیت تھی جسے حضرت ابن عباسؓ نے آپ کی وفات کے وقت ان الفاظ میں بیان کیا تھا کہ:۔

وہ کتاب اللہ کے مطابق فیصلے کرتے تھے اور برابر برابر تقسیم کرتے تھے۔

(ضمناً) وہ جو ہمارے ہاں "امام مہدی" کا تصور ہے کہ ان کے زمانے میں، اسلام کا نظام (الدّین) ساری دنیا پر چھا جائے گا، زمین، ظلم و تشدد کی جگہ عدل و انصاف سے معمور ہو جائے گی۔ کرۂ ارض کا ہر فرد مطمئن اور مسرور ہوگا، تو اس نظام کے سربراہ کے متعلق (روایت ہے کہ) حضورؐ نے فرمایا کہ وہ "یقسم المال صحاحًا۔" (وہ سرمایہ کو صحیح طور پر تقسیم کرے گا)۔ کسی نے دریافت کیا کہ صحیح تقسیم کا معیار کیا ہوگا تو آپ نے فرمایا۔ "بالسویۃ بین الناس" (تمام انسانوں میں مساوات کی رُو سے)[1]

امام مہدی

اس مقام پر اتنا واضح کر دینا غیر متعلق نہیں ہوگا کہ ہمارے نزدیک، امام مہدی کے متعلق یہ عام تصور کہ آپ آخری زمانہ میں، خدا کی طرف سے مامور ہو کر آئیں گے اور ان کے ہاتھوں دنیا میں اسلام کا غلبہ ہوگا، قرآنی تعلیم کے مطابق نہیں۔ قرآنِ کریم کی رو سے، ختمِ نبوت کے معنی یہ ہیں کہ حضورؐ کے بعد، کوئی مامور من اللہ نہیں آئے گا۔ مامورین من اللہ صرف حضرات انبیاء کرامؑ ہوتے تھے جن کا سلسلہ حضورؐ خاتم النبیین کی ذاتِ گرامی پر ختم ہو گیا۔ حضورؐ کے بعد، دنیا میں اسلامی نظام کو قائم اور بلند کرنے والے افرادِ امت حضورؐ کے متبعین ہوں گے۔ انہی کو خلفائے راشدین کہا جائے گا اور یہی مہدی کہلائیں گے۔ خود حضورِ نبی اکرمؐ کا ارشادِ گرامی اس پر شاہد ہے۔ جب آپ نے فرمایا تھا کہ:۔

عَلَيْكُمْ بِسُنَّتِي وَ سُنَّةِ الْخُلَفَاءِ الرَّاشِدِينَ الْمَهْدِيِّينَ۔ (مشکوٰۃ، باب الاعتصام بالکتاب والسنۃ)

تم پر میرے طریقے اور میرے خلفاء راشدین المہدیین کے طریقوں کی پیروی لازم ہے۔

---

[1] مجمع الزوائد۔ باب ماجاء فی المھدی۔

[2] شیعہ حضرات کا اپنے ائمہ کرام (منجملہ امام مہدی) کے متعلق عقیدہ کچھ اور ہے۔ اس سے ہمیں بحث نہیں۔ ہم یہاں سنیوں کے عقیدہ کے متعلق گفتگو کر رہے ہیں۔

لہذا، جو مردِ مومن جس زمانے میں قرآن کا نظام قائم کر کے سنّتِ رسول اللہ کا احیاء کریگا وہی اس زمانے کا مہدی اور امام برحق ہوگا۔ اقبالؒ کے الفاظ میں:۔

ہے وہی تیرے زمانے کا امامِ برحق — جو تجھے حاضر و موجود سے بیزار کرے
موت کے آئینے میں تجھ کو دکھا کر رُخِ دوست — زندگی تیرے لئے اور بھی دشوار کرے
دے کے احساسِ زیاں تیرا لہو گرما دے
فقر کی سان چڑھا کر تجھے تلوار کرے

اس کے برعکس:۔

فتنۂ ملّتِ بیضا ہے امامت اس کی — جو مسلماں کو سلاطیں کا پرستار کرے

بنا بریں، حضرات خلفاء راشدینؓ ہی وہ امام مہدی تھے جو رزق کی تقسیم مساوی مساوی کرتے تھے۔ (یعنی ہر ایک کی ضرورت کے مطابق) اور یہی تھی وہ سب سے بڑی خصوصیت جس کا ذکر حضرت ابن عباسؓ نے حضرت عمرؓ کی وفات کے وقت کیا تھا۔ نیز حضرت علیؓ کا وہ قول جس میں آپ نے حضرت عمرؓ سے کہا تھا کہ

آپ کے عُمّال اس قدر امانت دار اس لئے ہیں کہ آپ خود امین ہیں۔

حضرت عمرؓ کو اس امانت کا احساس کس قدر شدید تھا اس کا اندازہ دو ایک واقعات سے لگایا جا سکتا ہے۔

ذمّہ داری کا احساس

(۱) حضرت علیؓ فرماتے ہیں کہ میں نے دیکھا کہ حضرت عمرؓ پالان پر سوار تیز تیز جا رہے ہیں۔ میں نے پوچھا، امیر المومنین! کدھر؟ کہنے لگے۔ مالِ زکوٰۃ کا ایک اونٹ گم ہو گیا ہے، اسے ڈھونڈنے جا رہا ہوں۔ حضرت علیؓ نے کہا کہ آپ نے کسی اور سے کیوں نہ کہہ دیا کہ وہ اس اونٹ کو تلاش کر لے۔ آپ نے کہا کہ خدا کی قسم! یہ تو اونٹ ہے، اگر بیت المال کی ایک بکری بھی کہیں گم ہو گئی تو عمرؓ سے اس کی بھی باز پرس ہو گی۔ (اور جب باز پُرس عمرؓ سے ہو گی تو یہ ڈیوٹی بھی عمرؓ ہی کی ہونی چاہیئے کہ وہ گم گشتہ اونٹ کو تلاش کرے۔)

(۲) ایک دن سخت گرمی تھی۔ حضرت عثمانؓ کیا دیکھتے ہیں کہ ایک شخص دو اونٹ ہنکائے چلا آ رہا ہے۔ گرمی سے زمین تپ رہی تھی۔ فضا جھلس رہی تھی۔ آپ نے دل میں کہا کہ نہ جانے اس شخص کو کیا مصیبت پیش آئی ہے کہ اس وقت یوں بھاگے بھاگے پھر رہا ہے؟ قریب آنے پر دیکھا کہ وہ امیر المومنین حضرت عمرؓ ہیں۔ حضرت عثمانؓ نے پوچھا کہ اس گھڑی کیا مصیبت آئی تھی۔ فرمایا۔ بیت المال کے دو اونٹ

باقی اونٹوں سے پیچھے رہ گئے تھے۔ میں نے کہا کہ انہیں باقی اونٹوں سے ملادوں تاکہ کہیں ضائع نہ ہو جائیں اور اللہ مجھ سے مواخذہ کرے۔ حضرت عثمانؓ نے کہا کہ آپ اندر تشریف لائیے، سایہ میں بیٹھئے، پانی پیجئے۔ ہم یہ کام کسی دوسرے سے کرائے دیتے ہیں۔ حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ شکریہ! آپ آرام کیجئے۔ یہ کام میں خود ہی کروں گا۔ یہ کہا اور اونٹوں کو ساتھ لئے آگے بڑھ گئے۔

حضرت عثمانؓ نے فرمایا۔

جس شخص نے قوی و امین[1] انسان کو دیکھنا ہو، وہ انہیں دیکھ لے۔

(۳) یہ واقعہ پہلے بیان ہو چکا ہے کہ حضرت عمرؓ بیت المال کے بیمار اونٹ کو کس طرح تیل کی مالش کر رہے تھے اور آپ نے باہر سے آنے والے وفد کے قائد حضرت احنف بن قیسؓ کو کس طرح اس کارِ خیر میں شرکت کی دعوت دی تھی۔

آئیے اب ہم دیکھیں کہ جس شخص کے احساسِ ذمہ داری کا یہ عالم تھا، بہ حیثیتِ امیر المومنین، اس نے اپنی پوزیشن کیا رکھی تھی۔

(۵)

۲۔ سربراہِ مملکت کی اپنی پوزیشن

وظیفہ

خلافت کی ذمہ داریاں سنبھالنے کے بعد، حسبِ معمول، سب سے پہلا سوال خلیفہ کے وظیفہ کا سامنے آیا۔ اس کے متعلق رفقاء نے مختلف مشورے دیئے لیکن جس طرح حضرت ابو بکر صدیقؓ نے اپنا وظیفہ آپ مقرر کیا تھا، اسی طرح حضرت عمرؓ نے بھی اپنے لئے آپ وظیفہ تجویز کیا۔ اور وہ یہ تھا۔

کپڑوں کے دو جوڑے، ایک سردی کا، ایک گرمی کا۔ حج اور عمرہ کے لئے ایک ایک احرام اور میرے اور میرے اہل و عیال کے لئے فی کس اتنا کھانا جو قریش کے ایک آدمی کی خوراک ہے۔ نہ اس سے زیادہ نہ اس سے کم۔ اس کے بعد میں مسلمانوں کا ایک فرد ہوں۔ جو ان کا حال سو میرا حال۔

---

[1] قوی و امین کی بات پہلے بھی گزر چکی ہے۔

بیت المال میں سے اتنا سا لیتے وقت بھی دل پر جو بوجھ تھا اس کا اظہار نہایت بلیغ اور مؤثر انداز سے کیا. قرآن کریم میں کہا گیا ہے کہ تم یتیموں کے مال کا نہایت دیانت داری سے انتظام کرو. اگر تم ضرورت مند نہیں ہو تو اس خدمت کے معاوضہ میں کچھ نہ لو لیکن اگر تم خود صاحب احتیاج ہو تو اس کے عوض قاعدہ اور قانون کے مطابق تھوڑا بہت لے سکتے ہو (۴/۶) حضرت عمرؓ نے (اپنے وظیفہ کے سلسلہ میں) فرمایا کہ

بیت المال میں حق

اللہ کا مال میرے لئے یتیم کے مال کی طرح ہے. اگر ضرورت نہیں ہوتی تو اُسے ہاتھ تک نہیں لگاتا اور حاجت مند ہوتا ہوں تو بقدرِ احتیاج لے لیتا ہوں.

اربابِ تحقیق کا اندازہ ہے کہ حضرت عمرؓ جو کچھ اپنے لئے بیت المال سے لیتے تھے وہ بقدرِ دو درہم روزانہ کے ہوتا تھا اور (علامہ طنطاوی کی تحقیق کی رُو سے) ایک درہم ہماری چوّنی کے برابر ہوتا تھا. اس حساب سے حضرت عمرؓ بیت المال سے اپنے اور اپنے اہل و عیال کے لئے زیادہ سے زیادہ آٹھ آنے یومیہ لیتے تھے. لیکن اس میں گزارہ بڑی تنگی سے ہوتا تھا. رفقاء نے اسے محسوس کیا تو کسی کو اس کی جرأت نہ ہوئی کہ آپ سے کہتا کہ اس میں اضافہ کر لیجئے. انہوں نے مشورہ کر کے آپ کی بیٹی 'ام المومنین' حضرت حفصہؓ کو اس کے لئے آمادہ کیا. وہ باپ کے پاس گئیں اور کہا کہ اب جبکہ اللہ تعالیٰ نے مملکت کو کشائش عطا کر دی ہے' آپ بھی اپنے روزینے میں کچھ اضافہ فرما لیجئے تاکہ گزارہ قدرے سہولت سے ہو جائے. آپ نے سنا تو جواب میں فرمایا کہ:-

> بیٹی تم نے اپنی قوم کا ساتھ دیا لیکن اپنے باپ کے ساتھ خیر خواہی نہ کی. جہاں تک تمہارے مشورہ کا تعلق ہے' میں واضح کر دینا چاہتا ہوں کہ میرے گھر والوں کا میرے مال اور میری جان پر حق ہے دین اور امانت میں ان کا کوئی حق نہیں.

ہم نے دیکھا ہے کہ حضرت عمرؓ نے جو وظیفہ اپنے لئے مقرر کیا تھا اس میں قریش کے ایک عام آدمی کے معیار کے مطابق کھانا اور دو جوڑے (سالانہ) کپڑے تھے. اب دیکھئے کہ اس کھانے اور ان کپڑوں کی کیفیت کیا تھی. پہلے کھانے کو لیجئے.

ہم پہلے دیکھ چکے ہیں کہ حضرت ساریہؓ کا پیغامبر[1] جب آپ کے پاس آیا ہے تو آپ اُسے اپنے

---

[1] ایک اور روایت میں ہے کہ یہ واقعہ عتبہ بن فرقد کے ساتھ پیش آیا تھا جو کوفہ کے عامل تھے.

امیر المومنین کا کھانا ساتھ گھر لے آئے اور اسی کے سامنے اندر سے آپ کا کھانا آگیا۔ کھانے میں جو کی روٹی، زیتون کا تیل اور موٹا پسا ہوا نمک تھا۔ اس مہمان نے کہا کہ امیر المومنین! آپ گیہوں کے آٹے کی روٹی کیوں نہیں کھاتے؟ آپ نے جواب میں کہا:۔

ابن فرقد! سرزمین عرب میں اس وقت مجھ سے زیادہ صاحب مقدرت کوئی ہے؟

اس نے جواب میں کہا کہ کوئی نہیں! تو آپ نے فرمایا کہ اس مقدرت کے باوجود میں جو گیہوں کے بجائے جو کی روٹی کھاتا ہوں تو اس کی وجہ عدم مقدرت نہیں، کچھ اور ہے۔ تم بتاؤ کہ کیا اس وقت ہماری مملکت میں ہر شخص کو گیہوں کی روٹی مل رہی ہے؟ اس نے کہا کہ میں ایسا تو نہیں کہہ سکتا۔ اس پر آپ نے فرمایا کہ:۔

عمر کو اس وقت اس کا یقین ہے کہ مملکت میں ہر شخص کو کم از کم جو کی روٹی میسر آرہی ہے۔ وہ گیہوں کی روٹی اس دن کھائیگا جس دن اُسے اس کا اطمینان ہو جائے کہ ہر شخص کو گیہوں کی روٹی مل رہی ہے۔

یہ تو عام حالات میں کھانے کا معیار اور اصول تھا۔ قحط کے زمانے میں آپ نے اپنے، اور اپنے اہل و عیال پر جو مزید پابندیاں عائد کرلی تھیں، ان کی تفصیل پہلے گزر چکی ہے۔ عام حالات میں جب سالن میسر آتا تھا تو وہ ایک ہی ہوتا تھا۔ دستر خوان پر کبھی ایک سے زیادہ سالن نہیں دیکھے گئے۔ "ایک سے زیادہ سالن" کا بھی آپ کے نزدیک معیار عجیب تھا۔ ایک دفعہ کھانے میں گوشت اور دودھ آیا تو آپ نے کہا کہ یہ دو سالن ہیں۔ ان میں سے ایک وقت میں صرف ایک ہی کھایا جائے گا اور ان میں سے بھی وہ کھایا جائے گا جس کے متعلق اطمینان ہو کہ وہ عام مسلمانوں کو میسر آسکتا ہے۔ ایک دفعہ آذر بائیجان کا قاصد آتے وقت آپ کے لئے وہاں کا کچھ حلوہ لیتا آیا۔ آپ نے چکھا تو فرمایا کہ بہت اچھا ہے لیکن ساتھ ہی پوچھا کہ کیا یہ حلوہ وہاں تمام مسلمانوں کو میسر آجاتا ہے۔ قاصد نے کہا کہ نہیں! یہ تو خاصہ کی چیز ہے۔ یہ سن کر آپ نے ہاتھ روک لیا اور فرمایا کہ اسے واپس لے جاؤ۔[1] اس کے ساتھ ہی عامل کو خط لکھا کہ:۔

میاں! اس قسم کا حلوہ کھانا نہ تمہارے بس کی بات تھی نہ تمہاری ماں کے۔ وہی کچھ کھاؤ اور مسلمانوں کو کھلاؤ جو کچھ ہم اپنے گھروں میں کھاتے ہیں۔

اس قسم کی پر تکلف چیزوں کے استعمال سے اجتناب کیوں برتا جاتا تھا، اس کے لئے آپ نے ایک دفعہ جو دلیل دی تھی وہ دیدۂ بصیرت کے لئے وجہ صد فروغ ہے۔ حضرت جابر بن عبداللہؓ نے کہا ہے کہ ایک دن

---

[1] ایک روایت میں ہے کہ آپ نے اسے شہدا کے بچوں میں تقسیم کر دیا۔

میں حضرت عمرؓ کے ہاں گیا تو میرے ہاتھ میں تازہ گوشت کا ٹکڑا تھا۔ آپ نے کہا کہ جابر یہ کیا؟ میں نے عرض کیا کہ گوشت کھانے کو جی چاہا تھا، خرید لایا۔" فرمایا:۔

کیا صورت یہ ہوئی کہ جس چیز کو جب بھی جی چاہا، اسے خرید لیا؛ کیا تو اس ارشادِ خداوندی سے نہیں ڈرتا جس میں کہا گیا ہے کہ جب کفار کو جہنم کے کنارے لایا جائے گا تو وہ خدا سے عرض کریں گے کہ کیا اس زندگی کی خوشگواریوں میں ہمارا کوئی بھی حصہ نہیں تو ان سے کہا جائیگا کہ اَذْهَبْتُمْ طَيِّبٰتِكُمْ فِيْ حَيَاتِكُمُ الدُّنْيَا۔ (۴۶/۲۰) تم اپنے حصے کی خوشگوار چیزیں دنیاوی زندگی میں لے کر ختم کر چکے ہو۔

جب کھانا سامنے آیا تو وہ قدرے پُر تکلف تھا۔ فرمایا کہ

یہ تو ہمارے لئے ہوا۔ ان محتاجوں کے لئے کیا ہے جو بھوکے مر رہے ہیں اور جنہیں نانِ جویں تک میسر نہیں

حضرت خالد بن ولیدؓ نے کہا کہ "ان کے لئے جنت ہے۔" یہ سُن کر آپ کی آنکھوں میں آنسو ڈبڈبا آئے اور فرمایا کہ خالد!

اگر ہماری قسمت میں یہ ہے اور ان کے مقدر میں جنت، تو پھر سوچو کہ یہ فرق کتنا بڑا ہوا؟

واضح رہے کہ حضرت عمرؓ اپنے آپ کو ان آسائشوں سے اس لئے محروم نہیں رکھتے تھے کہ آپ (اہلِ تصوف کی طرح) زہد و تورع کی فقیرانہ زندگی بسر کرنا چاہتے تھے۔ قطعاً نہیں۔ اس قسم کی زندگی بسر کرنے والوں کو آپ کس طرح ڈانٹتے تھے، یہ ہم پہلے دیکھ چکے ہیں۔ اس کی وجہ وہ تھی جسے آپ نے ان الفاظ میں بیان فرما دیا تھا کہ:

اگر مجھ پر وہ کچھ نہ گزرے جو عوام پر گزرتی ہے تو مجھے ان کی تکلیفوں اور پریشانیوں کا احساس کیسے ہو سکتا ہے؟ اور جب مجھے ان کا احساس ہی نہیں ہو گا تو میں انہیں رفع کرنے کی فکر کیسے کر سکوں گا۔

دوسرے مقام پر آپ نے فرمایا کہ

اگر میں پیٹ بھر کر کھڑا ہو جاؤں اور دوسرے انسان بھوکے ہوں تو اس کے ایک ہی معنی ہیں کہ میں لوگوں کا اچھا والی نہیں ہوں۔

(-)

کھانے کے بعد لباس کی طرف آئیے۔ یعنی سردی اور گرمی کے لئے ایک ایک جوڑے کی طرف۔ حضرت

امیر المومنین کا لباس

علیؓ نے فرمایا کہ "میں نے عمر ابن الخطابؓ کو دیکھا۔ آپ کے ازار میں اکیس پیوند چمڑے کے اور ایک پیوند کپڑے کا تھا۔" حضرت انسؓ نے

بیان کیا ہے کہ "میں نے حضرت عمرؓ کی قمیض میں، ان کے مونڈھوں کے درمیان چار پیوند دیکھے۔" حضرت عبداللہ بن عباسؓ کی روایت ہے کہ "میں ایک دن حضرت عمرؓ سے ملنے کے لئے گیا۔ آپ گدھے پر سوار کہیں جا رہے تھے۔ میں بھی ساتھ ہولیا۔ گدھے کے گلے میں سیاہ رسّی بندھی تھی اور حضرت عمرؓ ایک قمیص اور تہبند بندھے ہوئے تھے۔ تہبند کا یہ عالم کہ وہ پنڈلیوں سے اوپر چڑھتا جا رہا تھا۔ میں اسے ایک طرف سے ٹھیک کرتا تو وہ دوسری طرف سے اوپر چڑھ جاتا۔ یہ دیکھ کر آپ مسکرائے اور کہا کہ اسے چھوڑ دو۔ یہ تمہاری بات نہیں مانے گا۔ اتنے میں ہم ایک باغ میں داخل ہو گئے تو آپ نے تہبند میری طرف پھینکتے ہوئے فرمایا کہ ذرا ہاتھ بٹاؤ اور اسے دھو ڈالو۔ یہ کہہ کر قمیض خود دھونے لگ گئے۔

کبھی کبھی آپ، وقتِ مقررہ پر گھر سے باہر نہیں آتے تھے۔ اس کی وجہ پوچھی گئی تو آپ نے فرمایا کہ اس کے ذمہ دار یہ میرے کپڑے ہیں۔ ایک ہی جوڑا ہے، اسے دھو کر ڈال دیتا ہوں، تو یہ سوکھنے میں دیر لگا دیتا ہے۔

حج کا خرچ

حج کے اجتماع میں شرکت 'امیر المومنین (اور دیگر عمالِ حکومت) کی "سرکاری ڈیوٹی" تھی۔ ظاہر ہے کہ اس کے اخراجات حکومت کو برداشت کرنے ہوتے تھے۔ صدرِ مملکت کس "شان و شوکت" سے یہ سفر کرتے تھے اس کا اندازہ حضرت عبداللہ بن عامر بن ربیعہؓ کی اس روایت سے لگ سکتا ہے جس میں وہ فرماتے ہیں کہ "میں ایک دفعہ حج کے سفر میں حضرت عمرؓ کے ساتھ رہا۔ آپ کے لئے نہ کہیں خیمہ لگایا گیا نہ سائبان۔ نہ کوئی ایسی عمارت تھی جس میں آپ آرام کر سکتے۔ جہاں قیام کرنا ہوتا، ایک چادر کسی درخت پر ڈال دیتے اور اس کے سائے میں ہم سب آرام کر لیتے۔

حضرت یسارؓ بن نمیر کی روایت ہے کہ ایک دفعہ حضرت عمرؓ نے پوچھا کہ اس مرتبہ حج پر کل کیا خرچ آیا۔ میں نے کہا پندرہ دینار (دوسری روایت میں دو سو اسی درہم کہا گیا ہے) اس پر آپ نے فرمایا کہ "ہم نے بیت المال کا بہت سارا پیسہ اڑا دیا۔"

مکان، امیر المومنین کا وہی تھا جس میں آپ زمانۂ خلافت سے پہلے رہا کرتے تھے۔ جب ایوانِ حکومت وہی مسجد تھی تو ایوانِ صدر جداگانہ کیوں ہوتا؟ یہ پہلے لکھا جا چکا ہے کہ حضرت عمرو بن عاصؓ نے آپ کو اطلاع دی کہ انہوں نے صدرِ مملکت کے لئے مصر میں ایک مکان بنوایا ہے۔ اس پر حضرت عمرؓ نے انہیں جواب دیا کہ "بھائی ذرا سوچو! حجاز میں رہنے والے کا مکان مصر میں کیسے ہو سکتا ہے۔ اس مکان کو رفاہِ عامہ

کے لئے کھلا رہنے دو۔"

ضمناً، مکانات کے متعلق عام لوگوں کے لئے بھی آپ کی ہدایت یہی تھی کہ وہ نہایت سادہ سے ہونے چاہئیں۔ جب کوفہ کی چھاؤنی تعمیر ہوئی ہے تو وہاں پہلے بانس کے مکانات بنائے گئے۔ ایک دفعہ ان مکانوں میں آگ لگ گئی تو وہ جل کر راکھ کا ڈھیر بن گئے۔ اس پر آپ نے اجازت دے دی کہ ان کی جگہ مکانات پختہ بنا لئے جائیں۔ لیکن ساتھ ہی یہ تاکید بھی کردی کہ کوئی شخص نہ تین کمروں سے بڑا مکان بنائے، نہ زیادہ اونچا۔

امیر المومنین کی زندگی

بہرحال، یہ تھی امیر المومنین کی زندگی۔ ایک دفعہ قیصر روم نے ایک قاصد مدینہ بھیجا کہ وہ حالات کا جائزہ لے۔ اس نے مدینہ پہنچ کر لوگوں سے پوچھا کہ آپ کا بادشاہ کہاں ہے؟ انہوں نے کہا کہ ہمارا کوئی بادشاہ نہیں۔ ایک امیر ہے جو مدینے سے باہر کہیں گیا ہے۔ وہ آپ کی تلاش میں نکلا تو دیکھا کہ آپ اپنے چغے کو سر کے نیچے رکھے بالو ریت پر دھوپ میں سو رہے ہیں اور آپ کا پسینہ پیشانی سے ٹپک کر زمین کو تر کر رہا ہے۔ یہ دیکھ کر وہ ورطۂ حیرت میں ڈوب گیا اور بے ساختہ کہنے لگا کہ "عمرؓ! تو لوگوں سے عدل کرتا ہے اس لئے اس طرح بے خوف سوتا ہے۔ ہمارا بادشاہ ظلم کرتا ہے اس لئے وہ بیدار اور خوف زدہ رہتا ہے۔ میں گواہی دیتا ہوں کہ تیرا دین برحق ہے۔ اگر میں قاصد کی حیثیت سے نہ آیا ہوتا تو اسی وقت اسلام قبول کر لیتا۔ اب جا کر واپس آؤں گا تو اسلام قبول کر لوں گا۔"

(۰)(۰)(۰)(۰)(۰)(۰)(۰)

یہ تھا اندازِ زیست اس امیر المومنین کا جس کی مملکت بائیس لاکھ مربع میل پر پھیلی ہوئی تھی۔ اس کی زندگی کا ایسا انداز کیوں تھا؟ اس لئے کہ جس معلّم (علیہ التحیۃ والسلام) سے اسؓ نے تعلیم و تربیت حاصل کی تھی، اسؐ کا ارشاد تھا کہ:-

> سربراہِ مملکت کی حیثیت محض ایک خزانچی (قاسم) کی ہوتی ہے۔ اس کے پاس ڈھیروں مال جمع رہتا ہے۔ لیکن سب اس لئے کہ جہاں تقسیم کرنے کا اسے حکم دیا جائے، وہاں تقسیم کردے۔
>
> (زاد المعاد، جلد ۲)

اسی بنا پر حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ ہماری اور قوم کی مثال ایسی ہے جیسے کچھ لوگ سفر کے لئے نکلے تو انہوں نے اپنا اپنا سرمایہ کسی ایک شخص کے سپرد کر دیا کہ وہ اس سے مشترکہ طور پر سفر کے اخراجات پورے کرتا جائے۔

کہا، کیا اس صورت میں اُس شخص کے لئے یہ جائز ہو سکتا ہے کہ وہ اپنے ساتھ کوئی ترجیحی سلوک کرے۔ لوگوں نے کہا کہ نہیں۔ آپ نے فرمایا کہ بس یہی کیفیت قوم اور اس کے سربراہ کی ہے۔

اس باب میں آپ کی احتیاط کا یہ عالم تھا کہ آپ بیت المال سے قرض تک لینا بھی پسند نہیں کرتے تھے۔

یہ تھی امیرالمومنین کی زندگی۔ ہم نے، اسلام کے معاشی نظام کے سلسلہ میں، خود سربراہِ مملکت کی زندگی کو پیش کرنا اس لئے ضروری سمجھا ہے کہ اس نظام کو وہی شخص متشکل کر سکتا ہے جو اپنی زندگی اس قسم کی رکھے اور اس حقیقت پر ایمان رکھے کہ:

ایک ایک قطرے کا مجھے دینا پڑا حساب ⁖ خونِ جگر ودیعتِ مژگانِ یار تھا

آمدنی اور اس کی تقسیم

صحاح کی مشہور حدیث ہے کہ حضورؐ نے فرمایا کہ قیامت میں جن امور کے متعلق خصوصیت سے بازپرس

کہاں سے لیا، کہاں خرچ کیا

ہوگی ان میں ایک اہم معاملہ یہ بھی ہوگا کہ مال کے متعلق پوچھا جائے گا کہ:

من این اکتسبه و فیما انفقه

اس نے اس مال کو کہاں سے حاصل کیا اور کہاں کہاں خرچ کیا۔

یعنی یہی نہیں کہ مال کے خرچ کرنے کے متعلق ہی بازپرس ہوگی، بلکہ اس کے ساتھ یہ بھی پوچھا جائے گا کہ تم نے وہ مال حاصل کس طریق سے حاصل کیا تھا۔ سو جب یہ بازپُرس ایک ایک فرد سے ہوگی تو حکومت سے اس کا مؤاخذہ بدرجۂ اولیٰ ہوگا۔ اسلامی حکومت اس امر کی جوابدہ ہوتی ہے کہ "اس نے کہاں سے لیا اور کیسے خرچ کیا۔"

جغرافیائی پوزیشن اور آب وہوا کے لحاظ سے ملک عرب کی جو حالت تھی اس کی وجہ سے اس کے ذرائع پیداوار نہایت محدود تھے۔ ملک کا بیشتر حصہ ریگستان تھا۔ اس میں جہاں جہاں نخلستان تھے، وہاں گھاس چارہ ہو جاتا تھا اور اس سے قبائل بھیڑ بکریاں پال لیتے تھے۔ یہی ان کا مال تھا اور اسی مال کی لڑائیوں میں لوٹ پڑتی تھی ــــ بلکہ یوں کہیئے کہ اکثر وبیشتر اسی مال کی خاطر لڑائیاں ہوتی تھیں ــــ

عربی زبان میں، بھیڑ بکریوں کو غنم کہتے ہیں۔ اس لئے جنگ میں لوٹ کے مال کو غنیمت کہا جاتا تھا۔ لہذا، ان کے ہاں آمدنی کا بیشتر حصہ مالِ غنیمت پر مشتمل ہوتا تھا۔ قاعدہ یہ تھا کہ جنگ

مالِ غنیمت

میں جو شخص اپنے غنیم کو قتل کر دے، اس کا مال و اسباب اس (قاتل) کو بطورِ غنیمت مل جاتا تھا۔ قرآنِ کریم نے سب سے پہلے اس میں اصلاح کی اور کہا کہ سب سے پہلے اس حقیقت کو سمجھ لینا چاہئے کہ جنگ، مالِ غنیمت کے لئے نہیں کی جائے گی بلکہ اس لئے کی جائے گی کہ خدا کا نظامِ عدل و انصاف غالب رہے (کلمۃ اللّٰہ العلیا)۔ اس ایک اصلاح سے جنگ کا جذبۂ محرکہ یکسر بدل گیا۔ اب رہا مالِ غنیمت، سو اس کے متعلق فرمایا کہ اسے انفرادی طور پر لوٹا نہیں جائے گا بلکہ اسے اجتماعی طور پر حکومت کی تحویل میں دیدیا جائے گا جو اسے انفرادی اور اجتماعی ضروریات کے مطابق تقسیم کرے گی۔ سورۂ انفال میں ہے۔

> یاد رکھو! جو کچھ تمہیں بطور مالِ غنیمت حاصل ہو، اس کا پانچواں حصہ "اللہ اور رسولؐ" کے لئے اور ذی القربیٰ اور یتامیٰ اور مساکین اور ابن السبیل کے لئے ہے۔ (۸/۴۱)

یہ اس مالِ غنیمت کے متعلق ہے جو حریف سے جنگ کرنے کے بعد حاصل ہو لیکن اگر دشمن بغیر جنگ کئے بھاگ جائے اور کچھ مال و اسباب پیچھے چھوڑ جائے (جسے اصطلاح میں مالِ فَے کہا جاتا ہے) تو اس کے متعلق کہا کہ وہ سب کا سب حکومت کی تحویل میں چلا جائے گا۔ (۵۹/۷)

مالِ غنیمت کا پانچواں حصہ (خُمس) یا مالِ فَے، جو حکومت کی تحویل میں جائے گا، وہ سربراہِ مملکت کی ذاتی ملکیت قرار نہیں پائے گا۔ سربراہِ مملکت کو تو، دیگر افرادِ معاشرہ کی طرح، کفاف (روزینہ) ملے گا جس سے اس کی اور اس کے اہل و عیال کی ضروریات پوری ہوں۔ یہ مال، مملکت کی اجتماعی ضروریات پوری کرنے اور رفاہِ عامہ کے لئے خرچ کیا جائے گا۔ چنانچہ حضور نبی اکرمؐ نے یہ فرما کر اس کی تشریح کر دی کہ

> تمہارے مالِ غنیمت میں سے میرے لئے پانچواں حصہ ہے اور یہ حصہ بھی تمہیں لوگوں کو واپس دے دیا جاتا ہے۔ (بخاری و مسلم)

اب رہا وہ مال جو لوگوں میں تقسیم کیا جاتا تھا۔ اس کے متعلق قرآنِ کریم نے دو بنیادی اصول بیان کر دیئے۔ ایک یہ کہ:-

> وَمَآ اٰتٰىكُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْهُ ۚ وَمَا نَهٰىكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوْا ۚ (۵۹/۷)
>
> جو کچھ رسولؐ تمہیں دے دے (بطیبِ خاطر) قبول کر لو۔ جو نہ دے اس سے رکے رہو۔

یعنی اس تقسیم کا اختیار حکومت کو حاصل ہے۔ ہر ایک کو اس کا فیصلہ بطیبِ خاطر قبول کر لینا چاہیئے۔
اور دوسرا اصول خود حکومت کے لئے کہ

کَیۡ لَا یَکُوۡنَ دُوۡلَۃًۢ بَیۡنَ الۡاَغۡنِیَآءِ مِنۡکُمۡ۔ (۵۹/۷)

ایسا نہ ہو کہ یہ مال، تم میں سے دولت مندوں کے طبقہ ہی میں گردش کرتا رہے۔

یعنی تقسیم ایسی نہ ہو کہ یہ مال اوپر کے طبقہ ہی میں گردش کرتا رہے۔ اسے تمام معاشرہ میں اس طرح گردش کرتے رہنا چاہیئے جس طرح انسانی جسم میں خون رواں دواں رہتا ہے کہ ہر عضو کو ضرورت کے مطابق سامانِ نشوونما ملتا رہتا ہے۔ اس اصول پر نبی اکرمؐ نے جس طریق سے عمل فرمایا، جب نگہ بصیرت اس پر غور کرتی ہے تو انسان وجد میں آجاتا ہے۔

تاریخِ انسانیت کا اہم ترین اور مشکل ترین مسئلہ دولت (یا سامانِ رزق) کی تقسیم کا ہے۔ اس کے لئے یکے بعد دیگرے مختلف اصول وضع ہوئے اور متعدد طریق کار اختیار کئے گئے لیکن ہر اصول و طریق کے بعد انسانیت کو بصد حسرت و یاس کہنا پڑا کہ

تلاش جس کی ہے وہ زندگی نہیں ملتی

اس سلسلۂ سعئ لاحاصل کی آخری کڑی کارل مارکس (کے نظامِ کمیونزم) کا وہ اصول ہے جسے اس باب میں حرفِ آخر قرار دیا جاتا ہے۔ یعنی یہ کہ

صلاحیت کے مطابق لیا جائے
ضرورت کے مطابق دیا جائے

ہر ایک سے اس کی صلاحیت کے مطابق کام لیا جائے۔ اور ہر ایک کو اس کی ضرورت کے مطابق دیا جائے۔

یہ اصول واقعی بڑا اطمینان بخش ہے لیکن یہ بھی اسی "سلسلۂ سعئ لاحاصل" کی ایک کڑی ہے جس کا ذکر اوپر کیا گیا ہے۔ یہ اس لئے کہ خود کارل مارکس اور لینن نے اس کا اعتراف کیا ہے کہ یہ اصول ہے تو بڑا انسانیت ساز، لیکن اسے عمل میں کس طرح لایا جائے، یہ ہماری سمجھ میں نہیں آتا۔ اس لئے ہم اس باب میں معذور ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اشتراکی دنیا میں سوشلزم کا نظام تو کسی حد تک جاری ہو سکا لیکن کمیونزم کا نظام کہیں آزمایا تک نہیں گیا۔ کارل مارکس نے تو اپنے رفقاء کو یہاں تک کہہ دیا تھا کہ اس مسئلہ پر بحث و تمحیص بھی نہ کی جائے[1]۔

---

[1] تفصیل میرے مقالہ "اسلامی سوشلزم" میں ملے گی۔

مذکورہ بالا اصول فی الواقعہ بڑا درخشندہ ہے لیکن بہت کم لوگوں کو معلوم ہے کہ اسے سب سے پہلے پیش کس نے کیا تھا؛ اسے کارل مارکس نے نہیں، حضورؐ نبیٔ اکرم نے چھٹی صدی عیسوی میں دنیا کے سامنے پیش کیا تھا (جب ساری دنیا نظامِ سرمایہ داری کی تاریکیوں میں ڈوبی ہوئی تھی) اور نہ صرف نظری طور پر پیش کیا تھا۔ بلکہ اس پر عمل کر کے بھی دکھا دیا تھا۔ یہ ظاہر ہے کہ جنگ میں تمام سپاہی یکساں حصہ لیتے تھے اور اپنی اپنی صلاحیت اور استعداد کے مطابق نبرد آزمائی کرتے تھے۔ مالِ غنیمت میں ان کا حصہ یا تو (سب کے لئے) یکساں ہونا چاہیے تھا یا ان کی خدمات کے مطابق۔ لیکن حضورؐ نے اصول یہ طے فرمایا کہ ہر ایک کو اس کی ضروریات کے مطابق حصہ دیا جائے۔ (بخاری، کتاب الجہاد) اور عملاً اس کا مظاہرہ یوں ہوتا تھا کہ مجرّد (غیر شادی شدہ) کو ایک حصہ ملتا تھا اور اہل و عیال والے کو دو حصے (ابوداؤد، کتاب الخراج والامارہ) ہم آگے چل کر دیکھیں گے کہ جب بعد میں، مالِ غنیمت کو اس طرح تقسیم کرنے کے بجائے، افرادِ مملکت کے وظائف مقرر کر دینے کا طریق اختیار کیا گیا تو اس کے لئے بھی اسی اصول کو بنیاد قرار دیا گیا۔ یعنی وظیفہ ہر ایک کی ضروریات کے مطابق، نہ کہ خدمات کے تناسب سے!

اراضیات کا بندوبست

خالقِ کائنات نے انسان کو پیدا کیا تو جن چیزوں پر اس کی زندگی اور پرورش کا دارومدار تھا انہیں بھی ساتھ ہی مہیا کر دیا ــــ "ساتھ ہی" نہیں، بلکہ یوں کہیے کہ انسانوں کی پیدائش سے بھی بہت پہلے۔ پانی، ہوا، روشنی، حرارت، سب، انسان کی پیدائش سے بھی پہلے، دنیا میں بکھرے ہوئے تھے اور خدا کی طرف سے بلا معاوضہ (بطورِ موہبت) عطا ہوئے تھے لیکن ان کے ساتھ، انسان کو خوراک کی بھی ضرورت تھی۔ اس کے خزانے زمین (ارض) میں مدفون تھے اور زمین بھی خدا کی طرف سے بلا مزد و معاوضہ عطا ہوئی تھی۔ شروع شروع میں دنیا میں انسانوں کی آبادی بہت کم تھی اور زمین کی قدرتی پیداوار اس کثرت سے کہ کسی کے دل میں یہ سوال ہی پیدا نہیں ہو سکتا تھا کہ مجھے بھوک لگی تو میں کھاؤں گا کہاں سے۔ قرآنِ کریم نے انسانوں کی

اوّلین جنّتِ ارضی

اس اوّلین زندگی کو "جنّتِ ارضی" کہہ کر پکارا ہے جس میں کیفیت یہ تھی کہ وَ كُلَا مِنۡهَا رَغَدًا حَيۡثُ شِئۡتُمَا۔ (۲/۳۵) جہاں کسی کو بھوک لگے

اسے پیٹ بھر کر کھانے کو مل جاتا تھا۔ ذرا آگے بڑھے تو اس کی ضرورت محسوس ہوئی کہ زمین کھود کر (بذریعہ کاشت) اس کے اندر سے غذا برآمد کی جائے۔ اس سے انسانوں کی زرعی معیشت کا دور شروع ہوا۔ زمین کھلی پڑی تھی۔ ہر شخص، یا ہر خاندان اور قبیلہ اپنی اپنی ضرورت کے مطابق اسے کاشت کر کے خوراک حاصل کر لیتا تھا۔

کہا جاتا ہے کہ انسانی تاریخ میں وہ دن سب سے زیادہ منحوس تھا جب کسی غلام نے اپنے آقا کو اتنا کما کر لا دیا جو اُس سے زیادہ تھا جتنا وہ آقا اُس غلام پر صرف کرتا تھا۔ اس سے ایک انسان دوسرے انسان کے لئے آمدنی کا ذریعہ بن گیا۔ اسی سے نظام سرمایہ داری کی پہلی اینٹ رکھی گئی۔

نظامِ سرمایہ داری کی ابتداء

وہ صنعتی دَور نہیں تھا کہ غلاموں کے مالک ان سے کچھ چیزیں بنوا کر، اپنے لئے آمدنی حاصل کرتے۔ وہ زرعی معیشت کا دور تھا اس لئے وہ اپنے غلاموں سے زمین ہی کاشت کرا سکتے تھے۔ اس مقصد کے لئے صاحبِ اقتدار لوگوں نے زمین پر لکیریں کھینچ کر "میری زمین اور تیری زمین" کا انسانیت کُش تصور وضع کیا۔ اس سے "خدا کی زمین" خدا کے بندوں کے لئے عام نہ رہی، انسانوں کی ملکیت بن گئی۔ قرآن نے اس انسانیت سوز تصور کا نہایت سختی سے ابطال کیا اور زمین (یعنی سرچشمۂ رزق) پر ذاتی ملکیت کو انسانیت کے خلاف سنگین جرم قرار دیا۔ (تفصیل اس اجمال کی سابقہ صفحات میں گزر چکی ہے۔)

قرآنِ کریم نے جو اصول دیا (کہ زمین پر انفرادی ملکیت نہیں ہو سکتی، اسے مملکت کی تحویل میں رہنا چاہیئے تاکہ وہ اس کا انتظام اس طریق سے کرے جس سے تمام افرادِ معاشرہ کو سامانِ زیست مہیا ہوتا رہے) اسے اسلامی مملکت نے عمل میں لانا تھا لیکن (جیسا کہ پہلے بتایا جا چکا ہے) انسانی معاشرہ میں اس قسم کی بنیادی تبدیلی شباشب نہیں لائی جا سکتی۔ اسے حالات کے تقاضے کے مطابق، بتدریج عمل میں لایا جا سکتا ہے۔ اسی اصول کے مطابق حضورؐ نبی اکرم نے اس انقلاب کی ابتداء فرمائی۔ مکہ تو وادیٔ غیر ذی زرع (بے برگ و گیاہ زمین) تھی۔ اس لئے وہاں زرعی اصلاحات کا سوال پیدا نہیں ہوتا تھا۔ ویسے بھی وہاں اسلامی مملکت کا آغاز نہیں ہوا تھا۔ مدینہ میں انصار کے پاس زرعی زمین کے چھوٹے چھوٹے قطعات تھے، جن میں وہ کاشت کرتے تھے۔ اسی لئے اس انقلاب کی ابتداء وہاں سے ہوئی۔ اس سلسلہ میں حضورؐ نے اصولی طور پر اعلان فرمایا کہ۔

انّ الارض ارض اللّٰہ۔ و العباد عباد اللّٰہ۔ (ابوداؤد)

زمین بھی اللہ کی ہے اور انسان بھی اللہ کے بندے ہیں، اس لئے اللہ کی زمین اللہ کے بندوں کے لئے رہنی چاہیئے۔

چونکہ زیرِ نظر کتاب کا اساسی موضوع عہدِ فاروقیؓ سے متعلق ہے، اس لئے ہم اس مقام پر ان اصلاحات کی تفصیل میں نہیں جانا چاہتے جنہیں حضور نبی اکرمؐ نے آہستہ آہستہ نافذ فرمایا۔ مختصراً یہ سمجھ لیجئے کہ حضورؐ نے اس طریق کی ممانعت فرمادی جس کی رو سے ایک شخص زمین کا مالک قرار پاتا تھا اور دوسرا شخص اس کی زمین میں کاشت کرتا تھا اور اس کے عوض مالکِ اراضی اس مزارع سے یا زمین کی پیداوار میں سے ایک حصہ (بٹائی) لے لیتا تھا یا نقد کرایہ (پٹہ)۔ اسے اصطلاح میں مزارعت کہتے تھے جو ہمارے ہاں عام ہے (بلکہ یوں کہیے کہ مسلمانوں میں صدیوں سے مسلسل چلا آرہا ہے) حضورؐ نے اصولاً یہ فیصلہ صادر فرمایا کہ:۔

جس شخص کے پاس زمین ہو وہ اس میں خود کاشت کرے یا اپنے بھائی کو مفت دے دے[1]۔

(مسلم، ابوداؤد وغیرہ)

اس فیصلہ کی عملی تنفیذ کے سلسلہ میں ہمیں کتبِ احادیث میں متعدد روایات ملتی ہیں۔ مثلاً حضرت ابن ابی نعیمؒ کی روایت ہے کہ:۔

رافع بن خدیجؓ نے ایک زمین پر کاشت کی۔ وہ اسے پانی دے رہے تھے کہ حضورؐ کا گزر اُدھر سے ہوا۔ آپؐ نے دریافت فرمایا کہ یہ زمین کس کی ہے اور کھیتی کس کی۔ رافعؓ نے کہا کہ یہ کھیتی میرے بیج اور میری محنت کا نتیجہ ہے۔ اس کا ایک حصہ میرا ہوگا اور ایک حصہ فلاں خاندان کا جس کی یہ زمین ہے۔ حضورؐ نے فرمایا تم دونوں سودی کاروبار کر رہے ہو۔ زمین صاحبِ زمین کو واپس کردو اور اپنا خرچہ اس سے وصول کرلو۔ (ابوداؤد)

حضورؐ کے اس فیصلہ کی تشریح میں نسائی میں یہ تصریح آئی ہے۔

رسولؐ اللہ سے سوال کیا گیا کہ کیا زمین کا مالک کاشتکار سے تھوڑا بہت اناج بھی نہیں لے سکتا۔

---

[1] بعض روایات میں ہے کہ آپؐ نے فرمایا تھا کہ زمین کو خود کاشت کرے یا اپنے بھائی کو مفت دیدے یا روکے رکھے۔ یہ آخری الفاظ بطورِ تہدید نظر آتے ہیں۔ اتنا بہرحال واضح ہے کہ حضورؐ نے زمینوں کو بٹائی پر دینے یا فروخت کرنے سے منع کردیا تھا۔

فرمایا' نہیں۔ پھر سوال کیا گیا کہ اچھا غلّہ نہ سہی، بھوسہ تو لے سکتا ہے۔ فرمایا بالکل نہیں۔

جس انقلاب کی ابتدا اس طرح ہوئی تھی وہ عہدِ فاروقی میں کئی منزلیں آگے بڑھ کر وہاں پہنچ گیا تھا جہاں اراضیات کو مملکت اپنی تحویل میں لے لیتی ہے۔ یہ سوال اس وقت زیرِ غور آیا جب شام اور عراق کا علاقہ فتح ہوا۔ عراق میں دجلہ و فرات کی وادیاں صحیح معنوں میں زرخیز (سونا اگلنے والی) تھیں۔ اس قسم کی اس قدر وسیع اراضیات جب مفتوحہ قرار پائیں تو ان کی تقسیم کا سوال سامنے آیا۔ اس سے پیشتر مفتوحہ زمینوں کو بھی مالِ غنیمت قرار دیا جاتا تھا۔ اس لئے وہ سپاہیوں میں تقسیم کردی جاتی تھیں۔ اگر حضرت عمرؓ ان اراضیات کو بھی حسبِ دستورِ

شام و عراق کی اراضیات کا مسئلہ

سابق، سپاہیوں میں تقسیم کر دینا چاہتے تو اس کے لئے کسی غور و فکر اور بحث و تمحیص کی ضرورت نہیں تھی۔ لیکن ان کا خیال اس سے مختلف تھا اس لئے انہوں نے ضرورت سمجھی کہ اسے مجلسِ مشاورت میں پیش کیا جائے۔ چونکہ یہ سوال بڑا اہم ہے —— اس حیثیت سے بھی کہ اس میں، اُس فیصلہ کے خلاف فیصلہ کیا گیا جو عہدِ رسالت مآبؐ اور دورِ صدیقیؓ میں نافذ العمل تھا' اور اس جہت سے بھی کہ معاشیات کے سلسلہ میں یہ ایک اہم سنگِ میل کی حیثیت رکھتا ہے، اس لئے ہم نے مناسب سمجھا ہے کہ اس کے متعلق جو بحث ہوئی تھی اُسے پوری تفصیل کے ساتھ درج کر دیا جائے۔ حضرت عمرؓ نے جب "غیر رسمی طور پر" صحابہؓ کے سامنے اپنی رائے کا اظہار فرمایا تو آپ نے دیکھا کہ جہاں اکثر صحابہؓ آپ سے متفق تھے، بعض کو اس سے اختلاف بھی تھا۔ ان (مؤخر الذکر) میں حضرت عبدالرحمٰن بن عوفؓ اور حضرت بلالؓ جیسے حضرات خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ ان کے اختلاف کا ذکر کرتے ہوئے، حضرت عمرؓ نے مجلسِ مشاورت کے سامنے اپنی تقریر میں فرمایا۔

> یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ میں زمین کو آپ لوگوں میں تقسیم کر دوں اور بعد کے لوگوں کو ایسی حالت میں چھوڑ دوں کہ اس میں ان کا کچھ حصہ نہ رہے۔ کیا آپ لوگوں کا مقصد یہ ہے کہ اس کی آمدنی ایک طبقہ میں سمٹ کر رہ جائے اور نسلاً بعد نسلٍ اسی طبقہ میں منتقل ہوتی رہے۔ اگر میں نے ایسا کر دیا تو سرحدوں کی حفاظت کس مال سے کی جائے گی۔ بیواؤں اور حاجت مندوں کی کفالت کہاں سے ہوگی۔ مجھے اس کا بھی اندیشہ ہے کہ بعض لوگ پانی کے بارے میں بھی فساد کرنے لگیں گے۔

اس کی تائید میں حضرت علیؓ نے تقریر کی جس میں فرمایا۔

> میری رائے ہے کہ کاشتکاروں اور اراضی کو جوں کا توں رہنے دیجئے تاکہ یہ (اراضیات) سب لوگوں کے

لئے یکساں معاشی قوت کا ذریعہ ہوں۔ (فوجوں میں زمین تقسیم کرنے سے یہ انہی میں سمٹ کر رہ جائے گی)

حضرت معاذؓ نے فرمایا:۔

اگر آپ نے زمینیں تقسیم کردیں تو زرخیز زمینوں کے بڑے بڑے ٹکڑے فوج میں بٹ جائیں گے۔ پھر ان کے مرنے کے بعد کسی کی وارث کوئی عورت ہو گی اور کسی کا وارث کوئی اکیلا مرد۔ اس کے علاوہ سرحدوں کی حفاظت اور فوجیوں کی کفالت کے لئے حکومت کے پاس کچھ نہیں رہے گا۔ اس لئے آپ کو وہ کام کرنا چاہیئے جس میں آج کے لوگوں کے لئے بھی فائدہ اور سہولت ہو اور بعد میں آنے والوں کے لئے بھی۔

اس تجویز کی مخالفت میں، حضرت عبدالرحمٰن بن عوفؓ اور حضرت بلالؓ نے جو تقاریر فرمائیں، ان کا ملخّص یہ تھا کہ:۔

جو مال اللہ نے ہمیں غلبہ سے عطا فرمایا ہے۔ وہ ہم لوگوں میں تقسیم ہونا چاہیئے اسی طرح جس طرح رسول اللہؐ نے خیبر تقسیم کردیا[ل]۔ یہ کسی طرح مناسب نہیں کہ جو لوگ اس وقت موجود نہیں، ان کے بیٹوں اور پوتوں کے خیال سے ہماری حق تلفی کی جائے۔ ہم اپنی اولاد کے لئے ہیں اور بعد والے اپنی اولاد کے لئے۔

حضرت عبدالرحمٰن بن عوفؓ نے امیر المومنین کو مخاطب کر کے متعیّن طور پر پوچھا کہ

کیا یہ اراضی اور ان کے غیر مسلم مالک، اللہ نے ہمیں فتح کے نتیجہ میں نہیں دیئے۔

اس کے جواب میں حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ:۔

اے عبدالرحمٰن! بات وہی ہے جو آپ فرماتے ہیں لیکن میں ان اراضیات کی تقسیم کے حق میں نہیں کیونکہ میں دیکھ رہا ہوں کہ اب میرے بعد کوئی ایسا ملک فتح نہیں ہو گا جس سے مسلمانوں کو اتنا نفع حاصل ہو جتنا اب تک ہو چکا ہے۔ بلکہ (یہ بھی ممکن ہے کہ) آیندہ فتح ہونے والے علاقے مسلمانوں پر بار ثابت ہوں۔ سو اگر شام اور عراق کی اراضیات موجودہ مسلمانوں میں تقسیم کر دی گئیں تو آئندہ اسلامی سرحدوں

ل خیبر کی اراضی کے معاملہ میں بھی تاریخ میں بڑا الجھاؤ ہے لیکن چونکہ اس کا تعلق عہدِ فاروقی سے نہیں اس لئے ہم اسے زیرِ بحث نہیں لانا چاہتے۔

کی حفاظت کے لئے مال کہاں سے آئے گا اور آج کے بعد فتح ہونے والے علاقوں کے یتیم اور بیواؤں کی کفالت کیونکر کی جاسکے گی۔!

لیکن یہ حضرات اس پر بھی حضرت عمرؓ کی تجویز سے متفق نہ ہوئے۔ لہٰذا طے پایا کہ اس مسئلہ پر مجلسِ مشاورت کی آئندہ نشست میں غور کیا جائے۔ اس مجلس کی دوسری نشست میں انصار کے قبیلہ اوس و خزرج کے ممتاز عمائد کو بھی دعوت شرکت دی گئی کیونکہ وہ اراضیات کے معاملہ میں، مہاجرین کے مقابلہ میں بہتر تجربہ رکھتے تھے۔ اس نشست کا افتتاح کرتے ہوئے حضرت عمرؓ نے فرمایا۔

میں نے آپ حضرات کو اس لئے دعوت دی ہے کہ جس بارِ امانت کو آپ نے میرے سر پر رکھا ہے اس کی ادائیگی میں آپ میری اعانت فرمائیں۔ اس وقت مجلس میں میری حیثیت خلیفہ کی نہیں بلکہ آپ میں سے ایک فرد کی سی ہے۔ اس لئے آپ میں سے ہر شخص کو اپنی رائے آزادی سے پیش کرنے کا حق حاصل ہے۔ میں نے جو تجویز پیش کی تھی اس میں بعض حضرات نے میری مدافعت کی تھی اور بعض نے مخالفت۔ مجھے نہ اس پر ملال ہے کہ اس باب میں کس نے میری مخالفت کی ہے، نہ اس پر فخر کہ کس نے میری موافقت کی۔ میں ہرگز نہیں چاہتا کہ آپ حضرات میری مرضی کا اتباع کریں، اور جسے آپ حق سمجھتے ہیں، اُسے میری خاطر چھوڑ دیں۔ میں آپ کی توجہ اس بات کی طرف مبذول کرانا چاہتا ہوں جسے میں حق سمجھتا ہوں۔ (لیکن حق کا معیار نہ آپ کی رائے ہے نہ میری۔ حق کا معیار خدا کی کتاب ہے) اور یہ کتاب جس طرح میرے پاس موجود ہے، اسی طرح آپ کے پاس بھی ہے۔ یہی ناطق بالحق ہے۔ آپ اسے سامنے رکھ کر جواب دیں کہ اس باب میں اس کا فیصلہ کیا ہے۔ اس پر عمل کرنا ہم سب کا فرض ہوگا۔

آپ نے یہاں تک فرمایا تھا کہ آوازیں آنے لگیں "اے امیرالمومنین! ہمیں تسلیم ہے کہ جو کچھ آپ کرنا چاہتے ہیں وہی مناسب ہے"۔ حضرت عمرؓ نے تقریر جاری رکھتے ہوئے فرمایا۔

آپ نے میرے ان دوستوں کی آوازیں سنی ہوں گی جو اس باب میں میری مخالفت کرتے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ میں شاید ان کی حق تلفی کرنا چاہتا ہوں حالانکہ میرے نزدیک کسی فرد کی بھی حق تلفی کرنا جائز نہیں۔ خدا شاہد ہے کہ میں نے آج تک کسی شخص کے جائز حق پر تصرّف کر کے اس پر ظلم نہیں کیا۔ یہ حضرات خود گواہ ہیں کہ مالِ منقولہ میں نے فوجیوں میں تقسیم کر دیا حتیٰ کہ خُمس بھی اس کے مناسب موقعہ پر صرف کر دیا ہے۔ اب سوال زمین کا ہے۔ اس بارے میں میرا خیال یہ ہے کہ اسے تقسیم نہ کیا جائے۔

(اسے مملکت کی تحویل میں رہنے دیا جائے. اس کے انتظام کے متعلق میں نے سوچا ہے کہ اسے موجودہ کاشت کاروں کے پاس رہنے دیا جائے اور ان سے خراج وصول کر لیا جایا کرے، تاکہ یہ آمدنی اجتماعی مفاد کے کام میں لائی جاسکے اور اس کے ذریعے فوج کے اخراجات نیز موجودہ اور بعد میں آنے والی نسلوں نسلوں کی پرورش کا سامان مہیا کیا جائے. آپ حضرات خود سوچئے کہ کیا یہ ممالک سرحدوں کی حفاظت کے بغیر بیرونی حملوں سے محفوظ رہ سکیں گے؟ آخر، جزیرہ، بصرہ، کوفہ، عراق، شام، مصر وغیرہ کے بڑے بڑے شہروں میں فوجیوں کی چھاؤنیاں نہیں بنانی پڑیں گی؟ آخر ان کا خرچ کہاں سے پورا کیا جائے گا؟

اس مقام پر دو قسم کی روایات سامنے آتی ہیں. ایک یہ کہ آپ نے سورۃ حشر کی ان آیات سے جن کا ذکر اب کیا جائے گا، اسی مجمع میں استدلال فرمایا تھا جس پر تمام حضرات متفق ہو گئے اور بعض روایات میں ہے کہ یہاں بھی اختلاف ہوا تو آپ نے مزید غور و فکر کے لئے تین دن کی مہلت طلب کی اور اس دوران میں قرآنِ مجید پر گہری سوچ میں ڈوبے رہے. تیسرے دن جب پھر مجلس کا انعقاد ہوا تو آپ نے فرمایا کہ میں نے کتاب اللہ پر مزید غور و فکر کیا تو للہ الحمد کہ مجھے اس سے اپنی تجویز کے حق میں راہ نمائی مل گئی. اس کے بعد آپ نے سورۃ حشر کی آیات (۱۰۔ ۵۹/۷) تلاوت فرمائیں اور کہا کہ دیکھئے، ان میں مالِ فے کے متعلق اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ اس میں

(۱) مہاجرین کا حق ہے — مہاجرین میں، جنگ میں شرکت کرنے والوں اور شرکت نہ کرنے والوں میں کوئی تخصیص و تمیز نہیں کی گئی. صرف احتیاج (ضرورت مندی) کو شرط قرار دیا گیا ہے.

(۲) انصار کا حق ہے اور ان میں بھی مندرجہ بالا تفریق نہیں کی گئی.

ان دونوں کے بعد کہا گیا ہے:

وَالَّذِيْنَ جَآءُوْا مِنْۢ بَعْدِهِمْ ۔ (۵۹/۱۰)

اور ان لوگوں کا بھی حق جو ان کے بعد آئیں.

روایات میں ہے کہ حضرت عمرؓ کی طرف سے اس قرآنی استدلال کو سن کر صحابہؓ کے چہرے خوشی سے تمتما اٹھے اور وہ (مخالفین و موافقین سب) جوشِ مسرت سے بیک زبان پکار اٹھے کہ

آپ کی رائے بالکل درست ہے. ہم سب آپ سے متفق ہیں.

اس طرح اس مشکل ترین اور اہم ترین معاملہ کا فیصلہ نہایت خوش اسلوبی سے طے پا گیا۔

آگے بڑھنے سے پیشتر، ضروری معلوم ہوتا ہے کہ اس واقعہ سے جو اہم اصولی نتائج مستنبط ہوتے

مستنبط نتائج

ہیں، ان پر غور کر لیا جائے ـــــ ان تاریخی واقعات کو سامنے لانے کا حقیقی مقصد ہی یہ ہے۔ وہ اصولی نتائج یہ ہیں کہ:۔

(۱) اسلامی نظامِ مملکت کی رُو سے، قرآنِ کریم کے عطا کردہ اصول تو ابدی طور پر غیر متبدل رہتے ہیں، لیکن ان اصولوں کی جزئیات، اور ان پر عمل کرنے کے طریق، حالات کے مطابق بدلے جا سکتے ہیں۔ آپ دیکھتے ہیں کہ عہدِ فاروقیؓ کی اسلامی حکومت نے، اس اہم مسئلہ میں جو فیصلہ کیا وہ اس سے مختلف تھا جس پر عہدِ رسالت مآبؐ اور دورِ صدیقیؓ میں عمل ہوتا رہا۔ اس فیصلہ کے متعلق صحابہؓ میں سے کسی نے بھی یہ اعتراض نہیں کیا کہ ایسا کرنا خلافِ سنت ہے اور اسے صحیح سمجھنا انکارِ رسالت ہے۔ جیسا کہ پہلے بھی (نویں باب میں) بہ تفصیل بیان کیا جا چکا ہے، تاریخ میں اس قسم کی متعدد مثالیں مذکور ہیں جن کی رو سے، حضرت عمرؓ نے اپنے سے پہلی حکومتوں کے فیصلوں میں تبدیلی کر دی اور بعض امور میں نئے فیصلے بھی دیئے۔ یہی طریق آج کی "اسلامی حکومت" بھی اختیار کرے گی، جو جب اور جہاں بھی قائم ہو گی۔ یعنی وہ قرآنی اصولوں کی جزئیات کی تعیین میں صاحبِ اختیار ہو گی کہ اپنے زمانے اور حالات کے مطابق جس قسم کا جزئی قاعدہ چاہے، مرتب اور نافذ کرے۔

(۲) اس قسم کا فیصلہ کرنے کا حق کسی فرد کو حاصل نہیں ہوتا۔ حتیٰ کہ امیر المومنین کو بھی (انفرادی حیثیت سے) نہیں۔ اس کا فیصلہ امت کی مجلسِ مشاورت میں بحث و تمحیص کے بعد ہو سکتا ہے۔

(۳) مجلسِ مشاورت میں سربراہِ مملکت کی حیثیت بھی دیگر ارکان جیسی ہوتی ہے اور ہر رکن کو آزادیٔ رائے کا حق حاصل ہوتا ہے۔

(۴) اختلافی امور کے فیصلہ کا معیار یہ ہے کہ خدا کی کتاب اس باب میں کیا راہ نمائی دیتی ہے۔

(۵) اس راہ نمائی کے سامنے آجانے پر، تمام اختلافات ختم ہو جاتے ہیں اور مخالف، موافق سب اس کے سامنے سرِ تسلیم خم کر دیتے ہیں۔ اور

(۶) اسلامی حکومت میں "علماء" کا کوئی الگ گروہ نہیں ہوتا جن سے اختلافی معاملات میں فتوے مانگا جائے۔ اس میں تمام امور کے فیصلے حکومت کرتی ہے اور انہی فیصلوں کو، جو قانون کی حیثیت سے نافذ کئے جاتے ہیں، "شریعتِ اسلامی" کہہ کر پکارا جاتا ہے۔

اراضیات کے متعلق مذکورہ بالا فیصلہ اصولی حیثیت رکھتا ہے، اس لئے اس کا اطلاق عراق اور شام کی زمینوں تک محدود نہیں رہا۔ مصر کی زمینوں پر بھی یہی فیصلہ نافذ کیا گیا۔ اس فیصلہ کا اعلان حضرت عمرؓ نے ان مختصر اور جامع الفاظ میں فرما دیا کہ

لنا رقاب الارض

تمام زمینیں ہماری (یعنی حکومت) کی ہیں۔ (کتاب الاموال)

اسی بناپر، حکومت کو حق حاصل ہوتا ہے کہ وہ مفادِ عامہ (یعنی ربوبیتِ عامہ) کے پیشِ نظر، اراضیات کا جو انتظام مناسب سمجھے، کرے۔ قادسیہ (ایران) کی لڑائی میں، قوم بجیلہ کے کافی افراد جنگ میں شریک تھے۔ فتح کے بعد، حضرت عمرؓ نے وہاں کی زمینوں میں سے خاصا رقبہ ان افراد کو دے دیا لیکن دو تین سال کے بعد، جب حکومت کو ضرورت پڑی، تو ان سے یہ قطعات واپس لے لئے گئے۔ (کتاب الاموال)۔ لوگوں کو جو رقبے اس طرح

زمینیں واپس بھی لی جا سکتی ہیں

دیئے جاتے تھے انہیں قطائع کہا جاتا تھا۔ قطائع کے متعلق اصول یہ تھا کہ یہ کسی خاص مقصد (بالخصوص افتادہ زمین کو آباد کرنے) کے لئے دیئے جاتے تھے اور حکومت کو اس کا حق حاصل ہوتا تھا کہ وہ جب مناسب سمجھے انہیں واپس لے لے۔ چنانچہ تاریخ میں ایسے واقعات بھی ملتے ہیں کہ جن لوگوں کو خود رسول اللہ نے قطائع عطا فرمائے تھے، مفادِ مملکت کے پیشِ نظر حضرت عمرؓ نے ان میں سے بعض کو واپس لے لیا۔ (مثلاً) رسول اللہ نے وادیٔ عقیق میں ایک قطیعہ حضرت بلالؓ بن حارث کو، جو حضورؐ کے قریب ترین صحابہ میں سے تھے، دے رکھا تھا۔ حضرت عمرؓ نے ان سے کہا کہ رسول اللہ نے آپ کو یہ زمین اس لئے نہیں دی تھی کہ اسے نہ آپ خود آباد کریں، نہ دوسروں کو آباد کرنے دیں۔ لہٰذا، جتنی زمین آپ آباد کر سکیں، اپنے پاس رکھیں، باقی زمین حکومت کے حوالے کر دیں۔ یہ سنکر حضرت بلالؓ نے کہا کہ جو زمین مجھے رسول اللہ نے عطا فرمائی تھی میں اسے واپس نہیں کرونگا خواہ میں اسے آباد کروں یا نہ کروں۔ حضرت عمرؓ نے زمین کی واپسی پر اصرار کیا اور آباد شدہ حصہ کو چھوڑ کر باقی زمین واپس لے لی۔ اسی بنا پر حضرت عمرؓ نے اعلان کر دیا تھا کہ جو شخص زمین آباد نہیں کرے گا، اس سے وہ زمین واپس لے لی جائے گی۔ جن لوگوں کے پاس زمین رہے گی ان سے حکومت مفادِ عامہ کے سلسلہ میں کیا لیگی، اس

لہ زمین کو بے آباد رکھنا تو ایک طرف، مولانا جامیؔ نے نفحات الانس میں شیخ علاؤالدین سمنانیؒ کا یہ قول نقل کیا ہے کہ جو شخص زمین کا ایسا قطعہ رکھتا ہے جس سے ہزار من غلہ حاصل ہو سکتا ہے، اگر اس کی سستی اور کوتاہی سے اس سے نو سو من غلہ حاصل ہوا اور اس وجہ سے مخلوقِ خدا سو من غلہ سے محروم ہو گئی تو قیامت کے دن اس سے اس کی باز پرس ہو گی۔

کے لئے حضرت علیؓ نے فرمایا تھا کہ :۔

حکومت صرف وہ لے سکتی ہے جو کاشت کار کی ضروریات سے زاید ہو۔

یہ فیصلہ، قرآنِ کریم کے اس اصول کی ترجمانی کر رہا ہے جس میں کہا گیا ہے کہ " لوگ تم سے پوچھتے ہیں کہ ہم دوسروں کی ضروریات کے لئے کتنا دیں ___ قل العفو ___ ان سے کہو کہ جس قدر تمہاری اپنی ضروریات سے زاید ہو، وہ سب۔" (۲/۲۱۹)

اس زمانے میں، مویشی پالنا، نظامِ معیشت میں بڑی اہمیت رکھتا تھا۔ اس مقصد کے لئے چراگاہوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ ان کے متعلق حضورؐ نے فرمادیا تھا کہ :۔

چراگاہیں

لا حمیٰ الا للہ و رسولہٗ۔

چراگاہیں صرف خلافت کی ہیں۔ (بخاری)

حضرت عمرؓ نے، نہ صرف یہ کہ پہلی چراگاہوں کو مفادِ عامہ کے لئے کھلا رکھا بلکہ ان میں اضافہ بھی فرمایا۔ ان چراگاہوں کے متعلق تاکید تھی کہ ان میں غریبوں کے مویشی چریں چگیں۔ جن صاحب ثروت کے ہاں اپنا انتظام ہے ان کے جانور ان "پبلک چراگاہوں" میں نہ آئیں۔ (حضرت) اسلمؓ کی روایت ہے کہ حضرت عمرؓ نے ایک کارندے ہنیؓ کو پبلک چراگاہ کا محافظ مقرر فرمایا اور اسے تاکید کی کہ :۔

جو لوگ غریب ہیں، ان کے جانوروں کو یہاں چرنے دو۔ دیکھو (صاحبِ ثروت مثل) عثمانؓ بن عفان اور عبدالرحمٰن بن عوفؓ کے اونٹ یہاں داخل نہ ہونے پائیں کیونکہ اگر ان کے جانوروں کو چارے کی ضرورت ہوگی تو ان کے لئے بہت سی کھیتیاں اور کھجوروں کے درخت موجود ہیں لیکن اگر غریبوں کے جانور بھوکے مرنے لگے تو وہ سوائے اس کے کہ میرے پاس واویلا کرتے ہوئے آئیں اور کیا کر سکیں گے۔

حضرت عمرؓ ان چراگاہوں کی حفاظت خود کیا کرتے تھے اور دیکھتے تھے کہ کسی نے ان کے گھاس چارہ یا درختوں کو نقصان تو نہیں پہنچایا۔

جب حضرت عمرؓ نے مدینہ کی چراگاہ کو سرکاری تحویل میں لیا اور اس پر نگران مقرر کر دیئے تو ایک بدوی نے آکر آپ سے شکایت کرتے ہوئے کہا کہ " اے عمرؓ! کیا ہم نے اسلام کی خاطر اس لئے لڑائیاں

لڑی ہیں کہ آپ ان چیزوں کے استعمال پر ہماری نگرانی کریں"؟ اس پر آپ خفا ہوئے اور اس سے کہا کہ سُن رکھو!

مال اللہ کا مال ہے اور بندے اللہ کے بندے ہیں۔ اس لئے میں ایسا نہیں کر سکتا (کہ انہیں ضرورت مندوں کے لئے مختص نہ کردوں)

باقی رہے چشمے، سو ان کا پانی تو کوئی روک ہی نہیں سکتا تھا۔ ایک دفعہ ایک شخص نے آکر شکایت کی کہ میری زمین تک پانی پہنچنے کا ایک ہی راستہ ہے لیکن جس شخص کی زمین سے وہ راستہ گزرتا ہے وہ مجھے اس میں سے پانی نہیں لے جانے دیتا۔ آپ نے اس شخص کو بلایا اور اس سے ڈانٹ کر کہا کہ تجھے پانی کے لئے راستہ دینا ہوگا۔

پانی روکا نہیں جاسکتا

یہ تو تیری زمین ہے۔ اگر پانی کا راستہ تیرے پیٹ کے سوا کوئی اور نہیں ہوگا تو وہ تیرے پیٹ کے اوپر سے پانی لے جائے گا۔

(۵)

بات اساساً اراضیات کی ہو رہی تھی۔ آپ نے اراضیات کو مملکت کی تحویل میں لے کر ان کی سرِ نو پیمائش کرائی۔ زمین کی حیثیت اور نوعیت کے اعتبار سے اس کی قسمیں مقرر کیں اور پھر اسی نسبت سے ان کا خراج (لگان) مقرر کیا۔ اس حسنِ انتظام کا نتیجہ یہ ہوا کہ مملکت کے خراج میں محیّر العقول اضافہ ہو گیا۔

مملکت کی آمدنی بے انتہا بڑھ گئی

جب حضرت ابوہریرہؓ بحرین کا خراج لیکر آئے تو حضرت عمرؓ نے ان سے پوچھا کہ کیا لائے ہو؟ انہوں نے کہا کہ پانچ لاکھ۔ آپ نے کہا کہ کچھ جانتے بھی ہو کہ کیا کہہ رہے ہو! حضرت ابوہریرہؓ نے کہا کہ ایک لاکھ ایک لاکھ (اسے پانچ بار دہرایا) حضرت عمرؓ نے کہا کہ تھکے ہوئے معلوم ہوتے ہو۔ نیند کا خمار ہے۔ جاؤ جاکر بال بچوں میں سوؤ، صبح آنا۔ یہ صبح گئے تو پانچ لاکھ پیش کر دیئے۔ یہ ایک علاقہ کا خراج تھا! اس سے مملکت کی کل آمدنی کا اندازہ لگائیے۔

لیکن مملکت کی اس قدر مرفہ الحالی، صرف حسنِ انتظام کا نتیجہ نہیں تھی۔ اس کے ساتھ (بلکہ بنیادی طور پر اس میں) سربراہِ مملکت کی دیانت و امانت بھی شامل تھی۔ اس باب میں حضرت عمرؓ کس حد تک متشدد تھے، اس کا اندازہ ہم ان واقعات سے لگا سکتے ہیں جو گذشتہ ابواب میں ہماری نظر سے گزر چکے ہیں۔ اس وقت

ہم ان میں صرف ایک واقعہ کا اضافہ کرنا چاہتے ہیں۔ امام مالکؒ اور امام شافعیؒ کی روایت ہے کہ ایک صاحب حضرت عمرؓ کے پاس تھوڑا سا دودھ لائے جسے پی کر آپ خوش ہوئے۔ اس سے پوچھا کہ یہ دودھ تم کہاں سے لائے ہو۔ اس نے کہا کہ فلاں چشمہ پر صدقہ (بیت المال) کے اونٹ جمع تھے اور نگران ان کا دودھ دوہ رہے تھے۔ اس میں سے انہوں نے مجھے بھی دے دیا۔ یہ سنتے ہی حضرت عمرؓ نے حلق میں انگلی ڈالی اور قے کر کے دودھ نکال دیا اور فرمایا کہ بیت المال سے کچھ بھی بلا قیمت لینا جائز نہیں قرار پا سکتا۔

سربراہِ مملکت کی اپنی اس احتیاط کا نتیجہ تھا کہ دیگر عمالِ حکومت بھی اس قدر امین اور دیانتدار تھے اور اسی امانت و دیانت کے ساتھ حسنِ انتظام کا نتیجہ تھا کہ مملکت میں زر و مال کی اس قدر فراوانی تھی۔

(۰)

وظائف کا تعیّن

لیکن مملکت میں زر و مال کی فراوانی مقصود بالذات نہیں تھی۔ یہ ایک عظیم مقصد کا ذریعہ تھی۔ یہ پہلے بتایا جا چکا ہے کہ اسلامی مملکت کی بنیادی ذمّہ داری "ایتائے زکوٰۃ" (۲۲/۴۱) ہے۔ یعنی (ابتدائی) افرادِ معاشرہ (اور آخر الامر عالمگیر انسانیت) کو سامانِ نشو و نما بہم پہنچانا۔ ذرائع پیداوار کو مملکت کی تحویل میں لینا اور دیگر وسائلِ آمدنی میں نظم و ضبط پیدا کرنا اس مقصد کے حصول کا ذریعہ، یا مملکت کے لئے اس عظیم ذمّہ داری سے عہدہ برا ہونے کا موجب ہے۔ جو مملکت اس ذمّہ داری کو پورا نہیں کرتی، اس کے لئے ذرائع پیداوار کو اپنی تحویل میں لینا تو ایک طرف، کسی فردِ معاشرہ سے ایک حبّہ تک وصول کرنا بھی جائز نہیں قرار پا سکتا۔

ظاہر ہے کہ اس ذمّہ داری کا پورا کرنا، مملکت کے حالات کی نسبت سے ہی ہو سکتا ہے۔ حضورؐ نبئ اکرمؐ نے جب اس مملکت کی بنیاد ڈالی تو کیفیّت یہ تھی کہ ملک میں افلاس اور غربت کا دور دورہ تھا اور مملکت کی آمدنی نہ ہونے کے برابر۔ یہ تھے وہ حالات جن میں حضورؐ کے لب پر اکثر اس قسم کی دعائیں رہتی تھیں کہ:۔

پروردگار! یہ بھوکے ہیں تُو انہیں پیٹ بھر کر کھلا۔
یہ ننگے ہیں، تُو انہیں کپڑے پہنا۔

یہ پیدل سفر کرتے ہیں، تو انہیں سواری عطا فرما۔

ظاہر ہے کہ ان دعاؤں سے مقصد یہ تھا کہ مملکت کو اس قدر فراوانی حاصل ہو جائے کہ وہ ان محتاجوں اور ناداروں کی تمام ضروریاتِ زندگی مہیا کرنے کے قابل ہو جائے (جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا ہے) اس پروگرام کی منزلِ اوّل میں، یہ ضروریات، انفرادی طور پر، خوشحال لوگوں کے عطیّات (صدقات) کی رو سے پوری ہوتی تھیں لیکن انفرادی خیرات و صدقات کا جو نفسیاتی اثر ہوتا ہے، نگاہِ رسالتؐ اس سے بے خبر نہیں تھی۔

صدقہ کا نفسیاتی اثر

آپؐ اکثر فرمایا کرتے تھے کہ الصدقۃ تمیت القلب — صدقہ و خیرات انسان کے قلب کی موت ہیں۔ اسی لئے آپؐ فرمایا کرتے تھے کہ "کسی کا اپنی پشت پر بوجھ لادنا بہتر ہے اس سے کہ وہ دوسروں سے سوال کرے۔" (بخاری کتاب الزکوٰۃ) بنا بریں، حضورؐ نے کوشش فرمائی کہ حاجت مندوں کی ضروریات انفرادی خیرات کے بجائے، حکومت کی طرف سے پوری ہوا کریں۔ اس مقصد کے لئے آپؐ نے وظائف کا سلسلہ شروع فرمایا۔ وظائف کے تعیّن کے لئے حضورؐ نے اصول کیا اختیار فرمایا تھا، اس ضمن میں علامہ ابن القیم (زاد المعاد میں) لکھتے ہیں کہ:

> حضورؐ دولت مندوں اور غریبوں کو برابر برابر نہیں دیتے تھے، نہ ہی میراث کے قاعدے کے مطابق تقسیم فرماتے تھے۔ آپؐ ضرورت کے مطابق عطا فرماتے تھے۔ یعنی کنواروں کی شادی کرتے تھے — مقروضوں کا قرض ادا کرتے تھے اور غریبوں کو بقدرِ حاجت دیتے تھے۔

حضرت صدیق اکبرؓ کے عہد میں، مملکت کی آمدنی میں وسعت ہوئی تو آپ نے وظائف کے سلسلہ کو بھی اُسی نسبت سے آگے بڑھایا اور اصول بھی وہی برقرار رکھا جسے رسول اللہؐ نے اختیار فرمایا تھا۔ یعنی کسی قسم کی تخصیص و تمیز کے بغیر، ہر ایک کو اس کی ضرورت کے مطابق۔ اس پر بعض صحابہؓ نے (جن میں کہا جاتا ہے کہ حضرت عمرؓ بھی شامل تھے)

ہر ایک کی ضرورت کے مطابق

اعتراض کیا اور کہا کہ جن لوگوں نے اسلام قبول کرنے میں سبقت کی، اس کی خاطر اس قدر تکلیفیں برداشت کیں، ہجرت کی، جہاد کیئے، ان کے ساتھ ترجیحی سلوک ہونا چاہیئے۔ صدیق اکبرؓ نے ان کے جواب میں جو کچھ فرمایا، وہ اربابِ بصیرت کے لئے ابدی مشعلِ ہدایت ہے۔ آپ نے کہا کہ

> آپ لوگوں نے ان حضرات کی جس اولیّت و افضلیّت کا ذکر کیا ہے، میں اس سے بخوبی واقف

ہوں۔ انہیں اس کا اجر ان کے خدا کے ہاں سے ملے گا لیکن یہ معاش کا معاملہ ہے جس میں ترجیحی سلوک کے بجائے اصولِ مساوات تقاضائے عدل ہے۔ یعنی بلا تخصیص ہر ایک کو اس کی ضرورت کے مطابق۔

(کتاب الاموال۔ ابی عبید)

اس کے خلاف اعتراض

آپ اس دلیل پر غور کیجئے اور دیکھئے کہ اس کی محکمیّت کس طرح ذہنوں میں سکون اور دلوں میں سرور پیدا کرتی ہے لیکن، اس کے ساتھ ہی جب ہم صحابہ کرامؓ کے اعتراض پر نگاہ ڈالتے ہیں تو ہمیں ایک ثانیہ کے لئے رکنا پڑتا ہے، بالخصوص جب ہم ان میں حضرت عمرؓ جیسی شخصیت بھی دیکھتے ہیں جن کی قرآنِ کریم کے نظامِ ربوبیت پر اس قدر گہری نگاہ تھی۔ اس وقت یہ اعتراض "معصوم" سا نظر آتا ہے لیکن آگے چل کر ہم دیکھیں گے کہ اس سے 'اُس تاریخ نے'، جو ہمارے دورِ ملوکیت میں مرتب ہوئی تھی، ایک بنیادی اینٹ رکھی تھی جس پر نظامِ سرمایہ داری کی بلند عمارت تعمیر کرنی مقصود تھی۔ تاریخ کی یہ ستم ظریفی بھی قابلِ دید ہے کہ اس نے "زکوٰۃ" کی سرمایہ دارانہ تعبیر کے لئے بھی حضرت عمرؓ ہی کو منتخب کیا کہ وہ حضورؐ تک صحابہؓ کا اعتراض پہنچائیں (تفصیل پہلے گزر چکی ہے) اور اب وظائف کے اصول کے خلاف اعتراض کرنے والوں کی فہرست میں بھی انہیں شامل کر دیا گیا ہے۔

مردم شماری

حضرت صدیق اکبرؓ کے زمانے میں مملکت کی آمدنی اتنی کثیر نہیں تھی اس لئے معلوم ہوتا ہے کہ وظائف کا سلسلہ عالمگیر نہیں ہو سکا تھا۔ عہدِ فاروقیؓ میں مملکت کی آمدنی میں اضافہ ہوا تو آپ نے فیصلہ کیا کہ وظائف کا سلسلہ عام کر دیا جائے۔ اس مقصد کے لئے آپ نے مردم شماری کرائی۔ اس مردم شماری پر تبصرہ کرتے ہوئے، مشہور جرمن مستشرق، فان کریمر لکھتا ہے کہ:۔

> یوں تو مردم شماری قدیم ایشیائی سلطنتوں میں بھی کی جاتی تھی اور سلطنتِ روما میں بھی، لیکن اس سے مقصد یہ ہوتا تھا کہ کوئی فرد حکومت کے ٹیکس سے بچنے نہ پائے۔ (حضرت) عمرؓ نے جو مردم شماری کرائی تو اس سے مقصد کچھ اور تھا۔ اس سے مقصد یہ تھا کہ کوئی فرد اپنے اس حق سے محروم نہ رہنے پائے۔ جو، ازروئے اسلام، مملکت کے ذمے واجب تھا۔[1]

ان اعداد و شمار اور احوال و کوائف کے مطابق آپ نے مختلف فہرستیں مرتب کرائیں اور انہیں وظائف کے رجسٹروں

---

(1) ORIENT — UNDER CALIPHS. (بحوالہ 'اسلام کے معاشی نظریئے' از یوسف الدین)

میں درج کیا۔ (روایات کی رُو سے) آپ نے وظائف کے تعیّن میں، ترجیحی سلوک کا اصول اختیار کیا اور ترجیح کے لئے دو معیار مقرر کئے۔ (ا) رسولؐ اللہ سے قرابت داری۔ اور (ii) مسابقت فی الاسلام۔

وظائف کا ترجیحی معیار

مسابقت فی الاسلام کی بنا پر مدارج میں اختلاف خود قرآنِ کریم میں مذکور ہے اور حضرت عمرؓ نے اپنے فیصلہ کی تائید میں یہی دلیل پیش کی تھی۔ اس حد تک اس باب میں کسی کو اختلاف نہیں ہو سکتا لیکن ان مدارج کو معاش کی تقسیم کا معیار قرار دینا (اگر یہ روایت صحیح ہے تو) آپ کی اجتہادی غلطی تھی۔ اس کا جواب وہی تھا جو حضرت ابوبکر صدیقؓ نے دیا تھا۔ (اور جو اوپر گذر چکا ہے)

قرابت داری کا معیار

لیکن حسب ونسب کی بنا پر مدارج کا تعیّن تو قرآنِ کریم کی بنیادی تعلیم کے خلاف ہے۔ اس نے یہ کہہ کر کہ وَ لِكُلٍّ دَرَجٰتٌ مِّمَّا عَمِلُوْا۔ (۴۶/۱۹) "ہر ایک کا درجہ اس کے اعمال کے مطابق ہے"۔ اور اِنَّ اَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ اَتْقٰىكُمْ (۴۹/۱۳) "تم میں سب سے زیادہ واجب التکریم وہ ہے جو سب سے زیادہ تقویٰ شعار (کیریکٹر میں بلند) ہے"۔ حسب ونسب کے بُت کو پاش پاش کر کے رکھ دیا تھا اور یہ قرآنی تعلیم اور اسوۂ رسالتؐ کا وہ امتیازی کارنامہ ہے جسے ہم دنیا کے سامنے (بجا طور پر) نہایت فخر کے ساتھ پیش کرتے ہیں۔ بنا بریں، ہم یہ باور کرنے کے لئے تیار ہی نہیں ہو سکتے کہ حضرت عمرؓ نے ایسا اصول اختیار کیا ہوگا۔ واضح رہے کہ ہم حضرت عمرؓ (یا کسی اور انسان) کو منزّہ عن الخطا تصور نہیں کرتے۔ منزّہ عن الخطا تو صرف وحیٔ خداوندی ہو سکتی ہے لیکن اس کے ساتھ ہی اس حقیقت کو بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا کہ قرآنِ کریم کے کسی اصول کی عملی تعبیر و تشکیل میں اجتہادی غلطی ہو جانا اور بات ہے لیکن یہ چیز کہ دست پروردگانِ رسالت مآبؐ (صحابہ کبارؓ) قرآنِ کریم کی بنیادی تعلیم کے خلاف کوئی اقدام کریں، اسے تسلیم نہیں کیا جا سکتا۔ اگر کسی معاملہ میں تاریخ ایسا بیان کرتی ہے، تو وہ یقیناً تاریخ کی غلطی ہے۔ یہ بات کہ...... قربِ رسالت مآبؐ کی بنیاد مسلمانوں کے اعمال ہیں نہ کہ نسبی تعلق، خود حضرت عمرؓ کی اس روایت سے بھی واضح ہے جو تعیّنِ وظائف ہی کے سلسلہ میں ہمارے سامنے آتی ہے۔ اس میں کہا گیا ہے کہ رسولؐ اللہ سے قرابت داری کی بنا پر وظائف کے تعیّن کے خلاف احتجاج کرنے کے لئے حضرت عمرؓ کے اہلِ قبیلہ بنو عدی آپ کے پاس آئے اور کہا کہ آپ نے خود اپنا نام وہیں کیوں نہیں رہنے دیا جہاں رسولؐ اللہ اور حضرت صدیق اکبرؓ نے رکھا تھا۔ اس پر آپ نے انہیں غضب آلود نگاہوں سے دیکھا اور

فرمایا۔

اے بنو عدی! تم چاہتے ہو کہ تم میری پشت پر سوار ہو کر کھاؤ اور تمہاری وجہ سے میری نیکیاں برباد ہو جائیں۔ ایسا ہرگز نہیں ہو سکتا۔ جب تمہارا نمبر آئے گا تب ہی نام لکھا جائے گا...... خدا کی قسم! ہمیں دنیا میں جو عزت ملی ہے اور ہم آخرت میں اپنے عمل کے بدلے اللہ کے جس ثواب کے امیدوار ہیں، وہ بسبب محمد رسول اللہ کا صدقہ ہے۔ اس لئے آپ ہی ہمارا شرف ہیں اور آپ کی قوم اشرف العرب! اس کے بعد جو ان سے قریب ہیں۔ پھر وہ جو ان سے قریب ہیں۔

اس کے بعد (اسی روایت میں ہے کہ) آپ نے ان سے کہا کہ

(اپنے نسب کی طرف نہ جاؤ) یاد رکھو! اگر اہلِ عجم ہم سے عمل میں بڑھ گئے تو وہ قیامت کے دن ہماری نسبت رسول اللہ سے زیادہ قریب ہوں گے۔ لہٰذا تم میں سے کوئی شخص حسب نسب پر نگاہ نہ رکھے۔ جو اعمال اللہ کے ہاں مقبول ہیں، وہی کرنے چاہئیں کیونکہ جس کا عمل کوتاہ ہو گا اس کا نسب اسے نہ بڑھا سکے گا۔

آپ دیکھتے ہیں کہ اس (ایک ہی) روایت میں دو متضاد باتیں کہی گئی ہیں۔ ایک یہ کہ مدارج کا معیار انسان کے اعمال ہیں نہ کہ حسب و نسب۔ جس کے اعمال اچھے ہوں گے، وہی رسول اللہ سے زیادہ قریب ہوگا۔ جس کے اعمال کوتاہ ہوں گے اس کا نسب اسے آگے نہیں بڑھا سکے گا۔ حضرت عمرؓ کا یہ ارشاد قرآنی تعلیم اور عملِ رسول اللہ کے عین مطابق ہے، لہٰذا روایت کا اتنا حصہ یقیناً قابلِ قبول ہے لیکن اس کا دوسرا حصہ ــــ یعنی شرف کا معیار رسول اللہ سے نسبی تعلق ہے ــــ قرآنی اصول اور اسوۂ رسولؐ کے خلاف ہے۔ اس لئے اسے صحیح تسلیم نہیں کیا جا سکتا۔ قرآنی اصول کے مطابق، بلال حبشیؓ (جو السابقون الاولون میں سے تھے) رسول اللہ سے زیادہ قریب تھے، بہ نسبت حضورؐ کے حقیقی چچا (حضرت) عباسؓ کے، جو ہجرت، بلکہ جنگِ بدر کے بعد اسلام لائے تھے۔ اسلام نے حسب و نسب کی انسانیت سوز تمیزوں کو ختم کر کے، کس طرح مساواتِ انسانیہ کا علم بلند کیا، اس کی سب سے اہم شہادت، حضورؐ کا حجۃ الوداع کا وہ خطبہ ہے جس میں آپؐ نے اعلان فرمایا کہ

الا! لا فضل العربي على العجمي، ولا العجمي على عربي۔ ولا الاحمر على اسود، ولا الاسود على احمر۔ الا بالتقوىٰ۔ (مسند احمد)

لوگو! آگاہ رہو کہ عربی کو عجمی پر یا عجمی کو عربی پر، سرخ کو سیاہ پر یا سیاہ کو سرخ پر، کوئی فضیلت حاصل نہیں بجز تقویٰ کے۔

آپؐ نے اپنے اہلِ خاندان اور قریبی رشتہ داروں کو اعلانیہ کہہ دیا کہ

اے اہلِ قریش! اپنے لئے خود سامان تیار کرو۔ میں اللہ کے حضور تمہارے کچھ کام نہیں آسکوں گا۔ اے بنی عبدمناف! میں اللہ کے حضور تمہارے کچھ کام نہ آسکوں گا۔ اے عباس ابن مطلب! میں اللہ کے حضور تمہارے ذرہ برابر کام نہیں آسکوں گا۔ اے محمدؐ کی بیٹی فاطمہؓ! اور اے رسولؐ کی پھوپھی صفیہؓ! اپنے لئے کچھ کر لو۔ میں خدا کے حضور تمہارے لئے کچھ نہیں کر سکوں گا۔ (متفق علیہ)

معاشی تقسیم کے معاملہ میں بھی آپؐ نے حضرت علیؓ اور فاطمہؓ سے، جو آپ کو سب سے زیادہ عزیز تھے، فرمایا کہ

یہ نہیں ہو سکے گا کہ میں تمہیں کچھ دوں اور اہلِ صُفّہ کو اس حال میں چھوڑ دوں کہ بھوک کے مارے ان کے پیٹ چپکے جا رہے ہوں۔ (مسند احمد)

دوسرے مقام پر آپؐ نے ان سے فرمایا کہ

یہ نہ ہو گا کہ میں تمہاری خدمت کروں اور اہلِ صُفّہ کو فاقہ کشی کے لئے چھوڑ دوں۔ (ایضاً)

اس سے واضح ہے کہ حضورؐ کے رشتہ داروں سے، محض اس بنا پر کہ وہ حضورؐ کے قرابت دار ہیں، کوئی ترجیحی سلوک خود حضورؐ کی تعلیم اور مسلک کے خلاف ہے اور تقسیم رزق کے معاملہ میں تو آپؐ نے بہ صراحت فرما دیا کہ اس کا معیار "ضرورت" ہے نہ کہ قرابت داری۔

بہرحال (تاریخ کے بیان کے مطابق جسے جیسا کہ اوپر بیان کیا جا چکا ہے، صحیح تسلیم کرنے میں ہمیں تأمل ہے) حضرت عمرؓ نے ترجیحی سلوک کے معیار کے مطابق وظائف کا تعین کیا۔ ان کی مقدار کے متعلق

وظائف کی مقدار

روایات میں تھوڑا بہت اختلاف ہے لیکن بہ ہیئتِ مجموعی، آپ نے حضورؐ کی ازواجِ مطہراتؓ (اُمّہات المومنینؓ) کو بارہ بارہ ہزار درہم دیئے۔ حضرت عباسؓ کو حضورؐ سے ان کی قرابت کی بنا پر، پانچ ہزار درہم۔ اس طرح حضرت علیؓ اور آپ کے صاحبزادگان حضرت حسنؓ و حسینؓ کے لئے بھی پانچ پانچ ہزار مقرر فرمائے، جو صحابہؓ، رسول اللہ کے زیر لوا، ابتدائی جنگوں میں شریک ہوئے تھے، انہیں چار چار ہزار عطا فرمایا۔ فتحِ مکہ سے پہلے، ہجرت کرنے والوں کو تین تین ہزار اور فتحِ مکہ کے بعد اسلام لانے والوں کے لئے دو دو ہزار مقرر کئے۔ باقی لوگوں کو ایک ہی

درجہ میں رکھا۔ وظیفہ سے کوئی بھی محروم نہ رہا۔

یہاں تک تو معیار مدارج تھا لیکن نوزائیدہ بچوں کے سلسلہ میں معیار ضرورت تھا۔ چنانچہ آپ نے ہر نومولود کے لئے سو درہم مقرر کئے (جو اس کے یوم پیدائش سے شروع ہو جاتے تھے) اور جوں جوں وہ بڑا ہوتا جاتا، وظیفہ میں اضافہ ہوتا جاتا۔ تا آنکہ وہ سن بلوغ پر پہنچ کر، عام معیار کے مطابق وظیفہ حاصل کر لیتا۔ لاوارث بچوں کی نگہ پرداخت مختلف گھرانوں کے سپرد کر دی جاتی اور ان کا وظیفہ بھی دوسرے بچوں کی طرح مقرر کر دیا جاتا۔

عیال داری کا بوجھ کس قدر باعث پریشانی ہوتا ہے، اس کا آپ کو خود احساس تھا۔ چنانچہ ایک روایت میں ہے کہ آپ سے ایک مرتبہ دریافت کیا گیا کہ سب سے بڑی مصیبت کیا ہے تو آپ نے فرمایا کہ:

کم مال اور کثرتِ عیال

آپ کے اس احساس کے پیش نظر بھی یہ باور کرنے کو جی نہیں چاہتا کہ آپ نے وظائف کے تعین میں "عیال کے بوجھ" کے بجائے مدارج کے ترجیحی سلوک کو معیار قرار دیا ہوگا۔

(تاریخ کا بیان ہے کہ) آپ نے حضرت اسامہ بن زیدؓ کا وظیفہ چار ہزار درہم مقرر کیا اور اپنے بیٹے عبداللہ

اپنے بیٹے پر فوقیت

بن عمر کا تین ہزار۔ بیٹا شکایت لے کر باپ کے پاس پہنچا تو آپ نے اس سے کہا کہ میں نے اسے، تم سے زیادہ وظیفہ اس لیے دیا ہے کہ رسول اللہ اُسے تم سے اور اس کے باپ کو تمہارے باپ سے زیادہ چاہتے تھے۔"

تقسیم وظائف کے معاملہ میں آپ کس قدر محتاط تھے اس کا اندازہ اس سے لگائیے کہ حزام بن ہشام کعبی، اپنے والد سے روایت کرتے ہیں کہ (انہوں نے کہا کہ) "میں نے عمر ابن خطابؓ کو دیکھا کہ خزاعہ کا رجسٹر لیے

وظائف خود تقسیم کرتے تھے

جا رہے تھے۔ قدید پہنچ کر انہوں نے ہر شادی شدہ عورت اور دوشیزہ لڑکی کو بلایا اور اس کا وظیفہ اپنے ہاتھ سے اسے دیا۔ وہاں سے عسفان پہنچے اور اسی طرح ایک ایک کا وظیفہ اسے پہنچا دیا۔" یعنی حضرت عمرؓ مدینہ اور اس کے اطراف کی بستیوں میں وظائف خود پہنچاتے تھے اور دوسرے شہروں میں اپنے عمال کے ذریعے تقسیم کراتے جنہیں احتیاط برتنے کی سخت تاکید تھی۔

یہ نقد وظائف 'خوراک کے علاوہ تھے جو ہر ایک کو بیت المال کے مودی خانہ سے ملتی تھی۔ یہ طے کرنے

خوراک کا معیار

کے لئے کہ فی کس کس قدر خوراک دی جائے' آپ نے (اپنے معمول کے مطابق) عملی طریق اختیار فرمایا۔ آپ نے ایک جریب آٹا پکوا کر لوگوں کو اپنے سامنے کھلایا۔ اس سے تیس آدمی سیر ہو گئے۔ پھر اسی طرح شام کو پکوا کر کھلایا اور جب اطمینان کر لیا کہ اتنا آٹا فی کس کافی ہوتا ہے تو اس کے مطابق ہر ایک کا راشن مقرر کر دیا۔ اسی کے مطابق آپ نے اپنے عمال کو بھی ہدایات بھیجیں اور اس کے ساتھ ہی تاکید کر دی کہ "لوگوں کی خوراک ان کے گھر پر پہنچاؤ اور اتنا دو جس سے ان کا اور ان کے بچوں کا خوب گزارہ ہو جائے۔ یاد رکھو! مٹھی مٹھی دینے سے لوگوں کے اخلاق درست نہیں ہو سکتے"۔ اخلاق کا معاش سے کس قدر گہرا تعلق ہے، اس کا اندازہ حضرت عمرؓ کی ہدایات کے آخری الفاظ سے لگ سکتا ہے۔

تاریخ سے یہ نہیں پتہ چلتا کہ افرادِ معاشرہ کے وظائف اور راشن مقرر ہو جانے کے بعد معاشرہ کا کاروبار کس نہج سے چلتا تھا' لیکن جب ہم 'قرآن کی رُو سے مملکت کی ذمہ داری اور اس کی عملی شکل کے لئے حضورؐ کا وہ ارشادِ گرامی سامنے رکھیں جس کا ملخّص یہ تھا کہ ہر کام کرنے والے کو اس کی ضرورت کے مطابق دیا جائے' تو اُس معاشرہ کا نقشہ اصولی طور پر سامنے آ جاتا ہے۔ یعنی مملکت نے تمام افرادِ معاشرہ کے رزق کی ذمہ داری لے کر انہیں معاشی پریشانیوں سے فارغ کر دیا کہ وہ اپنے اپنے فرائضِ مفوضہ (یعنی جو کام ان کے سپرد کیا گیا ہے) کی بجا آوری پورے اطمینان سے کر سکیں۔ اسی بنا پر حضرت عمرؓ نے ہدایات جاری کر دی تھیں کہ اس کے بعد عمالِ حکومت' اپنے لئے کوئی اور ذریعہ رزق تلاش اور اختیار نہ کریں۔ اسی سلسلہ میں علامہ جوہری طنطاوی لکھتے ہیں کہ:-

مزید ذرائع آمدنی کو بند کر دیا

> جب حضرت عمرؓ کے زمانے میں مال کی کثرت ہوئی تو آپ نے رجسٹر د بنوائے اور تمام سرکاری ملازمین' اور قاضیوں کے وظائف مقرر کر دیئے۔ اس کے بعد آپ نے مال جمع کرنے سے روک دیا اور مسلمانوں پر اراضی بطور جائیداد رکھنا اور کاشت کاری کرنا یا کرانا' حرام قرار دے دیا کیونکہ ان کے اور ان کے اہل و عیال کے معاش کا بندوبست بیت المال سے کر دیا گیا تھا۔
>
> (نظام العالم والامم - جلد ۲)

حضرت عمرؓ نے بنا بر احتیاط، اس قسم کی ہدایات نافذ فرمائیں، لیکن تقسیم وظائف کا جو اصول اختیار کیا تھا ان ہدایات سے ان کے مضرت رساں نتائج تو برآمد ہونے سے نہیں رُک سکتے تھے۔ قرآن کے معاشی نظام کا بنیادی اصول یہ ہے کہ فاضلہ دولت جو نظامِ سرمایہ داری کی بنیاد ہے، کسی کے پاس نہ رہے۔"" وظیفہ مطابق ضرورت" کے اصولِ مساوات[1] کی رُو سے کسی کے پاس فاضلہ دولت نہیں رہتی

اس معیار کے مضر اثرات

اور اس طرح " قُلِ الْعَفْوَ " (زاید از ضرورت مال اپنے پاس نہ رکھنے) کے ارشادِ خداوندی پر خود بخود عمل ہوتا رہتا ہے لیکن جب وظائف کا معیار یہ نہ رہے تو پھر جن لوگوں کو ان کی ضروریات سے زیادہ ملے گا، ان کے پاس فاضلہ دولت جمع ہو جائے گی۔ اس خدشہ کی طرف حضرت عمرؓ کی توجہ بھی مبذول کرائی گئی۔ چنانچہ ایک روایت میں ہے کہ خالد بن عرفطہ العذری حضرت عمرؓ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ آپ نے ان سے حالات دریافت کئے تو انہوں نے کہا کہ

> امیر المومنین! لوگ آپ کو دعائیں دیتے ہیں جو آپ نے ان کے لئے اس قدر وظائف مقرر کر دیئے اور راشن عطا فرما دیا لیکن بعض گھرانے ایسے ہیں جو کھانا بہت کم کھاتے ہیں اور بعض زیادہ کھاتے ہیں۔ سو جو لوگ کم کھاتے ہیں (یعنی ان کے اخراجات کم) تو آپ کا کیا خیال ہے کہ وہ زیادہ کھا کر اپنا وظیفہ وغیرہ ختم کر دیں گے؟)

العذری نے بات واضح کر دی کہ جن لوگوں کو ان کے اخراجات سے زیادہ وظیفہ ملتا ہے وہ زاید مال کو کیا کریں؟ وہ اسے خرچ تو کر نہیں سکیں گے۔

آپ نے جواب دیا کہ یہ ان کا حق ہے جو میں نے انہیں پہنچا دیا۔ اگر کسی کے پاس رقم بچ جاتی ہے تو اسے روکا تو نہیں جا سکتا۔ وہ اس سے کچھ بکریاں خرید لے اور مویشی پالے اور اس طرح کچھ رقم جمع کر لے۔ شاید میرے بعد ایسے والی آئیں جو وظائف بند کر دیں تو یہ اندوختہ اُس وقت اُن کے کام آئے گا۔

یہ اُس مشکل کا حل نہیں تھا جس کی طرف العذری نے اشارہ کیا تھا۔ انہوں نے کہا تھا کہ اس طرح لوگوں کے پاس فاضلہ دولت جمع ہو جائے گی اور یہی سارے فساد کی جڑ ہے۔

---

[1] "اصولِ مساوات" سے مراد یہ نہیں کہ ہر شخص کو وظیفہ (یا سامانِ رزق) یکساں ملے۔ اس سے مراد یہ ہے کہ انفرادی خصوصیات و امتیازات سے قطع نظر، سامانِ رزق ہر ایک کی ضرورت کے مطابق دیا جائے۔

فاضلہ دولت کی کیفیت یہ تھی کہ جب ام المومنین حضرت زینبؓ کا وظیفہ ان کے پاس پہنچا تو انہوں نے رقم دیکھ کر فرمایا کہ میں اتنی خطیر رقم کو کیا کروں گی. میری کئی بہنیں اس کی مجھ سے زیادہ مستحق ہیں. یہ انہیں دے دینا چاہیئے. چنانچہ آپ نے اسے اپنے ان عزیزوں میں بانٹ دیا جنہیں زیادہ ضرورت تھی۔

یہ ظاہر ہے کہ حضرت عمرؓ کے زمانے میں زمینوں کی خرید و فروخت نہیں ہوتی تھی (زمین سب مملکت کی تحویل میں تھی) اس لئے زاید از ضرورت روپے سے نہ زمین خریدی جا سکتی تھی، نہ جائیدادیں بنائی جا سکتیں. البتہ بعض لوگوں نے اس سے تجارت شروع کر دی تھی۔

وظائف کا یہ نظام ۲۰ھ میں شروع ہوا تھا. دو ہی سال کی قلیل مدت میں جب اس کے

غلطی کا احساس

مضرت رساں نتائج سامنے آنے شروع ہوئے تو روایات کے مطابق، حضرت عمرؓ کو اپنی غلطی کا احساس ہو گیا. چنانچہ اس کے ازالہ کے لئے آپ نے فرمایا کہ:-

(۱) جب مجھے اپنے پہلے فیصلہ پر نظرِ ثانی کا موقعہ ملا تو میں دولت مندوں سے ان کی فاضلہ دولت لے کر حاجتمندوں میں تقسیم کر دوں گا۔

(۲) اگر میں اگلے سال تک زندہ رہا تو سارے ملک کا دورہ کروں گا اور وظائف کا اصول، حضرت ابوبکر صدیقؓ کی طرح مساوات پر مبنی کر دوں گا۔

(۳) اس مساوات میں یہ نہیں کروں گا کہ بلند لوگوں کو پست لوگوں کی سطح پر لے آؤں گا بلکہ پست لوگوں کو بلند لوگوں کی سطح پر لے جاؤں گا اور اس طرح آخری آدمی کو پہلے آدمی سے ملا دوں گا۔ اور

(۴) یہ کچھ اس طرح کروں گا کہ کوئی شخص بھی ایسا نہ رہے جس تک گھر بیٹھے اس کا رزق نہ پہنچ جائے، اگرچہ اس نے کوئی کام بھی نہ کیا ہو اور کوئی مشقت بھی نہ اٹھائی ہو. (یعنی جہاد وغیرہ میں شرکت کی شرائط بھی اٹھا دی جائیں گی اور معیار صرف ضروریات قرار دے دیا جائے گا۔)

لیکن اس "اگلے سال" کے آنے سے پہلے ہی آپ کی شہادت ہو گئی اور یہ خوں گشتہ آرزوئیں حسرت بن کر رہ گئیں۔

(۵)

ہم اس کتاب کو عہدِ فاروقیؓ تک محدود رکھنا چاہتے ہیں لیکن تاریخ کا بیان ہے کہ تعینِ وظائف سے متعلق

حضرت عمرؓ کے فیصلہ کے اثرات عہدِ عثمانیؓ میں جاکر نمودار ہوئے، اس لئے ہم نے مناسب سمجھا ہے کہ تاریخ

عہدِ عثمانیؓ میں نتائج سامنے آ گئے

نے اس عہد کے متعلق جو کچھ کہا ہے، اسے بھی سامنے لے آئیں۔ اس ضمن میں سید قطب (مرحوم) اپنی کتاب العدالتہ الاجتماعیہ فی الاسلام' میں لکھتے ہیں:۔

(حضرت) عثمانؓ خلیفہ ہوئے تو انہوں نے حضرت عمرؓ کے دونوں ارادوں میں سے ایک کو بھی عملی جامہ نہ پہنایا۔ جن لوگوں کے پاس ضرورت سے زاید دولت جمع ہو گئی تھی، اسے بھی واپس نہ لیا اور وظائف بھی اسی ترجیحی سلوک کے مطابق تقسیم کرتے رہے۔ اتنا ہی نہیں، بلکہ انہوں نے وظائف میں اور بھی وسعت کر دی۔ چنانچہ دولت مندوں کی دولت میں اضافہ ہوتا چلا گیا اور ضرورت مندوں کی تنگی بسا اوقات بڑھتی گئی۔ اس کے بعد حضرت عثمانؓ نے اپنی دولت مندوں کو بڑے بڑے انعامات و عطایا سے نوازا۔ پھر قریش کو اس کی بھی اجازت دے دی کہ وہ دوسرے ممالک میں جہاں چاہیں جا سکتے ہیں[1] اور ان کے جو مال بیکار پڑے ہوئے ہیں، انہیں تجارت میں لگا سکتے ہیں۔ سب سے آخر انہوں نے ان دولت مندوں کے لئے اسے بھی مباح (جائز) قرار دیا کہ وہ سواد یا غیر سواد جس علاقے میں چاہیں، زمینیں اور جائیدادیں خرید سکتے ہیں۔ اس سے جاگیرداری کا نظام 'اسلامی اجتماعیت' پر مسلط ہونا شروع ہو گیا۔

ڈاکٹر طہٰ حسین (مصری) اپنی کتاب 'الفتنۃ الکبریٰ' میں لکھتے ہیں کہ:۔

جب فساد زیادہ بڑھ گیا تو اسے روکنے کے لئے (حضرت عثمانؓ) نے ایک "اختراع" کی جس کے نتائج ان کی منشاء کے بالکل برعکس برآمد ہوئے۔ ان کی اختراع یہ تھی کہ سوائے ان لوگوں کے، جن کا کسی خاص شہر میں رہنا مملکت کے تقاضا کے لئے ضروری ہو (مثلاً فوج کے افراد) باقی لوگ جس جگہ چاہیں قیام کر سکتے ہیں۔ وہ جہاں جائیں گے ان کی جائیداد وہیں منتقل کر دی جائے گی۔ مدینہ والوں نے (حضرت) عثمانؓ کی اس "اختراع" کو سنا تو وہ حیرت زدہ رہ گئے کہ آپ ان لوگوں کی جائیدادوں کو دوسری جگہ کیسے منتقل کر دیں گے؟ حضرت عثمانؓ نے فرمایا کہ یہ اس طرح کہ ہم ان جائیدادوں کو خرید لیں گے اور

---

[1] ہم دیکھ چکے ہیں کہ حضرت عمرؓ نے صحابہؓ پر پابندی لگا دی تھی کہ وہ دوسرے ممالک میں سکونت اختیار نہ کریں۔

اس کی قیمت سے یہ لوگ جہاں چاہیں اور جائیدادیں خرید سکیں گے۔ مدینہ والے بہت خوش تھے کہ خدا نے ان پر ایک ایسا دروازہ کھول دیا ہے جو ان کے سان گمان میں بھی نہ تھا۔ چنانچہ لوگ دوسرے مقامات میں بسنے کے لئے منتشر ہو گئے۔ (بحوالہ طبری سن ۳۰ھ)

اس کے بعد ڈاکٹر طٰہٰ حسین لکھتے ہیں کہ:۔

نظامِ جاگیرداری کی ابتداء

یہ چیز حجاز و عراق تک ہی محدود نہ رہی بلکہ تمام بلادِ عرب اور مفتوحہ علاقوں تک پھیل گئی اور ہر طرف بڑی بڑی جاگیرداریاں اور وسیع و عریض زمینداریاں قائم ہو گئیں۔ اس طرح اسلام میں ایک نئے طبقہ نے جو بلوتقراطیہ (PROLETARIAT) کہلاتا ہے، جنم لے لیا۔

یہ ہے اس تاریخ کا بیان جو اُس دَور (عہدِ عباسیہ) میں مرتّب ہوئی جب ملوکیّت اور اس شجرۃ الزقوم کی مختلف

تاریخ کے متعلق ہمارا مسلک

شاخیں۔ سرمایہ داری، زمینداری، جاگیرداری، طبقاتی امتیازات وغیرہ مسلمانوں کے معاشرہ پر مسلّط ہو چکی تھیں۔ اس تاریخ کے متعلق ہم اپنا مؤقف و مسلک ایک سے زیادہ بار واضح کر چکے ہیں۔ یعنی یہ کہ:۔

(۱) قرآنِ کریم نے واضح الفاظ میں صحابہ کرامؓ (مہاجرین و انصار) کو "مومن حقًا" قرار دیا اور انکی مغفرت کا اعلان کیا ہے۔

(۲) لہٰذا، اگر تاریخ میں کوئی ایسی بات ان حضرات کی طرف منسوب ہے جو ایک "مومن حقًا" کی خصوصیات کے خلاف ہے تو ہم اسے صحیح تسلیم کرنے کے لئے تیار نہیں۔ اس لئے کہ کوئی بات جو قرآنِ کریم کی شہادت کے خلاف جاتی ہے، کسی مسلمان کے لئے قابلِ قبول نہیں ہو سکتی۔ ہمارا ایمان خدا کی کتاب پر ہے، تاریخ پر نہیں۔

نظامِ سرمایہ داری کو (جس میں زمینداری، جاگیرداری سب شامل ہیں) قرآنِ کریم نے انسانیّت کی سب سے بڑی لعنت قرار دیا ہے۔ قرآنِ کریم اسے مٹانے کے لئے آیا تھا، نہ کہ مسلّط و مستحکم کرنے کے لئے۔ لہٰذا، اگر تاریخ میں صحابہ کبارؓ (اور خلفائے راشدینؓ کا مرتبہ تو ان میں اور بھی بلند ہے) کی طرف کوئی ایسی بات منسوب کی جاتی ہے جس سے نظامِ سرمایہ داری کے قیام اور استحکام کی نشاندہی ہوتی ہو تو ہم اسے بلا تامل مسترد کر دیں گے۔ (جیسا کہ ہم پہلے بھی لکھ چکے ہیں) قرآنِ کریم کے کسی اصول پر عمل پیرا ہونے کے طریق کار میں کوئی اجتہادی غلطی ہو جانا، اور بات ہے لیکن خود قرآنِ کریم کی بنیادی تعلیم کے خلاف، علی الرغم کوئی قدم اٹھانا کسی "مومن حقًا"

کی سیرت و کردار کے مطابق قرار نہیں پا سکتا۔ اس لئے ہم صحابہ کبارؓ کے متعلق تصور تک نہیں کر سکتے کہ انہوں نے ایسا کیا ہوگا۔ یہ ہمارا مسلک ہے لیکن اگر کوئی شخص، کتاب اللہ کے مقابلہ میں انسانوں کی مرتب کردہ تاریخ کو زیادہ مستند سمجھتا ہے اور اس لئے صحابہ کبارؓ کی طرف اس قسم کے خلافِ اسلام اقدامات کی نسبت کو صحیح تصور کرتا ہے، تو یہ اس کا اور اس کے خدا کا معاملہ ہے۔ اصل یہ ہے کہ جب مسلمانوں میں ملوکیت[1] در آئی تو مفاد پرست طبقہ یہ کہنے کی جرأت نہیں کر سکتا تھا کہ ہمارے اقدامات خلافِ اسلام ہیں تو ہوا کریں۔ اُس وقت ہنوز عوام میں اتنی حمیتِ دینی باقی تھی کہ وہ علانیہ خلافِ اسلام اقدامات کو برداشت نہیں کر سکتے تھے۔ یہ طبقہ، قرآنِ کریم کی رُو سے اپنے اقدامات کو مطابقِ اسلام ثابت نہیں کر سکتا تھا۔ اس کے لئے انہوں نے ترکیب یہ سوچی کہ وضعی روایات کی رُو سے، عہدِ رسالت مآبؐ اور دورِ صحابہؓ کی تاریخ ایسی مرتب کر دی جائے جس سے انہیں، اپنے (خلافِ اسلام) اقدامات کے جواز کی سند مل جائے۔ اس طرح ہمارے صدرِ اوّل کی تاریخ مرتب ہوئی اور پھر، اسی مقصد کے پیشِ نظر، اس تاریخ کو مقدس ایسا بنا دیا گیا کہ اس پر کسی قسم کی تنقید، کفر کے مرادف قرار پا گئی۔ یہ سلسلہ آگے بڑھتا گیا اور اس تاریخ کو سلف کی تائید اور "تواتر" کی سند بھی حاصل ہوتی چلی گئی۔ چنانچہ اب حالت یہ ہے کہ آپ (مثلاً) قرآنِ کریم کی نصِ صریح سے ثابت کر دیں کہ اسلام میں دولت کا جمع کرنا جائز نہیں، تو اس کے جواب میں تاریخ سے اس قسم کے واقعات پیش کر دیئے جائیں گے کہ فلاں صحابیؓ کے پاس اس قدر مال و دولت تھا اور فلاں اتنی بڑی جائیداد کے مالک تھے اور اس کے بعد کہا جائے گا کہ فرمایئے! صحابہ کبارؓ قرآن کو زیادہ سمجھتے تھے یا آپ؟ یعنی ہمارے ہاں تاریخی سند کو اوّلیت حاصل ہو گئی ہے اور قرآنِ کریم اس کے تابع آ چکا ہے۔ بجائے اس کے کہ یہ سمجھا جائے کہ تاریخ کا وہی بیان صحیح ہو سکتا ہے جو قرآن کے مطابق ہو، کہا یہ جاتا ہے کہ قرآن کا وہی مفہوم صحیح ہو سکتا ہے جو تاریخ کے مطابق ہو۔

پھر، تاریخی بیانات میں تضاد بھی ہے۔ اسی تاریخ میں ایک طرف (حضرت عثمانؓ دکھائی دیتے ہیں جن کے متعلق کہا جاتا ہے کہ وہ بے حد و نہایت دولت کے مالک تھے اور وہیں، دوسری طرف، حضرت ابوذر غفاریؓ

---

[1] اس کے اسباب و علل کیا تھے، یہ ایک الگ موضوع ہے۔ اگر مجھے فرصت اور توفیق نصیب ہوئی تو میرا ارادہ "اسلام کی تاریخ" لکھنے کا بھی ہے۔ اس میں بتایا جائے گا کہ اسلام کیا تھا اور وہ رفتہ رفتہ اس اسلام میں کس طرح تبدیل ہو گیا جو ہمارے ہاں صدیوں سے مروّج چلا آ رہا ہے۔ سرِدست، کتاب کے آخری باب میں اس کے متعلق اختصاراً کچھ لکھا جائے گا۔

کھڑے نظر آتے ہیں جو (خلیفۃ المسلمین) حضرت عثمانؓ کے منہ پر کہہ رہے ہیں کہ اکتنازِ دولت از روئے قرآن حرام ہے۔ نتیجہ ان تاریخی تضادات کا یہ ہے کہ ہر شخص (اور ہر فرقہ) کو اپنے اپنے خیال یا مسلک کی تائید میں سند حاصل ہو جاتی ہے۔ سرمایہ دار، اپنے مسلک کے جواز میں "حضرت عثمان والا اسلام" پیش کر دیتے ہیں۔ اور سوشلسٹ "حضرت ابوذر غفاریؓ والا اسلام"۔ حتیٰ کہ حضرت عثمانؓ کا (بزعمِ خویش) سرمایہ دارانہ اسلام پیش کرنے والے حضرات، ان کے متعلق طبری کے اس بیان کو نظر انداز کر جاتے ہیں جس میں کہا گیا ہے کہ انہوں نے فرمایا کہ:۔

> اس وقت میرے پاس سواری کے دو اونٹوں کے سوا اور کوئی اونٹ نہیں ہے اور نہ ہی میرے پاس کوئی دودھ دینے والی اونٹنی یا بکری رہ گئی ہے۔ حالانکہ خلافت سے پہلے تمام عرب میں میرے پاس سب سے زیادہ اونٹ اور بکریاں تھیں لیکن آج میرے پاس نہ کوئی بکری ہے نہ کوئی اونٹ سوائے سواری کے ان دو اونٹوں کے جو میں نے سفرِ حج کے لئے رکھ چھوڑے ہیں۔
>
> (تاریخ طبری، جلد ۴، صہ ۳۴۷، مطبوعہ مصر جدید ایڈیشن)

یہ ہے ہماری تاریخ کی کیفیت۔

صحیح مسلک

اگر تاریخ کے بجائے، قرآنِ کریم کو سندِ حجت تسلیم کر لیا جائے (کہ وہ ہی دین میں سندِ حجت ہے) اور تاریخ کو اس کے تابع رکھا جائے، تو اس قسم کے "مختلف اور متضاد اسلاموں" کی گنجائش باقی نہ رہے۔ اسلام وہی ایک اسلام باقی رہے جسے قرآن کی سند حاصل ہو۔ اور یہ اسی صورت میں ممکن ہے کہ تاریخ کو تاریخ کا مقام دیا جائے۔ اسے ایسا مقدس نہ بنا دیا جائے کہ اسے چھونا تک حرام قرار دے دیا جائے۔ یہی ایک صورت ہے جس سے اسلام کا احیاء ہو سکتا ہے اور اس کے لئے ہمارا قدامت پرست طبقہ تیار نہیں۔

بہرحال، ہم ان تاریخی بیانات کو وضعی سمجھتے ہیں جن میں کہا گیا ہے کہ حضرت عمرؓ نے تعیینِ وظائف کے معاملہ میں "ترجیحی سلوک" کو معیار قرار دیا تھا اور اس کے نتیجہ میں حضرت عثمانؓ نے سرمایہ داری نظام اور جاگیرداری نظام کو از سرِ نو قائم کر دیا۔ ان حضرات کی خلافت، اسلام کے استحکام کے لئے تھی، دورِ جاہلیت کے نظامہائے حیات کو واپس لانے کے لئے نہیں۔ واللہ علیٰ ما نقول شہید۔

بارہواں باب

سخنے نگفتہ را چہ قلندرانہ گفتم

در سینہ تا بچند برآرم، فرو برم!
ایں نیم قطرہ خوں کہ ز مژگاں چکیدنی است

جیسا میں کتاب کے تعارف میں تفصیل سے لکھ چکا ہوں، میری زندگی کا نصفِ اوّل، قدامت پرستی کی تیرہ و تار وادیوں میں گزرا۔ تعلیم بھی ہوئی تو اُسی نہج پر اور تربیت بھی ہوئی تو اُسی ماحول میں جس میں شریعت اور طریقت (تصوف) پہلو بہ پہلو گامزن تھے بلکہ یوں کہیے کہ شریعت، طریقت کے تابع رہتی تھی۔ اُس اندازِ تعلیم و تربیت میں، اوّل تو قرآنِ کریم کو محض ثواب کی خاطر پڑھا جاتا ہے اور اگر کبھی اسے سمجھنے کو جی چاہے تو اسے تقلیدی رنگ میں، اسلاف کی تفاسیر کی رُو سے سمجھا جاتا ہے۔ "تقلیدی رنگ" کے معنی یہ ہیں کہ انسان اپنی عقل و فکر اور علم و بصیرت کو کام میں نہ لائے بلکہ جو کچھ اسلاف کی طرف سے منتقل ہو کر آرہا ہے، اسے وحیٔ منزّل من اللہ کی طرح صحیح اور تنقید سے بالاتر سمجھے۔ اگر کسی مقام پر "عقلِ گستاخ کچھ شرارت کرے" اور دل میں اس قسم کا وسوسہ بیدار کردے کہ جو کچھ کہا گیا ہے وہ صحیح معلوم نہیں ہوتا، تو اس قسم کے شیطانی وساوس سے خدا سے پناہ مانگے اور یہ کہہ کر دل کو اطمینان دے لے کہ صحیح وہی ہے جو بزرگوں نے کہا ہے۔ اس لئے کہ

- سالک بے خبر نبود ز راہ و رسمِ منزلہا۔

اس کے بعد میری زندگی کا دوسرا دَور شروع ہوا جس میں، میں نے قرآنِ کریم کو غور و تدبر اور عقل و بصیرت کی رُو سے سمجھنے کی کوشش کی۔ اس پر قریب چالیس سال کا عرصہ گزر چکا ہے، جس میں سوائے ایسے مواقع کے

جن میں، میں معذور ہی نہ ہو گیا ہوں، ایک دن بھی ایسا نہیں گزرا جب میں نے خدا کی اس کتابِ عظیم کے حقائق و معارف پر غور و فکر نہ کیا ہو۔ آرزو ہے کہ زندگی کا باقیماندہ حصہ بھی اسی روش پر گزر جائے کہ یہ کتاب ایک بحرِ بے پایاں ہے جس کے حقائق کبھی ختم ہی نہیں ہو سکتے بلکہ اس میں جوں جوں انسان آگے بڑھتا ہے، سامنے کا کنارہ اور پیچھے ہٹتا چلا جاتا ہے۔

اس مرحلہ میں بہت سے مقامات ایسے آئے جن میں مجھے برسوں ایک ایک نکتہ پر غور کرنا پڑا اور تب کہیں جا کر بات سمجھ میں آئی۔ انہی نکات میں ایک نکتہ دعا کے متعلق تھا۔ قرآنِ کریم میں دعا (یعنی خدا کو پکارنے) کے متعلق متعدد آیات ہیں۔ ان میں، سورۂ بقرہ کی حسبِ ذیل آیت خاص اہمیت رکھتی ہے اس میں کہا گیا ہے۔

دُعا کا مفہوم سمجھنے میں دشواری

وَاِذَا سَاَلَكَ عِبَادِىْ عَنِّىْ فَاِنِّىْ قَرِيْبٌ۔ اُجِيْبُ دَعْوَةَ الدَّاعِ اِذَا دَعَانِ۔ فَلْيَسْتَجِيْبُوْا لِىْ۔ وَلْيُؤْمِنُوْا بِىْ لَعَلَّهُمْ يَرْشُدُوْنَ۔ (۲/۱۸۶)

اس کا ترجمہ یوں کیا جاتا ہے:۔

> اور جب تجھ سے پوچھیں میرے بندے مجھ کو، سو میں تو قریب ہوں۔ قبول کرتا ہوں دعا مانگنے والے کی دعا کو جب مجھ سے دعا مانگے۔ تو چاہیئے کہ وہ حکم مانیں میرا اور یقین لائیں مجھ پر، تاکہ نیک راہ پر آئیں۔ (ترجمہ مولانا محمود الحسنؒ)

اس ترجمہ اور اس کی رو سے متعین کردہ مفہوم کو صحیح سمجھنے میں میری دشواری یہ تھی کہ اس میں کہا گیا ہے کہ "میں قبول کرتا ہوں دعا مانگنے والے کی دعا کو جب مجھ سے دعا مانگے" لیکن یہ ہمارا ذاتی تجربہ بھی ہے اور روزمرہ کا مشاہدہ بھی کہ دعا مانگنے والے خدا سے سینکڑوں، ہزاروں، لاکھوں دعائیں مانگتے ہیں جو قبول نہیں ہوتیں۔ جب ہمارا تجربہ اور مشاہدہ یہ ہے تو پھر قرآنِ کریم کا یہ دعویٰ سمجھ میں نہیں آتا کہ اللہ تعالیٰ، ہر دعا مانگنے والے کی دعا قبول کرتا ہے۔ اس اعتراض کے جواب میں جو کچھ کہا گیا ہے وہ (کم و بیش) سب میری نظروں سے گزرا لیکن مجھے اس سے اطمینان نہ ہوا۔ اکثر یہ کہا جاتا ہے کہ خدا، دعا تو ہر ایک کی قبول کر لیتا ہے، لیکن ضروری نہیں کہ جو کچھ دعا مانگنے والا چاہتا ہے اسی کے مطابق ہو جائے۔ خدا وہ کرتا ہے جو اس کے لئے بہتر ہو۔ لہذا، اگر دعا کرنے کے بعد، کسی کی مصیبت رفع نہیں ہوتی تو اسے سمجھ لینا چاہیئے کہ اس

کا تکلیف یا مصیبت میں مبتلا رہنا اس کے حق میں بہتر ہے۔ علاوہ اس کے کہ یہ توجیہہ بڑی کمزور ہے، یہ قرآنِ کریم کی اس آیت کے بھی خلاف جاتی ہے جس میں کہا گیا ہے کہ

اَمَّنْ يُّجِيْبُ الْمُضْطَرَّ اِذَا دَعَاهُ وَيَكْشِفُ السُّوْٓءَ (۲۷/۶۲)

وہ کون ہے جو مصیبت زدہ کی دعا قبول کرتا ہے جب وہ اسے پکارتا ہے اور اس کی مصیبت رفع کر دیتا ہے۔

اس کے بعد کہا ہے کہ وہ خدا، اور صرف خدا ہے جو ایسا کرتا ہے۔ اس کے ساتھ کوئی الٰہ نہیں۔ یہاں واضح طور پر کہا گیا ہے کہ دعا کے قبول ہونے کے معنی یہ ہیں کہ مصیبت زدہ کی مصیبت رفع ہو جائے۔ لہٰذا، یہ کہنا کہ مصیبت زدہ کی مصیبت رفع ہو یا نہ ہو، اسے یہ سمجھ لینا چاہیئے کہ جو کچھ ہو رہا ہے، اس کے حق میں وہی بہتر ہے، قرآنِ کریم کے مندرجہ بالا ارشاد کے بھی خلاف ہے۔

میں غور و فکر کے بعد، اس نتیجہ پر پہنچا کہ ان مقامات میں "خدا کو پکارنے" سے مراد، اس سے صحیح

ایک مفہوم

راستے کی راہ نمائی طلب کرنا ہے۔ انسان، بعض اوقات ایسے مقامات پر پہنچ جاتا ہے کہ اس کی سمجھ میں نہیں آتا کہ وہ کونسا راستہ اختیار کرے۔ یہ الجھاؤ اس کے لئے بڑی پریشانی کا باعث ہوتا ہے اور اکثر ایسا ہوتا ہے کہ وہ غلط سمت کی طرف مڑ جاتا ہے تو نقصان اٹھاتا ہے۔ اگر اس دوراہے پر اُسے صحیح راستے کا نشان مل جائے تو اس کی پریشانی رفع ہو جاتی ہے۔ قرآنِ کریم زندگی کے ہر دوراہے پر انسان کی راہ نمائی صحیح راستے کی طرف کرتا ہے جس سے اس کی پریشانیاں دور ہو جاتی ہیں۔ قرآنِ کریم نے تعلیم یہ دی ہے کہ زندگی کے ہر دوراہے پر تم خدا سے راہ نمائی طلب کرو۔ یعنی اس کی کتاب کی طرف رجوع کرو۔ وہ (قرآن) تمہارے سوال کا جواب دے گا اور صحیح راستے کی طرف تمہاری راہ نمائی کر دے گا۔ یہ مفہوم ہے خدا کے قریب ہونے اور ہر پریشاں خاطر کے سوال کا جواب دینے کا۔

ان آیات کا مفہوم تو میں وہی سمجھا تھا لیکن ایک اور آیت تھی جس سے میری نگاہ کا رُخ ایک اور طرف پلٹ گیا۔ ہجرتِ نبویؐ کے بعد، مدینہ میں اسلامی مملکت کا قیام وجود میں آگیا اور وہاں کے مسلمان اُن تکالیف اور پریشانیوں سے، جو انہیں مکی زندگی میں پیش آتی تھیں، محفوظ ہو گئے لیکن جو مسلمان مکہ میں گھر گئے تھے، انہیں مخالفین بے حد تنگ کرتے تھے۔ یہ بے کس و بے بس، مظلوم و مقہور، کمزور و ناتواں مسلمان رہ رہ

کر خدا سے دعائیں مانگتے تھے، التجائیں کرتے تھے کہ وہ ان کی مدد کرے اور کسی طرح ان کے مصائب سے انہیں نجات دلائے۔ خدا کے لئے کچھ بھی مشکل نہیں تھا کہ وہ ان کی مشکلات کا حل " براہِ راست " پیدا کر دے لیکن اس نے ایسا نہیں کیا۔ اس نے کیا کیا، اسے غور سے سنئے۔ سورۃ النساء میں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے مدینہ کے مسلمانوں سے کہا کہ:

وَ مَا لَكُمْ لَا تُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَ الْمُسْتَضْعَفِيْنَ مِنَ الرِّجَالِ وَالنِّسَآءِ وَالْوِلْدَانِ الَّذِيْنَ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَآ اَخْرِجْنَا مِنْ هٰذِهِ الْقَرْيَةِ الظَّالِمِ اَهْلُهَا ۚ وَاجْعَلْ لَّنَا مِنْ لَّدُنْكَ وَلِيًّا ۚ وَّ اجْعَلْ لَّنَا مِنْ لَّدُنْكَ نَصِيْرًا ۔ (۴/۷۵)

(اے مدینہ کے مسلمانو!) تمہیں کیا ہو گیا ہے کہ تم خدا کی راہ میں جنگ کے لئے نہیں اٹھتے۔ کیا تم نہیں دیکھتے کہ (مکہ کے) ستم رسیدہ، کمزور و ناتواں، مرد، عورت، بچے کس طرح پکار پکار کر ہم سے فریاد کر رہے ہیں اور کہہ رہے ہیں کہ اے ہمارے پروردگار! ہمیں اس بستی سے، جس کے رہنے والوں نے ظلم و ستم پر کمر باندھ رکھی ہے، کسی طرح نکال لے۔ اپنے ہاں سے ہمارے لئے کوئی سرپرست بھیج۔ کوئی مددگار ادھر پہنچا۔

یہاں دیکھئے، مکہ کے مظلوم، خدا سے دعا کر رہے ہیں اور خدا مدینہ کے مسلمانوں سے کہہ رہا ہے، کیا تم سُن نہیں رہے کہ وہ کس طرح آہ و فغاں کرتے ہوئے ہمیں پکار رہے ہیں۔ تم ان کی مدد کو کیوں نہیں پہنچتے؟ اس سے میں نے دعا کا یہ مفہوم

دُوسرا مفہوم

سمجھا کہ خدا دعا کرنے والے کی مدد براہِ راست نہیں کرتا۔ وہ ان کی مدد اپنے ان بندوں کے ذریعے کرتا ہے جو مظلوم کی مدد کرنا اپنا فریضہ سمجھتے ہیں۔ اس سے دعا کی قبولیت کا ایک اور گوشہ میری سمجھ میں آیا اور قرآنِ کریم کے دیگر کئی ایک مقامات سے اس کی تائید بھی سامنے آگئی۔

اسی سے قرآنِ کریم کا یہ نکتہ بھی میری سمجھ میں آیا کہ جس طرح خدا کا قانون خارجی کائنات میں کارفرما ہے، اسی طرح وہ انسانوں کی دنیا میں بھی روبعمل رہتا ہے لیکن انسانی حساب و شمار کے مطابق اس کی کارفرمائی یا نتیجہ خیزی کی رفتار بڑی سُست ہوتی ہے ـــ خدا کا ایک ایک دن، ہمارے حساب و شمار کے مطابق، ہزار ہزار سال (۳۲/۵) کا بلکہ پچاس پچاس ہزار سال کا ہوتا ہے۔ (۷۰/۴)، لیکن جب انسانوں

کی کوئی جماعت، قوانینِ خداوندی کو انسانی معاشرہ میں عملاً نافذ کرنے کے لئے اٹھتی ہے، تو وہ قوانین، انسانوں کے حساب و شمار کے مطابق اپنے نتائج مرتب کر دیتے ہیں اور اس طرح جو انقلاب (خدائی رفتار کے مطابق) صدیوں میں جاکر مشہود ہونا تھا، وہ، اس جماعت کے ہاتھوں، دنوں میں وجود پذیر ہو جاتا ہے۔ اس جہت سے، یہ جماعتِ مومنین خدا کی رفیق قرار پاتی ہے (لیکن رفیقِ ادنیٰ — رفیقِ اعلیٰ حضور نبی اکرمؐ کے الفاظ میں، خدا ہی رہتا ہے)۔

مکہ کے مظلومین نے خدا سے جو دعائیں مانگی تھیں، ان کی قبولیت کے سلسلہ کا آغاز بدر کے میدان سے ہو گیا تھا۔ اُس میدان میں، مجاہدین کا لشکر مکہ کے (بلکہ یوں کہیئے کہ ساری دنیا کے مظلومین و مقہورین کی امداد کے لئے) سربکف و شمشیر بدست، مخالفین کے سامنے صف آرا ہو گیا تھا۔ تاریخ کے اس فقید المثال معرکہ کا ذکر کرتے ہوئے، اللہ تعالیٰ نے کہا کہ اس دن

فَلَمْ تَقْتُلُوْهُمْ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ قَتَلَهُمْ ۔ وَمَا رَمَيْتَ اِذْ رَمَيْتَ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ رَمٰى ... (۸/۱۷)

خدا کے تیر اور تمہاری کمانیں

مخالفین کو تم قتل نہیں کر رہے تھے، ہم کر رہے تھے۔ تم تیر نہیں چلا رہے تھے، ہم چلا رہے تھے۔

غور فرمایئے! اس دن تلواریں بھی یہی مجاہدین چلا رہے تھے اور تیر بھی انہی کی کمانوں سے نکل رہے تھے، لیکن خدا نے انہیں اپنی طرف منسوب کیا۔ اس سے واضح ہے کہ انسانی دنیا میں خدا کی ذمہ داریاں، ان انسانوں کے ہاتھوں پوری ہوتی ہیں جو ان ذمہ داریوں کے پورا کرنے کا فریضہ اپنے ذمے لیتے ہیں۔ غالب نے اس حقیقتِ کبریٰ کو ایسے حسین و بلیغ انداز میں بیان کیا ہے کہ (نعت کے لٹریچر میں) اس سے بہتر شعر (کم از کم) میری نظر سے نہیں گزرا۔ اس نے کہا ہے کہ:-

تیرِ قضا ہر آئینہ در ترکشِ حق است ۔۔۔ امّا کشاد آں ز کمانِ محمدؐ است

اسی حقیقت کو اقبالؒ نے ان الفاظ میں بیان کیا ہے کہ بندۂ مومن۔

چوں فنا اندر رضائے حق شود ۔۔۔ بندۂ مومن قضائے حق شود[1]

---

[1] اس مقام پر انہی اشارات پر اکتفا کیا جاتا ہے۔ دعا کے متعلق تفصیلی بحث میری تصنیف "کتاب التقدیر" میں ملے گی، جہاں یہ بھی بتایا گیا ہے کہ دعا کا نفسیاتی اثر خود انسان کی اپنی ذات پر کیا پڑتا ہے۔

بہرحال، یہ تھا دعا کا مفہوم جو قرآنِ کریم پر غور و فکر سے میری سمجھ میں آیا تھا اور اسی کے مطابق میں نے "مفہوم القرآن" میں بھی لکھا تھا۔ بایں ہمہ، مجھے اس کی جستجو رہی کہ کیا صدرِ اوّل میں اس مفہوم کی کہیں سے تائید مل سکتی ہے؛ اور میری خوشی کی انتہا نہ رہی جب مجھے خود جناب فاروق اعظمؓ کے ہاں یہی مفہوم مل گیا۔ یہی مفہوم اور ایسے بلیغ ترین انداز میں جو میرے حیطۂ تصور میں بھی نہیں آسکتا تھا۔ آپ نے حضرت سعد بن ابی وقاصؓ کے ساتھ لشکرِ اسلام کو روانہ کیا تو اعوص کے مقام تک انہیں رخصت کرنے کے لئے گئے۔ وہاں کھڑے ہو کر آپ نے ایک بلیغ خطبہ ارشاد فرمایا جس میں کہا۔

حضرت عمرؓ کا ارشادِ گرامی

انی بینکم وبین اللہ۔ ولیس بینی وبینہ احدا۔ و ان اللہ قد الزمنی دفع الدعاء عنہ ۔ فاء نھوا شکاتکم الینا۔ فمن لم یستطع فالی من یبلغنا ۔ ناخذلہ الحق غیر متمتع ۔

(النہایۃ لابن اثیر۔ بحوالہ طنطاوی ص۲۳۶)

لوگو! یاد رکھو۔ میں تمہارے اور اللہ کے درمیان ہوں لیکن میرے اور اس کے درمیان کوئی نہیں۔ اللہ نے مجھے اس بات کا ذمہ دار ٹھہرایا ہے کہ میں تمہاری دعاؤں کو اس تک پہنچنے سے روک لوں۔ لہٰذا، تم اپنی شکایتیں مجھ تک پہنچاؤ۔ اگر کوئی شخص براہِ راست مجھ تک نہیں پہنچ سکتا تو وہ اپنی شکایت ان لوگوں تک پہنچا دے جو مجھ تک پہنچ سکتے ہیں۔ ہم (ہر پکارنے والے کا) حق، بغیر کسی پریشانی کے اس تک پہنچا دیں گے۔

اس سے میری نگاہوں میں چمک پیدا ہو گئی اور وہ بے ساختہ اسلام کے اس بطلِ جلیل کے احترام میں جھک جھک گئیں جسے تعلیم و تربیتِ نبویؐ نے قرآن فہمی کے اس مقامِ بلند تک پہنچا دیا تھا! میری نگاہیں احترام میں جھک گئیں اور مجھے محسوس ہوا کہ یہی تھے وہ مومن جن کے متعلق خود خدا نے کہا تھا کہ ھُوَ الَّذِیْ یُصَلِّیْ عَلَیْکُمْ وَ مَلٰٓئِکَتُہٗ (۳۳/۴۳) اللہ اور اس کے ملائکہ تم پر درود و سلام بھیجتے ہیں۔ تم پر تحسین و آفرین کے پھول برساتے ہیں۔

آپ ان الفاظ پر ایک بار پھر غور فرمایئے کہ:۔

اللہ نے مجھے اس بات کا ذمہ دار ٹھہرایا ہے کہ میں تمہاری دعاؤں کو اس تک پہنچنے سے

روک لوں۔

اور سوچئے کہ اس قدر عمیق حقیقت کو کس قدر لطیف انداز میں بیان کیا گیا ہے! ظاہر ہے کہ انسان، خدا سے اس وقت دعا مانگتا ہے جب اس کی کوئی ضرورت رُک جائے۔ اسلامی مملکت کے سربراہ کی ذمہ داری یہ ہے کہ وہ دیکھے کہ افرادِ معاشرہ میں سے کسی کی کوئی جائز ضرورت رکی نہ رہے۔ اگر اُسے معلوم ہو کہ فلاں کی کوئی ضرورت رُک گئی ہے تو وہ فوراً اس کے پورا کرنے کا انتظام کرے اور اس طرح اس کی دعا کو وہیں روک لے، خدا تک پہنچنے ہی نہ دے۔

اور اس کے اندر یہ نکتہ بھی پوشیدہ ہے کہ اگر کسی شخص کو اپنی کسی ضرورت کے لئے خدا سے کچھ کہنے کی ضرورت پڑ جائے تو یہ گویا مملکت کے سربراہ کے خلاف خدا سے شکایت ہوگی کہ وہ اپنی ذمہ داری پوری کرنے سے قاصر رہ گیا ہے۔ یہ مطلب تھا حضرت عمرؓ کے اس اعلانِ گرامی کا کہ میں ایسی صورت پیدا ہی نہیں ہونے دوں گا کہ تم میں سے کسی کو میرے خلاف خدا سے شکایت کرنے کی ضرورت پیش آئے۔

یہ تھا مقصد اسلامی مملکت کے قیام کا اور یہ تھیں اس کے سربراہ کی ذمہ داریاں! ضرورت مندوں کی دعاؤں کے قبول ہونے کے لئے قرآنی نظامِ مملکت کا وجود لاینفک ہے۔ خدا، بندوں کی مشکلات براہِ راست حل نہیں کرتا، اس نظام کی وساطت سے کرتا ہے جو اس کے قوانین کو نافذ کرنے کے لئے اس کے نام پر قائم ہوتا ہے۔ اس نظام کے سربراہ کا ہاتھ "اللہ کا ہاتھ" بن جاتا ہے۔ (۴۸/۱۰) اور انسانوں کی دنیا میں، جو ذمہ داریاں خدا نے اپنے اوپر لے رکھی ہیں، وہ اس کے ہاتھوں پوری ہوتی ہیں۔ یہی ہوتا ہے وہ بندۂ مومن جس کے متعلق اقبال نے کہا ہے کہ

ہاتھ ہے اللہ کا بندۂ مومن کا ہاتھ
غالب و کار آفریں، کارکشا کارساز

اس سے یہ حقیقت بے نقاب ہوگئی ہوگی کہ اپنی مصیبتوں اور مشکلوں کے لئے ہم جو ہر روز خدا سے دعائیں مانگتے ہیں، وہ قبول کیوں نہیں ہوتیں! یہ براہِ راست قبول ہو نہیں سکتیں۔ یہ پوری ہوتی ہیں "مقربینِ بارگاہِ خداوندی" کی وساطت سے لیکن یہ "مقربینِ بارگاہِ خداوندی" خانقاہوں اور مزاروں میں نہیں ہوتے۔ یہ قرآنی مملکتِ خداوندی کے ایوانوں میں ملتے ہیں۔ یہ حضرات نہ "روحانیت" اور "مظہرِ شانِ الوہیت" کے مدعی ہوتے ہیں اور نہ ہی "ظل اللہ علی الارض[1]" (زمین پر خدا کے سایہ کے) مدعی۔ یہ احکام و اقدارِ خداوندی کی روشنی میں اس قسم کے

[1] مجوسی شہنشاہوں کے تتبع میں مسلمان (باقی ص ۴۱۳ پر)

معاشرہ قائم کرتے ہیں جس میں کسی ضرورت مند کی کوئی ضرورت رُکی نہیں رہتی۔ یہ اس کا (CREDIT) بھی خود نہیں لیتے بلکہ جن کی ضروریات پوری ہوتی ہیں ان سے برملا کہہ دیتے ہیں کہ لَا نُرِيْدُ مِنْكُمْ جَزَآءً وَّ لَا شُكُوْرًا۔ (۷۶/۹) "ہم تم سے کسی قسم کے معاوضہ کے تو ایک طرف، شکریہ تک کے بھی متمنی نہیں۔"

(بقیہ فٹ نوٹ از ص ۴۱۳)

بادشاہوں نے بھی اپنے لئے "ظل اللہ علی الارض" کا تمغہ وضع کر لیا تھا۔ ذرا غور کیجئے کہ وہ ذات گرامیؐ کہ جس سے اعظم و اعلیٰ ہستی آسمان کی آنکھ نہ دیکھی تھی نہ دیکھ سکے گا، اپنے آپ کو عَبْدُہٗ (خدا کا غلام) کہے اور اس میں انتہائی فخر محسوس کرے، اور یہ حضرات "زمین پر خدا کا سایہ" ہونے کے مدعی ہوں!

تفاوت راہ از کجاست تا بکجا!!

تیرھواں باب

خوش درخشید ولے شعلۂ مستعجل بود

عمرہا در کعبہ و بت خانہ می نالد حیات
تا ز بزم عشق یک دانائے راز آید بروں

فاروق اعظمؓ نے ۱۳ھ میں خلافت کی ذمہ داریاں سنبھالیں۔ اب ہم ۲۳ھ میں پہنچ گئے ہیں۔ اس دس سال کی قلیل ترین مدت میں (جو قوموں کی زندگی میں، کلمح البصر ہوتی ہے) جو انقلابات رونما ہوئے' ان کی تفصیل کے لئے ایک جداگانہ (مستقل) تصنیف کی ضرورت ہے۔ مختصر الفاظ میں اتنا ہی کہا جاسکتا ہے کہ آپ مختلف اقوامِ عالم کی تاریخ پر نگاہ ڈالئے اور دیکھئے کہ جن حالات میں یہ جدید مملکت وجود میں آئی تھی اور جس قوم کے ہاتھوں یہ متشکل ہوئی تھی اس کے پیشِ نظر کیا آپ کو دنیا کی کسی اور قوم کے ہاں اتنی قلیل مدت میں ایسے وسیع اور عظیم انقلاب کی مثال ملتی ہے؟

فتوحات کے نقطۂ نگاہ سے دیکھا جائے تو دس سال کی قلیل مدت میں' پورے کا پورا ایران' شام' عراق' مصر' مملکت اسلامیہ کا جزو بن چکے ہیں۔ یہ اُس زمانے میں ہوا جب سامانِ رسل و رسائل اور ذرائع

خارجی دنیا میں انقلاب

مواصلات و اسبابِ آمدورفت کی حالت یہ تھی کہ گھوڑے اور اونٹ سے زیادہ تیز رفتار سواری کوئی نہ تھی اور سانڈنی سوار کے سوا' نامہ و پیام اور احکام و ہدایات رسانی کا کوئی ذریعہ نہ تھا۔ ان حالات میں' فاروقِ اعظمؓ مدینہ میں بیٹھے ہزاروں میل دور جنگ کے میدانوں کے نقشے مرتب کرتے' کمانڈروں اور سپہ سالاروں کو ہدایات بھیجتے اور

علاقہ فتح ہوجاتے پر، وہاں کا نظم و نسق سرانجام دیتے تھے۔ نئے مفتوحہ علاقوں کا سنبھالنا آسان کام نہیں ہوتا لیکن یہ حقیقت کچھ کم تعجب انگیز نہیں کہ اس قدر دور دراز گوشوں میں پھیلے ہوئے ممالک میں سے کسی ایک میں، بغاوت تو ایک طرف، خفیف سی سازش بھی نمودار نہیں ہوئی۔ اس کے ساتھ ہی اس حقیقت کو بھی پیشِ نظر رکھیے کہ جو قومیں اسلامی مملکت کے زیرِ نگین آئیں وہ ایک دوسرے سے یکسر مختلف اور متضاد عناصر کا مجموعہ تھیں۔ ہر قوم، دوسری قوم سے مذہب، زبان، نسل، تہذیب و تمدن اور سیاسی، معاشی اور معاشرتی تصورات میں الگ تھی، اور یہ سب مل کر، خود عربوں سے الگ۔ یہ تمام باہمد گر متضاد عناصر ایک مملکت کی وحدت میں اس طرح سمو گئے کہ نہ ان میں کوئی تفاوت رہا نہ فتور، نہ اختلال رہا نہ اختلاف — تیری سرکار میں پہنچے تو سبھی ایک ہوئے — ملکوں کا فتح کر لینا آسان ہے لیکن اس قسم کے متضاد عناصر میں اس طرح کی ہم آہنگی پیدا کر دینا، کارے دارد۔ دیگر ممالک سے قطع نظر، خود سرزمینِ عرب کے اندر کچھ کم متضاد عناصر نہیں تھے اور انہوں نے اپنی تاریخ میں پہلی مرتبہ ایک مرکز کے تابع نظم و نسق کی زندگی بسر کرنی شروع کی تھی۔ ان میں بھی کہیں بغاوت نہیں اُبھری، سرکشی مودار نہیں ہوئی۔ انہوں نے اس طرح کے ڈسپلن اور فرماں پذیری کا ثبوت دیا جیسے وہ ہزاروں سال سے اس قسم کی زندگی بسر کرنے کے عادی تھے۔ ہم دیکھ چکے ہیں کہ امورِ مملکت کے سلسلہ میں فاروقِ اعظمؓ خاصے سخت گیر تھے۔ ان کی سرزنش بڑی شدید اور گرفت بڑی آہنی ہوتی تھی۔ اس باب میں وہ جری سے جری کمانڈر اور بڑے سے بڑے حاکم اور والی تک کو نہیں بخشتے تھے لیکن اس کے باوجود، کیا مجال جو ان میں سے کسی نے ان کے کسی حکم کے خلاف آنکھ تک بھی اٹھائی ہو۔ اس سلسلہ میں اس حقیقت کو بھی فراموش نہ کیجئے کہ اُس مملکت کی کوئی مستقل فوج (STANDING ARMY) نہ تھی جو حکومت کے زیرِ کمان ہو۔ تمام فوج، افرادِ مملکت پر مشتمل تھی، جو عند الضرورت رضاکارانہ جمع ہوجاتے اور انہی سے فوج ترتیب پالیتی تھی۔ آپ سوچئے کہ جس حکومت کے پاس اپنی الگ مستقل فوج نہ ہو اور جو ہتھیار فوج کے پاس ہوں وہی عام افرادِ مملکت کے پاس موجود ہوں، اس میں کہیں ہلکی سی بغاوت کا بھی نمودار نہ ہونا، تاریخ کا فقید المثال کارنامہ نہیں؟ مفتوحہ علاقوں میں اس قدر امن و سلامتی اور خود اپنی قوم میں اس قدر صلح و آشتی، کس بات کا ثبوت ہے! صرف اس بات کا کہ نظامِ مملکت اس قدر عدل و احسان کے درخشندہ قرآنی اصولوں پر مبنی تھا کہ ہر ایک اپنی اپنی جگہ نہ صرف مطمئن بلکہ شاداں و فرحاں تھا اور سربراہِ مملکت کا اپنا کردار اس قدر پاکیزہ اور بلند تھا کہ اس میں کسی کو

کسی مقام پر انگشت نمائی کی گنجائش نظر نہیں آتی تھی۔ تاریخِ عالم اس قسم کے نظام اور نظام کے سربراہ کی مثال پیش کرنے سے قاصر ہے۔ "انسائیکلوپیڈیا آف اسلام" کا مقالہ نگار اس باب میں لکھتا ہے کہ:

> یہ حقیقت یقیناً باعثِ صد تعجب ہے کہ مکہ کے ایک سادہ سے شہری نے کس طرح ایسے محیر العقول کارنامے سرانجام دیئے۔ اس نے 'تنہا اس نظامِ حکومت کے ذریعے جس کے خلاف کسی نے کوئی آواز بلند نہ کی' ان بدوؤں کو قواعد و ضوابط کا پابند بنایا جو اس سے پہلے، قواعد و ضوابط کے نام تک سے آشنا نہ تھے اور ملک کے طول و عرض میں پھیلے ہوئے تھے۔ حیرت ہے کہ اس نے بدوؤں کے سرداروں کو' جن کے ہاتھ میں ان قبائل کا پورے کا پورا اقتدار تھا' کس طرح کنٹرول میں رکھا۔ یہ ٹھیک ہے کہ اس قدر وسیع و عریض فتوحات تنہا عمرؓ کا کارنامہ نہیں تھا۔ لیکن یہ تنہا اسی کی صلاحیتوں کا نتیجہ تھا کہ اس نے اتنے اتنے بڑے جرنیلوں کو کبھی عنان گسیختہ نہ ہونے دیا اور بنو امیہ جیسے شہ زور اور صاحبِ اقتدار قبیلہ تک کی صلاحیتوں سے تو فائدہ اٹھایا لیکن انہیں صاحبِ اقتدار نہیں ہونے دیا۔ اس نے خالد بن ولیدؓ جیسے سپہ سالار کو جس طرح معزول کیا، اس سے ہم ان کے (حضرت عمرؓ کے) سیاسی تدبر اور اقتدار کی محکمیت کا اندازہ لگا سکتے ہیں۔ ان حقائق کے پیشِ نظر، ہم بلا تامل، انہیں سیاسی نابغہ (POLITICAL GENIUS) کے معزز لقب سے سرفراز کرتے ہیں۔ (نہ صرف ان کی فتوحات کی بنا پر بلکہ اس لئے بھی کہ) انہوں نے' اس قسم کے متضاد عناصر پر جن سے یہ جدید مملکت عبارت تھی، کس طرح وحدت اور استحکام کا نقش ثبت کر دیا اور اس کے ساتھ ہی یہ حقیقت بھی کہ عمرؓ کا زمانۂ خلافت' بظاہر شخصی حکومت کا دور نظر آتا ہے لیکن اس کے باوجود اس میں جنونِ ملوکیت کا شائبہ تک دکھائی نہیں دیتا۔
>
> (صفحہ ۹۸۳۔ ۱۹۳۴ء ایڈیشن)

داخلی دنیا میں انقلاب

پھر یہ انقلاب صرف خارجی دنیا میں ہی نمودار نہیں ہوا تھا؛ اُس قوم کی داخلی دنیا میں بھی جو نفسیاتی تبدیلی پیدا ہو گئی تھی، وہ بھی عدیم النظیر اور فقید المثال تھی۔ ذرا غور کیجئے کہ وہ عرب جن کی تگ و تاز کا بنیادی مقصد لوٹ مار تھا اور جو محض مالِ غنیمت حاصل کرنے کے لئے ہر وقت آمادۂ جنگ و پیکار رہتے تھے؛ ان میں ایسا نفسیاتی تغیر واقعہ ہو گیا کہ (جیسا کہ ہم دیکھ چکے ہیں) ایران کی فتح میں اِس قدر مالِ غنیمت ان کے ہاتھ لگا جو اُنکے

حیطۂ تصور میں بھی نہیں آسکتا تھا لیکن اس میں سے کسی سپاہی نے ایک سوئی تک بھی اپنے پاس نہ رکھی اور سارے کا سارا لاکر میرِ سپاہ کے قدموں میں ڈھیر کر دیا۔ دوسری طرف، ہم نے ایک بدو لڑکی کو رات کی تنہائیوں میں، اپنے خیمہ کے اندر، خود اپنی ماں سے یہ کہتے ہوئے سنا کہ اس میں شبہ نہیں کہ اس وقت کوئی دیکھنے والا نہیں، لیکن اس کے باوجود میں دودھ میں پانی نہیں ڈالنا چاہتی کیونکہ خلیفہ نے کہا تھا کہ جب کوئی اُور دیکھنے والا نہ ہو تو خدا دیکھ رہا ہوتا ہے۔ (جیسا کہ ہم نے اوپر لکھا ہے) دنیا کے بڑے بڑے فاتحین ملکوں کو فتح کر سکتے ہیں، بڑے بڑے مدبّرین بساطِ سیاست پر انقلاب برپا کر سکتے ہیں لیکن قلوب کی دنیا میں ایسا انقلاب برپا کرنا دست پروردگانِ رسالتؐ ہی کا حصّہ ہو سکتا تھا۔ اسی انقلاب کے پیشِ نظر، ہیکل نے جن الفاظ میں، بارگاہِ فاروقیؓ میں خراجِ تحسین پیش کیا ہے، وہ بڑے جامع ہیں۔ ملاحظہ فرمایئے۔ اس نے کہا ہے کہ:-

ہیکل کا خراجِ تحسین

دس برس اور کچھ مہینے حضرت عمرؓ نے امیر المومنین کی حیثیت سے گزارے۔ وہ اللہ اور اس کے دین کے لئے وقف تھے۔ اپنی ذات اور اپنے اہل و عیال کی انہیں کوئی پرواہ نہ تھی۔ ان کا دل، ان کی عقل اور ان کے اعضاء و جوارح، اُس بارِ عظیم کے اٹھانے میں مصروف رہتے تھے جو قضا و قدر نے ان کے شانوں پر رکھ دیا تھا۔ چنانچہ وہ فوج کے سپہ سالارِ اعظم تھے۔ فقہائے اسلام میں انہیں فقیہہِ اکبر کا مرتبہ حاصل تھا۔ وہ ایک ایسے مجتہد تھے جن کی رائے سند سمجھی جاتی اور جن کا اجتہاد تسلیم کیا جاتا تھا۔ وہ ایک ایسے انصاف پسند اور پاک دامن قاضی تھے جو مقدمات کے فیصلے کرتے اور طاقت وروں سے کمزوروں کو ان کا حق دلواتے تھے۔ وہ تمام مسلمانوں کے ــــ بڑے سے پہلے چھوٹے، طاقت ور سے پہلے کمزور اور مالدار سے پہلے فقیر کے ــــ شفیق و مہربان باپ تھے۔ وہ بندۂ مومن تھے جن کے اللہ اور اس کے رسولؐ پر سچے ایمان نے ان کی خود اعتمادی میں اضافہ کر دیا تھا اور ان کی رائے کی قدر و قیمت اُن پر اچھی طرح واضح کر دی تھی۔ وہ ایک تجربہ کار سیاست دان تھے جو اپنے ارادوں کو جانتے تھے۔ اور انہیں اپنی مقدرت کے دائرے سے نکلنے نہ دیتے تھے اور ان کی مقدرت کے ساتھ ساتھ ان کے ارادے بھی وسیع ہوتے جاتے تھے۔ وہ ایک صاحبِ نظر حکمران تھے جن کی عقل و حکمت نے ان کے لئے مختلف النسل، مختلف اللّسان اور مختلف المذاہب قوموں پر حکومت کرنا آسان

بنا دیا تھا اور وہ رعایا کے معاملات کی تدبیر اس طرح کرتے تھے کہ لوگ ان سے اُپرا ئیں نہیں بلکہ قریب تر ہو جائیں۔ حضرت عمرؓ کی ان خصوصیات کو دیکھتے ہوئے کوئی عجیب نہیں اگر ان کے عہد میں مسلمانوں کو سچے ایمان نے ابھارا، اُن کے دلوں میں شہادت فی سبیل اللہ کی تڑپ پیدا کی اور انہوں نے ایران، عراق، شام، مصر اور دوسرے ممالک فتح کر لئے اور فاروقِ اعظمؓ کے ان امتیازات کے پیشِ نظر کوئی حیرت نہیں۔ اگر عرب مغرب کی انتہائی حدوں سے لے کر مشرق کے انتہائی سروں تک تمام دنیا کی نگاہوں کا مرکز بن گئے۔ حالانکہ اسلام سے پہلے وہ ایک خانہ بدوش قوم تھے جو صرف انفرادی اغراض کے لئے جیتی تھی اور اجنبی اقتدار کی محکوم تھی۔

کتنی مہتم بالشّان تھی وہ کوشش، جو حضرت عمرؓ نے، دس سال کی مدّت میں یہ بارِ عظیم اٹھانے کے لئے صرف کی تھی۔

اور مصر ہی کا ایک اور نامور مفکر (ڈاکٹر طٰہٰ حسین) اس باب میں لکھتا ہے۔

اور طٰہٰ حسین کا

میں نہیں جانتا کہ تاریخ انسانی کسی ایسے شخص کی مثال پیش کر سکے جو حضرت عمرؓ کا سا زندہ، حساس، محتاط اور معصیت سے خائف ضمیر رکھتا ہو، جو اپنے حق میں ان باتوں سے بھی ڈرتا ہو جن میں ڈرنے کی کوئی بات نہ ہو، ان امور سے بھی اِبا کرتا ہو جن سے اِبا نہیں کیا جاتا اور اپنی ذات پر ایسی سختیاں کرتا ہو جو صرف ایک اولعزم انسان ہی کر سکتا ہے۔

(الفتنۃ الکبریٰ)

اور اس کے بعد وہ لکھتے ہیں:۔

میرا خیال ہے کہ دنیا کی متمدّن اور ترقّی یافتہ قومیں آج وہاں تک پہنچنے کی کوشش کر رہی ہیں جس مقام پر حضرت فاروقِ اعظمؓ اس زمانے میں پہنچے تھے لیکن یہ متمدّن قومیں آج بھی اس مقام تک سخت جدّوجہد اور مشکلات کا مقابلہ کئے بغیر نہیں پہنچ سکیں گی۔ (ایضاً)

ڈاکٹر طٰہٰ حسین کی کتاب (الفتنۃ الکبریٰ) درحقیقت ان حوادث و فتن پر مشتمل ہے جو حضرت عثمانؓ کے عہد میں نمودار اور ان کی شہادت پر منتج ہوئے۔ حضرت عمرؓ کے متعلق اس میں محض تمہیداً وہ کچھ لکھا گیا ہے جس کے اقتباسات اوپر درج کئے گئے ہیں۔ کتاب کے آخر میں، جب وہ ان اسباب و علل پر تبصرہ

کرتا ہے جو اس فتنۃ الکبریٰ (شہادت امیرالمؤمنین حضرت عثمانؓ) کا موجب بنے' تو اس کی نگاہ پھر حضرت عمرؓ کی طرف اٹھتی ہے۔ چنانچہ وہ لکھتا ہے کہ:۔

> جب ان تمام امور کو ایک دوسرے سے ملا کر دیکھیں گے تو آپ اس نتیجہ پر پہنچیں گے کہ جن حالات نے حضرت عثمانؓ کو آگھیرا تھا وہ ان کے اور ان کے رفقاء کی طاقت سے باہر تھے۔ کہا جائے گا کہ حضرت عمرؓ کو بھی تو ایسے ہی حالات سے سامنا کرنا پڑا تھا اور انہوں نے ان پر قابو پالیا تھا لیکن ایسا کہنے والے یہ بھول جاتے ہیں کہ حضرت عمرؓ ان منفرد شخصیتوں میں سے تھے جنہیں عالمِ انسانیّت شاذ و نادر ہی پیدا کرتا ہے۔ اس قسم کی غیر معمولی شخصیتیں در اصل اپنے جانشینوں کو سخت مشکلات اور آزمائشوں میں مبتلا کر جاتی ہیں بلکہ اگر احتیاط مانع نہ ہو تو میں یہاں تک بھی کہوں گا کہ درحقیقت حضرت عمرؓ کی عبقریّت[1] (غیر معمولی صلاحیت) ہی ان حالات کی ذمہ دار ہے جن میں حضرت عثمانؓ اور ان کے ساتھی گھر گئے ___ وہ عبقریت جو حضرت عمرؓ کے بعد ان کے ساتھیوں میں سے کسی کو بھی نہ ملی جن میں حضرت عثمانؓ بھی شامل ہیں۔ (ایضاً)

اور جس کی مثال کی تلاش میں آسمان آج تک مصروفِ گردش ہے۔

اگلا پروگرام

عہدِ فاروقیؓ میں مملکت تو بے شک اس قدر وسیع و عریض ہو گئی تھی اور اس میں نظم و نسق بھی قائم ہو گیا تھا، لیکن قرآنِ کریم کی بلند اقدار کے مطابق، داخلی دنیا کا انقلاب ہنوز حجاز اور اس میں بسنے والے عربوں تک محدود تھا۔ اس کے بعد' حضرت عمرؓ کے سامنے یہ پروگرام تھا کہ جن ممالک کو انہوں نے فتح اور جن اقوام کو انہوں نے مسخّر کیا تھا، ان میں بھی اسی قسم کا انقلاب پیدا کر دیا جائے۔ ظاہر ہے کہ یہ مرحلہ' پہلے مرحلہ سے کہیں زیادہ دقّت طلب اور صبر آزما تھا لیکن حضرت عمرؓ اس کا عزم کر چکے تھے، اس لئے کہ یہ حقیقت ان کے پیشِ نظر تھی کہ قرآنِ کریم کی رو سے' خلافت سے مقصود تسخیرِ ممالک نہیں' بلکہ انسانی دنیا میں صحیح آسمانی انقلاب پیدا کرنا ہے۔ تسخیرِ ممالک اس مقصدِ عظیم کا ذریعہ ہے' مقصود بالذات نہیں۔ اسی مقصد کے پیشِ نظر حضرت عمرؓ نے فرمایا تھا کہ اگر میں زندہ رہا تو میرا ارادہ ہے کہ اگلے سال ساری مملکت کا دورہ کروں گا اور ہر ملک کے مقامی حالات کا جائزہ لے کر وہاں قرآنی

---

[1] عبقریت۔ GENIUS-NESS

نظام کے نفاذ کی عملی تدابیر اختیار کروں گا۔

لیکن ان کی آنکھوں نے وہ " اگلا سال" دیکھا ہی نہ، اور انسانیت کا مقدر بدلتے بدلتے رہ گیا۔ تاریخ عالم کا یہ المیہ اس قدر حیرت انگیز، زہرہ گداز، جگر سوز اور دوررس نتائج کا حامل ہے کہ اس پر آسمان کی آنکھ جس قدر بھی خون کے آنسو بہائے کم ہے۔ اس حادثۂ کبریٰ کے بعد، چودہ سو سال کی تاریخ، انسانیت کی

المیہ

حرماں نصیبیوں اور سوختہ بختوں کی الم انگیز داستان کے سوا کچھ نہیں۔ اگر اس پیغامبر انقلاب کو دس سال بھی اور مل جاتے تو آج دنیا کا نقشہ کچھ اور ہوتا۔ ابن آدم نے اس فردوسِ گم گشتہ کو مدت ہوئی پالیا ہوتا جس کی تلاش میں وہ اس طرح مارا مارا پھر رہا ہے ۔ ستاروں کی آنکھ محوِ حیرت ہے کہ بعض حوادث کس طرح تاریخ کے دھارے کا رُخ موڑ دیتے ہیں!

اور یہ حادثہ تھا کیا؟ بجلی کی چمک، کوندے کی لپک، جس کا کسی کو سان گمان تک نہ تھا لیکن جس نے عالمِ انسانیت کی متاعِ حیات کو راکھ کا ڈھیر بنا کر رکھ دیا۔ وہ حادثہ جسے تاریخ نے چار لفظوں میں سمٹا کر رکھ دیا ہے اور نہیں سمجھی کہ اس اجمال میں زمانے کی کتنی گردشیں مستور ہو کر رہ گئی ہیں۔

یک لحظہ غافل گشتم و صد سالہ راہم دُور شُد

حادثہ کی تفصیل اتنی ہی ہے کہ ۲۶ ذی الحجہ، ۲۳ھ، مؤذن نے فجر کی نماز کی اذان دی۔ صحابہؓ مسجدِ نبوی میں جمع ہو گئے۔ حضرت عمرؓ امامت کے لئے کاشانۂ خلافت سے باہر تشریف لائے۔ دیکھا کہ نمازیوں کی دو ایک صفیں سیدھی نہیں۔ انہیں اشارہ سے سیدھا کیا۔ جماعت کھڑی ہو گئی۔ حضرت عمرؓ نے ابھی تکبیر کہی تھی کہ ایک شخص اچانک ان کے سامنے آیا[1] اور نہایت تیز خنجر سے ان پر متعدد وار کئے۔ آپ کی آنتیں کٹ گئیں۔ حادثہ کی تفصیل ختم ہو گئی۔

قاتل کا خنجر سینۂ عمرؓ میں نہیں، قلب کائنات میں پیوست ہو گیا۔

قاتل وار کر کے بھاگا۔ نمازیوں نے اسے پکڑنے کی کوشش کی تو اُس نے اُن پر بھی وار کئے۔ یہاں تک کہ بارہ آدمی زخمی ہو گئے۔ ان میں سے ایک کے قول کے مطابق، چھ اور دوسرے کے مطابق نو جانبر نہ ہو سکے جب آخر الامر اس پر قابو پا لیا گیا تو اُس نے اُسی خنجر سے اپنے آپ کو ہلاک کر لیا۔ اس طرح جرم کی اوّلین شہادت ہمیشہ کے لئے مٹ گئی اور باقی صرف خنجر رہ گیا جس کی زبان نے جو کچھ بیان کیا وہ ذرا آگے چل کر سامنے

---

[1] ایک روایت میں ہے کہ وہ سامنے سے نہیں آیا تھا، نمازیوں کی صف اوّل میں کھڑا تھا اور وہیں سے اس نے حملہ کیا تھا۔

آتا ہے۔

تاریخ نے اس المیہ کی جو تفصیل بیان کی ہے اس سے ہمارے سامنے "حیرت" کے سوا کچھ نہیں آتا۔ اگر اس زمانے میں اس قسم کا کوئی حادثہ رونما ہوتا تو حکومت ان سارے نمازیوں کو بھی شاملِ تفتیش کر لیتی جو اُس وقت مسجد میں موجود تھے، کہ ان کی آنکھوں کے سامنے ایک شخص سربراہِ مملکت پر (چھپ کر، دور کھڑا، بندوق سے نہیں بلکہ پاس آکر خنجر سے حملہ کرتا ہے اور ان میں سے کوئی بھی مدافعت کے لئے کچھ نہیں کرتا۔ آخر امام اور نمازیوں کی پہلی صف میں فاصلہ ہی کتنا تھا؟ اگر قاتل سامنے سے آیا تھا تو مسجد میں نماز کی حالت میں، کسی شخص کا اس طرح سامنے سے آنا، بجائے خویش ایک غیر معمولی اور اندیشہ خیز واقعہ تھا جس سے انہیں چوکنا ہو جانا چاہیئے تھا اور اگر وہ صفِ اوّل میں سے نکل کر آگے بڑھا تھا تو باقی نمازی خاموش کھڑے کیا دیکھتے رہے؟ آج کی حکومت بے شک انہیں شاملِ تفتیش کر لیتی لیکن ہم تو ایسا نہیں کر سکتے کیونکہ (یہ کم و بیش) تمام نمازی، انصار و مہاجرین کا گروہ تھے جن کے مومنِ حقا ہونے کی شہادت قرآن نے دی ہے اور جو اپنے امیر کے جاں نثار پروانے تھے۔ ان کے متعلق یہ وسوسہ وہم و گمان میں بھی نہیں آنا چاہیئے کہ وہ (معاذاللہ) اس سازش میں شریک تھے۔ تاریخ نے جو کچھ اس حادثہ کے متعلق بیان کیا ہے (جو بادی النظر میں بڑا ہی سطحی سا دکھائی دیتا ہے) اگر وہ صحیح ہے تو ان حضرات کے متعلق اس سے زیادہ اور کیا عرض کیا جا سکتا ہے کہ انہوں نے ناقابلِ فہم حد تک غفلت برتی۔ بہرحال، یہ ان کی غفلت کا نتیجہ تھا یا عدم تدبّر یا فقدانِ احتیاط کا، زمانے کے لئے حیرت و استعجاب کی ایک دنیا اپنے پیچھے چھوڑ گیا ہے۔

آخری لمحاتِ زندگی

خنجر کے وار سے حضرت عمرؓ کی آنتیں کٹ گئی تھیں۔ زخم سے برابر خون بہے جا رہا تھا۔ جب آپ کو ذرا ہوش آیا تو آپ نے پہلا سوال یہ کیا کہ لوگوں نے نماز پڑھ لی ہے۔ جب جواب اثبات میں ملا تو آپ کو اطمینان ہوا۔ دوسرا سوال قاتل کے متعلق تھا۔ جب معلوم ہوا کہ وہ ایک غیر مسلم، غیر عرب ہے تو آپ نے اس پر بھی اظہارِ اطمینان کیا کہ وہ کسی مسلمان اور اپنی قوم کے فرد کے ہاتھوں شہید نہیں ہوئے۔

؎ ایک روایت میں ہے کہ حضرت ابن عباسؓ نے لوگوں سے پوچھا بھی تھا کہ کیا واقعہ ان کے مشورہ یا علم سے سرزد ہوا ہے۔ ان پر لوگ کانپ اٹھے اور کہا کہ معاذاللہ، معاذاللہ، اس کا تو تصور بھی نہیں کیا جا سکتا!

طبیب بلائے گئے اور انہوں نے بصد تاسّف کہہ دیا کہ زخم جان لیوا ہے۔ امیرالمومنین تھوڑے سے وقت کے مہمان ہیں۔

غور کیجئے کہ ایک شخص کی انتڑیاں کٹ چکی ہیں ــــ اس سے درد کی شدّت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ خون متواتر بہے جا رہا ہے۔ اس سے دم بدم نقاہت بڑھ رہی ہے۔ معالج مایوس ہو چکے ہیں۔ موت سامنے کھڑی ہے اور مہلت یونہی گھڑی دو گھڑی کی ہے۔ آپ کو معلوم ہے کہ ایسے میں 'اس عظیم شخصیت کو کون سا

جانشینی کا مسئلہ

خیال پریشان کر رہا ہے! یہ کہ میرے بعد' نظم و نسقِ مملکت کا کیا ہوگا! میرا جانشین کیسا ہوگا۔ اس انتہائی کرب والم اور اضطراب و انحطام کے عالم میں' آپ نے جس سکوت و سکون' اور جس تدبّر و تحمل سے اس اہم ترین مسئلہ کے متعلق ایک جامع اسکیم مرتّب فرمائی' جب مؤرخین اس پر غور کرتے ہیں تو محوِ حیرت رہ جاتے ہیں۔ آپ سے کہا گیا کہ آپ کسی موزوں شخصیت کو نامزد فرما دیجئے' جس طرح حضرت صدیق اکبرؓ نے آپ کا نام تجویز کر دیا تھا۔ آپ نے فرمایا کہ اگر ابی حذیفہؓ کا (آزاد کردہ) غلام' سالمؓ اور ابو عبیدہؓ بن جرّاح میں سے کوئی زندہ ہوتا تو میں اس کی سفارش کر دیتا۔ ایک شخص نے کہا کہ آپ اپنے بیٹے' عبداللہؓ سے کیوں گریز فرماتے ہیں۔ آپ نے فرمایا کہ خدا تجھے غارت کرے تو مجھے کون سے راستے کی طرف لے جانا چاہتا ہے (دوسری روایت میں ہے کہ آپ نے فرمایا کہ جس شخص کو اپنی بیوی کو طلاق دینے کا سلیقہ نہیں آیا' تم اسے سربراہِ مملکت بنانے کا مشورہ دے رہے ہو!) ہمارے نزدیک' اصل بات وہی ہے جو متعدد روایات میں آئی ہے کہ آپ نے فرمایا کہ " یہ بات پسندیدہ نہ ہوگی کہ میں اپنے گھر والوں کے لئے خلافت چاہوں۔ اگر یہ اچھی بات ہے تو خاندانِ خطاب اس سے بہرہ یاب ہو چکا ہے۔ اب یہ سعادت دوسروں کے حصے میں آنی چاہیئے اور اگر اس میں کوئی خرابی کی بات ہے تو خاندانِ خطاب میں سے ایک اسے بھگت چکا ہے۔ باقیوں کو محفوظ رہنے دیجئے۔"

انتہائی سوچ اور بچار کے بعد آپ نے چھ حضرات پر مشتمل ایک مجلسِ مشاورت متعیّن کر دی اور کہہ دیا کہ یہ لوگ باہمی مشاورت سے آپس میں سے کسی ایک کو خلیفہ منتخب کر لیں ــــ یعنی حضرت عثمانؓ (۲) حضرت علیؓ۔ (۳) حضرت زبیرؓ بن عوامؓ۔ (۴) حضرت طلحہؓ بن عبید اللہ۔ (۵) حضرت عبدالرحمٰنؓ بن عوف۔ (۶) حضرت سعد بن ابی وقاص (رضی اللہ عنہم)۔ ان کے علاوہ اپنے بیٹے' عبداللہ کو بھی نامزد کیا لیکن اس حیثیت سے کہ وہ صرف مشورہ دے سکے گا' خلافت کے لئے نہ امیدوار بن سکیگا' نہ منتخب کیا جا سکے گا۔ گویا ابنِ عمرؓ کی

حیثیت اس کمیٹی کے ممبر کی سی تھی۔

ادھر سے فارغ ہونے کے بعد، اپنی طرف متوجہ ہوئے۔ آپ کے ذمے کچھ قرض تھا۔ حضرت عبدالرحمٰن

قرض کی ادائیگی

بن عوفؓ کو معلوم تھا کہ آپ نے یہ رقم قرض لے کر نادار مسلمانوں پر خرچ کی تھی۔ آپ نے مشورہ دیا کہ آپ بیت المال سے روپیہ لے کر یہ قرض ادا کر دیں۔ ہم بعد میں دیکھ لیں گے۔ آپ نے فرمایا کہ ہاں! بعد میں آپ لوگ میری رعایت سے یہ طے کر دیں گے کہ بیت المال کا قرضہ معاف کر دیا جائے۔ اس سے تم تو مطمئن ہو جاؤ گے لیکن جس مصیبت میں، میں (خدا کے حضور) ماخوذ ہو جاؤں گا اس سے مجھے کون چھڑائے گا! میں ایسا نہیں کرنا چاہتا۔ اس پر حضرت عبداللہ بن عمرؓ نے باپ کے قرضہ کی ذمہ داری لے لی اور ان کے دفن ہونے سے پہلے اسے ادا کر دیا۔

حضرت عمرؓ کی دلی خواہش تھی کہ آپ اپنے محترم رفقاء، حضور نبیٔ اکرمؐ اور حضرت ابوبکر صدیقؓ کے ہم پہلو، حضرت عائشہؓ کے حجرہ میں دفن ہوں۔ آپ نے اپنے بیٹے، عبداللہ سے کہا کہ حضرت عائشہؓ کے پاس جاؤ اور کہو کہ عمرؓ آپ کی خدمت میں سلام عرض کرتا ہے ___ دیکھنا! امیرالمومنین عمر نہ کہنا۔ صرف عمرؓ کہنا ___ اور مستدعی ہے کہ آپ انہیں پہلوئے حضورؐ میں دفن ہونے کی اجازت مرحمت فرما دیں۔ حضرت

قبر کی جگہ

عائشہؓ نے کہا کہ وہ جگہ میں نے اپنے لئے مختص کر رکھی تھی لیکن میں عمرؓ کو اپنے آپ پر ترجیح دیتی ہوں۔ حضرت عبداللہ نے آکر حضرت عائشہؓ کا پیغام سنایا تو آپ بہت خوش ہوئے لیکن اس کے ساتھ ہی کہا کہ جب میں وفات پا جاؤں تو ایسا کرنا کہ میرا جنازہ لے کر جانا اور حضرت عائشہؓ سے ایک بار پھر اجازت طلب کرنا۔ ہو سکتا ہے کہ اس وقت انہوں نے میری خاطر ایسا کہہ دیا ہو۔ اگر وہ میری وفات کے بعد بھی اجازت عطا فرما دیں تو مجھے وہاں دفن کرنا، ورنہ مسلمانوں کے عام قبرستان میں دفن کر دینا۔

نزع کے عالم میں بھی اس قدر احتیاط، کسی فاروق ہی سے ممکن ہو سکتی ہے! کتنا نازک تھا یہ مقام اور کس قدر باریک تھا یہ فرق! وللہ درہٗ من قال۔

مرا مرنا، خلوصِ نوحہ گر کی آزمائش ہے۔

تقدیر کے متعلق حضرت عمرؓ کی نگہِ بلند اور فکرِ عمیق، عمواس کے طاعون کے واقعہ میں ہمارے سامنے آ چکے ہیں۔ طبقات ابن سعد میں ہے کہ جب حضرت عمرؓ کے خنجر مارا گیا، تو وہ کہہ رہے تھے کہ و کان

تقدیر کا مفہوم اَمْرُ اللّٰہِ قَدَرًا مَّقْدُوْرًا۔ (۳۳/۳۸) "خدا کا امر مقررہ پیمانوں کے مطابق ظہور میں آتا ہے۔" مطلب واضح ہے کہ خدا کا مقرر کردہ قانون یہ ہے کہ حادثوں سے موت اس وقت واقع ہوتی ہے جب حفاظتی تدابیر کی طرف سے غفلت برتی جائے۔ لہذا، یہ حادثہ خدا کے اسی قانون کے مطابق رونما ہوا ہے۔

یہ ہے **تقدیر** کا دوسرا مفہوم!

یوں تو آپ کی زندگی کا کوئی لمحہ ایسا نہ تھا جب آپ کو مواخذۂ آخرت کا خیال نہ ہو لیکن موت کے

مواخذۂ آخرت کا خیال قریب، فطرۃً یہ احساس اور بھی شدید ہو گیا۔ ایک شخص نے کہا کہ آپ اس خیال سے پریشان نہ ہوں۔ مجھے امید ہے کہ نارِ جہنم آپ کو مس تک نہیں کرے گی۔ اس شخص نے آپ کی طرف دیکھا تو آپ کی آنکھوں سے آنسو چھلک رہے تھے۔ آپ نے اس سے کہا کہ "اس باب میں تیرا علم بہت قلیل ہے۔ اگر میرے اختیار میں ہوتا تو میں اس آنے والے محاسبہ کے فدیہ میں دنیا کے سارے خزانے صرف کر دیتا۔" حضرت ابن عباسؓ نے آپ سے کہا کہ "آپ کتاب اللہ کے مطابق فیصلے کرتے تھے اور ہر ایک کے حقّے جز اپنہ برابر تقسیم کرتے تھے اس لئے آپ امیر المومنین، امین المومنین، سید المومنین ہیں۔" یہ سن کر آپ سنبھل کر بیٹھ گئے اور کہا کہ ابن عباسؓ! کیا تم اللہ کے حضور میرے لئے یہ شہادت دو گے؟ انہوں نے کہا کہ ہاں میں اس کی شہادت دونگا۔ اس پر آپ خوش ہوئے۔

لیکن لوگ جس قدر ان کی تعریف کرتے تھے، ذمہ داریوں کے محاسبہ کا احساس انتہائی شدید ہوتا جاتا تھا۔ روایت ہے کہ انہوں نے ایک تنکا اٹھایا اور کہا کہ اے کاش! میں عمرؓ ہونے کے بجائے یہ تنکا ہوتا تو ذمہ داریوں کے بوجھ سے چھوٹ جاتا۔ پھر فرمایا کہ تم لوگ میری تعریف کرتے ہو اور جنت کی بشارت دیتے ہو اور مجھے یہ خوف ستا رہا ہے کہ

اگر عمرؓ نے کسی کمزور پر ظلم کیا ہوگا اور اس کی فریاد آسمان پر پہنچی ہوگی تو اس کی ساری کی ساری نیکیاں صاحبِ عرش کے حضور بے وزن ہو جائیں گی۔

اسی حالت میں آپ نے اپنے اعزّہ سے کہا کہ مجھے عام مسلمانوں کی طرح سادہ پانی سے غسل دینا۔ اس میں مشک وعنبر نہ ملانا۔ مجھے معمولی کفن دینا کہ اگر اللہ کے نزدیک مجھ میں کوئی بھلائی ہوگی تو وہ اسے اچھے ملبوس میں

بدل دے گا اور اگر میں ایسا نہ ہؤا تو میرا اچھے سے اچھا لباس بھی مجھ سے چھین لیا جائے گا۔ یہ بھی فرمایا کہ میری قبر بھی معمولی ہونی چاہیئے۔

آخری وقت فرمایا کہ اف! اگر اللہ نے میری لغزشوں سے درگزر نہ فرمایا تو میرا انجام کیا ہوگا! یہ الفاظ زبان پر تھے کہ

اسلام کا یہ آفتابِ عالمتاب غروب ہوگیا، ہمیشہ کے لئے غروب!

ایک مزدور، حضرت صہیبؓ رومی نے آپ کی نمازِ جنازہ پڑھائی اور حجرۂ حضرت عائشہؓ میں حضور نبیٔ اکرمؐ اور صدیقِ اکبرؓ کی معیت میں دفن کردیئے گئے۔ طوبیٰ لھم وحسن ماٰب۔ بعض روایات میں ہے کہ بدھ کے دن اُن پر حملہ ہؤا، اور دوسری صبح، ۲۷ ذی الحجہ کو آپ دفن کئے گئے لیکن دوسری روایت میں ہے کہ وہ اتوار کے دن یکم محرم ۲۴ھ کو دفن کئے گئے۔ بعض روایات میں کہ آپ کی تاریخ وفات ۸ ریا ۱۰ محرم بھی بیان کی گئی ہے۔

آپ کی عمر کتنی تھی، اس کے متعلق متعین طور پر کچھ کہنا مشکل ہے۔ اصل یہ ہے کہ عربوں کے ہاں عدِ سنین (سالوں کی گنتی) کا اندازہ کچھ ایسا ہی تھا، اس لئے صدرِ اوّل کی ممتاز ترین ہستیوں کے سنِ ولادت اور عمر کے متعلق بھی متعین طور پر بہت کم معلوم ہوسکتا ہے۔ اور تو اور، خود حضور نبیٔ اکرمؐ کی عمر شریف کے متعلق بھی پختہ طور پر کچھ نہیں کہا جاسکتا۔ طبقاتِ ابن سعد اور طبریؔ ابتدائی دَور کی مستند کتب تاریخ سمجھی جاتی ہیں۔ ان دونوں میں حضورؐ کی عمر، ساٹھ برس، تریسٹھ برس، اور پینسٹھ برس لکھی ہے۔ فاروقِ اعظمؓ کی عمر کے متعلق بھی یہی کیفیت ہے۔ مختلف روایات کی رُو سے آپ کی عمر پچپن برس، ساٹھ برس، اکسٹھ برس، تریسٹھ برس اور پینسٹھ برس کی قرار پاتی ہے۔ آپ کی وفات کے متعلق تو معلوم ہے کہ وہ ۲۳ھ میں ہوئی لیکن (جیسا کہ شروع میں لکھا جاچکا ہے) آپ کے سنِ پیدائش کے متعلق یقینی طور پر کچھ نہیں کہا جاسکتا۔ اگر فاروقِ اعظمؓ کی عمر تریسٹھ برس کی تسلیم کرلی جائے تو آپ، نبیٔ اکرمؐ سے ۱۲/۱۳ برس عمر میں چھوٹے ہوتے ہیں۔

(٥) (٥)

آپ کی وفات کے بعد آپ کے رفقاء (دیگر صحابہ کبارؓ) نے جن جذباتِ خلوص و محبت کا اظہار فرمایا اور جو خراجِ تحسین و آفریں آپ کی بارگاہ میں پیش کیا، اس کی تفصیل خاصی گنجائش طلب ہے۔ ہم ان

رفقاء کا خراج تحسین

میں سے چند ایک کے پیش کرنے پر اکتفا کرتے ہیں۔ حضرت ابن عباسؓ کی روایت ہے کہ حضرت علیؓ ابن ابی طالب، حضرت عمرؓ کے جنازے کے قریب آئے اور فرمایا۔

مجھے آپ جیسے اعمالِ حسنہ والے انسان سے زیادہ کوئی محبوب نہیں۔ میری دلی تمنا ہے کہ میں بھی آپ جیسے اعمال لے کر خدا کے ہاں پہنچوں۔ (صحیح مسلم و ابن ماجہ، بحوالہ طنطاوی، طبع بیروت ص۲۶۱)

کتنی بڑی بات ہے جو چند لفظوں میں کہہ دی گئی ہے! حضرت عبداللہ ابن عمرؓ نے بیان کیا ہے کہ جب آپ کا جنازہ قبر کے قریب لایا گیا تو حضرت علیؓ نے فرمایا کہ "ہم کہا کرتے تھے کہ آپ کی زبان سے فرشتہ بولتا ہے۔" پھر فرمایا کہ "لوگو! جب صالح لوگوں کا ذکر کیا جائے تو عمرؓ کا ذکر کیا کرو۔" آپ (حضرت علیؓ) حضرت عمرؓ کو یاد کر کے اکثر رویا کرتے تھے۔ جب آپ سے اس بارے میں دریافت کیا گیا تو آپ نے فرمایا کہ

میں عمرؓ کی وفات پر اس لئے روتا ہوں کہ ان کی وفات سے اسلام میں ایک ایسا رخنہ پیدا ہو گیا ہے جو کبھی پُر نہیں ہو سکتا۔ (تاریخ الخلفاء و ابن جوزی، بحوالہ طنطاوی ص۲۶۱)

علامہ طنطاوی نے یہ بھی لکھا ہے کہ حضرت علیؓ اور امیر معاویہؓ میں باہمی اختلاف کے دوران، آپ نے (حضرت علیؓ نے) دیکھا کہ بعض لوگ حضرت ابو بکرؓ اور حضرت عمرؓ کے متعلق کچھ نازیبا الفاظ استعمال کر رہے ہیں۔ آپ برسرِ منبر تشریف لے گئے اور ایک طویل اور بلیغ خطبہ ارشاد فرمایا۔ رسول اللہؐ اور حضرت ابو بکرؓ کے تذکارِ جلیلہ کے بعد کہا۔

ان کے بعد عمرؓ خلیفہ ہوئے تو کچھ لوگ ان سے ناراض تھے اور کچھ راضی لیکن جب وہ دنیا سے رخصت ہوئے تو جو پہلے ناراض تھے وہ بھی ان سے راضی تھے۔ انہوں نے رسول اللہؐ اور آپ کے ساتھی (حضرت ابو بکرؓ) کے نقوشِ قدم پر معاملات کو سنوارا۔ وہ ان دونوں کا اس طرح اتباع کرتے تھے جیسے بچہ اپنی ماں کا۔ بخدا وہ (حضرت عمرؓ) رفیق و رحیم اور مظلوموں کے لئے باعث تقویت و رحمت و نصرت تھے۔ اللہ کی راہ میں کسی ملامت کرنے والے کی ملامت سے نہ ڈرتے۔ اللہ تعالیٰ نے حق ان کی زبان پر اتارا اور صدق کو ان کی شان ٹھہرایا۔ حتیٰ کہ ہم خیال کیا کرتے تھے کہ ان کی زبان سے فرشتہ بولتا ہے۔ انہوں نے اسلام لا کر اسلام کو تقویت بخشی اور اپنی ہجرت کو دین کے لئے وجہ استحکام بنایا۔ اللہ نے منافقین کے دلوں میں ان کا رعب طاری کر دیا تھا اور مومنوں کے دلوں میں ان کی محبت استوار

کردی تھی۔ رسول اللہ نے انہیں جبریل اور (حضرت) نوح کے ساتھ تشبیہ دی تھی۔ طاعتِ الٰہی میں نقصان اٹھانا انہیں اس نفع سے زیادہ محبوب تھا جو معصیتِ خداوندی سے حاصل ہو۔ تم ان جیسے کہاں سے لاؤ گے!

(طنطاوی، طبع بیروت، ص ۲۶۲)

حضرت ابو عبیدہ ابن جراحؓ کہا کرتے تھے کہ "جب حضرت عمرؓ انتقال کر جائیں گے تو اسلام کمزور ہو جائے گا میں نہیں چاہتا کہ میں عمرؓ کے بعد زندہ رہوں۔" حضرت عبداللہ ابن عباسؓ سے (حضرت) عمرؓ کے متعلق دریافت کیا گیا تو آپ نے فرمایا کہ:-

بخدا! وہ حلیفِ اسلام، پناہ گاہِ یتیماں، محلِّ ایمان، منتہائے احسان، کمزوروں کے فریادرس، عوام الناس کے مددگار تھے۔ انہوں نے حق کو نہایت استقامت اور احتسابِ خویش کے ذریعے قائم کیا حتیٰ کہ دین غالب آگیا، ملک فتح ہو گئے اور میدانوں اور کہساروں پر خدا کا نام بلند ہونے لگا۔

(الریاض النضرۃ، بحوالہ طنطاوی ص ۲۶۳)

حضرت عبداللہ بن مسعودؓ نے فرمایا:-

تم قرآن اس طرح پڑھا کرو جس طرح عمرؓ پڑھا گئے ہیں۔ وہ اسلام کا ایک مضبوط قلعہ تھے کہ لوگ اس میں داخل ہو جاتے تو پھر کبھی نہ نکلتے۔ ان کی شہادت کے بعد وہ قلعہ ٹوٹ گیا ہے۔ اب لوگ اسلام سے نکل سکتے ہیں۔ (طنطاوی ص ۲۶۴)

نیز (جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا ہے) فرمایا:-

اگر عمرؓ کا علم ایک پلڑے میں اور عرب کے تمام قبائل کا علم دوسرے پلڑے میں رکھ دیا جائے تو بھی عمرؓ کے علم کا پلڑا بھاری ہوگا۔ آپ کتابِ الٰہی کے سب سے بڑے عالم اور دینِ خداوندی کے سب سے بڑے فقیہہ تھے۔ آپ کا داخلِ اسلام ہونا اسلام کے لئے باعثِ فتح و نصرت، آپ کی ہجرت موجبِ تقویت اور آپ کی حکومت رحمت تھی۔ (طنطاوی ص ۲۶۴)

حضرت عائشہؓ نے فرمایا کہ

جس کسی نے عمرؓ کو دیکھا اس نے جان لیا کہ خدا نے انہیں، اسلام کو دیگر تمام سہاروں سے مستغنی کرنے کے لئے پیدا کیا ہے۔ وہ اپنے کمالات میں منفرد تھے۔ (ابن جوزی، بحوالہ طنطاوی ص ۲۶۶)

ہم اسی پر اکتفا کرتے ہیں، ورنہ ــــ سفینہ چاہیئے اس بحرِ بیکراں کے لئے ــــ اور اس پر اپنی طرف سے صرف

اتنا اضافہ کرنا چاہتے ہیں کہ

اگر آج اسلام 'ایک زندہ و پائندہ مکمل نظام معاشرہ (دین) کی شکل میں سامنے آتا ہے تو وہ عہدِ فاروقیؓ کا اسلام ہے۔ حضورؐ نبی اکرم نے اس کی بنیاد رکھی۔ صدیقِ اکبرؓ نے خارجی خطرات سے اس کی حفاظت کی اور فاروق اعظمؓ نے اسے پروان چڑھایا۔ (رضی اللہ عنہم و رضوا عنہ)

سازش کا انکشاف

ہم یہ لکھ رہے ہیں اور اس امر کا احساس قدم قدم پر عناں گیر ہو رہا ہے کہ شہادتِ حضرت عمرؓ کے حادثۂ فاجعہ کے سلسلہ میں جو کچھ جاننے کے لئے قارئین اس قدر مضطرب و بے قرار ہیں' اسے سامنے لائے بغیر آگے نہ بڑھا جائے لیکن وہ معاملہ بڑا اہم بھی ہے اور نہایت شکیب آزما بھی۔

حضرت عمرؓ کے قاتل کا نام ابولؤلؤ فیروز تھا۔ یہ نصرانی المذہب' ایران کا باشندہ تھا۔ نہاوند کی جنگ میں پکڑا گیا اور والئ کوفہ' حضرت مغیرہ بن شعبہؓ کی تحویل میں آ گیا اور انہی کے ہاں رہنے لگا۔ حضرت عمرؓ کسی ایسے قیدی کو مدینے میں داخل نہیں ہونے دیتے تھے جو بالغ ہو چکا ہو۔ حضرت مغیرہؓ نے ایک دفعہ آپ کو لکھا کہ ابولؤلؤ بڑا چابکدست' ہنرمند (لوہار' بڑھئی اور نقّاش) ہے۔ اسے مدینہ آنے کی اجازت دے دیجئے یہ وہاں کے لوگوں کے لئے بڑا کارآمد ثابت ہوگا۔ آپ نے اسے اجازت دیدی۔

تاریخ بتاتی ہے کہ ایک دفعہ یہ شخص حضرت عمرؓ کی خدمت میں حاضر ہوا اور کہا کہ حضرت مغیرہؓ مجھ پر زیادتی کرتے ہیں۔ میں کام زیادہ پیسوں کا کرتا ہوں اور وہ مجھے بہت کم مزدوری دیتے ہیں۔ آپ نے تفصیل معلوم کرنے پر کہا کہ اس کی شکایت بے جا ہے۔ حضرت مغیرہؓ اس پر زیادتی نہیں کر رہے۔ یہ سن کر وہ ہونٹوں کو تو واپس ہو گیا لیکن حضرت عمرؓ کے خلاف انتقام کی آگ کو سینے میں چھپائے رکھا۔ ایک دفعہ وہ حضرت عمرؓ کے پاس سے گزرا تو آپ نے اس سے کہا کہ میں نے سنا ہے کہ تو کہتا ہے کہ میں ایسی چکّی بنا سکتا ہوں جو ہوا سے چلے۔ اس نے آپ کی طرف ترشروئی سے دیکھا اور کہا کہ "میں آپ کے لئے ایسی چکّی بنا دوں گا کہ تمام لوگ اسکے متعلق باتیں کیا کریں گے"۔ کچھ لوگ حضرت عمرؓ کے ساتھ تھے۔ آپ نے ان سے کہا کہ یہ شخص آج مجھے دھمکی دے گیا ہے۔ چنانچہ وہ موقعہ کی تلاش میں رہا اور اس صبح آپ پر حملہ کر دیا۔

صاف نظر آ رہا ہے کہ تاریخ کا یہ بیان بڑا سطحی سا ہے۔ حضرت عمرؓ کی طرف سے اتنی سی بات فیروز کو

ایسے سنگین اور جرأت آزما جرم کے ارتکاب پر آمادہ کرنے کے لئے کافی جذبۂ محرکہ قرار نہیں پا سکتی۔ مدینہ جیسے دارالخلافہ میں، حضرت عمرؓ جیسے سربراہِ مملکت کے قتل کے لئے اس سے کہیں زیادہ قوی جذبۂ محرکہ کی ضرورت تھی۔ اس جذبۂ محرکہ کی غمازی اس خنجر نے کر دی جس سے فیروز نے (حملہ کے بعد) خودکشی کر لی تھی جب حضرت عبدالرحمٰن بن عوفؓ نے وہ خنجر دیکھا تو کہا کہ میں نے اس خنجر کو کل ہرمزان اور جفینہ کے پاس دیکھا تھا۔ میں نے ان سے پوچھا کہ تم اس چھری سے کیا کرو گے؟ تو انہوں نے کہا کہ ہم اس سے گوشت کاٹیں گے کیونکہ ہم گوشت کو ہاتھ نہیں لگاتے۔ یہ دو دھارا خنجر اس مقصد کے لئے بڑا موزوں ہوتا ہے۔ اس کے بعد حضرت عبدالرحمٰن بن ابوبکرؓ نے کہا کہ میں (حضرت) عمرؓ کے قاتل، ابو لُؤلُوء کے پاس سے گزرا۔ جفینہ اور ہرمزان اس کے ساتھ تھے اور وہ آپس میں چپکے چپکے باتیں کر رہے تھے۔ میں دفعتہً ان کے پاس پہنچا تو وہ بھاگ گئے اور ایک خنجر ان کے ہاتھوں سے گر پڑا جس کے دو پھل اور بیچ میں دستہ تھا۔ ذرا دیکھوں کہ وہ خنجر کیسا ہے جس سے (حضرت) عمرؓ کو شہید کیا گیا ہے۔ جب انہوں نے خنجر کو دیکھا تو کہا کہ یہ تو وہی خنجر ہے جس کا میں نے ابھی ابھی ذکر کیا ہے۔

ہرمزان وہی ایرانی گورنر تھا جو پابجولاں حضرت عمرؓ کے سامنے آیا تھا اور (پانی کا پیالہ زمین پر گرا کر) ایک پُرفریب چال سے قتل ہونے سے بچ گیا تھا۔ بعد میں وہ مسلمان ہو کر مدینہ ہی میں قیام پذیر ہو گیا تھا۔ ــــ اور جفینہ، حیرہ کا رہنے والا عیسائی تھا جو حضرت سعد بن ابی وقاص کا دودھ شریک بھائی تھا۔ وہ اس رشتہ سے اسے مدینہ لے آئے تھے جہاں وہ لوگوں کو پڑھایا لکھایا کرتا تھا ــــ زبانِ خنجر نے اس طرح ایک گہری سازش کا راز افشا کر دیا۔

حضرت عمرؓ کے بیٹے، حضرت عبیداللہؓ کو جب اس سازش کا یقین ہو گیا تو ان کی آنکھوں میں خون اُتر آیا۔

سازشیوں کا قتل

وہ باپ کے قتل کے قصاص کے لئے جوش میں اٹھے، تلوار ہاتھ میں لی ــــ پہلے ہرمزان کو قتل کیا۔ پھر جفینہ کو۔ اس کے بعد ابو لُؤلُوء کی ایک صغر سن بیٹی سامنے آئی تو اسے بھی قتل کر دیا۔ لوگوں نے بڑی مشکل سے ان پر قابو پایا۔

ضمناً، حضرت عبیداللہؓ کا یہ اقدام، اسلام کے قانونِ عدل کی رُو سے درست نہیں تھا۔ چنانچہ بعد میں ان پر مقدمہ چلایا گیا۔ حضرت علیؓ نے ان کے قتل کئے جانے کا مشورہ دیا لیکن خلیفۃ المسلمین حضرت عثمانؓ نے خود خون بہا ادا کر کے معاملہ کا تصفیہ کر دیا۔ اس مقام پر ایک تجسس طلب ذہن پھر متعجب رہ جاتا ہے کہ اس

معاملہ کو نجی اور انفرادی، واردات قتل اور ذاتی انتقام تک محدود رکھا گیا۔ اور حکومت نے اس سازش کی تحقیقات کے سلسلہ میں کوئی اقدام نہ کیا۔ اگر ایسا کر لیا جاتا تو عالم اسلام (شاید) ان خطرات سے (کم از کم بڑی حد تک) محفوظ ہو جاتا جو بعد میں وقوع پذیر ہوئے اور جس سے تاریخ کا نقشہ بدل گیا۔

لیکن ہمارے لئے اس سے بھی زیادہ موجب حیرت اس حقیقت کا احساس ہے کہ بعض اوقات، بڑے سے بڑے دیدہ ور، نہایت دور اندیش، انتہائی محتاط مدبر سے بھی کس طرح ایسی چوک ہو جاتی ہے جس کے نتائج و عواقب بڑے دوررس ہوتے ہیں۔

حضرت عمرؓ نہایت محتاط اور دور اندیش واقعہ ہوئے تھے۔ (مثلاً) جنگ بدر کے بعد کا واقعہ ہے کہ ایک دن آپ مدینے میں، چند دوستوں کے ساتھ بیٹھے، معرکہ بدر کے احوال و کوائف بیان کر رہے تھے کہ آپ نے دیکھا کہ ایک شخص مسجد نبویؐ کے باہر اونٹ سے اُترا ہے اور حضورؐ کی بابت دریافت کر رہا ہے۔

احتیاط کی کمی

آپ فوراً آگے بڑھے۔ دیکھا کہ وہ عمیر بن وہب ہے۔ یعنی ان ممتاز قریشیوں میں سے ایک، جنہوں نے ابھی ابھی بدر میں ذلت آمیز شکست کھائی تھی۔ وہ حضورؐ کی خدمت میں جانا چاہتا تھا۔ آپؐ نے سنا تو فرمایا کہ اسے اندر بھیج دیا جائے لیکن حضرت عمرؓ نے اسے آزادانہ اندر جانے کی اجازت نہ دی۔ اس کی تلوار کے پرتلے سے اس کی مشکیں کسیں اور انصار سے کہا کہ اسے اسی حالت میں حضورؐ کی خدمت میں لے جاؤ اور وہاں چوکنے رہو کہ اس قسم کے دشمنوں پر کبھی اعتماد نہیں کیا جا سکتا۔

ہرمزان نے عمیر بن وہب سے بھی زیادہ ذلت آمیز شکست کھائی تھی اور جس پُرفریب طریقہ سے اس نے اپنی جان بچائی تھی وہ بھی کوئی پوشیدہ راز نہیں تھا۔ پھر کیا یہ مقام حیرت نہیں کہ حضرت عمرؓ نے نہ صرف یہ کہ اسے مدینہ میں رہنے کی اجازت دے دی بلکہ اسے اتنا قریب کر لیا کہ اس سے امور مملکت میں مشورے بھی لیتے رہے۔

آپؓ نے حکم دے رکھا تھا کہ بالغ قیدیوں کو مدینہ میں نہ آنے دیا جائے (حالانکہ بعض صحابہ بالخصوص حضرت عباسؓ چاہتے تھے کہ ایرانی قیدیوں کو مدینے آنے دیا جائے لیکن آپ نے اس کی سخت مخالفت کی تھی)۔ لیکن اس کے باوجود، فیروز کو مدینہ آنے کی اجازت دے دی اور اس کی نقل و حرکت پر کوئی نگاہ نہ رکھی۔ اگر عام حالات میں اس کی ضرورت کا احساس نہیں ابھرا تھا تو ہرمزان، جفینہ، فیروز وغیرہ کی خفیہ

ملاقاتوں سے تو اس اندیشہ کو بیدار ہو جانا چاہیئے تھا۔ حیرت ہے کہ ایسا کیوں نہ ہوا؟ لیکن ہم آج اس کے متعلق کیا کہہ سکتے ہیں جب کہ حقیقت تک پہنچنے کا ہمارے پاس کوئی ذریعہ ہی نہیں۔ ذریعہ تو لے دے کے تاریخ ہی ہے اور تاریخ جس سطحی طور پر اس حادثہ سے آگے گزر گئی ہے وہ ہمارے سامنے ہے۔

تاریخ کے بعض بیانات سے یہ بھی مترشح ہوتا ہے کہ بعض گوشوں کی طرف سے، مبہم طور پر ہی سہی، اس ہونے والے حادثہ کے متعلق اشارات کئے گئے ہیں۔ (مثلاً) جُبیر بن مطعم کا بیان ہے کہ حضرت عمرؓ کے آخری حج میں، میں ان کے ساتھ تھا۔ ہم جبلِ عرفات پر کھڑے تھے کہ ایک شخص نے پکارا، یا خلیفۃ الرسول اللہ۔ پھر کہا یا امیر المومنین! بنولہب کے ایک بدو نے سُنا تو کہا کہ کون چلا رہا ہے۔ واللہ، امیر المومنین اس سال کے بعد، جبلِ عرفات پر کبھی کھڑے نہیں ہوں گے۔ جب صبح ہوئی تو رمی الجمار کے وقت ایک کنکر آپ کے سر پر آکر لگی جس سے ایک رگ پھٹ گئی۔ میں نے اسی شخص کو پھر دامنِ کوہ سے کہتے ہوتے سنا کہ اس سال کے بعد امیر المومنین یہاں کبھی نہیں ٹھہریں گے۔

عینیہ بن حصن نے آپ سے کہا کہ "یا تو آپ اپنی حفاظت کیجئے یا اہلِ عجم کو مدینہ سے باہر نکال دیجئے کیونکہ مجھے خطرہ ہے کہ ان میں سے کوئی آپ پر وار نہ کر دے۔"

سب سے اہم روایت آپ کی زوجۂ مطہرہ (حضرت علیؓ کی صاحبزادی) حضرت اُمّ کلثومؓ کی ہے۔ حضرت عمرؓ نے ایک دن دیکھا کہ وہ رو رہی ہیں۔ دریافت کرنے پر انہوں نے کہا کہ کعب احبار کہتا ہے کہ آپ جہنم کے دروازے پر کھڑے ہیں۔ آپ نے کعب کو بلا کر پوچھا تو اس نے کہا کہ امیر المومنین! جلد بازی سے کام نہ لیجئے۔ ذی الحجہ ختم نہیں ہو گا کہ آپ جنت میں داخل ہو جائیں گے۔ آپ نے فرمایا کہ تم کبھی کہتے ہو جہنم میں، کبھی کہتے ہو جنت میں۔ اس نے کہا کہ یا امیر المومنین! ہم کتابِ خداوندی میں آپ کو جہنم کے دروازے پر پاتے ہیں کہ آپ لوگوں کو اس میں گرنے نہ دیں۔ پھر جب آپ کی وفات ہو جائے گی تو لوگ قیامت تک جہنم میں دھڑا دھڑ گرتے جائیں گے۔ اس کے بعد وہ ایک دن پھر حاضرِ خدمت ہوا اور کہا کہ امیر المومنین! آپ وصیت کر دیجئے کیونکہ آپ تین دن کے اندر اندر وفات پا جائیں گے۔ آپ نے کہا کہ تمہیں کیسے معلوم ہوا ہے۔ اس نے کہا کہ ہم کتابِ خداوندی میں ایسا لکھا پاتے ہیں۔ آپ نے فرمایا کہ کیا تورات میں عمرؓ ابن خطاب کا ذکر ہے! اس نے کہا کہ آپ کے نام سے تو آپ کا ذکر تورات میں نہیں لیکن اس میں جو قرائن و شواہد اور حلیہ اور شمائل مذکور ہیں وہ بالکل آپ کے سے ہیں۔ اس سے میں نے یہ اندازہ لگایا ہے۔ اس کے بعد

دو دن متواتر آپ کے پاس آتا رہا اور جس صبح کو یہ ناشدنی واقعہ ہونا تھا اس سے پہلی رات کو آکر واضح الفاظ میں کہا کہ اب وقت باقی نہیں رہا۔

کعب احبار، مدینہ میں یہودیوں کا ایک بہت بڑا عالم تھا۔ اسلام تو نہیں لایا تھا لیکن نبی اکرمؐ کی خدمتِ اقدس میں اکثر حاضر ہوتا رہتا تھا۔ حضرت عمرؓ کے زمانہ بھی عام مسلمانوں اور امیر المومنین سے خلا ملا رکھتا تھا۔ جب حضرت عثمانؓ کی خلافت کا فیصلہ ہو گیا تو پھر اسلام لے آیا۔

جو روایات اوپر درج کی گئی ہیں ہم ان کی بالکلیہ صداقت کو تسلیم نہیں کرتے لیکن ایسا نظر آتا ہے کہ حضرت عمرؓ کے خلاف سازش کی بھنک ان لوگوں نے پالی تھی، لیکن وہ علانیہ، یا غیر مبہم طور پر اس کا ذکر کرنا نہیں چاہتے تھے۔ انہوں نے اسے اشارات و کنایات کے پردوں میں حضرت عمرؓ تک پہنچانے کی کوشش کی تھی۔ کعب احبار نے اسے جو کتابِ خداوندی کا مقدس نقاب اڑھایا ہے تو اس سے بھی غالباً اس کا مقصد یہی تھا کہ حضرت عمرؓ تک وارننگ بھی پہنچ جائے اور وہ (کعب) اس کے لئے بھی قرار نہ پائے۔ (اگرچہ ایک اور مصری مورخ عباس محمود العقاد کی رائے یہ ہے کہ خود کعب بھی اس سازش میں شریک نظر آتا ہے۔ ہم ان کی اس رائے سے بھی متفق نہیں، کیونکہ اگر ایسا ہوتا تو وہ خود آکر حضرت عمرؓ کو اس قسم کی وارننگ کیوں دیتا۔ ہم زیادہ سے زیادہ یہی کہہ سکتے ہیں کہ اسے اس کا علم تھا لیکن وہ بعض مصالح کی بنا پر متعین طور پر اس کا ذکر نہیں کرنا چاہتا تھا)۔

اگر ان روایات میں کچھ بھی صداقت ہے تو حیرت ہوتی ہے کہ حضرت عمرؓ نے ان انتباہات کو بھی درخورِ اعتنا نہ سمجھا۔ اصل یہ ہے کہ حضرت عمرؓ جیسے صاحبِ عزیمت انسان کو جب زندگی میں اس قدر محیر العقول کامیابیاں حاصل ہوتی جائیں تو اس میں اس حد تک خود اعتمادی پیدا ہو جاتی ہے کہ وہ اپنے لئے کسی احتیاط کی ضرورت نہیں سمجھتا۔ بہرحال، یہ حضرت عمرؓ کی (ضرورت سے زیادہ) خود اعتمادی تھی یا آپ کی حفاظت کے سلسلہ میں آپ کے رفقاء کی عدمِ احتیاط، نتیجہ اس کا نوعِ انسان کے لئے ایک ایسا عالمگیر نقصان ہے جس کی تلافی ہو ہی نہیں سکتی۔ اس سے عالمِ انسانیت میں صفِ ماتم بچھ گئی، اور نہ معلوم ابھی یہ

لے حضرت عمرؓ کے بیت المقدس کے دورہ کے وقت، کعب احبار سے آپ نے جو کچھ فرمایا تھا، وہ اُس مقام پر درج کیا جا چکا ہے۔

صفیں کب تک بچھی رہیں!

اور نچوڑ اس داستانِ خونچکاں کا یہ کہ ایران نے مسلمانوں کے ہاتھوں جو اس قدر ذلت آمیز شکست کھائی تھی، یہ اس کے انتقام کا پہلا قدم تھا ـــــ اس کے بعد کے اقدامات کے لئے چودھواں باب دیکھئے۔

بزمِ انجم

شمعِ نظر، خیال کے انجم، جگر کے داغ
جتنے چراغ ہیں، تری محفل سے آئے ہیں!

گذشتہ صفحات میں، عالمِ انسانیت کے اس بطلِ جلیل کے بیشمار ایسے اقوال آپ کے سامنے آئے ہیں جو سمائے تاریخ پر درخشندہ ستاروں کی طرح جگمگ جگمگ کر رہے ہیں، اور چونکہ وہ قرآن کے ابدی حقائق پر متفرع ہیں اس لئے مرورِ زمانہ ان کی تابندگی پر کبھی اثر انداز نہیں ہو سکتا۔ وہ آج بھی اسی طرح تر و تازہ ہیں اور ہمیشہ اسی طرح سرسبز و شاداب رہیں گے۔ وہ ان صفحات میں رخشندہ موتیوں کی طرح بکھرے ہوئے ہیں۔ ہم نے مناسب سمجھا ہے کہ انہیں ترتیب کی مالائیں پرو کر یکجا کر دیا جائے تاکہ ان سے کسبِ ضیا کرنے میں آسانی رہے۔ جنابِ فاروقِ اعظمؓ نے فرمایا۔

۱۔ حَسْبُنَا كِتَابُ اللهِ۔ (ہمارے لئے خدا کی کتاب کافی ہے۔) (چوتھا باب)

۲۔ خدا نے کائنات تمہارے لئے پیدا کی ہے اور تمہیں اپنے لئے۔ " "

۳۔ "واللہ اعلم" مت کہو۔ جو بات نہیں جانتے اس کے متعلق سیدھے طور پر کہو کہ میں نہیں جانتا۔ " "

۴۔ مسئلہ تقدیر کا حل ۔۔ میں خدا کی ایک تقدیر سے ہٹ کر خدا ہی کی دوسری تقدیر کی طرف جا رہا ہوں۔ " "

۵۔ خدا، انسانوں کو براہِ راست رزق نہیں دیتا۔ انسانوں کے ذریعے دیتا ہے۔ " "

۶۔ متوکل وہ ہے جو زمین میں دانہ ڈالتا ہے اور پھر (خدا کے قانونِ زراعت پر) بھروسہ کرتا ہے۔ " "

۷۔ اِنَّ اللهَ يَرْفَعُ بِالْقُرْآنِ اَقْوَامًا وَّ يَضَعُ بِالْقُرْآنِ اَقْوَامًا (خدا قوموں کے عروج و زوال کے فیصلے قرآن کے مطابق کرتا ہے۔) " "

۸۔ محض لاالٰہ کہہ دینے سے جنت نہیں مل سکتی۔ جنت عمل سے ملتی ہے۔ (چوتھا باب)
۹۔ حجرِ اسود صرف ایک پتھر ہے۔ نہ کسی کو نفع پہنچا سکتا ہے نہ نقصان۔ ״
۱۰۔ کسی قوم سے مقابلہ کے وقت یہ نہ دیکھو کہ اس کی اخلاقی خرابیاں، تمہاری خرابیوں سے زیادہ ہیں۔ دیکھو یہ کہ تمہاری اخلاقی خوبیاں اس سے کتنی زیادہ ہیں یہ ہے کامیابی کا راز۔ (پانچواں باب)
۱۱۔ اگر تم یہ جاننا چاہتے ہو کہ اللہ کے ہاں تمہارا کیا مقام ہے تو یہ دیکھو کہ خدا کی مخلوق تمہیں کیسا سمجھتی ہے۔ (״)
۱۲۔ جب حاکم بگڑ جاتا ہے تو رعایا بھی بگڑ جاتی ہے۔ سب سے بدبخت حاکم وہ ہے جس کے سبب رعایا بگڑ جائے۔ (״)
۱۳۔ مومن نہ کسی کو دھوکا دیتا ہے، نہ دھوکا کھاتا ہے (چھٹا باب)
۱۴۔ ہماری عزت و عظمت اسلام کے صدقہ میں ہے۔ اس لئے سب تعریف و ستائش اسی کی ہونی چاہیئے نہ کہ ہماری۔ (״)
۱۵۔ خلافت کے معنی یہ ہیں کہ خدا کو حساب دیتے وقت بتایا جا سکے کہ کہاں سے لیا تھا اور کسے دیا تھا! اگر یہ جواب اطمینان بخش ہے تو وہ خلافت ہے ورنہ ملوکیت۔ (ساتواں باب)
۱۶۔ کسی کے ثقہ اور قابلِ اعتماد ہونے کا معیار یہ ہے کہ وہ باہمی معاملات میں کھرا ثابت ہو، نہ کہ وہ جو نمازیں بہت پڑھتا ہو۔ ״
۱۷۔ بھوک سے مجبور ہو کر چوری کرنے والے کو سزا نہیں دی جائے گی۔ سزا اسے دی جائے گی جس نے اُسے اُس حالت تک پہنچایا۔ (حاطب ابن بلتعہ کے غلاموں کا واقعہ) ״
۱۸۔ اگر کسی کی وجاہت کے خیال سے قانون کا پلڑا اس کے حق میں جھک جائے تو خدا کی بادشاہت اور قیصر و کسریٰ کی حکومت میں فرق کیا ہوا! (جبلہ بن ایہم کا واقعہ) ״
۱۹۔ لوگوں کو ان کی مائیں آزاد جنتی ہیں، انہیں غلام بنانے کا کسی کو حق نہیں۔ ״
۲۰۔ جب تک سربراہِ مملکت پر وہی کچھ نہ گزرے جو رعایا پر گزرتی ہے، اسے ان کی تکالیف کا احساس کیسے ہو سکتا ہے۔ (آٹھواں باب)
۲۱۔ اللہ تعالٰے، حالات اور زمانے کے تقاضوں سے لوگوں کے لئے نئے نئے مسائل پیدا کرتا رہتا ہے۔ اس لئے ان کے حل کے لئے جدید قوانین کی ضرورت ہوتی ہے۔ (نواں باب)

۲۲۔ عمر کی رائے وحیِ خداوندی نہیں۔ یہ ایک انسان کی رائے ہے جو غلط بھی ہو سکتی ہے۔ اسے سند اور سنّت نہ بناؤ۔ (نواں باب)

۲۳۔ حکومت کے منصب کے لئے ایسا شخص سب سے زیادہ موزوں ہے کہ جب وہ اس منصب پر فائز نہ ہو تو قوم کا سردار نظر آئے اور جب اس پر فائز ہو جائے تو انہی میں کا ایک فرد معلوم ہو۔ (" ")

۲۴۔ طاقتور خائن اور کمزور دیانتدار، دونوں حکومت کے لئے نقصان رساں ہوتے ہیں۔ (" ")

۲۵۔ جس کے دل میں اپنی اولاد کے لئے محبت نہیں وہ رعایا کے لئے شفیق کس طرح ہو سکتا ہے۔ (" ")

۲۶۔ جو شخص خود کسی منصب کا خواہشمند ہو، اسے اس پر تعیّنات نہیں کرنا چاہیئے۔ (" ")

۲۷۔ رعایا اس وقت تک اپنے حاکم کی اطاعت کرتی ہے جب تک وہ قوانینِ خداوندی کی اطاعت کرتا رہتا ہے۔ جب وہ فسق و فجور میں پڑ جاتا ہے تو رعایا اس سے بھی زیادہ فاسق و فاجر ہو جاتی ہے۔ (" ")

۲۸۔ ایک گورنر کو لکھا کہ تم اپنی رعایا کے لئے ایسے بن جاؤ کہ اگر تم رعیّت ہوتے تو چاہتے کہ ہمارا امیر ایسا ہونا چاہیئے۔ (" ")

۲۹۔ وہی حکومت درست رہ سکتی ہے جس میں نرمی ہو، لیکن کمزوری کی وجہ سے نہیں اور سختی ہو لیکن استبداد کی بنا پر نہیں۔ (" ")

۳۰۔ گورنر کو لکھا کہ ایسا بن کر رہو کہ امن پسند تجھ سے بے خوف ہو اور بدقماش خوفزدہ۔ (" ")

۳۱۔ جو شر پیدا کر کے غالب آیا، وہ غالب نہیں، مغلوب ہے۔ جو ناجائز طریق سے کامیاب ہوا، وہ کامیاب نہیں، ناکام ہے۔ (" ")

۳۲۔ جب تک اسلام میں حکومت کا زور ہے وہ ناقابلِ شکست رہے گا لیکن حکومت کے زور کا مطلب تلوار نہیں۔ اس کا مطلب حق کے ساتھ فیصلہ اور انصاف کے ساتھ مواخذہ کرنا ہے۔ (" ")

۳۳۔ جو شخص مسلمانوں کا امیر بنے اس کے ضروری ہے کہ وہ غلاموں کی طرح مخلص اور امین ہو۔ (" ")

۳۴۔ جھوٹا موٹا کھاؤ۔ گاڑھا گزی پہنو۔ عجمیوں کا سا تکلف نہ کرو۔ (" ")

۳۵۔ جس میں تکبّر دیکھو، سمجھ لو کہ وہ احساسِ کمتری کا شکار ہے۔ (" ")

۳۶۔ اپنا محاسبہ کرو قبل اس کے کہ تمہارا محاسبہ کیا جائے۔ (" ")

۳۷۔ جس حاکم کے محل کے دروازے عوام کے لئے بند ہو جائیں وہ قصرِ سعد نہیں قصرِ فساد ہے۔ (نواں باب)

۳۸۔ مرد کا حسب، اس کا دین، نسب اس کی عقل اور مردانگی اس کا حسنِ خلق ہے۔ نکاح کے رشتوں کے لئے یہ خوبیاں تلاش کرو۔ (دسواں باب)

۳۹۔ ازدواجی زندگی میں تصوّراتی معیار ( ) کام نہیں دیتا۔ اس میں لچک رکھنے کی ضرورت ہوتی ہے۔ (" ")

۴۰۔ ایک زاہدِ مرتاض سے کہا کہ خدا تجھے غارت کرے، ہمارے دین کا گلا کیوں گھونٹ رہا ہے۔ (" ")

۴۱۔ دنیا کی سب سے بڑی مصیبت، کم مال اور کثرتِ عیال ہے۔ (" ")

۴۲۔ جوانوں سے کہا کہ جوانوں کے زمانے میں ہر ایسی بات سے بچو جو تمہاری بدنامی کا باعث ہو تاکہ اگر تم بعد میں بڑے آدمی بن جاؤ تو تمہارا ماضی تمہارے لئے وجہِ ندامت نہ ہو۔ (" ")

۴۳۔ کسی شخص کے اخلاق پر بھروسہ نہ کرو جب تک اسے غصّہ کی حالت میں نہ آزما لو۔ (" ")

۴۴۔ انسان کی عجیب حالت ہے۔ اس کے بیل یا گدھے میں کوئی خرابی پیدا ہو جائے تو اس کی اصلاح کے لئے دوڑ دھوپ کرتا ہے لیکن اس کی اپنی ذات میں خرابی پیدا ہو جائے اس کی اصلاح کی طرف توجہ نہیں دیتا۔ یعنی یہ اپنے آپ کو اپنے بیل اور گدھے جتنی اہمیت بھی نہیں دیتا۔ (" ")

۴۵۔ ایک شخص نے آپ کی تعریف کی تو کہا کہ کیا تو مجھے اور اپنے آپ کو ہلاک کرنا چاہتا ہے۔ (" ")

۴۶۔ کسی شخص کے متعلق رسوا کن الفاظ استعمال نہ کرو۔ (" ")

۴۷۔ فیصلہ باطن کی پاکیزگی کے دعویٰ کے مطابق نہیں ہوگا، ظاہر اعمالِ کردار کی رُو سے ہوگا۔ (" ")

۴۸۔ وعظ سے بچو۔ اکثر وعظ شیطانی ہیجان کا نتیجہ ہوتے ہیں۔ (" ")

۴۹۔ انسان کو چاہیئے کہ اپنے اہل و عیال میں بچے کی طرح رہے لیکن جب ان کی کوئی ضرورت سامنے آجائے تو مرد بن جائے۔ (" ")

۵۰۔ اگر فرات کے کنارے ایک کتا بھی بھوک سے مر گیا تو عمرؓ سے اس کی بھی باز پرس ہوگی۔ (گیارھواں باب)

۵۱۔ امیرالمومنین اس وقت گیہوں کی روٹی کھا سکتا ہے جب اسے یقین ہو جائے کہ رعایا میں سے ہر ایک کو گیہوں کی روٹی مل رہی ہے۔ (" ")

۵۲۔ اللہ کے نزدیک سب سے بہتر کھانا وہ ہے جسے سب مل کر کھائیں۔ (حضرت ابن عمرؓ)

۵۳۔ خدایا! اس قوم کا کیا حشر ہوگا جو اپنے آپ کو اپنے ملازموں پر ترجیح دیتی ہے۔ (گیارھواں باب)

۵۴۔ رعایا پر حکومت کے واجبات کی ادائیگی اس وقت لازم آتی ہے، جب وہ حکومت کے رفاہِ عامہ سے مستفید ہو جائے۔ (" ")

۵۵۔ لوگوں کو ان کی ضرورت کے مطابق دو۔ مُٹھی مُٹھی دینے سے ان کے اخلاق درست نہیں رہ سکتے۔ (" ")

۵۶۔ خدا نے مجھے اس کا ذمہ دار ٹھہرایا ہے کہ میں تمہاری دعائیں اس تک پہنچنے دوں۔ (بارھواں باب)

۵۷۔ (عمر کے آخری لمحات میں فرمایا) اگر عمرؓ نے کسی پر ظلم کیا ہوگا اور اس کی فریاد آسمان پر پہنچی ہوگی تو اس کی (عمرؓ کی) ساری ہی نیکیاں صاحبِ عرش کے نزدیک بے وزن ہو جائیں گی۔ (تیرھواں باب)

۵۸۔ حکومت کی اصلاح تین چیزوں سے ہو سکتی ہے۔ امانات (ذمہ داریوں) کی ادائیگی۔ قوت کے ساتھ گرفت اور قرآن کے مطابق فیصلے۔ اور دولت کی اصلاح دو چیزوں سے ہو سکتی ہے۔ حق کے ساتھ لیا جائے اور باطل میں صرف ہونے سے بچایا جائے۔ (جابیہ کا خطبہ)

۵۹۔ ہم انہی باتوں کا حکم دیں گے جن کا حکم خدا نے دیا ہے اور انہی سے روکیں گے جن سے اللہ نے روکا ہے۔ (ایک تقریر)

۶۰۔ جس نے اپنی مدد کے لئے "فلاں خاندان" کہہ کر آواز دی، سمجھ لو کہ وہ شیطان کی آواز ہے۔ اسلام کے بعد قبائلی اور خاندانی تعریفات ختم ہو جاتی ہیں۔ (حضرت سعد بن ابی وقاصؓ کے نام خط)

———(۰)———

قادسیہ کی فتح کی خبر سننے کے بعد آپ نے جو تقریر فرمائی وہ بھی اس قابل ہے کہ اسے اس سلکِ مروارید میں شامل کر دیا جائے۔ آپ نے کہا:

بھائیو! میں بادشاہ نہیں ہوں کہ تم کو اپنا غلام بنانا چاہوں۔ میں تو خود اللہ کا غلام ہوں۔ البتہ خلافت کا فریضہ میرے سپرد کیا گیا ہے۔ اگر میں اس فریضہ کو اس طرح سرانجام دوں کہ تم آرام سے اپنے گھروں میں اطمینان کی زندگی بسر کرو تو یہ میری خوش نصیبی ہے۔ اور اگر خدا نخواستہ میری یہ خواہش ہو کہ تم لوگ میرے دروازے پر حاضری دیا کرو تو یہ میری انتہائی بدبختی ہوگی۔ میں تمہیں تعلیم دیتا ہوں اور نصیحت بھی کرتا رہتا ہوں — لیکن صرف قول سے نہیں، عمل سے بھی۔

اور مدائن کی فتح کے بعد آپ نے اپنے خطبہ میں ارشاد فرمایا:۔

آج مجوسیوں کی حکومت فنا ہو چکی۔ اب وہ اپنے ملک میں بالشت بھر زمین کے بھی مالک نہیں ہو سکیں گے کہ مسلمانوں کو نقصان پہنچا سکیں۔ مسلمانو! خدائے تعالےٰ نے تمہیں مجوسیوں کی زمین، مجوسیوں کی سلطنت، مجوسیوں کے اموال و املاک کا مالک بنایا ہے تاکہ اب تمہارے اعمال و افعال کو جانچے پس تم اپنی حالت نہ بدل لینا۔ اگر تم نے ایسا کر لیا تو خدا تم سے بھی حکومت چھین لے گا اور کسی دوسری قوم کو دیدیگا۔

یہ آپ کی آخری نصیحت تھی۔ اس کے چند ہی روز بعد، آپ اس دنیا سے رخصت ہو گئے۔

اور آئیے! ابدی حقائق کے ان گلہائے شاداب کو اپنے دامن میں سلئے، ہم بھی اس حسین وجمیل محفل سے یہ کہتے ہوئے رخصت ہوں کہ

ابدی باد بہارِ تو کہ در انجمنت
کفِ خاک آمدم و جوشِ بہاراں رفتم

چودہواں باب

شعلۂ عشق سیاہ پوش ہوا تیرے بعد

(انتقام)

قَدْ بَدَتِ الْبَغْضَآءُ مِنْ اَفْوَاهِهِمْ وَمَا تُخْفِیْ صُدُوْرُهُمْ اَكْبَرُ (۳/۱۱۸)

بغض و نفرت کے بعض جذبات کبھی کبھی ابھر کر ان کی زبان تک آجاتے ہیں لیکن وہ حسد و انتقام کی اس آگ کے مقابلہ میں کچھ بھی نہیں جو ان کے سینوں میں دبی ہوئی ہے۔

ایران کا شکست خوردہ گورنر، ہرمزان، جب پابجولاں حضرت عمرؓ کی خدمت میں حاضر ہوا، تو اُس وقت ان دونوں میں جو مکالمہ ہوا تھا، اسے ایک بار پھر سامنے لائیے[1]۔ حضرت عمرؓ نے اس سے کہا تھا کہ ہرمزان! یہ کیا بات ہے کہ اس سے پہلے عربوں نے جب بھی تم لوگوں کے سامنے آنے کی جرأت کی، تم نے انہیں نہایت آسانی سے پسپا کر دیا لیکن اب حالت یہ ہے کہ وہی عرب تمہاری پوری کی پوری مملکت کو فتح کئے جا رہے ہیں اور تم ان کا کچھ بھی نہیں بگاڑ سکتے۔ تم پابجولاں میرے سامنے ہو اور تمہارا شاہنشاہ اپنی جان بچانے کے لئے مارے مارے پھر رہا ہے۔

ہرمزان نے جواب میں کہا تھا کہ بات بالکل واضح ہے۔ اس سے پہلے جب جنگ ہوتی تھی تو ایک طرف ایرانی ہوتے تھے اور دوسری طرف عرب۔ ایرانیوں کے لئے تنہا عربوں کو شکست دے دینا کچھ بھی مشکل نہیں تھا لیکن اب جو جنگ ہوتی ہے تو اس میں ایک طرف تنہا ایرانی ہوتے ہیں اور دوسری طرف عرب اور ان کے ساتھ ان کا خدا — ہمارے لئے ان دو قوتوں کا مقابلہ کرنا ممکن نہیں۔ اس لئے ہم شکست کھا جاتے

---

[1] دیکھئے چھٹا باب۔

ہیں۔

کیسی عمیق حقیقت تھی جسے ہرمزان دو لفظوں میں بیان کر گیا۔ اور حق تو یہ ہے کہ ان لوگوں کی دیدوری کی داد دینی پڑتی ہے، جن کی نگاہیں، اسلام کی اس منفرد اور بسیط حقیقت تک ایسے صاف اور شفاف انداز سے پہنچ گئیں اور اس طرح انہوں نے جماعتِ مومنین کی بے پناہ قوت کا راز پالیا۔ ہرمزان نے جو کچھ کہا تھا وہ قرآن کریم کی اس قسم کی آیات کی ترجمانی تھی جن میں کہا گیا ہے کہ اَنَّ اللّٰہَ مَعَ الْمُؤْمِنِیْنَ۔ (۸/۱۹) "خدا مومنین کے ساتھ ہے۔" اور وَ کَانَ حَقًّا عَلَیْنَا نَصْرُ الْمُؤْمِنِیْنَ۔ (۳۰/۴۷) "مومنین کی مدد کرنا ہم پر واجب ہے۔" ایرانی اس حقیقت کو پا گئے تھے کہ جب تک خدا مومنین کے ساتھ ہے، (ہم یا دنیا کی کوئی طاقت) ان پر غالب نہیں آسکتی۔ لہذا، ان سے اپنی شکستوں کا انتقام کے لئے ضروری ہے کہ ان سے ان کے خدا کا ساتھ چھڑا دیا جائے۔

مسلمانوں کی قوت کا راز

اور اس کے بعد، ہماری ساری تاریخ اس اجمال کی تفصیل ہے کہ ہم سے ہمارا خدا کس طرح چھڑایا گیا۔ ظاہر ہے کہ خدا مسلمانوں کا ساتھ دینے کے لئے، بہ نفسِ نفیس، زمین پر نہیں آجاتا تھا۔ "خدا کے ساتھ ہونے کا مطلب یہ تھا کہ اس زمانے میں مسلمان خدا کی کتاب کے مطابق زندگی بسر کرتے تھے۔ اس کا نتیجہ ان کے دین کا تمکّن، اور خدا کے اس وعدے کا عملی ثبوت تھا کہ وَلَنْ یَّجْعَلَ اللّٰہُ لِلْکٰفِرِیْنَ عَلَی الْمُؤْمِنِیْنَ سَبِیْلًا۔ (۴/۱۴۱) "خدا کافروں کو مومنوں پر کبھی غلبہ حاصل نہیں ہونے دے گا"۔ ان کے ہاتھوں شکست خوردہ قوموں کی سازش یہ تھی کہ ان سے خدا کی کتاب (قرآنِ کریم) کو الگ کر دیا جائے۔ اسی کو اقبالؒ "عجمی سازش" کہہ کر پکارتا ہے۔ واضح رہے کہ جب اقبالؒ، عربی اسلام کے مقابلہ میں عجمی اسلام کا ذکر کرتا ہے تو اس سے اس کی مراد عرب اور ایران کے دو ملک نہیں ہوتے۔ عربی اسلام سے اس کی مراد ہوتی ہے وہ اسلام جسے اللہ تعالےٰ نے نبی اکرمؐ کی وساطت سے عالمِ انسانیت کو عطا فرمایا اور جو اب قرآنِ کریم کے اندر محفوظ ہے اور عجمی اسلام سے مراد مروّجہ اسلام ہے جس میں تحریف ہو چکی ہے۔ وہ، اوّل الذکر کو عربی اس لئے کہتا ہے کہ اس کی اوّلین مخاطب قوم عرب تھی اور وہ انہی کی زبان میں نازل ہوا تھا اور ثانی الذکر کو عجمی اس لئے کہ اس کی تحریف کی ابتداء بھی ایران سے ہوئی تھی اور جن غیر قرآنی نظریات، تصورات اور معتقدات

ان سے قرآن چھڑا دو

سے یہ اب مرکّب ہے، ان کا معتدبہ حصہ بھی قدیم ایرانی (مجوسی) مذہب اور تمدّن پر مشتمل ہے۔

صدرِ اوّل کے مسلمانوں نے ایرآن اور روٓما دونوں سلطنتوں کو پاش پاش کیا تھا لیکن ان میں ایک بنیادی فرق تھا۔ روٓما کی سلطنت کے صرف بعض حصّے مسلمانوں کے قبضہ میں آئے تھے۔

ایرآن اور روٓما کی فتوحات میں فرق

نہ ان کی پوری کی پوری مملکت کا خاتمہ ہوگیا تھا، نہ ان کی تہذیب مٹی تھی۔ اس کے برعکس، ایران کی مملکت بھی ختم ہوگئی تھی اور ان کی وہ ہزار ہا سالہ تہذیب بھی، جس پر انہیں اس قدر فخر و ناز تھا، مٹ گئی تھی۔ اس لئے مسلمانوں کی اس فتح کا زخم، ایرانیوں کے دل پر بڑا گہرا تھا اور اسی لئے وہ، مسلمانوں، (بلکہ اسلام) کے خلاف انتقام جوئی میں پیش پیش تھے۔ باقی اقوام، یہودی، نصاریٰ، تبعًا ان کا ساتھ دیتے تھے۔ کوشش ان سب کی یہی تھی کہ مسلمانوں کی نگاہوں سے قرآن اوجھل ہوجائے ـــ اور اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ اپنی اس کوشش میں کامیاب ہوئے اور پوری طرح کامیاب ہوئے۔

ایرآن اور روٓما میں ایک فرق اور بھی تھا۔ جیسا کہ ہم دیکھ چکے ہیں، مسلمانوں نے ان کے ممالک فتح کئے تھے لیکن وہاں کی آبادی کو پوری پوری مذہبی آزادی حاصل رہی ـــ کسی کو زبردستی مسلمان نہیں بنایا گیا کیوں ایسا کرنا قرآنِ کریم کی تعلیم کے خلاف تھا۔ سلطنتِ روٓما کے مفتوح علاقوں کے باشندے (عیسائی) عام طور پر اپنے مذہب پر قائم رہے لیکن ایران کے باشندے بالعموم مسلمان ہوگئے۔ ان میں سے اکثر جیوشِ اسلامیہ کے حملوں کے وقت، ساتھ کے ساتھ مسلمان ہوتے گئے۔ ان اسلام لانے والوں میں، ایرانی عوام ہی نہیں تھے، ان کے اربابِ دانش و بینش اور اعیانِ دساتیر و ضوابط بھی تھے مثلاً شاہنشاہ یزدگرد نے دیلم کی قوم سے ایک منتخب دستہ تیار کیا تھا جس کی تعداد چار ہزار تھی۔ یہ "جُندِ شاہنشاہ" یا بادشاہ کا لشکرِ خاص کہلاتا تھا۔ فتح قادسیہ کے بعد یہ لشکر ایرانیوں سے الگ ہوکر، اسلام لے آیا۔ اور حضرت سعد ابن ابی وقاصؓ کی اجازت سے کوفہ میں آباد ہوگیا۔ اسی طرح، یزدگرد کی فوج ہراول کا سردار، ایک جلیل القدر افسر

ایرانی اسلام لے آئے

تھا جو سیاہ کے لقب سے مشہور تھا۔ یزدگرد جب اصفہان کی طرف روانہ ہوا تو اس نے سیاہ کو ایک منتخب لشکر کے ساتھ اسلامی افواج کے مقابلہ کے لئے روانہ کیا لیکن وہ مقابلہ کرنے کے بجائے، اپنے لشکر سمیت مسلمان ہوگیا۔ یہ سب بصرہ میں آباد ہوگئے۔ باذان، نوشیرواں کی طرف سے یمن کا گورنر

تھا۔ اس کی رکاب میں جس قدر فوج تھی اس میں سے بھی بیشتر مسلمان ہو گئے تھے۔

ہم نے اوپر کہا ہے کہ شاہنشاہ یزدگرد کا ذاتی لشکر بھی مسلمان ہو گیا تھا۔ یہ لوگ صرف فوجی سپاہی نہیں تھے بلکہ اکبر کے نورتنوں کی طرح، شاہنشاہ کے مشیرِ خاص تھے اور **اساورہ** کہلاتے تھے۔ ایران میں شاہنشاہ کے تقرب اور عزت و عظمت کا سب سے بڑا نشان، سونے کا کنگن ہوتا تھا جنہیں یہ پشلن مرحمت ہو جاتا وہ اہلِ اساورہ کہلاتے تھے۔ (اسورہ کنگن کو کہتے ہیں۔ قرآنِ کریم میں اہلِ جنت کے متعلق جو کہا گیا ہے کہ وہ "اَسَاوِرَ مِنْ ذَهَبٍ" (سونے کے کنگن پہنے ہوں گے (۱۸/۲۱) تو اس سے مراد بلند مدارج و مراتب ہے) فتوحات کے بعد، یہ لوگ فوج در فوج اور جوق در جوق اسلام لاتے چلے گئے۔ ہم یہ تو نہیں کہہ سکتے (نہ کہنا چاہتے ہیں) کہ یہ سب (اسلام لانے والے) دل میں کوئی کھوٹ لے کر مسلمان ہوئے تھے لیکن (جیسا کہ آگے چل کر نظر آجائے گا) ان کے اربابِ فکر و نظر کا بیشتر حصہ اسی مقصد کے لئے زمرۂ اُمتِ مسلمہ میں داخل ہوا تھا کہ اس طرح وہ مسلمانوں میں اپنے قدیم مجوسی نظریات و معتقدات آسانی سے پھیلا سکیں گے۔ حقیقت یہ ہے کہ (اس زمانے کی) عربوں جیسی سادہ ذہنیت کی حامل قوم، ایرانی فکر کی پیچیدگیوں اور ان کی عیارانہ سیاست کی دسیسہ کاریوں کی حریف ہو نہیں سکتی تھی۔ اس لئے وہ اس میدان میں، ان سے نہایت آسانی سے مات کھا گئے (تفصیل آگے چل کر سامنے آئے گی) لیکن ان میں سے جو لوگ نیک نیتی سے بھی مسلمان ہوئے تھے، ان کا اسلام لانا ایسا ہی تھا جیسا ان بدوی قبائل کا اسلام لانا جن کے متعلق قرآن کریم میں ہے کہ۔ قَالَتِ الْأَعْرَابُ اٰمَنَّا۔ یہ بدو کہتے ہیں کہ ہم ایمان لے آئے ہیں۔ قُلْ لَّمْ تُؤْمِنُوْا۔ ان سے کہو کہ تم ایمان نہیں لائے۔ وَلٰكِنْ قُوْلُوْٓا اَسْلَمْنَا۔ تمہیں یہ کہنا چاہیئے کہ تم نے اسلامی مملکت کے سامنے سرِ تسلیم خم کر دیا ہے۔ اس لئے کہ وَلَمَّا يَدْخُلِ الْإِيْمَانُ فِيْ قُلُوْبِكُمْ (۴۹/۱۴) ایمان تمہارے دل کی گہرائیوں میں نہیں اُترا۔

حضرت عمرؓ اس حقیقت سے باخبر تھے۔ چنانچہ ان کے پیشِ نظر یہ پروگرام تھا کہ ان نومسلموں کی مناسب تعلیم و تربیت سے ان کے اندر ایسی تبدیلی پیدا کر دی جائے کہ ایمان ان کے دل کی گہرائیوں میں اُتر جائے لیکن قبل اس کے کہ وہ اس پروگرام کو بروئے کار لاتے، ہرمزان کی سازش کارگر ہو گئی۔ اس نے دیکھ لیا تھا کہ مسلمانوں سے انتقام لینے کے راستے میں سب سے بڑی رکاوٹ، (حضرت) عمرؓ کا

وجود ہے۔ جب تک اسے راستے سے ہٹایا نہیں جائے گا، ہم اپنے مقصد میں کامیاب نہیں ہوسکیں گے۔ وہ رکاوٹ دور ہو گئی تو اگلا راستہ صاف اور آسان ہو گیا۔ نومسلم عوام کی تعلیم و تربیت بھی نہ ہو سکی اور ان کے عیار طبقہ کے لئے مسلمانوں میں اپنے خیالات پھیلانے کیلئے فضا بھی ساز گار ہو گئی۔

اس مقصد کے لئے، عجمی سازش کے دو نمایاں محاذ سامنے آتے ہیں۔ ایک محاذ کا مقصد اسلامی سلطنت کو کمزور کر کے اپنا سیاسی غلبہ حاصل کرنا تھا، اور دوسرے کا منتہیٰ اسلام کو کسی نہ کسی طرح عجمی تصورات، نظریات و معتقدات کے رنگ میں رنگ (بلکہ ڈبو) دینا بلکہ (اگر بہ نظرِ تعمق دیکھا جائے تو) سیاسی غلبہ بھی ان کے لئے مقصود بالذات نہیں تھا۔ وہ بھی اس دوسرے مقصد کے حصول کا ذریعہ تھا، جو کچھ آئندہ صفحات میں آپ کے سامنے آئے گا، وہ اسی اجمال کی تفصیل ہے۔

(٥)

لیکن یہ وہ وادی ہے جس میں قدم رکھتے ہوئے "فرشتوں کے بھی پر جلتے ہیں" اور اس کی وجہ ظاہر ہے۔ ہمارے مروجہ اسلام کا کوئی گوشہ ایسا نہیں جو اس عجمی سازش کا شکار اور غیر اسلامی تصورات سے ملوث نہ ہو چکا ہو — یہ اسلام، اربابِ شریعت کا ہو یا اصحابِ طریقت کا، اور اربابِ شریعت میں سے بھی کسی فرقہ یا مسلک کا ہو، اس پر عجمی (غیر قرآنی) تصورات کا ٹھپہ ضرور لگا ہوا ہو گا۔ اب ظاہر ہے کہ جب مروجہ اسلام کے متعلق کہا جائے کہ یہ غیر اسلامی معتقدات و نظریات سے ملوث ہے، تو یہ بات ہمارے مذہب پرست طبقہ پر یقیناً گراں گزرے گی۔ اس لئے کہ وہ اس پر مصر ہوتے ہیں کہ جس اسلام کے وہ پیرو ہیں، وہی حقیقی اسلام ہے۔ بظاہر یہ بات ناقابلِ فہم اور تعجب انگیز سی نظر آتی ہے کہ اگر کسی مروجہ عقیدہ یا مسلک کے متعلق بتا دیا جائے کہ وہ قرآنِ کریم کی نصِ صریح کے خلاف ہے تو یہ حضرات اس پر کیسے مُصر ہو سکتے ہیں کہ حقیقی اسلام وہی ہے جس پر وہ کاربند ہیں لیکن یہ چیز کتنی ہی ناقابلِ فہم اور تعجب انگیز کیوں نہ ہو، ہے یہ حقیقت۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کے نزدیک دین میں سند اور حجت، روایات اور تاریخ ہیں اور قرآن کا وہی مفہوم قابلِ قبول ہو سکتا ہے جس کی تائید روایات اور تاریخ سے ہوتی ہو۔ یعنی یہ حضرات، بجائے اس کے کہ روایات اور تاریخ کو قرآن کے تابع رکھیں، قرآن کو روایات اور تاریخ کے تابع رکھتے ہیں۔ (تفصیل ان امور کی ذرا آگے چل کر ملیگی) اور یہ

نازک مقام

کتبِ روایات و تاریخ

معلوم کر کے آپ کو حیرت ہوگی کہ روایات کے مجموعے ہوں یا کتبِ تاریخ، یہ سب ایرانیوں کی مرتب کردہ ہیں۔ سنیوں کے ہاں احادیث کے چھ مجموعے ایسے ہیں جنہیں صحاحِ ستہ، یعنی صحیح ترین قرار دیا جاتا ہے۔ اسی طرح شیعہ حضرات کی احادیث کی چار کتابیں ایسی ہیں۔ یہ مجموعے سنیوں کے ہوں یا شیعوں کے، ان کے جمع اور مرتب کرنے والے سب ایرانی تھے۔ اسی طرح تاریخ کی سب سے پہلی اور قابلِ اعتماد تصنیف امام طبری کی ہے۔ وہ بھی ایرانی تھے۔ (تفسیر کی سب سے پہلی کتاب بھی انہی کی ہے) اور یہ سب کتابیں بغیر کسی سابقہ تحریری ریکارڈ کے زبانی روایات کی بنا پر تیسری چوتھی صدی ہجری میں مرتب ہوئیں۔ صدرِ اوّل کے اتنے عرصہ بعد، اس طرح مرتب شدہ کتب روایات و تاریخ جس قدر قابلِ اعتماد ہو سکتی ہیں، ظاہر ہے۔ جہاں تک شیعہ حضرات کی کتب روایات اور تاریخ کا تعلق ہے، ان کے سلسلہ میں ایک دشواری اور بھی لاحق ہوتی ہے۔ ان حضرات کے ہاں تقیہ، دین کے مسلمات (بلکہ اساسات) میں سے ہے۔ تقیہ کیا ہے؟ اور دین میں اس کا مقام کیا، اسے ہم، ان حضرات کی حدیث کی سب سے معتبر کتاب، اصولِ کافی[1] سے بیان کرتے ہیں۔ اس کتاب کے بابِ تقیہ میں لکھا ہے:۔

تقیہ

(۱) فرمایا حضرت ابوجعفر علیہ السلام نے کہ مخالفین سے بظاہر میل ملاپ رکھو اور باطن میں مخالفت رکھو۔

(۲) حضرت ابوعبداللہ علیہ السلام نے فرمایا کہ ہمارے امرِ امامت کو اختیار کرنے کے یہ معنی نہیں کہ اس کی تصدیق کی جائے اور فقط قبول کر لیا جائے، بلکہ چاہیئے یہ کہ نا اہلوں (مخالفوں) سے ہمارے معاملہ کو پوشیدہ رکھا جائے۔ ہماری احادیث ان سے بیان نہ کی جائیں۔ ہمارے دوستوں سے ہمارا اسلام کہو اور کہو کہ رحم کرے اللہ اس بندہ پر جو بحالتِ تقیہ ہمارے مخالفوں سے اپنی دوستی ظاہر کرے۔

آپ نے فرمایا کہ اے سلیمان! تم اس دین پر ہو کہ جس نے چھپایا، خدا نے اسے عزت دی اور جس نے ظاہر کیا اللہ نے اسے ذلیل کیا۔

یہ ہے تقیہ اور اس کا مقام یہ ہے کہ:۔

فرمایا حضرت ابوعبداللہ علیہ السلام نے کہ اے معلیٰ! تقیہ میرا اور میرے آبا کا دین ہے۔ جس کے لئے

---

[1] اصولِ کافی اور فروعِ کافی اور ان کے تراجم کا تعارف ذرا آگے چل کر کرایا جائے گا۔

تقیہ نہیں اس کے لئے دین نہیں۔ (اردو ترجمہ سید ظفر حسن صاحب قبلہ، جلد دوم صہ ۲۴۷، ۲۴۰)

اسی کے مطابق ان ائمہ کرامؑ کا عمل بھی تھا۔ کافی میں ہے:۔

میں نے ابو عبداللہ علیہ السلام کو فرماتے سنا۔ جو شخص یہ جانتا ہے کہ ہم نہیں کہتے مگر حق، تو اس کو چاہیئے کہ وہ اکتفا کرے اس پر جو ہم سے جانا ہے اور اگر ہم سے کوئی بات ایسی سنی جو حکم خدا خلاف ہو تو سمجھ لے کہ ہم نے تم سے دشمنوں کے ضرر کا دفعیہ چاہا ہے، یعنی بصورتِ تقیہ اس کو بیان کیا ہے۔ (الشافی۔ جلد اوّل، صہ ۷۳-۷۲)

ایک اور روایت میں ہے:۔

امام جعفر صادق علیہ السلام نے ایک شیعہ سے فرمایا کہ اگر میں تم سے اس سال ایک حدیث بیان کروں اور دوسرے سال جب آؤ تو اس کے خلاف بیان کروں تو تم کس پر عمل کرو گے۔ میں نے کہا۔ آخر والی پر، امام نے فرمایا۔ اللہ تم پر رحم کرے گا۔ (یعنی پہلی روایت بنا پر تقیہ تھی) (ایضاً صہ ۷۳)

ظاہر ہے کہ ان حضرات کی مرتب کردہ کتبِ احادیث و تاریخ سے اصل حقیقت کا معلوم کرنا، ناممکنات میں سے ہے۔

یہ ہے ہمارے ہاں کی (سُنی اور شیعہ حضرات کی) کتبِ روایات و تاریخ کی جمع و تدوین کی حقیقت، لیکن انہیں مقدس ایسا بنا دیا گیا ہے کہ ان پر کسی قسم کی تنقید کرنا، کفر قرار دیا جاتا ہے۔ ان کی تقدیس کے

ایک واقعہ — حضرت عائشہؓ کی عُمر

سلسلہ میں صرف ایک واقعہ بیان کرنا کافی ہوگا۔ ہمارے ہاں یہ امر بطور مسلّمہ مانا جاتا ہے کہ حضرت عائشہؓ کی عمر بوقتِ نکاح چھ سال کی تھی۔ یہ بات ایک طرف قرآنِ کریم کی واضح تعلیم کے خلاف ہے جس کی رُو سے بلوغت، نکاح کی شرط ہے، دوسری طرف، اس سے حضور نبی اکرمؐ کی سیرتِ طیّبہ کے خلاف جس قسم کا اعتراض وارد ہوتا ہے، اس پر مستشرقین کی تصنیفات شاہد ہیں۔ راقم الحروف نے ایک مدت کے تجسّس و کاوش کے بعد، بالتحقیق ثابت کر دیا کہ یہ روایت غلط ہے۔ نکاح کے وقت حضرت عائشہؓ کی عمر سترہ اور انیس برس کے درمیان تھی۔ اس پر ان حضرات کو سجدۂ شکرانہ ادا کرنا چاہیئے تھا کہ غلط روایات نے دامنِ رسالتمآبؐ پر جو داغ لگایا تھا اور جس کی وجہ سے دشمنانِ اسلام کو دریدہ دہنی کا موقعہ مل جاتا تھا، اس تحقیق سے وہ داغ دھل گیا لیکن آپ کو معلوم ہے کہ ان حضرات کی طرف سے ردِّ عمل کیا ہوا؟ انہوں نے کہا کہ اس

سے بخاری شریف کی روایت کو غلط تسلیم کرنا پڑتا ہے، جو کفر ہے۔ لہٰذا، یہ شخص منکرِ حدیث اور دائرہ اسلام سے خارج ہے۔ چنانچہ میرے خلاف ایک ہزار "علمائے کرام" نے کفر کا فتویٰ صادر فرما دیا۔

یہ ہے ان کتابوں کی تقدیس کا عالم ـــ اور ظاہر ہے کہ یہ خود اسی عجمی سازش کا ایک حصہ ہے اور اسے کامیاب بنانے اور ابدیت عطا کرنے کا نہایت محکم ذریعہ۔ ان حالات میں آپ سوچئے کہ جب ہم ان تاریخی بیانات اور روایات کو وضعی قرار دیں گے جن پر ہمارے مروّجہ اسلام کے خلافِ قرآن نظریات و معتقدات کی بنیاد ہے تو ہمارا قدامت پرست طبقہ اس سے کیسے متفق ہو سکے گا؟ روایات اور تاریخ کے باب میں میرا جو مسلک ہے، اسے میں (اس کتاب کے) مقدمہ میں وضاحت سے بیان کر چکا ہوں۔ مختصراً وہ مسلک یہ ہے:-

میرا مسلک

(۱) دین میں سند اور حجت خدا کی کتاب، قرآن مجید ہے، جو اپنی تفسیر آپ کرتا ہے۔ ہماری کتبِ روایات و تفسیر میں جو باتیں، قرآنی تعلیم کے مطابق ہیں، انہیں صحیح سمجھنا چاہیئے اور جو اس کے خلاف ہیں، انہیں مسترد کر دینا چاہیئے۔

(۲) حضور نبیٔ اکرمؐ کی رسالت پر ہمارا ایمان ہے اور جملہ صحابہ کبارؓ کے مومن حقاً ہونے پر قرآن کی شہادت۔ اس لئے کتبِ روایات اور تاریخ میں جو باتیں ایسی ہیں جن سے حضورؐ کی سیرتِ مقدسہ داغدار ہوتی ہو، یا صحابہ کبارؓ کے خلاف کسی قسم کا طعن پڑتا ہو، انہیں صحیح تسلیم نہ کیا جائے۔

یہ ہے میرا مسلک۔ باقی رہے دورِ صحابہؓ کے بعد کے وہ بزرگ جنہیں واجب الاحترام سمجھا جاتا ہے، (خواہ ان کا تعلق کسی فرقے سے بتایا جائے) جو باتیں ان کی طرف منسوب کی جاتی ہیں، اگر ان میں کوئی بات ایسی ہے جو قرآنِ کریم کے خلاف جاتی ہے، تو میں یہ کہا کرتا ہوں کہ ان کی طرف اس بات کی نسبت غلط ہے۔ اگر وہ دین کے بزرگ تھے تو وہ ایسی بات کہہ یا کر نہیں سکتے تھے۔ لیکن اگر کوئی شخص، اس کے باوجود، اس پر اصرار کرتا ہے کہ اس کی نسبت ان کی طرف بالکل صحیح ہے تو پھر خدا کا یہ ارشاد میرے لئے کافی ہو جاتا ہے کہ تِلْكَ أُمَّةٌ قَدْ خَلَتْ۔ یہ وہ لوگ ہیں جو اپنے اپنے وقت میں دنیا سے گزر گئے۔ لَهَا مَا كَسَبَتْ وَلَكُمْ مَا كَسَبْتُمْ۔ جو کچھ انہوں نے کیا، اس کے ذمہ دار وہ ہیں، جو کچھ تم کرو گے اس کے ذمہ دار تم ہو گے۔ وَلَا تُسْأَلُونَ عَمَّا كَانُوا يَعْمَلُونَ۔ (۲/۱۴۱) ہم تم سے پوچھیں گے بھی نہیں کہ انہوں نے کیا کیا تھا۔

آئندہ صفحات میں جو کچھ آپ کے سامنے آئے گا ان میں جتنی باتیں ایسی ہیں جو قرآن کریم کی واضح تعلیم کے خلاف ہیں، ان کے متعلق میرا مسلک یہ ہے کہ صحابہ کبارؓ یا بزرگانِ عظام کی طرف ان کی نسبت، غلط ہے۔ میں نہ شیعہ ہوں نہ سنّی، نہ اہلِ فقہ ہوں نہ اہلِ حدیث۔ میں سیدھا سادہ مسلمان ہوں۔ قرآن کو خدا کی آخری، مکمل اور غیر متبدل کتاب مانتا ہوں اور حضورؐ ختمی مرتبت کو خدا کا آخری رسول۔ جس پر نبوت ختم ہو گئی۔ میں تاریخ اور روایات کا جائزہ قرآنِ کریم کی روشنی میں لیتا ہوں۔ جو کچھ میں نے آئندہ صفحات میں لکھا ہے، اس سے صرف یہ بتانا مقصود ہے کہ عجمی سازش نے کس چابکدستی سے قرآن کا دامن اُمّت کے ہاتھوں سے چھڑا کر، اسلام کو کیا سے کیا بنا دیا۔ میں نے انتہائی کوشش کی ہے کہ جو کچھ بیان کیا جائے، تاریخ اور روایات کی سند سے بیان کیا جائے۔ اگر ان میں سے کوئی بات کسی کو ناگوار گزرے، تو اگرچہ اس کی ذمہ داری مجھ پر نہیں، تاریخ اور روایات پر ہو گی، بایں ہمہ، میں، ان سے معذرت طلب ہوں کہ کسی کی آزردگیٔ خاطر میرا شیوہ نہیں۔ وما توفیقی الا باللہ العلی العظیم۔

ایک وضاحت اور بھی ضروری ہے۔ پہلے کہا جا چکا ہے کہ اسلام میں اس تحریف کا آغاز ایران سے ہوا اور اس میں جس قدر غیر اسلامی نظریات و معتقدات در آئے، وہ ایران کے قدیم مذہب مجوسیت سے مستعار لئے گئے ہیں۔ اس سے یہ مراد نہیں کہ ہم موجودہ اہلِ ایران کو موردِ الزام قرار دیتے ہیں۔ قطعاً نہیں۔ ان سے مراد اس زمانے کے اہلِ ایران ہیں۔ وہ سب قصہ ماضی ہو چکے ہیں۔ اس لئے اگر (از روئے تاریخ) ان پر کوئی اعتراض وارد ہوتا ہے تو اس کی ذمہ داری، ان کے بعد آنے والوں یا موجودہ اہلِ ایران پر کسی طرح عائد نہیں ہوتی۔ لہٰذا آئندہ صفحات میں جو کچھ ایران کے متعلق کہا جائے گا، اس سے اُس زمانے کے اہلِ ایران مراد ہوں گے۔ اس وضاحت کو ہر مقام پر پیشِ نظر رکھئے۔

اُس زمانے کے اہلِ ایران

(o)(o)

مسئلہ خلافت

وہ پہلی چٹان جس سے ٹکرا کر اُمّت کی کشتی دو ٹکڑے ہو گئی، مسئلہ خلافت ہے۔ پہلے یہ مسئلہ محض سیاسی تھا لیکن بعد میں اس نے مذہبی شکل اختیار کر لی اور اس طرح یہ اُمّتِ واحدہ، دو مستقل مذہبی فرقوں (سنّی اور شیعہ) میں اس طرح بٹ گئی کہ اس خلیج کے پلٹنے کی کوئی شکل ہی نہیں۔ ہم تیسرے باب (متعلقہ خلافت) میں دیکھ چکے ہیں کہ خلیفہ کا

انتخاب اُمت کے باہمی مشورے سے عمل میں آتا ہے لیکن جب حضرت ابوبکر صدیقؓ کا انتخاب اس طرح عمل میں آیا تو حضرت علیؓ نے یہ کہہ کر اس سے اختلاف کیا کہ وہ رسول اللہؐ کے ترکہ کے وارث ہیں اور خلافت بھی اسی میں آتی ہے، اس لئے خلافت ان کا حقِ وراثت ہے جسے کوئی اور نہیں لے جا سکتا۔ اپنے اس دعوے کو منوانے کے لئے انہوں نے کچھ عرصہ تک تگ و تاز بھی کی لیکن حضرت فاطمہؓ کی وفات کے بعد وہ خاموش ہو گئے۔ خلافتِ فاروقیؓ کے زمانے میں بھی اس باب میں خاموشی رہی لیکن حضرت عثمانؓ کے دورِ خلافت میں یہ آگ اس شدت سے بھڑکی کہ پھر نہ بجھ سکی۔ ابن جریر طبری نے اپنی تاریخ میں حضرت عثمانؓ کے انتخاب کے واقعہ کو بھی تفصیل کے ساتھ لکھا ہے۔ ہم پوری تفصیل میں جانے کے بجائے (بغرضِ اختصار) اس کا اتنا حصہ نقل کرنے پر اکتفا کرتے ہیں کہ "جب حضرت عثمانؓ کا انتخاب عمل میں آگیا تو حضرت علیؓ منہ موڑ کر چل دیئے لیکن حضرت عبدالرحمان بن عوفؓ کے ٹوکنے پر مڑے اور حضرت عثمانؓ کی بیعت کر لی لیکن اس کے ساتھ ہی وہ یہ بھی کہتے جاتے تھے کہ ۔۔۔ فریب ہے، کتنا بڑا فریب۔" (طبری۔ جلد ۳)۔

بطورِ حقِ وراثت

نہج البلاغہ (جو حضرت علیؓ کے خطبات اور دیگر ارشاداتِ گرامی پر مشتمل ہے) شیعہ حضرات کے ہاں بڑی اہم اور مستند کتاب سمجھی جاتی ہے۔ اس میں حضرت علیؓ کا ایک مشہور خطبہ، شقشقیہ کے نام سے منقول ہے۔ اس میں آپ نے فرمایا ہے کہ رسول اللہؐ کی وفات کے بعد، ہر سہ خلفاء نے ان کے حقِ خلافت کو، جو انہیں وراثتاً ملتا تھا، غصب کر لیا۔ انہوں نے فرمایا کہ میں نے ان حالات پر صبر کیا اور "اپنی میراث کو تاراج ہوتے دیکھتا رہا۔"

اریٰ تراثی نھبا۔ (نہج البلاغہ، شائع کردہ غلام علی اینڈ سنز، ۱۹۶۳ء ایڈیشن، حصہ ۲۷۔ ۱۲۶)

لیکن خلافت بطورِ حقِ وراثت کے دعویٰ میں ایک سقم تھا جس کی وجہ سے یہ زیادہ آگے نہ بڑھ سکا۔ (جیسا کہ آگے چل کر تفصیل سے لکھا جائے گا) بنو عباس نے یہ دعوے کیا کہ وراثت کی بنا پر خلافت ان کا حق ہے، نہ کہ حضرت علیؓ اور ان کی اولاد کا۔ ان کی پیش کردہ دلیل یہ تھی کہ شریعت کی رو سے، چچا کی موجودگی میں، چچا کے بیٹے کو حقِ وراثت نہیں پہنچتا۔ رسول اللہؐ کی وفات کے وقت، حضورؐ کے چچا حضرت عباسؓ موجود تھے۔ لہٰذا، حضورؐ کی وراثت کے حق دار وہ تھے، نہ کہ حضورؐ کے چچا کے لڑکے حضرت علیؓ۔ بنو عباس کے اس دعویٰ کی بنا پر یہ بحث خاندانی یا سیاسی بن کر رہ گئی۔ اس نے جو مذہبی شکل اختیار کی اس کی بنیاد دوسری تھی۔ اس بنیاد تک پہنچنے کے لئے کچھ تمہیداً سمجھ لینا ضروری ہے۔

اہلِ ایران کا اپنے بادشاہوں کے متعلق عقیدہ یہ تھا کہ وہ عام انسان نہیں، بلکہ فوق البشر ہوتے ہیں اور

اہلِ ایران کا اپنے شہنشاہوں کے متعلق عقیدہ

خدائی صفات و اختیارات کے حامل۔ وہ لوگوں کے منتخب کردہ نہیں ہوتے بلکہ خدا کی طرف سے حکومت کے لئے مامور ہوتے ہیں۔ اس اعتبار سے حکومت ان کا اور صرف انہی کا حق ہوتا ہے، اور کوئی شخص ان کا یہ حق چھین نہیں سکتا۔ یہ حق ان کی اولاد میں وراثتاً منتقل ہوتا رہتا ہے۔ وہ زمین پر خدا کا سایہ اور اس کے نمائندہ ہوتے ہیں۔ وہ کوئی غلطی نہیں کرسکتے، اس لئے لوگوں پر ان کے ہر حکم کی اطاعت لازم ہوتی ہے۔ ساسانی شہنشاہوں کے زمانہ میں یہ عقائد شدت اختیار کرچکے تھے کہ اتنے میں قرآن آیا اور اس نے ان تمام عقائد کو باطل قرار دے دیا۔

عہدِ حضرت عثمانؓ میں ایک عجیب و غریب شخصیت تاریخ کے اسٹیج پر نمودار ہوئی ہے، جو عبداللہ بن سبا

عبداللہ ابنِ سبا

کے نام سے مشہور، اور ابن السوداء کے لقب سے معروف ہے۔ بعض مورخین اسے ایک فرضی شخصیت قرار دیتے ہیں[1] لیکن جو اس کی واقعیت کے قائل ہیں، ان کا بیان ہے کہ یہ یمن کا رہنے والا یہودی تھا جو مدینہ میں آکر مسلمان ہوا۔ اس نے کچھ عرصہ وہاں رہ کر رموزِ مملکت سے واقفیت حاصل کی اور اس کے بعد وہاں سے نکل کر کوفہ کو اپنی خفیہ سازشوں کا اوّلین مرکز بنایا۔ بعض تاریخی روایات میں ہے کہ وہ کچھ عرصہ کے لئے مدائن (ایران) میں بھی رہا تھا۔ اس کے بعد وہ مصر چلا گیا اور وہاں سے سازش کا جال ہر طرف پھیلانا شروع کردیا۔ اس سازش کا مقصود یہ تھا کہ حضرت عثمانؓ کو مجبور کیا جائے کہ وہ حضرت علیؓ کے حق میں خلافت سے دستبردار ہوجائیں۔ چنانچہ ۳۵ھ میں، ایک مسلح لشکر نے جو اہالیانِ مصر، بصرہ اور کوفہ پر مشتمل تھا، مدینہ پہنچ کر، خلیفۃ المسلمین، حضرت عثمانؓ کا گھیراؤ کیا اور آخر الامر انہیں روزِ روشن میں شہید کرڈالا اور حضرت علیؓ کی خلافت کا اعلان کردیا۔ شہادتِ حضرت عثمانؓ کے کے بعد (تاریخ کے بیان کے مطابق) جب حضرت علیؓ اور حضرت عائشہؓ کے زیرِ قیادت اُمت میں باہمی تصادم ہوا (جسے جنگِ جمل کہا جاتا ہے) تو عبداللہ بن سبا حضرت علیؓ کے لشکر میں موجود تھا۔ اسی کی وہ جماعت تھی کہ جب انہوں نے فریقین میں صلح کے آثار دیکھے تو حضرت عائشہؓ کے لشکر پر حملہ کرکے جنگ کی آگ بھڑکا

---

[1] مثلاً ڈاکٹر طٰہٰ حسین مصری۔ (الفتنۃ الکبریٰ۔ حضرت عثمانؓ)

دی۔ پھر یہی جماعت حضرت علیؓ اور حضرت معاویہؓ کے درمیان، جنگِ صفین کے موقعہ پر حضرت علیؓ کے لشکر میں شامل ہو کر اپنی ریشہ دوانیوں میں مصروف رہی۔

لیکن یہ عبداللہ بن سبا کا سیاسی کردار ہے۔ اس کی وہ سازش جس نے اسلام کو ایسا نقصان پہنچایا جس کی تلافی نہیں ہو سکتی، اس کے وہ نظریات تھے جن کا پراپیگنڈہ اس نے اس شدومد سے کیا۔ اس نے پہلے یہ کہا کہ مجھے مسلمانوں کی اس سادگی پر تعجب آتا ہے کہ یہ اس کے تو قائل ہیں کہ حضرت عیسیٰؑ دوبارہ دنیا میں آئیں گے لیکن رسول اللہ کے دوبارہ دنیا میں آنے کو نہیں مانتے۔

رجعت کا عقیدہ

ان کی مراجعت دنیا میں ضرور ہوگی۔ رسول اللہ کے متعلق یہ عقیدہ تو مسلمانوں میں عام نہ ہو سکا لیکن (جیسا کہ ہم آگے چل کر دیکھیں گے) شیعہ حضرات کے ہاں بعض ائمہ کے متعلق یہ عقیدہ پھیل گیا۔ اسے رجعت کا عقیدہ کہا جاتا ہے۔

(تاریخ بتاتی ہے کہ) اس کے بعد اس نے یہ کہنا شروع کیا کہ ہر پیغمبر کا ایک خلیفہ اور وصی ہوتا ہے۔ نبی اکرمؐ کے وصی، حضرت علیؓ ہیں۔ حضورؐ کی نص (واضح ارشاد) کے مطابق، حضرت علیؓ کو آپؐ کے بعد خلیفہ ہونا چاہیئے تھا۔ جن لوگوں نے انہیں خلیفہ نہیں بننے دیا انہوں نے ان کے حق کو غصب کیا ہے۔ اب مسلمانوں کو چاہیئے کہ وہ حضرت عثمانؓ کو معزول یا قتل کر کے حضرت علیؓ کو ان کی جگہ خلیفہ بنائیں اور اس طرح اپنی سابقہ غلطی کی تلافی اور اپنے گناہوں کا کفارہ ادا کریں۔

ان معتقدات کی اشاعت کا نتیجہ تھا کہ مسلمانوں میں، خلافت کے متعلق اس قسم کے نظریات پھیلنے

امامتِ منصوص کا نتیجہ

شروع ہو گئے جو ایرانی اپنے شہنشاہوں کے متعلق رکھتے تھے۔ ان نظریات کی رُو سے کہا گیا کہ خلافت (جسکی جگہ امامت کی اصطلاح اختیار کی گئی، جو خلافت کے مقابلہ میں زیادہ جامع اور ہمہ گیر ہے) ان مصالحِ عامہ میں سے نہیں جنہیں خدا انسانوں کی فکر و نظر کے سپرد کر دے اور جو امت کے متعین کر دینے سے متعین ہو جائے۔ یہ دین کا رکن اور اسلام کی بنیاد ہے۔ رسول کے لئے یہ جائز ہی نہیں کہ وہ اسے یونہی چھوڑ جائے اور امت کے حوالے کر جائے۔ اس کے لئے ضروری ہے کہ وہ امت کے لئے ایک امام مقرر کر جائے۔ چنانچہ وہ' اس کے لئے' خدا کے حکم کے مطابق' وصیت کر کے جاتا ہے۔ رسول اللہ نے امامت کے لئے حضرت علیؓ کے حق میں وصیت فرمائی تھی۔ اسی جہت سے آپ (حضرت علیؓ) کو وصیِ رسول اللہ کہا جاتا ہے۔ اسی طرح، ہر امام' اپنے بعد ہونے

والے امام کے حق میں وصیت کر کے جاتا ہے اور چونکہ یہ وصیت، خدا کے حکم کے مطابق ہوتی ہے، اس لئے امام، منصوص یا مامور من اللہ ہوتا ہے (یعنی خدا کی طرف سے مقرر کردہ امام)۔ وہ ہر غلطی سے منزہ اور ہر خطا سے پاک ہوتا ہے، اس لئے اسے امام معصوم کہا جاتا ہے۔ لہٰذا، امام منصوص کے علاوہ، کسی اور کا جانشین رسول اللہ بن بیٹھنا غصبِ امامت ہے۔ اس کے ساتھ ہی یہ بھی کہا گیا کہ یہ امامت صرف حضرت علیؓ اور ان کی اولاد کا حق ہے۔

ظاہر ہے کہ خلافت کے متعلق یہ عقیدہ، سنیوں کے عقیدہ اور مسلک کے خلاف ہے۔ اس سے امت میں (پہلی مرتبہ) دو ایسے فرقے وجود میں آ گئے جن میں مستقل نزاع پیدا ہو گئی۔ اس سے آگے بڑھ کر امام منصوص کی معرفت، اصولِ ایمان میں سے قرار دے دی گئی۔ اس لئے یہ نقطہ، کفر اور ایمان میں حدِ فاصل بن گیا۔ اس عقیدہ کی رو سے، شیعہ اور سنی مسلمانوں کے دو فرقے قرار نہیں پاتے، بلکہ (شیعہ حضرات کے عقیدہ کی رو سے) غیر شیعہ (جو امام منصوص کے قائل نہیں)، دائرہ اسلام سے خارج ہو جاتے ہیں۔ اسی لئے شیعہ حضرات کے نزدیک سنی، مسلمان ہی قرار نہیں پا سکتے۔ پھر جس طرح، آگے چل کر، سنیوں میں متعدد فرقے پیدا ہو گئے، اسی طرح شیعہ بھی مختلف فرقوں میں بٹ گئے لیکن جہاں تک مسئلہ خلافت کا تعلق ہے، اس پر ان کے سب فرقے متفق ہیں (تفصیل ان امور کی آگے چل کر ملے گی جہاں یہ بھی بتایا جائے گا کہ شیعہ حضرات کا دعویٰ یہ ہے کہ یہ عقائد اس علم پر مبنی ہیں جو ان کے ائمہ کو خدا کی طرف سے عطا ہوا تھا۔)

کفر و ایمان کا خطِ امتیاز

(تاریخی روایات کی رو سے) جن خیالات کی تخم ریزی عبداللہ بن سبا نے کی تھی وہ ان شکلوں میں گُل و بار لائے۔ ہم اوپر بیان کر چکے ہیں کہ یہ شخص یمن کا رہنے والا تھا لیکن چونکہ یمن اس زمانے میں ایرانیوں کا مقبوضہ علاقہ تھا، اور وہاں ایرانی بکثرت آباد تھے، اس لئے ابن سبا کے ان خیالات کا سرچشمہ ایرانیوں کے معتقدات ہی تھے۔ وہ اس کے بعد زیادہ عرصہ کوفہ اور بصرہ میں رہا جہاں ایرانیوں نے (اسلام لانے کے بعد) سکونت اختیار کر رکھی تھی۔ نیز، وہ مدائن میں بھی رہا، جو ایران کا دارالسلطنت تھا۔ ان قرائن کی رو سے قیاس کا رخ اسی طرف جاتا ہے کہ اس کے یہ خیالات ایرانی معتقدات ہی کا عکس تھے۔ ہیکل نے اس باب میں، انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا کی شائع کردہ "تاریخ المورخ" کا ایک طویل اقتباس، اپنی کتاب میں درج کیا ہے۔ اس میں کہا گیا ہے کہ ایرانیوں نے اسلام اختیار کیا

ایرانی نظریہ

تو اس کا اثر سیاسی اور مذہبی گوشوں پر بڑا گہرا پڑا۔ اس میں لکھا ہے :۔

ایرانی عقیدہ 'ملک کے بادشاہ کو " خدا کا بیٹا " قرار دیتا تھا اور اسے پیدائشی طور پر عظمت و تقدس کا دیوتا سمجھتا تھا۔ چنانچہ جب ایرانیوں نے مدینہ اور دمشق کی حکومتوں کے خلاف بغاوت کی تو وہ (حضرت) محمدؐ کے عم زاد بھائی اور شرعی وارث حضرت علیؓ کے گرد جمع ہو گئے جنہیں خلافت سے دُور رکھا گیا تھا[1] اور ان کے چاروں طرف جلال و تقدس کا وہ ہالہ قائم کر دیا گیا جو اُن کے اسلاف اپنے قومی بادشاہوں کے گرد قائم کرتے چلے آئے تھے۔ پھر جس طرح ان کے بزرگ 'کسریٰ کو آسمان کا بیٹا' مقدس بادشاہ کے لقب سے ملقّب کرنے کے عادی تھے اور ان کی کتابوں میں اُسے " سید و مرشد " لکھا جاتا تھا 'اسی طرح انہوں نے ' اپنے اسلام کے زمانے میں حضرت علیؓ کو امام کا لقب دے دیا جو اپنی سادگی کے باوجود بڑے اہم معانی کا مالک ہے۔

جب حضرت علیؓ وفات پا گئے تو ایرانی ان کے صاحبزادوں (حضرت حسنؓ اور حضرت حسینؓ) کے گرد جمع ہو گئے اور ان کے بعد ان کی اولاد کے گرد۔ کہا جاتا ہے کہ حضرت حسینؓ نے اکاسرۂ بنی ساسان کے آخری تاجدار کی بیٹی سے شادی کی تھی۔ چنانچہ اس ازدواج سے 'امامت' مقدس حق کے ساتھ رشتہ بدامن ہو گئی۔ پھر کربلا کے میدان میں حضرت حسینؓ کے خون نے اس وحدت کو متبرک بنا دیا جو اسلام اور قدیم ایران کے درمیان قائم ہوئی تھی۔

وہ بغاوت جس نے بنو امیہ سے حکومت چھین کر 'رسول اللہ کے قرابت داروں 'بنو عباس' کو تخت پر بٹھا دیا' ایرانیوں ہی کی برپا کی ہوئی تھی جس کے ذریعے انہوں نے اپنے اصولِ امامت کی تشکیل و تصدیق کر دی۔ اگرچہ وہ اس گھرانے کو تاج نہ پہنا سکے جس تاج کے لئے انہوں نے اپنی تمام تر کوششیں صرف کر دی تھیں۔ (عمر فاروقِ اعظم، از محمد حسنین ہیکل، اردو ترجمہ صہ ۴۱۹)

یزدگرد کی بیٹی کی امام حسینؓ کے ساتھ شادی کا ذکر چھٹے باب میں آچکا ہے۔ اس سلسلہ میں شیعہ حضرات

حضرت شہر بانو کے متعلق شیعہ روایت

کی احادیث کی کتاب 'اصول الکافی' میں جو روایت آئی ہے وہ بھی غور طلب ہے۔ اس میں ذکرِ مولدِ علی

---

[1] اس کی تفصیل آگے چل کر ملے گی۔

بن الحسینؑ کے ضمن میں لکھا ہے کہ ان کی والدہ کا نام سلامہ (زیادہ مشہور شہر بانو ہے۔ ممکن ہے یہ نام اسلامی ہو) بنتِ یزد جرد بن شہر یار بن شیرویہ بن کسریٰ تھا۔ اور یزد جرد ایران کا آخری بادشاہ تھا" اس کے بعد ہے:۔

امام محمد باقر علیہ السلام نے فرمایا کہ جب بنتِ یزد جرد حضرت عمر کے پاس آئیں تو مدینہ کی باکرہ لڑکیاں ان کا حسن و جمال دیکھنے بالائے بام آئیں۔ جب مسجد میں داخل ہوئیں تو چہرہ کی تابندگی سے مسجد روشن ہو گئی۔ عمر نے جب ان کی طرف دیکھا تو انہوں نے اپنا چہرہ چھپا لیا اور کہا۔ بُرا ہو ہرمز کا کہ اس کی سوئے تدبیر سے یہ روزِ بد نصیب ہوا۔ حضرت عمر نے کہا۔ کیا تو مجھے گالی دیتی ہے (کہ میرے دیکھنے کو روزِ بد کہا) اور ان کی اذیت کا ارادہ کیا۔ انہوں نے کہا۔ ایسا نہیں ہے۔ امیرالمومنین نے کہا کہ اس کو اختیار دو کہ یہ مسلمانوں میں سے کسی کو اپنے لئے اختیار کر لے۔ اس کے حصۂ غنیمت میں اس کو سمجھ لیا جائے۔ جب اختیار دیا گیا تو وہ لوگوں کو دیکھتی ہوئی چلیں۔ (اور امام حسینؑ کے سر پر اپنا ہاتھ رکھ دیا) امیرالمومنین نے پوچھا، تمہارا نام کیا ہے۔ کہا جہاں شاہ۔ حضرت عمرؓ نے فرمایا، نہیں بلکہ شہر بانو۔ پھر امام حسین سے فرمایا، اے ابو عبداللہ! تمہارا ایک بیٹا اس کے بطن سے پیدا ہو گا جو اہلِ زمین میں سب سے بہتر ہو گا۔ چنانچہ علی ابن الحسین پیدا ہوتے۔ پس وہ بہترین عرب ہاشمی ہونے کی وجہ سے اور بہترین عجم تھے ایرانی ہونے کی وجہ سے۔

(کتاب الشافی، جلد اوّل، صہ ۷۹۔ ۸۰ ۔ ترجمہ اصول کافی، جلد اوّل)

حضرت علیؓ کے ساتھ اہلِ ایران کے سلسلۂ روابط کی ایک کڑی (تاریخی روایات کی رُو سے)، ایک اور شخصیّت بھی ہیں۔ یعنی حضرت سلمان فارسیؓ جو معروف صحابی ہیں۔ اُن کے متعلق بہت سی روایات مشہور ہیں۔ مؤرخ ابنِ

حضرت سلمانؓ فارسی

اثیر نے (اپنی کتاب، اسد الغابہ فی سیرۃ الصحابہؓ) میں لکھا ہے کہ حضرت سلمانؓ، اصحابِ رسول اللہ میں سے تھے۔ ان کی عمر کے بارے میں اختلاف ہے۔ ڈھائی سو برس سے لے کر چھ سو برس تک بیان کی جاتی ہے۔ انہوں نے حواریانِ حضرت مسیحؑ کا زمانہ پایا تھا اور ان کی صحبت میں رہے تھے۔ انہیں حضرت مسیحؑ کی پیشگوئی دربارۂ بعثتِ احمدؐ (فارقلیط) کا علم تھا، اور یہ بھی کہ آپؐ کا ظہور یثرب میں ہو گا۔ انہیں ایک یہودی نے جو مالِ تجارت لیکر یثرب کی طرف آرہا تھا، پکڑ کر غلام بنا لیا اور اس طرح یہ اس کے ساتھ وہاں آ گئے۔ ہجرت کے بعد، یہ مدینہ آکر حضورؐ کے دستِ مبارک پر مشرّف بہ اسلام ہوئے اور آپؐ نے انہیں صحابہؓ کی مالی مدد سے،

یہودی کی غلامی سے نجات دلائی۔ جب آپؐ نے مدینہ میں مہاجرین اور انصار میں مواخات قائم کی تو (حضرت) سلمانؓ کا ان دونوں میں سے کسی میں بھی شمار نہ ہوا۔ اس پر نبیٔ اکرمؐ نے فرمایا کہ — سلمان من اھل بیتی — یعنی سلمانؓ میرے اہلِ بیت میں سے ہے۔ (بحوالہ ازالۃ الخلفا۔ شاہ ولی اللہؒ)

یوں حضرت سلمان فارسیؓ کا شمار "اہلِ بیت" میں کر لیا گیا۔ اس کے بعد، کتبِ روایات میں مذکور ہے کہ جب سورۂ جمعہ کی یہ آیت نازل ہوئی۔ وَّ اٰخَرِيْنَ مِنْهُمْ لَمَّا يَلْحَقُوْا بِهِمْ۔ (۶۲/۳) نبیٔ اکرمؐ، اپنی قومِ مخاطب کی طرف بھی رسول ہیں اور ان کی طرف بھی جو ان کے بعد آنے والے ہیں، تو صحابہؓ نے دریافت فرمایا کہ ان (بعد میں آنے والوں) سے کون لوگ مراد ہیں۔ حضرت سلمان فارسیؓ آپ کے پہلو بہ پہلو بیٹھے تھے۔ آپؐ نے ان کے زانو (یا سر) پر ہاتھ مار کر فرمایا کہ وہ اس کی قوم کے افراد ہوں گے اور ان میں ایک شخص اس عظمت و شان کا پیدا ہوگا کہ ایمان خواہ ثریا میں بھی کیوں نہ ہو، وہ اسے وہاں سے بھی اتار لائے گا اور علمِ اولین و آخرین کا وارث ہوگا۔ اسی طرح جامع ترمذی میں ہے کہ جب آیت — وَاِنْ تَتَوَلَّوْا يَسْتَبْدِلْ قَوْمًا غَيْرَكُمْ۔ (۴۷/۳۸) نازل ہوئی جس میں کہا گیا ہے کہ اگر تم دین سے پھر جاؤ گے، تو خدا تمہاری جگہ کسی اور قوم کو لے آئے گا۔ تو

لوگوں نے پوچھا کہ یا رسول اللہ! کس قوم کو اللہ ہماری جگہ چن لے گا۔ آپؐ نے سلمانؓ کے مونڈھے پر ہاتھ مار کر فرمایا — اس کی قوم کو، اس کی قوم کو۔

ان روایات کی رُو سے، ایک تو عربوں کے مقابلہ میں ایرانیوں کی برتری ثابت ہوگئی اور دوسرے، ایک "آنیوالے" کے عقیدہ کا دروازہ کھل گیا۔

یہ ہیں حضرت سلمان فارسیؓ کے کوائف، جن کے متعلق شیعہ حضرات کا عقیدہ ہے کہ رسول اللہؐ کی وفات کے بعد (اہلِ بیت کو چھوڑ کر) صرف تین مسلمان باقی رہ گئے تھے یعنی حضرت مقدادؓ، حضرت ابوذرؓ اور حضرت سلمان فارسیؓ[1]

(۰)(۰)

---

[1] میں نے اسکا حوالہ "فروعِ کافی، باب الروضہ" الگ رکھا ہے لیکن اس وقت میرے پاس فروعِ کافی کی جلد اوّل ہے۔ جس میں باب الروضہ نہیں۔ وہ باب غالباً اس کی دوسری جلد میں ہے لیکن شیعہ حضرات کے ہاں یہ رِوایت مسلّم ہے۔ اگرچہ بعض روایات میں انہیں دو اور اصحاب کا بھی اضافہ ہے۔ یعنی حضرت علیؓ کے غلام حضرت قنبر اور حضرت عمار بن یاسرؓ کا۔ انہوں نے حضرت علیؓ کے دعویٰ خلافت کی تائید کی تھی۔

"تاریخ المورّخ" کا جو اقتباس پہلے درج کیا جا چکا ہے، اس میں کہا گیا ہے کہ اگرچہ ایرانی اس گھرانے کو تاج پہنا نہ سکے جنہیں تاج پہنانے کے لئے انہوں نے اپنی کوششیں صرف کر دی تھیں لیکن، انہوں نے، سلطنت، بنی امیہ کے ہاتھ سے چھین کر، بنو عباس کے ہاتھ میں دے دی جو رسول اللہ کے قرابتدار تھے۔ چونکہ ہمارے پیشِ نظر مقصد یہ بتانا ہے کہ اُس زمانے کے ایرانیوں نے کس طرح اسلامی مملکت میں اندرونی خلفشار پیدا کر کے، اسے کمزور کر دیا، اس لئے تاریخ کا یہ گوشہ بھی ہمارے موضوع سے متعلق ہو جاتا ہے کہ انہوں نے ان سازشوں کا سلسلہ کس طرح جاری رکھا جن کے نتیجہ میں سلطنت، بنی امیہ کے ہاتھ سے نکل کر بنو عباس کیطرف منتقل ہو گئی اور پھر سقوطِ بغداد کے بعد اس کا خاتمہ ہی ہو گیا۔

امام حسنؓ کی خلافت سے دستبرداری

حضرت علیؓ کے زمانے میں، مملکت دو حصوں میں تقسیم ہو گئی تھی ــــ ایک حصہ حضرت علیؓ کے زیرِ اقتدار تھا جس کا دارالخلافہ کوفہ تھا۔ دوسرا حصہ حضرت معاویہؓ کے زیرِ نگین۔ اس کا دارالخلافہ دمشق تھا۔ حضرت علیؓ کی شہادت کے بعد، ان کے بڑے صاحبزادہ، امام حسنؓ ان کے جانشین ہوئے لیکن تھوڑے ہی دنوں کے بعد، وہ حضرت معاویہؓ کے حق میں خلافت سے دستبردار ہو گئے۔ ابن خلدون کی تصریح کے مطابق:۔

> امام حسنؓ نے امیر معاویہؓ کو لکھا کہ وہ خلافت سے دستبردار ہو سکتے ہیں بشرطیکہ کوفہ کے بیت المال میں جس قدر رقم ہے وہ انہیں دے دی جائے۔ اس رقم کی مقدار پانچ کروڑ تھی۔ نیز یہ کہ دارا بجرد کا خراج بھی (جو فارس کا ایک حصہ تھا) انہیں ادا کیا جاتا رہے۔
>
> (ابن خلدون، جلد ۲، صہ ۴۵۶)

اس معاملہ کے طے پا جانے کے بعد، سلطنت پوری کی پوری امیر معاویہؓ (بنی امیہ) کی طرف منتقل ہو گئی۔

حسنینؓ کے امیر معاویہؓ کے ساتھ تعلقات

واضح رہے کہ ان حضرات کے باہمی تعلقات نہایت خوشگوار تھے (مثلاً) علامہ ابن کثیر نے لکھا ہے کہ:۔

> جب خلافتِ معاویہؓ قائم ہو گئی تو (حضرت) حسینؓ اپنے بھائی (حضرت) حسنؓ کے ساتھ ان کے پاس جایا کرتے تھے۔ وہ ان دونوں کی بڑی عزت کرتے، نہایت خندہ پیشانی سے ان کا استقبال کرتے، اور گراں قدر عطیات سے انہیں نوازتے۔ انہوں نے ایک ایک دن میں دو دو لاکھ درہم عطا

کئے۔ (البدایہ والنہایہ۔ جلد ۸)

یہ سلسلہ امام حسنؓ کی وفات کے بعد، امام حسینؓ کے ساتھ بھی جاری رہا۔ نہج البلاغہ کے شارح ابن ابی الحدید نے لکھا ہے کہ

> معاویہؓ دنیا میں پہلے شخص تھے جنہوں نے دس دس لاکھ درہم عطا کئے اور ان کے فرزند (یزید) پہلے شخص ہیں جنہوں نے اسے دگنا کر دیا۔ یہ عطایا حضرت علیؓ کے دونوں بیٹوں، امام حسنؓ و حسینؓ کو ہر سال عطا ہوتے تھے۔ (شرح ابن ابی الحدید، جلد ۲)

پھر ان کی باہمی رشتہ داریاں بھی تھیں۔ (مثلاً) امام حسینؓ کی بھتیجی، یعنی حضرت عبداللہ بن جعفر طیار کی صاحبزادی

باہمی رشتہ داریاں

سیدہ امّ محمد، یزید کے عقد میں تھیں اور امام حسینؓ کی زوجۂ محترمہ (والدۂ حضرت علی اکبر) امیر معاویہؓ کی حقیقی بھانجی تھیں۔

جب سلطنت، بنی امیہ کی طرف منتقل ہوگئی تو ایرانیوں کی سازشوں کا رُخ بھی انہی کی طرف پھر گیا۔ اس مقصد کے لئے انہیں بنی عبّاس کی شکل میں ایک مؤثر مہرہ ہاتھ آگیا۔ بنی عباس اور بنی امیہ ایک ہی

بنی اُمیّہ اور بنی عبّاس کی رقابت

شجر کی دو شاخیں تھیں۔ اس سلسلہ میں ذیل کے شجرۂ نسب پر ایک نگاہ ڈال لینا مفید ہوگا۔

قریش میں عبد مناف ایک ممتاز شخصیت گزری تھی۔ وہ ان دونوں خاندانوں کا مورث تھا۔ اس سے سلسلہ یوں آگے چلا:۔

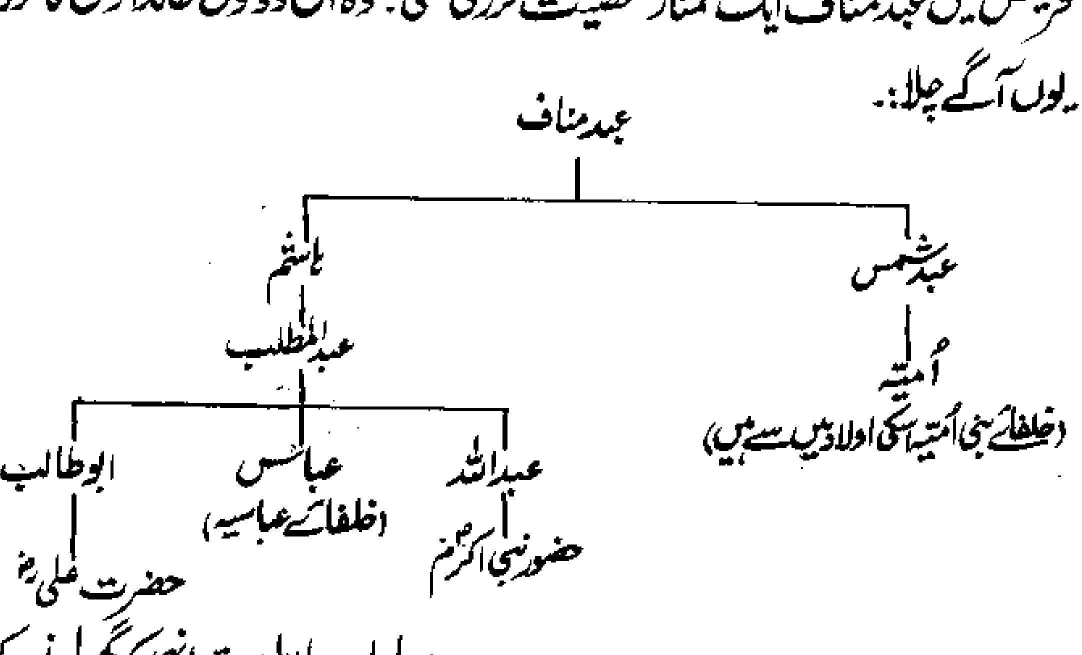

بنی امیہ برسرِ اقتدار آئے تو بنی عباس کے دل میں رقابت کی آگ بھڑک اٹھی۔ ایرانی اس قسم کے مواقع کی تلاش میں تھے۔ انہوں نے اس سے فائدہ اٹھانے کی ٹھان لی۔ اس مقام پر تاریخ میں ایک اور شخصیت سامنے آتی ہے جو ابو مسلم خراسانی کے نام سے مشہور ہے۔ یہ عباسیوں کے حق میں پراپیگنڈہ کا سب سے بڑا داعی تھا۔ بنی عباس کی اپنی کوئی ایسی خصوصیت نہیں تھی جس کی بنا پر عوام کو ان کا طرفدار بنایا جا سکتا۔ اس کمی کو پورا کرنے کیلئے ابو مسلم نے وہی پرانا حربہ استعمال کیا۔ البتہ اس کا ہدف تبدیل کر دیا۔ اس نے اس عقیدہ کو پھر سے عام کیا کہ خلافت "اہلِ بیت" کا حقِ وراثت ہے۔ یہ انہی کو ملنی چاہیئے۔ "اہلِ بیت" کی اصطلاح کو سمجھنے کے لئے حسبِ ذیل شجرۂ نسب کا سامنے لانا ضروری ہے۔

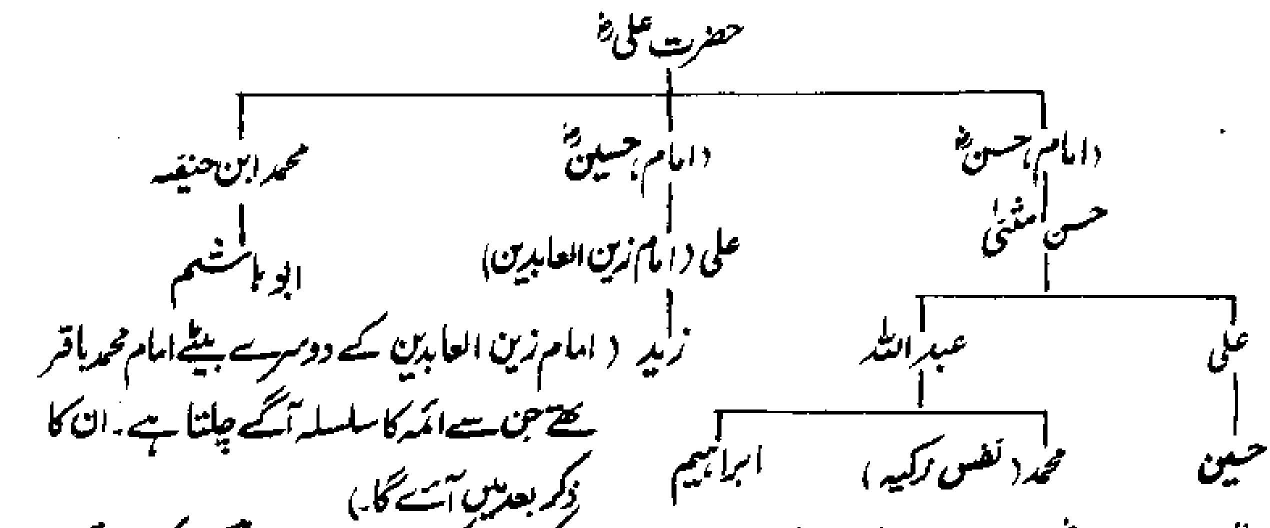

امام حسنؓ اور امام حسینؓ حضرت فاطمہؓ کے بطن سے تھے۔ ان کی اولاد کو عام طور پر سادات کہا جاتا ہے۔ حضرت

سادات اور علوی

فاطمہؓ کی وفات کے بعد حضرت علیؓ نے متعدد شادیاں کیں جن سے آپ کے ہاں بکثرت اولاد ہوئی۔ روایات کی رُو سے، ان کے ہاں اٹھارہ بیٹے اور اٹھارہ بیٹیاں پیدا ہوئیں۔ ان میں سے جو بیٹے حضرت فاطمہؓ کے علاوہ، دوسری بیویوں سے پیدا ہوئے، ان کی اولاد علوی کہلاتی ہے۔ (مندرجہ بالا شجرۂ نسب میں، ہم نے ان میں سے اُن کے صرف ایک بیٹے، محمد ابن حنفیہ کا نام لکھا ہے کیونکہ موضوع زیرِ نظر سے سردست انہی کا تعلق ہے)۔ شیعوں کے دو معروف فرقے (اثنا عشری اور اسماعیلی، جن کا تفصیلی ذکر آگے چل کر آتا ہے) امامت کو امام زین العابدین کے بیٹے امام باقر اور ان کی اولاد میں متوارث تسلیم کرتے ہیں لیکن ایک فرقہ (زیدیہ) اسے، ان کے دوسرے بیٹے، زید کی طرف منتقل شدہ سمجھتا ہے۔ ان کا ایک اور فرقہ، امامت کو حضرت علیؓ کے بعد، ان کے بیٹے

محمد ابن حنفیہ کی طرف منتقل کرتا ہے۔ اسے فرقہ کیسانیہ کہا جاتا ہے۔ ہم نے اس مقام پر ان حضرات (اور فرقوں) کا اجمالی سا تعارف اس لئے ضروری سمجھا ہے کہ بنی امیہ کے خلاف جو محاذ قائم ہوئے تھے، ان میں اگرچہ سب سے نمایاں حیثیت بنو عباس کی تھی، لیکن چند ایک مقامات پر، فاطمیین اور علویین نے بھی اہم کردار ادا کیا تھا۔

خلفائے بنی امیہ نے حضرت عبداللہ بن عباسؓ کے بیٹے، علی کو ایک گاؤں حمیمہ میں، جو مدینہ سے دمشق کے راستے پر واقعہ تھا، جاگیر عطا کر رکھی تھی۔ وہ اسی گاؤں میں سکونت رکھتے تھے۔ فرقہ کیسانیہ کے امام ابو ہاشم کا ادھر سے گزر ہوا اور اتفاقاً ان کا انتقال حمیمہ میں ہو گیا۔ چونکہ ان کا بیٹا کوئی نہیں تھا، اس لئے بنی عباس نے دعویٰ کر دیا کہ وہ علی کے لئے حقِ امامت کی وصیت کر گئے ہیں۔ اس طرح بنو عباس کے دل میں امامت کا داعیہ پیدا ہو گیا اور کیسانیہ ان کے داعی بن گئے۔ علی کی وفات کے بعد، ان کا بیٹا محمدؐ امام قرار پایا۔ اس نے سوچا کہ بنی عباس کے نام میں کوئی ایسی کشش نہیں جس سے عوام ان کی طرف راغب ہو جائیں، اس لئے اس نے اپنے دعاۃ سے کہا کہ وہ اپنی دعوت و تبلیغ میں کسی کا نام نہ لیں، بلکہ کہیں کہ امامت "اہلِ بیت" کا حق ہے۔ اس مقصد کے لئے اس نے خراسان کو اپنا مرکز قرار دے لیا کیونکہ وہاں ایرانیوں کی تائید بآسانی حاصل ہو سکتی تھی۔ اس مقام پر ابو مسلم خراسانی ہمارے سامنے آتا ہے۔

ابو مسلم خراسانی

ابراہیم بن عثمان بن بشار اس کا نام تھا۔ یہ ایرانی الاصل اور بزرجمہر کی اولاد سے تھا۔ اصفہان میں پیدا ہوا اور کوفہ میں ابتدائی پرورش پائی۔ بلا کا ذہین اور اعلیٰ تنظیمی صلاحیتوں کا مالک تھا۔ پراپیگنڈہ کے فن میں اس کا کوئی حریف نہیں تھا۔ محمد (عباسی) کے بیٹے ابراہیم نے ان کی صلاحیتوں کو بھانپا اور پراپیگنڈہ کا شعبہ اس کے سپرد کر دیا۔ اس نے "اہلِ بیت" کے نام سے اس قدر شدومد سے پروپیگنڈہ کیا کہ سلطنتِ بنی امیہ کی بنیادوں میں تزلزل واقعہ ہو گیا۔ اس دوران میں، فاطمیین نے بھی بنی امیہ کے خلاف محاذ آرائیاں کیں۔ (مثلاً) ۶۱ھ میں کربلا کا واقعہ ظہور میں آیا۔ ۱۲۲ھ میں، امام زین العابدین کے فرزند، زید نے کوفہ سے بغاوت کی۔ ۱۲۶ھ میں زید کے بیٹے یحییٰ نے خراسان سے۔ ان کے علاوہ حضرت جعفر طیارؓ کی اولاد میں سے، عبداللہ ابن معاویہ نے ۱۲۷ھ میں کوفہ سے علمِ بغاوت بلند کیا لیکن یہ کامیاب نہ ہو سکے۔[1]

---

[1] فاطمیین نے اپنی سلطنت، پہلے شمالی افریقہ اور بعد میں مصر میں قائم کی۔ اس کا ذکر آگے چل کر آئیگا۔

لیکن ابومسلم کا پروپیگنڈہ کامیاب ہوگیا. اس زمانے میں ایک "آنے والے" (مہدی) کا عقیدہ بھی عام ہو رہا تھا. اس کے ساتھ ہی اس قسم کی روایات بھی پھیلائی جا رہی تھیں کہ وہ آنے والا، خراسان کی طرف سے آئے گا. اس کے لشکر کا لباس بھی سیاہ ہوگا اور جھنڈے بھی سیاہ رنگ کے. ابومسلم نے اس "آنے والے" کا پراپیگنڈہ بڑی شدّومد سے کیا اور جب دیکھا کہ فضا سازگار ہوگئی ہے تو وہ سیاہ لباس اور سیاہ جھنڈے کے ساتھ ایک لشکرِ جرّار کے ساتھ نکلا. اس نے ۱۲۸ھ میں خراسان فتح کر لیا اور ۱۳۲ھ میں، ایک فیصلہ کن جنگ کے بعد بنی امیّہ کا خاتمہ ہوگیا اور سلطنت بنو عبّاس کی طرف منتقل ہوگئی. ان کا پہلا خلیفہ عبداللہ تھا، جو سفّاح کے لقب سے مشہور ہے. بنی عبّاس نے بنی امیّہ سے جو انتقام لینا تھا وہ تو لیا، لیکن اس خطرہ کے ماتحت کہ ابومسلم کہیں زیادہ طاقت نہ پکڑ لے، ۱۳۷ھ میں اس کا بھی خاتمہ کر دیا.

"امام مہدی" کی آمد

ہم دیکھ چکے ہیں کہ عباسیوں نے سلطنت "محبّتِ اہلِ بیت" کے نقاب میں حاصل کی تھی. اہلِ بیت کو یہ بات فطرۃً کھٹک رہی تھی کہ سلطنت حاصل کرنے کے لئے ہر جگہ ان کا نام لیا گیا اور جب وہ حاصل ہوگئی تو بنو عبّاس اس کے مالک بن بیٹھے. چنانچہ محمد نفس زکیہ ان کے خلاف اٹھے لیکن ناکام رہے. ان کا دعویٰ تھا کہ امامت کی وارث حضرت علیؓ کی اولاد ہے، حضرت عبّاس کی نہیں. عباسی خلیفہ منصور نے ان کے اس دعویٰ کی تردید کی اور کہا کہ وراثت کے اصول کے مطابق خلافت، آلِ عبّاس کو ملنی چاہیئے. اس موضوع پر ان دونوں کے درمیان جو خط و کتابت ہوئی وہ بڑی دلچسپ اور عبرت آموز ہے. ہم اسے بتمامہٖ نقل کرتے ہیں. اس سے یہ حقیقت واضح ہو جائے گی کہ وہ خلافت، جو قرآنی اصول کے مطابق، بلالحاظ نسل و نسب صرف جوہرِ ذاتی کی بنا پر کسی کو امّت کے مشورے سے تفویض ہونی چاہیئے تھی، کس طرح وراثت قرار پاگئی. خط و کتابت ملاحظہ فرمایئے. پہلا خط خلیفہ ابوجعفر عبداللہ بن محمد (منصور - عباسی خلیفہ) کا، محمد بن عبداللہ (نفس زکیہ) کے نام ہے. اس میں لکھا ہے.

حقِ خلافت کے متعلق خط و کتابت

قرآن میں اللہ نے فرمایا ہے کہ جو لوگ اللہ اور اس کے رسول سے لڑیں اور دنیا میں فساد پھیلائیں، ان کی سزا یہ ہے کہ مار ڈالے جائیں یا سولی پر چڑھا دیئے جائیں یا ان کے ہاتھ پاؤں برخلاف کاٹ

لیئے جائیں یا ملک بدر کر دیئے جائیں۔ اس لیئے میں اللہ اور اس کے نبی محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے حق کا واسطہ دے کر عہد و پیمان کرتا ہوں کہ اگر اس سے پہلے کہ میں تمہارے اوپر قابو پاؤں تم توبہ کر لو گے تو میں تمہاری اور تمہارے تمام بھائیوں کی اور ساتھیوں کی اور معتقدوں کی جو اس بغاوت میں شریک ہیں، جان بخشی کر دوں گا۔ نیز دس لاکھ درہم تم کو دوں گا کہ جہاں چاہو رہو اور تمہاری جو ضروریات ہوں گی ان کو پورا کرتا رہوں گا۔ تمہارے اہل بیت اور شیعہ میں سے جو لوگ میرے قیدخانوں میں ہیں، ان کو چھوڑ دوں گا اور کسی قسم کی تکلیف نہیں دوں گا۔ اگر تم اس پر راضی ہو تو اپنے کسی معتمد کو بھیج دو تاکہ آکر مجھ سے عہدنامہ لکھوالے۔"

اس کے جواب میں نفس زکیہ نے لکھا:

از جانب محمد بن عبداللہ مہدی امیرالمومنین بنام عبداللہ بن محمد۔ میں بھی تمہارے لیئے اسی قسم کی امان پیش کرتا ہوں جس قسم کی تم نے پیش کی ہے۔ تم جانتے ہو کہ خلافت ہمارا حق ہے اور ہمارے ہی شیعوں کی بدولت تم نے اس کو حاصل کیا ہے۔ ہمارے باپ حضرت علی کرم اللہ وجہہ، وصی اور امام تھے۔ ہم جو ان کے بیٹے ہیں، زندہ ہیں۔ پھر ہمارے ہوتے ہوئے تم کیسے اس کے وارث بن گئے۔ تمہیں یہ بھی خوب معلوم ہے کہ جاہلیت اور اسلام دونوں میں بنی ہاشم میں سے جو نسبی فضائل و مفاخر ہم کو حاصل ہیں وہ کسی کو حاصل نہیں ہو سکے۔ زمانۂ جاہلیت میں رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی دادی فاطمہ بنت عمرو کے شکم سے ہم ہیں نہ کہ تم۔ خاص کر ہاشم کی اولاد میں، میں نسب میں سب سے بہتر اور ماں باپ کے لحاظ سے سب سے بڑھ کر ہوں۔ میری رگوں میں امہات اولاد کا غیر عربی خون مطلق نہیں ہے۔ میرے نسب کو اللہ نے ہمیشہ ممتاز رکھا۔ دنیا میں سب سے افضل محمد صلے اللہ علیہ وسلم ہیں۔ میں ان کا بیٹا ہوں۔ صحابہؓ میں میرے باپ حضرت علیؓ اسلام میں سب سے اوّل، علم میں سب سے فائق اور جہاد میں سب سے افضل تھے۔ میری ماں حضرت خدیجہؓ ہیں جنہوں نے اس اُمت میں سب سے پہلے نماز پڑھی۔ پھر حضرت فاطمہؓ ہیں جو ان کی بیٹیوں میں سب سے بہتر اور جنتی عورتوں کی سردار ہیں۔ زمانۂ اسلام میں ہاشم کے بہترین فرزند حضرت حسنؓ اور حسینؓ ہیں جو بہشتی نوجوانوں کے سید ہیں ان میں سے بڑے کا میں بیٹا ہوں۔ اب دیکھو۔ حضرت علیؓ والدین کی طرف سے ہاشم کے بیٹے ہیں امام حسنؓ والدین کی طرف سے عبدالمطلب کے بیٹے ہیں اور میں والدین کی طرف سے رسول اللہؐ کا بیٹا

ہوں۔ اللہ نے ہمارا امتیاز ہمیشہ قائم رکھا۔ یہاں تک کہ جہنم میں بھی اس نے اس کا لحاظ کیا۔ یعنی میں اس شخص کا بیٹا ہوں جو جنت میں سب سے بڑا درجہ رکھتا ہے اور اس شخص کا بیٹا ہوں جو جہنم میں سب سے ہلکا عذاب پائے گا۔ اس طرح پر نیکوں میں سب سے بہتر، نیک اور گنہگاروں میں سب سے کمتر گنہگار کا فرزند ہوں۔

میں اللہ کو گواہ کر کے تم کو ہر چیز کی سوائے کسی شرعی حد یا کسی مسلم یا معاہد کے حق کے جو تمہارے ذمہ ہو امان دیتا ہوں اور میں بہ نسبت تمہارے عہد کا زیادہ پابند ہوں۔ تم نے مجھ کو جو امان دی ہے وہ کون سی ہے؟ ابن ہبیرہ والی یا وہ جو تم نے اپنے چچا عبداللہ کو یا ابو مسلم خراسانی کو دی تھی۔" فقط

منصور کو جب یہ خط پہنچا تو اس کے کاتب نے جواب لکھنے کی اجازت مانگی۔ منصور نے کہا کہ یہ تمہارا کام نہیں ہے۔ جب حسب نسب اور خاندان کے جھگڑے آپڑے تو خود مجھے جواب لکھنا چاہیئے۔ اس نے لکھا۔

از ابو جعفر عبداللہ بن محمد امیر المومنین بنام محمد بن عبداللہ۔

تمہارا خط مجھ کو ملا۔ عوام کو برانگیختہ کرنے اور جہلا میں مقبول بننے کے لئے تم نے یہ نسبی مفاخر جوڑ رکھے ہیں جن کی ساری بنیاد عورتوں پر ہے۔ حالانکہ عورتوں کا وہ درجہ نہیں ہے جو چچا کا ہے۔ تم کو معلوم ہے کہ اللہ نے جس وقت نبی صلے اللہ علیہ وسلم کو مبعوث فرمایا اس وقت ان کے چچاؤں میں سے چار شخص زندہ تھے۔ (حمزہ، عباسؓ، ابو طالب اور ابو لہب) ان میں سے دو اسلام لائے، جن میں سے ایک میرا باپ تھا اور دو کافر رہے جن میں سے ایک تمہارا باپ تھا۔ تم نے عورتوں کا ذکر کر کے ان کی قرابت پر جو فخر کیا ہے، یہ نادانی ہے۔ اگر عورتوں کو نسبی فضیلت میں سے کوئی حصہ ملتا تو ساری فضیلت رسولؐ اللہ کی والدہ کے لئے ہوتی۔ لیکن اللہ تو جس کو چاہتا ہے اپنے دین سے سر بلند کرتا ہے۔

تعجب ہے کہ ابو طالب کی والدہ فاطمہ بنت عمرو پر بھی تم نے ناز کیا ہے۔ سوچو تو کہ ان کے بیٹوں میں سے کسی کو بھی اللہ نے اسلام کی ہدایت کی اور اگر کرتا تو اس کے زیادہ حقدار نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے والد ہو سکتے تھے لیکن وہ تو جس کو چاہتا ہے اسی کو ہدایت دیتا ہے۔

تم نے اس پر بھی فخر کیا ہے کہ حضرت علیؓ والدین کی طرف سے ہاشمی ہیں اور حسنؓ والدین کی طرف سے عبدالمطلب کے بیٹے ہیں اور تمہارا نسب والدین کی طرف سے رسولؐ اللہ تک پہنچتا ہے۔ اگر

یہ واقعی کوئی فضیلت ہوتی تو نبی صلے اللہ علیہ وسلم اس کے زیادہ مستحق ہوتے لیکن وہ تو صرف ایک ہی طرف سے ہاشمی ہیں۔

پھر تم اپنے آپ کو رسول اللہ کا بیٹا کہتے ہو حالانکہ قرآن نے اس سے بالکل انکار کیا ہے۔

مَا كَانَ مُحَمَّدٌ اَبَآ اَحَدٍ مِّنْ رِّجَالِكُمْ۔(۳۳/۴۰)

محمدؐ تمہارے مردوں میں سے کسی کے باپ نہ تھے۔

ہاں تمہارا یہ کہنا درست ہے کہ تم ان کی بیٹی کی اولاد ہو اور یہ بے شک ایک قریبی رشتہ ہے لیکن اس کے ذریعے سے کسی قسم کی میراث نہیں مل سکتی اور نہ اس سے تم امامت کے حقدار ہو سکتے ہو۔ اسی قرابت کی بنیاد پر تمہارے باپ حضرت علیؓ نے ہر طرح پر خلافت حاصل کرنے کی کوشش کی۔ حضرت فاطمہؓ کو ابوبکرؓ سے لڑا کر رنجیدہ کیا۔ اسی غصہ میں ان کی بیماری کی بھی کسی کو اطلاع نہیں کی اور جب انہوں نے انتقال فرمایا تو رات ہی کو لے جا کر ان کو دفن کر دیا مگر کوئی ابوبکرؓ کو چھوڑ کر ان کی خلافت پر راضی نہ ہوا۔ خود آں حضرتؐ کی بیماری کے زمانے میں بھی وہ موجود تھے لیکن نماز پڑھانے کا حکم آپؐ نے ابوبکرؓ کو دیا۔ ان کے بعد حضرت عمرؓ خلیفہ ہو گئے۔ پھر خلافت اصحاب شوریٰ میں آئی۔ اس میں بھی وہ انتخاب میں نہ آ سکے اور حضرت عثمانؓ خلیفہ ہو گئے۔ ان کے بعد انہوں نے طلحہؓ اور زبیرؓ پر سختی کی۔ سعدؓ بن ابی وقاص سے بیعت لینی چاہی۔ انہوں نے اپنا پھاٹک بند کر لیا۔ جب علیؓ گزر گئے۔ امام حسنؓ ان کی جگہ پر آئے۔ معاویہؓ نے شام سے لشکر کشی کی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ کچھ رقم ان سے لے کر اپنے شیعہ اور خلافت دونوں کو معاویہؓ کے سپرد کر دیا اور مدینہ چلے گئے۔ لہٰذا، اگر تمہارا کچھ حق بھی تھا تو تم اس کو فروخت کر چکے۔ تمہارا یہ کہنا کہ اللہ نے جہنم میں بھی تمہارے امتیاز کا لحاظ رکھا، تمہارے باپ ابوطالب کو اس میں سب سے کمتر عذاب ملے گا' نہایت افسوسناک ہے۔ اللہ کا عذاب خواہ کم ہو یا زیادہ مسلمان کے لئے فخر کی چیز نہیں ہے اور نہ اس میں کوئی فضیلت ہے۔

یہ جو تم نے لکھا ہے کہ تمہاری رگوں میں عجمی خون مطلق نہیں ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے تم آنحضرتؐ کے فرزند ابراہیم سے بھی بڑھ کر اپنے آپ کو سمجھتے ہو، حالانکہ وہ ہر لحاظ سے تم سے افضل تھے۔

خود تمہارے خاندان میں زین العابدین تھے۔ وہ تمہارے دادا حسن بن حسن سے بہتر تھے۔ پھر ان

کے بیٹے محمد باقر تمہارے باپ سے بہتر اور ان کے بیٹے جعفر صادق تم سے بہتر ہیں۔ حالانکہ ان سب کی رگوں میں عجمی خون ہے۔

تم یہ بھی دعوے کرتے ہو کہ نسب اور ماں باپ کے لحاظ سے تم کل بنی ہاشم سے بہتر ہو۔ بنی ہاشم میں سے رسول اللہؐ بھی ہیں۔ تمہیں یہ تو پیشِ نظر رکھنا چاہیئے کہ قیامت کے دن اللہ کو منہ دکھانا ہے۔

صفین کے معاملے میں تمہارے باپ حضرت علیؓ نے پنچوں سے پیمان کیا تھا کہ ان کے فیصلے پر رضامند ہو جائیں گے۔ تم نے یہ سُنا ہو گا کہ پنچوں نے ان کو خلافت سے معزول کر دیا تھا۔ یزید کے عہد میں تمہارے عم حسینؓ ابنِ علیؓ ابنِ زیاد کے مقابلے کے لئے کوفہ میں آئے اور جو لوگ ان کے حامی تھے، انہی کے ہاتھوں قتل ہوئے۔ ان کے بعد تمہارے خاندان کے کئی آدمی یکے بعد دیگرے خلافت لینے کے لئے اٹھے۔ بنی امیہ نے ان کو قتل کیا اور سولی پر چڑھایا۔ یہاں تک کہ ہم مستعد ہوئے اور ہم نے تمہارا اور اپنا سب کا انتقام ان سے لے لیا۔ وہ نماز کے بعد تمہارے اوپر جو لعنتیں بھیجا کرتے تھے، اس کو بند کیا۔ تمہارے رتبے بڑھائے۔ اب انہی امور کو تم ہمارے سامنے بطور حجّت کے پیش کرتے ہو۔ کیا تم یہ سمجھتے ہو کہ ہم نے حضرت علیؓ کی فضیلت کا جو اظہار کیا ہے تو ہم ان کو عباسؓ و حمزہ (رضی اللہ عنہما) سے بھی بڑھ کر تسلیم کرتے ہیں۔ وہ سب لوگ محفوظ گزر گئے اور حضرت علیؓ ان جنگوں میں پڑے جن میں مسلمانوں میں خون ریزی ہوئی۔

تمہیں یہ بھی معلوم ہو گا کہ زمانۂ جاہلیت میں سقایۂ حاج اور زمزم کے متولی حضرت عباسؓ تھے نہ کہ ابو طالب۔ حضرت عمرؓ کی عدالت میں تمہارے باپ نے اس کا دعوٰے بھی پیش کیا مگر فیصلہ ہمارے حق میں ہوا۔

رسول اللہؐ نے جس وقت وفات پائی اس وقت ان کے اعمام میں سے سوائے حضرت عباسؓ کے اور کوئی زندہ نہ تھا۔ اس لئے کل اولاد عبد المطلب میں سے آنحضرتؐ کے وارث وہی ہیں۔ پھر بنی ہاشم میں سے بہت سے لوگ خلافت حاصل کرنے کے لئے اٹھے لیکن بنی عباس ہی نے اس کو حاصل کیا۔ لہٰذا قدیم استحقاق اور جدید کامیابی حضرت عباسؓ اور ان کی اولاد ہی کے حصّہ میں آئی۔

بدر کی لڑائی میں تمہارے چچا طالب اور عقیل کی وجہ سے مجبوراً حضرت عباسؓ کو بھی آنا پڑا۔ ورنہ وہ دونوں بھوکوں مر جاتے یا عتبہ اور شیبہ کے پیالے چاٹتے۔ ہمارے ہی باپ کی بدولت اس ننگ و عار سے بچے۔ نیز آغازِ اسلام میں قحط کے زمانے میں حضرت عباسؓ ہی نے ابوطالب کی امداد کی۔ پھر تمہارے چچا عقیل کا فدیہ بھی بدر میں، انہوں نے ہی ادا کیا۔ الغرض جاہلیت اور اسلام دونوں میں ہمارے احسانات تمہارے اوپر ہیں۔ ہمارے باپ نے تمہارے باپ پر احسان کئے اور ہم نے تمہارے اوپر اور جن رتبوں پر تم خود اپنے آپ کو نہیں پہنچا سکے تھے، ان پر ہم نے تم کو پہنچایا اور جو انتقام تم نہیں لے سکے تھے وہ ہم نے لئے۔ والسلام۔

"ان خطوط کو پڑھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ حکومت الٰہی کا تصور دماغوں سے کس قدر بعید ہو چکا تھا کہ ابوجعفر منصور جیسا اہل سنت کا عظیم الشان خلیفہ اور نفس زکیہ جیسا اہل بیت کا مہدی تسلیم کیا ہوا امام اس کو وراثت تسلیم کر رہے ہیں۔ صرف جھگڑا یہ ہے کہ یہ وراثت بیٹی کی اولاد کو پہنچتی ہے یا چچا کی[1]۔"

(تاریخ الامت، جلد ہشتم، علامہ اسلم جیراجپوریؒ)

آپ دیکھ رہے ہیں کہ اس خط و کتابت میں بجز خاندانی تفاخر اور طعن و تشنیع کے، کچھ نہیں۔ اس کے بعد منصور نے ایک لشکرِ جرّار، (امام) نفس زکیہ کے خلاف بھیجا جس نے انہیں شکست دے کر قتل کر دیا۔ یہ ۱۴۵ھ کا واقعہ ہے۔

(•)

ابومسلم، ایرانی سلطنت کے احیاء کا عزم لے کر آیا تھا۔ یہ اپنے اس ارادے میں کامیاب نہ ہوا تو اس کے بعد، ایک ایرانی، فرد نہیں، بلکہ خاندان، اسی عزم کو لے کر عباسیوں کے ہاں آ گیا۔ یہ خاندان بھی ایرانی سلطنت

---

[1] اسی قسم کی ایک بحث خلیفہ مامون الرشید اور امام علی رضا کی عیون الاخبار میں منقول ہے۔ مامون نے امام موصوف سے پوچھا کہ تم کس بنیاد پر خلافت کا دعویٰ کرتے ہو؟ بولے کہ رسول اللہ سے حضرت علیؓ اور حضرت فاطمہؓ کی قرابت پر۔ مامون نے کہا کہ اگر حضرت علیؓ کی قرابت کی بنیاد پر یہ دعویٰ ہے تو آنحضرتؐ نے ایسے ورثہ چھوڑے تھے جن میں سے بعض ان میں سے بھی زیادہ قریبی اور بعض انہی کے درجے کے تھے اور اگر فاطمہؓ کے رشتہ کی بنیاد پر ہے تو ان کے بعد اس کے حقدار حسنؓ اور حسینؓ تھے۔ ان کی موجودگی میں حضرت علیؓ نے خلافت پر قبضہ کر کے اُن کا حق کیوں غصب کیا۔ امام علی رضا نے اسکا کوئی جواب نہیں دیا۔

کو زندہ تو نہ کر سکا، لیکن اس نے مسلمانوں کی اس عظیم مملکت (عباسیہ) میں نہ اسلام رہنے دیا نہ عربیت۔ دونوں کی جگہ عجمیت نے لے لی اور یہ ایرانی سازش کی بڑی نمایاں کامیابی تھی۔ تاریخ میں یہ خاندان برامکہ کے لقب سے

برامکہ

مشہور ہے۔ برامکہ کے لقب کی وجہ تسمیہ کے متعلق روایات میں اختلاف ہے لیکن اکثریت کا خیال ہے کہ اس لفظ کی اصلیت "برِ ماہ گاہ" ہے۔ یعنی ایرانیوں کے سب سے بڑے آتشکدہ کا اعلیٰ ترین متولی یا پجاری۔ اس مندر میں چاند کے دیوتا کا مجسمہ نصب تھا اور نوبہار کہلاتا تھا۔ برمکیوں کا جدِ امجد، جاماسپ بن پشتاسپ تھا جو گشتاسپ کے زمانہ میں نوبہار کا پہلا موبد مقرر ہوا اور اس خدمت کے اعزاز میں اسے پوری مملکت کا موبدِ موبداں (قاضی القضاۃ یا چیف جسٹس) بھی بنا دیا گیا۔ یہ وہ اعلیٰ ترین منصب تھا جس کے سامنے شہنشاہوں تک کی گردنیں جھک جاتی تھیں۔ اس کے بعد اسے مملکت کا دستورِ اعظم (یعنی وزیر اعظم) بھی مقرر کر دیا گیا۔ اس خاندان کی وجاہت کا یہ عالم تھا کہ ایران کے پیامبر (جناب) زردشت نے اپنی بیٹی کا نکاح، جاماسپ سے کر دیا تھا اور جاماسپ کی ایک بھتیجی (جناب) زردشت سے منسوب تھی۔ ہم پہلے عباسی خلیفہ (عبد اللہ بن محمد بن علی، ملقب بہ سفاح) کے دربار میں، خالد برمکی کو ایک نہایت بلند ذمہ دار منصب پر فائز دیکھتے ہیں۔ (چونکہ ہمارے پیشِ نظر برامکہ کی تاریخ نویسی نہیں، اس لئے ہمیں اس تفصیل میں جانے کی ضرورت نہیں کہ یہ کیسے ہوا تھا۔ ہمارے پیشِ نظر مقصد کے لئے اتنا جان لینا کافی ہے کہ بنو عباس کے سب سے پہلے خلیفہ کے زمانہ ہی میں اس خاندان نے اس قدر اثر و رسوخ پیدا کر لیا تھا، خلیفہ کے ساتھ خالد کے تعلقات کا اندازہ اس سے لگایئے کہ خلیفہ کی بیٹی کو، خالد کی بیوی نے دودھ پلایا تھا اور خالد کی بیٹی کو خلیفہ کی بیوی نے۔ خلیفہ المہدی کے زمانے میں خالد کو صوبہ فارس کا حاکم مقرر کر دیا گیا تھا۔ خالد کا بیٹا یحییٰ اس سے بھی زیادہ زیرک اور قابل تھا۔ خلیفہ منصور نے اسے آذربائیجان کا حاکم مقرر کر دیا لیکن خالد نے اس کے لئے، اس سے بھی زیادہ اہم اور مؤثر گوشہ تلاش کیا۔ یعنی اسے ولی عہد ہارون الرشید کا اتالیق مقرر کر دیا۔ یہ اتالیقی، خاندانِ برامکہ کے لئے انتہائی عروج اور سطوت کا موجب بن گئی اور ایک گونہ موروثی قرار پا گئی۔ فضل اور جعفر، یحییٰ کے دو بیٹے، باپ اور دادا سے بھی زیادہ قابل تھے۔ خلیفہ ہارون الرشید کے عہد میں کیفیت یہ تھی کہ سلطنت کا سارا کاروبار یحییٰ کے سپرد تھا جسے وہ اپنے ان دونوں بیٹوں کے مشورہ سے سر انجام پاتا تھا۔ نتیجہ یہ کہ خلافت نام کو عباسیوں کے ہاتھ میں تھی لیکن درحقیقت برامکہ کی تحویل میں۔ اس خاندان نے مملکت میں سیاسی سطوت ہی حاصل نہیں کی بلکہ مملکت کے ہر گوشے کو ایرانی رنگ میں

رنگ دیا۔ یحییٰ نے بغداد میں بیت الحکمۃ قائم کیا جس میں عجم کی تاریخ اور لٹریچر کا معتد بہ ذخیرہ عربی زبان میں منتقل کر دیا گیا۔ اس کے ساتھ ہی اس نے بحث و مناظرہ کی مجالس بھی نہایت اعلیٰ پیمانہ پر قائم کیں۔

سارا معاشرہ عجمیت کے رنگ میں

ان مجالس میں، ایرانی، یہودی اور نصاریٰ علماء اور فلاسفر ایک طرف ہوتے تھے اور مسلمان علماء دوسری طرف اور موضوع بحث، اسلامی عقائد و نظریات ہوتے تھے۔ ان مباحثوں کا جو نتیجہ نکل سکتا ہے وہ ظاہر ہے۔ اول تو عرب سادہ سی قوم تھی جو فلسفیانہ نکات آفرینیوں اور منطقی موشگافیوں میں الجھنا جانتی ہی نہ تھی، پھر، مملکت کی سیاسی مصلحتوں نے انہیں اس قدر دبا کر رکھا تھا کہ ان کا جذبۂ حریت ماؤف ہو کر رہ گیا تھا۔ ان کے مدِمقابل، اُس ایرانی قوم کے اہلِ علم و دانش تھے جو قرنہا قرن سے فلسفہ، منطق اور الٰہیات کے مسائل پر غور و فکر کے حامل تھے، ان کے ساتھ یہود و نصاریٰ (جو یوں کہیے کہ یونانی فلسفہ کے ماہر تھے۔ نتیجہ یہ کہ ہر مباحثہ کے بعد، اسلامی عقائد و نظریات کے متعلق شکوک و شبہات کا سیلاب امنڈ آتا اور ان کے مقابلہ میں، عجمی تصورات و معتقدات نہایت معقول دکھائی دیتے۔ علاوہ ازیں، مملکت کے سارے خزانے برامکہ کی تحویل میں تھے۔ یہ ان (مجوسی، یہودی اور عیسائی) مناظرین کو اس قدر انعام و اکرام سے نوازتے کہ ان مذاہب کے علماء دُور دُور سے کھنچ کر ان مجالس میں شامل ہوتے۔ برامکہ کی اس سازش سے، قرآنی اسلام کس طرح عجمی اسلام بن کر رہ گیا، اس کی تفصیل آگے چل کر سامنے آئے گی کیونکہ سرِدست ہم اپنی بحث کو ایرانیوں کے سیاسی اثر و غلبہ تک محدود رکھنا چاہتے ہیں۔

یحییٰ برمکی کی اولاد تو خاصی تھی لیکن (جیسا کہ پہلے بتایا جا چکا ہے) ان میں سے فضل اور جعفر بڑے نامور تھے۔ عباسی خاندان میں برامکہ کے علوِ مرتبت کا اس سے اندازہ لگایئے کہ فضل اور ہارون الرشید دودھ شریک بھائی تھے۔ یعنی ہارون الرشید کی والدہ خیزران نے (جو تاریخ میں نہایت ممتاز مقام رکھتی ہے) اپنے بیٹے ہارون اور فضل کو ایک ساتھ دودھ پلایا تھا۔ اس کی گود میں ایک طرف ہارون ہوتا تھا اور دوسری طرف فضل۔ جب ہارون برسرِ اقتدار آیا تو اس نے فضل کو مملکت کے بلند ترین مناصب پر فائز کرنا چاہا لیکن (جس طرح خالد نے یحییٰ کے سلسلہ میں کیا تھا) یحییٰ نے مصلحتاً فضل کو محلات کے اندر رکھا اور امورِ مملکت جعفر کے سپرد کئے۔ یوں مملکت کی داخلی اور خارجی شاہ رگیں ان دونوں بھائیوں کی گرفت

میں چلی گئیں۔ اس گرفت کارُخ متعیّن کرنے کے لیے، ان کے بوڑھے باپ (یحییٰ) کا تجربہ ان کے ساتھ تھا۔ سلطنت کلیتہً ان تینوں کے ہاتھ میں تھی۔ لیکن، جیسا کہ عام طور پر ہُوا کرتا ہے، قوت، ثروت، دولت اور حکومت کے نشہ نے ان کے ہوش و حواس پر اثر ڈالنا شروع کر دیا جس کی وجہ سے انہوں نے اپنی سازشی کارروائیوں میں احتیاط برتنی چھوڑ دی اور رفتہ رفتہ ہارون الرشید پر ان کی حقیقت بے نقاب ہونی شروع ہو گئی۔ یہیں سے ان کے زوال کی ابتداء ہوئی۔ ہارون الرشید جب بھی ملک میں دورہ کرتا تو جس جس جگہ اس کے خیمے نصب ہوتے، اسے معلوم و محسوس ہوتا کہ وہاں حکومت برامکہ کی ہے، اس کی نہیں۔ اس سے ان کے دل میں کھٹک پیدا ہونی شروع ہو گئی جو آہستہ آہستہ برامکہ کی تباہی کا موجب بنی۔

برامکہ کا انجام

اس نے جعفر کو قتل کرا دیا۔ یحییٰ اور فضل کو قید کر دیا اور انہیں اس قدر اذیتیں دیں کہ ان کی تفصیل سن کر روح کانپنے لگتی ہے۔ اس نے خاندانِ برامکہ کی تمام جائیدادیں ضبط کر لیں۔ مملکت سے ان کا صفایا کر دیا۔ بعض مؤرخین نے جعفر کے قتل کا سبب یہ بتایا ہے کہ اس نے ہارون الرشید کی ہمشیرہ کے ساتھ خفیہ نکاح کر لیا تھا لیکن محققین کے نزدیک اس "واقعہ" کی حیثیت افسانہ سے زیادہ کچھ نہیں۔ جعفر کے قتل اور دیگر برامکہ کے زوال کے اسباب وہی تھے جن کی طرف ہم نے اوپر اشارہ کیا ہے اور جنہیں ابنِ خلدون نے نہایت وضاحت سے اپنی تاریخ میں بیان کیا ہے۔

برامکہ بے شک ختم ہو گئے، وہ ایرانی سلطنت کا احیاء بھی نہ کر سکے لیکن وہ جس مقصد کو لے کر آئے تھے، اس میں بڑے کامیاب ہوئے۔ انہوں نے عبّاسیوں کی عربی مملکت کو خالصتہً ایرانی، ان کے معاشرہ کو یکسر غیر عربی اور ان کے مذہب (اسلام) کو عجمی بنا دیا۔ (ہم آگے چل کر دیکھیں گے کہ جو اسلام اس کے بعد آگے چلا وہ عجمی اسلام تھا۔ محمد رسول اللہ کا لایا ہُوا، دینِ خداوندی نہیں تھا)۔ ابومسلم اس سلسلہ کی پہلی کڑی تھا۔ اس نے ایرانی رضاکاروں کو عبّاسی فوج میں داخل کر کے، عسکری قوّت کو بھی غیر عربی بنا دیا تھا۔ اس نے خالد برمکی کو بھی اپنی فوج میں شامل کر لیا تھا اور اسی کی سفارش پر اس نے عبّاسیوں کے دربار تک رسائی حاصل کی تھی۔ فضل برمکی نے اپنے عہدِ وزارت میں صوبہ خراسان میں جس قدر فوج بھرتی کی، وہ بھی خالص ایرانی تھی۔ اس فوج کی تعداد پانچ لاکھ سے کم نہیں تھی۔ علاوہ ازیں، مملکت کے قریب قریب تمام کلیدی مناصب پر ایرانی (برامکہ) فائز تھے۔ مرکز اور اضلاع کے خزانوں پر ایرانی افسر مقرر تھے جس کا

نتیجہ یہ تھا کہ (عام عرب تو ایک طرف، خود خلیفہ ہارون الرشید کو بھی یحییٰ کی منظوری کے بغیر اپنی سلطنت کا خزانۂ عامرہ سے ایک پیسہ تک نہیں مل سکتا تھا۔

جب (امام) محمد بن علی عباس کا انتقال ہوا تو ابو مسلم نے امام کے ماتم میں فوج کی وردی سیاہ کردی اور مملکت کے علم پر سیاہ حریری پردے چڑھادیئے اور (امام) ابراہیم عباسی معہ اپنے خاندان کے سیاہ پوش ہوگئے اور اسی دن سے عباسیوں نے سیاہ لباس کو اپنا خاندانی شعار بنالیا۔ (جیسا کہ پہلے لکھا جاچکا ہے یہی سیاہ لباس اور علم تھے، جو "آنے والے" کی روایتی نشانی بن کر ابو مسلم کی کامیابی کا باعث بنے تھے غور کیجئے کہ یہ شخص کس قدر ماہر شاطر تھا۔) ابو مسلم نے اس طرح عباسیوں کے ظاہری شعار کو ایرانی رنگ میں رنگ دیا اور برامکہ نے ان کی نفسیات تک کو بدل کر عجمی بنا دیا اور سارا معاشرہ اسی رنگ میں رنگا گیا خالد کے عہدِ وزارت میں ایران کے جشنِ نوروز کا آغاز عباسی مملکت میں ہوگیا تھا اور جعفر برمکی نے اپنے دور میں جشنِ مہرجان کی تقریب کو عام کردیا۔ یہ دونوں تقریبیں مجوسیوں کی عیدیں تھیں۔ (ایران میں اب تک جشنِ نوروز بطور عید منایا جاتا ہے)۔ ہمارے ہاں (یعنی...... مسلم ممالک میں) شب بارات (یا برأت) کی تقریب اور اس کی آتش بازی خود برامکی آتشکدوں کی یاد تازہ کرتی ہے۔ بعض مؤرخین کا خیال ہے کہ برامکہ شیعہ تھے لیکن شیعہ مؤرخ اسے صحیح تسلیم نہیں کرتے۔ اصل یہ ہے کہ ان لوگوں کو شیعہ اور سنی نسبتوں سے متعارف کرنا ہی غلط ہے۔ یہ اسلام تو لے آئے تھے لیکن مجوسیت ان کے رگ و ریشے میں حلول کئے ہوئے تھی۔ انہوں نے اپنے اسی قدیم ایرانی مذہب کے عقائد و تصورات کو اسلامی پردوں میں چھپا کر عام کردیا اور یہی ان کا مقصد تھا۔

عباسیوں کی داستان کا سلسلہ دراز ہے اور ایرانیوں کے ہاتھوں ان کی آخری تباہی کا زمانہ ہنوز دور۔ اس مقام پر ہمیں تھوڑے سے وقت کے لئے رک کر یہ دیکھنا چاہیئے کہ اس دوران میں علویین اور فاطمینِ مصر کی سرگرمیاں کیا تھیں۔

فاطمینِ مصر

یہ اپنے انداز اور طریق کے مطابق، عباسی سلطنت کے خلاف وقتاً فوقتاً اٹھتے رہے۔ تاریخی تحقیق کے مطابق، انہوں نے ۱۳۸ھ سے لے کر ۳۵۸ھ تک، قریب باسٹھ مرتبہ حکومت کے خلاف بغاوت کی لیکن ہر بار ناکام رہے[1]۔ ان میں سے

---

[1] بحوالہ "تحقیقِ مزید بہ سلسلۂ خلافتِ معاویہ و یزید" از محمود احمد عباسی۔

صرف ایک جماعت اپنی حکومت قائم کرنے میں کامیاب ہوئی جو فاطمیین کے نام سے مشہور ہے۔ اس کے پہلے خلیفہ نے رقادہ (شمالی افریقہ) میں، ۲۹۷ھ میں اپنی آزاد حکومت قائم کی۔ یہ شیعوں کے مشہور فرقہ اسمٰعیلیہ سے متعلق تھا۔ ۳۵۸ھ تک اس سلطنت کا دائرہ شمالی افریقہ تک محدود رہا۔ اس کے بعد اس نے شام اور مصر کو بھی فتح کر لیا۔ اسی جہت سے اسے "دولتِ فاطمیینِ مصر" کہا جاتا ہے۔ انہوں نے بڑی شان و شوکت سے حکومت کی اور شیعہ مذہب (اسماعیلیہ) کے پھیلانے میں نمایاں سرگرمیاں دکھلائیں۔ اس مقصد کے لئے، قاہرہ میں ایک وسیع و عریض مسجد جامع تعمیر کی جس کا نام جامع ازہر رکھا۔ یہ مسجد درحقیقت اس مذہب کی نشر و اشاعت کا سرچشمہ اور مرکز تھی۔ (جامع ازہر مصر میں اب تک موجود ہے لیکن اب وہ سنیوں کی درس گاہ ہے) رفتہ رفتہ داخلی انتشار کی وجہ سے اس حکومت میں ضعف آنا شروع ہو گیا جو اس زمانے میں، جب صلیبی جنگیں شروع تھیں، انتہا تک پہنچ گیا۔ بجائے اس کے کہ یہ حکومت، دوسری مسلمان حکومتوں کے ساتھ مل کر صلیبیوں کا مقابلہ کرتی، یہ خود صلیبیوں کے ساتھ مل گئی..... لیکن صلاح الدین ایوبی نے صلیبیوں کو شکست دی تو اس کے ساتھ ہی فاطمی حکومت کا بھی خاتمہ ہو گیا۔ اس کے بعد، یہ مملکت دوبارہ عباسی سلطنت کا جزو بن گئی۔ یہ ۵۶۷ھ کی بات ہے۔

اکثر مؤرخین کا خیال ہے کہ دولتِ فاطمیہ کے حکمرانوں کا اپنے آپ کو فاطمی مشہور کرنا غلط تھا۔ اس سلطنت کا بانی درحقیقت عبداللہ بن میمون القداح تھا جو ایران کا رہنے والا دہریہ تھا اور بظاہر (اسماعیلی امام) محمد بن اسماعیل کے نام پر بیعت لیتا تھا۔ اس نے اپنے آپ کو فاطمی مشہور کر کے، اس آزاد مملکت کی بنیاد ڈالی تھی لیکن دوسرے محققین کا خیال ہے کہ یہ صحیح النسب فاطمی تھے۔ یہ بحث ہمارے موضوع سے خارج ہے۔ ہمارا مقصد صرف یہ واضح کرنا ہے کہ عباسی سلطنت کے خلاف کیا کیا سازشیں ہوئیں اور ان میں سے کون سی سازش کامیاب ہوئی۔ یہ سازش، بالواسطہ ایرانی تھی یا بلاواسطہ، اس سے ہمارے مقصد پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ اگر قداح (ایرانی) خود فاطمی نہیں تھا تو فاطمیین کی کامیابی میں اس کی کوششوں کا بڑا حصہ تھا۔

اب چلئے واپس بغداد کی طرف۔ بات یہاں تک پہنچی تھی کہ پہلے ابومسلم نے اور بعد میں برامکہ نے عباسی مملکت کو کس طرح ایرانی عقائد و تصورات کی آماجگاہ بنا دیا تھا۔

(۰)

ابومسلم قتل ہو گیا۔ برامکہ کا خاتمہ ہو گیا۔ لیکن یہ لوگ، ایرانیت کا جو بیج بو گئے تھے، وہ بڑھتا پھولتا

پھیلتا چلا گیا۔ اس کا نتیجہ یہ تھا کہ عباسی سلطنت کا مرکز کمزور سے کمزور تر ہوتا چلا گیا اور صوبے زور پکڑتے چلے گئے۔ ان میں ایران پیش پیش تھا۔ اس کی بین مثال دیالم (یا بنی بویہ) کی سلطنت ہے۔

دیلمی حکومت

دیالم کا خطہ جو بحرِ خزر کے جنوب میں واقع ہے، حضرت عمرؓ کے زمانہ میں اسلامی فتوحات میں شامل ہوا لیکن وہاں کے باشندے اپنے قدیم مذہب پر قائم رہے، بعد میں وہ مسلمان ہوگئے۔ بویہ دیلمی ان میں ممتاز حیثیت کا مالک تھا۔ اس کے تین بیٹے (علی۔ حسن اور احمد) بھی باپ کی طرح نامور تھے۔ ان میں سے علی نے خاصی قوت حاصل کرلی۔ یہ شخص دولتِ دیالم یا بنی بویہ کا بانی ہے۔ ان بھائیوں نے آہستہ آہستہ پہلے ایران کے مختلف صوبوں میں اپنی حکومت قائم کرلی اور عراق تک کو اپنی حدود میں شامل کرلیا۔ اس کے بعد، بغداد کے بعض امراء کے ایماء پر، آگے بڑھے اور ۳۳۴ھ میں، احمد بغداد میں داخل ہوگیا۔ خلیفہ مستکفی نے اس کا شاہانہ استقبال کیا۔ (اس سے آپ اس زمانے کے عباسی خلفاً کے "اقتدار" کا اندازہ لگا سکتے ہیں!) خلیفہ نے اس کی سلطنت کو تسلیم کرلیا اور علی کو عماد الدولہ، حسن کو رکن الدولہ، اور احمد کو معزالدولہ کے خطاب سے نوازا اور سکوں پر ان کے نام مسکوک کرنے کا حکم جاری کردیا۔ اس کے بعد کیفیت یہ تھی کہ خلیفہ صرف ایک مذہبی رئیس رہ گیا جس کا نام خطبوں میں لیا جاتا تھا۔ حکومت بنی بویہ کے ہاتھ میں تھی۔ ابھی معزالدولہ کو زمامِ اقتدار اپنے ہاتھ میں لئے چالیس دن ہی ہوئے تھے کہ اس نے خلیفہ مستکفی کو معزول کر کے قید کردیا، اور وہ بھی نہایت ذلت آمیز طریق سے۔ بنی بویہ غالی شیعہ تھے۔ معزالدولہ وہ شخص ہے جس نے

بغداد، شیعیت کا مرکز

پہلے پہل بغداد میں عاشورہ محرم منانے کا حکم دیا۔ اس حکم میں کہا گیا تھا کہ سب لوگ اپنی دکانیں بند رکھیں، امام حسینؓ کا ماتم کریں اور عورتیں اپنے بال کھول کر نوحہ کرتی ہوئی باہر آئیں۔ اسی طرح اس نے ۱۸ ذی الحجہ کو عیدِ غدیر منانے کا بھی فرمان جاری کیا۔ بغداد کی آبادی بالعموم سنیوں پر مشتمل تھی۔ انہوں نے ان احکام کے خلاف صدائے احتجاج بلند کی تو معزالدولہ نے ان پر سختی شروع کردی۔ نتیجہ اس کا یہ کہ بہت سے سنی وہاں سے ہجرت کر گئے۔ ۴۴۷ھ تک، بنی بویہ کی حکومت رہی جس کا خاتمہ سلاجقہ نے کیا۔ ان کی حکومت ۵۹۰ھ تک قائم رہی۔ سلاجقہ کے زوال کے بعد، قریب چھیاسٹھ سال تک بغداد میں عباسیوں کا خطبہ پڑھا جاتا رہا۔

عباسی سلطنت کا خاتمہ

اس کے بعد اس سلطنت کا ہمیشہ ہمیشہ کے لئے چراغ گل ہوگیا۔ جب چنگیز خاں کا پوتا، ہلاکو خاں برسرِ اقتدار

آیا تو ابن العلقمی، خلیفہ بغداد کا وزیر تھا۔ یہ غالی شیعہ تھا۔ دوسری طرف محقق نصیر الدین طوسی، جو اسی قسم کا شیعہ تھا، ہلاکو خاں کا وزیر تھا۔ ان دونوں کی سازش سے، ہلاکو خان نے بغداد پر حملہ کیا اور اس کی اینٹ سے اینٹ بجا دینے کے بعد خلیفہ مستعصم کو قتل کر دیا۔ اس سے سلطنتِ عباسیہ کا خاتمہ ہو گیا۔ یہ محرم ۶۵۶ھ کا واقعہ ہے۔

اس طرح، ایرانیوں نے جنگِ قادسیہ کی شکست کا بھرپور انتقام لے لیا۔ یہ بنیادی طور پر اُس شکست کا سیاسی انتقام تھا جو انہوں نے مسلمانوں سے لیا۔

خود ایرانیوں کا اعتراف

ہم نے جو کہا ہے کہ اہلِ ایران نے اس طرح اپنی اس شکست کا انتقام لے لیا جو انہیں عربوں کے ہاتھوں اٹھانی پڑی تھی تو یہ ہمارا قیاس نہیں۔ خود ایران کے اربابِ فکر و نظر اس کا اعتراف و اقرار کرتے ہیں۔ حسین کاظم زادہ، عصرِ حاضر کے مشہور ایرانی مؤرخ ہیں۔ وہ اپنی کتاب "تجلیاتِ روحِ ایران، در ادوارِ تاریخی" میں لکھتے ہیں:

> جس دن سے سعد بن ابی وقاصؓ نے خلیفہ دومؓ کی جانب سے ایران کو فتح کیا اور اس پر غلبہ پایا، ایرانی اپنے دل میں کینہ و انتقام کا جذبہ پالتے رہے۔ کینہ و انتقام کا یہ جذبہ متعدد مواقع پر ظاہر ہوتا رہا تا آنکہ فرقۂ شیعہ کی بنیاد پڑ جانے سے یہ کلیتہً بے نقاب ہو گیا۔ اربابِ علم و اطلاع اس حقیقت کو بخوبی جانتے اور مانتے ہیں کہ شیعیت کی بنیاد و ظہور میں، اعتقادی مسائل اور نظری اور نقلی اختلافات کے علاوہ، ایک سیاسی مسئلہ کو بھی دخل تھا۔ ایرانی اس بات کو نہ کبھی بھول سکتے تھے نہ قبول اور معاف کر سکتے کہ مٹھی بھر، ننگے پاؤں پھرنے والے، بادیہ نشین عربوں نے ان کی مملکت پر قبضہ کر لیا۔ اس قدیم مملکت کے خزانوں کو لوٹ کر غارت کر دیا اور ہزاروں بے گناہ انسانوں کو قتل کر ڈالا۔

اس کے بعد یہ مؤرخ لکھتا ہے کہ:

> ہمارے دانشمند بزرگوں کو نہ تو بنو فاطمہ سے عشق تھا اور نہ ہی خاندانِ بنی اُمیہ سے دشمنی۔ ان کا مقصد صرف یہ تھا کہ کسی نہ کسی طرح عرب حکومت کا تختہ الٹ جائے اور اپنی عظمت اور حکومت بحال ہو جائے۔ چونکہ ہاشمی خلافت حضرت علیؓ کے بعد ختم ہو گئی، اور اُموی، خالص عربی حکومت، دنیائے اسلام کی مرکزی حکومت تسلیم کر لی گئی اور اس طرح عرب، عجم پر بری طرح مسلط ہو گیا۔ فلہٰذا،

ہمارے لئے واحد چارۂ کار یہی تھا کہ ہم ہاشمیوں کا ساتھ دے کر، ان کو ابھارتے: ہمارے بزرگوں نے یہی کچھ کیا۔[1]

جب ایرانیوں نے ہاشمیوں کو ابھار کر، اُموی سلطنت کا خاتمہ کر دیا اور اس جگہ خود ہاشمیوں (عباسیوں) کی حکومت قائم ہو گئی تو انہوں نے ہلاکو کو بلا کر، عربوں کی اس سلطنت کا بھی خاتمہ کرا دیا۔ اس طرح انہوں نے بقول قاسم زادہ، اپنی شکستوں کا بدلہ، عربوں سے لے لیا۔

لیکن یہ بدلہ وہ تھا جو انہوں نے عربوں (یا مسلمانوں) سے لیا جو بدلہ انہوں نے اسلام سے لیا (جس نے ان کے مذہبِ مجوسیت کا خاتمہ کر دیا تھا) اس کا تذکرہ اب سامنے آتا ہے۔

(•)

اسلام کی اساسات

قبل اس کے کہ ہم اسلام کے خلاف "عجمی سازش" کی تفاصیل کی طرف آئیں، مناسب معلوم ہوتا ہے کہ (تجدیدِ یادداشت کے لئے) اس دین کی اساسات کو مختصر الفاظ میں دہرا دیا جائے جسے اللہ تعالیٰ نے نبیٔ اکرمؐ کی وساطت سے نوعِ انسان کو دیا؛ اور جو قرآنِ کریم کی دفتین میں محفوظ ہے۔ قرآنِ کریم کی رُو سے۔

(۱) انسانی علم کا ذریعہ، مطالعہ، مشاہدہ، تجربہ اور تعلیم و تعلّم ہے۔ اس علم کو ہر انسان اکتسابی طور پر حاصل کر سکتا ہے۔

(۲) لیکن ایک علم اور بھی تھا جسے اللہ تعالیٰ اپنے مخصوص اور برگزیدہ بندوں کو براہِ راست عطا کرتا تھا۔ اسے وحی کہا جاتا ہے اور جن حضرات کو یہ علم عطا ہوتا تھا انہیں انبیاء یا رسول۔ یہ علم آخری مرتبہ حضورؐ نبیٔ اکرمؐ کو عطا ہوا، اور اس کے بعد اس سلسلہ کو ختم کر دیا گیا — بالفاظِ دیگر، نبوّت حضورؐ کی ذاتِ اقدس پر ختم ہو گئی۔ اس کے بعد علم کا صرف اکتسابی ذریعہ باقی رہ گیا — ختمِ نبوّت کے معنی یہ ہیں کہ اب کسی شخص کو

---

[1] ہم نے پہلا اقتباس، محمود عباسی صاحب کی کتاب، "تحقیقِ مزید بہ سلسلۂ خلافتِ معاویہ و یزید" سے لیا ہے اور دوسرا ملخصاً خواجہ عباد اللہ اختر (مرحوم) کے مقالہ "عجمی مذاہب کا اثر مسلمانوں کے عقائد پر" سے جو مجلہ طلوعِ اسلام کی نومبر ۱۹۵۴ء کی اشاعت میں چھپا تھا۔

براہِ راست خدا سے علم حاصل نہیں ہو سکتا۔

(۳) جو وحی حضور نبیؐ اکرمؐ کو دی گئی وہ بہ تمام و کمال قرآنِ کریم کے اندر محفوظ ہے۔ قرآنِ کریم تمام نوعِ انسان کے لئے اور ہمیشہ کے لئے، مکمل ضابطۂ حیات ہے۔ یہ مکمل بھی ہے اور غیر متبدل بھی، محفوظ بھی ہے اور واضح بھی۔ یہ عربی زبان میں ہے اور غور و تدبر اور علم و بصیرت کی رُو سے سمجھا جا سکتا ہے۔ اسے، اس کی موجودہ شکل میں، خود حضورؐ نبیؐ اکرم نے امت کو دیا تھا اور اس کے بعد اس میں ایک حرف کی بھی کمی بیشی یا تغیر و تبدل نہیں ہوا۔ اس کی حفاظت کا ذمہ خود خدا نے لے رکھا ہے۔

(۴) دین، جو قرآنِ کریم کے اندر محفوظ ہے، ایک نظامِ حیات ہے جو اپنی آزاد مملکت میں عملاً متشکل ہو سکتا ہے۔ یہ مملکت، امتِ محمدیہ کے ہاتھوں متشکل ہوتی ہے۔ یہ امت، اپنے میں سے بہترین فرد کو، بطور سربراہِ مملکت منتخب کرتی ہے اور یہ سربراہ، امت کے مشورہ سے کاروبارِ مملکت سرانجام دیتا ہے۔ مقصد اس مملکت کا قرآنِ کریم کے احکام و قوانین کو عملاً نافذ کرنا اور اس کے اصول و اقدار کے مطابق معاشرہ کی تشکیل کرنا ہوتا ہے۔

(۵) یہ مملکت، سب سے پہلے حضور نبیؐ اکرمؐ نے قائم فرمائی اور حضورؐ کی وفات کے بعد، اس کا سلسلہ کچھ عرصہ تک آگے چلا۔ اس کے بعد امت کی گاڑی کسی اور پٹری پر چل نکلی۔ اسی کا نام دین میں عجمی تحریف ہے۔ چونکہ (جیسا کہ پہلے بھی لکھا جا چکا ہے) اس کا اوّلین سرچشمہ سرزمینِ ایران تھی، اس لئے اسے "**عجمی تحریف**" کی اصطلاح سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ مفہوم اس سے ہر وہ عقیدہ، تصوّر، نظریہ، مسلک و مشرب ہے، جو قرآن کے خلاف ہو، خواہ وہ کہیں سے آیا ہو اور اس کی نسبت کسی کی طرف بھی کیوں نہ کی جاتی ہو۔

ہم دیکھ چکے ہیں کہ امت میں سب سے پہلا اختلاف مسئلہ خلافت کی بنا پر نمودار ہوا۔ حضرت علیؓ کے دعوائے خلافت کے سلسلہ میں کہا یہ گیا کہ خلیفہ منتخب نہیں ہو سکتا۔ یہ خدا کی طرف سے منصوص اور مامور ہوتا ہے۔ اسے امام کہا جاتا ہے۔ پہلے امام حضرت علیؓ ہیں اور آپ کے بعد یہ امامت، آپ کی اولاد میں متوارث جاری رہے گی۔ اُس وقت ہم نے اس عقیدہ کے صرف اس گوشہ کا ذکر کیا تھا جس کا تعلق سیاست سے تھا۔ یہ دین پر کس طرح اثر انداز ہوا، اس کا ذکر اب سامنے لایا جاتا ہے۔ اس کے لئے ضروری ہے کہ

ان حضرات کا شجرۂ نسب سامنے آجائے جنہیں ائمہ (حاملِ امامت) تسلیم کیا جاتا ہے۔ وہ حسبِ ذیل ہے۔

(۱) حضرت علیؓ (م ۴۰ھ)
- (۲) (امام) حسنؓ (م ۴۹ھ)
- (۳) (امام) حسینؓ (م ۶۱ھ)
  - (۴) (امام) زین العابدین (م ۹۵ھ)
    - (۵) (امام) باقر (م ۱۱۴ھ)
      - (۶) (امام) جعفر صادق (م ۱۴۸ھ)
        - (۷)۔ (امام) موسےٰ کاظم۔ (م ۱۸۳ھ)
          - (۸)۔ (امام) علی رضا۔ (م ۲۰۳ھ)
          - (۹)۔ (امام) محمد جواد (تقی)۔ (م ۲۲۰ھ)
          - (۱۰)۔ (امام) علی ہادی (نقی) (م ۲۵۴ھ)
          - (۱۱)۔ (امام) حسن عسکری۔ (م ۲۶۰ھ)
          - (۱۲)۔ (امام) محمد (امام غائب)
        - اسماعیل (باطنی فدائی، آغاخانی اور بوہرے وغیرہ انہی کی نسبت سے اسماعیلیہ کہلاتے ہیں۔ یہ امامت کو انکی اولاد میں موروثی تسلیم کرتے ہیں۔)
    - زید
- محمد بن حنفیہ

فرقہ کیسانیہ

شیعوں کا پہلا فرقہ کیسانیہ ہے جو حضرت علیؓ کے بعد، ان کے اس بیٹے (محمد بن حنفیہ) کو (جو حضرت فاطمہؓ کے بطن سے نہیں تھے بلکہ ان کی ایک اور بیوی، حنفیہ کے بطن سے تھے) امام مانتا تھا۔ بالفاظِ دیگر، اس فرقہ نے فاطمیین کے مقابلہ میں علوئیین کو ترجیح دی۔ جب ان کے امام (محمد بن حنفیہ) کی وفات ہوگئی تو ان میں کے ایک گروہ نے یہ عقیدہ وضع کیا کہ امام محمد بن حنفیہ، مہدیٔ موعود تھے، وہ دراصل مرے نہیں بلکہ لوگوں کی نگاہوں سے غائب ہوگئے ہیں۔ عنقریب دنیا میں واپس آئیں گے اور اپنی حکومت روئے زمین پر قائم کریں گے۔ آپ نے دیکھا کہ عبداللہ ابن سبا نے رجعت کے جس عقیدہ کو پھیلایا تھا انہوں نے اس کا اطلاق کس پر کیا؟ ہم آگے چل کر دیکھیں گے کہ اس عقیدہ کا

اطلاق اہلِ تشیع کی کئی ایک اور ہستیوں پر بھی ہوتا رہا ہے۔ کیسانیہ کا یہ بھی عقیدہ تھا کہ امام، خدا کا مظہر یا اوتار ہوتا ہے اور خدا کی طرح حیؑ و قیوم۔ اس جماعت کا مرکز خراسان تھا جہاں سے وہ سلطنت بنی امیہ کے خلاف سازشوں کا جال پھیلاتے رہتے تھے۔

زیدیہ فرقہ

شیعوں کا دوسرا فرقہ زیدیہ کہلاتا ہے۔ یہ، امامت کے متعلق حضرت علیؓ سے لے کر امام زین العابدینؒ تک جمہور شیعہ سے متفق ہیں، لیکن اس کے بعد، ان کے فرزندِ اکبر، امام باقرؒ کے بجائے، ان کے فرزندِ اصغر، زید کو امام تسلیم کرتے ہیں۔ ان کا عقیدہ یہ ہے کہ امامت حضرت علیؓ کی اولاد میں تو رہے گی لیکن اس کے لئے کسی سلسلہ یا خاندان کی تخصیص نہیں۔ یہ شیعوں کا معتدل ترین فرقہ ہے جو اصول و فقہ میں سنّیوں کے بہت قریب ہے۔

امامیہ و اسماعیلیہ

شیعوں کے جس گروہ نے امام باقرؒ کو امامِ برحق تسلیم کیا، وہ ان کے بعد، ان کے بیٹے امام جعفر صادقؒ کی امامت کے بھی قائل رہے لیکن ان کے بعد یہ پھر دو گروہوں میں بٹ گئے۔ انہی دو گروہوں نے تاریخ میں شہرت حاصل کی ہے۔ ان میں سے ایک گروہ نے کہا کہ امام جعفر صادقؒ کے بعد، ان کے فرزندِ اکبر، اسماعیلؒ امام منصوص ہیں اور دوسرے گروہ نے، ان کے بجائے، ان کے دوسرے بیٹے، امام موسیٰ کاظمؒ کو امام تسلیم کیا۔ اوّل الذکر کو ہفتی امامیہ (کیونکہ وہ پہلے چھ اماموں کو ائمۂ برحق تسلیم کرتے ہیں) یا اسماعیلیہ کہا جاتا ہے۔ باطنی فدائی اور اس قسم کے دوسرے غالی شیعہ فرقے، عام طور پر انہی سے متعلق ہیں۔ آجکل، آغاخانی اور بوہرے، اس فرقہ کی دو مشہور شاخیں ہیں۔ دوسرا فرقہ اثنا عشری یا امامیہ کہلاتا ہے اور جمہور شیعہ اسی سے متعلق ہیں۔ یہ بارہ اماموں کے قائل ہیں اور اس سلسلہ کے آخری امامؒ (محمد) کے متعلق ان کا عقیدہ ہے وہ زندہ ہیں اور عراق کے ایک غار میں مستور۔ قیامت کے قریب، ان کا ظہور ہوگا اور وہ ساری دنیا پر اپنی حکومت قائم کریں گے۔ (انہی کو امام مہدی کہا جاتا ہے۔)

شیعوں کا کوئی فرقہ بھی ہو، امام کے منصوص ہونے اور مہدویت (یعنی ایک آنے والے امام) کا عقیدہ ان سب کے ہاں پایا جاتا ہے لیکن ان کے بعض غالی فرقوں کے عقائد بڑے ہی غلو پر مبنی ہیں۔ (مثلاً) ان

شیعوں کے غالی فرقے

کا ایک فرقہ "خرم دینیہ" ائمہ کو (معاذاللہ) خدا، رسول اور ملائکہ تصور کرتا اور قیامت اور حساب کتاب کا انکار کرتا تھا۔

تناسخ کا قائل تھا۔ اسی کو وہ رجعت کہتے تھے۔ یعنی انسانی روح کا (اسی دنیا میں) ایک قالب سے دوسرے قالب میں منتقل ہو جانا۔ رجعت کے متعلق بعض غالی فرقوں کا عقیدہ تھا کہ قیامت کے قریب نبی اکرمؐ اور دیگر تمام انبیاءؑ دنیا میں واپس آئیں گے اور وہ سب حضورؐ کی نبوت کا اقرار کریں گے۔ اسی طرح حضرت علیؓ بھی دنیا میں واپس تشریف لائیں گے اور حضرت معاویہؓ اور ان کی اولاد کو قتل کریں گے۔ فرقۂ خطابیہ کا بانی، ابوالخطاب، امام جعفر صادقؒ کو (معاذ اللہ) خدا اور اپنے آپ کو ان کا رسول ظاہر کرتا تھا۔ بعض ائمہ جب اس قسم کے عقائد کی تردید اور مخالفت کرتے تو یہ لوگ کہہ دیتے کہ یہ حضرات ایسا کچھ تقیۃً کہتے ہیں، ورنہ دل سے یہ ہم سے متفق ہیں (تقیہ کا مفہوم پہلے بیان ہو چکا ہے۔ یہ عقیدہ بھی شیعوں کے تمام فرقوں میں مشترک ہے) خطابیہ کا ایک عقیدہ یہ بھی تھا کہ ہر دورِ رسالت میں دو پیغمبر ہوتے ہیں۔ ایک ناطق اور دوسرا صامت۔ محمد رسول اللہ ناطق پیغمبر تھے اور حضرت علیؓ صامت۔

بعض غالی فرقوں کے عقاید اس قدر مذموم تھے کہ ان کا ذکر کرنے سے بھی طبیعت ابا کرتی ہے لیکن یہ سب اپنے آپ کو مسلمان ہی کہتے تھے۔ حکومتِ وقت کے خلاف سازشیں کرنا ان کا شیوہ تھا۔ اور ظاہر ہے کہ وہ حکومت بنی اُمیہ کی تھی یا بنی عباس کی، بہرحال سنیوں کی حکومت تھی۔ جب انہیں اپنی مساعی میں کامیابی نہیں ہوتی تھی تو یہ اپنے آپ کو اور اپنے متبعین کو یہ کہہ کر مطمئن کر لیتے تھے کہ خیر، کوئی بات نہیں، آخری زمانہ میں امامِ مستور آئیں گے اور شیعوں کی حکومت قائم کریں گے۔ یہ (غالی) فرقے اپنے اپنے وقت میں ابھرنے کے بعد ختم ہو گئے۔ (اب ان کے محض "نقوشِ قدم" بعض مقامات پر پائے جاتے ہیں لیکن انہیں چنداں اہمیت حاصل نہیں) شیعوں کے دو فرقے البتہ ایسے ہیں جنہیں تاریخ میں نمایاں خصوصیت حاصل رہی ہے اور وہ اب بھی موجود ہیں۔ یعنی اسماعیلیہ (آغاخانی خوجے اور بوہرے) اور امامیہ (اثنا عشری) جن کی اکثریت ہے۔ ان دونوں فرقوں کے اہم عقائد کا ذکر ناگزیر ہے پہلے اسماعیلیہ کو لیجئے۔

اسماعیلیوں کے عقائد

اسماعیلی اپنے عقائد اور تعلیم کو اس شدت کے ساتھ مخفی رکھتے ہیں کہ ان کے متعلق کوئی بات یقینی طور پر کہنا مشکل تھا۔ (اس فرقہ کا تو نام ہی "باطنی" تھا) لیکن کچھ عرصہ پہلے، خود اسی فرقہ کے ایک محقق، ڈاکٹر زاہد علی (سابق پروفیسر عربی و وائس پرنسپل، نظام کالج حیدرآباد دکن) نے بڑی ہمت اور جرأت سے کام لیا اور اپنے فرقہ کی مستند (مخفی) کتب و دستاویزات سے مرتب کردہ، ایک کتاب شائع کر دی، جس کا نام ہے "ہمارے اسماعیلی مذہب کی

حقیقت اور اس کا نظام"۔ ہمارے سامنے اس کتاب کا ۱۹۵۴ء کا ایڈیشن ہے اور ذیل میں جو کچھ درج کیا جاتا ہے، اسی سے مقتبس ہے۔ اس فرقہ کی اساس اور تعلیم کے متعلق اس کتاب میں لکھا ہے کہ،۔

> اس دعوت کے بانی، ایرانی نژاد میمون القداح یا ان کے فرزند سیدنا عبداللہ ہیں۔ اس سے ان کا مقصد ایک ایسی مذہبی تحریک پیدا کرنا تھا جو خلافتِ عباسیہ کا مقابلہ کر سکے۔ اس مقصد کے لئے انہوں نے (امام عبداللہ نے) ایک انجمن بنائی جن میں ایسے افراد شریک کئے جو بالطبع معتزلیوں کے خیالات اور فلسفیوں کی رایوں کی طرف مائل تھے۔ اس تحریک کی کامیابی کے لئے اہل بیت کی مدد لینا پڑی تاکہ وہ شیعہ جن کو اہلِ بیت سے محبت تھی اسے جلد قبول کر لیں۔ (صہ ۶۱۱)

ان کی تعلیم کے متعلق ڈاکٹر زاہد علی نے لکھا ہے کہ" ان کی ابتدائی بناء اس اصول پر ہے کہ آنحضرتؐ نے ظاہری شریعت وضع فرمائی اور مولانا علیؑ نے اس کے باطن یعنی تاویل کی تعلیم شروع کی۔ آپ کے بعد چھ اماموں نے باطنی تعلیم کی تکمیل کی اور ساتویں امام (مولانا محمد بن اسماعیل) نے شریعتِ محمدیہ کے ظاہر کو معطل کر دیا۔ آپ کی نسل سے جو ائمہ ہوئے اور قیامت تک ہوں گے، وہ سب خلفائے قائم ہیں۔ ان میں سے اگر کسی خلیفہ کو موقعہ ملے تو وہ قائم کی حیثیت سے ظہور فرمائیں گے اور تاویل یعنی علمِ باطن ظاہر کر کے تمام دنیا کو اسماعیلی مذہب کا پیرو بنائیں گے ...... اسماعیلی تعلیم کی بڑی خصوصیت رازداری اور پوشیدگی ہے۔ سیاسی مصلحتوں اور ملکی اغراض کے باعث ہم اپنے اصل عقیدے 'اپنی دعوت کے بڑے بڑے ارکان کے سوا کسی دوسرے کو نہیں بتاتے تھے کیونکہ ہماری عام رعایا کا مذہب سنی تھا[۲]۔ اس لئے ہم نے عام لوگوں کو جو تعلیم دی وہ اس تعلیم سے بالکل الگ تھی جو خاص خاص ارکانِ دعوت کو دی جاتی تھی بلکہ خود اسماعیلیوں میں بھی مستجیبوں' یعنی ابتدائی مدارج کے مومنین کو وہ بھید نہیں بتائے جاتے تھے جو بالغوں کو بتلائے جاتے"

(مقدمہ ب)

ان کے عقائد کے متعلق لکھا ہے کہ" امام کو رفعِ شریعت " یعنی شریعت اٹھا دینے کا حق حاصل ہے۔ وہ جب چاہے شریعت اٹھا سکتا ہے اور جب چاہے جاری کر سکتا ہے۔" قرآنِ کریم کے متعلق ان کا عقیدہ

---

[۱] اس کا ذکر، حکومتِ فاطمیہ کے ضمن میں آ چکا ہے۔

[۲] یہ مصر کی فاطمی حکومت کے زمانے کی بات ہے۔

یہ ہے کہ "جس طرح یہود و نصاریٰ نے اصلی تورات اور انجیل کو چھوڑ کر اپنی رائے اور قیاس سے علیحدہ کتابیں جمع کرلیں، مسلمانوں نے بھی اسی طرح کیا۔ رسولِ خدا نے کلام اللہ جمع کرکے اسے اپنے اصحاب کے سامنے اپنے وصی کے سپرد فرمادیا۔ یہ لوگ اس سے بے پرواہ ہوگئے اور اپنی رائے اور قیاس سے ایک الگ قرآن جمع کیا۔ اس کے بعد خلیفہ ثالث نے شیخین کا جمع کیا ہوا نسخہ جلا ڈالا اور ایک دوسرا نسخہ تیار کیا۔ پھر حجاج آیا اور اس نے خلیفہ مذکور کے نسخے کو لے کر آگ میں جھونک دیا۔ اس کے بعد اس نے جو چاہا نکال دیا اور ایسی کتاب تالیف کی جواب اُن کے پاس موجود ہے۔" (مقدمہ)

محرف قرآن

ڈاکٹر زاہد علی نے ان اختلافات کی بہت سی مثالیں پیش کی ہیں جو مسلمانوں کے مروجہ قرآن اور حضرت علیؑ کے مرتّب کردہ قرآن میں پائے جاتے ہیں۔ مثلاً سورہ مائدہ کی آیت (۵/۶۷) یٰٓاَیُّهَا الرَّسُوْلُ بَلِّغْ مَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ فِیْ عَلِیٍّ...... (واضح رہے کہ حضرت علیؑ کے مرتّب کردہ قرآن کے متعلق ان کا عقیدہ ہے کہ وہ ان کے ائمہ کے پاس ہے اور اسے قائم القیامۃ ہی کھولیں گے)۔ تقیہ ان کے ہاں بنیادی عقیدہ ہے ـــــ نیز تاویل، جس سے مراد یہ ہے کہ قرآنِ مجید کا صحیح مفہوم اس کے ظاہری الفاظ میں نہیں ہوتا۔ ان الفاظ کے باطنی معانی ہوتے ہیں جن کا علم ائمہ ہی کو ہوتا ہے۔ قرآن کا حقیقی مفہوم انہی باطنی معانی (یا تاویل) کی رُو سے متعیّن ہوسکتا ہے۔ اسی بنا پر، نبی کو رسولِ ناطق (یعنی ظواہر پر حکم کرنے والا) اور وصی کو رسولِ صامت (یعنی باطن پر حکم کرنے والا) کہا جاتا ہے۔ تاویل کی تین مثال لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ کے باطنی معانی ہیں۔ یعنی " لا امام الا امام الزمان" (صہ ۴۰۸) یا (مثلاً) وضوء سے مراد حضرت علیؑ ہیں کیونکہ وضوء اور علی ہر ایک میں تین تین حرف ہیں اور صلوٰۃ (نماز) سے مراد آنحضرتؐ ہیں کیونکہ صلوٰۃ اور محمد ہر ایک میں چار حرف ہیں۔ لہٰذا، لا صلوٰۃ الا بوضوء کے معنی ہیں مولانا علی کی وصایت (وصی ہونے) کے اقرار کے بغیر آنحضرتؐ کی نبوت کا اقرار بے معنی ہے۔ (صہ ۴۲۴) یا (مثلاً) قرآنِ کریم میں جو آیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آدم کو شجرِ ممنوعہ کے استعمال سے منع کیا تھا تو اس سے مراد یہ ہے کہ" امامِ مستقر مولانا ابوطالب نے آنحضرتؐ کو منع فرمایا علم (تم (علم) تاویل کسی کو نہ بتانا۔ یہ صرف مولانا علیؑ کا حق ہے۔ ظالمِ اوّل (ابلیس) نے دھوکے سے کچھ علم) باطن آنحضرتؐ سے سیکھ لیا۔ یہ آپؐ کا پہلا گناہ ہے۔ آپ کا پچھلا گناہ یہ ہے کہ آپ

باطنی معانی

نے اپنی ایک بیوی سے یہ راز کہہ دیا کہ تمہارے باپ میرے وصی کا حق ظلم سے چھین لیں گے[1]" (صہ ۴۶۱) یا (مثلاً) " الٓمّٓ۔ ذٰلِكَ الْكِتٰبُ لَا رَيْبَ فِيْهِ، میں ذٰلِكَ الْكِتٰبُ سے اشارہ مولانا علیؑ کی طرف ہے۔" (صہ ۵۵۱)۔ غرضیکہ اُن کے ہاں، قرآنِ کریم کی تمام آیات کا مفہوم اسی طرح (تاویل کی رُو سے) متعین کیا جاتا ہے اور یہ تاویلات بھی بدلتی رہتی ہیں۔

اسماعیلی (اور دیگر شیعہ فرقوں) کی ساری تعلیم کا نقطۂ ماسکہ اور مرکز، **امامت** کا عقیدہ ہے۔ اس عقیدہ کی ابتداء یوں ہوتی ہے۔

امامت آنحضرتؐ کے دادا، مولانا عبدالمطلب حضرت ابراہیمؑ کی ذریت سے ہیں۔ آپ بھی حضرت ابراہیمؑ کی طرح حضرت عیسٰیؑ کے دور میں مستقر امام تھے۔ یعنی آپ میں نبوت، رسالت، وصایت اور امامت، چاروں مراتب جمع تھے۔ آپ نے اپنے دو فرزندان، مولانا عبداللہ اور مولانا ابو طالب کو خدا کے امر و وحی سے الگ الگ رتبے دیئے۔ پہلے کو نبوت و رسالت کے رتبے دے کر ظاہری دعوت کا صدر بنایا اور دوسرے کو وصایت و امامت کا درجہ دے کر باطنی دعوت کا رئیس مقرر کیا۔ مولانا ابو طالب نے نبوت و رسالت کا رتبہ آنحضرتؐ کو اور وصایت و امامت کا درجہ مولانا علیؑ کو دیا۔ مولانا ابو طالب کی شانِ عظمت و جلالت اس سے ظاہر ہے کہ آپ میں بھی مولانا عبدالمطلب کی طرح چاروں مراتب جمع ہو گئے تھے......... آپ کے بعد ہی چاروں مراتب مولانا علیؑ کی ذات میں جمع ہیں۔ (صہ ۶۲۔ ۶۳)۔ چنانچہ مستقر امام، مولانا علیؑ ہی ہیں جن پر دلالت کرنے کے لئے آنحضرتؐ بھیجے گئے تھے...... آپ نے جو آخری رسالت بہم پہنچائی وہ مولانا علیؑ کی ولایت ہے۔ گویا آپؐ کے مبعوث ہونے کا اصل مقصد یہ ہے کہ آپ باطنی شرک کو مٹائیں (اور باطنی شرک یہ ہے کہ) دنیا میں کوئی مشرک نہیں۔ سب خدا کو واحد مانتے ہیں۔ اگر لوگ شرک کرتے ہیں تو مولانا علیؑ کی ولایت میں شرک کرتے ہیں۔ (صہ ۳۶۰)

امام کے متعلق ان کا عقیدہ ہے کہ:-

اگر تو اپنی آنکھوں سے امام کو زنا کرتے، شراب پیتے اور فواحش کا مرتکب ہوتا دیکھے تو اسے

---

[1] معاذاللہ، ثم معاذاللہ۔

اپنے دل و زبان سے منکر نہ سمجھ اور اس کے درست اور حق ہونے میں کچھ شک نہ کر، کیونکہ اللہ تعالےٰ نے ائمہ کو اس سے بچالیا ہے۔ (۳۶۳)

بلکہ یہاں تک کہ :-

ہمارے ائمہ معصومین کی شان انبیائے مرسلین کی شان سے بدرجہا بلند ہے۔ دونوں میں مالک اور مملوک کا فرق ہے۔ ائمہ سے کوئی گناہ سرزد نہیں ہو سکتا بخلاف انبیائے مرسلین کے جن سے گناہ سرزد ہوتے ہیں۔ ان انبیاء مرسلین میں موسےؑ تو ایک طرف آنحضرتؐ تک شامل ہیں[1] (۳۶۶)

آغاخانی اور بوہرے

ہندوستان میں، اسماعیلی، خوجوں (آغاخانیوں) اور بوہروں پر مشتمل ہیں۔ ان کے عقاید اور بھی عجیب و غریب ہیں جنہیں ہم، میرزا محمد سعید دہلوی (مرحوم) کی کتاب " مذہب اور باطنی تعلیم " کے حوالے سے درج کرتے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں کہ ان کا عقیدہ یہ ہے کہ

ادوارِ سابقہ میں جب حضرت علیؓ وشنو تھے تو حضرت محمدؐ نے ویدویاس کا قالب اختیار کیا۔ جب حضرت علیؓ اپنی معروف عام حیثیت میں نمودار ہوئے تو وہ وشنو کا دسواں اوتار (نشی کلنکی) تھے ...... بعض خوجے یہ عقیدہ بھی رکھتے ہیں کہ حضرت علیؓ نعوذ باللہ خدا، اور سیدنا محمدؐ ان کے پیغمبر تھے۔ موجودہ آغاخان تک تمام نزاری[2] ائمہ، حضرت علیؓ کا اوتار تصور کئے جاتے ہیں اور اس طرح انہیں بھی وہی مرتبۂ الوہیت حاصل ہے جو حضرت علیؓ کو حاصل تھا۔ خوجے اور شمسی ہندو انہیں اپنا معبود تصور کرتے ہیں ...... یہ لوگ آواگون یا تناسخ کے بھی قائل ہیں اور قیامت، جنّت، دوزخ کے بھی ــــ قرآنِ مجید کو یہ سب سے آخری اور مستند وید خیال کرتے ہیں لیکن جو قرآن اس وقت ملّتِ اسلامی کے درمیان ہے اس کو وہ مستند نہیں مانتے .... نزاریہ فرقہ کا عموماً مسلک یہ رہا ہے کہ وہ جس ملک میں سکونت پذیر ہوتے ہیں، اس ملک کی شریعت اختیار کر لیتے ہیں۔ مثلاً ترکستان میں وہ حنفی فقہ کے مقلد ہیں اور ایران میں اثنا عشری فقہ کے پابند۔ (صہ ۳۲۲، ۳۲۹)

---

[1] معاذ اللہ۔

[2] اسماعیلیوں کا سب سے زیادہ مشہور فرقہ نزاری ہے جس کا ایک امام حسن بن صباح تھا باطنی فدائی اس کے معتقدین کہلاتے تھے۔ آغاخانیوں اور بوہروں کا تعلق اسی فرقہ سے ہے۔

یہ ہیں مختصراً شیعوں کے ایک اہم فرقہ 'اسماعیلی کے عقائد.

اس کے بعد آپ 'ان کے دوسرے فرقہ امامیہ (اثنا عشری) کی طرف آئیے. جیسا کہ کہا جاچکا ہے' شیعہ

امامیہ یا اثنا عشری

حضرات کا بنیادی عقیدہ امامت ہے. امامت کے متعلق اس فرقہ کے عقاید کیا ہیں' اسے ہم اس کتاب سے (براہِ راست) پیش کرتے ہیں جو اس فرقہ کے نزدیک مذہب کے ستون کی حیثیت رکھتی ہے. یعنی کلینی کی کتاب الکافی. یہ ان حضرات کے نزدیک حدیث کی سب سے زیادہ معتبر اور مستند کتاب ہے اور اس کی ہر حدیث، کسی نہ کسی امام سے مروی ہے. کتاب کا پورا نام ہے' الاصول الکافی' اور تالیف ہے' ثقۃ الاسلام محمد بن یعقوب بن اسحٰق الکلینی الرازی (متوفی ۳۲۹ھ) کی. ہمارے سامنے اس کتاب کا عربی نسخہ وہ ہے جو مطبع الحیدری' طہران میں چھپا تھا اور جسے دارالکتب اسلامیہ' طہران نے شائع کیا تھا. اُردو ترجمہ " حضرت ادیب اعظم' مولانا سیّد ظفر حسن صاحب امروہوی"

اصول الکافی

کا ہے جسے شمیم بک ڈپو' ناظم آباد کراچی نے کتاب الشافی کے نام سے (۱۹۶۶ء میں) شائع کیا ہے[1]. اس میں امامت کے خصائص ولزوم کے متعلق جو کچھ کہا گیا ہے اسے مختصراً درجِ ذیل کیا جاتا ہے.

پہلے لکھا جاچکا ہے کہ خدا سے براہِ راست علم ملنے کا نام وحی ہے اور وحی کا سلسلہ نبی اکرمؐ کی ذاتِ گرامی پر ختم ہوگیا. آپؐ کی طرف نازل شدہ وحی، قرآن کے اندر درج ہے جس کی حفاظت کا ذمہ خدا نے لے رکھا ہے. ختمِ نبوّت کے معنی یہ ہیں کہ دین میں سند اور حجّت قرآنِ مجید ہے اور اب کسی شخص کو اس کا حق حاصل نہیں کہ وہ کسی سے کوئی بات (جو قرآن سے باہر ہو) یہ کہہ کر منوائے کہ وہ خدا کا حکم ہے. خدا سے براہِ راست علم حاصل ہونا خاصۂ نبوّت تھا لیکن ہم اصول الکافی میں دیکھتے ہیں کہ اس میں امامت کو بھی شریک کرلیا گیا ہے، اگرچہ اس کے لئے اصطلاح نبی کی نہیں اختیار کی گئی' ایک اور اختیار کی گئی ہے. وہ اصطلاح

مُحدَّث کا عقیدہ

ہے مُحَدَّث کی. (د کے زبر کے ساتھ). الکافی میں ہے.

زرارہ سے مروی ہے کہ میں نے امام محمد باقر علیہ السّلام سے آیہ " کَانَ رَسُوْلاً نَّبِیًّا " کے متعلق سوال کیا اور پوچھا کہ نبی اور رسول میں کیا فرق ہے. فرمایا. نبی وہ ہے

---

[1] اصولِ کافی کا دوسرا حصّہ " فروعِ کافی" ہے. اس کا اُردو ترجمہ بھی مولانا ظفر حسن صاحب کے قلم سے شمیم بکڈپو نے شائع کیا ہے.

جو فرشتہ کو خواب میں دیکھتا ہے۔ اس کی آواز سنتا ہے لیکن ظاہر بظاہر حالتِ بیداری میں نہیں دیکھتا اور رسول وہ ہے جو آواز بھی سنتا ہے، خواب میں بھی دیکھتا ہے اور ظاہر میں بھی۔ میں نے پوچھا۔ امام کی منزلت کیا ہے۔ فرمایا۔ وہ فرشتہ کی آواز سنتا ہے مگر دیکھتا نہیں۔ پھر یہ آیت پڑھی۔ وَمَا اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ مِنْ رَّسُوْلٍ وَّ لَا نَبِيٍّ وَلَا مُحَدَّثٍ۔ (الشافی، جلد اوّل صہ ۲۰۳)

آگے بڑھنے سے پہلے یہ دیکھتے جائیے کہ اس روایت میں جو آیت لکھی گئی ہے (وَمَا اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ)۔(۲۲/۵۲) قرآنِ کریم میں، اس آیت میں "وَلَا مُحَدَّثٍ" کے الفاظ نہیں ہیں۔ اصولِ کافی (عربی) میں اس روایت کے نیچے حاشیہ میں لکھا ہے۔ "ولا محدث" انما ھو قراۃ اھل البیت علیھم السلام۔ (جلد اوّل صہ ۱۷۶) "اہلِ بیت کی قرأت قرآن میں اس آیت میں "وَلَا مُحَدَّثٍ" کے الفاظ آئے ہیں"۔ یہ بات آپ کے لئے وجۂ تعجب نہیں ہونی چاہیئے کیونکہ (جیسا کہ ہم آگے چل کر تفصیل سے بیان کریں گے)، بیشمار آیات ایسی ہیں جن کے متعلق (الکافی میں) کہا گیا ہے کہ جبرئیل امین تو انھیں اس طرح لے کر نازل ہوئے تھے لیکن مروجہ قرآن میں، یہ الفاظ نہیں ہیں۔ اس وقت ہم مُحدَّث کے نظریہ سے بحث پر اکتفا کرتے ہیں۔ یعنی مُحدَّث وہ ہے جس کی طرف فرشتے پیغامِ خداوندی لے کر نازل ہوتے ہیں۔ وہ ان کا کلام سنتا ہے لیکن انھیں دیکھ نہیں سکتا۔ اس سے اگلی روایت میں ہے۔

"مُحَدَّث وہ ہے جو ملائکہ سے ہمکلام ہوتا ہے، ان کا کلام سنتا ہے لیکن انھیں دیکھتا نہیں اور نہ خواب نظر آتا ہے"۔ (الشافی، جلد اوّل صہ ۲۰۴)

ازاں بعد، ایک روایت میں ہے کہ حضرت علیؓ نے فرمایا کہ "میں اور میرے صلب سے گیارہ امام محدَّث ہیں"۔ (الشافی، جلد اوّل، صہ ۲۸۱)

آپ نے غور فرمایا کہ جہاں تک خدا سے براہِ راست (بذریعہ ملائکہ) علم حاصل کرنے کا تعلق ہے، رسول اور محدَّث میں کوئی فرق نہیں۔ اس کی تصریح الکافی کی دیگر روایات میں بھی موجود ہے۔

اس میں اور نبوت میں عملاً کوئی فرق نہیں

(مثلاً) قرآنِ کریم میں نبیِ اکرمؐ کے متعلق خدا نے فرمایا کہ وَمَآ اٰتٰكُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْهُ وَمَا نَهٰكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوْا (۵۹/۷) "جو کچھ رسول تمھیں دے وہ لے لو، جس سے وہ روکے، اس سے رک جاؤ"۔[1]

---

[1] اس آیت کی تشریح کا یہ موقعہ نہیں۔

کافی کی ایک روایت میں ہے کہ امام جعفر صادق نے فرمایا مَا جَاءَ بِہٖ عَلِیٌّ عَلَیْہِ السَّلَامُ اٰخُذُ بِہٖ وَمَا نَھٰی عَنْہُ اَنْتَھِیْ ــــ "جو کچھ (حضرت) علیؑ نے فرمایا اس کو لو اور جس سے منع کیا ہے اس سے باز رہو۔" (شافی جلد اوّل صہ ۲۲۵) یہ اس لئے کہ جَرٰی لَہٗ مِنَ الْفَضْلِ مِثْلَ مَا جَرٰی لِمُحَمَّدٍ۔ (شافی جلد اوّل صہ ۲۲۵)، عربی الکافی جلد اوّل صہ ۱۹۷) یعنی، فضلِ خداوندی میں سے (حضرت) علیؑ کے لئے بھی وہی کچھ جاری ہوا تھا، جو رسولؐ اللہ کے لئے جاری ہوا تھا، یعنی دونوں کا سرچشمۂ علم ایک ہی تھا۔ اس کے بعد ہے،

> امیر المومنینؑ اکثر فرمایا کرتے تھے۔ میں اللہ کی طرف سے جنّت اور دوزخ کا تقسیم کرنے والا ہوں۔ میں فاروقِ اکبر ہوں۔ میں صاحبِ اعصا یعنی اجتماعِ مسلین کا سبب ہوں۔ میں صاحبِ میسّم یعنی وہ آیات ہوں جو دلیلِ امامت ہوں۔ میری وصایت (وصی ہونے) کا اقرار کیا ہے تمام ملائکہ، روح اور مرسلین نے جس طرح اقرار کیا ہے محمد صلعم کے متعلق اور سوار کیا گیا ہوں منصبِ امامت پر۔ جیسے آں حضرتؐ (نبوت پر) .... اور یہ منصب ہمارا خدا کی طرف سے ہے۔
>
> (شافی، جلد اوّل، صہ ۲۲۵)

ایک اور روایت میں ہے،

> امام اپنے زمانہ میں واحد و یگانہ ہوتا ہے۔ کوئی، فضل و کمال میں اس کے نزدیک بھی نہیں ہوتا اور نہ کوئی عالم اس کے مقابلہ کا ہوتا ہے۔ نہ اس کا بدل پایا جاتا ہے نہ اس کا مثل و نظیر۔ وہ بغیر اکتساب اور خدا سے طلب کے ساتھ ہر قسم کی فضیلت سے مخصوص ہوتا ہے۔ یہ اختصاص اس کے لئے خدا کی طرف سے ہوتا ہے۔ (شافی، جلد اوّل صہ ۲۳۱)

اس کے بعد، امام کے متعلق کہا گیا ہے کہ وہ آلِ رسول میں سے، "نسلِ سیدہ طاہرہ معصومہ سے ہوتا ہے" (ایضاً صہ ۲۳۳) "انبیاء اور ائمہ علیہم السلام موفق من اللہ ہوتے ہیں اور علم و حکمتِ الٰہیہ کے خزانہ سے وہ چیز ان کو دی جاتی ہے جو ان کے غیر کو نہیں دی جاتی۔" (ایضاً صہ ۲۲۴)۔ ایک روایت میں بات اور بھی واضح ہو گئی ہے۔ فرمایا امام جعفر صادقؓ نے کہ،

> اس (امام) کا علم اس وسیلہ سے .... جو آسمان تک کھنچا ہوا ہے تاکہ وحیِ الٰہی کا سلسلہ قطع نہ ہو اور جو احکام من اللہ ہیں وہ نہیں حاصل ہوتے مگر بوسیلۂ امام اور خدا اپنے بندوں کے اعمال

کو قبول نہیں کرتا جب تک معرفتِ امام نہ ہو۔ ...... امام خدا کا منتخب اور پسندیدہ ہوتا ہے، برگزیدہ اور مقبولِ خدا و رسول ہے اور ایسا ہادی ہے جو محلِ اسرارِ الٰہیہ ہے...... (خدا نے اخلق کے پیدا کرنے سے پہلے ان (ائمہ) کو پیدا کیا۔ (ایضاً صہ ۳۶ - ۲۳۵)

آپ نے غور فرمایا کہ نبی اور محدّث میں لفظی تغیّر کے سوا کوئی فرق نہیں۔ یہ عقیدہ کہ ختمِ نبوّت کے بعد بھی خدا انسانوں سے ہمکلام ہوتا ہے، (یعنی خدا سے براہِ راست علم حاصل ہو سکتا ہے) ازاں بعد کس کس شکل میں نمودار ہوتا رہا، اس نے کس طرح نبوّت کے بند کئے ہوئے دروازہ کو چوپٹ کھول دیا اور اس دروازے سے کون کون، کس کس انداز سے، داخل ہوئے اور ہوتے جا رہے ہیں، اس کی تفصیل آگے چل کر ملے گی۔ سرِدست آپ امام کی مزید خصوصیات ملاحظہ فرمایئے۔

امام جعفر صادق علیہ السلام نے فرمایا۔ ہم وہ ...... ہیں جن پر اللہ نے اپنی اطاعت فرض کی ہے[1]۔ لوگوں کو بدوں ہماری معرفت کے چارہ نہیں اور ہم سے جاہل رہنا قابلِ قبول نہیں ہوگا۔ جس نے ہم کو پہچانا وہ مومن ہے اور جس نے انکار کیا وہ[2] کافر ہے اور جس نے ہم کو نہ پہچانا لیکن انکار نہ کیا وہ گمراہ ہے؛ جب تک اس ہدایت کی طرف نہ لوٹے جس کو اللہ نے ہماری اطاعتِ واجبہ کی صورت میں فرض کیا ہے.... فرمایا امام محمد باقر علیہ السلام نے۔ ہماری محبّت ایمان ہے اور ہمارا بغض کفر...... یہی اللہ اور اس کے ملائکہ کا دین ہے۔ (شافی، جلد اوّل، صہ ۱۶ - ۲۱۵)

ایک اور روایت میں ہے کہ امام محمد باقر علیہ السلام نے 'امیر المومنین (یعنی حضرت علیؓ) کے متعلق فرمایا کہ:

رسول اللہ کے بعد، مثلِ رسول .... ان کی اطاعت کا بھی حکم ہے اور ان پر تقدّم کرنے والا ایسا ہے جیسے خدا اور رسول پر سبقت کی........ اور ان پر فضیلت چاہنے والا ایسا ہے جیسے رسول ...... پر فضیلت چاہی اور چھوٹے یا بڑے حکم کو ان کے نہ ماننا شرک باللہ ہے۔ رسول اللہ وہ باب اللہ تھے جس میں داخل ہونا ناگزیر تھا۔ وہ ایک راستہ تھے، جو اس پر چلا وہ اللہ سے مل گیا اور

---

[1] الشافی کا یہ ترجمہ صحیح نہیں۔ الکافی کے الفاظ ہیں نحن الذین فرض الله طاعتنا۔ اس کا صحیح ترجمہ یہ ہے۔ "ہم وہ لوگ ہیں جن کی اطاعت اللہ نے فرض قرار دی ہے"۔

[2] ہم نے پہلے لکھا ہے کہ معرفتِ امام کفر و امتیاز کا خطِ امتیاز قرار پا گئی۔ اس سے اس کی وضاحت ہو جاتی ہے۔

ایسے ہی امیر المومنین تھے۔ ان کے بعد اور یکے بعد دیگرے تمام ائمہ کے لئے یہی صورت رہی۔

(شافی، جلد اول صہ ۲۴۷)

مسلمانوں میں قرآنِ کریم ہی دین میں سند و حجت تھی (اور ہے)۔ اس کے متعلق امام محمد باقر نے فرمایا کہ:۔

کسی کی یہ طاقت نہیں کہ یہ دعویٰ کرے کہ اس کے پاس ظاہر و باطن قرآن کا پورا پورا علم ہے سوائے اوصیائے علیہ السلام کے۔ (شافی، جلد اول صہ ۲۶۱)

یہاں ظاہر کے ساتھ باطن کا لفظ بھی آیا ہے۔ اس کی تشریح آگے چل کر کی جائے گی۔ ائمہ کے علم کے متعلق عقیدہ ہے کہ ان کا علم رسول اللہ سے بھی زیادہ ہے۔ یعنی علم کی ابتداء رسول اللہ سے ہوئی تھی، انتہا ائمہ پر۔ الکافی میں ہے:۔

راوی کہتا ہے، میں نے ابو جعفر علیہ السلام کو کہتے سنا، اگر ہمارا علم زیادہ نہ ہوتا رہتا تو البتہ ہم اسے ختم کر دیتے۔ میں نے کہا، کیا ایسا علم بھی آپ کو حاصل ہوتا ہے جو رسول اللہ کو نہ ہو۔ فرمایا صورت یہ ہے، پہلے رسولؐ پر پیش ہوتا ہے، پھر ائمہؑ پر اور پھر منتہی ہوتا ہے ہماری طرف۔ (شافی، جلد اول صہ ۲۹۱)

وحی کے متعلق قرآنِ کریم میں ہے کہ چونکہ یہ علم اکتسابی نہیں ہوتا اس لئے اس کی صورت یہ نہیں تھی کہ رسول جب چاہتا اس پر وحی آجاتی۔ وحی کا نزول خدا کی مشیت پر موقوف ہوتا تھا۔ وہ جب چاہتا اور جو چاہتا رسول کو بذریعہ وحی بتا دیتا۔ اس کے برعکس ائمہ کے متعلق ہے:

فرمایا امام جعفر صادق علیہ السلام نے۔ امام جب چاہتا ہے کہ جانے تو اس کو علم دے دیا جاتا ہے۔

(شافی، جلد اول صہ ۲۹۵)

غیب کے متعلق قرآنِ کریم میں ہے کہ اس کا علم صرف خدا کو ہوتا ہے کسی انسان کو نہیں ہوتا۔ البتہ خدا جس بات کا علم چاہے حضرات انبیاء کرامؑ کو بذریعہ وحی دے دیتا تھا۔ ائمہ کی علمِ غیب کے متعلق یہ کیفیت تھی کہ

فرمایا امام جعفر صادق علیہ السلام نے کہ جو امام یہ نہیں جانتا کہ اسے کیا مصیبت پہنچے گی اور انجام کار کیا ہوگا، تو وہ مخلوقِ خدا کی راہ نمائی نہیں کر سکتا اور خدا کی حجت نہیں ہو سکتا۔ (شافی صہ ۲۹۵)

عیسائیت کا مرکزی عقیدہ یہ ہے کہ حضرت عیسٰیؑ نے اپنی جان دے کر، گناہگاروں کو بخشوا لیا، یعنی ان کا خون گنہگاروں کے گناہوں کا کفارہ بن گیا۔ الکافی کی ایک روایت میں ہے کہ

امام موسیٰ کاظم علیہ السلام نے فرمایا، اللہ تعالیٰ غضب ناک ہوا ہمارے شیعوں پر (بہ سبب ترکِ تقیہ) پس

اختیار دیا مجھے اپنے اور ان کے قتل ہونے کے درمیان۔ پس میں نے اپنی جان دے کر ان کو بچا لیا۔

(شافی، جلد اوّل، صہ ۲۹۷)

ایک اور روایت میں ہے:۔

امام جعفر صادق علیہ السلام نے فرمایا۔ خدا نہیں حیا کرتا عذاب دینے سے اس گروہ کے جو عبادت کرتے تحت ولایت و محبتِ امام جابر۔ چاہے اس کے اعمال کتنے ہی نیک ہوں اور حیا کرتا ہے عذاب دینے میں اس گروہ کو جو عبادت کرے امام منصوص من اللہ کی محبت کے ساتھ چاہے اس کے اعمال کیسے ہی خراب ہوں۔

(شافی، جلد اوّل صہ ۴۶۲)

نجات و سعادت کا یہی مدار ہے، کفر و ایمان کا یہی معیار ہے۔

ابو حمزہ سے مروی ہے کہ میں نے امام محمد باقر علیہ السلام سے سنا۔ علی وہ دروازہ ہیں جس کو اللہ نے کھولا ہے۔ جو اس میں داخل ہوا وہ مومن ہے اور جو اس سے خارج ہوا وہ کافر ہے اور جو نہ داخل ہوا نہ خارج ہوا وہ اس طبقہ میں ہے جس کے متعلق خدا نے کہا ہے کہ اس کے لئے میری مشیت ہے۔ (چاہے بخشوں چاہے نہ بخشوں)

(شافی، جلد اوّل، صہ ۵۴۱)

ان ائمہ کی معرفت اُمتِ محمدیہ ہی پر لازم نہیں تھی، انبیاء سابقہ کی وساطت سے بھی ان کی پہچان کرا دی گئی تھی۔ چنانچہ ایک روایت میں ہے کہ

فرمایا امام رضا علیہ السلام نے کہ تمام صحفِ انبیاء میں ولایت علیؑ کا ذکر تھا۔ خدا نے کوئی رسول ایسا نہیں بھیجا جو نبوّتِ محمدؐ اور وصایتِ علیؑ کا مُقر نہ ہو۔ (شافی، جلد اوّل، صہ ۵۴۱ - ۵۴۰)

حضرت علیؓ کی فضیلت کا ذکر آ گیا تو مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس سلسلہ میں، موجودہ شیعہ حضرات کے عقاید کی بھی دو ایک مثالیں پیشِ خدمت کر دی جائیں۔ لاہور سے (شیعہ حضرات کا) ایک ماہ نامہ شائع ہوتا ہے۔

حضرت علیؓ کا مقام

——— معارفِ اسلام ——— وہ ہر سال، بالعموم ستمبر۔ اکتوبر میں، اپنا ایک خاص نمبر شائع کرتے ہیں جس کا عنوان ہوتا ہے۔ علیؓ و فاطمہؓ نمبر۔ اس رسالہ کی اشاعت بابت ستمبر۔ اکتوبر ۱۹۷۲ء میں علامہ مجلسیؒ کے حوالہ سے حضرت علیؑ کا ایک فرمان نقل کیا گیا ہے، جس میں آپ نے فرمایا:۔

میں خدا کے اسمائے حسنیٰ، امثالِ علیا اور آیاتِ کبریٰ ہوں اور میں ہی جنت اور دوزخ کا مالک ہوں۔

میں اہلِ جنت کو جنّت میں داخل کروں گا اور اہلِ نار کو جہنّم میں ڈالوں گا اور میں ہی اہلِ جنّت کی تزویج کروں گا اور میرے ہی ذمّہ اہلِ جہنّم کا عذاب کرنا ہے اور میری ہی طرف ساری مخلوق کی بازگشت ہوگی اور میں ہی مرکز ہوں، میری ہی طرف ہر ایک شئے بعد قضاءِ الٰہی رجوع کرتی ہے اور میرے ہی ذمّہ ساری مخلوقِ خدا کا حساب ہے۔ مجھ سے اللہ تعالیٰ نے ان کی خلقت کے وقت احتجاج و اتمامِ حجّت کیا اور میں ہی روزِ قیامت ان کا شاہد ہوں اور میں ہی وہ ہوں جس کے پاس کل مخلوق کی موت اور مصائب اور فیصلہ جات کا علم ہے اور جُملہ آیات و معجزات وکتبِ انبیاً علیہم السلام میرے سپرد کی گئی ہیں اور ان کا محافظ ہوں اور میں لاٹھی والا اور نشان والا ہوں اور میں ہی ہوں جس کے لئے بادل، گرج، بجلی، تاریکیاں، روشنیاں، ہوائیں، پہاڑ، سمندر، ستارے، سورج اور چاند مسخّر کردیئے گئے ہیں اور میں ہی وہ ہوں جس نے اس علم کے ذریعہ جو اللہ نے مجھ کو دیا ہے گن کر احصار کیا ہوا ہے اور میں رازِ قدرت کے ذریعہ جو اللہ نے محمّد کو عطا فرمایا اور محمّد نے مجھے پہنچایا ہے اور میں ہی ہوں جس کو خدا نے اپنا نام، اپنا کلمہ، اپنی حکمت، اپنی فہم عطا فرمایا ہے۔ اے معاشر الناس۔ پوچھ مجھ سے قبل اس کے کہ مجھ کو نہ پاؤ۔ خداوندا! میں تجھ کو اپنا گواہ بناتا ہوں اور تجھ ہی سے مدد چاہتا ہوں۔ لَا حَوْلَ وَلَا قُوَّۃَ اِلَّا بِاللّٰہِ العلی العظیم۔ (صہ ۶۱-۶۰)

اسی رسالہ کی ستمبر ۱۹۷۱ء کی اشاعت میں تحریر ہے۔

اگر جناب مولا علیؑ نہ ہوتے تو جناب رسولِ خدا پیدا نہ ہو سکتے اور جناب رسولِ خدا پیدا نہ ہوتے تو لو لاک لما خلقت الافلاک، زمین و آسمان پیدا نہ ہوتے۔ لہذا، علیؑ نہ ہوتے تو کچھ بھی نہ ہوتا۔ (صہ ۸)

اسی رسالہ کی نومبر ۱۹۶۷ء کی اشاعت میں ہے:۔

قربان جائیں اس مظہر العجائب والغرائب اسد اللہ الغالبؑ کے کہ جب اس نے توراتِ موسیٰؑ میں ظہور فرمایا تو خدا کا منہ اور خدا کا کلام بن گیا۔ جب وہ زبور میں جلوہ افروز ہوا تو تحمید و تمجید کا لباس اوڑھ کر لحنِ داؤدؑ بن گیا۔ جب اس کی تجلیات غزل الغزلات میں ظاہر ہوئیں تو تقدیس و عبودیت کی دعاؤں میں سلیمانؑ کا لہجہ بن گیا۔ جب وہ انجیلِ عیسٰیؑ میں نوُر بار ہوا تو مددگار اور طفلِ معصوم

بن گیا۔ جب وہ صحیفۂ یوحنا میں ضیا پاش ہوا تو اسپِ سفید پر سوار ہو کر شیر کی آواز میں آیاتِ حمد پڑھنے لگا۔ جب وہ قرآنِ حمید میں روشن ہوا تو جگہ جگہ اس کا ذکر، جگہ جگہ اس کی فضیلت، جگہ جگہ اس کی مدحت، جگہ جگہ اس کی شجاعت، جگہ جگہ اس کی کرامت۔ کبھی وہ یدُ اللہ کی صورت میں خدا کا ہاتھ، کبھی وہ لِسَانَ صِدْقًا نَبِیًّا کی صورت میں رسولوں کی سچی زبان۔ (صہ ۹۱)

اسی تسلسل میں آگے لکھا ہے:۔

ذرا اور آگے چلئے .... یہ بے مثال و بے نظیر امامِ اوّل زرتشت کے ژند و پاژند میں پہنچا تو شعلۂ جوّالہ کی صورت میں، جین مت میں گیا تو شانتی اور اہنسا کی صورت میں، ویدوں میں اس نے رُوپ دھارا تو اُوم کی صورت میں۔ شاستروں میں سرُوپ دکھایا تو پرم آتما کی صورت میں۔ گیانوں میں قدم رکھا تو مہابلی کی صورت میں۔ گیتا میں جلوہ ریز ہوا تو نارائن کی صورت میں۔ رامائن میں ضو فشاں ہوا تو مہاتم کی صورت میں اور دیوتاؤں کو نظر آیا تو سنگھ کی صورت میں۔ سنگھ! شیر، اسد، لائن ــــ اسی شیر کی، اسی سنگھ کی، ہزارہا سال سے مندروں، شوِوالوں میں پرستش کی جا رہی ہے۔ کرشن جی کو جب چودہ معصوموں کے چودہ صفاتی روپ نظر آتے تھے، ایک روپ میں سنگھ یعنی شیر بھی دکھائی دیتا تھا۔ (صہ ۹۲-۹۱)

یہ ہیں دو چار مثالیں ان عقائد کی جو حضرت علیؓ کی فضیلت کے سلسلہ میں شیعہ حضرات میں رائج ہیں اور اس کا تو غالباً آپ کو علم ہی ہو گا کہ ان حضرات کا کلمہ اس طرح مکمل ہوتا ہے۔ لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ۔ علیٌ ولی اللہ۔ (معارفِ اسلام، نومبر ۱۹۶۷ء، صہ ۱۴۱)

آپ نے دیکھا کہ محدّث کے عقیدہ سے شروع ہو کر بات کہاں سے کہاں پہنچ گئی۔ ظاہر ہے کہ جب نجات و سعادت ائمہ منصوص کی اطاعت، بلکہ معرفت کے ساتھ مشروط ہو گئی تو پھر نہ (براہِ راست) قرآنِ کریم کی کوئی حیثیت باقی رہی نہ ختمِ نبوّت کی کوئی اہمیت۔ لیکن بات یہیں پر ختم نہیں ہو جاتی۔ اس کے

موجودہ قرآن محرف ہے

ساتھ ہی ایسے عقائد بھی عام کئے گئے ہیں جن سے قرآن کی محفوظیت اور ابدیت ہی باقی نہ رہی۔ چنانچہ الکافی کے باب (کتاب الحجت)

میں متعدد آیات کے متعلق یہ کہا گیا ہے کہ "یہ آیت دراصل اس طرح نازل ہوئی تھی لیکن مروجہ قرآن میں اس طرح ہے۔" ہم یہاں اس کی دو چار مثالیں پیش کرتے ہیں:۔

عن ابی عبد اللہ علیہ السلام فی قولہ تعالیٰ لقد عہدنا الیٰ آدم من قبل کلمات فی محمد و علی و فاطمہ والحسن والحسین و الائمۃ علیہم السلام من ذریتہم فنسی۔ ھکذا واللہ نزلت علیٰ محمد۔

امام جعفر صادق علیہ السلام نے آیہ لقد عہدنا کے متعلق فرمایا کہ وہ کلمات تھے محمدؐ و علیؑ و فاطمہؑ و حسنؑ و حسینؑ اور ان ائمہ کے متعلق جو ان کی ذریت سے ہونے والے تھے۔ آدم ان کو بھول گئے۔ واللہ محمدؐ پر یونہی نزولِ آیت ہوا۔ (شافی، صہ ۵۱۳)

قرآنِ مجید میں یہ آیت اس طرح ہے۔

وَ لَقَدْ عَهِدْنَآ اِلٰٓى اٰدَمَ مِنْ قَبْلُ فَنَسِيَ وَ لَمْ نَجِدْ لَهٗ عَزْمًا۔ (۲۰/۱۱۵)

ایک روایت میں ہے۔

فرمایا امام جعفر صادق علیہ السلام نے، آیت (فستعلمون من ھو فی ضلال مبین ....) "عنقریب تم جان لوگے کہ کھلی ہوئی گمراہی میں کون ہے۔ اے جھوٹوں کے گروہ۔ تم کو میں نے ولایتِ علیؑ کی اپنے بعد آنے کی خبر دے دی تھی۔ اب کھلی گمراہی میں کون ہے۔" کے متعلق (فرمایا کہ یہ آیت اس مضمون کے ساتھ نازل ہوئی تھی۔) (شافی، جلد اوّل، صہ ۵۱۷)

قرآنِ کریم میں صرف اتنا ہے۔

فَسَتَعْلَمُوْنَ مَنْ هُوَ فِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ۔ (۶۷/۲۹)

ایک روایت میں ہے۔

امام جعفر صادق علیہ السلام نے فرمایا کہ یہ آیت یوں نازل ہوئی تھی کہ "جب ایک سائل نے سوال کیا ایسے عذاب کا جو واقعہ ہونے والا تھا (ولایتِ علیؑ کے) منکروں پر اور جس کا کوئی دفع کرنے والا نہ تھا" امام نے فرمایا، واللہ! رسولؐ پر یہ اس طرح (یعنی بولایتِ علیؑ کے ساتھ) نازل ہوئی تھی۔

(شافی، جلد اوّل، صہ ۵۱۸)

قرآن مجید میں یہ آیات اس طرح ہیں۔

سَاَلَ سَآئِلٌۢ بِعَذَابٍ وَّاقِعٍ ۙ لِّلْكٰفِرِيْنَ لَيْسَ لَهٗ دَافِعٌ ۔ (۷۰/۱-۲)

اس سے یہ سوال پیدا ہوا کہ اس قسم کی آیات میں جو الفاظ خدا کی طرف سے نازل ہوئے تھے لیکن اب قرآن میں نہیں ہیں، وہ کس طرح حذف (گم) ہوگئے۔ اس کے متعلق

امام محمد باقر علیہ السلام نے فرمایا کہ جبریل حضرت رسولِ خدا پر یہ آیت اس طرح لے کر نازل ہوئے تھے "جن لوگوں نے (آلِ محمدؐ کا حق غصب کیا) انھوں نے بدل دیا اس بات کو جو ان سے کہی گئی تھی ایک دوسری بات سے۔ پس ہم نے ان لوگوں پر (جنہوں نے آلِ محمدؐ کا) حق لے لیا تھا، آسمان سے اس لئے عذاب نازل کیا کہ وہ بدکار تھے۔ (شافی، صہ ۵۲۰)

قرآن کی آیت یوں ہے:۔

فَبَدَّلَ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا قَوْلًا غَيْرَ الَّذِيْ قِيْلَ لَهُمْ فَاَنْزَلْنَا عَلَى الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا رِجْزًا مِّنَ السَّمَآءِ بِمَا كَانُوْا يَفْسُقُوْنَ ۔ (۲/۵۹)

قرآنِ کریم کی خصوصیتِ کبریٰ، اساسی اہمیت اور انفرادیت اس میں ہے کہ یہ خدا کی آخری، مکمل اور غیر متبدل کتاب ہے اور ایسی محفوظ کہ اس میں ایک حرف کی بھی نہ کمی بیشی ہوئی ہے (نہ ہوسکتی ہے) اور نہ ہی ردّ و بدل کیونکہ اس کی حفاظت کا ذمہ خود خدا نے لیا ہے۔ (اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَ اِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ ۔ (۱۵/۹)۔ اس کا ارشاد ہے) اگر اس کے کسی ایک لفظ کے متعلق بھی یہ شک پیدا ہوجائے کہ یہ اصلی ہے یا نہیں، تو اس پر ایمان کی بنیاد متزلزل ہوجاتی ہے اور اس کی حیثیت انبیاء سابقہ کی طرف نازل شدہ محرّف کتابوں (تورات، انجیل) کی سی رہ جاتی ہے۔ جو مثالیں ہم نے اوپر پیش کی ہیں (اور اس قسم کی متعدد اور آیات بھی الکافی میں درج ہیں) ان کی رُو سے قرآن کی محفوظیت اور ابدیت کا تصور ہی ختم ہوجاتا ہے۔

قرآن کے باطنی معانی

جن آیات کے متعلق کہا کہ ان میں ردّ و بدل نہیں ہوا، ان کے معانی ایسے بیان کئے گئے جن کی سند قرآنِ کریم سے نہیں ملتی۔ ان معانی کی بنیاد

امام محمد باقر علیہ السلام نے فرمایا کہ علی کے بارے میں جو نازل کیا گیا تھا سرکشی سے لوگوں نے اس سے انکار دکفر کیا۔ (شافی، جلد اوّل، صہ ۵۱۳)

دوسری روایت میں ہے کہ قرآنِ کریم میں تبدیلیاں کردی گئی ہیں۔

(ان حضرات کے عقیدہ کے مطابق، ائمہ کا وہ علم ہے جو انہیں خدا سے حاصل ہوتا تھا۔ اسے تاویل کہا جاتا ہے۔ (تاویل اور قرآن کے باطنی معانی کے متعلق تفصیلی ذکر اسماعیلیہ کے عقائد کے ضمن میں آچکا ہے) مثلاً قرآن کریم کی آیت عَمَّ يَتَسَآءَلُوْنَ عَنِ النَّبَاِ الْعَظِيْمِ۔ (۷۸/۱-۲) "تم سے پوچھتے ہیں نبا العظیم کے متعلق" کے معانی کے سلسلہ میں:

> امام جعفر صادق علیہ السلام نے فرمایا۔ نباءِ عظیم سے مراد ولایت ہے۔ (راوی نے سوال کیا۔ کیا ولایت خدا مراد نہیں۔ فرمایا ولایتِ امیر المومنین مراد ہے۔ (شافی، جلد اوّل، صہ ۵۱۴)

اسی طرح آیت وَ اَنْ اَقِمْ وَجْهَكَ لِلدِّيْنِ حَنِيْفًا ج (۱۰/۱۰۵) کے متعلق۔

> امام محمد باقر علیہ السلام نے فرمایا کہ اس سے مراد ولایت ہے۔ (شافی، جلد اوّل، صہ ۵۱۵)

یہاں تک بات موجودہ قرآن میں تحریف اور اس کے معانی میں تاویل کی ہو رہی تھی لیکن بات اس سے بھی آگے جاتی ہے۔ اس کی تفصیل کافی (کتاب الحجۃ) کے انتالیسویں باب کی دو روایات میں دیکھئے جن کا مکمل ترجمہ درجِ ذیل ہے۔

> ابو بصیر سے مروی ہے کہ میں امام جعفر صادق علیہ السلام کی خدمت میں حاضر ہُوا اور عرض کی۔ میں آپ پر فدا ہوں۔ آپ سے ایک مسئلہ پوچھنا چاہتا ہوں۔ یہاں میرا کوئی کلام سُن تو نہیں رہا حضرت نے وہ پردہ اٹھایا جو اس مکان اور دوسرے کمرے کے درمیان تھا۔ میں نے جھانک کر دیکھا۔ حضرت نے فرمایا، اب جو تمہارا دل چاہے پوچھو۔ میں نے کہا، میں آپ پر فدا ہوں۔ آپ کے شیعہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلعم نے علیؑ کو ایک باب علم کا تعلیم دیا جس سے ہزار باب علم کے آپ پر اور منکشف ہو گئے۔ حضرت نے فرمایا، اے ابو محمد (کنیّت ابو بصیر) رسول اللہ صلعم نے علیؑ کو ہزار باب علم کے تعلیم کئے اور ان پر ہر باب سے ہزار باب اور ظاہر ہوئے۔ میں نے کہا واللہ، علم اس کا نام ہے۔

قرآن کے علاوہ وحی کے مجموعے

> پس حضرت کچھ دیر خاموش رہے۔ پھر فرمایا، اے ابو محمد! ہمارے پاس جامع ہے۔ لوگ کیا جانیں جامعہ کیا ہے۔ میں نے کہا حضور بتائیں جامعہ کیا ہے۔ فرمایا، وہ ایک صحیفہ ہے ستر ہاتھ لمبا رسول اللہ کے ہاتھ سے اور رسول اللہ نے اس کو اپنے دہنِ مبارک سے .... بیان فرمایا اور حضرت علیؑ نے اپنے ہاتھ سے اس کو لکھا۔ اس میں تمام حلال و حرام کا ذکر ہے اور ہر اس شے کا جس کی

احتیاج لوگوں کو ہوتی ہے۔ یہاں تک کہ ہلکے سے خراش کی دیت کا بھی ذکر ہے۔ پھر آپ نے اپنا دستِ مبارک میرے اوپر رکھا اور فرمایا، اے ابو محمد! مجھے اجازت ہے۔ میں نے کہا، میں آپ پر فدا ہوں۔ میں آپ کا ہوں جو چاہے کیجئے۔ حضرت نے اپنی دو انگلیوں سے چٹکی لے کر فرمایا۔ اس کی دیت کا بھی ذکر ہے۔ یہ آپ نے ذرا تند لہجہ میں کہا۔ میں نے کہا، واللہ علم یہ ہے۔ حضرت نے فرمایا، صرف اتنا ہی نہیں ہے۔ پھر تھوڑی دیر خاموش رہ کر فرمایا۔ ہمارے پاس جفر بھی ہے۔ لوگ کیا جانیں جفر کیا ہے؟ میں نے پوچھا حضور جفر کیا ہے۔ فرمایا وہ ایک ظرف ہے آدم کے وقت سے جس میں انبیاء اور اوصیاء کے علم کا ذکر ہے اور ان تمام علماء کے علم کا جو بنی اسرائیل میں ہو چکے ہیں۔ میں نے کہا، بس علم تو یہی ہے۔ فرمایا صرف یہی نہیں ہے۔ پھر تھوڑی دیر خاموش رہ کر فرمایا، ہمارے پاس مصحفِ فاطمہؑ بھی ہے۔ لوگ کیا جانیں کہ وہ کیا ہے۔ میں نے کہا وہ کیا ہے۔ فرمایا، تمہارے اس قرآن سے (بلحاظ تفصیل و توضیحِ احکام) وہ مصحف تین گنا زیادہ ہے۔ تمہارے قرآن میں ایک حرف ہے یعنی اجمال ہے۔ میں نے کہا، واللہ علم یہ ہے۔ فرمایا صرف یہی نہیں۔ پھر خاموش رہ کر فرمایا۔ ہمارے پاس علم ماکان و مایکون ہے قیامت تک کے واقعات کا۔ میں نے کہا۔ واللہ علم اس کو کہتے ہیں۔ فرمایا، ہاں اس کے علاوہ بھی ہے۔ میں نے پوچھا وہ کیا ہے۔ فرمایا، جو حادثے رات اور دن میں ہوتے ہیں اور جو ایک امر دوسرے کے بعد اور ایک شے دوسری شے کے بعد دنیا میں ہوتی ہے اور قیامت تک ہوتی رہے گی، ہمیں اس کا بھی علم ہے۔

راوی کہتا ہے میں نے امام جعفر صادق علیہ السلام کو کہتے سُنا کہ ۱۲۸ ہجری میں فلاسفہ (بعہدِ بنی عباس) ظاہر ہوں گے (جو منکرِ اسلام و توحید ہوں گے) میں نے یہ مصحفِ فاطمہؑ میں دیکھا ہے۔ میں نے پوچھا، مصحفِ فاطمہ کیا ہے۔ فرمایا جب رسولؐ اللہ کا انتقال ہو گیا تو جنابِ فاطمہؑ پر ہجوم اندوہ و غم ہوا، ایسا کہ جس کو اللہ کے سوا کوئی نہیں جانتا۔ خدا نے ان کے پاس اس غم میں تسلّی دینے کے لئے ایک فرشتہ بھیجا جس نے ان سے کلام کیا۔ حضرت فاطمہؑ نے یہ واقعہ امیر المومنین سے بیان کیا۔ حضرت نے فرمایا۔ اب جب فرشتہ آئے اور تم اس کی آواز سنو تو مجھے بتانا چنانچہ جب پھر فرشتہ آیا تو حضرت فاطمہ نے آگاہ کیا۔ امیر المومنین علیہ السلام فرشتے کی تمام باتوں کو لکھتے جاتے تھے۔ یہاں تک کہ وہ باتیں اس مصحف میں لکھی گئیں۔ پھر فرمایا اس میں حلال و حرام کا ذکر نہیں بلکہ آئندہ

ہونے والے واقعات کا ذکر ہے۔ (الشافی، جلد اوّل، صہ ۲۷۲۔۲۷۰)

یہاں آخر میں کہا گیا ہے کہ اس میں حرام و حلال کا ذکر نہیں لیکن اس کے دو ہی تین روایتوں کے بعد ایک روایت میں ہے۔

> راوی کہتا ہے کہ میں نے امام جعفر صادق علیہ السلام کو کہتے سُنا کہ ہمارے پاس وہ چیز ہے کہ ہم اس کی وجہ سے لوگوں کے محتاج نہیں بلکہ لوگ ہمارے محتاج ہیں۔ ہمارے پاس ایک کتاب ہے جس کو رسولؐ اللہ نے لکھوایا اور حضرت (علیؓ) نے لکھا۔ اس میں حلال و حرام کا ذکر ہے۔ ہم جانتے ہیں اس امر کو جسے تم شروع کرتے ہو اور جانتے ہیں جب تم ختم کرتے ہو۔
>
> (شافی، جلد اوّل، صہ ۲۷۴ - ۲۷۳)

خدا کی طرف سے یہ تمام احکام ملائکہ لے کر نازل ہوتے تھے۔ ملائکہ ائمہ حضرات کے گھروں میں کس انداز سے آتے تھے، اس کے متعلق

> ابو حمزہ ثمالی سے مروی ہے کہ میں حضرت علی بن الحسین کی خدمت میں حاضر ہوا۔ کچھ دیر مجھے باہر رُکنا پڑا۔ پھر میں اندر داخل ہوا۔ دیکھا کہ حضرت کوئی چیز چُن رہے ہیں اور پردہ کے اندر ہاتھ سے ان کو دے رہے ہیں جو گھر میں ہے۔ میں نے کہا یہ کیا چیز آپ چن رہے ہیں۔ فرمایا یہ ملائکہ کے پروں کے ریشے ہیں۔ ان کے جانے کے بعد جب ہم خلوت میں ہوتے ہیں تو ان کو جمع کر کے اطفال کے لئے تعویذ بناتے ہیں۔ میں نے کہا حضور کیا وہ آپ کے پاس آتے ہیں؟ فرمایا کہ ہم اپنے تکیوں سے حرکت کر نہیں پاتے کہ وہ آجاتے ہیں۔ (شافی، جلد اوّل، صہ ۴۸۵)

ایرانیت کو ان عقائد سے کیا تعلق ہے؟

بات یہاں سے شروع ہوئی تھی کہ ہرمزان نے حضرت عمرؓ سے کہا تھا کہ ہم لوگ تم (عربوں) سے شکست اس لئے کھا گئے ہیں کہ تمہارے پاس خدا کی کتاب ہے۔ اس کی موجودگی میں ہم، تم پر کبھی غالب نہیں آ سکتے ـــ دنیا کی کوئی قوم بھی تم پر غالب نہیں آسکتی ـــ اور اس کے بعد ہم نے دیکھا ہے کہ قرآن کس طرح اس امت کے ہاں سے (عملاً) گم کر دیا گیا۔ اس مقام پر سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ

(۱) جو عقائد و نظریات سابقہ صفحات میں ہمارے سامنے آئے ہیں، وہ ائمہ کرام کی طرف منسوب ہیں جو سب کے سب عرب تھے۔ پھر اس میں ایرانیت کا کیا دخل ہے۔ اور

(۲) یہ عقائد و نظریات، مسلمانوں کے ایک فرقہ (شیعہ حضرات) کے ہیں۔ مسلمانوں کے سوادِ اعظم (سنی حضرات) کے تو یہ عقاید نہیں۔ کیا ان کے ہاں سے بھی قرآن گم ہو گیا اور اگر ایسا ہوا تو وہ کیسے؟

یہ سوالات بڑے اہم ہیں اور غور و فکر سے سمجھنے کے قابل۔ آگے بڑھنے سے پہلے، میں اس حقیقت کو بارِ دگر سامنے لانا ضروری سمجھتا ہوں کہ میں نہ سنی ہوں نہ شیعہ۔ میرا تعلق کسی بھی فرقہ سے نہیں۔ میں قرآنِ کریم کا طالب علم ہوں اور میرا عقیدہ (بلکہ ایمان) یہ ہے کہ خدا کی یہ کتابِ عظیم دین میں سند و حجت ہے اور حق و باطل کے پرکھنے کا واحد معیار۔ کوئی عقیدہ، نظریہ، تصور، مسلک و مشرب جو اس کے خلاف جاتا ہو، میرے نزدیک درست نہیں ہو سکتا خواہ اس کی نسبت کسی کی طرف بھی کیوں نہ کی گئی ہو۔ اگر اس قسم کا کوئی عقیدہ بزرگانِ سلف میں سے کسی کی طرف منسوب کیا جاتا ہے، خواہ ان کا تعلق کسی فرقے سے ہو، تو (ان حضرات کے احترام کے پیشِ نظر) میں یہی کہا کرتا ہوں کہ ان کی طرف اس کی نسبت صحیح معلوم نہیں ہوتی ہے۔ انھوں نے ایسا نہیں کہا ہوگا۔ میری اس وضاحت کے بعد آگے چلیے۔

گزشتہ صفحات میں جن عقائد و نظریات کا ذکر کیا گیا ہے، ان کی نسبت بے شک شیعہ حضرات کے ائمہ کرام کی طرف کی گئی ہے لیکن ہمارے پاس کوئی ایسی کتاب نہیں جس کے متعلق مستند طور پر کہا جا سکے کہ وہ خود ان حضرات میں سے کسی کی تصنیف ہے۔ ان حضرات کی طرف منسوب کردہ اقوال، ہمارے پاس جامعینِ روایات کے ذریعے پہنچے ہیں۔ (جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا ہے) اثنا عشری جامعینِ احادیث میں ثقۃ الاسلام

جامعین حدیث سب ایرانی تھے

کلینی کو سب سے زیادہ مستند اور معتمد علیہ سمجھا جاتا ہے، ان کی پیدائش مقام رَے (موجودہ طہران) میں ۲۵۰ھ میں ہوئی اور وفات ۳۲۹ھ میں۔ امامیہ شیعہ حضرات کے گیارہویں امام حسن عسکری نے ۲۶۰ھ میں وفات پائی اور ان کے بعد، ان کے بارہویں امام، محمد المنتظر، چار یا پانچ سال کی عمر میں (بغداد کے قریب) سامرا کے غار میں مستور ہو گئے۔ ان حقائق کی روشنی میں یہ حقیقت سامنے آجاتی ہے کہ کلینی

لے ڈاکٹر زاہد علی (صہ ۱۵۵)

نے، اپنی جمع کردہ روایات، کسی امام سے براہِ راست نہیں لیں، دوسرے راویوں سے حاصل کی ہیں۔ شیعہ حضرات کی حدیث کی باقی تین کتابیں، اس سے بھی بعد میں مدوّن ہوئی تھیں. یعنی من لا یحضرہ الفقیہ (شیخ محمد ابن علی، متوفی ۳۸۱ھ) اور تہذیب اور استبصار (ابوجعفر محمد بن حسن، متوفی ۴۶۰ھ)۔ الکافی کے متعلق کتاب الشافی (جلد اوّل) کے مقدمہ میں کہا گیا ہے کہ

الکافی کی ضعیف روایات

کافی کی سولہ ہزار ایک سو ننانوے احادیث میں صرف پانچ ہزار بہتر صحیح ہیں۔ باقی ایک سو چوالیس حسن، ایک ہزار ایک سو سولہ موثق تین سو دو قوی اور نو ہزار چار سو پچاس ضعیف ہیں۔ (ص ۶)

انہی (مولانا سیّد ظفر حسن صاحب) نے کتاب فروعِ کافی کے ترجمہ میں تحریر فرمایا ہے۔

فرقہ شیعہ نے اپنی کتابوں کے متعلق کبھی یہ دعوےٰ نہیں کیا کہ من اوّلہ وآخرہ ان کی تمام احادیث صحیح اور متواتر ہی ہیں. کسی کتاب میں کسی حدیث کا پایا جانا اس کی صحت کا ثبوت نہیں کہا جا سکتا، جب تک وہ معیارِ حدیث پر صحیح نہ اُترے۔ (ص ۵)

اور راقم الحروف کے نزدیک "معیارِ حدیث" یہ ہے کہ کوئی حدیث جو قرآنِ کریم کے خلاف جاتی ہو، صحیح نہیں ہو سکتی۔ اسی بنا پر میں یہ کہنے کی جرأت کر رہا ہوں کہ سابقہ صفحات میں جو کچھ لکھا گیا ہے، اس میں سے جو عقاید اور تعلیم، قرآنِ کریم کے خلاف ہے، حضرات ائمہ کرام کی طرف ان کی نسبت صحیح نہیں ہو سکتی۔ ان کا شمار (سیّد ظفر حسن صاحب کی مندرجہ بالا تصریح کے مطابق) ضعیف روایات میں ہونا چاہیئے لیکن چونکہ شیعہ حضرات انھیں صحیح سمجھتے ہیں اس لئے مجھے اس باب میں کسی فیصلہ دینے کا حق نہیں پہنچتا۔ ویسے بھی، مجھے اس سلسلہ میں خاص طور پر محتاط رہنے کی ضرورت ہے کیونکہ، شیعہ حضرات کی طرف سے، خود مجھے بھی، "فتنۂ انکارِ حدیث" سے متہم کیا گیا ہے. چنانچہ الشافی (جلد اوّل) کے مقدمہ میں، علامہ محمد حسن صاحب ارشاد فرماتے ہیں۔

مجھ پر انکارِ حدیث کا اتہام

مگر افسوس ہے کہ با ایں ہمہ، مسلمانوں میں ہمیشہ سے ایک ایسا گروہ بھی موجود رہا ہے جو نہ صرف یہ کہ حدیث کی افادیّت کا منکر ہے بلکہ وہ یہ کہتا ہے ___ ایں دفترِ بے معنی غرقِ مے ناب اولیٰ ___ اس فتنہ کا حجرِ اساس تو پیغمبرِ اسلام کے آخری لمحاتِ حیات میں آنجنابؐ کے مطالبۂ قلم و دوات کے جواب میں حسبنا کتاب اللہ (بخاری شریف.....) کہہ کر رکھ دیا گیا تھا اور انہی "حسبنا کتاب اللہ" کے قائل کے دورِ

خلافت میں بیان کرنے والوں کو درّے لگتے۔ (الفاروق، شبلی)۔ یہ نظریہ فاسدہ، اسلام کے مختلف ادوار سے گزر کر، مولوی چکڑالوی اور مسٹر پرویز کے وقت خوب برگ و بار لے آیا۔ اب جب کہ وہ اپنے اصلی رنگ و روپ اور حقیقی خدوخال کے ساتھ منظرِ عام پر ظاہر ہوا ہے تو حسبنا کتاب اللہ کے قائل بھی چلا اُٹھے ہیں اور اس خیال کے ابطال پر متعدد کتب و رسائل لکھ ڈالے ہیں مگر ان حضرات کو کون سمجھائے کہ — اے بادِ صبا! ایں ہمہ آوردۂ تست۔ (مقدمہ الشافی، جلد اوّل ص۳۔)

میرا "انکارِ حدیث" اتنا ہی ہے جو میں کہتا ہوں کہ جو حدیث قرآنِ کریم کی تعلیم کے خلاف ہے، رسول اللہؐ یا بزرگانِ دین کی طرف اس کی نسبت غلط ہے۔ وہ کوئی ایسی بات کہہ نہیں سکتے تھے جو قرآن کے خلاف ہو۔ میں نے کبھی نہیں کہا — ایں دفترِ بے معنی غرقِ مے ناب اولیٰ — جو احادیث قرآن کے خلاف نہیں میں انھیں صحیح تسلیم کرتا ہوں لیکن حسبنا کتاب اللہ کہنے کے جرم میں مجھے جس ذاتِ گرامی (حضرت عمرؓ) کے ساتھ ہم رشتہ کیا گیا ہے، میرے لئے یہ سعادت کچھ کم باعثِ فخر نہیں۔

گرچہ خوردیم نسبت ایست بزرگ

اب ہم دوسرے سوال کی طرف آتے ہیں۔ یعنی اس سوال کی طرف کہ سنّیوں کے عقاید و تصورات پر ایرانی سازش نے کیا اور کس طرح اثر کیا۔ اسے پھر دہرا دیا جائے کہ عجمی سازش

سُنّیوں عقاید و مسلک پر عجمی اثرات

کا محوری نقطہ یہ تھا کہ کسی نہ کسی طرح قرآنِ کریم کی اہمیّت و عظمت کو ختم کر دیا جائے۔ اس سلسلہ میں سب سے پہلے یہ خیال عام کیا گیا کہ رسول اللہؐ نے قرآنِ مجید مرتب شکل میں اُمّت کو نہیں دیا تھا، وہ اسے منتشر شکل میں چھوڑ گئے تھے۔ اس کے بعد یہ جمع اور مرتب کیسے ہوا؟ اس کے لئے عجیب و غریب روایات ملتی ہیں۔ (روایات کے متعلق ہم تفصیل سے بعد میں لکھیں گے) اس مقام پر اتنا سمجھ لینا کافی ہو گا کہ اہلِ سنّت والجماعت یعنی سُنّی حضرات کے احادیث کے متعدد مجموعے ہیں۔ ان میں چھ کتابوں کو، جنھیں صحاحِ ستّہ کہا جاتا ہے، مستند مانا جاتا ہے۔ پھر صحاحِ ستّہ میں سے دو کتابوں، مسلم اور بخاری کو صحیحین اور بخاری کو اصح الکتب بعد کتاب اللہ قرار دیا جاتا ہے۔ ان کتبِ روایات میں جمعِ قرآن کے متعلق کہا گیا ہے کہ:-

جمعِ قرآن کے متعلق شکوک و شبہات

امام ابن ابی داؤد اپنی سند کے ساتھ زید بن ثابت سے نقل کرتے ہیں کہ جس سال اہلِ یمامہ کا قتل ہُوا، ابوبکرؓ نے مجھے آدمی بھیج کر بلایا۔ وہاں عمرؓ بھی موجود تھے۔ ابوبکرؓ کہنے لگے کہ یہ (عمرؓ) میرے پاس آئے اور کہنے لگے کہ قرآن کے قاریوں کے ساتھ قتل کی گرم بازاری ہوگئی ہے۔ مجھے ڈر ہے کہ دوسرے مواقع پر بھی یہی گرم بازاری ہو اور اس طرح قرآن ضائع ہو جائے۔ میری رائے ہے کہ قرآن کو جمع کر لو۔ میں نے عمرؓ سے کہا کہ جو کام رسول اللہ نے نہیں کیا وہ تم کیسے کرتے ہو۔ عمرؓ نے کہا، بخدا یہ کام اچھا ہی ہے اور اس بارہ میں مجھ سے برابر کہتے رہے حتیٰ کہ جس چیز کے لئے خدا نے ان کا شرحِ صدر کر دیا تھا میرا بھی شرحِ صدر کر دیا اور میری رائے بھی وہی ہوگئی جو ان کی تھی۔ ابوبکرؓ مجھ سے کہنے لگے۔ تم نوجوان اور عقلمند آدمی ہو اور رسول اللہ صلعم کے لئے وحی لکھتے رہے ہو۔ ہم تمھیں متہم نہیں سمجھتے۔ لہٰذا تم قرآن کو لکھ لو۔ زید بن ثابت لکھتے ہیں کہ بخدا اگر وہ مجھے کسی پہاڑ کو اپنی جگہ سے ہٹا کر دوسری جگہ لے جانے کو کہتے تو وہ مجھ پر اس کام سے زیادہ دشوار نہ ہوتا۔ میں نے ان دونوں سے کہا کہ جو کام رسول اللہ صلعم نے نہیں کیا، وہ کام تم کیسے کرتے ہو۔ ابوبکرؓ اور عمرؓ کہنے لگے کہ بخدا یہ کام اچھا ہی ہے۔ چنانچہ ابوبکرؓ اور عمرؓ برابر مجھ سے کہتے رہے۔ حتیٰ کہ جس امر کے لئے ان دونوں کو شرحِ صدر ہُوا تھا مجھے بھی شرحِ صدر ہوگیا اور وہی میری رائے بھی ہوگئی جو ان دونوں کی رائے تھی۔ چنانچہ لکھنے کے لئے میں نے کاغذ کے ٹکڑوں، کھجور کے پٹھوں، پتھروں کے ٹکڑوں اور لوگوں کے سینوں (حافظوں) سے تلاش کرنا شروع کر دیا۔ حتیٰ کہ ایک آیت جو میں حضورؐ کو پڑھتے ہوئے سُنا کرتا تھا مجھے نہیں ملی۔ یعنی لقد جاءکم رسول من انفسکم (الآیہ) چنانچہ میں نے اس کو ڈھونڈا۔ بالآخر خزیمہؓ بن ثابت کے پاس ملی اور میں نے اس کو اس کی سورۃ میں لکھ دیا[1]

(مقامِ حدیث ص۲۷۶)

دیگر روایات میں ہے کہ (۱) قرآن مجید کو جمع حضرت ابوبکر صدیقؓ نے کیا تھا۔ حضرت زیدؓ نے اس پر صرف نظرِ ثانی کی تھی۔ (۲) اسے حضرت عمرؓ نے جمع کیا تھا۔ (۳) حضرت عمرؓ نے بھی نہیں بلکہ حضرت عثمانؓ نے

---

[1] تفصیل ادارہ طلوعِ اسلام کی طرف سے شائع کردہ کتاب — مقامِ حدیث — میں دیکھئے۔ وہیں ان تمام روایات کے حوالے بھی ملیں گے۔

جیسا کہ بابِ چہارم، "حسبنا کتاب اللہ" میں بیان کیا گیا ہے، ان روایات کی رُو سے، اس طرح جمع شدہ قرآنِ مجید میں بعض آیات درج ہونے سے رہ گئی تھیں اور تلاش کے بعد معلوم ہوا تھا کہ انھیں حضرت عائشہؓ کی بکری کھا گئی تھی۔ آیۂ رجم کے متعلق حضرت عمرؓ کو اصرار تھا کہ وہ رسول اللہ کے زمانے میں قرآن میں موجود تھی۔ جب ان سے (ان کے زمانۂ خلافت میں) کہا گیا کہ اس آیت کو قرآن میں شامل کر دیا جائے تو آپ نے کہا کہ اسے قرآن میں تو درج نہیں کریں گے، البتہ حکم اس کا باقی رکھیں گے۔ چنانچہ عمل اس آیت کے مطابق ہوتا رہا۔ یعنی زنا کی سزا سنگساری۔ حضرت ابوبکرؓ یا حضرت عمرؓ کے زمانے کے مرتب کردہ صحائف حضرت حفصہؓ کے پاس تھے۔ مروان نے انھیں اپنے زمانے میں ان سے لے کر جلا دیا۔ (بعض روایات میں ہے کہ وہ نسخہ کنوئیں میں گر گیا تھا)۔ بہرحال، وہ کنوئیں میں گر گیا ہو، یا جلا دیا گیا ہو، وہ نسخہ (یا صحائف) امت کے پاس نہ رہے۔ جو نسخہ حضرت عثمانؓ نے مرتب فرمایا تھا اس کے متعلق امام ابنِ ابی داؤد اپنی تصنیف 'کتاب المصاحف' میں لکھتے ہیں کہ

> جب حضرت عثمانؓ مصحف سے فارغ ہو گئے اور انھوں نے اسے دیکھا تو فرمایا کہ تم لوگوں نے بہت اچھا کیا اور خوب کیا مگر مجھے اس میں کچھ غلطیاں نظر آتی ہیں۔ (لیکن کوئی بات نہیں) عرب انھیں اپنی زبانوں سے ٹھیک کر لیں گے۔

بعد میں (بزمانۂ بنی اُمیّہ) الحجاج بن یوسف نے، مصحفِ حضرت عثمانؓ میں گیارہ جگہ تبدیلیاں کیں۔ مروجہ قرآن کے متعلق کہا جاتا ہے کہ یہ حجاج کا تصحیح کردہ ہے۔ علاوہ ازیں، خود حضرت عثمانؓ کے زمانے میں مختلف صحابہؓ کے پاس جو قرآن کے نسخے تھے، ان میں اور مصحفِ عثمانؓ میں متعدد اختلافات تھے ـــ یہ ہے جو خود سُنّیوں کی روایات میں قرآنِ کریم کے متعلق درج ہے۔

آپ سوچئے کہ جس قرآن کی جمع و تدوین کے متعلق اس قسم کے خیالات عام کر دیئے جائیں، اس کی محکمیت کہاں باقی رہ سکتی ہے؟ (ہم آگے چل کر بتائیں گے کہ یہ خیالات کس زمانے میں وضع اور عام کئے گئے اور ان میں ایرانیت کا کہاں تک دخل تھا)۔

ناسخ و منسوخ کا عقیدہ

بہرحال، قرآنِ مجید (روایات کی رُو سے جیسے تیسے بھی جمع ہوا) امت کے پاس آ گیا۔ اب اس کے متعلق یہ عقیدہ پھیلایا گیا کہ اس میں بے شمار آیات منسوخ ہیں۔ یعنی وہ آیات قرآن میں موجود ہیں، ان کی تلاوت بھی کی جاتی ہے لیکن حکم

ان کا منسوخ ہو چکا ہے۔ اس سلسلہ میں ایک عقیدہ یہ ہے کہ قرآن کی بعض آیات، قرآن ہی کی دوسری آیات سے منسوخ ہیں۔ اور دوسرا عقیدہ یہ ہے کہ قرآن کی آیات، بعض احادیث کی رُو سے منسوخ ہو چکی ہیں۔ اس (دوسرے) عقیدہ کے متعلق ہم ذرا آگے چل کر لکھیں گے۔ جہاں تک اوّل الذکر عقیدہ کا تعلق ہے، قرآن میں یہ کہیں درج نہیں کہ فلاں آیت نے فلاں آیت کو منسوخ کر دیا ہے۔ اسے "علماء" پر چھوڑ دیا گیا ہے کہ وہ جس آیت کے متعلق چاہے کہہ دیں کہ اسے فلاں آیت نے منسوخ کر دیا ہے۔ یہ روش اس قدر عام ہوئی کہ قرآنِ مجید کی قریب پان سو آیات منسوخ قرار دے دی گئیں۔ اس تعداد میں مختلف زمانوں میں کمی بیشی ہوتی رہی، تاآنکہ شاہ ولی اللہ نے انھیں گھٹا کر پانچ آیات تک محدود کر دیا۔ لیکن پانچ ہوں یا پانسو، یہ عقیدہ بہرحال موجود ہے کہ قرآن کی بعض آیات صرف پڑھی جاتی ہیں، ان کا حکم منسوخ ہو چکا ہے۔ اور منسوخ ہو چکا ہے (خدا کے فیصلے کی رو سے نہیں)، کسی نہ کسی "عالم" کے فیصلے کی رُو سے۔

اس کے بعد یہ سوال سامنے آتا ہے کہ جو قرآن (منسوخ ہونے سے) بچ گیا ہے، اسے سمجھا کس طرح جائے۔ یہ وہ مقام ہے جہاں ایرانیت نکھر کر سامنے آجاتی ہے۔ ہم دیکھ چکے ہیں کہ "محدث" کے عقیدہ کی رُو سے کہا یہ گیا کہ وحی کی دو قسمیں ہیں۔ ایک قسم کی وحی رسول اللہ پر نازل ہوئی تھی اور دوسری قسم کی وحی ائمہ پر۔ ان کے صرف طریقِ تنزیل میں فرق تھا۔ وحی ہونے کی جہت سے ان میں کسی قسم کا فرق نہیں تھا۔ یہ عقیدہ شیعہ حضرات کا تھا۔ سُنیوں کے ہاں یہ عقیدہ رائج کیا گیا کہ وحی کی دو قسمیں ضرور ہیں لیکن یہ دونوں رسول اللہ پر ہی نازل ہوئی تھیں۔ ایک کو وحی جلی (یا وحیٔ متلو) کہا جاتا ہے اور دوسری کو وحیٔ خفی (یا وحیٔ غیر متلو)۔ وحیٔ جلی (یا متلو) قرآنِ مجید کے اندر درج ہے اور وحیٔ خفی احادیث[1] کے اندر۔ وحیٔ غیر متلو کے متعلق یہ عقیدہ وضع کیا گیا کہ یہ بھی "مثلہٗ معہٗ" قرآن کے ساتھ اس کی مثل" ہے۔ چنانچہ حضرت مقداد بن معدی کرب کی روایت یوں بیان کی جاتی ہے کہ

مثلہٗ معہٗ | رسول اللہ نے فرمایا کہ یاد رکھو کہ مجھے الکتاب دی گئی ہے اور اس کے ساتھ اس کی مثل کچھ اور (اِنّی اوتیت الکتاب و مثلہٗ معہٗ)۔ یاد رکھو

---

[1] دو قسم کی وحی کا عقیدہ، یہودیوں کے ہاں رائج تھا۔ ایک شکتب (وحیٔ متلو) اور دوسری شبعلفہ (وحیٔ غیر متلو) ہمارے ہاں یہ عقیدہ وہیں سے آیا ہے۔

عنقریب ایک شخص جس کا پیٹ بھرا ہوگا، اپنے تخت پر بیٹھا کہے گا کہ تم اس قرآن کو لازم پکڑو۔ جو کچھ اس میں حلال پاؤ اسے حلال سمجھو اور جو کچھ اس میں حرام پاؤ اسے حرام سمجھو۔

(ابو بکر خطیب بغدادی، کتاب الکفایہ)

یہ "مثلہٗ معہٗ" احادیث ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ وحیٔ متلو اور وحیٔ غیر متلو (مثلہٗ معہٗ) کا عقیدہ، امام شافعیؒ نے وضع کیا تھا۔ یہ عسقلان کے صوبہ میں، سنہ ۱۵۰ھ میں پیدا ہوئے اور ہارون الرشید کے زمانہ میں یمن میں مقیم تھے جو شیعوں کا مرکز تھا۔ ان پر بھی تشیع کا الزام تھا اور اسی بنا پر ہارون الرشید کے ہاں ان کی طلبی بھی ہوئی تھی۔ اکثر عراق آتے جاتے تھے۔ آخر الامر، انھوں نے مصر میں، سنہ ۲۰۴ھ میں انتقال کیا۔ (تاریخ فقہٗ اسلامی، علامہ خضری مرحوم، صہ ۲۴۷)۔ بہرحال، اس عقیدہ کو کسی نے وضع کیا ہو، اس کی رُو سے، قرآن سے باہر، ایک مجموعۂ وحی اور وجود میں آگیا جنھیں احادیث کہا جاتا ہے۔ جن لوگوں کے ذہن میں دین کا صحیح تصور اور دل میں قرآنِ مجید کے "لا شریک لہٗ" ہونے کی عظمت تھی، انھوں نے اس نئے عقیدہ کی مخالفت کی اور کہا کہ دین میں سند اور حجت صرف قرآنِ کریم ہے۔ جیسا کہ قدامت پرست طبقہ کا قاعدہ ہے، انھوں نے اُن لوگوں پر معتزلہ کا لیبل لگایا اور پھر ان کے خلاف اس قدر پراپیگنڈہ کیا کہ حالت یہ ہے کہ آج بھی جو شخص عقل و فکر کی بات کرے اور اس کے دلائل کا کوئی جواب اُن سے نہ بن پڑے، اس کے متعلق اتنا کہہ دینا کافی ہے کہ وہ معتزلہ ہے۔ وہ خود بخود ملحد و زندیق قرار پا جائے گا۔ "معتزلہ" اور شوافع کی کشمکش اور آویزش کی داستان بڑی طویل اور خونچکاں ہے جس کی تفصیل میں جانے کا یہ موقعہ نہیں۔ آخر الامر ہوا یہ کہ امام شافعیؒ کا پیش کردہ نظریہ، اسلام کا بنیادی ستون قرار پا گیا۔ اس عقیدہ کی رُو سے حدیث کو کیا مقام حاصل ہو گیا۔ اسے غور سے سنئے۔ جمعیت اہلِ حدیث کے سابق صدر، مولانا محمد اسمٰعیل (مرحوم) اپنی کتاب "جماعتِ اسلامی کا نظریۂ حدیث" میں لکھتے ہیں۔

حدیث کا مقام

تحقیق و تثبیت کے بعد حدیث کا ٹھیک وہی مقام ہے جو قرآنِ عزیز کا ہے اور فی الحقیقت اس کے انکار کا ایمان اور دیانت پر بالکل وہی اثر ہے جو قرآنِ عزیز کے انکار کا...... جو احادیث قواعدِ صحیحہ اور ائمۂ سنّت کی تصریح کے مطابق صحیح ثابت ہوں، ان کا انکار کفر ہوگا اور

ملت سے خروج کے مرادف[1] ...... جبریل، قرآن اور سنت دونوں لے کر نازل ہوتے تھے۔ آنحضورؐ کو سنت بھی قرآن کی طرح سکھاتے تھے۔ اس لحاظ سے ہم وحی میں تفریق کے قائل نہیں۔

یہاں تک تو قرآن اور حدیث کو ہم پایہ قرار دیا جا رہا ہے۔ لیکن اب ذرا آگے بڑھئے۔ امام اوزاعی کا قول ہے،۔

قرآن اس سے زیادہ حدیثوں کا محتاج ہے، جس قدر حدیثیں قرآن کی محتاج ہیں[2]۔

اور ایک دوسرے امام حدیث، یحییٰ ابن کثیر فرماتے ہیں۔

حدیث قرآن پر قاضی ہے۔ قرآن حدیث پر قاضی نہیں[2]۔

اتنا ہی نہیں، عقیدہ یہ بھی ہے کہ حدیث، قرآن کے حکم کو منسوخ کر سکتی ہے۔ علامہ حافظ محمد ایوب (مرحوم) اپنے کتابچہ " فتنۂ انکارِ حدیث " میں لکھتے ہیں کہ

نبی کے قول کے لئے ضروری نہیں کہ وہ قرآن کے مطابق ہو تب حجت رہے اور مطابق نہ ہو تو حجت نہ رہے ...... اس کی دلیل یہ ہے کہ قرآن میں ہے۔ کتب علیکم اذا حضر احدکم الموت ان ترک خیرا ن الوصیۃ للوالدین۔ (۲/۱۸۰) " تمہارے اوپر والدین کے لئے وصیت فرض ہے، اگر کسی نے مال چھوڑا ہے جبکہ اسے موت آئے۔" رسول اللہؐ نے فرمایا۔ لا

---

[1] شیعہ حضرات صرف ان احادیث کو صحیح مانتے ہیں جو ان کے ائمہ سے مروی ہوں اس لئے ان کے نزدیک سنیوں کی حدیثیں قابلِ قبول نہیں اور سنیوں کا مسلک یہ ہے کہ جس حدیث کا کوئی ایک راوی بھی شیعہ ہو وہ حدیث قابلِ تسلیم نہیں۔ اہلِ حدیث حضرات، بخاری اور مسلم کی کسی ایک حدیث کے انکار کو بھی مستلزم کفر قرار دیتے ہیں اور حنفی حضرات مسلم اور بخاری کی قریب دو سو احادیث سے انکار کرتے ہیں اور احادیث کے سب سے زیادہ قابلِ اعتماد، جامعِ امام بخاری نے چھ لاکھ احادیث میں سے چھ سات ہزار کو قبول کیا اور باقی سب کو مسترد کر دیا۔ اسی طرح دیگر جامعینِ احادیث نے بھی۔ [2] مختصر جامع بیان العلم، [illegible]

[3] خلیفہ عمر بن عبدالعزیز کے زمانے (قریب [illegible]ھ) میں، امام ابن شہاب زہری نے ایک مختصر سا مجموعہ، خلیفہ کی فرمائش پر مرتب کیا تھا لیکن احادیث کے مروجہ مجموعوں میں اس کی کوئی اہمیت نہیں۔

وصیۃ للوارث. وارث کے لئے وصیت نہیں ہے اور تواتر سے ثابت ہے کہ عمل اس حدیث پر رہا ہے، یعنی وارث کے لئے وصیت ناجائز قرار دے دی گئی۔ حدیث نے قرآن کو منسوخ کر دیا۔ اور قولِ رسولؐ، قرآن کی آیت کے خلاف، حجت اور موجب عمل رہا۔ (ص ۸۵)

یہ ہے وہ مقام جو قرآن کے مقابلہ میں احادیث کو عطا کیا گیا۔ سوال یہ ہے کہ عقاید کب وضع ہوئے اور احادیث کب وجود میں آئیں! ہم باب چہارم (حسبنا کتاب اللہ) میں بہ تفصیل بتا چکے ہیں کہ احادیث کا کوئی مجموعہ نہ رسول اللہؐ نے مرتب فرما کر اُمت کو دیا، نہ ہی خلفائے راشدینؓ کے زمانے میں مرتب ہوا۔ انہوں نے، بلکہ اس کی شدت سے مخالفت کی۔ ان کے بعد صحابہؓ اور بنی امیہ کے زمانے میں بھی ان کے مجموعے مرتب نہ ہوئے۔ یہ مجموعے عباسیوں کے زمانے میں مرتب ہوئے۔ (جیسا کہ لکھا جا چکا ہے)۔

جامعینِ حدیث سب ایرانی تھے

اہلِ سنت والجماعت، ان مجموعوں میں سے چھ کو صحیح تسلیم کرتے ہیں۔ آپ یہ دیکھ کر حیران ہوں گے کہ (شیعہ جامعینِ روایات کی طرح) یہ سُنّی جامعینِ روایات بھی سب کے سب ایرانی تھے۔ یعنی

نام جامع حدیث	سنِ وفات	وطن	کتنی احادیث جمع کیں	ان میں سے کتنی اپنے مجموعہ میں درج کیں
۱۔ امام محمد اسماعیل بخاریؒ	۲۵۶ھ یا ۲۶۰ھ	بخارا	چھ لاکھ	۲۷۶۲ (مکررات حذف کرنے کے بعد)
۲۔ امام مسلم بن حجاج	۲۶۱ھ	نیشاپور	تین لاکھ	۴۳۴۸
۳۔ امام ابو موسیٰ محمد ترمذیؒ	۲۷۹ھ	ترمذ	تین لاکھ	۳۱۱۵
۴۔ امام ابو داؤد	۲۷۵ھ	سیستان	پانچ لاکھ	۴۸۰۰
۵۔ ابو عبد اللہ ابن ماجہ	۲۷۳ھ	قزوین	چار لاکھ	۴۰۰۰
۶۔ امام عبد الرحمٰن نسائیؒ	۳۰۳ھ	صوبہ خراسان کا گاؤں نسا	دو لاکھ	۴۳۲۱

آپ غور فرمائیے کہ رسول اللہؐ کی احادیث جمع کی جاتی ہیں اور ان جامعین میں سے کوئی بھی عرب نہیں۔ سب کے سب ایرانی ہیں۔ ان جامعین کے سامنے احادیث کا کوئی تحریری مواد نہیں تھا۔ تمام احادیث زبانی

روایات کی بنا پر جمع کی گئیں۔ آپ سوچئے کہ ایک شخص، رسول اللہ کی وفات کے قریب دواڑھائی سو سال بعد، بغیر کسی سابقہ تحریری ریکارڈ کے، لوگوں کی زبانی سُن کر، روایات جمع کرتا ہے۔ اسے، اس طرح (خود اس کے اپنے بیان کے مطابق) قریب چھ لاکھ روایات ملتی ہیں۔ ان میں سے وہ، محض اپنے فیصلے سے، ستائیس اٹھائیس سو کے قریب قبول کر لیتا ہے اور باقیوں کو مسترد کر دیتا ہے۔ جنہیں وہ قبول کر کے اپنی کتاب میں درج کر لیتا ہے، ان کے متعلق عقیدہ یہ ہے کہ "وہ قرآن کے ہم پایہ ہیں۔ قرآن کے احکام کو منسوخ کر سکتی ہیں۔ ان کا انکار کفر ہے۔" ان مجموعوں میں روایات کس قسم کی ہیں، ان کی مثالیں پیش کرنے کا یہ مقام نہیں[1]۔ یہاں صرف اتنا لکھ دینا کافی ہوگا کہ یہ احادیث عباسیوں کے دور میں جمع ہوئیں۔ اس لئے ان میں اس قسم کی روایات موجود ہیں کہ

عباسیوں کی محبّت

حضورؐ نے فرمایا کہ کسی شخص کے دل میں اس وقت تک ایمان داخل نہیں ہو سکتا جب تک وہ حضرت عباسؓ اور ان کی اولاد سے محبّت نہ رکھے[2]۔ (توجیہہ النظر، ص۱ — نیز جامع البیان)

اس کا محرک جذبہ تو (ظاہر ہے) سیاسی ہے۔ عقیدہ کے طور پر اس قسم کی متعدد روایات ان کتابوں میں مذکور ہیں جن میں کہا گیا ہے کہ

حضورؐ نے فرمایا کہ تم لوگ، خدا کی نعمتوں کو مدِ نظر رکھ کر خدا سے محبّت کرو اور اللہ کی محبّت کی وجہ سے مجھ سے محبّت کرو اور میری محبّت کی وجہ سے میرے اہل بیت سے محبّت رکھو۔

(ترمذی، بحوالہ تفسیر ابن کثیر، سورۃ شوریٰ)

یا مثلاً، قرآنِ مجید میں ہے۔ قُلْ لَّآ اَسْئَلُكُمْ عَلَيْهِ اَجْرًا اِلَّا الْمَوَدَّةَ فِى الْقُرْبٰى (۴۲/۲۳) "اے رسولؐ! ان سے کہہ دو کہ میں (تبلیغِ قرآن) کے لئے تم سے کوئی اجر نہیں طلب کرتا۔ میں صرف اتنا چاہتا ہوں کہ تم مجھ سے رشتہ داری کا برتاؤ رکھو۔" حضرت ابن عباسؓ نے اس کی تفسیر میں کہا ہے کہ

---

[1] اس کے لئے ادارہ طلوعِ اسلام کی طرف سے شائع کردہ کتاب — مقامِ حدیث — ملاحظہ فرمائیے۔

[2] تفسیر ابن کثیر میں بھی اس روایت کو نقل کیا گیا ہے۔ (پچیسواں پارہ، تفسیر سورۃ شوریٰ ص۱۳)

آنحضرتؐ کی قرابت جملہ بطونِ قریش میں تھی۔ اللہ نے آپ کی زبان سے اعلان کرایا کہ کہہ دو کہ میں تبلیغِ قرآن اور تعلیمِ دین پر تم سے کسی اجر کا طالب نہیں ہوں۔ صرف رشتہ داری کا برتاؤ میرے ساتھ رکھو۔

امام ترمذی نے اسے درج کرنے کے باوجود سعید بن جبیر سے نقل کیا ہے کہ:۔

اس آیت میں قربیٰ کے معنی آلِ محمدؐ" کے ہیں۔ یعنی میری تبلیغ کا اجر کچھ نہیں سوائے اس کے کہ میری اولادؑ کے ساتھ محبت رکھو۔

دوسری طرف ان کتابوں میں اس قسم کی حدیثیں بھی ملتی ہیں۔

اصحاب معاذاللہ مرتد ہو گئے تھے

حضرت ابن عباسؓ راوی ہیں کہ رسولِ خدا نے یہ خطبہ پڑھا کہ اے لوگو! تم اللہ کی طرف ننگے پیر ننگے بدن، بلاختنہ اٹھائے جاؤ گے ...... پھر آنحضرتؐ نے فرمایا کہ آگاہ رہو کہ کچھ لوگ میری امت کے لائے جائیں گے اور فرشتے انہیں دوزخ کی طرف لے جائیں گے۔ اس وقت میں کہوں گا، اے میرے رب! یہ میرے صحابیؓ ہیں۔ اللہ کی طرف سے ندا آئے گی کہ تو نہیں جانتا کہ انہوں نے تیرے بعد کیا کیا۔ اس وقت میں بھی عیسٰیؑ کی طرح سے کہوں گا۔ (وَكُنْتُ عَلَيْهِمْ شَهِيدًا۔ الآیۃ) پھر اللہ کی جانب سے ندا آئے گی کہ اے محمدؐ! یہ لوگ تیرے جدا ہونے کے بعد ہی مرتد ہو گئے تھے[2]۔ (بخاری، کتاب التفسیر)

اس سے پہلے قرآنِ کریم کی جمع و تدوین کے متعلق جو کچھ لکھا گیا ہے، وہ بھی انہی کتبِ روایات میں مذکور ہے اور صحابہ کبارؓ کے متعلق یہ روایت (کہ وہ، معاذاللہ، حضورؐ کی وفات کے بعد مرتد ہو گئے تھے) بھی انہی کتابوں میں ہیں۔ پھر سُن لیجئے کہ یہ کتابیں شیعوں کی نہیں، سنیّوں کی ہیں اور ایسی مستند اور معتبر کہ (ان حضرات کے عقیدہ کی رُو سے) ان میں درج شدہ کسی ایک روایت کا انکار، مسلمان کو دائرۂ اسلام سے

---

[1] اس میں ہر سیّد شامل ہو گا۔

[2] اس سے پہلے شیعہ حضرات کی یہ روایت ہمارے سامنے آ چکی ہے جس کی رُو سے کہا گیا ہے کہ حضورؐ کی وفات کے وقت اہلِ بیت کے علاوہ صرف تین یا پانچ مسلمان رہ گئے تھے باقی مرتد ہو گئے تھے۔ وہ شیعوں کی روایت تھی یہ سنّیوں کی ہے اور بخاری شریف کی ہے۔

خارج کر دیتا ہے۔

ان کتبِ احادیث نے جب یہ بنیاد فراہم کردی تو اس پر اسلام کی ایک جدید عمارت کا استوار کر دیا جانا کچھ مشکل نہ رہا۔ یہ کارنامہ سُنّیوں کے ایک نہایت قابلِ اعتماد، جلیل القدر، امام[1]، محمد جریر ابنِ طبریؒ نے سرانجام دیا۔ علامہ تمنا عمادی (مرحوم) ان کے متعلق رکھتے ہیں۔

امام ابنِ جریر طبری

> ابنِ جریر، طبرستان کے قصبہ امل کے رہنے والے تھے۔ یہیں پیدا ہوئے، یہیں پرورش پائی اور یہیں سے تحصیلِ علم کے لئے باہر نکلے۔ ۴۴ برس تک تحصیلِ علم میں سرگرداں رہے۔ (شیعہ تھے لیکن ازروئے تقیہ سنّی بنے رہے۔ ان کے دادا کا اصل نام رستم تھا۔ اسلام قبول کرنے کے بعد یزید نام رکھا گیا۔ ابنِ جریر خالص شیعوں کے لئے جو کتاب لکھتے تھے اس میں اپنا نام محمد بن جریر بن رستم لکھتے تھے اور سارے مسلمانوں کے لئے جو کتاب لکھتے تھے اس میں اپنا نام محمد بن جریر بن یزید لکھتے تھے[2]۔
>
> (طلوعِ اسلام، بابت اگست ۱۹۶۸ء صفحہ ۶۱)

امام طبری نے ایک تو یہ کیا کہ (تیس جلدوں میں) قرآنِ کریم کی تفسیر لکھی۔ اس تفسیر میں انہوں نے انداز یہ رکھا کہ ہر آیت کی تفسیر میں احادیث درج کر دیں جس کا مطلب یہ ہوا کہ وہ تفسیر، امام طبری کی نہیں، بلکہ خود رسول اللہ کی ہے۔ آپ سوچئے کہ اس کا نتیجہ کیا نکلا؟ یہ کہ اب قرآنِ کریم کا وہی مطلب صحیح تسلیم کیا جا سکتا ہے جسے امام طبری نے اپنی تفسیر میں لکھ دیا۔ بات بالکل واضح ہے۔ جب کسی سے یہ کہا جائے کہ فلاں آیت کی یہ تفسیر خود رسول اللہ نے بیان فرمائی ہے تو کونسا مسلمان یہ کہنے کی جرأت کر سکے گا کہ یہ تفسیر ٹھیک نہیں۔ یا یہ کہ اس آیت کا جو مفہوم میں نے سمجھا ہے وہ اس سے بہتر ہے۔ نہ کوئی مسلمان ایسا کہنے کی جرأت کر سکے گا، نہ کوئی مسلمان ایسی بات سننا گوارا! نتیجہ یہ کہ قرآنِ کریم کا مفہوم، تفسیرِ طبری میں مقید ہو کر رہ گیا اور اس پر غور و تدبر اور تنقید و تنقیح کے سب دروازے بند ہو گئے۔ چنانچہ، طبری کے

---

[1] شیعہ حضرات کے ہاں امام کا ایک خاص مفہوم ہے لیکن سنی حضرات، علومِ دین کے ماہرین کو امام کہہ کر پکارتے ہیں (مثلاً امام بخاری، امام طبری، امام ابو حنیفہ رحمہم اللہ وغیرہ)

[2] شیعہ حضرات انہیں شیعہ تسلیم نہیں کرتے۔ یہ ۲۲۴ھ میں پیدا ہوئے اور ۳۱۱ھ میں وفات پائی۔

بعد جس قدر تفاسیر لکھی گئیں وہ انہی کے تتبع میں لکھی گئیں اور جس نے اس سے اختلاف کی جراَت کی' وہ منکرِ حدیث' منکرِ رسالتؐ' فلہٰذا ملحد و بے دین قرار پا گیا۔ آپ نے غور فرمایا کہ اس ایک اقدام سے' قرآنِ مجید کو کس طرح ان عقاید و تصوّرات کا پابند بنا دیا گیا جو ان کتبِ روایات میں مذکور تھے جنہیں ایرانی جامعین نے جمع اور مرتب کیا تھا۔

جو اسلام عہدِ رسالت مآبؐ و صحابہؓ میں عملاً رائج و نافذ تھا' اس کے سامنے آنے کی ایک شکل یہ ہو سکتی تھی کہ اس دَور کی صحیح تاریخ مرتب ہو جاتی۔ امام طبری نے یہ راستہ بھی روک دیا۔ انہوں نے اپنی

امام طبری کی تاریخ

تفسیر کے ساتھ ایک ضخیم تاریخ بھی مرتّب کر دی جو تیرہ جلدوں پر مشتمل ہے یہی سُنّی مسلمانوں کے ہاں سب سے مبسوط تاریخ ہے۔ اس اعتبار سے طبری کی تفسیر کو اُمّ التفاسیر اور ان کی تاریخ کو اُمّ التاریخ کہا جاتا ہے۔ ہمارے ہاں جتنی کتبِ تاریخ بعد میں مرتب ہوئیں' ان کا ماخذ طبری کی تاریخ ہے۔ اس تاریخ میں انہوں نے یہ التزام کیا ہے کہ آیاتِ قرآنی کا جو مفہوم اپنی تفسیر میں بیان کیا ہے اس کی تائید میں عہدِ رسالتمآبؐ و صحابہؓ کے واقعات اپنی تاریخ میں درج کر دیئے ہیں اور اس عہد کے جو واقعات اپنی تاریخ میں درج کئے ہیں' ان کی تائید میں' اپنی تفسیر میں روایات درج کر دی ہیں۔ اس طرح تفسیرِ طبری اور تاریخِ طبری' عہدِ رسالتمآبؐ و صحابہؓ کے اسلام کی مستند تعبیر کی آئینہ دار قرار پا گئیں اور یہی اسلام آگے چلا۔

(۰)

ماورائے قرآن' خدا سے براہِ راست علم حاصل ہونے کے عقیدہ کا نتیجہ اتنا ہی نہیں تھا کہ اس سے

اسلام دین نہ رہا' مذہب بن گیا

وضعی حدیثیں وجود میں آ گئیں اور انہوں نے دین کی حیثیت اختیار کر لی۔ اس کا نتیجہ یہ بھی تھا کہ اسلام سرے سے دین ہی نہ رہا۔ یہ مذہب میں تبدیل ہو گیا۔ دین اور مذہب میں کیا فرق ہے' اسے ہم تیسرے باب میں تفصیل سے بیان کر چکے ہیں۔ اس کا لُبِّ لباب یہ ہے کہ دین' اپنی آزاد مملکت میں زندگی کا عملی نظام بن سکتا ہے۔ اپنی آزاد مملکت" سے مراد ہے وہ مملکت جس میں قوانینِ خداوندی (قرآنِ کریم کے احکام' اصول و اقدار) حکومت کے قوانین کی حیثیت سے نافذ اور عمل پیرا ہوں۔ اگر ایسی مملکت نہ رہے تو پھر دین باقی نہیں رہتا' وہ مذہب میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ مذہب میں' دین کے ارکان رسمی شکل میں باقی رہ جاتے

ہیں جن کا عملی نتیجہ کچھ مرتب نہیں ہوتا۔ ان کی ادائیگی سے انسان، بزعمِ خویش یہ سمجھ کر کہ میں احکامِ خداوندی کی اطاعت کر رہا ہوں، اپنے آپ کو (جھوٹا) اطمینان دلا لیتا ہے اور بس۔

استخلاف فی الارض (اپنی آزاد مملکت) کے سلسلہ میں قرآنِ کریم میں جو متعدد آیات آئی ہیں، ان میں سرِفہرست سورۂ نور کی وہ آیۂ جلیلہ ہے جس میں کہا گیا ہے کہ

وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْاَرْضِ كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ ۠ وَلَيُمَكِّنَنَّ لَهُمْ دِيْنَهُمُ الَّذِي ارْتَضٰى لَهُمْ وَلَيُبَدِّلَنَّهُمْ مِّنْۢ بَعْدِ خَوْفِهِمْ اَمْنًا ۭ يَعْبُدُوْنَنِيْ لَا يُشْرِكُوْنَ بِيْ شَيْـــًٔا ۭ وَمَنْ كَفَرَ بَعْدَ ذٰلِكَ فَاُولٰۗىِٕكَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ۔ (۲۴/۵۵)

جو لوگ تم میں سے ایمان لائیں گے اور عملِ صالح کریں گے، خدا نے وعدہ کر رکھا ہے کہ وہ انہیں

آیۂ استخلاف کا مفہوم بدل گیا

دنیا میں حکومت عطا کرے گا اسی طرح جیسے اس نے انہی جیسے لوگوں کو ادوارِ سابقہ میں حکومت عطا کی تھی

یہ حکومت اس لئے عطا ہوگی کہ اس کے ذریعے، خدا اس دین کو متمکن کر دے جسے اس نے ان کے لئے پسند کیا ہے اور تاکہ ان کا خوف، امن سے بدل جائے اور اس طرح وہ اس قابل ہو جائیں کہ وہ صرف خدا کی محکومیت اختیار کریں اور اس میں کسی اور کو شریک نہ کریں۔ جو لوگ اس کے بعد اس ابدی صداقت سے انکار کریں گے، وہ فاسق ہوں گے۔

اس سے ظاہر ہے کہ ایمان و اعمالِ صالح کا لازمی نتیجہ استخلاف فی الارض ہے اور اسی سے دین کا تمکن ہو سکتا ہے۔ یعنی اپنی حکومت کے بغیر دین کا تمکن ممکن نہیں۔

لیکن ہم دیکھ چکے ہیں کہ "امامت" کے لئے حکومت (استخلاف فی الارض) لازمی شرط نہیں اور تاریخ اس پر شاہد ہے کہ حضرت علیؓ کے سوا، دیگر ائمہ میں سے کوئی بھی صاحبِ حکومت نہ تھا۔ اس مشکل کے حل کے لئے کہا گیا کہ مذکورہ بالا آیت میں استخلاف سے مراد دنیاوی حکومت نہیں بلکہ "روحانی امامت" ہے۔ اصولِ کافی میں ہے۔

امام ابوجعفر علیہ السلام نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے سب سے پہلے شبِ قدر کو پیدا کیا اور اس

میں سب سے پہلے نبی اور سب سے پہلے وصی کو پیدا کیا اور اس کی مشیت نے یہ چاہا کہ ہر سال یہ رات ہو اور اس میں آنے والے سال کے جملہ امور تفصیل سے بتا دیئے جائیں جو اس سے انکار کرے گا اس نے علم الٰہی کی تردید کی کیونکہ انبیار و مرسلین و محدثین قائم کرتے ہیں لوگوں پر حجت اس چیز سے جو ان تک پہنچتی ہے۔ اس رات میں یہ امور جبریل ان کے پاس لاتے ہیں۔ میں نے کہا، کیا محدث وغیرہ کے پاس بھی جبریل آتے ہیں اور دیگر ملائکہ۔ فرمایا انبیار و مرسلینؑ کے بارہ میں تو کوئی شک ہی نہیں۔ ان کے علاوہ بھی دنیا کے آغاز سے اس کے خاتمہ تک خدا کی کوئی حجت روئے زمین پر ضرور رہے گی اور ہر شب قدر میں امر الٰہی نازل ہو گا اس شخص پر جس کو خدا اپنے بندوں میں سب سے زیادہ دوست رکھتا ہے۔

خدا کی قسم شب قدر میں ملائکہ اور روح امر الٰہی کو لے کر آدم پر نازل ہوئے اور خدا کی قسم جب آدم مرے تو ان کے وصی ان کی جگہ ہوئے۔ اسی طرح آدم کے بعد جو انبیار بھی آئے تو شب قدر میں ان کے پاس امر الٰہی آیا اور ان کے بعد ان کے اوصیار کے پاس۔

اور خدا کی قسم آدم سے لے کر محمد مصطفےٰ تک اس رات میں جس کے پاس بھی امر الٰہی آیا، اس کو حکم دیا گیا کہ وہ فلاں شخص کو وصیت کرے۔ خدا نے اپنی کتاب میں آنحضرت کے بعد والیانِ امر کے متعلق فرمایا ہے " تم میں جو لوگ ایمان دار ہیں اور انہوں نے نیک اعمال کئے ہیں، خدا نے ان سے وعدہ کیا ہے کہ وہ ان کو روئے زمین کا خلیفہ اسی طرح بنائے گا جس طرح ان سے پہلوں کو بنایا ہے الیٰ قولہ وہی لوگ فاسق ہیں۔ یعنی خدا فرماتا ہے، میں تم کو تمہارے نبی کے بعد اسی طرح خلیفہ بناؤں گا اپنے علم و دین اور عبادت کے لئے جس طرح اوصیائے آدم کو بنایا تھا۔ یہاں تک کہ خدا نے ان کے بعد ختم المرسلین کو مبعوث کیا (تاکہ) میرے ساتھ عبادت میں کسی کو شریک نہ کریں۔ فرمایا، میری عبادت کریں ایمان کے ساتھ۔ محمدؐ کے بعد کوئی نبی نہیں۔ پس جو لوگ اس کے خلاف کہیں گے وہ فاسق ہیں۔ پس خدا نے آنحضرت صلعم کے بعد والیانِ امر کو علم پر قدرت دی اور وہ ہم ہیں۔ (الشافی، جلد اول ص ۸۵۔ ۲۸۴)

یہی نہیں، الکافی کی دوسری روایات میں، طلب و ہوسِ سلطنت و حکومت (ریاست) کو ہلاکت قرار دیا گیا ہے۔ مثلاً ایک روایت میں ہے کہ

حضرت امام رضا علیہ السلام نے فرمایا کہ مسلمانوں کے دین میں ہوس ریاست اس سے زیادہ خوفناک اور مضر ہے جتنی دو شکاری بھیڑیوں کی موجودگی بکریوں کے گلّے کے لئے جو اپنے چرواہے سے الگ ہو گیا ہو۔ (الشافی جلد دوم، صہ ۳۱۶)

ایک اور روایت میں ہے۔

حضرت ابو عبداللہ علیہ السلام نے فرمایا، جس نے ہوسِ ریاست و حکومت کی وہ ہلاک ہو گیا۔ (ایضاً)

اس سے "دنیاوی حکومت" اور "روحانی مملکت" نہ صرف دو الگ الگ چیزیں قرار پا گئیں، بلکہ دنیاوی حکومت، مبغوض و مردود ٹھہرا دی گئی۔ مذہب اور سیاست کی یہ ثنویت، نظریۂ امامت کے تعلق سے شیعوں تک ہی محدود نہ رہی بلکہ سنّیوں کے ہاں بھی اسی طرح راہ پا گئی۔ موروثی امامت کے عقیدہ کے زیرِ اثر، بادشاہت پہلے ہی موروثی ہو چکی تھی (چنانچہ صدرِ اوّل کے بعد مسلمانوں کی جس قدر سلطنتیں قائم ہوئیں، خواہ وہ شیعوں کی تھیں خواہ سنیوں کی، سب موروثی تھیں) مذہب و سیاست

مذہب و سیاست میں ثنویت

کی ثنویت کے نظریہ کے ماتحت، امورِ مملکت اور امورِ شریعت بھی دو الگ الگ شعبوں میں بٹ گئے۔ امورِ مملکت بادشاہوں کے حصّے میں آ گئے اور امورِ شریعت، مذہبی پیشوائیت کی تحویل میں ــــ شخصی قوانین (PERSONEL LAWS) اور ملکی قوانین (PUBLIC LAWS) کی تفریق بھی اسی ثنویت کا نتیجہ ہے۔ یوں خود ایک مملکت بھی دو حصّوں میں منقسم ہو گئی جن میں دو متوازی حکومتیں قائم ہو گئیں۔ ایک بادشاہ کی، دوسری مذہبی پیشواؤں کی۔

اس سے اتنا ہی نہیں ہوا کہ حکومت دو حصّوں میں بٹ گئی، اس سے قانون سازی کا وہ سارا طریق ہی الٹ گیا جو قرآن کا تجویز کردہ اور دین کی اساس تھا۔ قرآنی نظامِ سیاست کی رُو سے، قانون سازی کا اصول یہ تھا کہ اُمّت، باہمی مشاورت سے، احکام و اصولِ قرآنی کے حدود میں رہتے ہوئے، اپنے زمانے کے تقاضوں کے مطابق جزئی قوانین وضع کرتی تھی۔ قرآنی حدود غیر متبدّل رہتی تھیں اور ان کے اندر وضع کردہ قوانین، زمانے کے تقاضوں کے ساتھ بدلتے رہتے تھے۔ مشاورت کا نظام، بادشاہت نے ختم کر دیا اور زمانے کے تقاضوں کے مطابق بدلنے والے قوانین کا تصور، مذہبی پیشوائیت نے ناجائز قرار دے دیا۔

امام شافعیؒ کے پیش کردہ مسلکِ حدیث کی رُو سے عقیدہ یہ قرار پاگیا کہ احکام و قوانین سب کے سب احادیث کے اندر موجود ہیں۔ یہ مکمل بھی ہیں اور غیر متبدّل بھی۔ اس لئے نہ کسی نئے قانون کے

قانون سازی کا امکان ختم کردیا

وضع کرنے کی ضرورت ہے، نہ موجودہ احکام میں ردّ و بدل کی اجازت۔ یہ اہلحدیث کا مسلک تھا۔ اہلِ فقہ نے شروع شروع میں اس مسلک کی مخالفت کی اور کہا کہ قرآن اور حدیث کی روشنی میں، قیاس و اجتہاد کی رُو سے، نئے نئے احکام مستنبط کئے جاسکتے ہیں اور جس حکم پر اجماع[1] ہو جائے، وہ اُمّت کے لئے قانون بن جائے گا ۔۔۔ یہ جو ہمارے ہاں مشہور ہے کہ قانون کے ماخذ چار ہیں، یعنی قرآن، حدیث، قیاس اور اجماع، اس کی سند یہی فقہی مسلک ہے۔ اس سے بہرحال، نئے نئے احکام وضع کرنے کا امکان موجود رہا، لیکن بعد میں انہوں نے بھی یہ عقیدہ اختیار کرلیا کہ اب اجتہاد کا دروازہ بند ہے۔ اس لئے نہ سابقہ فقہی فیصلوں میں تبدیلی ہوسکتی ہے اور نہ ہی نئے احکام وضع کئے جاسکتے ہیں[2]۔ اہلحدیث کا عقیدہ یہ تھا کہ جب قرآن اور حدیث میں تضاد پایا جائے تو حدیث کا حکم برقرار رہے گا کیونکہ حدیث، قرآن پر قاضی بھی ہے اور اسے منسوخ بھی کرسکتی ہے۔ یہی عقیدہ اہلِ فقہ نے بھی اختیار کرلیا۔ چنانچہ فقہ حنفی کے ایک مسلّم امام، ابوالحسن عبیداللہ الکرخیؒ کا قول ہے کہ

> ہر وہ آیت جو اس مسلک کے خلاف ہو جس پر ہمارے اصحاب ہیں، وہ یا تو ماوّل ہے یا منسوخ۔
> اور اسی طرح جو حدیث اس قسم کی ہو وہ ماوّل یا منسوخ ہے[3]۔

یعنی، اگر قرآن کے کسی حکم اور فقہ کے کسی فیصلہ میں اختلاف نظر آئے، تو پہلے یہ کوشش کرنی چاہیئے کہ قرآنی آیت کی اس طرح تاویل کی جائے کہ اس کا مفہوم فقہ کے مطابق ہو جائے اور اگر ایسا کسی طرح بھی ممکن نہ ہو تو پھر سمجھ لینا چاہیئے کہ وہ آیت منسوخ ہے۔ اہلحدیث چونکہ کسی حدیث کو (جو ان کے ہاں صحیح قرار دی گئی ہو) منسوخ نہیں تسلیم کرتے اس لئے، اس نکتہ پر اہلِ حدیث اور اہلِ فقہ میں باہمی بحث و نزاع ہوتی

---

[1] اجماع کے متعلق آج تک فیصلہ نہیں ہوسکا کہ اس سے کن لوگوں کا اجماع مقصود ہے۔

[2] فقہ کے چار مسالک معروف ہیں۔ حنفی، شافعی، حنبلی، مالکی۔

[3] تاریخ فقہ اسلامی، مؤلفہ علامہ خضری (مرحوم)، صہ ۴۲۱۔

ہے۔ جہاں تک قرآنی احکام کے منسوخ ہو جانے کا تعلق ہے' اس میں دونوں متفق ہوتے ہیں۔

اِس وقت اُمّت' انہی گروہوں میں بٹی ہوئی ہے ___ یعنی شیعہ اور سُنّی۔ پھر سنّیوں میں اہلحدیث اور اہلِ فقہ' اور اہلِ فقہ میں حنفی' شافعی' حنبلی اور مالکی۔ ان سب کے ہاں دین میں سند اور حُجّت روایات ہیں اور یا ائمہ فقہ کے فیصلے۔ قرآن صرف تلاوت کے لئے باقی رہ گیا ہے اور یا اس لئے ___ کہ از یٰسین اُو آسانِ بمیری[1]

انسانوں کے وضع کردہ تصوّرات نے' انسانوں پر جن انسانیت سوز لعنتوں کو مسلّط کیا' تفصیل میں جایئے تو ان کی فہرست طول طویل ہے لیکن اصولی طور پر انہیں تین شقوں میں سمیٹا جا سکتا ہے ___ (۱) ملوکیّت۔ (۲) مذہبی پیشوائیت اور (۳) نظامِ سرمایہ داری۔ قرآن کریم نے ان تینوں لعنتوں کو ختم کر کے' انسان کو کس طرح صحیح آزادی سے ہمکنار کیا' اس کی جھلک ہم' اس کتاب کے گذشتہ ابواب میں دیکھ چکے ہیں۔ عجمی سازش نے' قرآن کو نگاہوں سے اوجھل کر کے' ان لعنتوں کو کس طرح پھر سے زندہ کر کے انہیں

نظامِ سرمایہ داری کا احیاء

عین اسلام بنا دیا' اس کا اجمالی تذکرہ زیرِ نظر باب میں آپ کے سامنے آ چکا ہے۔ ان میں سے پہلی دو لعنتوں کا احیاء کس انداز سے کیا گیا' اسے بھی ہم دیکھ چکے ہیں۔ اس نے نظامِ سرمایہ داری کو کس طرح دوبارہ زندہ کر کے' اسلام کا جزو بنا دیا' یہ داستان بھی بڑی دلخراش ہے اور ایک جداگانہ تصنیف کی محتاج[2]۔ ہم سرِدست صرف اس اصولی نکتہ تک محدود رہنا چاہتے ہیں کہ قرآنِ کریم کے بجائے' روایات کو دین میں سند قرار دیدینے کے بعد ایسا کرنا کچھ بھی مشکل نہ تھا (جیسا کہ بیان کیا جا چکا ہے) یہ روایات عہدِ عباسیہ میں وضع اور مرتب ہوئی تھیں' جب سرمایہ دارانہ اور جاگیردارانہ نظام مملکت پر مسلط ہو چکا تھا' اسے اسلامی قرار دینے کے لئے

---

[1] ہمارے زمانے میں (مولوی) عبداللہ چکڑالوی (مرحوم) نے قرآنِ خالص کی طرف دعوت دی لیکن چونکہ ان کے سامنے بھی اسلام بہ حیثیت ایک مذہب کے تھا ' دین کی حیثیت سے نہ تھا' اس لئے ان کے متبعین بھی ایک فرقہ (اہل قرآن) بن کر رہ گئے اور یوں قرآنی تصورِ اسلام کے لئے اور زیادہ نقصان کا موجب بن گئے۔

[2] میں اس سلسلہ میں بہت کچھ لکھ چکا ہوں۔

روایات وضع کی گئیں جن میں سے کچھ کتبِ احادیث میں جمع ہو گئیں اور کچھ کتبِ تاریخ میں۔ انہی روایات پر مبنی فقہ مرتب کی گئی۔ لہٰذا، نظامِ سرمایہ داری، حدیث اور فقہ دونوں کی رُو سے، عین اسلام بنا دیا گیا۔ اس کی ایک بیّن مثال ہم اس سے پہلے سابقہ ابواب میں پیش کر چکے ہیں، لیکن ہم سمجھتے ہیں کہ اس کا ایک بار پھر سامنے لے آنا، قارئین کے ذوقِ سلیم پر ناگوار نہیں گزرے گا۔

قرآنِ کریم میں نظامِ سرمایہ داری کے خلاف بے شمار آیات آئی ہیں۔ ان میں دو بیّن آیات سورۃ توبہ کی ہیں جن میں کہا گیا ہے کہ

وَالَّذِيْنَ يَكْنِزُوْنَ الذَّهَبَ وَالْفِضَّةَ وَلَا يُنْفِقُوْنَهَا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۙ فَبَشِّرْهُمْ بِعَذَابٍ اَلِيْمٍ ۙ يَّوْمَ يُحْمٰى عَلَيْهَا فِيْ نَارِ جَهَنَّمَ فَتُكْوٰى بِهَا جِبَاهُهُمْ وَجُنُوْبُهُمْ وَظُهُوْرُهُمْ ۭ هٰذَا مَا كَنَزْتُمْ لِاَنْفُسِكُمْ فَذُوْقُوْا مَا كُنْتُمْ تَكْنِزُوْنَ ؁ (۹/۳۴-۳۵)

جو لوگ سونا اور چاندی (مال و دولت) جمع کرتے ہیں اور اسے فی سبیل اللہ (انسانیت کی فلاح و بہبود کے لئے قوانینِ خداوندی کے ماتحت) خرچ کرنے کے لئے کھلا نہیں رکھتے، (اے رسولؐ!) تو ان کے لئے خدا کی طرف سے الم انگیز عذاب کا اعلان کر دے۔ (یہ عذاب اس دن وارد ہو گا جب) اس مال و دولت کو جہنم کی آگ میں تپایا جائے گا اور اس سے ان کی پیشانی، پہلو اور کمر کو داغا جائے گا اور کہا جائے گا کہ یہ ہے وہ مال و دولت جسے تم نے اپنی ذات کے لئے مختص کر رکھا تھا۔ اب تم اس کا مزہ چکھو۔

ظاہر ہے کہ قرآنِ کریم کا یہ واضح حکم، سرمایہ داری کو جڑ بنیاد سے اکھیڑ کر رکھ دیتا ہے۔ اب دیکھئے کہ حدیث کی رُو سے اس آیت کی تفسیر کیا کی گئی ہے۔ ابوداؤد میں ہے۔

ابن عباسؓ کہتے ہیں کہ جس وقت یہ آیت نازل ہوئی تو مسلمانوں پر اس کا خاص اثر ہوا۔ یعنی انہوں نے اس حکم کو گراں خیال کیا۔ حضرت عمرؓ نے لوگوں سے کہا کہ میں تمہاری فکر کو دور کر دوں گا اور اس مشکل کو حل کر دوں گا۔ پس عمرؓ رسول اللہؐ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا، یا نبیؐ اللہ! یہ آیت آپ کے صحابہؓ پر گراں گزری ہے۔ آپؐ نے فرمایا کہ خداوند تعالےٰ نے زکوٰۃ اس لئے فرض کی ہے کہ وہ تمہارے باقی مال کو پاک کر دے اور میراث کو اس لئے فرض کیا ہے کہ جو لوگ تمہارے بعد رہ جائیں

ان کو مال مل جائے۔ ابن عباسؓ کہتے ہیں کہ حضورؐ کا یہ بیان سُنکر عمرؓ نے جوشِ مسرت سے اللہ اکبر کہا۔ (ابوداؤد، بحوالہ مشکوٰۃ، باب الزکوٰۃ)

یعنی، اس تفسیر کی رُو سے، جسے ارشادِ رسالت مآبؐ کہہ کر پیش کیا گیا، قرآنِ کریم کی اس آیت کا مطلب یہ ہو گیا کہ اگر سال بھر کے بعد اڑھائی فیصد زکوٰۃ دے دی جائے تو پھر جس قدر جی چاہے دولت جمع کی جا سکتی ہے۔ اس کی تائید میں تاریخ آگے بڑھی اور اس نے بتایا کہ صحابہ کرامؓ میں بڑے بڑے سرمایہ دار موجود تھے۔ حضرت عثمانِ غنیؓ کے پاس بے شمار دولت تھی۔ حضرت عبدالرحمٰن بن عوفؓ کے کاروبار کا یہ عالم تھا کہ ان کے مالِ تجارت کے کارواں کا اگلا اونٹ مدینہ میں ہوتا تھا اور پچھلا اونٹ مصر میں۔ اسی قسم کی روایات اور تاریخ پر متفرع، فقہ کے وہ احکام مستنبط ہوئے جن کی رُو سے مال و دولت اور جائیداد اور زمین کی ملکیت پر کسی قسم کی حدبندی کی ہی نہیں جا سکتی۔ ان (فقہی) احکام کی تفصیل میں جانا ہمارے لئے ممکن نہیں۔ (ہمارے زمانہ میں) سیّد ابو الاعلیٰ مودودی صاحب نے ان کا ملخّص اپنی کتاب "مسئلۂ ملکیّتِ زمین" میں ان الفاظ میں بیان کر دیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:۔

> اسلام نے کسی نوع کی ملکیّت پر بھی، مقدار اور کیّت کے لحاظ سے کوئی حد نہیں لگائی ہے۔ جائز ذرائع سے جائز چیزوں کی ملکیّت جب کہ اس سے تعلق رکھنے والے شرعی حقوق و واجبات ادا کئے جاتے رہیں، بلا حد و نہایت رکھی جا سکتی ہے۔ روپیہ، پیسہ، جانور، استعمالی اشیاء، مکانات، سواری، غرض کسی چیز کے معاملہ میں بھی قانوناً ملکیّت کی مقدار پر کوئی حد نہیں ہے۔ پھر آخر تنہا زرعی جائیداد میں وہ کون سی خصوصیت ہے جس کی بنا پر صرف اس کے معاملہ میں شریعت کا میلان یہ ہو کہ اسکے حقوقِ ملکیّت کو مقدار کے لحاظ سے مقیّد کر دیا جائے یا انتفاع کے مواقع سلب کر کے ایک خاص حد سے زائد ملکیت کو آدمی کے لئے عملاً بیکار کر دیا جائے۔ (سنہ ۱۹۵۰ء ایڈیشن صہ ۵۲)

یہ ہے وہ اسلام جسے فقہ، احادیث اور تاریخ کی رُو سے پیش کیا جاتا ہے اور جو شخص اس کے خلاف لب کشائی کرے اسے یہ کہہ کر ڈانٹ دیا جاتا ہے کہ تم اسلام کو بہتر سمجھتے ہو یا رسول اللہؐ اور سلف صالحینؒ بہتر سمجھتے تھے!

آپ نے دیکھا کہ عجمی سازش نے ہمیں کہاں سے کہاں پہنچا دیا ہے۔

(○)

اس وقت تک ہم نے اپنی گفتگو کو احکام تک محدود رکھا ہے، لیکن بنیادی بات عقائد کی ہوتی ہے۔

عقاید میں تبدیلی

اس لیے کہ عقیدہ ہی وہ اساس ہے جس پر زندگی کی عمارت استوار ہوتی ہے۔ فرد اور قوم دونوں کی زندگی کی۔ قرآنِ کریم نے جب کہا ہے کہ ذَالِكَ بِاَنَّ اللّٰهَ لَمْ يَكُ مُغَيِّرًا نِّعْمَةً اَنْعَمَهَا عَلٰى قَوْمٍ حَتّٰى يُغَيِّرُوْا مَا بِاَنْفُسِهِمْ ۔ (۸/۵۳) خدا کسی قوم کی حالت میں تبدیلی نہیں کرتا جب تک وہ قوم اپنی نفسیات میں تبدیلی نہ کرے، تو اس سے مقصود یہی تھا۔ انسانوں میں نفسیاتی تبدیلی، عقاید کی رو سے پیدا ہوتی ہے اور عربوں نے (اسلام کے صدرِ اوّل میں) جو محیّر انگیز انقلاب پیدا کر دیا تھا وہ قرآن کے عطا کردہ عقاید (نظریات و تصوّراتِ حیات) کی بدولت تھا۔ عجم اس حقیقت سے خوب واقف تھا۔ چنانچہ اس نے قرآنی عقاید کو اس طرح بدل دیا کہ اب ڈھونڈے سے بھی ان کا نشان نہیں ملتا۔ اس ضمن میں ہم صرف ایک مثال پر اکتفا کرینگے۔

قرآن کا عطا کردہ بنیادی عقیدہ یہ تھا کہ انسان اپنے اعمال کا خود ذمّہ دار ہے اور قومیں اپنی تقدیر آپ بناتی ہیں۔ مکافاتِ عمل کا یہی وہ عقیدہ تھا جس پر ایمان رکھنے سے جماعتِ مومنین چند سال کے عرصہ میں نہ صرف قیصر و کسریٰ کے تخت و تاج کی وارث بن گئی بلکہ ان کی صدیوں پرانی تہذیب کو مٹا کر (یا دھندلا کر) انسانیت کو ایک نئے دور میں داخل کر دیا۔ ایرانی اور بازنطینی (عیسائی) دونوں انسان کو مجبور قرار دیتے تھے۔ اس عقیدہ کو ماننے والی قومیں، عربوں (مسلمانوں) کے سامنے کس طرح ٹھہر سکتی تھیں جو اپنی دنیا آپ تعمیر کرنے کے قائل تھے۔ چنانچہ ایران کی پہلی ضرب کا نشانہ یہی عقیدہ تھا۔

مجوسیت کا بنیادی عقیدہ تقدیر کا تھا۔ ان کے ہاں "نوشتۂ تقدیر" اٹل فیصلہ تھا جو کسی طرح بدل

تقدیر کا عقیدہ

نہیں سکتا تھا۔ یہ عقیدہ، قرآنی عقیدہ کی ضد تھا۔ ایرانیوں نے اپنے اسی عقیدہ کو مسلمانوں میں پھیلانا شروع کر دیا۔ تاریخ کا بیان ہے کہ مسلمانوں میں سب سے پہلے جس شخص نے اس مسئلہ کو چھیڑا، وہ معبد بن خالد جہنی ہے۔ اس نے اس مسئلہ کو ابو یونس نامی ایک دانشور سے اخذ کیا تھا جس کا تعلق اساورہ سے تھا (اساورہ کے متعلق ہم پہلے دیکھ چکے ہیں کہ یہ شاہنشاہ ایران کے دانشوروں پر مشتمل جیش تھا جو مسلمان ہو کر کوفہ، بصرہ وغیرہ میں پھیل گیا تھا)۔ معبد سے اس عقیدہ کو غیلان دمشقی نے لیا اور آگے پھیلایا۔ اس عقیدہ کا ملخّص یہ تھا کہ انسان اپنے مقدّرات کی زنجیروں میں جکڑا ہوا، بے بس اور مجبور ہے۔

بعض مورّخین کا خیال ہے کہ عقیدۂ جبر کا بانی جعد بن درہم تھا۔ ابن الندیم کی تحقیق کی رُو سے، یہ شخص ایرانی الاصل، مانوی مذہب کا پیرو تھا جو ظاہرداری میں مسلمان ہوگیا تھا۔ درہم سے یہ عقیدہ جہم بن صفوان نے سیکھا جو خراسانی الاصل تھا اور اس نے اسے مسلمانوں میں عام کیا۔[1] شیعہ اور سنّی کی تفریق کے بعد مسلمانوں میں جو پہلا فرقہ پیدا ہوا، وہ یہی جبریہ (یا قدریہ) تھا۔ ظاہر ہے کہ یہ عقیدہ، قرآن کے عقیدۂ مکافاتِ عمل کی نقیض تھا۔ اس سے یہ سوال سامنے آتا ہے کہ ایسا عقیدہ جو قرآن کے ایک بنیادی عقیدہ کے یکسر خلاف تھا، مسلمانوں میں کس طرح راہ پا گیا۔ گزشتہ صفحات میں جو بحث سامنے آچکی ہے اس کی روشنی میں اس (بظاہر مشکل ترین) سوال کا جواب نہایت آسانی سے مل سکتا ہے۔ اس عقیدہ کی تائید میں احادیث وضع کر دی گئیں۔ اس کے بعد اس کے "عین اسلام" قرار پا جانے میں کچھ مشکل ہی نہ رہی۔ اس سلسلہ میں دو چار احادیث ملاحظہ فرمایئے۔ جنہیں ہم (احادیث کے معتبر مجموعہ) مشکوٰۃ، باب التقدیر سے پیش کرتے ہیں۔

تقدیر کے متعلق روایات

(۱) حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے روایت ہے۔ فرمایا رسول اللہؐ نے کہ خدا تعالیٰ نے آسمان اور زمین کو پیدا کرنے سے، پچاس ہزار برس پہلے، مخلوقات کی تقدیروں کو لکھا ہے جب کہ اس کا عرش پانی پر تھا۔ (بحوالہ مسلم)

(۲) حضرت ابن عمرؓ کہتے ہیں کہ فرمایا رسولِ خداؐ نے ہر چیز تقدیر پر موقوف ہے، یہاں تک کہ نادانی اور دانائی بھی۔ (بحوالہ مسلم)

(۳) حضرت علیؓ سے روایت ہے کہ فرمایا رسول اللہؐ نے کہ تم میں سے کوئی شخص ایسا نہیں جسکا ٹھکانا نہ لکھا گیا ہو۔ یعنی یا تو اس کا ٹھکانا آگ میں ہوگا یا جنت میں۔ (بحوالہ بخاری، مسلم)

حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ رسول اللہؐ نے فرمایا کہ خداوند تعالیٰ نے انسان کی تقدیر میں زنا کا جتنا حصّہ لکھ دیا ہے وہ ضرور اس پر عمل کرے گا۔ (بحوالہ بخاری، مسلم) نیز حضورؐ نے فرمایا کہ خداوند تعالیٰ نے آدم کو پیدا کیا۔ پھر اس کی پشت پر اپنا داہنا ہاتھ پھیرا۔ پھر اس میں سے (یعنی آدم کی پشت میں سے) اس کی اولاد نکالی اور فرمایا، پیدا کیا میں نے ان کو جنت کے لئے۔ یہ جنتیوں کے کام کریں گے۔ پھر دوبارہ آدمؑ

---

[1] مسئلہ تقدیر سے متعلق میری مستقل تصنیف 'کتاب التقدیر' کے نام سے شائع ہو چکی ہے۔

کی پشت پر ہاتھ پھیرا اور اس سے اور اولاد نکالی اور پھر فرمایا کہ ــ پیدا کیا میں نے ان کو دوزخ کے لئے. یہ لوگ دوزخیوں کے کام کریں گے۔ رسول اللہ کا یہ ارشاد سن کر ایک شخص نے عرض کیا۔ یا رسول اللہ! پھر عمل کرنے سے کیا فائدہ ؟ رسول اللہ نے جواب میں فرمایا کہ خداوند تعالیٰ جب کسی بندے کو جنت کے لئے پیدا کرتا ہے تو اس سے جنتیوں ہی کے کام کراتا ہے...... اور خدا اس کے ان اعمال کے سبب اس کو جنت میں داخل کر دیتا ہے۔ اسی طرح جب کسی بندے کو دوزخ کے لئے پیدا کرتا ہے تو اس سے دوزخیوں کے کام کراتا ہے...... اور خدا اس کو اس کے کاموں کے سبب دوزخ میں داخل کر دیتا ہے۔ (بحوالہ مالک، ترمذی، ابو داؤد)

(۴) حضرت عبداللہ بن عمرؓ بیان کرتے ہیں کہ ایک مرتبہ رسول اللہ باہر تشریف لائے اور آپ کے ہاتھوں میں دو کتابیں تھیں۔ آپؐ نے ہم لوگوں سے مخاطب ہو کر فرمایا۔ تم جانتے ہو یہ دونوں کتابیں کیسی ہیں؟ ہم نے عرض کیا یا رسول اللہ! ہم کو معلوم نہیں۔ آپؐ نے سیدھے ہاتھ کی طرف اشارہ کر کے فرمایا، یہ کتاب پروردگارِ عالم کی طرف سے ہے۔ اس میں جنتیوں کے نام ہیں۔ اب نہ اس میں کچھ گھٹایا جا سکتا ہے نہ بڑھایا۔ اس کے بعد آپؐ نے اُلٹے ہاتھ کی کتاب کی طرف اشارہ کر کے فرمایا، یہ کتاب بھی پروردگارِ عالم کی طرف سے ہے۔ اس میں دوزخیوں کے نام درج ہیں۔ اب اس میں نہ کچھ زیادہ کیا جا سکتا ہے نہ کم۔ (بحوالہ ترمذی)

(۵) حضرت ابو الدرداءؓ سے روایت ہے کہ فرمایا رسول اللہ نے کہ خداوند تعالیٰ نے اپنے ہر ایک بندے کے متعلق پانچ باتوں سے فراغت حاصل کر لی ہے، یعنی ان پانچ باتوں کو اس کی تقدیر میں لکھ دیا ہے۔ اس کی مدت (عمر)، اس کا نیک و بد عمل، اس کے رہنے کی جگہ، اس کی واپسی اور رزق۔

(بحوالہ احمد)

ظاہر ہے کہ جو شخص قرآنِ کریم کی واضح تعلیم اور علم و بصیرت کی روشنی میں اس قسم کی روایات پر غور کرے گا، اس کے دل میں طرح طرح کے سوالات ابھریں گے اور وہ ان کا اطمینان بخش جواب چاہے گا۔ جن لوگوں نے یہ احادیث وضع کی تھیں انہوں نے اس صورتِ حال کا بھی پہلے سے حل سوچ لیا تھا۔ اس کے لئے انہوں نے اس قسم کی حدیثیں بھی ساتھ ہی وضع کر دی تھیں جن سے اس بحث کا دروازہ ہی کھلنے نہ پائے۔ (مثلاً) حضرت ابو ہریرہؓ بیان کرتے ہیں کہ ہم لوگ تقدیر کے مسئلہ پر بیٹھے گفتگو کر رہے

تھے کہ رسولِ خدا تشریف لائے اور ہماری باتیں سُن کر ان کا چہرہ انار کے دانوں کی طرح سُرخ ہو گیا۔ آپؐ نے انتہائی غصّہ کے عالم میں فرمایا کہ کیا تم لوگوں کو اس کا حکم دیا گیا ہے؟ کیا میں تم میں اس مقصد کے لئے بھیجا گیا ہوں؟ تم سے پہلے جو قومیں گزری ہیں جب انہوں نے اس مسئلہ پر بحث و تمحیص کی تو انہیں ہلاک کر دیا گیا۔ سو میں تمہیں قسم دیتا ہوں اور مکرّر قسم دیتا ہوں کہ تم آئندہ اس مسئلہ پر بحث مت کرنا۔ (بحوالہ ترمذی) یعنی ان لوگوں نے عقیدۂ جبر کو مسلمانوں میں عام کر دیا اور اس پر بحث و نظر کے دروازے بند کر دیئے۔ برامکہ نے اس عقیدہ کو بڑے زور و شور سے پھیلایا۔ مجوسیوں کا عقیدہ تھا کہ آنے والے سال کے تمام واقعات اور لوگوں کی قسمتوں کا فیصلہ نوروز کی شب میں ہو جاتا ہے۔ برامکہ نے اسی شبِ نوروز کو "مسلمان کر کے" اس کا نام شبِ براَت (مقدرات کی رات) رکھ دیا۔ شبِ برات کی آتشبازی مجوسی آتشکدوں کے شعلوں سے ٹوٹے ہوئے شراروں کی یاد تازہ کرتی ہے۔ شیعہ حضرات "شبِ قدر" کو قسمتوں کے فیصلے کی رات مانتے ہیں۔ الکافی میں ہے۔

> امام ابو جعفر علیہ السّلام نے فرمایا کہ اللہ تعالےٰ نے سب سے پہلے شبِ قدر کو پیدا کیا اور اس میں سب سے پہلے نبی اور سب سے پہلے وحی کو پیدا کیا اور اس کی مشیّت نے یہ چاہا کہ ہر سال یہ رات ہو اور اس میں آنے والے سال کے جملہ امور تفصیل سے بتا دیئے جائیں۔ جو اس سے انکار کرے گا اس نے علمِ الٰہی کی تردید کی کیونکہ انبیاء و مرسلین و محدثین قائم کرتے ہیں۔ لوگوں پر حجّت اس چیز سے جو ان تک پہنچتی ہے۔ اس رات میں یہ امور جبریل ان کے پاس لاتے ہیں۔ (الشافی۔ جلد اوّل، صہ ۱۵ ۔ ۲۸۴)

اس روایت میں یہ ٹکڑا کہ "جو اس سے انکار کرے گا اس نے علمِ الٰہی کی تردید کی"۔ بات کو آگے بڑھاتا ہے۔ قرآنِ کریم کی رُو سے، ایمان کے پانچ اجزاء ہیں۔ اللہ، ملائکہ، انبیاء، کتب اور آخرت (۲/۱۷۷، ۴/۱۳۶)۔ سارے قرآن میں انہی اجزاء کا ذکر ہے۔ انہی کے اقرار سے ایک شخص مسلمان ہوتا ہے انہی کے انکار سے کافر۔ لیکن آپ کو معلوم ہے کہ اب ایمان کے پانچ اجزاء نہیں، چھ ہیں اور چھٹا جزو یہی عقیدۂ تقدیر ہے۔ ملاحظہ فرمایئے:۔

> اٰمنت باللہ و ملائکتہ وکتبہ و رسلہ و القدر خیرہ و شرہ من اللہ تعالیٰ و البعث بعد الموت۔

میں ایمان لایا اللہ پر اور اس کے ملائکہ پر اور اس کی کتابوں پر اور اس کے رسولوں پر اور اس بات پر کہ نیکی اور بدی، خیر اور شر سب خدا کی طرف سے مقدر ہو چکے ہیں اور موت کے بعد دوبارہ جی اٹھنے پر۔

یعنی ایمان کے پانچ اجزاء خدا نے مقرر کئے تھے، ان میں ایک کا اضافہ بعد میں کر دیا گیا۔ اب کوئی شخص مسلمان نہیں ہو سکتا جب تک وہ تقدیر پر ایمان نہ لائے۔ اور یہ اضافہ حسبِ معمول روایات کی رُو سے کیا گیا۔ مثلاً

حضرت علیؓ سے روایت ہے کہ فرمایا رسول اللہؐ نے کہ بندہ اس وقت تک مومن نہیں ہو سکتا جب تک ان چار باتوں پر ایمان نہ رکھے۔ (۱) اس امر کی شہادت دینا کہ خدا کے سوا کوئی معبود نہیں اور میں خدا کا رسول ہوں۔ مجھ کو خدا نے حق کے ساتھ بھیجا ہے۔ (۲) موت کو حق جاننے۔ (۳) مرنے کے بعد جی اٹھنے کو سچ ماننے اور (۴) تقدیر پر ایمان رکھے۔ (بحوالہ ترمذی و ابن ماجہ)

یوں تقدیر کا عقیدہ جزوِ ایمان بن گیا — یعنی یہ عقیدہ کہ نفع، نقصان، رنج و راحت، صحت اور بیماری، امیری اور غریبی، عزت و ذلت، نیکی و بدی (اور افراد سے آگے بڑھ کر قوموں کا) عروج و زوال، ان کی موت و حیات، فتح و شکست، محکومی اور حکمرانی، سب خدا کی طرف سے پہلے سے مقدر ہے۔ انسان کی سعی و کاوش اس میں کسی قسم کی تبدیلی نہیں کر سکتی — وہی ہوتا ہے جو منظورِ خدا ہوتا ہے — آپ اسبابِ زوالِ امت کی تحقیق و تفتیش کے لئے بڑی بڑی کاوشیں کرتے ہیں۔ اس کی حقیقت تک پہنچنے کے لئے کمیٹیاں بٹھاتے اور کمیشن متعین کرتے ہیں لیکن اس کے لئے نہ کسی تحقیق کی ضرورت ہے نہ تفتیش کی حاجت۔ قوموں کو تباہ کرنے کے لئے "ایک" حقیدۂ تقدیر" کافی ہے۔ عجمی سازش نے اس عقیدہ کو امتِ مسلمہ میں عام کر کے — بلکہ اسے اس کا جزوِ ایمان بنا کر — اس ہمہ تن شعلۂ جوالہ قوم کو راکھ کا ڈھیر بنا دیا اور اس کی نگاہ کا زاویہ اس طرح بدل دیا کہ اگر کوئی شخص ان سے کہے کہ یہ چھٹا جزوِ ایمان، قرآن پر اضافہ اور اس کی بنیادی تعلیم کے یکسر خلاف ہے، تو قوم اس کے لئے صلیبیں کھڑی کر دیتی ہے۔ سوچئے کہ کیا اس عقیدہ کے جزوِ ایمان بن جانے کے بعد، یہ قوم قیامت تک بھی اپنے پاؤں پر کھڑی ہو سکتی ہے؟ — تقدیر کا ایک مفہوم وہ تھا جسے حضرت عمرؓ نے سمجھایا تھا[1] اور ایک مفہوم وہ ہے جسے عجمی سازش نے وضع

---

[1] دیکھئے چوتھا باب۔

کیا۔ فاروقی مفہوم (جو قرآن کے عین مطابق تھا) کفر قرار پا گیا اور عجمی مفہوم، مسلمانوں کا جزوِ ایمان ــــ مزہ آیا نہ انتقام لینے کا!!

لیکن نہیں!! ابھی اس ترکش کا آخری تیر باقی ہے ــ یہ تیر نہیں، وہ سیلِ سُبک سیر و زمین گیر ہے، جس کے آگے

عقل و نظر و علم و ہنر ہیں خس و خاشاک

اس سازش کی یہ غارت گرِ متاعِ دین و دانش چال، اسلام کے تابوت کی آخری میخ تھی۔

تصوّف

ہم دیکھ چکے ہیں کہ ختم نبوت کی مہر کو توڑنے اور وحی کے مقابلے میں اس کا ہم پایہ ایک نیا دروازہ کھولنے کے لئے محدثیّت کا نظریہ وجود میں لایا گیا لیکن یہ خصوصیت اہلِ تشیع کے ائمہ کرام تک محدود رہی۔ اس لئے اس کا اثر و نفوذ بھی انہی کے دائرے میں مقیّد۔ سنّیوں کے ہاں اس کے مقابل، دو قسم کی وحی کا نظریہ اختراع کیا گیا اور قرآن سے خارج عقاید و احکام کو قرآن کا ہم پایہ قرار دے دیا گیا لیکن یہ چیز نبیٔ اکرمؐ کی ذاتِ اقدس تک محدود رہی اور اس کا ماحصل احادیث کے سرمایہ میں مقیّد۔ ضرورت اس امر کی محسوس کی گئی کہ خدا کے ہاں سے "براہِ راست علم پا لینے" کے اس امکان کو قیامت تک ممتد کر دیا جائے۔ اس ضرورت کو تصوّف نے آکر پورا کر دیا، وہ تصوّف جس کے متعلق علاّمہ اقبالؒ نے سیّد سلیمان ندوی (مرحوم) کے نام اپنے ایک مکتوب میں لکھا تھا کہ:-

> اس میں ذرا بھی شک نہیں کہ تصوّف کا وجود ہی سرزمینِ اسلام میں ایک اجنبی پودا ہے جس نے عجمیوں کی دماغی آب و ہوا میں پرورش پائی ہے۔ (اقبالؒ نامہ، جلد اوّل ص۴۷)

کہا جاتا ہے کہ اسلام میں پہلا شخص جو صوفی کے لقب سے مشہور ہوا، کوفے کا رہنے والا ابو ہاشم عثمان بن شریک تھا جس کی وفات ۱۶۰ھ کے قریب رملہ کی خانقاہ میں ہوئی۔ تصوّف کی بنیاد اس عقیدہ پر ہے کہ انسان، خاص قسم کے مجاہدات، ریاضات، مراقبات اور چلّہ کشیوں کے ذریعے اس مقام پر پہنچ سکتا ہے، جہاں وہ خدا سے براہِ راست مکالمہ اور مخاطبہ کر سکے۔ ظاہر ہے کہ شیعہ حضرات اس عقیدے کے حامی نہیں ہو سکتے تھے کیونکہ وہ اس قسم کے مخاطبہ اور مکالمہ کو اپنے ائمہ منصوص میں محدود سمجھتے اور وہی خیال کرتے تھے۔ اس لئے انہوں نے صوفیا کی مخالفت کی لیکن یہ عجیب بات ہے کہ صوفیا کے تمام خانوادے (نقشبندیہ کے سوا) انہی

ائمہ کی وساطت سے حضرت علیؓ تک پہنچتے ہیں، جنہیں متفقہ طور پر شاہِ ولایت تسلیم کیا جاتا ہے۔ ان کے نزدیک ولایت کا درجہ خلافت سے بہت بلند ہے۔ اتنا ہی نہیں، صوفیاء کے نزدیک، تصوف کے بلند ترین مقام پر صرف اہلِ بیت پہنچ سکتے ہیں۔ چنانچہ ابنِ عربیؒ "فتوحاتِ مکیہ" میں لکھتے ہیں کہ قطب الاولیا ہمیشہ اہلِ بیت میں سے ہوتا ہے۔ دیگر صوفیا، جو ان سے متفق نہیں، ان کا عقیدہ ہے کہ قطب الاقطاب بہرحال اہلِ بیت میں سے ہوتا ہے۔ (تحقیقِ سید و سادات، محمود احمد عباسی ص ۲۱۹)

اہلِ تشیع کے ہاں محدثیت کا عقیدہ یہ تھا کہ جس سرچشمۂ علمِ خداوندی سے رسولؐ اللہ کو وحی ملتی تھی،

شیخ اکبر ابن عربی

اسی سے ائمہ کرامؒ کو علم حاصل ہوتا تھا۔ بعینہٖ یہی عقیدہ اہلِ تصوف کا ہے۔ سرخیلِ صوفیاء، محی الدین ابنِ عربیؒ، جنہیں شیخِ اکبر کہا جاتا ہے، اپنی مشہور کتاب "فصوص الحکم" میں لکھتے ہیں:۔

جس مقام سے نبی لیتے تھے اسی مقام سے انسانِ کامل صاحب الزمان، غوث، قطب لیتے ہیں۔

اور احادیث کے متعلق وہ لکھتے ہیں کہ احادیث

روایت بالمعنی اور ذاتی فہم کی غلطی سے معصوم نہیں۔ لہٰذا، اولیاء ان کے متعلق رسولؐ خدا سے براہِ راست دریافت کر لیتے ہیں۔ اگرچہ اولیاء، انبیاء کے تابع ہوتے ہیں لیکن صاحبِ وحی دونوں ہوتے ہیں۔ ...... اگرچہ رسولؐ اللہ کے خلفاء (یعنی اولیاء) دائرہ شرع سے باہر نہیں نکل سکتے لیکن یہاں ایک دقیقہ ہے جسے ہمارے ہی جیسے شخص جان سکتے ہیں اور وہ دقیقہ یہ ہے کہ جب یہ شرعِ رسولؐ پر حکم کرتے ہیں تو ان کا ماخذ کیا ہوتا ہے؟ یہ کہاں سے حکم دیتے ہیں؟ اربابِ شریعت تو وہ ہیں جو قرآن و حدیث سے حکم دیتے ہیں۔ قرآن و حدیث میں مُصرّح حکم نہیں ملتا تو قیاس کرتے ہیں، اجتہاد کرتے ہیں مگر اس اجتہاد کی اصل وہی منقول قرآن و حدیث ہوتے ہیں۔ اس کے برعکس، ہم میں ایسے لوگ بھی ہیں جو اس چیز کو اپنے کشف و الہام کے ذریعہ خود اللہ تعالےٰ سے لیتے ہیں۔ لہٰذا خود اس حکمِ شرعی میں خلیفۃ اللہ ہوتے ہیں۔ پس ایک طور پر مادۂ کشف و الہام اور مادۂ وحیِ رسولؐ ایک ہے...... صاحبِ کشف اللہ تعالےٰ سے لینے کے طریقے سے واقف ہونے کی وجہ سے خاتم النبیّین کے موافق ہے...... ان کا اللہ تعالےٰ سے لینا عین رسولؐ اللہ کا لینا ہے...... یہی وجہ ہے کہ رسولؐ اللہ کا انتقال ہو گیا اور آپ نے منصوص و معیّن طور پر کسی کو خلیفہ نہ بنایا کیونکہ

آپ کو معلوم تھا کہ ان کی امت میں ایسے لوگ ہوں گے جو خلافت کو اللہ تعالیٰ سے لیں گے اور خلیفۃ اللہ ہوں گے ...... پس خلقِ خدا میں خلیفۃ اللہ ہیں۔ وہ معدنِ خاتم النّبیینؐ و مادہ انبیاء سابقین سے وہ احکام لیتے ہیں جو خود انہوں نے لئے تھے ...... خدا تعالیٰ ایسے خلیفہ کو وہی احکامِ شرعیہ اور علوم دیتا ہے جو خاص کرکے انبیاء کو دیئے گئے تھے۔ اگرچہ خلیفۂ ولی ظاہر میں متبعِ نبی اور اس کا غیر مخالف رہتا ہے۔

(سلیم کے نام، جلد سوم، صفحہ ۴۴-۴۲)

محققین کا خیال ہے کہ ابنِ عربی، اخوان الصفا کے نظریات و معتقدات سے متاثر تھے، اخوان الصفا باطنی مسلک اسماعیلیہ کے پیرو، مصنفین کا ایک گروہ تھا جس نے اپنے ناموں کا انکشاف کئے بغیر کچھ رسائل تصنیف کئے تھے۔ ان کی تعلیمات، محمد ابوالقاسم الاندلسی (متوفی ۳۹۵ھ) کی تصانیف کے توسط سے افریقہ اور اندلس (ہسپانیہ) تک رائج ہو گئی تھیں اس لئے ان محققین کا قوی گمان ہے کہ ابن عربی انہی کے فلسفہ سے متاثر تھے۔ تصوّف کی جو تصویر ان کے ہاں نظر آتی ہے وہ ایک حد تک اخوان الصفا کی تعلیمات کا عکس ہے[1]۔

صوفیا اپنے اس علم کا نام کشف اور الہام رکھتے ہیں۔ لفظ مذہب کی طرح یہ الفاظ بھی ان معنوں میں قرآن کریم میں کہیں نہیں آئے۔ نہ ہی اس میں تصوّف یا صوفی کا لفظ کہیں آیا ہے۔ آپ نے دیکھا ہو گا کہ

تصوّف کے اساسات قرآن کی ضد ہیں

وحی اور کشف والہام میں صرف لفظی فرق ہے، مفہوم و معانی کے اعتبار سے دونوں ایک ہی ہیں۔ یعنی خدا سے براہِ راست علم حاصل ہونا۔ اس منفرد اور خصوصی علم کی رُو سے صوفیاء کرام نے جن عقاید و نظریات کو پیش کیا، وہ اسلام کی ضد ہیں۔ مثلاً:

(۱) مجوسیت کا بنیادی تصوّر، اہرمن اور یزداں کی ثنویت تھا، یعنی خیر اور شر کی مسلسل جنگ۔ صوفیاء نے کہا کہ انسانی ذات روحِ خداوندی کا ایک جزو ہے جو اپنی اصل سے الگ ہو کر مادہ کی دلدل میں پھنس گئی ہے۔ مادہ سراسر شر ہے اور روحِ خداوندی (خواہ وہ کُل ہو یا اس کا جزو) خیر۔ اب دنیا میں مادہ اور روح

---

[1] مذہب اور باطنی تعلیم، مرزا محمد سعید مرحوم۔

کی کشمکش جاری ہے اور انسانی زندگی کا مقصد یہ ہے کہ انسانی ذات، مادہ کی کثیف دلدل سے نکل کر پھر سے اپنی اصل میں جاکر جذب ہو جائے۔ اس عقیدے کا لازمی نتیجہ مادی دنیا کو قابلِ نفرت سمجھنا ہے۔ چنانچہ ترکِ علائق، ترکِ لذات، یعنی دنیا اور ما فیہا کو قابلِ نفرت سمجھ کر اس سے دور بھاگنا، تزکیۂ نفس کی بنیادی شرط ہے۔ قرآن کریم نے مادی کائنات کے متعلق کہا تھا کہ اسے خدا نے قوانین کی زنجیروں میں جکڑ دیا ہے اور جماعتِ مومنین کا فریضہ یہ ہے کہ وہ ان قوانین کا علم حاصل کر کے فطرت کی قوتوں کو مسخر کرے۔ آپ سوچئے کہ قرآن کے اس تصور کے مقابلے میں یہ نظریہ کہ دنیا قابلِ نفرت ہے اور اس سے دور بھاگنا ہی مقصدِ حیات، کس طرح اسلام کو اُس کی جڑ بنیاد سے اکھیڑ دیتا اور اس کی حامل قوم کو مفلوج و مصلوب بنا کر رکھ دیتا ہے۔

(۲) قرآن نے بتایا ہے کہ خدا نے اس کائنات کو بالحق پیدا کیا ہے، لیکن (افلاطون کے نظریۂ اعیانِ نامشہود کے تتبع میں) تصوف کا نظریہ یہ ہے کہ اس مادی کائنات کا کوئی وجود نہیں، وجود صرف خدا کا ہے اور جو کچھ ہمیں نظر آتا ہے وہ سب خدا ہی خدا ہے۔ اسے نظریۂ وحدت الوجود یا ہمہ اوست کہا جاتا ہے۔ اس میں یہ حضرات کہاں تک آگے بڑھ جاتے ہیں، اُس کا اندازہ شیخِ اکبر کے اس بیان سے لگائیے جسے انہوں نے 'فصوص الحکم' میں ان الفاظ میں لکھا ہے کہ

> پس فرعون کو ایک طرح سے حق تھا کہ کہے اَنَا رَبُّکُمُ الْاَعْلٰی کیونکہ وہ ذاتِ حق سے جدا نہ تھا، اگرچہ اُس کی صورت فرعون کی تھی — (معاذ اللہ)

(۳) صوفیاء کا دعوٰی ہے کہ اُن کے اِن تمام عقائد اور نظریات کا مدار قرآنِ کریم پر ہے۔ اس کے لئے وہ کہتے ہیں کہ قرآن کے وہ معنی جو اُس کے الفاظ سے سمجھ میں آتے ہیں، ظاہر بینوں کے لئے ہیں، اس کے حقیقی معنی، اُس کے باطن میں پوشیدہ ہیں اور یہ باطنی علم صرف صوفیاء کو حاصل ہوتا ہے۔ اس علمِ باطن کی رُو سے وہ قرآنی آیات کو کس طرح مسخ کرتے ہیں، اس کا اندازہ، ابنِ عربی ہی کی بیان کردہ ایک مثال سے لگائیے۔ قرآنِ کریم میں ہے۔ مِنْهَا خَلَقْنٰكُمْ وَ فِيْهَا نُعِيْدُكُمْ وَ مِنْهَا نُخْرِجُكُمْ تَارَةً اُخْرٰى۔ (۲۰/۵۵) اس کا صاف اور سیدھا ترجمہ یہ ہے کہ "ہم نے تمہیں اسی زمین سے پیدا کیا، اسی میں تمہیں لوٹائیں گے اور اسی سے تمہیں بارِ دیگر نکالیں گے"۔ ابنِ عربی اس کی تفسیر میں لکھتے ہیں کہ

> ہم سب احدیت سے نکلے تھے، فنا ہو کر پھر احدیت میں جا چھپیں گے۔ پھر بقا ملے گی اور دوبارہ پھر

نمودار ہوں گے۔ (فصوص الحکم)

باطنی علم کی سند

علمِ باطنی کے متعلق عقیدہ یہ ہے کہ اسے عوام پر ظاہر نہیں کیا جاتا خواص تک محدود رکھا جاتا ہے۔ اس کی سند کے لئے اس قسم کی حدیثیں وضع کی گئیں کہ

> حضرت ابو ہریرہؓ نے فرمایا کہ مجھے رسول اللہؐ سے علم کے دو برتن ملے۔ ایک (علم ظاہری) کو تو میں نے پھیلا دیا ہے لیکن اگر میں دوسرے (علم باطنی) کو ظاہر کردوں تو میری رگِ حیات کاٹ دی جائے۔
>
> (بخاری باب العلم، نیز مشکوٰۃ باب العلم)

(جیساکہ حوالہ میں لکھا گیا ہے) یہ حدیث بخاری میں موجود ہے جسے اصح الکتب کہا جاتا ہے۔ کس قدر مقامِ تاسّف ہے کہ نہ امام بخاری کو اس کا خیال آیا اور نہ ہی ایسی حدیثوں کی نسبت نبئ اکرمؐ کی طرف کرنے والوں کو اس کا احساس ہوتا ہے کہ اس سے حضور رسالتمآبؐ کی ذاتِ اقدس پر کتنا بڑا حرف آتا ہے۔ اللہ تعالےٰ نے حضورؐ کو علم (وحی) عطا فرمایا اور ساتھ ہی یہ حکم دیا کہ یٰٓاَیُّھَا الرَّسُوْلُ بَلِّغْ مَآ اُنْزِلَ اِلَیْکَ۔ اے ہمارے پیغمبر! جو کچھ تیری طرف نازل کیا جاتا ہے، اسے لوگوں تک پہنچا دے۔ وَاِنْ لَّمْ تَفْعَلْ فَمَا بَلَّغْتَ رِسٰلَتَهٗ۔ (۵/۶۷) اگر تو نے ایسا نہ کیا تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ تو نے فریضۂ رسالت ادا نہیں کیا۔ دوسری طرف کہا کہ اِنَّ الَّذِیْنَ یَکْتُمُوْنَ مَآ اَنْزَلْنَا مِنَ الْبَیِّنٰتِ وَالْهُدٰی مِنْۢ بَعْدِ مَا بَیَّنّٰهُ لِلنَّاسِ فِی الْکِتٰبِ۔ اُولٰٓئِکَ یَلْعَنُهُمُ اللّٰهُ وَیَلْعَنُهُمُ اللّٰعِنُوْنَ۔ (۲/۱۵۹) "جو لوگ اس روشن علم اور ہدایت کو چھپاتے ہیں جسے ہم نے نوعِ انسان کے لئے قرآن میں وضاحت سے بیان کر دیا ہے، ان پر خدا کی بھی لعنت ہے اور ہر لعنت کرنے والے کی بھی لعنت۔" اللہ تعالےٰ کے ان احکام اور وعید کے بعد یہ کہنا کہ خدا نے حضورؐ کو جو علم دیا تھا، آپؐ نے اسے دو حصوں میں تقسیم کر دیا تھا۔ ایک حصہ کو تو ظاہر کر دیا تھا

معاذ اللہ!

اور دوسرے حصہ کو (معاذ اللہ) مخفی طور پر خواص میں سے بعض کے سپرد کر دیا، اس تاکید کے ساتھ کہ وہ بھی اسے عوام پر ظاہر نہ کریں، خواص تک محدود رکھیں، حضورؐ کی ذاتِ اطہر کے خلاف ایسا سنگین الزام ہے جس کے تصور سے روح کانپتی ہے لیکن ہمارے اربابِ شریعت اسے حدیث کی صحیح ترین کتابوں میں درج کرتے ہیں اور اصحابِ طریقت اسے، اپنے "علم باطنی" کی سند کے طور پر پیش کرتے ہیں ــــ ناطقہ سر بگریباں کہ اسے کیا کہیے! یہ "علم باطنی" کہیں لکھا ہوا نہیں ہوتا۔ یہ صوفیہ میں سینہ بہ سینہ چلا آتا ہے۔ اسے علمِ لدنّی کہا جاتا ہے۔ اس علم کے حصول کے لئے یہ بھی ضروری نہیں کہ

علمِ لدُنّی مرید اسے اپنے مرشد سے بالمشافہ حاصل کرے۔ یہ صدیوں کے بُعدِ زمانی کے باوجود، باطنی طریق سے حاصل کیا جا سکتا ہے۔ (مثلاً حضرت جنیدؒ بغدادی کے متعلق (کہ جن کی وفات ۲۹۸ھ میں ہوئی تھی) یہ عقیدہ ہے کہ انہوں نے خرقۂ تصوّف، رسولؐ اللہ کے صحابی، حضرت انسؓ بن مالک سے حاصل کیا تھا۔ اہلِ تصوّف کا عقیدہ یہ ہے کہ یہ باطنی علم، رسولؐ اللہ نے حضرت علیؓ کو عطا فرمایا تھا اور آپ (حضرت علیؓ) سے یہ آگے، سینہ بہ سینہ منتقل ہوتا چلا گیا۔ اس منتقل ہو کر آنے والے علمِ باطنی کے علاوہ، اولیاء کرام کو مزید باطنی علم، خدا سے براہ راست بھی حاصل ہوتا ہے جس کی رُو سے ان پر قرآن کے باطنی معانی منکشف ہوتے ہیں۔

باطنی معانی کی رُو سے قرآنِ کریم کو کس طرح مسخ کیا جاتا ہے، اس کے متعلق علامہ اقبال اپنے ایک خط میں لکھتے ہیں کہ

> حقیقت یہ ہے کہ کسی مذہب یا قوم کے دستور العمل و شعار میں باطنی معانی تلاش کرنا یا باطنی مفہوم پیدا کرنا اصل میں اس دستور العمل کو مسخ کر دینا ہے۔ یہ ایک نہایت (SUBTLE) طریق تنسیخ کا ہے اور یہ طریق وہی قومیں اختیار یا ایجاد کر سکتی ہیں جن کی فطرت گوسفندی ہو۔ شعرائے عجم میں بیشتر وہ شعراء ہیں جو اپنے فطری میلان کے باعث وجودی فلسفہ کی طرف مائل تھے۔ اسلام سے پہلے بھی ایرانی قوم میں یہ میلانِ طبیعت موجود تھا اور اگرچہ اسلام نے کچھ عرصہ تک اس کا نشوونما نہ ہونے دیا، تاہم وقت پا کر ایران کا آبائی اور طبعی مذاق اچھی طرح سے ظاہر ہوا۔ یا بالفاظِ دیگر مسلمانوں میں ایک ایسے لٹریچر کی بنیاد پڑی جس کی بنا وحدت الوجود تھی۔ ان شعراء نے نہایت عجیب و غریب اور بظاہر دلفریب طریقوں سے شعائرِ اسلام کی تردید و تنسیخ کی ہے۔ (اقبالؒ نامہ، جلد ا، صہ ۳۵)

اور اسی بنا پر انہوں نے اپنے ایک اور مکتوب میں لکھا تھا۔

> جہاں تک مجھے علم ہے فصوص الحکم میں سوائے الحاد و زندقہ کے اور کچھ نہیں۔ (اقبالؒ نامہ، جلد ا، صہ ۴۴)

(۴) دین، انسانی حیاتِ اجتماعیہ کے لئے ایک مکمل نظام اور ضابطہ کا نام ہے جو اپنی مملکت میں متشکل ہوتا ہے۔ اسی بنا پر حضرت عمرؓ نے فرمایا تھا کہ لا اسلام الا بالجماعۃ۔ جماعت کے بغیر اسلام کا تصور ہی نہیں ہو سکتا لیکن تصوف، جماعتی زندگی سے دور بھاگتا ہے۔ وہ اپنی اپنی خلوت گاہوں میں مراقبوں اور ریاضتوں کے ذریعے انفرادی نجات کا قائل ہے۔ اس تصور کی رُو سے اسلام میں اور ہندوؤں کی ویدانت، عیسائیوں کی رہبانیت

اور ایرانیوں کی مجوسیت میں کوئی فرق نہیں رہتا۔

(۵) اسلام نے زندگی کو جہدِ مسلسل سے تعبیر کیا تھا اور اس جہد کی آخری شکل وہ بتائی تھی جہاں جماعت مومنین ظلم کی مدافعت کے لئے میدان جنگ میں اُتر آتی ہے۔ وہاں سے فاتح و منصور لوٹتی ہے تو غازی کہلاتی ہے اور جان دینے والے حیاتِ جاوداں کے مستحق قرار پاتے ہیں۔ اسلام میں، اس جہاد سے افضل کوئی عمل نہیں لیکن تصوف اس جہاد کو جہادِ اصغر قرار دیتا ہے اور ترکِ دنیا کے ذریعے نفس کشی کو جہادِ اکبر۔ یہاں تک ہی نہیں بلکہ وہ جہاد بالسیف کو بہایت حقارت کی نگاہ سے دیکھتا ہے۔ ان کے ہاں کی ایک مشہور رباعی ہے۔

جہاد کے خلاف

غازی زپئے شہادت اندر تگ و پوست — غافل کہ شہیدِ عشق فاضل تراز وست

در روزِ قیامت ایں بادکے ماند — ایں کشتۂ دشمن است آں کشتۂ دوست

علامہ اقبالؒ اس رباعی پر تنقید کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ "یہ رباعی شاعرانہ اعتبار سے نہایت عمدہ ہے اور قابلِ تعریف مگر انصاف سے دیکھئے تو جہادِ اسلامیہ کی تردید میں اس سے زیادہ دلفریب اور خوبصورت طریق اختیار نہیں کیا جاسکتا۔ شاعر نے کمال یہ کیا ہے کہ جس نے اس کو زہر دیا ہے اُس کو احساس بھی اس امر کا نہیں ہوسکتا کہ مجھے کسی نے زہر دیا ہے بلکہ وہ سمجھتا ہے کہ مجھے آبِ حیات دیا گیا ہے۔ آہ۔ مسلمان کئی صدیوں سے یہی سمجھ رہے ہیں۔" (مکتوب اقبال بنام سراجدین پال، اقبال نامہ، جلد اول، صہ ۳۶)

اس ایک رباعی پر ہی کیا موقوف ہے۔ وہ (علامہ اقبالؒ) لکھتے ہیں کہ:

تصوف کی تمام شاعری مسلمانوں کے پولیٹیکل انحطاط کے زمانے میں پیدا ہوئی، اور ہونا بھی یہی چاہیئے تھا۔ جس قوم میں طاقت و توانائی مفقود ہو جائے جیسا کہ تاتاری یورش کے بعد مسلمانوں میں مفقود ہوگئی تو پھر اُس قوم کا نقطۂ نگاہ بدل جایا کرتا ہے۔ ان کے نزدیک ناتوانی ایک حسین و جمیل شے ہو جاتی ہے اور ترکِ دنیا موجبِ تسکین۔ اسی ترکِ دنیا کے پردے میں قومیں اپنی سُستی و کاہلی اور اس شکست کو جو ان کے تنازع للبقاء میں ہو، چھپایا کرتی ہیں۔ خود ہندوستان کے مسلمانوں کو دیکھئے کہ ان کے ادبیات کا انتہائی کمال لکھنوکی مرثیہ گوئی پر ختم ہوا۔ (ایضاً صہ ۴۴)

انہوں نے اپنے ایک اور مکتوب میں لکھا تھا:

ہندوستان کے مسلمان صدیوں سے ایرانی تاثرات کے اثر میں ہیں۔ ان کو عربی اسلام اور اس کے

نصب العین اور غرض وغایت سے آشنائی نہیں۔ ان کے لٹریری آئیڈیل بھی ایرانی ہیں اور سوشل نصب العین بھی ایرانی۔ (اقبال نامہ، جلد ۱، صہ ۲۴)

اسے وہ مسلمانوں کا "مجوسی ورثہ" کہہ کر پکارتے ہیں، اور بصد کرب واذیت لکھتے ہیں کہ:۔

اس مجوسی ورثہ نے اسلام کی زندگی کی سوتیں خشک کردیں اور اس کی روح کی نشوونما اور اس کے مقاصد کی تکمیل کے سلسلہ کو آگے بڑھنے سے روک دیا۔ (احمدیت اور اسلام)

علّامہ اقبالؒ اور تصوّف

علّامہ اقبالؒ نے ۱۹۱۷ء میں (ISLAM AN MYSLICISM) کے عنوان سے ایک مضمون لکھا تھا جو لکھنؤ کے اخبار (NEW ERA) کی ۲۸ جولائی ۱۹۱۷ء کی اشاعت میں شائع ہُوا تھا۔ اس میں انہوں نے تصوّف کو "شعبدہ بازوں" کی کمند کہہ کر پکارا تھا۔[1]

صوفیا کی کتابوں میں تعلیم کس قسم کی ملتی ہے، اس کی تبیین کی یہاں گنجائش نہیں۔ اس کی مثالیں میں نے اپنی کتاب "سلیم کے نام خطوط" کی تیسری جلد میں پیش کی ہیں۔ اس موضوع سے دلچسپی رکھنے والے حضرات اسے دیکھ لیں۔

(۵)

مرزا غلام احمد کا دعویٰ

اب آگے بڑھئے۔ جب تصوّف کے اس عقیدہ نے (جس کی بنیاد محدّثیت کے نظریہ پر تھی اور جس کی ابتدا شیعوں کے ہاں سے ہوئی تھی) کشف والہام کے دروازے کھول دیئے تو اس سے دعویٰ نبوّت کا بھی امکان پیدا ہوگیا۔ چنانچہ مرزا غلام احمد قادیانی انہی سیڑھیوں سے مقامِ نبوّت تک پہنچنے کے دعویدار ہوئے تھے۔ انہوں نے پہلے لکھا۔

ہمارے سیّدالرسول اللہ، خاتم الانبیاء ہیں اور بعدِ آنحضرتؐ کوئی نبی نہیں آسکتا۔ اس لئے شریعت میں نبی کے قائمقام محدّث رکھے گئے ہیں۔ (شہادت القرآن صفحہ ۲۸)

دوسری جگہ لکھتے ہیں:۔

---

[1] یہ مضمون طلوعِ اسلام، بابت اپریل ۱۹۶۸ء میں شائع ہوا تھا۔

میں نے لوگوں سے سوائے اس کے جو میں نے اپنی کتابوں میں لکھا ہے' اور کچھ نہیں کہا کہ میں مُحدَّث ہوں اور اللہ تعالیٰ مجھ سے اُسی طرح کلام کرتا ہے جس طرح محدثین سے۔ (حمامة البشریٰ ص۹۶)

سابقہ صفحات میں جو کچھ لکھا گیا ہے' اس کی روشنی میں اس بات کے سمجھنے میں کچھ بھی دِقّت نہیں رہتی کہ مرزا صاحب نے محدثیت کا تصور کہاں سے مستعار لیا تھا؟ اس کا سرچشمہ شیعہ اور تصوّف کا لٹریچر ہے۔ (مثال کے طور پر) ہم پہلے دیکھ چکے ہیں کہ محدّث کا عقیدہ سب سے پہلے اہلِ تشیع کے ہاں آیا۔ اس کے لئے کہا گیا کہ قرآنِ مجید کی آیت (۲۲/۵۲) وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ مِنْ رَّسُوْلٍ وَّلَا نَبِيٍّ ....) میں' نبیؐ کے بعد لفظ مُحَدَّثٌ تھا جو قرآن کے مروّجہ نسخوں میں نہیں ہے۔ مرزا صاحب نے بھی اپنے دعویٰ محدّثیت کی سند میں یہی آیت لفظ محدّث کے اضافہ کے ساتھ درج کی ہے[1]۔ باقی رہا تصوّف' سو اس سلسلہ میں' مرزا صاحب کے متبعین کی لاہوری شاخ کے ترجمان' پیغامِ صلح کی اشاعت بابت ۱۱ جولائی ۱۹۷۳ء میں ایک مقالہ شائع ہوا ہے جس میں کہا گیا ہے کہ:

> آپ کی (مرزا صاحب کی) تحریرات میں جو اصطلاحات پائی جاتی ہیں جن سے اپنوں اور بیگانوں کو ٹھوکر لگی ہے اور آپ کو مدعیِ نبوّت سمجھنے لگے ہیں' جیسے ظلّی نبی' بروزی نبی' امتی نبی' غیر تشریعی نبی' فنا فی الرسول اور مجازی نبی' تو ان کے متعلق سمجھنے والی بات صرف یہ ہے کہ یہ اصطلاحات کہاں سے لی گئی ہیں اور ان کے معنی کیا ہیں۔ ظاہر ہے کہ ان اصطلاحات کا قرآنِ مجید اور احادیث میں تو کوئی ذکر نہیں اور آنحضرتؐ کے پانچ چھ سو سال بعد تک ہمیں ان کا وجود نظر نہیں آتا لیکن جب ہم تاریخ کی ورق گردانی کرتے ہیں تو پتہ چلتا ہے کہ یہ اصطلاحات صوفیاء کرام نے وضع کی ہیں۔

یہ ہیں ان کے دعوے کے منابع۔ اس کے بعد جو الہامات انہیں (بقول اُن کے) خدا کی طرف سے ملے' ان کے متعلق انہوں نے کہا۔

> میں خدا تعالیٰ کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ میں اُن الہامات پر اُسی طرح ایمان لاتا ہوں جیسا کہ قرآن شریف پر اور خدا کی دوسری کتابوں پر اور جس طرح میں قرآن شریف کو یقینی اور قطعی طور پر خدا کا کلام......

---

[1] براہینِ احمدیہ، ربوہ ایڈیشن (۱۹۵۷ء) ص۶۳۳، بحوالہ ہفتہ وار ایشیا' لاہور' مؤرخہ ۱۴ اکتوبر ۱۹۷۳ء۔ میرے سامنے اس وقت براہینِ احمدیہ نہیں اس لئے میں نے اس حوالہ پر اکتفا کیا ہے۔

جانتا ہوں، اُسی طرح اُس کلام کو بھی جو میرے پر نازل ہوتا ہے، خدا کا کلام یقین کرتا ہوں۔ (حقیقۃ الوحی ص۲۱۱)

اور ان کے بیٹے اور خلیفۂ اول، میاں محمود احمد نے کہا۔

پھر یہ بھی یاد رکھنا چاہیئے کہ جب کوئی نبی آجائے تو پہلے نبی کا علم بھی اُسی کے ذریعے ملتا ہے۔ یوں اپنے طور پر نہیں مل سکتا اور ہر بعد میں آنے والا نبی پہلے کے لئے بمنزلہ سوراخ کے ہوتا ہے۔ پہلے نبی کے آگے دیوار کھینچ دی جاتی ہے اور کچھ نظر نہیں آتا سوائے آنے والے نبی کے ذریعہ دیکھنے کے۔ یہی وجہ ہے کہ اب کوئی قرآن نہیں، سوائے اُس قرآن کے جو حضرت مسیح موعود نے پیش کیا اور کوئی حدیث نہیں سوائے اُس حدیث کے جو حضرت مسیح موعود کی روشنی میں نظر آئے۔

(اخبار الفضل، قادیان مورخہ ۱۵ر جولائی ۱۹۲۴ء)

اور آپ کو معلوم ہے کہ وہ کون سی خصوصیّتِ کبریٰ تھی جس کی بنا پر خدا نے مرزا صاحب کو اس منصب کے لئے منتخب کیا تھا! سُن لیجیے۔

اللہ تعالےٰ نے اس آخری صداقت کو قادیان کے ویرانوں میں نمودار کیا اور حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کو جو فارسی النسل ہیں، اس اہم کام کے لئے منتخب فرمایا[۱]۔ (اخبار الفضل، مورخہ ۲ر فروری ۱۹۳۵ء)

آپ نے دیکھا کہ اس نبوت کے ڈانڈے کہاں جا کر مل رہے ہیں؟ — اِس فارسی النسل "مامور من اللہ" کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ اُس نے قرآن کے حکمِ جہاد کو منسوخ قرار دے دیا۔

جہاد یعنی دینی لڑائیوں کی شدّت کو خدا تعالےٰ آہستہ آہستہ کم کرتا گیا ہے۔ حضرت موسیٰؑ کے وقت میں اس قدر شدّت تھی کہ ایمان لانا بھی قتل سے بچا نہیں سکتا تھا اور شیر خوار بچے بھی قتل کیے جاتے تھے پھر ہمارے نبی صلے اللہ علیہ وسلم کے وقت میں بچوں اور بوڑھوں اور عورتوں کا قتل کرنا حرام کیا گیا اور پھر بعض قوموں کے لئے بجائے ایمان کے صرف جزیہ دے کر مواخذہ سے نجات پانا قبول کیا گیا اور پھر مسیح موعود کے وقت قطعاً جہاد کا حکم موقوف کر دیا گیا۔

(اربعین نمبر ۴، صہ ۱۵، حاشیہ مصنفہ مرزا غلام احمد قادیانی صاحب)

آج سے انسانی جہاد جو تلوار سے کیا جاتا تھا، خدا کے حکم کیساتھ بند کیا گیا۔ اب اس کے بعد جو شخص کافر

---

[۱] یہ بھی عجیب اتفاق ہے کہ مرزا علی محمد باب اور بہاء اللہ بھی سرزمین ایران ہی سے اٹھے اور ان کی "نبوت" کا کارنامہ بھی حکمِ جہاد کی تنسیخ تھا۔

پر تلوار اٹھاتا اور اپنا نام غازی رکھتا ہے وہ اس رسولِ کریم صلے اللہ علیہ وسلم کی نافرمانی کرتا ہے، جس نے آج سے تیرہ سو برس پہلے فرما دیا ہے کہ مسیح موعود کے آنے پر تمام تلوار کے جہاد ختم ہو جائیں گے۔ سو اب میرے ظہور کے بعد تلوار کا کوئی جہاد نہیں۔ ہماری طرف سے امان اور صلح کاری کا سفید جھنڈا بلند کیا گیا۔ ایضاً (ص۔) (قادیانی مذہب، ص۲۹۷)

ایرانی سازش کا ملخص

یہ ہے اجمالی سا تعارف اس سازش کا جس کی رُو سے، ایران نے اپنی شکست کا انتقام عربوں ہی سے نہیں بلکہ نفسِ اسلام سے اس انداز سے لیا کہ اس کی اصل و بنیاد تک کو اکھیڑ کر رکھ دیا۔ اس ساری بحث کو علامہ اقبالؒ نے ایک فقرہ میں سمٹا دیا ہے جس میں کہا ہے کہ:

تسخیرِ ایران کا نتیجہ یہ نہ نکلا کہ ایران اسلام کا حلقہ بگوش بن گیا بلکہ یہ نکلا کہ اسلام، ایرانیت کے رنگ میں رنگا گیا۔ (مقالہ نیو آیرا، ۲۸ جولائی ۱۹۱۷ء)

یہی "ایرانی اسلام" (یعنی ہمارا "مجوسی ورثہ") ہے جو صدیوں سے مروّج چلا آرہا ہے۔ اس میں شیعہ کی تخصیص ہے نہ سنّی کی۔ نہ اہلِ حدیث کی نہ اہلِ فقہ کی، نہ اربابِ شریعت کی، نہ اصحابِ طریقت کی۔ سب اسی رنگ میں رنگے ہوئے ہیں۔

تمدن، تصوّف، شریعت، کلام　　　بُتانِ عجم کے پُجاری تمام

اور اس کا نتیجہ یہ کہ:

حقیقت خرافات میں کھو گئی　　　یہ اُمّت روایات میں کھو گئی　(اقبالؒ)

پھر اس سازش کی ساحری کا کمال یہ ہے کہ ہمارے اربابِ مذہب، اصولات و جزئیات تک میں ایک دوسرے کے مخالف ہیں، ان میں مسلسل باہمی آویزش و کشمکش رہتی ہے۔ یہ ایک دوسرے کے خلاف کفر کے فتاویٰ تک صادر کرتے رہتے ہیں لیکن جو شخص ان سے یہ کہدے کہ:

ز قرآن پیشِ خود آئینہ آویز　　　دگرگوں گشتۂ! از خویش بگریز
ترازوئے بنہ کردارِ خود را　　　قیامت ہائے پیشیں را برانگیز

یہ سب کے سب، متحدہ و متفقہ طور پر اس کے خلاف نبرد آزما ہو جاتے ہیں۔

علاج اس کا؟

سوال یہ ہے کہ کیا عجم کی اس سازش کا توڑ ممکن ہے اور اسلام کو اس ملبہ کے نیچے سے نکالا جا سکتا ہے؟ علامہ اقبالؒ کا جواب یہ ہے کہ ایسا ممکن ہے اور یقیناً ممکن؛

بشرطیکہ اسلامی دنیا اس کی طرف عمرؓ کی روح کو لے کر آگے بڑھے، وہ عمرؓ جو اسلام کا سب سے پہلا تنقیدی اور حریت پسند قلب ہے۔ وہ جسے رسولؐ اللہ کی حیاتِ طیّبہ کے آخری لمحات میں یہ کہنے کی جرأت ہوئی کہ

حَسْبُنَا كِتَابُ اللهِ

ہمارے لئے خدا کی کتاب کافی ہے۔ (خطباتِ اقبالؒ)

اور یہی میری بھی عمر بھر کی آرزو اور پکار رہے اور ان کے مظاہر کی تازہ کڑی، میری یہ سعی و کاوش جو اس تصنیف کی شکل میں آپ کے سامنے ہے۔ بایں دعا کہ

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا إِنَّكَ أَنْتَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ ط

پرویز